جامعہ

مولانا محمد علی نمبر

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

جامعہ

مولانا محمد علی نمبر حصہ دوم

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبداللطیف اعظمی

جامعہ ملیہ اسلامیہ ۔ نئی دہلی

مجلس ادارت

پروفیسر محمد مجیب — پروفیسر مسعود حسین

ڈاکٹر سلامت اللہ — ضیاء الحسن فاروقی

جلد ۷۷ — جنوری و فروری ۱۹۸۰ء — شمارہ ۱، ۲

سالانہ چندہ چھ روپے — اس شمارے کی قیمت پانچ روپے

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

The Monthly Jamia

Jamia Nagar New Delhi-110025

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی

مطبوعہ: جمال پریس دہلی ۶ — ٹائیٹل: فائن پریس۔ دہلی ۶

فہرست مضامین

شذرات

اپریل ۱۹۷۹ء میں ہم نے مولانا محمد علی نمبر شائع کیا تھا، تو اس کا گمان بھی نہ تھا کہ اس بطلِ حریت کی یاد میں ہم ایک اور نمبر ایک سال کے اندر اندر نکالیں گے۔ لیکن اکتوبر ۱۹۷۹ء کے اوائل میں جامعہ کے شعبۂ تاریخ کے اہتمام میں "مولانا محمد علی اور ہندستانی سیاست" کے عنوان سے ایک سیمینار منعقد ہوا جس میں مسلم اور غیر مسلم عالموں نے بڑے اچھے مقالے پڑھے اور مولانا محمد علی مرحوم کی شخصیت اور اس عہد کی ہندستانی اور عالمی سیاست کے کئی نئے پہلو سامنے آئے۔ پھر برادر گرامی قدر جناب عبداللطیف اعظمی صاحب کی تلاش اور جستجو، کوششوں اور کاوشوں سے مولانا مرحوم کے سوانح حیات سے متعلق کئی مطبوعہ مضامین ایسے مل گئے جو عرصہ ہوا شائع ہوئے تھے لیکن آج کے پڑھنے والے ان سے تقریباً بالکل ناواقف ہیں اور ان میں بعض ایسی معلومات ہیں جو عام طور پر کتابوں میں نہیں ملتیں، اسی طرح بیگم محمد علی کے خطوط بھی اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان سے گول میز کانفرنس کے زمانے کی سرگرمیوں اور مولانا کی آخری علالت کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ خطوط "علی برادران" میں شائع ہوئے تھے جو آسانی سے ہندستان میں دستیاب نہیں اور اب غالباً پاکستان میں بھی نایاب یا کمیاب ہے ___ اس لئے یہ طے کیا گیا کہ ایک اور مولانا محمد علی نمبر شائع کیا جائے جو ماہنامہ جامعہ، 'محمد علی نمبر حصہ دوم' سے موسوم ہو اور اس طرح مولانا مرحوم پر لکھنے والوں کو رسالہ جامعہ کے ان دونوں حصوں سے کافی مواد مل جائے۔ امید ہے کہ ہماری یہ کوشش رائگاں نہ جائے گی اور عرصے تک ہمارے دلوں کو اس مرد مجاہد کی یاد سے گرماتی رہے گی۔

جس سمینار کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس میں خواجہ عبدالمجید مرحوم کے جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے علی گڑھ دور کے دوسرے شیخ الجامعہ تھے اور پھر عرصہ تک امیر جامعہ (چانسلر) رہے، بڑے صاحبزادے پروفیسر جمال خواجہ نے جو مقالہ پڑھا اُس میں مولانا محمد علی کے تصور کائنات سے بھی بحث تھی۔ مقالہ محنت سے لکھا گیا تھا اور عالمانہ تھا اور ہمیں ایک حد تک خواجہ صاحب سے اتفاق بھی ہے۔ خواجہ صاحب فلسفہ کے پروفیسر ہیں اور فکر کے اعتبار سے جدید طرز کے دانشور۔ انھوں نے سرسید، علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی کی شخصیت اور کارناموں کا ایک دانشور کی حیثیت سے جائزہ پیش کیا اور ان کا تجزیہ اچھا تھا لیکن انھوں نے اس کا خیال نہیں رکھا کہ انیسویں صدی کے اواخر میں مسلمانوں میں جو طرزِ فکر ابھرا تھا اُس کے دو پہلو تھے۔ ایک کے ترجمان سرسید تھے اور دوسرے کے علامہ شبلی اور مولانا حالی۔ اپنی تعلیم کے اعتبار سے مولانا محمد علی کو فکری طور پر سرسید کے حلقے میں ہونا چاہیے تھا، لیکن وہ اثر میں آئے اُس رجحان کے جس کے ترجمان شبلی اور حالی تھے۔ سیاست اور مذہب دونوں میں انھوں نے سرسید کے تصوّرات سے بغاوت کی، ہم قطعیت کے ساتھ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ سرسید کا تصور کائنات غیر اسلامی تھا، البتہ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے انیسویں صدی کے مغرب کی عقلیت پسندی کی جس کے فکری پس منظر مشمولات اور مضمرات سے وہ براہِ راست اور پورے طور پر واقف بھی نہ تھے، بیجا طور پر مرعوبانہ پیروی کر کے اپنے مذہبی فکر کو ایک چیستاں بنا دیا۔ مولانا محمد علی کو اپنے مذہبی افکار کو تفصیل اور تسلسل سے بیان کرنے کا موقع نہیں ملا، اس لیے محض اُن کی تقریروں اور کامریڈ اور ہمدرد میں اُن کی تحریروں کی بنیاد پر جن پر وقتی سیاست کی چھاپ ہے اُن کے مذہبی فکر کو ترتیب نہیں دیا جا سکتا۔ علامہ اقبال اور مولانا آزاد سے متعلق یہ بات نہیں کہی جا سکتی اور ان دونوں کے تصور کائنات کو ہم سرسید سے مختلف پاتے ہیں، یعنی دونوں اپنی فکری خصوصیات کے باوجود، اُسی تصور کائنات کی ترجمانی کرتے ہوئے ملتے ہیں جو اوّل

سے آخر تک مجموعی طور پر راسخ العقیدگی کی روایت رہی ہے ۔ ہمارا خیال ہے کہ مولانا محمد علی بھی اسی تصورِ کائنات کے حامل تھے ، ہاں، ان کے یہاں کبھی کبھی ، بقول بعض حضرات کے جس میں ہمارے خواجہ صاحب بھی شامل ہیں، یہ جو "ملائیت" یا کٹرپن ملتا ہے، اس میں ایک حد تک تو ان کی اپنی طبیعت اور مزاج کا دخل تھا اور ایک حد تک اس ماحول کا بھی جس میں وہ اپنی قوم پروری کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے کاز کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے ۔ مولانا محمد علی کی شخصیت کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک سچے قوم پرور بھی رہے اور راسخ العقیدہ مسلمان بھی :

بر کفے جامِ شریعت . بر کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام وسنداں باختن

سمینار میں ایک ترقی پسند دانشور نے جو عقیدہ کے لحاظ سے اشتراکی ہیں، اپنے مقالے میں یہ شکایت کی کہ مولانا محمد علی نے اپنی تحریروں میں کہیں انقلاب روس (۱۹۱۷ء) کا ذکر نہیں کیا ہے، گویا انھوں نے تاریخ عالم کے اتنے بڑے واقعے کو یکسر نظر انداز کر دیا ۔ دوسری بات انھوں نے یہ کہی کہ مولانا کو کسانوں اور مزدوروں کی تحریکات سے کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ ہمارا خیال ہے کہ بھلے ہی سے مولانا کی تحریروں میں انقلاب روس کا ذکر نہیں اور مزدوروں اور کسانوں کی تحریکوں سے متعلق بھی انھوں نے کچھ نہیں لکھا، لیکن یہ کہنا غالباً مناسب نہیں کہ انھیں ان واقعات سے دلچسپی نہ تھی یا انھوں نے انھیں کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں سمجھا ۔ مولانا کانگرس کے صدر تھے اور جواہر لال نہرو سکریٹری، یہ ناممکن ہے کہ پنڈت جی کے خیالات سے مولانا کو واقفیت نہ ہو یا وہ سوشلزم اور انقلاب روس جیسے امور و واقعات کو غیر اہم سمجھتے ہوں ۔ کانگرس کا جو سیاسی و اقتصادی پروگرام تھا، اس کے صدر کو اس سے کماحقہ، واقفیت رہی ہوگی اور وہ ان تحریکات سے بھی باخبر ہوگا جو ملک ، ورملک سے باہر چل رہی ہوں گی ۔ مولانا ایک

جید صحافی تھے اور ان کی نظر دنیا کے تمام واقعات اور مسائل پر رہتی تھی۔ اب اگر ان کی تحریروں میں کہیں انقلاب روس کا ذکر نہیں تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے اسے کبھی کوئی قابلِ ذکر واقعہ نہیں سمجھا۔

مولانا محمد علی پر آیندہ بہت کچھ لکھا جائے گا۔ ابھی ایسی بہت سی باتیں، خطوط، تحریریں اور دستاویزیں بھی سامنے آئیں گی جن سے مرحوم کی زندگی، شخصیت اور کارناموں پر مزید روشنی پڑے گی۔ کئی باتیں جو آج مولانا سے متعلق لوگ مانتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ کل کے شواہد کے پیشِ نظر ان میں کچھ کمی بیشی ہو جائے، لیکن ایک بات ایسی ہے جس پر ہمیشہ اتفاق رہے گا اور وہ یہ ہے کہ مولانا اربابِ عزیمت میں سے تھے، حق پرست تھے، جسے وہ حق سمجھتے تھے اُسے سرِ دار بھی کہتے تھے، عقیدہ اور عمل کے خوشگوار امتزاج کے جس مقام پر وہ تھے وہاں ہمہ وقت دار و رسن ہی کی آزمائش رہتی تھی، اور یہ وہ مقام ہے جہاں پہونچ کر مردِ حق آگاہ اپنوں کو بھی خفا رکھتا ہے اور بیگانوں کو بھی ناخوش رکھتا ہے کہ وہ کسی کی خوشی کے لئے زہر کو قند یا قند کو زہر نہیں کہہ سکتا۔ اُسے صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی مطلوب ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مولانا کے آخری دن ایسے گذرے کہ اُن سے نہ تو مسلمان خوش تھے اور نہ ہندو، حقیقت یہ ہے کہ وہ خود رضائے الٰہی کی طلب میں ساری دنیا سے خفا ہو گئے تھے:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

مولانا شوکت علی مرحوم

مولانا محمد علی کی ابتدائی زندگی

(مولانا شوکت علی مرحوم (۱۸۷۳ - ۱۹۳۸) کا یہ مضمون روزانہ خلافت (بمبئی) میں ۲۹ مارچ سے ۱۲ مئی ۱۹۳۲ء تک شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا: "محمد علی کی زندگی کی کہانی، شوکت علی کی زبانی۔" عنوان کے بعد ہر قسط میں حسب ذیل شعر شائع ہوتا تھا:

انھیں افسانۂ غم ڈرتے ڈرتے
سنایا کچھ کہیں سے، کچھ کہیں سے

اس مضمون کی دو خوبیاں ہیں، جن کی وجہ سے اسے یہاں شائع کیا جا رہا ہے، پہلی یہ کہ بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائی کے بارے میں پوری بے تکلفی کے ساتھ لکھا ہے اور وہ باتیں بھی لکھ دی ہیں، جنھیں عموماً ایسی تحریروں میں نہیں لکھا جاتا جن کا مقصد اشاعت ہو۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بعض ایسی معلومات ہیں جن سے عام طور پر لوگ واقف نہیں ہیں۔ افسوس کہ یہ مفید سلسلہ جاری نہ رہ سکا اور مزید افسوس اس کا ہے کہ دو قسطیں بارہ اور تیرہ ہمیں نہ مل سکیں۔ انھیں حاصل کرنے کی کوشش جاری ہے، اگر مل گئیں تو انشاءاللہ انھیں بھی شائع کیا جائے گا۔ ہم جناب محمد ظہیر وارثی (کامیٹی) کے ممنون ہیں جن کی عنایت سے "خلافت" کے وہ شمارے ہمیں حاصل ہوئے جن میں یہ مفید مضمون شائع ہوا ہے۔)

میں مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھ کو ایک مفید مشورہ دیا اور اوس پر عمل کرنا شروع کرتا ہوں۔ جو کچھ تھوڑا بہت میں کر سکتا تھا وہ اسی قسم کے مشوروں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مجھ کو نہ علم کا دعویٰ ہے اور نہ انشا پردازی کا، جو کچھ کہتا ہوں یا لکھتا ہوں وہ دل کی چبھن کی وجہ سے اور غالباً اس وجہ سے دل سے نکلی ہوئی بات دل میں جگہ پیدا کر لیتی ہے۔ میں جو کچھ لکھتا ہوں، حافظہ کے زور اور اول دن سے جو کچھ محمد علی کی نسبت مجھ کو یاد آتا ہے، اوسے سیدھے سادے الفاظ میں قلمبند کرتا ہوں۔ رونے یا یاد کرنے کی بھی فرصت نہیں ہے۔ مرحوم جب کبھی مجھ سے ملتے تھے تو جو کچھ نئے واقعات ہم دونوں پر گذرتے تھے، ہم اون کو بیان کرتے تھے، چنانچہ ایک سفر کے بعد جب ملاقات ہوئی تو مجھ سے کہا: "شوکت! ایک لاجواب شعر سنا ہے، حضرت عاصی غازی پوری کا ہے اور اوس سے زیادہ لطیف نعت میں کوئی شعر مشکل سے ہوگا، نہ کسی کا نام نہ کوئی ذکر، پھر بھی سب کچھ موجود ہے۔" مزہ لے لیکر اوس کو پڑھکر سنایا، خود بھی لطف اٹھایا اور مجھ کو بھی محظوظ کیا، شعر واقعی خوب تھا۔ ؎

صبا تو جا کے یہ کہیو مرے سلام کے بعد
تمھارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

اتفاقاً میں بھی اس کے بعد کسی دورے پر گیا اور کسی جگہ ایک ایسا شعر سنا کہ دل تڑپ گیا، اس کو محنت کر کے یاد کیا اور جب بھائی کی بھائی سے ملاقات ہوئی تو میں نے زور سے کہا کہ: "تو نے کیا شعر سنایا تھا، لے میرا شعر بھی سن لے" یہ تذکرہ یہاں اس وجہ سے کرتا ہوں کہ اوسی شعر پر میرا آج عمل درآمد ہے، مجھ کو کچھ نہیں کرنا آتا مگر ہاں محبت کرنا جانتا ہوں۔ مرحوم بھی بہت خوش ہوا تھا اور قبول کیا تھا کہ میرا شعر واقعی لاجواب ہے۔

نہ تیمم مجھے آتا نہ وضو آتا ہے
سجدہ کر لیتا ہوں جب سامنے تو آتا ہے

برادر عزیز مولانا عبدالماجد کی ہدایت کے مطابق سب حالات لکھتا ہوں، اوس وقت سے جبکہ میں پانچ برس کا تھا اور محمد علی نے دنیا میں قدم رکھا تھا۔

محمد علی ۹ ردسمبر ۱۸۷۸ء کو پیدا ہوا

میری عمر پونے چھ برس کی تھی۔ موسم سردی کا تھا، مگر بہت زیادہ سردی نہ تھی، میں اپنے گھر میں کہیں سے کھیلتا ہوا آیا تھا۔ یہ مکان ہمارا قدیم تھا اور دادا اس میں رہتے تھے۔ چاروں طرف دالان تھا اور اوپر کوٹھے پر چار کمرے تھے اور اون کے ساتھ چھتوں پر چار صحن تھے، جس میں ہمارے دادا کی بہوئیں اور بیٹے رہتے تھے۔ نیچے دادی صاحبہ رہتی تھیں اور تمام گھر بھی نیچے تھا۔ یہ مکان میرے والد کے حصے میں آیا تھا اور اسی میں ہم سب بھائی بہن پیدا ہوئے تھے اور اسی میں بی اماں دلہن بن کر آئی تھیں۔ افسوس یہ مکان اب سب گر گیا ہے، زمین باقی ہے، جس پر خاندان کے بچے ہاکی کھیلتے ہیں[1]۔ یہ زمین محمد علی کے حصے میں آئی تھی مگر اوس پر مکان بنانا اوس غریب کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ جب میں زنانے کے دروازے سے اندر داخل ہو کر صحن میں آیا اور باہر کے دالان میں گیا تو کسی نے مجھ کو خبر دی کہ میرے بھیا پیدا ہوا، اس خبر کو سن کر مجھ کو خوب یاد ہے کہ بچوں کی طرح رالوں کو سٹنا جیسے بچے گھوڑا بن کر دوڑتے ہیں، خوش خوش فوراً ننگے پیر صرف سفید کرتا پاجامہ پہنے باہر بھاگا گیا اور یہ خبر چلا کر سارے تحصیل کو سنائی کہ "میرے بھیّا پیدا ہوا"۔ یہ بات مجھ کو آج بھی ویسی یاد ہے جیسے کہ اُس دن تھی۔ شام کا وقت تھا، جاڑوں کا موسم اور قریب عصر کے، بعد کو بی اماں سے اس قدر معلوم ہوا تھا کہ بقرعید کا مہینہ تھا۔ محمد علی نے بڑی تلاش سے پتہ لگایا تھا

---

[1] مولانا عبدالماجد دریاآبادی صاحب ہی کے مشورے پر "سیرت محمد علی" کی تالیف کا کام مولوی رئیس احمد جعفری صاحب کے سپرد کیا گیا تھا جو اس وقت جامعہ میں زیر تعلیم تھے۔

کرا دس کی پیدائش کی تاریخ ۹ر دسمبر ۱۸۷۸ء تھی۔ جو لوگ جنتری سے پرانی تاریخیں نکال سکتے ہیں، ان سے درخواست ہے کہ وہ مجھے مطلع کریں کہ آیا اس سال بقر عید یعنی عید الاضحیٰ دسمبر میں ہوئی تھی؟ یہ ۱۸۷۸ء کی بات ہے۔[۲] رام پور میں پیدا ہوا تھا اور افسوس مرا وطن سے دور لندن [میں] اور خدا نے مٹی دی حرم محترم بیت المقدس میں۔[۳]

ابتدائی تعلیم

ہم لوگ اپنے دادا کے خاندانی مکان میں رہتے تھے۔ جب محمد علی پیدا ہوا تھا۔ اس کی پیدائش کے دن اس وقت تک کہ اس پرانے مکان کو چھوڑ کر ہم اس نئے محل سرائے میں گئے جو بہت عالیشان ہمارے والد نے شوق سے بنوایا تھا اور نہایت سلیقہ اور خوبصورتی کے ساتھ آراستہ کیا تھا۔ ہمارے والد مرحوم عبدالعلی خاں رام پور شہر میں اپنی خوش مذاقی، مہمان نوازی اور فیاضی کے لیے مشہور تھے۔ مجھے چہرہ اور باتیں تھوڑی تھوڑی یاد ہیں جو ان کے حالات کے سلسلے میں شائع ہو جائیں گے۔ بہترین کھانا پکانا مشہور رکابداروں سے

۲؎۔ اس فرمائش کے جواب میں، خلافت پریس کے منصرم، منشی ممتاز علی آثر دہلوی کی طرف سے، روزنامہ خلافت مورخہ یکم اپریل ۱۹۳۲ء (جمعہ۔ ۲۴ر ذی قعدہ الحرام ۱۳۵۰ھ) میں شائع ہوا ہے کہ: جواباً عرض ہے کہ ۹ر دسمبر ۱۸۷۸ء تاریخ ولادت مولانا محمد علی مندرجہ ذیل تاریخوں سے منطبق ہوتی ہے:
"۱۸۷۸ء مطابق ۱۴ر ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ روز دوشنبہ۔ ۱۵ر اگھن بکرمی"۔ اس تطابق سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی مرحوم و مغفور کی پیدائش عید اضحیٰ کے پانچ روز بعد، ولادت حضور سرور کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دن دوشنبہ کے روز ہوئی۔
مولانا محمد علی نے ۱۷ر جون ۱۹۲۷ء کے "ہمدرد" کے اداریے میں "میری زندگی کے پچاس سال" ۱۵ر ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ — ۱۵ر ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ) کے عنوان کے تحت اپنی تاریخ پیدائش ۱۵ر ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ لکھی ہجری۔ کی تاریخ عیسوی ۱۰ر دسمبر ۱۸۷۸ء ہے اور اسی کے مطابق ہند و پاک میں مولانا کا صد سالہ یوم پیدائش منایا گیا ہے۔

۳؎۔ قسط اول روزنامہ خلافت مورخہ ۲۹ر مارچ ۱۹۳۲ء (جلد ۱۱ نمبر ۷۳) صفحہ ۲

سکھ تھا اور ایک رکابدار ہمیشہ نوکر رہتا تھا اور والد مرحوم کو کھانا پکانا سکھاتا تھا اور ان سے بی اماں بہترین کھانے، علاوہ معمولی کھانے کے پکانا سیکھتی تھیں جو اپنی بیوگی کے زمانے میں ہم بچوں کو پکا پکا کر کھلاتی تھیں۔

اب جو سماں نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ چبوترے کے قریب باہر کے دالان میں نصف اندر اور نصف باہر دو پلنگ پڑے تھے، ایک والد مرحوم کا جن کو ہم سب "میاں بھائی" کہتے تھے اور دوسرا بی اماں کا جن کو ہم سب بچے "بہو" کہتے تھے، اس وجہ سے کہ چونکہ ہمارے دادا کی سب سے چھوٹی بہو تھیں، سب بہو بہو کہہ کر پکارتے تھے اور ہم بھی بہو ہی کہتے تھے۔ "بی اماں" کا نام "بی اماں" تو میرے بیٹوں اور خلافت کے کام کرنے والوں نے رکھا تھا۔ یہ نام حامیانِ خلافت اور عام مسلمانوں کی خواہش کے مطابق رکھا کہ انھوں نے ان کو اماں بنایا اور آج بھی عزت اور محبت کے ساتھ ان کا نام لیتے ہیں۔

غالباً موسم سخت جاڑوں کا نہ تھا مگر سخت گرمی کا بھی نہ تھا۔ ہم کب پرانے مکان سے نئے مکان میں آئے، مجھے ذرا بھی یاد نہیں، اتنا یاد ہے کہ ہم چبوترے کے نیچے صحن میں اپنی پالنے والی اناؤں کے پاس رہتے تھے، اوپر چبوترے پر ایک کونے میں بڑی اکلوتی بہن کا پلنگ تھا، جہاں وہ اپنی پالنے والی کے ہمراہ، جس کو ہم سب "میا" کہتے تھے اور اس کے نام کے ساتھ اس کو لگا کر پکارتے تھے۔

پیدائش کے بعد اب جو حافظہ یاد دلاتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے والد محمد علی کو گود میں لیے پلنگ کی پائینتی کھڑے ہیں۔ اس وقت محمد علی کی عمر کیا تھی، میں نہیں کہہ سکتا، مگر انتقال کے وقت جو کہ یکم اگست ۱۸۸۱ء کو ہوا تھا[1]، حساب لگا کر اب کہہ سکتا ہوں کہ دو سال سات مہینوں

---

[1] عام طور پر مولانا محمد علی کے سوانح نگاروں نے ان کے والد کا عیسوی سنہ وفات ۱۸۸۰ء لکھا ہے۔ ڈاکٹر افضل اقبال نے تاریخ وفات ۲۰ اگست ۱۸۸۰ء لکھی ہے۔ (لائف اینڈ ٹائمز آف محمد علی) اور مولانا محمد علی نے "ہمدرد" کے اداریے: "میری زندگی کے پچاس سال" میں اپنے والد کی وفات کی ہجری تاریخ: ۷ ار رمضان المبارک ۱۲۹۷ھ لکھی ہے جس کی عیسوی تاریخ ۲۴ اگست ۱۸۸۰ء ہوتی ہے۔

کا تھا۔[شہ] والد کا انتقال، بی اماں کے حالات وغیرہ سب موقع پر آئیں گے۔ اب محمد علی حافظے کے پردے سے پھر دور ہو گیا۔ والد کے انتقال کا وقت بھی مجھے یاد نہیں آتا۔ ہاں اتنا معلوم ہے کہ ہم سب نے دوسری عورتوں کا دودھ پیا تھا، بی اماں یہ بھی کہتی تھیں کہ ہمارے والد سب سے محبت کرتے تھے مگر محمد علی سے سب سے زیادہ۔

اب پھر دماغ خالی ہے اور کچھ تھوڑی یاد جو آتی ہے، وہ یہ ہے کہ میرے منجھلے بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب جو اب احمدی ہو گئے ہیں اور جو اپنے چھوٹے بھائیوں کا بہت کچھ خیال کرتے ہیں۔ ان کو بھی سب سے زیادہ محمد علی سے محبت تھی، بلکہ ان کی [؟ کے] شاعرانہ مزاج اور شاعری کا محمد علی پر بہت کچھ اثر تھا۔ ہلکی سی تصویر مجھے نظر آتی ہے کہ محمد علی بھائی کے پاس بیٹھا ہے اور بی اماں نے کوئی عمدہ حلوا وغیرہ پکایا ہے اور سب بچوں کو برابر برابر تقسیم کر دیا ہے۔ میں شاید اس کا تھوڑا اس کا چھین کر کھا گیا ہوں۔ میں اور میری بہن ایک پارٹی میں تھے اور وہ محمد علی کو "منہ پھٹا" کہتی تھی، ہم محمد علی کو نوچ کر چھیڑ کر رلاتے تھے اور وہ بہت جلد ہمارے دق کرنے سے رو دیتا تھا۔ اس موقع پر بھی حلوے کے چھن جانے پر اس نے منہ کھول کھول کر رونا شروع کر دیا اور بی اماں اور بھائی ناراض ہو گئے اور میں سب کا منہ چڑا کر بھاگ گیا۔

بی اماں کہا کرتی تھیں کہ بچپن میں ہی میں بڑا شریر تھا اور جب شرارت کے بعد میں اپنے والد کے پاس بلایا جاتا تھا تو دور سے ہاتھ جوڑ کر، آنکھیں نیچی کر کے، ہونٹ نکال کر بسورتا ہوا آتا تھا اور جب انھوں نے ڈانٹ کر میرے کان پکڑوائے تو میں نے، حکم کی

شہ مولانا محمد علی نے اپنی آپ بیتی میں اپنے والد کی وفات کے وقت اپنی عمر کے بارے میں لکھا ہے کہ: راقم الحروف ابھی دو برس کا نہ تھا۔" ("مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز" مرتبہ پروفیسر محمد سرور، مطبوعہ، جنوری ۱۹۶۲ء، صفحہ ۱۹۲) اور مولانا کی ہجری تاریخ ولادت (۱۰، ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ) کے لحاظ سے یہ بات بالکل صحیح ہے۔

تکمیل کر کے جب رخصت ہوا تو ستون اور پردے کی آڑ میں، بی اماں کے سامنے مگر دالان کی آنکھ بچا کر، بسورتے ہونٹوں سے، منہ چڑانا شروع کیا، ہاتھوں کے اشارے سے ان کی تحقیر کر کے، دل کی بھڑاس نکالی اور پھر بھاگ گیا۔ بچپن میں بی اماں اور گھر کے لوگ مجھ کو "ہبوڑا" کہتے تھے جو کہ ایک جرائم پیشہ قوم باہر سرکنڈوں میں رہتی ہے اور ایسا اوقات چوری اور ڈاکے بھی ڈالتی رہتی ہے۔ مجھے یہ بھی یاد پڑتا ہے کہ اکثر اپنا حصہ کھانے کے بعد محمد علی کے حصے پر چھاپا مارتا تھا اور وہ غریب اکثر منہ پھاڑ کر روتا تھا اور مجھ پر سب ناراض ہوتے تھے، مگر تیزی کے ساتھ اس کو مار کر گھر کے باہر بھاگ جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی خاص بات یاد نہیں ہے۔ کل کو وہ حالات لکھنے شروع کروں گا، جبکہ میں بڑا ہو گیا تھا۔ حافظ خوب کام کرتا تھا اور محمد علی کی تعلیم کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔[۱۶]

محمد علی کی کب بسم اللہ ہوئی۔ کیا رسم ادا کی گئی، مجھے ذرا بھی یاد نہیں۔ کب قرآن شریف ختم کیا اور کب مکتب چھوڑا، مجھے ذرا بھی یاد نہیں، اسکول میں جانے کا سلسلہ جب شروع ہوا تب مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے محمد علی کو رام پور کے اسکول میں دیکھا۔ رام پور میں انگریزی تعلیم کو اس زمانے میں کفر سمجھا جاتا تھا، جب میرے بڑے بھائی اور ہمارے خاندان کے چند نوجوان بریلی کے اسکول میں پڑھنے گئے تو ہمارے بڑے بھائی ہمیں "کرسٹان" کہا کرتے تھے۔ جب نواب کلب علی خاں بہادر کا انتقال ہوا[۱۷] تو رام پور میں انگریزی گردی شروع ہوئی اور (اس کا) پہلا نتیجہ یہ تھا کہ شہر کے ایک رئیس عبداللہ خاں صاحب کا بڑا مکان کرائے پر لیا گیا اور اس کے

---

[۱۶] دوسری قسط، خلافت ممبئی، ۲۷ اپریل ۱۹۳۲ء (جلد ۱۰، نمبر ۹) صفحہ ۲

[۱۷] ۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء

دالانوں میں ٹاٹ وغیرہ لگا کر ابتدائی درجے قائم کئے گئے۔ محمد علی نے قرآن شریف اور مکتب کی تعلیم ختم کرنے کے بعد رام پور کے اس انگریزی اسکول میں نام لکھوایا۔

ہمارے خاندان میں یہ رسم تھی کہ جب لڑکے یا لڑکی کی عمر چار سال چار ماہ اور دس دن کی ہوتی تو اس کی بسم اللہ کی رسم ادا کی جاتی تھی۔ خوبصورت ریشمی کپڑوں کی پھاٹ کا مدار جوتا، کامدار ٹوپی۔ بہت سی مٹھائی، زنانہ و مردانہ جلسہ، ریشم کا کام کیا ہوا قاعدے کا جز دان، چاندی کی تختی، قلم اور دوات غرضیکہ بچے کو ایسی رشوت دیکر تعلیم کی طرف رغبت دلائی جاتی تھی۔ غریب اس بسم اللہ کے اشتیاق میں بے قراری کے ساتھ دن گذارتا تھا اور بسم اللہ کے روز تو ہر طرف سے پیار کیا جاتا تھا اور جتنے خاندان کے بزرگ تھے، وہ عید کے دن کی عیدی کی طرح روپے بھی دیتے تھے، غرضیکہ بڑی خوشی ہوتی تھی، مگر جب دوسرے دن سے روز صبح کو ٹھنڈا گرم، ہر موسم میں سیپارہ بغل میں دبائے مدرسہ جاتا اور وہاں اگر سستی سے کام لیا گیا تو مولوی صاحب نے قمچی سے گرما دیا۔ یہ ایک ایسا تلخ تجربہ ہوتا تھا کہ غریب بچہ بھی سمجھ جاتا تھا کہ رشوت دیکر مجھ کو کس مصیبت میں ڈال دیا۔ بسم اللہ یا درہے نہ اس کا مکتب میں پڑھنا نہ اس کا قرآن شریف ختم کرنا۔

ہمارے خاندان کے سب لڑکے اور اہل محلہ بھی ہمارے کنبے کے دو تین مکتبوں میں پڑھتے تھے۔ ہر ایک کے گھر میں ایک استانی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے مقرر تھی۔ محمد علی کے مکتب کا زمانہ یاد نہیں، غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ میں ۱۸۸۲ء میں اپنے بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں کے ساتھ بریلی اسکول میں دو اور چچا زاد بھائیوں کے ہمراہ داخل ہو گیا تھا اور صرف چھٹیوں میں یا ایک دو مرتبہ اور رام پور جانا ہوتا تھا۔ اس زمانے میں ریل نہ تھی۔ بریلی سے چھیالیس میل ہم لوگ اونٹ گاڑیوں میں جاتے تھے اور دو دن میں یہ سفر پورا کرتے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ محمد علی کے مکتب کی زندگی کا حال

زیادہ معلوم نہیں ہے۔

رام پور اسکول کے ہیڈ ماسٹر علی گڑھ کے اولڈ بوائے اور غالباً علیگڑھ ہی کے رہنے والے عبدالحق نامی تھے اور رام پور کی انگریزی تعلیم کے کولمبس یا داسکوڈی گاما نذیر خاں صاحب تھے جن کا میں بھی شاگرد تھا اور تقریباً ہمارا تمام خاندان۔ ان کو ہم سب "ٹیچر صاحب" کہہ کر پکارتے تھے۔ محمد علی بھی ان ہی سے پرائیویٹ طور پر اور اسکول میں پڑھتا تھا۔ مجھے خوب یاد پڑتا ہے کہ میں نے محمد علی کو اس اسکول میں ایک دو مرتبہ جاکر دیکھا تھا جبکہ میں بریلی اسکول سے چھٹیوں میں واپس آیا۔

اب چوتھا دور شروع ہوتا ہے، جبکہ بی اماں اور ہماری اکلوتی بہن میرے چچازاد بھائی میجر یوسف علی خاں جو مہاراجہ ہلکر کی فوج میں افسر تھے اور جو ہمارے بہنوئی تھے، ان کے پاس ہم سب گئے تھے۔ رام پور کا قافلہ مع محمد علی کے اول چلا گیا تھا مگر میں اسکول کا امتحان دے کر اور اچھے نمبروں سے پاس ہوکر بعد کو جون کے مہینے میں اندور پہنچا۔ اس عرصے میں میں کشتی بھی لڑتا تھا، ورزشیں بھی کرتا تھا، کرکٹ بھی کھیلتا تھا اور اپنے بڑے بھائی کے ہمراہ بریلی اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا۔ اندور کے قیام کا مجھ کو ایک واقعہ خوب یاد آیا ہے۔ بی اماں اگرچہ اپنی اولاد میں سب سے زیادہ ہماری بہن سے محبت کرتی تھیں اور اس کے بعد اور اولاد سے مگر میں کسی گنتی میں نہ تھا۔ شرارت اور مذاق کی وجہ سے مجھے "بھانڈ" کہہ کر پکارتی تھیں اور چونکہ میری بہن مجھ سے از حد محبت کرتی تھیں اور آخر وقت میں ہم دونوں میں بے انتہا محبت، دوستی اور بے تکلفی تھی، اس لحاظ سے میں نے بی اماں کے دل میں گھر کرنا شروع کر دیا تھا اور بعض خانگی امور کی وجہ سے میں ان کا "پہلوان" بن گیا تھا۔

اندور کا موسم گرمیوں میں خوش گوار ہوتا تھا، گرمی بھی کم ہوتی تھی اور راتیں تو

لاجواب تحفیں۔ صبح بنارس، شام اودھ اور شب مالوہ، ہندوستان میں اپنی خوبصورتی کے لحاظ سے ضرب المثل ہیں۔ رمضان آیا اور محمد علی نے پہلا روزہ اندور ہیں رکھا۔ غالباً اس وقت بی اماں کے پاس روپے کی کمی تھی۔ روزہ تو رکھوایا مگر جوڑا نہیں بنوایا۔ محمد علی بچپن ہی سے شاہانہ مزاج رکھتے تھے اور خاص ٹن (ادا) کے آدمی تھے، بہت ناراض ہوئے اور دھمکی دی کہ روزہ توڑ دوں گا۔ جب ان پر منکر نکیر کی طرح دو گھر کے آدمی تعینات کر دیے گئے تو غصے میں انہوں نے ایک اور احتجاج کی صورت نکالی۔

ع طفلی میں بھی ہم کھیل جو کھیلے تو صنم کا

بی اماں کو دھمکی دینے کے لئے اور غالباً ایک طرف کپڑوں کی مایوسی، دوسری طرف بھوک اور پیاس کا زور، انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ مہاراجہ کے عطا کئے ہوئے مکان کے نیچے والی حوضوں میں، جہاں سے عام مخلوق اور خاص کر ہندو پانی بھرتے تھے اور جس مکان میں ہم رہتے تھے، اس کی کھڑکی میں سے کودنے کا ارادہ کیا۔ بی اماں نے مجھے آواز دی تو میں نے دیکھا کہ وہ کھڑکی میں جھکے ہیں اور سب کو کودنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ میں اندور میں خوب کسرت کرتا تھا، قد لانبا ہونا شروع ہوا تھا اور غالباً اندور کے قیام میں چار ماہ کے اندر میرا قد چار پانچ بڑھ گیا تھا۔ میں نے ان کی پیٹھ میں ایک دو گھونسے رسید کئے اور کان پکڑ کر ان کو کھینچ لایا۔ حسب معمول منہ پھاڑ کر رونا شروع کیا تو بی اماں نے گلے لگایا۔ پیار کیا۔ دوپہر کے بارہ بجے سے مٹھائیوں، شامی کباب، تربوز، پھل پھلار، شربت کا سامان شروع کیا اور اس طرح گویا ان کو رضامند کیا گیا اور وعدہ کیا گیا کہ جلد ان کو جوڑا بھی ملے گا اور غالباً کچھ نقدی بھی پیش کی گئی، اس کے بعد روزہ کشائی۔ اور اور باتیں مجھے یاد نہیں۔ پڑھائی کا اندور میں کیا انتظام تھا مجھے یاد نہیں۔

کئی مہینے کے بعد میں بریلی اسکول میں واپس آیا۔ چار پانچ مہینے ضائع ہو چکے تھے۔

مڈل میں داخل ہوا، مگر داخلے سے قبل میرا امتحان لیا گیا تو میں بہت پیچھے تھا مگر کرکٹ کا کھلاڑی ہونے کی وجہ سے انگریز ہیڈ ماسٹر مسٹر بوڈن نامی نے جو بعد کو نواب صاحب مرحوم رام پور کا استاد مقرر ہوا تھا اور پنشن لینے کے بعد بھی رام پور ہی میں رہا تھا، اس نے مجھے داخل کر لیا مگر میرے چار پانچ مضامین فیل ہوگئے۔ اس کے بعد میری ترقی ہونے کی وجہ سے اس کو بہت تعجب ہوا تھا۔ میں نے بھی پوری محنت سے تین ماہ میں ساری کمی کو پورا کر لیا اور اپریل کے مہینے میں مڈل کا امتحان دوسرے درجے میں پاس کیا اور پھر رام پور گیا۔ اب بھی مجھے کوئی خاص بات محمد علی کی یاد نہیں، الا یہ کہ میرے بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں سے اس کی خاص محبت تھی، مگر جب جونا ئی میں میرا مدرسہ کھلا، جہاں میں نے آخری درجے سے لیکر انٹرنس پاس کیا تھا، محمد علی بھی میری نگرانی میں غالباً دس برس کی عمر میں بریلی کے بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہوا۔

محمد علی کا مثانہ کمزور تھا اور رات میں دو تین مرتبہ اٹھانے کی ضرورت پڑتی تھی۔ پہلے یہ کام بی اماں کرتی تھیں اور اب یہ کام میرے سپرد ہوا۔ گود میں اٹھا کر رات کو بورڈنگ کے باہر لے جایا کرتا تھا اور اپنے ہاتھ سے یہ خدمت سرانجام دیتا تھا۔ اگر اس میں کہیں ناغہ ہوتی تو پھر بستر اور پلنگ کی خیر نہ تھی۔ طالب علموں کے پاس بہت سے گدے اور چادریں کہاں ہوتی ہیں، کثیف بستر کا قرب میرے لئے بھی باعث مصیبت ہوتا تھا اور ہمارے خادم کے لئے بھی۔ چونکہ ہم سب کا کھانا پکاتا تھا اور اب اس کو بستر بھی دھونا پڑتا تھا، اس لئے ذرا کوشش سے اور مستعدی کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیا کرتا تھا دو برس محمد علی میری نگرانی میں بریلی رہا۔ پڑھائی میں اچھا تھا لیکن وہ ذہانت ابھی شروع نہیں ہوئی تھی جو بعد کو نمایاں طور پر نظر آئی۔ میں اب عمدہ کرکٹ کھیلنے والا، ٹینس کھیلنے والا، تیرنے والا اور کشتی لڑنے والا ہو گیا تھا۔ پڑھنے میں بس اپنے درجے میں اچھا تھا، یہاں تک انٹرنس میں اول درجے میں پاس ہوا۔

میرے بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں اور ان سے چھوٹے اور مجھ سے بڑے صادق علی کے والد حافظ نوازش علی خاں، یہ دونوں فتحپور اسکول میں پڑھتے تھے، جہاں علی گڑھ کے اولڈ بوائے اور ہمارے بریلی کے استاذ مولوی سخاوت صاحب بی۔ اے، جو بعد کو سہارنپور کے ہیڈ ماسٹر اور اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس ہو گئے، ان کے ساتھ پڑھتے اور رہتے تھے ذوالفقار علی خاں ایک سال اول انٹرنس پاس کر کے علی گڑھ میں داخل ہو گئے تھے۔ وہاں کرکٹ اور فٹ بال میں بھی شریک تھے۔

۱۸۹۰ء میں ہم تین بھائی یعنی حافظ نوازش علی خاں، میں اور محمد علی بھی علی گڑھ میں داخل ہو گئے، یہاں ہماری زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے، جس کے واقعات مجھے بہت یاد ہیں، ان کو میں کل لکھوں گا۔ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"۔ اب علی گڑھ کی قوت دینے والی ہوائیں نمودار ہونے شروع ہوئے اور غالباً بڑے بھائی کی محنت اور شاعرانہ تعلیم نے بھی کچھ رنگ دکھانا شروع کیا اور محمد علی کو ایک ہمدرد مربی مل گیا اور نظام سقہ کی طرح میری بادشاہی ختم ہوئی اور ہم سب بڑے بھائی کی نگرانی میں علی گڑھ میں تعلیم پانے لگے۔[۱]

علی گڑھ کے ابتدائی حالات

۱۸۹۰ء میں، غالباً جولائی کا مہینہ ہوگا، جبکہ مرحوم ہمارے ہمراہ علی گڑھ آیا اور غالباً پرانے فورتھ کلاس میں یعنی مڈل سے نیچے کے درجے میں داخل ہوا جس کو ساتواں درجہ کہتے ہیں یعنی میٹرک سے تین درجے نیچے۔ عمر قریب بارہ برس تھی۔ یہاں چونکہ بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں کی صحبت زیادہ ملی، شاعری کا ذوق بھی زیادہ ہو گیا۔ ہاں یہ لکھنا بھول گیا کہ بچپن میں جبکہ محمد علی بہت چھوٹا تھا تو بھائی کے ہمراہ داغ مرحوم کے یہاں جاتا تھا اور ان کے بعض اشعار جو یاد کیے تھے، ان کو سناتا تھا اور وہ بہت محبت سے اس کو اپنی

---

[۱] تیسری قسط۔ خلافت مورخہ ۲۸ اپریل ۱۹۳۲ء جلد ۱۱ نمبر ۹۸ صفحہ ۶

گود میں بٹھاتے تھے اور اس کے بھولے منہ سے اپنے شعر سن کر محظوظ ہوتے تھے علی گڑھ اسکول میں مسٹر ہورسٹ ہیڈ ماسٹر تھے اور میر ولایت حسین صاحب سکنڈ ماسٹر تھے۔ درجے کے ساتھیوں میں صفدر علی خاں صاحب رام پوری اور غالباً مسٹر احسان الحق اور اور بھی حضرات تھے، جن سے میں حالات معلوم کرنے کی کوشش کروں گا، یہاں آکر پڑھنے میں اپنی قدرتی ذہانت کا مظاہرہ شروع کر دیا اور مجھے خوب یاد ہے کہ یونین کلب میں ایک نظم بھی بڑے زور شور سے سنائی تھی، مگر اس کی تصنیف میں ایک بڑا حصہ بڑے بھائی صاحب کا تھا، یہ اندرونی خبر میں دیتا ہوں، مگر ہمت اتنی تھی کہ یونین کلب کے بڑے جلسے میں، جہاں علی گڑھ کے سب طالب علم ذہین اور شریر موجود تھے، ایک چھوٹے لڑکے کا ہمت کرکے نظم پڑھنا واقعی ایک عجیب اور انوکھی بات تھی۔ مرزا قسیم بیگ چغتائی صاحب جو بعد کو یوپی میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے تھے، اس زمانے میں کالج کے طلبا میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے انھوں نے اس نظم کو سن کر محمد علی کا نام دومساں "(چھوٹا بھتنا) رکھ دیا اور بہت عرصے تک بڑے ہونے کے بعد بھی، اسی نام سے یاد کرتے تھے۔ ہم لوگ کچی بارک میں رہتے تھے اور دو یا تین کمرے ہم چاروں بھائیوں کے پاس تھے جن میں سے ایک کمرے میں میری کسرت کا سامان تھا، وراسی میں ہمارا نوکر رہتا تھا، سامنے نیم کے پیڑ کی باڑ تھی اور اس کے پیچھے یہ کشتی لڑنے کا اکھاڑا تھا۔ محمد علی نے میرے ساتھ تیرنا سیکھا تھا اور کشتی بھی لڑتا تھا۔ ہمارا نوکر بندحسن خاں تھا جس سے سارا ہندوستان اور علی گڑھ واقف ہے اور جو میرے پاس ۳۶ برس رہا، اسی نے مجھے کشتی لڑنا سکھایا، وہی محمد علی کا بھی استاد تھا۔ غالباً چھوٹی ٹیم میں کرکٹ اور فٹ بال بھی کھیلتے تھے۔ ان ابتدائی ورزشوں کے حالات اپنے اپنے موقع پر آئیں گے محمد علی کی وضع عجیب وغریب تھی۔ متانت کی بیماری آخر وقت تک رہی اور بعد میں یہی ذیابطیس کی صورت میں موت کا باعث بھی ہوئی۔ اس کے متعلق بہت سے پرمذاق قصے ہیں جو میں ضرور شائع کروں گا۔ تاکہ سب دوستوں کے سامنے اس کی زندگی کی صحیح تصویر آجائے۔

رنگ کی تھی اگر کرتا پھٹا ہے تو پائجامہ میلا اور خاص وجوہ سے اکثر مجبوراً پاجامہ چٹا ہوتا تھا اور کرتا میلا۔ بیماری برابر جاری رہتی تھی اور ہم جولی مذاق بھی اڑاتے تھے۔ غریب کو خرچ بھی کم ملتا تھا۔ بی اماں مشکل سے باقاعدہ روپیہ بھیج سکتی تھیں، مجھ کو بارہ روپے ماہوار کا وظیفہ ملتا تھا جو رام پور سے روپیہ آتا تھا اس کا زیادہ حصہ میری ریشم کی قمیص، عمدہ فلالین کی پتلون اور عمدہ ربڑ کے تلے کے کرکٹ کے بوٹوں میں صرف ہوتا تھا۔ علی گڑھ کا بانکا نرچھا کپتان تھا اور سب کو انگریزی لباس پہننا عام طور پر کرکٹ کے لباس کے ذریعہ سے میں نے ہی سکھایا تھا۔ محمد علی کو تھوڑا بہت خرچ مل جاتا تھا اور جب کبھی اس نے احتجاج کی ہمت کی اور کچھ کہا تو میرے طاقتور رسیدے ہاتھ نے اس کے جسم سے ملاقات کی اور اس کے گوشت کو مضبوط بنایا اور غریب رو کر رہ گیا۔ یہ اسکول کے زمانے کا حال تھا، لیکن جب اس نے ۱۸۹۴ء میں انٹرنس پاس کر لیا اور فرسٹ ایر میں داخل ہوا تو ساری نے پلٹی بدلی اور محمد علی میری آمدنی میں بڑے حصہ دار ہو گئے۔ فیشن ایبل انگریزی لباس تھا اور ہر ہفتہ مجھ کو محبت کا خط لکھتے تھے اور آخر میں روپوں کی فرمائش۔ کالج کے حالات ذرا دلچسپ ہیں، ان کو تفصیل کے ساتھ کل سے شروع کروں گا۔[۵]

کالج کا حال لکھنے سے بیشتر میں کچھ ضروری واقعات کو دہرا دوں، تاکہ مرحوم کے حالات لکھنے والوں کو آسانی ہو:

۱۔ تاریخ پیدائش: ۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء، عربی مہینہ: بقرعید ذی الحجہ الحرام، مقام: رام پور، ہمارے پرانے خاندانی مکان میں [صحیح تاریخ پیدائش کے بارے میں صفحہ ۱۲ پر حاشیہ ملاحظہ ہو]

۲۔ انگریزی تعلیم رام پور کے مدرسہ میں شروع کی اور گھر پر بھی پرائیوٹ طور پر بھی پڑھا، غالباً ۱۸۸۶ء یا ۱۸۸۷ء میں انگریزی شروع کی۔

---

۵ پانچویں قسط خلافت مورخہ یکم مئی ۱۹۲۳ء (جلد ۱ نمبر ۱۰۱) صفحہ ۲

۳:۔ ۱۸۸۸ء میں جولائی کے قریب میرے ہمراہ اور میری نگرانی میں بریلی ہائی اسکول میں تعلیم شروع کی ہم لوگ بورڈنگ ہاؤس میں سب سے آخر کے نیچے کے حصے والے کمرے میں رہا کرتے تھے۔

۴:۔ جولائی یا اگست ۱۸۹۰ء میں علی گڑھ اسکول میں داخل ہوا اور پرانی کچی بارک کے کمرہ ۲۷، ۳۷ میں ہمارے ساتھ قیام کیا۔ غالباً ۱۸۹۱ء میں ان کمروں سے اٹھ کر نئے کمروں میں چلے گئے۔

۵:۔ ۱۸۹۲ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا اور ۱۸۹۴ء میں انٹرنس کا امتحان بھی الہ آباد یونیورسٹی کا علی گڑھ سے پاس کیا۔

۶:۔ ۱۸۹۶ء میں ایف اے کا امتحان پاس کیا۔

۷:۔ ۱۸۹۸ء میں الہ آباد یونیورسٹی کا بی اے پاس کیا اور یونیورسٹی میں سب سے اول رہا اور اسی سال جون کے مہینے میں میں نے انگلستان آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم کے لئے بھیجا۔

محمد علی جب میری نگرانی میں آیا تو مجھ سے بے انتہا ڈرتا تھا اور میں اس کی شاعرانہ طبیعت اور تھوڑی عمر میں ذہانت کے ثبوت دینے سے ناراض ہوتا تھا اور بالکل اس سے کوئی ہمدردی نہیں کرتا تھا اور موقع بہ موقع خوب اس کو ٹھونکتا تھا۔ اس غریب کا جیب خرچ بھی اپنی قمیصوں اور کرکٹ کے کپڑوں پر صرف کر دیتا تھا۔

یہ حالت ۱۸۹۲ء تک رہی اور اس کے بعد ۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۴ء تک اس کی تھوڑی بہت حالت سنبھلی اور کپڑوں کی طرف سے وہ ذرا خوش حال ہوا اور غالباً مٹھائی کی بیماری میں بھی قدرے کمی واقع ہوئی۔ کرکٹ بھی کھیلتا تھا، قواعد بھی کرتا تھا، شرارت میں بھی اچھا درجہ تھا، چنانچہ محمد علی کے خاص دوستوں میں مسٹر احسان الحق تھے جو کہ اب ڈھائی ہزار روپیہ ماہوار پر ضلع اٹک میں سشن جج کر رہے ہیں اور سنا ہے کہ پنشن لے کر علیگڑھ کے لڑکوں کو کرکٹ سکھانے کے لئے علی گڑھ ہی میں قیام کرنے

والے ہیں۔ محمد علی سے روز لڑائی بھی رہتی تھی اور دوستی بھی۔ ایک دوپہر کے وقت احسان صاحب روتے ہوئے آئے اور مجھے سوتے سے جگا کر انہوں نے اپنا ہاتھ دکھایا جس میں سے خون بہہ رہا تھا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ دونوں دھوپ میں کچی بارک کے سامنے کرکٹ کھیل رہے تھے احسان بہت اچھا کھیلتا تھا، محمد علی نے کھیلنے میں بے ایمانی کی، احسان نے آؤٹ نہ ہونے کی قسم کھالی تھی، محمد علی نے وکٹ لیکر اس زور سے ہاتھ پر مارا کہ ڈیڑھ دو انچ لمبا زخم ہو گیا اور احسان مجبوراً آؤٹ ہو گئے اور پھر مجھے امپائر بنا کر اپیل کی۔ میں نے محمد علی کی تلاش شروع کی اور احسان کو پیار کر کے تسلی دی۔ محمد علی باوجود تمام تلاش کے دن بھر نہیں ملا، شام کو دوستوں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ فرانسیسی جرنیل پیرو کے باغ کی کوٹھی میں جس کو صاحب باغ کہتے ہیں، پناہ لی تھی اور اب دوستوں کی سفارش سے معافی کے طلب گار ہیں۔ تعجب تو یہ ہے کہ سفارش کرنے والوں میں جہاں بہت سے میرے دوست تھے وہاں احسان بھی زخمی ہاتھ پر پٹی باندھے اور ہاتھ گلے میں لٹکائے ہوئے محمد علی کی سفارش کو موجود تھے میں نے سب کی سفارش قبول کی، مگر تین چار چانٹے مذاق کے طور پر رسید کر دئے، جن سے اس کا چہرہ اور کان ضرور جھنجھناتے ہوں گے۔

احسان کرکٹ کے مداحوں میں تھے اور جب وہ انگلستان بیرسٹری کی تعلیم پانے گئے تو وکٹوریہ اسٹیشن پر محمد علی نے ان کا خیر مقدم کیا تھا اور ان کے سر سے ہندوستان کے بنے ہوئے انگریزی کپڑے اتروا کر انسان بنایا تھا۔

کالج میں محمد علی کی پڑھائی بہت اچھی تھی۔ ایف۔ اے آسانی کے ساتھ پاس کر لیا اور بی۔ اے میں تو یونیورسٹی میں اول آئے اور اقبال گولڈ میڈل حاصل کیا۔ مجھے اس کا الہ آباد سے امتحان دیکر واپس آنا خوب یاد ہے میں ان دونوں اوپیم ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ کلکٹر تھا اور ضلع رائے بریلی کے ڈیمٹو مقام پر افیون کی تول کا سامان

کر رہا تھا۔ یہ جگہ گنگا کے کنارے پر واقع تھی اور اس کو عبور کرکے فتحپور ہسوا صرف چودہ میل تھا۔ اس لئے میں نے آدمی اور سواری فتحپور اسٹیشن پر بھیجدی تھی جو الہ آباد سے قریب تھا اور وہاں سے وہ سید ھا میرے پاس آیا۔ جو کچھ میں نے چار برس محمد علی کا حق کاٹ کے اس کی جیب خرچ میں سے کھایا تھا، ۱۸۹۳ء سے لیکر ۱۸۹۶ء تک ان حضرت نے سود در سود کے حساب سے سینہ ادر یہودی کو مات کرکے مجھ سے اتنا وصول کر لیا کہ شاید کسی بنیے اور یہودی نے بھی اتنا وصول نہیں کیا ہوگا۔

اب محمد علی ٹھاٹھ باٹھ والے تھے۔ لباس کیا اچکن کیا اور کیا انگریزی کپڑے، بہت شان کے تھے، یہاں تک کہ میں بھی ان کی قدر کرتا تھا اور اس عرصے میں بہت محبت بھی ہوگئی تھی۔ ہر خط کی ابتدا پیار اور محبت سے ہوتی تھی۔ تعلیم میں ترقی کی وعدے کرتے تھے، بڑی اونچی اونچی لن ترانیاں کرتے تھے۔ شاعری کو بھی کام میں لاتے، انگریزی کے جوہر دکھاتے اور اس کے ذریعے میرے سخت دل کو موم کرکے روپے اور اور روپے کی فرمائش ہوتی تھی۔ ہل من مزید ہل من مزید کے نعرے میں کمی نہیں ہوتی تھی۔ میں دل میں پشیمان ہوتا تھا کہ میں نے کیوں اس کا جیب خرچ کھایا کہ آج اس کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔ کسی استاد کا برا اشعر کیا خوب ہے۔ ؎

گل چمن میں چار کلیاں چن کے محرم بن گیا
آج صحرا میں مرا ہر خار دامن گیر ہے

تھوڑے بہت کرکٹ کے قصے اور پرانی داستانیں یاد آتی جاتی ہیں اپنے حافظہ پر زور دے رہا ہوں اور ان شاء اللہ کل مزید حالات لکھونگا[لہ]

میرے کالج چھوڑنے کے بعد جب محمد علی فرسٹ ایر میں آگیا تو اس کی زندگی میں بڑا فرق پیدا ہو گیا، کرکٹ بھی کھیلنا شروع کیا، اور کھیلوں میں بھی حصہ لیا اور یونین کلب کے مباحثوں میں

[لہ] چھٹی قسط۔ خلافت مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۲۳ء (جلد ۱، نمبر ۳۱) صفحہ ۳

بھی شریک ہونے لگا۔ اب تک اسکول میں رہنے کی وجہ سے دائرہ محدود تھا، اب عمر بھی بڑھ گئی تھی اور میں ڈرانے دھمکانے والا بھی نہیں رہا تھا، جیب خرچ بھی پہلے سے بہت اچھا ملتا تھا، کچھ بی اماں سے لیتا تھا، کچھ بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب سے اور تعلیم فیس وغیرہ اور دیگر اخراجات میرے ذمے تھے، مجھے معلوم نہیں کس سنہ میں یونین کیبنیٹ میں شریک ہوا اور کب کالج کی کرکٹ کی سیکنڈ الیون میں، بعد کو وہ فرسٹ الیون کے قریب آگیا تھا، مگر مجھے معلوم نہیں کہ باقاعدہ طور پر فرسٹ الیون کا ممبر ہوا تھا یا نہیں۔ دوپہر کو جب میں سو جاتا تھا تو یہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ علی گڑھ کی گرمی میں دھوپ میں فٹ بال اور کرکٹ کھیلتے تھے جس سے ان کی نکسیر پھوٹ جایا کرتی تھی اور رفتہ رفتہ اس وجہ سے نگاہ بھی کمزور ہوگئی اور اس کو عینک لگانے کی ضرورت پڑی، اس وجہ سے قدرتاً کرکٹ اور ٹینس میں وہ زیادہ مہارت حاصل نہ کرسکا جو نگاہ کے اچھا ہونے کی حالت میں کرتا۔ کشتی رام پور اور علی گڑھ میں میرے ہی زمانے میں شروع کردی تھی اور تیرنے میں تو کافی مہارت تھی۔ جب بی۔ اے کے امتحان کا وقت آیا تو میں نے اس سے وعدہ کیا کہ اگر وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس کرے گا تو ضرور اس کو انگلستان سول سروس کے لئے بھیجدوں گا، روپیہ کہیں سے لاؤں گا۔ چنانچہ اس نے محنت کی اور یونیورسٹی میں اول آیا اور میں اس کو لے کر رام پور گیا اور نواب صاحب رام پور سے، جو مجھ سے بہت محبت کرتے تھے، دس ہزار روپیہ اپنی ضمانت پر قرض لیا اور ہزار روپیہ سالانہ کی قسط ادائی کا وعدہ کیا۔ دس ہزار روپیہ دے کر اسے آکسفورڈ ڈگری اور سول سروس کے امتحان کے لئے بھیجدیا۔ غالباً وہ ۸ جون ۱۸۹۸ء کو پی اینڈ او کمپنی کے جہاز سے بمبئی سے لندن روانہ ہوا۔ میں اس زمانے میں رائے بریلی اودھ میں اسسٹنٹ کلکٹر تھا اور میری تنخواہ ۰۔۱۲۔۳۴۳ ماہوار تھی اور سال میں تو مہینے نوے روپیہ مہینے بھتہ ملتا تھا۔ سارے خاندان کا بوجھ تھا مگر ہمت مرداں مدد خدا۔ مجھے خوب یاد ہے

کہ گاڑی راستے بریلی سے رات کو چھوٹتی تھی، بی اماں اور میری مرحومہ اہلیہ برقعہ پہنے ہوئے اسٹیشن پر اسے پہنچانے گئی تھیں، میں بھی ہمراہ تھا۔ بی اماں نے گلے لگایا تھا اور صرف یہ نصیحت کی تھی کہ: "بیٹا اسلام اور خاندان کی عزت کو دھبہ نہ لگانا، جاؤ خدا حافظ"
ہم تینوں کا دل بھرا ہوا تھا، آنکھوں میں آنسو تھے، مگر خوشی بھی تھی کہ جس کام کا ارادہ کیا تھا، خدا نے اس کا سامان کر دیا۔ خدا کے سپرد کرکے اس کو چار پانچ برس کیلئے اجنبی ملک کو روانہ کر دیا۔

محمد علی، مجھے خوب یاد ہے، سیکنڈ کلاس کے کمرے کے دروازے میں کھڑا تھا اور بھرائی ہوئی آواز سے ہم کو خدا حافظ کہتا تھا۔ گاڑی چلدی اور ہم بادل ناخواستہ اپنے بنگلے کو واپس آئے۔

محمد علی کے پاس پرانے انگریزی کپڑے علی گڑھ کے موجود تھے اور ہم سب نے یہی مشورہ دیا تھا کہ تم انگلستان جاکر نئے کپڑے بنوانا۔ بمبئی میں دو تین روز ٹھہرا تھا اور غالباً کوئی ہوٹل تھا وکٹوریہ اسٹیشن کے قریب جس کا نام یاد نہیں۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ شکریے کے ساتھ ایک انگریز دوست مسٹر برسی اوڈہم کا ذکر بھی کروں جو رائے بریلی میں ڈپٹی کمشنر تھے اور خود بھی آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے تھے اور میرے بہت عزیز دوست تھے اور اب بھی کینیا سے مجھ کو برابر خط لکھا کرتے ہیں۔ یوپی میں کمشنر کے درجے سے ریٹائر ہوئے، بڑے مشہور شیر کے شکاری تھے، مرزا پور اور کمایوں میں دوسو سے زاید شیر شکار کیے ہوں گے۔ انہوں نے محمد علی کو آکسفورڈ کے متعلق بہت مفید مشورے دیے تھے اور یہاں تک محبت کا ثبوت دیا کہ جب وہ انگلستان رخصت پر گئے تو محمد علی سے ملنے کی خاطر آکسفورڈ گئے۔

محمد علی کے پرانے خطوط میرے پاس کہیں نہ کہیں پڑے ہیں، نظر بندی اور سیاسی کشمکش میں مرحوم بیگم صاحبہ کے انتقال سے میرا تمام گھر کا سامان درہم برہم ہو گیا، خدا معلوم کہاں

کہاں میرا اسباب اور فرنیچر وغیرہ تتر بتر پڑے ہیں میں خطوط ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا، کیونکہ یہ خطوط بہت دلچسپ ہیں اور ان کے ذریعہ محمد علی کی روز افزوں ترقی کا حال معلوم ہوگا اور اس کی زندگی کے حالات لکھنے والوں کو بہت کچھ مواد مل جاتے گا۔[۱۲]

لندن پہنچکر مسٹر[۱۳] تھیوڈور بک کو [جو] علی گڑھ کے پرنسپل تھے اور ان کی چھوٹی بہن مس جے سی بک جو اب نمبر ۲۱ کرامیویل روڈ کے ہندوستانی طلبہ کے مکان کی منتظمہ ہیں، وہ اس کو اسٹیشن سے اپنے ہمراہ لے گئیں اور اس وقت تک اپنے مکان میں رکھا جب تک اس کی رہائش کا مناسب انتظام نہ ہو گیا۔ ان ہی کے خاندان کے مشورہ سے اس نے اپنے لئے کپڑے بنوائے اور اپنی تصویر مجھ کو بھیجی جو آج تک میرے پاس موجود ہے اور جس کو بہت ہی عزیز رکھتا ہوں۔[۱۴]

تقریباً ۱۸۹۵ء میں علی گڑھ چھوڑنے کے بعد، محمد علی میرے عزیز دوست اور کرکٹ کی کپتانی میں میرے جانشین، کے۔ ایم عبداللہ مرحوم کے ساتھ رہتے تھے، ان کے دونوں بھائی مسٹر اکرام بھوپال میں سپرنٹنڈنٹ پولیس ہیں اور دوسرے چھوٹے بھائی مسٹر اسلم مدراس میں سپرنٹنڈنٹ ڈاکخانہ جات ہیں۔ یہ سب علی گڑھ میں اکٹھے رہتے تھے اور محمد علی کی زندگی پر عبداللہ مرحوم کی صحبت کا اثر بھی پڑا تھا۔ اس زمانے میں مرحوم چچا (ضیاء اللہ خاں) رام پور جے پور کے بڑے مشہور کریکٹر (کرکٹ کے کھلاڑی) بھی کالج میں تھے اور محمد علی سے اپنے چھوٹے عزیزوں کا سا برتاؤ کرتے تھے سید سجاد حیدر[۱۵] سے مرحوم کی بہت دوستی تھی اور آخر وقت تک یہ دوستی قائم رہی۔

---

[۱۳] - غالباً یہ دلچسپ اور مفید خطوط نہیں ملے، کیونکہ اب تک شائع نہیں ہوئے ہیں [۱۳] ستمبر ۱۸۹۸ء

[۱۴] - ساتویں قسط۔ خلافت مورخہ ۵ رمئی ۱۹۳۲ء (جلد ۱۱ نمبر ۳۱) صفحہ ۹

[۱۵] - سید سجاد یلدرم - پیدائش :- ۱۸۸۰ء بمقام نہٹور (ضلع بجنور) وفات: ۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء بمقام لکھنؤ بوقت ۲ بجے شب :

دونوں میں ادبیت مشترک تھی۔ لندن پہونچ کر تھوڑے دنوں مسٹر بک کے یہاں قیام کیا اور بعد کو لندن میں ایک یہودی مسٹر اور مسز ہائیمس[۱۶] کے ساتھ دو گنی فی ہفتہ ادا کرکے رہنے لگے۔ نمبر ۸۲ برانڈسبری ولا کلبرن[۱۷] میں رہتے تھے اور جب آکسفورڈ میں داخل ہوئے تو بھی لندن کے قیام کے زمانے میں وہیں رہتے تھے۔ فضل حسین[۱۸]، جو اب سر میاں فضل حسین ہیں اور وائسرائے کی کونسل کے ممبر ہیں، وہ بھی اس مکان میں ان کے ہمراہ رہتے تھے[۱۹]۔

میں نے جب آکسفورڈ بھیجے کا ارادہ کیا اور اس لحاظ سے کہ وہ سول سروس کے امتحان کے لئے پوری کوشش کریں تو بعد میں شامل ہونے سے منع کیا۔ میرا خیال تھا کہ آکسفورڈ کی ڈگری اور سول سروس کے داخلے کے امتحان میں اسے ضرور کامیاب ہونا چاہیئے۔ نہایت اچھا قانونی دماغ تھا اور غالباً بہت ہی کامیاب بیرسٹر ہوتا۔ مگر اس پیشے سے نفرت تھی۔ بعد کو ہم دونوں کو اپنی غلطی پر پشیمانی ہوئی۔ محمد علی کی قسمت میں نہ سول سرونٹ ہونا لکھا تھا اور نہ بیرسٹر ہونا۔ اسلام کا سچا اور بہادر خادم ہونے کی عزت اس کے لئے مخصوص تھی اور افلاس بھی جو کام کرنے والوں کا حصہ ہے، ان کے لئے مخصوص تھا۔

جب محمد علی نے سول سروس کے مشہور کوچ یعنی استاد وین ربن اینڈ گرنی سے ملاقات کی

---

[۱۶] Hyams   [۱۷] 82, Brondsburry Villas Kilburn

[۱۸] پیدائش: ۱۴؍جون ۱۸۷۷ء بمقام پشاور، وفات: ۹؍جولائی ۱۹۳۶ء بمقام لاہور

[۱۹] فضل حسین باقاعدگی کے ساتھ ڈائری لکھا کرتے تھے۔ اپنی اس ڈائری میں محمد علی کا مختلف تاریخوں میں ذکر کیا ہے۔ ۲۱؍ستمبر ۱۸۹۸ء کو جب پہلی مرتبہ وہاں ملاقات ہوئی تو لکھا: مرد معزز ہے، علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور رامپور کے رہنے والے۔ ۲۴؍ستمبر کو لکھا، شام کو محمد علی اپنے دو دوستوں اور میرے ساتھ مس بک کے یہاں کھانے کے لئے گئے، ہم سب ڈنر سوٹ میں تھے، محمد علی پہلے سے اس خاندان کے ساتھ بے تکلف تھے مگر ہم لوگ نئے تھے۔ مولانا شوکت علی نے ساتویں قسط کے آخر میں مولانا محمد علی کی ایک تصویر کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں فضل حسین نے ۸؍اکتوبر کو لکھا ہے۔ محمد علی نے تصویر کھنچوانے کے لئے مجھ سے بار بار اپنے ساتھ چلنے کے لئے اصرار کیا، مگر میں نے طے کر لیا تھا کہ کوئی تصویر نہیں کھنچواؤں گا، اس لئے معذرت کرلی، لیکن ان کا اصرار جاری رہا، نامناسب جملے بازی بھی کی، فحش مذاق بھی کئے۔ ۱۰؍اکتوبر کو لکھا ہے: آکسفورڈ کی روانگی کے موقع پر محمد علی کو ایک الوداعی پارٹی دی گئی، سعد الظفر اور عبد الواحد نے تقریریں کیں۔ گانے بھی گائے گئے۔ وقت بہت اچھا گذرا۔ ۱۱؍اکتوبر کو محمد علی کو رخصت کرنے کے لئے فضل حسین پیڈنگٹن ریلوے اسٹیشن گئے۔ اس تاریخ کی ڈائری میں محمد علی کے بارے میں لکھا ہے: بہت دلچسپ آدمی ہیں، دوستی پیدا کرنے میں ملکہ رکھتے ہیں مگر ان میں گہرائی نہیں ہے۔

اور ان سے اپنے آکسفورڈ جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ جہاں یہ انتظام کیا گیا تھا کہ لوگوں کو خاص کورس یعنی جو امتحان کے لیے مضمون پڑھاتے تھے، ان سے طالب علموں کو سبکدوش کیا جائے تو رین نے مجھ کو ایک بہت تلخ خط لکھا تھا کہ آکسفورڈ بھیجنا ہے تو بھیجو، کھیل تماشے کی اچھی جگہ ہے، پڑھنے سے کچھ کام نہیں ہے، مگر بعد کو محمد علی دونوں جگہ سے مستفید ہوتے تھے، یعنی آکسفورڈ میں ڈگری کے لیے پڑھتے تھے اور چھٹیوں میں رین اینڈ گرنی کے ساتھ امتحان پاس کرنے کے لئے ان کے تجربوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ یہ مشہور سول سروس سکھانے والوں کا چھوٹا مدرسہ تھا جس میں امتحان پاس کرنے کے لیے لوگوں کو تعلیم دی جاتی تھی جن کو کریمر کے نام سے یعنی امتحان پاس کرنے کے لیے علم کو امیدواروں کے گلے میں "ٹھونستے تھے"۔ اس زمانے میں ہر ہفتہ محمد علی کے پاس سے بہت دلچسپ خطوط آتے تھے، میں ان کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پتہ لگاؤں گا اور سب کو ڈاکٹر ذاکر حسین[۵۰] کی خدمت میں دہلی بھیجدوں گا، تاکہ وہ ان سے کام لے سکیں۔ کیونکہ کلبرن جہاں مرحوم رہتا تھا، ہمپٹڈ کے قریب تھا جہاں ہمپٹڈ کی مشہور کرکٹ کی کلب تھی۔ محمد علی وہاں کرکٹ کھیلتے تھے اور انگلستان کا مشہور کھیلنے والا، اے۔ ای۔ اسٹاڈرٹ ان سے خاص محبت کرتا تھا اور مرحوم وہاں بلیزر (رنگت کا کوٹ) خاص وقت پہنتے تھے اور غالباً آخر وقت تک ان کے پاس رہا۔

سول سروس کے لیے مولوی محمد برکت اللہ بھوپالی سے عربی سیکھتے تھے اور لیٹن یعنی لاطینی زبان ایک جرمن نوجوان، پرنسٹن نامی سے سیکھتے تھے۔ اس کے پڑھنے میں انکو بڑی زحمت ہوئی۔ وقت بھی ضائع ہوا اور روپیہ بھی۔ سول سروس کے امتحان میں ان کو عربی میں بہت کم نمبر دیے گئے تھے، فضل حسین، جن کی عربی محمد علی سے اچھی تھی، ان کو بھی زیادہ نمبر نہیں ملے۔ مقابلے کے امتحان میں ریاضی اور سائنس بہت کامیاب ثابت ہوتی ہیں، دونوں سول سروس کے امتحان میں کافی نمبر حاصل نہ کرسکے اور آخر سال تو محمد علی کو اگر سو نمبر اور مل جاتے تو وہ سول سروس میں

---

[۵۰] پیدائش ۸ ر فروری ۱۸۹۷ء بمقام حیدرآباد۔ وفات: ۳ ر مئی ۱۹۶۹ء بمقام نئی دہلی۔ اسوقت شیخ الجامعہ تھے

ہندوستان آجاتے۔ اس وقت تو ہمیں صدمہ تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ سول سروس کی لعنت سے بچ گئے اور اسلام کی خدمت کرتے ہوئے دنیا سے اٹھ گئے۔[۵۲]

محمد علی جون ۱۸۹۸ء میں انگلستان گئے اور تھوڑے دنوں کے بعد ہی لنکن کالج آکسفورڈ میں داخل ہوگئے۔ آکسفورڈ کی ڈگری حاصل کرنے اور سول سروس کے امتحان میں پاس ہوکر اس میں داخل ہونے کا ارادہ تھا۔ تاریخ، انگریزی۔ اکانومی اور عربی یہ خاص مضامین تھے اور آکسفورڈ میں ہسٹاریکل ٹرائی پاس لینے کا ارادہ تھا، چھٹیوں میں لندن آکر رین اسڈگر لی کے یہاں پڑھتے تھے اور مسٹر اور مسز ہائمس کے یہاں قیام اس وجہ سے کرتے تھے کہ وہاں گوشت یہودیوں کا ذبح کیا ہوا ملتا تھا۔ محمد علی نے آکسفورڈ، لندن میں بھی ترکی ٹوپی اوڑھی اور رمضان شریف کے پورے روزے رکھے تھے، نماز بھی پڑھتے تھے مگر گنڈے دار۔

آکسفورڈ میں کرکیٹ کھیلنا جاری رکھا تھا اور دریا پر کشتیاں کھینا بھی سیکھا تھا ہاکی اور فٹ بال بھی کھیلتے تھے۔ ہندوستانی خاص دوستوں کے ساتھ ایک سوسائٹی بھی قائم کی تھی جس کا نام اکبر کے نورتن درباریوں کی مناسبت سے "نورتن" رکھا تھا اور اس کا ایک خاص کلب بھی رکھا تھا، کھانے کے کپڑے بھی خاص وضع کے تھے، جلسے بھی کرتے تھے، عام لوگوں کو اس میں شرکت کی اجازت نہ تھی، صرف خاص خاص احباب شریک کئے گئے تھے۔ لنکن کالج میں ہمارے رامپور کے صاحبزادے عبدالواحد خاں، صاحبزادہ عبدالصمد خاں کے بڑے بھائی محمد علی کے ساتھ تھے۔ عبدالواحد خاں، اجمیر مواڑ میں سشن جج ہیں طالب علمی کے زمانے میں بہت آزاد خیال تھے اور اب بہت پکے اور راسخ العقیدہ مسلمان سختی کے ساتھ صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں۔ نہایت قابل اور شریف اور بہت با مذاق تھے۔ محمد علی اور ان میں پھبتی بازی ہوتی رہتی تھی اور بعد میں بھی جب کبھی مل جاتے تھے تو پھر وہی چھیڑ خانی اور مذاق ہوا کرتا تھا۔

---

[۵۲] آٹھویں قسط علامت مورخہ ۶ مئی ۱۹۳۲ء (جلد ۸ نمبر ۱۰۵) صفحہ ۶

جب مولانا سروس کے آخری امتحان میں سو نمبروں کی کمی رہ گئی تو مجھے بہت رنج ہوا تھا مگر بی اماں نے ہمت افزائی کا تار دیا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں ہم سب کے مشورہ سے ان کو ہندوستان بلا یا گیا اور ۱۲ دسمبر ۱۹۰۱ء کو وہ ہندوستان پہنچ گئے، خوب تندرست اور طاقت در تھے اور جو موٹاپا بعد کو آیا وہ اس وقت موجود نہ تھا۔ جب لکھنؤ اسٹیشن پر اول مرتبہ میں نے ان کو دیکھا تو انگریزی کپڑوں کے ساتھ ترکی ٹوپی اوڑھے تھے، قریب شام کے چھ بجے ہم رام پور پہنچے۔

منگنی اور شادی

ابتدا میں محمد علی کی منگنی اسی جگہ ہوئی جہاں بعد کو شادی ہوئی، یعنی ہمارے چچا زاد بھائی کی چچا زاد بہن کی لڑکی امجدی بانو سے۔ محمد عظمت خاں صاحب ہمارے بڑے چچا اصغر علی خاں صاحب کے منجھلے بیٹے تھے، نہایت خوب صورت اور قابل جوان تھے۔ اندور کی ریاست میں سر صوبہ اور دیگر بڑے عہدوں پر اپنے انتقال کے وقت تک نوکر تھے اور اندور ہی میں دفن ہوئے ہیں ان کی تین اولادیں تھیں، جن میں سب سے بڑے معظم علی خاں بی اے آکسن بیرسٹر ایٹ لا ہیں جو کہ رام پور ہائی کورٹ میں آجکل چیف جج ہیں اور جمعیۃ خلافت میں بھی ترک موالات کے زمانے میں چار برس کام کر چکے تھے اور بعد کو اندور میں پبلک پراسیکیوٹر تھے اور اب رام پور وطن میں ہیں۔ ان سے چھوٹی امجدی بانو تھیں جس سے محمد علی کی منگنی ہوئی تھی اور بعد کو بعض خانگی وجوہات سے وہ چھوٹ گئی تھی اور ان کے چچا زاد بھائی سے منگنی ہوگئی مگر ان کے انتقال کے بعد امجدی بانو اسی کی قسمت میں آئیں جس کے ساتھ انکو عمر کا بہت بڑا حصہ گذارنا تھا اور جنھوں نے حق رفاقت لندن کی بیماری تک میں ادا کیا اور بعد کو اپنے عزیز شوہر کی میت کے ہمراہ آکر قدس شریف میں اپنے سامنے دفن کرایا دونوں کو ایک دوسرے سے بیحد محبت تھی اور امجدی بانو اپنے شوہر کے اسلامی اور سیاسی کاموں میں نمایاں حصہ لیتی تھیں اور خود بہترین تنظیمی و تعمیری کام کرنے والی ہیں۔ تقریر بھی بہت اچھی کرتی ہیں، حساب و کتاب اور ادارکنا نہ کرنے کا خاص مادہ ہے جس عمدگی سے انہوں نے مرحوم کے کاغذات کو

ترتیب دیکر اور سنبھال کر رکھا ہے، وہ ان ہی کا حصہ تھا محمد علی کی زندگی کے حالات لکھنے والوں کو ان کاغذات سے بہت کچھ مدد ملے گی،

سب سے چھوٹا بھائی مشتاق علی تھا جس نے عین جوانی میں انتقال کیا اور ہونہار زندگی کا خاتمہ کر دیا دوسری والدہ سے عظمت علی خاں صاحب کے دو لڑکے اور ہیں، مسعود علی جو ریاست اندور میں ریونیو افسر ہیں اور دوسرے چھوٹے مظفر علی خاں جو وی آنا میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

امجد بانو کی تعلیم کے لئے میں نے علیحدہ مدرسہ بھی قائم کر دیا تھا جس میں انہوں نے ابتدائی تعلیم جو پہلے ہو چکی تھی، اس کو اور مکمل کیا۔ یہاں تک کہ فروری کے مہینے میں (غالباً ۵ر فروری ۱۹۰۲ء کو) نکاح کی رسم رام پور میں ادا ہوئی تھی کسی قسم کا ناچ رنگ نہ تھا اور نہ کوئی رسم ادا کی گئی، دعوت ولیمہ میں نے ہی دی تھی اور ایک گارڈن پارٹی بھی جس میں ہز ہائینس نواب صاحب تشریف لائے تھے اور شہر کے تمام رؤسا بھی۔

محمد علی کے رام پور آتے ہی ہز ہائینس نواب صاحب مرحوم نواب سر حامد علی خاںؒ صاحب بہادر نے ان کو افسر تعلیم مقرر کیا رام پور ہائی اسکول کا پرنسپل بھی، تین سو روپیہ ماہوار تنخواہ ابتداء میں دی تھی۔ دیرینہ مراسم اور تعلقات کی وجہ سے تنخواہ کے مسئلے میں میں نے کوئی نفاق (؟ اختلاف) کرنا مناسب نہ سمجھا۔[۲۴]

شادی کے ڈیڑھ ماہ بعد بی اے آکسفورڈ کی ڈگری کا امتحان دینے کے لئے محمد علی واپس لندن گئے اور وہاں ۲۸ر جولائی ۱۹۰۲ء کو امتحان پاس کرنے کے بعد رام پور واپس آئے اور ایک افسر تعلیم کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دینے لگے۔[۲۵]

محمد علی کو رام پور کی ملازمت راس نہ آئی۔ دنیا کا تجربہ ابھی نہ تھا، مگر پھر بھی قابلیت اور ذہانت موجود تھی۔ خاندانی اثر بھی تھا اور اول دن سے محمد علی میں اخلاقی جرأت کافی تھی اس لئے ان کو دق کرنے کیلئے بہت سی سازشیں کھڑی کر دی گئیں۔

آکسفورڈ میں اس زمانے میں ہز ہائینس نواب صاحب مرحوم کے چھوٹے بھائی ناصر علی بھی

۲۴۔ اس سلسلہ میں نواب صاحب کا فرمان جامعہ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۷۹ء میں شائع کیا جا چکا ہے

۲۵۔ نویں قسط، خلافت مورخہ ۷ر مئی ۱۹۳۲ء (جلد نمبر ۱۰۶) صفحہ ۶

پڑھتے تھے محمد علی سے بھی ان کی ملاقات تھی، اس لحاظ سے رام پور کے والی ملک کے بیٹے تھے، محمد علی نے قدرتی طور پر زیادہ خیال بھی کیا تھا مگر وہ صرف ہز ہائینس نواب حامد علی خاں صاحب مرحوم کی وجہ سے، جن سے ہم دونوں کو محبت تھی اور جو مجھ پر خاص طور سے عنایت فرماتے تھے اور مجھ سے محبت کرتے تھے میں ان سے عمر میں دو برس بڑا تھا۔ مگر بچپن سے ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے اور ساتھ ہی کھیلے تھے۔

وطن سے دور جا کر وطن والوں کی قدر ہو جاتی ہے اور اس سلسلے میں تو خاص تعلقات بھی تھے۔ محمد علی جب انگلستان سے واپس آیا تھا تو وہ چھوٹے بھائی کا بڑے بھائی والی ملک کے لئے محبت اور عقیدت مندی کا پیغام بھی لایا تھا اور اس نے کوشش کی تھی کہ دونوں بھائیوں میں محبت قائم ہو جائے مگر درباری لڑانے والے بہت موجود تھے اور شک وشبہ کے زہر کو پھیلا کر اپنا کام نکالنا چاہتے تھے۔ چنانچہ محمد علی کے خلاف بھی ایک ایسی سازش تیار کی گئی کہ وہ اور ہمارے خاندان کے دیگر افراد اور شہر کے اور لوگ بھی ہز ہائینس کو گدی سے اتروا کر چھوٹے بھائی کو بٹھانا چاہتے ہیں اور غالباً انگریز بھی اس کو پسند کریں گے کہ ان کے قبضے میں رہنے والا انگریزی خیال کا ایک نوجوان رام پور کی گدی پر متعین ہو اور انگریزوں کے ہاتھ [میں] کٹھ پتلی بنا رہے۔

محمد علی نے شادی کے بعد چار[٢٤] ماہ کی رخصت طلب کی تاکہ آکسفورڈ کی بی اے کی ڈگری کا امتحان پاس کرے، مگر اس رخصت کے حصول میں دشواریاں پیدا کی گئیں اور ہز ہائینس جو اس زمانے میں علیل بھی تھے، ان کو یقین دلایا گیا کہ یہ رخصت وغیرہ سب گہری سازش کا ضروری جزو ہے۔ محمد علی غریب پریشان ہوا اور چونکہ ہز ہائینس مجھ سے بہت محبت کرتے تھے، اس لئے اس نے مجھ کو تار دے کر بلایا اور میں نے آکر ہز ہائینس کے شبہے کو دور کیا اور اس کو جانے کی رخصت بھی دے دی۔ واپس آنے پر اس سازش کو اور بھی بڑھایا گیا اور محمد علی کو تنگ کرنے کی کوشش کی گئی۔ مثلاً جب کوئی دعوت یا جلسہ ہو تو اس میں خاص طور سے محمد علی کو نہ بلایا جائے چھوٹی چھوٹی باتیں سرکار تک پہنچائی جاتی تھیں۔ ترقی تنخواہ کا معاملہ بھی تا حال معلق تھا۔ محمد علی کو ہائی اسکول کے پرنسپل کا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ اور

٢٤۔ نواب صاحب کا جو فرمان ۳۱ مارچ ۱۹۰۲ء کے رام پور گزٹ میں شائع ہوا ہے، اس میں تین ماہ کی رخصت منظور کی گئی ہے یہ فرمان جامعہ کے پچھلے شمارے (اکتوبر ۹۷ء) میں صفحہ ۳۴ پر شائع ہوا ہے، اتفاق سے تاریخ اور سنہ غلط چھپ گئے ہیں

ساتھ ہی سررشتہ تعلیم کے ڈائرکٹر بھی تھے، دورہ بھی کرنا پڑتا تھا، اسکول کا انتظام بھی بخیر کام کرنے میں تو تیز تھا، مگر سازشوں کے مقابلہ وغیرہ کے لئے وہ نہیں بنایا گیا تھا۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ رام پور کی نوکری سے سبکدوش ہو جائے اور باہر جا کر قسمت آزمائی کرے چنانچہ فروری ۱۹۰۲ء میں اس نے میرے کہنے پر رام پور سے استعفیٰ دیدیا اور میں اور وہ دونوں اس کی نوکری کی تلاش میں لگ گئے۔ ہزہائینس نواب صاحب مرحوم اس سے اکثر اوقات ناراض ہی رہتے اور ان کو شکایت تھی کہ محمد علی نے ان کا ساتھ نہیں نباہا، مگر اس کا الزام میں نے خود ہمیشہ اپنے کندھوں پر لے لیا اور واقعہ بھی یہی تھا کہ وہ میرے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کیا کرتا تھا اور میری مشورت سے ہی اس نے رام کی خدمات سے کنارہ کشی اختیار کی تھی۔

فروری ۱۹۰۳ء میں وہ اور امجدی بانو میرے اور میری مرحومہ بیگم صاحبہ کے ہمراہ گئیں اور بریلی کے ضلع میں ہم سب نے ڈیروں میں دورہ کرنا شروع کیا اور بالآخر محمد علی اس وقت [تک] میرے مہمان رہے جب تک کہ ان کو بڑودہ میں جگہ نہ مل گئی۔ تلاش روزگار کے قصے دلچسپ ہیں، میں تفصیل کے ساتھ کل لکھوں گا اور بتاؤں گا کہ قابل ہندوستان کے رہنے والے کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔[۳۵]

میں گذشتہ اشاعت میں لکھ چکا ہوں کہ کرزن کے دہلی دربار سے واپس آنے کے بعد فروری ۱۹۰۲ء میں محمد علی نے رام پور کی ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کی اور میرے پاس آ گئے اور اب ملازمت کی تلاش میں شملہ بھی گئے اور خطوط کے ذریعہ بھی کوششیں کیں، مگر معلوم ہوا کہ جس قدر اونچا مرتبہ تعلیم کے لحاظ سے کسی ہندوستانی کا ہوتا ہے، اسی قدر اس کی حیثیت کے مطابق روزگار ملنے میں دشواریاں ہوتی ہیں کیونکہ مقابلہ ہندوستانی اور انگریز کا ہوتا تھا، ہندوستانی ہندوستانی میں تو شاید انصاف ہو جاتا تھا، مگر جب انگریز اور ہندوستانی کا مقابلہ آتا تھا تو غریب ہندوستانی کا کوئی چانس نہیں تھا۔

محمد علی کی سر ٹامس رینلے سے ملاقات تھی جو وائسرائے کی کونسل میں اس وقت قانونی ممبر تھے۔ علی گڑھ کے مسلمانوں کے خاص دوست تھے۔ تھیوڈور بک، پرنسپل علی گڑھ کی بیوی کے چچا زاد بھائی کی محمد علی سے ملاقات تھی، انہوں نے بالآخر جواب دیدیا کہ وائسرائے لارڈ کرزن سے گفتگو کرنے کے بعد وائسرائے

۳۵۔ دسویں قسط، خلافت مورخہ ۸ رمئی ۱۹۲۳ء (جلد ۱۱ نمبر ۱۰۷) صفحہ ۴

کی یہ خواہش معلوم ہوئی کہ لائق ہندوستانی ہندوستانی ریاستوں میں کام کریں۔

آج یہ دیکھا جاتا ہے کہ جن جن کرپنشن یافتہ انگریز چاہے وہ لائق ہوں یا نہ ہوں ان کو ریاستوں میں بھر دیا جاتا ہے اور یوں ہندوستانیوں کی حق تلفی کی جاتی ہے۔ اس وقت یہی مصلحت تھی کہ لائق ہندوستانیوں کو برٹش انڈیا سے باہر رکھا جائے۔ محمد علی نے اسسٹنٹ ڈائرکٹری سی۔ آئی۔ ڈی کے عہدے کے لئے بھی شملہ میں کوشش کی جس کی تنخواہ آٹھ سو روپیہ سے شروع ہوتی ہے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ایسے کام کے لئے ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہوتی ہے جو ایمان اور ضمیر ایمان سے آزاد ہو کر اپنے فرائض کو سرانجام دے اور جو حکم ملے اس کی تعمیل کرتا رہے۔

میو کالج اجمیر کے چیف کالج کے واسطے بھی کوشش کی لیکن یہاں کے اعلیٰ عہدے انگریزوں کے لئے تھے اور ہم تیسرے عہدے اس قابل نہ تھے کہ ان کو کوئی قبول کر سکے۔ فروری، مارچ، اپریل، مئی اسی تلاش میں گذرے، کبھی شملہ گئے، کبھی کلکتہ، کبھی اجمیر، سینکڑوں خطوط بھی لکھے مگر کامیابی نہ ہوئی۔

مارچ میں میرا تبادلہ بریلی سے کچھ دنوں کے لئے فیض آباد ہوا اور میں اکبرپور میں افیون کی تول کرا رہا تھا۔ وہاں کے چھوٹے ڈاک بنگلہ میں مقیم تھا، کلکتہ سے واپسی پر محمد علی مجھ سے وہاں ملے اور میرے پاس چند دن قیام کیا، اس کے بعد براہ رام پور شملہ گئے۔ میں محمد علی سے مذاق کرتا تھا کہ تلاش ملازمت میں کسی سمت ہو، مگر محمد علی جو پروگرام اپنے سفر کا مرتب کرتے تھے وہ براہ رام پور ہوتا تھا، کیونکہ میرے اور ان دونوں کے بال بچے رام پور ہی میں تھے۔ ع

یوں چلا جائیو دائی کو نجارا ہو کر

ایک ہفتہ وہاں رہنے کے بعد، وہ کام ختم کر کے مجھ کو عارضی طور پر مین پوری جانا پڑا، جہاں افیون کی تول میں نے کی۔ سعید محمد خاں جو اب میجر سعید محمد خان اور بھوپال میں کمشنر کسٹم ہیں، محمد علی کے خاص دوست اور عزیز تھے اور آج تک محمد علی کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔ محمد علی کی ان سے طالب علمی کے زمانے سے بہت محبت تھی، اور آخر تک دونوں میں برابر قائم رہی، وہ افیون کی تول میں میرے اسسٹنٹ تھے اور ہم دفتر کے دو کمروں میں رہتے تھے، ایک میں ہم تینوں سوتے تھے اور ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے، رات کو کوٹھے کی چھت پر سوتے تھے اور چار بجے صبح اٹھ کر کام میں لگ جاتے تھے۔ بہت دلچسپی سے وقت گذرتا تھا، کام سے فارغ ہو کر شام کو ٹینس کے کپڑے پہن کر ہم تینوں انگریزی کلب میں جاتے تھے، جہاں میں

نمبر تھا اور وہاں سے ٹینس بلیرڈ کھیل کر رات کو ساڑھے آٹھ بجے گھر آتے تھے اور کھانا کھا کر سو جاتے تھے۔

جب محمد علی پہلی مرتبہ ولایت سے آیا تھا تو میرے فقط ایک اولاد زندہ تھی یعنی زاہد علی جو اس وقت سات ماہ کا تھا۔ محمد علی نے اس کی صورت دیکھ کر۔ اور یہ بھی کہ ہم اس کو بہت پیار کرتے تھے اس کا نام بلیو بوائے (نیلا لڑکا) رکھ دیا جو ایک مشہور تصویر ہے شہرۂ آفاق مصور گنسبرا می کی بنائی ہوئی اور مذاق سے یہ بھی کہتا تھا کہ یہ "کیمبرج بلیو" نہیں بلکہ "آکسفورڈ بلیو" ہے کیونکہ کوٹ کیمبرج کا ہلکا نیلا آسمانی رنگ کا اور آکسفورڈ کا گہرا نیلا تھا گویا زاہد علی کی رنگت کا مذاق اڑانا منظور تھا۔ ہم سب کی محبت چونکہ اس کے ساتھ تھی محمد علی بھی اس سے پیار کرتے تھے اور زہرہ جو غالبًا فروری ۱۹۰۳ کو پیدا ہوئی تھی نہایت خوبصورت تھی ہم دونوں کے دل میں یہ خواہش اسی وقت پیدا ہوئی تھی کہ زاہد اور زہرہ دونوں بڑے ہو کر ایک دوسرے سے عقد کریں اور باوجود بہت سی دشواریوں کے خدا نے ایسا ہی کیا۔ مین پوری میں تول ختم کرنے کے بعد میرا تبادلہ پاس کے ضلع اٹاوہ کا ہو گیا جہاں میں نے تمام سامان بلوا [منگوا] لیا اور میری اہلیہ مرحومہ اور محمد علی کی اہلیہ بھی معہ تمام کنبے کے وہاں آ گئے اور ہم اول افیون کے دفتر کے بنگلے میں مقیم ہو گئے اور گرمی کا موسم وہیں گذرا۔

دو مہینہ بعد ہم کو بڑا بنگلہ مل گیا جس میں ایک طرف محمد علی رہنے لگے اور دوسری طرف میں اور بچے کھانا اور ملاقات کے کمرے دفتر کے کمرے سے الگ تھے۔ محمد علی نے اب وہاں الہ آباد یونیورسٹی سے وکالت کا امتحان پاس کرنے کا ارادہ کیا اور چھ ماہ خوب محنت کی سچدانند سنہا[۲۶] جو بعد کو بہار کونسل کے ایگزیکیٹو ممبر تھے اور اسی زمانے میں الہ آباد میں بیرسٹری کرتے تھے اور "ہندوستان ریویو" نکالتے تھے، محمد علی سے بہت محبت رکھتے تھے، کیونکہ "ہندوستان ریویو" میں اس کے بہترین انگریزی کے مضامین بہت دلچسپ نکلے تھے جس سے سارے ہندوستان میں انگریزی قابلیت کا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ سنہا نے بہت سی قانونی کتابیں اس کو دی تھیں جس سے امتحان کے لئے قانون پڑھنے اور پاس کرنے میں آسانی پیدا ہوئی۔ اڑھائی ماہ کے عرصے میں امتحان دیا اور سوائے اسٹیمپ ایکٹ کے سب میں پاس ہوئے۔ تیج بہادر سپرو سے اسی زمانے [illegible] کی ملاقات تھی۔ اس موقع پر بھی ایک واقعہ پیش آیا اور اٹاوہ کے بھی بہت سے واقعات قابل ذکر ہیں جو کل پیش کروں گا۔[۲۷]

---

[۲۶] پیدائش: ۱۰ نومبر ۱۸۷۱ء بہ مقام آرہ (بہار) وفات: ۶ مارچ ۱۹۵۰ء
[۲۷] 'گیارہویں قسط' خلافت مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۳۲ء (جلد ۱۱ نمبر ۱۰۸) صفحہ ۶

[افسوس کہ دو قسطیں، بارہویں اور تیرہویں نہ مل سکیں، اس لئے اب چودھویں قسط پیش خدمت ہے]

اسلامی تحریکوں میں محمد علی کا حصہ اس قدر نمایاں رہا تھا کہ ان تحریکوں اور اس کی زندگی کو ایک دوسرے سے الگ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

جب ولایت سے پڑھ کر واپس آیا تو میرے پاس آیا وہ میں مقیم تھا اسی وقت سے (علی گڑھ کے) ٹرسٹیوں کے طریقۂ انتخاب میں تبدیلی کے لئے اس نے جد وجہد شروع کر دی تھی اور بالآخر تاحیات ٹرسٹیوں کے وقت معینہ کے لئے ٹرسٹی ہونے کے اصول کو قوم سے منوا کر رہا۔ علی گڑھ سے بیحد محبت تھی؛ اور اولڈ بوائیز ایسوسی ایشن سے خاص تعلق تھا۔ ہر ایک دستور اساسی بنانے میں محمد علی کا سب سے بڑا حصہ ہوتا تھا جس قدر ضروری تحریکیں پیش کی جاتی تھیں، وہ سب اس کے قلم سے نکلی ہوتی تھیں ہر شخص اس کی خداداد قابلیت سے فائدہ اٹھاتا تھا سینکڑوں نہیں ہزاروں میموریل گورنمنٹ اور ریاستوں کے لئے لوگوں کو مفت تیار کر کے دئے، یہاں تک کہ اپنے کام کو پس پشت ڈال کر "کامریڈ" اور "ہمدرد" کے ضروری کام کو چھوڑ کر دوسروں کے کام کو چمٹ جاتا تھا۔ کوئی سال ناممکن تھا کہ کوئی اولڈ بوائیز کا جلسہ ہو اور اس میں محمد علی بہت کچھ صرف کر کے شریک نہ ہوتا ہو۔ روانہ ہونے سے علی گڑھ پہنچنے تک راستے میں اولڈ بوائیز دوستوں سے ملتا ہوا، ان سے باتیں کرتا ہوا، اپنی آواز کو ریل کے انجن اور گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ میں بلند کر کے بحث مباحثے سے لوگوں کو قائل کرتا ہوا، علی گڑھ پہونچ جاتا تھا۔ ادھر سے میں اپنی جگہ سے آتا تھا اور ہم دونوں علی گڑھ کی پر لطف فضا میں، جس میں ہر وقت بجلی بھری رہتی تھی، ملتے تھے اور تمام پرانے اور نئے قصے دہراتے تھے۔ جلسے سے پیشتر ہی محمد علی کی آواز ریل کے مباحثوں کی نذر ہو جاتی تھی۔ ہم دونوں جب اولڈ بوائیز ایسوسی ایشن کے معاملات میں تقریریں کرتے تھے تو ہماری آواز غائب ہوتی تھی۔ طرح طرح کی دوائیاں اور گولیاں آواز کھولنے کے لئے استعمال کی جاتی تھیں، کبھی بھاپ پہونچا کر گلے کی آواز کو سنبھالتے تھے، ہم دونوں کے پاس اور خاص محمد علی کے پاس تو ایسی دوائیوں کا ایک خاصا ہسپتال رہا کرتا تھا، پھر بھی معمولی مباحثوں میں ہم لوگ ایسے جوش سے بولتے تھے کہ خاص موقعوں پر ہماری آواز غائب ہوتی تھی اور ہم دونوں علی الخصوص محمد علی طبیعت اور آواز پر زور ڈال کر بھیں بھیں کر کے معرکۃ الآرا تقریروں کو ختم کرتے تھے۔

محمد علی کو جو کوئی علی گڑھ کے علمی جلوس میں دیکھتا تھا، اس کی تقریروں کو پڑھتا یا سنتا تھا، اس کو ہرگز

یقین نہ آتا، اگر وہ [illegible] کے باقاعدہ جلسوں کے بعد یا تیرہ نمبر کے کمرے میں یا سرسید کورٹ کے کمرے میں جمع ہوتے تھے تو محمد علی انگریزی طریقے سے ناچتا تھا اور کبینیوں کی طرح دلچسپ رقص کرتا تھا۔ ع بخال ہندوش بخشم سمرقند وبخارا " کا فقرہ (؟ مصرع) زبان پر ہوتا تھا "سمرقند" کا خاص طور پر بھاؤ دیتا کو بخنی کی طرح دیکھنا دکھاتا ایسی چیز تھی کہ جو علی گڑھ کا پڑھا ہوا اور اور مسلمان دیکھتا تھا (تو) وہ محمد علی کو اپنے دل میں جگہ دیتا تھا اور اگر کسی جلسے سے وہ غیر حاضر ہو تو سب کی یہی آواز تھی کہ ع" وہ محفل ویران ہے جہاں بھانڈ نباشد" اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے کام کو صحیح اصولوں پر قائم کرانا اولڈ بوائز لاج کی تعمیر کی طرف سب کو متوجہ کرنا اس کی ترقی اور اس کی عزت بڑھانے میں محمد علی کی خدمات بہت وسیع تھیں۔ یہ درست ہے کہ میں علی کام کرتا تھا، زبان اور قلم کے ذریعے دفتر میں بیٹھ کر اندرونی انتظامات کرتا تھا، مگر حرکت دینے والی قوت محمد علی ہی تھا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا وہ بانی تھا اور اس کے ہر سالانہ جلسے میں شامل ہونے کی کوشش کرتا تھا مسلم لیگ ڈھاکہ کے بانیوں میں سے تھا، نواب صاحب ڈھاکہ مرحوم محمد علی سے بہت محبت کرتے تھے اور طرح طرح کے کپڑے وغیرہ بنوا کر بھیجا کرتے تھے، کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ وہ کپڑوں کا بہت شوقین تھا۔ عالم اسلام سے تعلقات پیدا کرنے میں تو کوئی اس کا شریک بھی نہیں ہوسکتا۔ جنگ طرابلس کے موقع پر اس نے تمام مسلمانوں کو پہلی مرتبہ ہوشیار کیا اور بلقان کی جنگ میں تو دیوانہ وار آگ میں کود پڑا اور ڈاکٹر انصاری کے مشن کو قسطنطنیہ اور جنگ بلقان میں شرکت کے لئے بھیج کر اس نے سارے عالم اسلام کو ہندوستان کا گرویدہ بنا دیا ہے بیسوں عمدہ کام کرنے والے مثلاً ڈاکٹر انصاری، عبدالرحمان صدیقی، شعیب قریشی، عبدالعزیز انصاری، خلیق الزماں وغیرہ پیدا کر دئے۔

مسلم یونیورسٹی کی تاریخ جب لکھی جائے گی تو اس میں بھی جہاں ہز ہائینس سر آغا خاں، نواب وقارالملک مرحوم صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی خدمت کا ذکر آئے گا، وہاں محمد علی مرحوم کی خدمات جلیلہ کا اعتراف بھی ساتھ ہی کرنا پڑے گا۔ علی گڑھ اور علی گڑھ کے طالب علموں سے محمد علی کو ایک عشق تھا: کرکٹ کھیلنے والوں، فٹ بال اور ٹینس کے کھلاڑیوں، اچھا گانے والوں اور اچھا ایکٹ کرنے والوں سے محبت تھی جو کہ عشق کے درجے تک پہنچ گئی تھی۔ چپہ چپہ پر علی گڑھ کی زمین سے اس کو محبت تھی اور وہ زمین اس کو ضرور

یاد رکھے گی۔[۴۸] اب بھی جب اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے جلسے ہوتے ہیں تو سب دوست اور عزیز، پرانے اور نئے یاد کرتے ہیں، سب کی آنکھیں اس کو ڈھونڈتی ہیں، مگر وہ جیسا جیا تھا ویسا ہی مرا اور انبیا علیہم السلام کی زمین بیت المقدس میں حرم شریف کے اندر جو مقام بڑے بڑے بادشاہوں اور سلطانوں کو نہیں ملا۔ وہ ایک ہندوستان کے غریب افلس مسلمان کو خدا نے بغیر مانگے دے دیا۔

میں اس کا ایک شعر کئی بار لکھ چکا ہوں اور اس وقت پھر دہراتا ہوں، اگرچہ اس کا موقع ہو یا نہ ہو، اس کو مقامات مقدسہ سے محبت اور ایک گونہ عشق تھا۔ جب ہم اکبر جہاز پر حج بیت اللہ شریف کو جا رہے تھے اور عرب کا ساحل نظر آیا اور میں نے اس کو نیچے سوتے سے جگایا تو بنیان پہنے، آنکھیں ملتا ہوا ننگے سر دوڑتا ہوا ڈگ پر آیا اور فی البدیہہ یہ شعر پڑھ دیا؛ آنسو جاری تھے، آواز بھرائی ہوئی تھی، بار بار اس شعر کو پڑھ کر خود روتا تھا اور دوسروں کو رلاتا تھا۔ سے

ساحل وہ آ رہا ہے دیارِ حبیب کا　　　کیا پوچھنا ہے آج ہمارے نصیب کا

میں کرکٹ کے قصے، علی گڑھ کے دوست احباب کے قصے خود بھی بہت سے لکھوں گا اور چاہتا ہوں کہ پرانے دوست احباب بھی اس بارے (میں) میری مدد کریں۔ سعید محمد خاں جو بھوپال میں انسپکٹر جنرل کسٹم ہیں،[۴۹] ظفر عمر جو آگرہ میں سپرنٹنڈنٹ ہیں، مکرم اسلم جو ہمارے عزیزوں سے زیادہ عزیز ہیں، تصدق شیروانی،[۵۰] خلیق نقوی،[۵۱] عبدالرحمان صدیقی،[۵۲] شعیب قریشی،[۵۳] سجاد حیدر،[۵۴] سید وزیر حسن[۵۵] وغیرہ سینکڑوں دوست اس کے افسانے، قصے اور لطیفے سنائیں گے اور محمد علی (کی) سوانح عمری لکھنے والوں کو حیرانی ہوگی کہ کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔

۴۸ه مولانا شوکت علی مرحوم کو اپنی شاندار روایات کے ہیں، مگر علی گڑھ نے مولانا محمد علی کے صد سالہ یوم پیدائش کے سلسلے میں کوئی قابل ذکر جلسہ تک نہیں کیا۔

۴۹ه پیدائش: ۱۸۸۵ء بہ مقام بلونا (ضلع علی گڑھ) وفات: ۲ مارچ ۱۹۳۵ء

۵۰ه پیدائش: ۲۵ دسمبر ۱۸۹۹ء بہ مقام چنار (ضلع مرزاپور) وفات: ۱۸ مئی ۱۸۷۳ء بہ عمر ۸۴ سال بہ مقام کراچی (پاکستان)

۵۱ه۔ وفات: ۲۴ مئی ۱۹۵۳ء، کراچی

۵۲ه۔ پیدائش: ۱۲ ستمبر ۱۹۰۴ء، جونپور۔ وفات: ۲۵ فروری ۱۹۶۲ء، کراچی

۵۳ه۔ پیدائش ۱۸۸۱ء، نہٹور (ضلع بجنور)، وفات: ۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء، لکھنؤ بوقت ۲ بجے شب

۵۴ه۔ پیدائش: یکم مئی ۱۸۷۲ء بمقام کالوپور (جونپور) وفات: اگست ۱۹۴۷ء

کلکتہ کے قیام میں محمد علی نے زیادہ وقت "کامریڈ" کے ذریعہ مسلمانوں کی خدمت کرنے میں صرف کیا، علی الخصوص مسلم یونیورسٹی اور طرابلس کے معاملات پر قابلیت کے ساتھ مضامین لکھے اور مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا کر دی۔ میرا دعویٰ ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں پر جو احسان محمد علی کا ہے، وہ کبھی ادا نہیں ہو سکتا۔ اس نے قرآن پاک اور اسلامی تعلیم و تربیت کی طرف سب کو متوجہ کیا اور سب کے دلوں میں اسلام کی آگ پیدا کر دی۔[۳۶]

[افسوس کہ اس کے بعد مولانا شوکت علی مرحوم، کسی وجہ سے آگے نہ لکھ سکے اور یہ دلچسپ کہانی ہمیشہ کے لئے ادھوری رہ گئی۔]

مولانا محمد علی کی تیسری برسی کے موقع پر، ۴ جنوری ۱۹۳۴ء کو روزنامہ "خلافت" کا محمد علی نمبر شائع ہوا تھا، جس میں خط کی صورت میں مولانا شوکت علی صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے: "بھائی کا خط بھائی کے نام"۔ اس کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

"عزیزی محمد علی، السلام علیکم۔ آج بہت دنوں کے بعد، تمہاری برسی کے موقع پر تم کو خط لکھنے کے لئے فرصت نکالی ہے۔ تعمیری کام یہی نہیں کہ ٹھنڈا اور دشوار ہوتا ہے بلکہ اس کی تکمیل کے لئے سخت صبر اور بہت ہمت اور رواداری کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں آج بھی اسی کام میں لگا ہوں اور برا کہنے والوں اور اعتراض کرنے والوں کی پروا نہ کر کے کام کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ زیادہ تکلیف کی بات یہ ہے کہ بعض پرانے ساتھی اور کام کرنے والے جلد دل برداشتہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی مالی حالتیں خراب ہیں۔ ذاتی پریشانیوں کی وجہ سے مزاج اور بھی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ میں، جہاں تک میری طاقت میں ہوتا ہے، امداد دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ ..... مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری طرح ایک دن میں بھی کام کرتے کرتے، تھکے ہوئے جانور کی طرح گر کر دم دے دوں گا۔"

۳۶۔ چھٹی قسط، خلافت مورخہ ۲۱ مئی ۱۹۳۴ء (جلد ۱۱ نمبر ۱۱۷) صفحہ ۶

محمد اعزاز الدین
تحقیق و تحشیہ: حکیم محمد حسین خاں شفا رام پوری

مولانا محمد علی پر پہلا مضمون

(جون ۱۸۹۸ء)

[مولانا محمد علی جوہر کے سفر یورپ کے انتظامات جب مکمل ہو گئے تو ان کے رام پوری دوستوں نے ایک الوداعی جلسے کا انتظام کیا جس میں کچھ مضامین پڑھے گئے اور آخر میں ایک طرحی مشاعرہ ہوا، جس میں حضرت جوہر نے بھی اپنی غزل پڑھی۔ ذیل میں ایک مضمون پیش کیا جاتا ہے جو اس موقع پر پڑھا گیا تھا۔ حسب ضرورت ایک دو جگہ حاشیوں کا میں نے اضافہ کر دیا ہے شفا رام پوری]

خاندانی حالات اور ریاست کی امداد

اہل رام پور جس قدر فخر و ناز کریں وہ بجا ہے۔ اس لئے کہ رام پور کے نہایت معزز اور مشہور و معروف خاندان کا ایک ممبر اس سال علیگڑھ کالج سے بی۔ اے پاس ہو کر ولایت کو امتحان سول سروس کے واسطے جاتا ہے۔ اس خوش قسمتی اور عزت کا رام پور کے واسطے یہ پہلا موقع ہے۔ محمد علی خاں صاحب اس عالی ہمت نیک نیت منتظم اور مدبر شخص کا پوتا ہے جس کا نام محمد علی بخش خاں[۱] صاحب بہادر مرحوم ہے جن لوگوں کی نظر سے رومیلکھنڈ کے ۱۸۵۷ء کے غدر کی تاریخ گزری ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ علی بخش خاں صاحب مرحوم کس دل و دماغ کا آدمی تھا۔ مرحوم مغفور بعہد نواب محمد سعید خاں صاحب بہادر جنت آرام گاہ رام پور میں ملازم ہوئے اور اسی روز سے اس خاندان کا وطن رام پور ہو گیا اس بہادر اور نامور شخص نے محض اپنی حسن خدمت، وفاداری۔ اور ریاست کی خدمت گاری سے والیان ریاست

رام پور کے حضور میں وہ عزت حاصل کی جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ نواب یوسف علی خاں صاحب بہادر فردوس مکاں کے عہد میں ، ۱۸۵۷ء کے پر آشوب غدر نے جنم لیا تمام روہیلکھنڈ نے برٹش گورنمنٹ کے مقابل میں ہتھیار اٹھائے۔ رام پور کے مغرب میں مراد آباد میں ایک نوابی قائم ہوئی اور مشرق میں بریلی میں دوسری نوابی کی بنیاد رکھی گئی۔ ان دونوں نوابوں کے سیلاب نے جنوبی حصہ تک بھی تلاطم مچایا رام پور کے شمال میں علاقہ ترائی ہے وہاں کچھ تو بدمعاشوں نے جا بجا طوائف الملوکی قائم کی اور کچھ بریلی کے خان بہادر خاں نواب کی بھوکی جماعت نے لوٹ مار شروع کر دی بغرض رام پور چاروں طرف سے باغیوں سے اس طرح سے گھرا ہوا تھا کہ انگریزوں کی امداد کا ذکر کیا خود ریاست کو محفوظ رکھنا مشکل تھا رام پور میں جا بجا محمدی جھنڈے کھڑے ہوئے کچھ لوگوں نے دہلی کی کالی پہاڑی پر یہاں سے جا کر مجاہدین کے ساتھ جانیں کھوائیں۔ بہت سے آدمی بریلی اور مراد آباد چلے گئے مگر نواب فردوس مکاں کے حسن انتظام اور ان کے جاں نثار ملازم محمد علی بخش خاں کی کوشش نے خاص رام پور میں کوئی ہنگامہ نہ ہونے دیا اور نینی تال کو رسد رسانی اور نینی تال سے میرٹھ تک انگریزوں کی ڈاک رسانی کا علی بخش خاں مرحوم نے ایسا انتظام رکھا کہ بعد ہنگامہ غدر کے گورنمنٹ انگریزی نے فتح گڑھ کے دربار میں خلعت اور پانچ ہزار روپے سالانہ آمدنی کی جاگیر عطا کی اور نواب فردوس مکاں نے بھی وہ قدر شناسی کی کہ کچھ علاقہ بطور جاگیر عطا کیا اور ان کی اولاد کے واسطے رام پور کو ہمیشہ کے واسطے وطن بنا دیا۔ علی بخش صاحب کے چار فرزند رشید ہوئے۔ خلف اکبر جناب محمد اصغر علی خاں صاحب، فرزند دوم جناب محمد محمود علی خاں صاحب، فرزند سوم جناب حافظ محمد مبارک علی خاں صاحب شہید، فرزند چہارم محمد عبد العلی خاں صاحب مرحوم۔

اللہ کے فضل و کرم سے اول کے دونوں صاحبزادے زندہ و سلامت موجود ہیں اور اس خاندان کے یہی دونوں صاحب مکھیا ہیں۔ فرزند سوم جنرل عظیم الدین خاں کے ساتھ شہید ہوئے اور فرزند چہارم سولہ برس ہوئے انتقال فرما گئے۔

محمد علی خاں صاحب مسافر ولایت انہیں محمد عبد العلی خاں صاحب مرحوم کے چشم و چراغ ہیں۔ دو سال ہوئے ان کے برادر اکبر جناب محمد شوکت علی خاں صاحب نے علی گڑھ کالج میں بی۔ اے پاس کیا اور اب وہ اپنی ذاتی لیاقت سے بریلی میں اسسٹنٹ اوپیم ایجنٹ ہیں اور دو سو روپے ماہوار تنخواہ پاتے ہیں شوکت علی خاں صاحب کی ہمت اور کوشش پر ہزار آفریں ہے کہ اپنے بھائی کی بی۔ اے کی کامیابی پر اپنے محسن آقا عالیجناب

نواب محمد حامد علی خاں صاحب بہادر خلد اللہ ملکہ کے حضور میں درخواست ہے کہ محمد علی خاں کو ولایت کو بغرض امتحان سول سروس بھیجنا چاہتا ہوں اس میں حضور بھی اپنے قدیمی نمک خواروں کی امداد فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حضور پرنور کی عمر و دولت میں برکت فرمائے۔ باوجودیکہ تین سال سے قحط سالی کی وجہ سے ریاست کو بڑا نقصان ہوا ہے، حضور نے بلا کسی سفارش اور سعی کے سینکڑوں مستاجروں کو رقوم مال گذاری اس تین سال میں معاف فرمائیں، محتاج خانے جاری کئے ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں کوئی امداد کرنا کس قدر مشکل کام تھا مگر ہمارے آقا کو تعلیم سے خاص دلچسپی ہے اور پھر اپنے قدیمی جانثاروں کے ساتھ الفت بھی بے حد ہے، اس لئے فوراً سرکار نے اس ارادہ کو نہایت پسند فرماکر مبلغ آٹھ ہزار روپیہ* ایک ہزار سالانہ کی ادائے گی کی قسط پر عطا فرمائے۔ اس شاہی فیاضی پر محمد علی بخش خاں صاحب مرحوم کے خاندان کو خصوصاً اور تمام اہل رام پور کو عموماً جو کچھ مسرت ہوئی وہ قابل بیان نہیں ہے، آج تک اس خاندان نے صرف رام پور میں ایک نہایت بیش قیمت ترقی حاصل کی تھی مگر خدا کا شکر ہے کہ اب گورنمنٹ میں بھی پورے عروج کے حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ رام پور میں معزز اہلکاروں اور رعایا میں ضرور کچھ نہ کچھ منافقت رہا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس وقت تک عموماً تمام اہل رام پور کو اس خاندان کے ساتھ خاص الفت ہے۔ یہ ایک مشہور بات ہے کہ اس گھرانے سے کسی شخص کو کبھی سوائے فائدہ کے ایذا نہیں ہوئی۔ انگریزی کی تحریروں میں جب کسی انگریز نے محمد علی بخش خاں صاحب مرحوم کی نسبت کچھ لکھا تو اس کے ساتھ یہ لفظ بھی ضرور استعمال کیا ہے "دی رائٹ ہینڈ آف ہز ہائینس"۔ (The right hand of His Highness)

جناب محمد اصغر علی خاں صاحب اس پایہ کے آدمی ہیں کہ جس وقت نواب کلب علی خاں صاحب بہادر خلد آشیاں حرمین شریفین کو جانے لگے تو ریاست کی نگرانی میں بذریعہ تحریری روبکار کے ان کو بھی معزز کیا۔

جناب محمد محمود علی خاں صاحب کی قدر کوئی اہل عرب سے دریافت کرے جن کے لئے آج تک حرمین شریفین میں دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ عربوں کی تقسیم عمارت کی افسری، مصاحبت، خاص رسالداری، اور سفارت ریاست ہائے بیرونی ان سے متعلق تھی، اب مہتمم پرچہ اخبار ریاست رام پور ہیں۔

اس خاندان کے بچے بچے کا یہ ماٹو ہے: فاقہ سے مرنا بہتر ہے بہ نسبت رشوت لینے کے" کوئی کلمہ آقا کی خیر خواہی سے خالی نہ ہو، کسی متنفس کو ایذا نہ پہنچے۔ ان لوگوں کی خوبیاں رام پور میں آن کر معلوم

* مولانا شوکت علی مرحوم کے مضمون میں، صفحہ ۲۸ پر قرض کی یہ رقم ۱۰ ہزار درج ہے (اعظمی)

ہوئی ہیں۔ محمد علی خاں کا ہنوز اشعار رواں سال ہے۔ وہ ۱۸؍جون ۱۸۹۸ء کو پی۔ او کمپنی کے اورینٹیل نامی بالائی کے جہاز پر سوار ہو کر ولایت کو روانہ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو کامیاب بخیریت ہندوستان میں لائے تاکہ وہ اپنی کوششوں سے ملک اور اہل قوم کو اور اپنے خاندان کے ممبروں کو فائدہ پہنچائیں۔ آمین ثم آمین

حواشی

۱؎ شیخ علی بخش خاں بہادر۔ نجیب الطرفین شیخ کلال تھے ۱۲۵۹ھ ۱۸۴۳ء میں ولی عہد رام پور یوسف علی خاں کے خانساماں کی حیثیت سے رام پور میں آئے ... چند سال میں رؤسائے رام پور کے سب سے بڑے معتمد خاص اور رازدان ہو گئے اور اپنے پورے خاندان کو رام پور میں بلا لیا.. جو خاندان شیلوح کے نام سے بہت پھلا پھولا۔ اس خاندان نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ ان کا محلہ الگ تھا۔ مسجد الگ تھی۔ قبرستان الگ تھا۔ شادی بیاہ بھی اپنے ہی خاندان میں کیا کرتے تھے ... زیادہ تر لوگ ریاست میں اعلیٰ عہدوں پر ملازم، اور بڑے پڑھے لکھے تھے۔ افغانان رام پور میں "سید" اور "خاں" کے علاوہ دوسری برادریوں کو سماجی حیثیت سے کمتر خیال کیا جاتا تھا۔ اس بنا پر رؤسا نے حسب سیدات' کا اعلان کیا تو یہ لوگ "خاں" کہلانے لگے۔ (کاملان رام پور۔ بزم غالب۔ مکاتیب غالب۔ راقم کا مضمون حکیم شفیق الرحمن رام پوری ماہنامہ آج کل دہلی اگست ۱۹۷۹ء)

۲؎ یہاں سیاسی مصلحت سے علی بخش خاں کے چار فرزند ظاہر کیے گئے ہیں در اصل ان کے پانچ لڑکے تھے سب سے بڑے لڑکے محمد اکبر علی خاں اکبر (پیدائش ۱۸۳۳ء وفات ۱۸۵۱ء) تھے ان کی موت ایک معمہ ہے۔ جس کے بارے میں حافظ احمد علی خاں شوق لکھتے ہیں: ان کی موت کے متعلق ایک بڑا راز ہے جن کو معلوم ہے وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسے وفادار نوکر بھی دنیا میں ہوتے ہیں" (کاملان رام پور صفحہ ۵۱۷)

۳؎ امیر مینائی لکھتے ہیں" ۱۹؍ اکیس برس کے سن میں ہیضہ کر کے قضا کی۔

(انتخاب یادگار صفحہ ۲۹)

ضیاء الرحمٰن بچھرایونی

مولانا محمد علی مرحوم

۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء کو محمد علی پیدا ہوئے۔ اس وقت کون جانتا تھا کہ غلام ملک کا یہ سپوت مستقبل میں لوگوں کو آزادی کا نغمہ سنائے گا اور اپنی شعلہ بیانی اور دھواں دار تقریروں سے ہندوستانیوں کے سینوں میں آزادی کی آگ لگا دے گا کسے خبر تھی کہ قدرت نے اسے آزادی کا پیغام بر اور حریت کا فرشتہ بنا کر بھیجا ہے تاکہ وہ غلاموں کو آزادی کا مژدہ سنائے اور اپنی جرأت، ہمت اور شجاعت کی اطراف عالم میں دھوم مچا دے مولانا محمد علی نے اپنی عمر کے دو سال بھی پورے نہ کئے تھے کہ شفیق باپ نے ۱۸۸۰ء میں تقریباً ۳۲ سال کی عمر میں ہیضے کی وبا میں اچانک انتقال کیا۔ اس وقت محمد علی کی والدہ کی عمر ستائیس۲۷ برس کی تھی۔ مولانا محمد علی اپنی خود نوشت سوانح حیات میں فرماتے ہیں، ''میری والدہ کی ستائیس۲۷ برس کی عمر تھی کہ چند گھنٹے کی بیماری کے بعد ہمارے والد دفعتاً ہیضہ کی نذر ہوگئے اور وہ بیوہ ہوگئیں ایک بیوہ کیلئے اس سے زیادہ حوصلہ شکن اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ جوانی کے عالم میں اس کا شوہر دائمی مفارقت اختیار کرے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا بار بھی اس کے سر چھوڑ جائے۔ مگر بی اماں معمولی عورت نہ تھیں جو شوہر کی مفارقت میں بچوں کی تربیت کو بھول جاتیں قدرت کی طرف سے انھیں وہ دل ملا تھا جس میں قوم کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا تھا انھوں نے اپنے بچوں کی ذہنی تربیت اور اعلیٰ صفات پیدا کرنے کی کوشش کی اور ان ہی کی تربیت کا یہ اثر تھا جس نے ان کے سب سے چھوٹے لڑکے محمد علی کو "مولانا محمد علی بنا دیا۔ مولانا محمد علی کو بی اماں سے بے حد محبت تھی، دل و جان سے فدا تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں، ''میں جو کچھ ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ خداوند کریم نے اس مرحومہ کے ذریعے پہنچایا ہے۔ والد مرحوم کی وفات کے دن سے خود گھر کی بوڑھی ماماؤں کا سا سادہ اور سفید لباس پہنا اور ان ہی کی طرح روکھی سوکھی کھا کر گزر کی۔ مگر ہمارا کوئی سوال رد نہیں کیا اور ہمیں اس عیش و آرام سے رکھا، پالا اور بڑا کیا جو ہمارے ان چچاؤں کی اولاد کے عیش و آرام سے کسی طرح کم نہ تھا بلکہ کچھ زائد ہی

تھا جو بفضلِ تعالیٰ والد مرحوم کی وفات کے وقت زندہ وسلامت تھے اور جن کی جائدادوں پر قرضہ کا دہ بوجھ۔ تھا جو ہمارے ترکے پر تھا جو ریاست میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز تھے" ابتدائی تعلیم کیلئے پرائمری اسکول رام پور میں داخل ہوئے اس کے کچھ عرصے کے بعد ۱۸۸۰ء میں اپنے بھائی شوکت علی کے ساتھ بریلی چلے گئے۔ وہاں سے ہائی اسکول کرنے کے بعد ۱۸۹۰ء میں علی گڑھ پہنچے۔

علی گڑھ کالج میں داخلہ بھی بی اماں کی وسیع اور بالغ نظری کی دلیل تھی ورنہ کالج اس وقت تنگ نظر اور قدامت پسند مسلمانوں کے نزدیک کفر والحاد کا مرکز تھا۔ محمد علی نے اس درس گاہ میں اپنی ذہانت اور خداداد استعداد سے بہت کچھ ترقی کی اور اسی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے بے حد ہر دل عزیز ہوئے۔ کالج میں ان کی ذہانت اور ذکاوت کی دھوم تھی۔ اپنی ملنساری اور خوش خلقی کی وجہ سے وہ بڑے ہر دل عزیز تھے۔ اسی زمانہ میں تحریر وتقریر میں بھی امتیازی شان حاصل کر لی تھی اور سب لوگ ان کی قابلیت اور تحریر وتقریر کی مہارت کے معترف تھے۔ اپنے زمانے کے سبھی ممتاز طالب علموں سے ان کے خصوصی تعلقات تھے سید سجاد حیدر یلدرم، میر محفوظ علی، ظفر علی خاں، حسرت موہانی وغیرہ وہ حضرات تھے جو بعد کو سیاست اور ادب و شاعری کے آسمان کے درخشندہ ستارے ہوئے۔ ان ہی لوگوں نے ماہوار مشاعرے چودھویں رات میں منعقد کئے۔ گریجویٹس لان پر چودھویں رات کی چاندنی میں مشاعرے ہوتے تھے اور صرف ایک شمع پڑھنے والے شاعر کے سامنے روشن ہوتی تھی۔ ان مشاعروں میں مولانا محمد علی نے جو غزلیں پڑھیں وہ ان کے دیوان میں ابتدائی کلام کی حیثیت سے درج ہیں

کھیل کے میدان میں مولانا شوکت علی کے بعد مولانا محمد علی بھی کچھ کم مشہور نہیں تھے۔ علی گڑھ میگزین میں برابر مضامین لکھتے رہے۔ Siddon's Union Club (طلبائے کالج کی یونین) میں ان کی تقریریں بڑی دلچسپ اور جوشیلی ہوتی تھیں۔ بی اے کرنے کے بعد رام پور پہنچے۔ وہاں نواب محمد اسحاق خاں صاحب مدار المہام کی کوششوں اور اعانت سے مولانا محمد علی نے سول سروس کا امتحان دینے کے لئے آکسفورڈ کا سفر ۱۸۹۸ء میں کیا، مگر بدقسمتی سے امتحان پاس نہ کر سکے۔ دوسرا سفر انگلستان ۱۹۰۲ء میں ہوا اور تاریخ میں بی۔ اے آنرز بڑے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ ان کے ساتھیوں میں مسٹر مونٹیگو (Montego) بھی تھے جو بعد کو سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا ہوئے۔

اس سارے عرصے میں ان کا مطالعہ بھی وسیع رہا۔ ان کو یورپ امریکہ وغیرہ کی تاریخ پر بڑا عبور

حاصل تھا۔ مختلف ممالک کے آئین پر ان کی نظر بہت وسیع تھی۔ انگریزی ادب سے خاص مناسبت تھی اور انگلستان کے ہر حصے اور صوبے کی زبان اور لہجے میں جو فرق ہے اس پر وہ پوری قدرت رکھتے تھے۔ انگریزی شاعری کے بڑے ماہر تھے۔ حافظے کی غیر معمولی قوت کی بدولت انھیں مختلف اصناف سخن کے نمونے بر زبان یاد تھے۔ تحریر میں میکالے کی تقلید انھوں نے شروع ہی سے اختیار کر لی تھی اور آخر میں اسی طرز تحریر کے بڑے ماہر ہو گئے تھے۔ اپنے دور کے انگریزی کے بڑے اعلیٰ مقرر اور نثر نگار تھے۔ اس نوعمری میں بھی انگلستان کے قیام کے دوران ان کا دامن کبھی آلودہ عصیان نہیں ہوا نماز اور روزے کے سخت پابند رہے۔

مجھے مولانا محمد علی سے ملاقات کا شرف سب سے پہلے رام پور میں ۱۹۰۶ء میں حاصل ہوا جبکہ میری عمر دس برس کی تھی۔ اس وقت وہ مسٹر محمد علی بی۔ اے (آکسن) تھے۔ ان کی کاسمیٹکس (Casmetics) سے تنی ہوئی بھاری مونچھیں، منڈی ہوئی ڈاڑھی، بہت بڑھیا سوٹ یا اعلیٰ قسم کی شیروانی چوڑی دار پاجامہ اور ترکی ٹوپی اس صورت اور لباس میں وہ بڑے بڑے مجمعوں میں نمایاں اور ممتاز نظر آتے تھے پھر تو مسلمانوں میں اس کا عام فیشن ہو گیا اور یہ لباس آزادی خیال کا ایک نشان بن گیا۔

ولایت سے واپسی کے بعد نواب صاحب رام پور نے ۱۹۰۲ء میں انھیں اسٹیٹ ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنا دیا تھا۔ مولانا محمد علی نے اس زمانہ میں اس اسکول کے پہلے درجہ کا نام Infant Class رکھا تھا کچھ عرصہ کے بعد ریاست رام پور کے چیف ایجوکیشن آفیسر مقرر ہوئے اور بہت سی تعلیمی اصلاحات کیں ۱۹۰۶ء میں مولانا کا تعلق بڑودہ اسٹیٹ سے ہو گیا تھا۔ اسی سال مولانا بڑودہ سے چھٹی لیکر رام پور تشریف لائے یہاں نواب صاحب کا جشن سالگرہ منایا جانے والا تھا، ہر جگہ اس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ان دنوں رام پور اسٹیٹ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر احمد حسین صاحب بی۔ اے تھے محلہ کسرول مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ احمد حسین صاحب مولانا محمد علی کے ساتھی اور علی گڑھ کے کلاس فیلو تھے یہ دونوں کبھی طالب علمی کے زمانہ میں ایک انگریزی ڈرامے میں شریک تھے جو بہت مقبول ہوا تھا۔ مولانا محمد علی نے تجویز پیش کی کہ اسی ڈرامے کو جشن سالگرہ کے موقع پر دوبارہ پیش کیا جائے۔ چنانچہ اسکول کے چند بچوں کا انتخاب ہوا۔ منتخب طلبا میں میرے بڑے بھائی مولوی نور الرحمن صاحب مرحوم اور میں بھی شامل تھا۔ اس وقت مولانا محمد علی نے اپنے قریبی عزیز منشی احمد علی صاحب شوق کے دولت کدہ پر مقیم تھے۔ یہ مکان لنگر خانہ کی گلی میں تھا۔ طلبا سے کہا گیا کہ

وہ ٹھیک آٹھ بجے صبح منشی احمد علی صاحب شوق کے گھر پہنچ جائیں تاکہ مولانا محمد علی بہ نفس نفیس ڈرامے کی ریہرسل کراسکیں۔ چنانچہ ہم سب ساتھی بڑے شوق سے وہاں پہنچ گئے۔ آٹھ بج چکے تھے۔ ملازم نے بتایا کہ، "صاحب ابھی بیدار نہیں ہوئے ہیں۔" ہمیں وہاں بیٹھ کر تھوڑا انتظار کرنا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر میں مولانا نائٹ سوٹ میں برآمد ہوئے، آنکھوں میں خمار، مونچھیں جو بڑی گھنی تھیں، نیچے ڈھلکی ہوئی تھیں۔ انھوں نے آتے ہی معذرت کی کہ، "آپ لوگوں کو بڑا انتظار کرنا پڑا۔" اس کے فوراً بعد ریہرسل شروع ہوگئی۔

دی کنگ اینڈ دی میلر (The King and the Miller) ایک چھوٹا سا انگریزی ڈرامہ تھا، جس میں بادشاہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر جنگل میں اکیلا رہ جاتا ہے اور وہاں کسی جانور پر فائر کرتا ہے۔ فائر کی آواز سن کر جنگل کا محافظ آپہنچتا ہے اور فوراً سوال کرتا ہے کہ فائر کس نے کیا ہے۔ اس نے بادشاہ کو کبھی دیکھا نہ تھا اس لئے وہ پہچان نہ سکا۔ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ بادشاہ کے آدمی وہاں پہنچ گئے اور آداب بجالائے، تب جنگل کے محافظ کو پتہ چلا کہ وہ اعلیٰ حضرت ہیں۔ یہ ریہرسل ہو ہی رہا تھا اور بادشاہ کو فائر کرنا تھا کہ پیچھے پٹاخہ چھوڑا گیا۔ وہ صاحب زادے جو بادشاہ بنے تھے پٹاخہ کی آواز سن کر ڈر گئے۔ مولانا نے ڈانٹ کر کہا کہ "بادشاہ کبھی ڈرتے نہیں ہیں"۔ اس کے بعد کئی مرتبہ پٹاخے چھوڑے گئے تاکہ ان صاحب زادے کا ڈر نکل جائے۔ اس ڈرامہ کا ریہرسل جاری ہی تھا کہ ایک منیم جی حاضر ہوئے اور جھک کر فرشی سلام کیا۔ ان کے پیچھے ایک کہار تھا جس کے سر پر بڑا سا تھال تھا اور اس میں دہی کی بالوشاہیاں چونی ڈار لگی ہوئی تھیں، تھال خوان پوش سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ تھال مولانا کو پیش کیا گیا۔ انھوں نے بڑی بے نیازی سے ایک خالی میز کی طرف رکھ دینے کا اشارہ کیا اور معلوم کیا کہ، "کہاں سے لائے ہو؟" معلوم ہوا کہ یہ مٹھائی شوق صاحب کے لئے فلاں ساہو صاحب نے اپنے یہاں کی کسی تقریب کے سلسلے میں بھیجی ہے۔ مولانا محمد علی نے فرمایا کہ یہ مٹھائی شوق صاحب کو پہنچ جائے گی اور ساہو صاحب سے شوق صاحب کی طرف سے مبارک باد کہہ دیجئے گا۔ منیم جی اور کہار چلے گئے۔ مولانا نے اتنے انتظار کے بعد کہ منیم جی پھاٹک سے باہر چلے جائیں، خوان پوش تھال پر سے اٹھایا اور لڑکوں کو صلائے عام دیدی لیکن کھینچے، مولانا نے ڈانٹ کر حکم دیا کہ یہ تمہیں اسی وقت ختم کرنا ہے۔ اور پھر خود بڑے بڑے ہاتھ مارنا شروع کر دیئے۔ جس کسی کو شرماتا دیکھتے اسی پر تقاضہ کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ذرا سی دیر میں سارا ہو مال سب کا سب صاف ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد منشی احمد علی صاحب شوق ادھر آنکلے۔ مولانا محمد علی نے ان سے

کہا کہ یہ تھال ملازم سائیں صاحب نے آپ کو بھیجا تھا اور اس میں وہ پرتکلف بالوشاہیاں تھیں جو ان بچوں نے صاف کر دیں۔ سو کس سادگی سے ہنستے ہوئے دوسری طرف چلے گئے۔

یہ واقعہ اپنی عمر میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا اور اس پہلی ملاقات میں مسٹر محمد علی نے اسی آن سے جو تعلق انتہائی خلوص کا اس وقت پیدا ہوا تھا وہ برابر بڑھتا ہی رہا۔ ترک موالات اور خلافت کے زمانے میں سینکڑوں لیڈروں کی تقریریں سنیں، بڑے بڑے مجمعوں کو دیکھا، بہت سے علماء مسند ارشاد پر جلوہ افروز ہوئے لیکن جو بات اور قلبی تعلق مسٹر محمد علی اور بعد میں ان کا مولانا محمد علی خادم کعبہ سے پیدا ہوا اس کا عشر عشیر بھی کہیں دوسری جگہ پیدا نہیں ہوا۔ وہ خلوص اور بے پناہ شفقت کا اثر تھا، جو ہر کہتر و مہتر پر یکساں تھا اور ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ ان کا کرم خاص میری ہی جانب ہے۔ اسی لیے ان کی تقریر سن کر کہہ اٹھتا تھا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس ملاقات کے بعد مولانا محمد علی نے ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے "کامریڈ" نکالا اور پھر بہت جلد وہ ہندوستانی سیاست پر چھا گئے۔ ان کے مضامین بہت مقبول ہوئے اور کامریڈ نے ہندوستانی اخباروں میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔ پھر "ہمدرد" جاری ہوا جس میں قاضی عبدالغفار، مولوی محفوظ علی بدایونی، ہاشمی فرید آبادی، عبدالماجد دریابادی[1] وغیرہ مولانا کے رفیق رہے۔

۲۲ اپریل ۱۹۱۵ء کو رام پور میں مولانا محمد علی کو نظر بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد مئی ۱۵ء میں مہرولی (دہلی) پہنچائے گئے اور کچھ عرصہ کے بعد لینسڈاؤن (یوپی) میں منتقل کر دیے گئے وہاں سے چھندواڑہ (سی پی) اور آخر میں بیتول جیل (سی پی) میں رہے وہاں سے ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہائی ملی۔

---

[1] مولانا عبدالماجد دریابادی "ہمدرد" کے مستقل اسٹاف میں باقاعدہ کبھی شامل نہیں رہے۔ مضامین اور مسودوں سے مدد ضرور کرتے رہے۔ بقول مولانا دریابادی "اپنا وقت جتنا "سچ" کے لئے صرف کرتا، اس سے کچھ زیادہ ہی "ہمدرد" کے لئے بھی نکالتا اور دریاباد کے گوشۂ تنہائی میں بیٹھے بیٹھے جتنی بھی خدمت ممکن ہوتی اپنی بساط کے لائق دونوں کی کرتا رہتا۔ ہمدرد کے لئے مستقل مضامین الگ لکھ کر بھیجتا رہتا، ہر پرچے کے لئے قرآن مجید کی ایک آیت مع تشریحی ترجمہ کے دیتا اور "سچ" کے متعدد مضامین "ہمدرد" خود بھی اپنے ہاں نقل کرتا رہتا۔" (محمد علی۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق حصہ اول صفحہ ۲۰۸) مگر جب مولانا محمد علی ۱۹۲۸ء میں بغرض علاج یورپ کے لئے روانہ ہوئے تو ۲۰ مئی سے "ہمدرد" کی ادارت میں تبدیلی آئی، مولانا دریابادی اس کے نگراں مقرر ہوئے، اور مولانا محمد علی کے بجائے سید محمد جعفری اس کے ایڈیٹر۔ (لطیف اعظمی)

۱۹۱۹ء کو بیتول جیل سے فوراً رہائی کے بعد مولانا امرتسر کے آل انڈیا کانگریس کے اجلاس میں پہنچے اور وہیں ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ پیش کیا گیا۔ وہ عجیب و غریب دور تھا کہ آزادی کا مطالبہ کانگریس بھی کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی لیکن مولانا حسرت موہانی اور علی برادران آزادی کامل سے کم کسی طرح منظور کرنے پر تیار نہ تھے چنانچہ مکمل آزادی وطن کا ریزولیوشن مولانا حسرت موہانی نے پیش کیا۔ اور وہ منظور ہوا علی برادران کا مکمل تعاون گاندھی جی کو حاصل ہو گیا۔ مولانا شوکت علی کانگریس کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے اور ان کی غیر معمولی بصیرت عملی اور انتظامی اہلیت سے سارے ہندوستان کے چپہ چپہ میں کانگریس کمیٹیاں بن گئیں لاکھوں آدمی چار آنے کا چندہ دے کر کانگریس کے ممبر بن گئے ہر ہر ضلع میں مقامی الیکشن ہوئے تھے اور کانگریس کے عہدیدار مقرر کئے جاتے تھے۔

۹ ر ۱۰ ر ۱۱ ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو مرادآباد میں یو۔پی پولیٹیکل کانفرنس، مہاراجہ تھیٹر، اسٹیشن روڈ پر (جو آج سرج سنیما کے نام سے مشہور ہے) اجلاس ہوئے۔ اس میں گیارہ سو ڈیلیگیٹ شریک جلسہ تھے۔ تعداد آخر تک بڑھتی ہی رہی جو ہزاروں سے متجاوز تھی ۸ ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو نہایت شاندار جلوس نکالا گیا اور ۹ ر اکتوبر کو صبح دوبارہ جلوس نکلا جس میں مہاتما گاندھی شریک تھے بارہ بجے دوپہر سے چار بجے شام تک جلسہ جاری رہا۔ اس جلسہ میں مہاتما گاندھی، مسٹر محمد علی، شوکت علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، سندر لال جی، موتی لال نہرو، مدن موہن مالوی، جواہر لال نہرو، سی آر داس، لالہ لاجپت رائے اور بہت سے دوسرے لیڈروں نے شرکت کی یہ جلسے بہت اہم تھے سردار سنگھ اس صدر تھے۔ گاندھی جی کے ترک موالات کا ریزولیوشن پاس ہوا۔ دونوں پارٹیوں کی طرف سے جوشیلی تقریریں ہوئیں دو دن تک بڑی رسہ کشی ہوئی اس کانفرنس کی دور دور شہرت ہو گئی تھی۔

پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت مالویہ، سی آر داس، لالہ لاجپت رائے وغیرہ حکومت کے خلاف نرم رویہ کے حامی تھے گاندھی جی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، جواہر لال نہرو وغیرہ حکومت کے خلاف سخت سے سخت ریزولیوشن پیش کرنے اور جنگ آزادی میں بغیر پس و پیش کو دپڑنے پر آمادہ تھے۔ ایک وقت آیا تھا جب موتی لال نہرو ترک موالات کے ریزولیوشن کے خلاف مدلل تقریر کر رہے تھے اور فوراً ہی جواہر لال نہرو جو اس وقت الہ آباد کے نوجوان بیرسٹر تھے۔ موتی لال نہرو کے خلاف بولنا شروع کر دیتے تھے اس طرح نرم گرم لیڈروں میں بڑے جوش و خروش کا مباحثہ جاری رہتا۔ مجمع اس بلا کا تھا کہ ہال میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی اسی طرح ہال کے باہر بھی بے انتہا مجمع ہو گیا تھا۔ گاندھی جی اور محمد علی باری باری باہر جاتے تھے اور مجمع کو پرسکون رہنے کی تاکید کرتے تھے اسی ریزولیوشن میں انگریزی مصنوعات اور کپڑوں وغیرہ کے

بائیکاٹ کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ مولانا محمد علی ڈائس پر بیٹھے تھے کہ ان کی نظر اپنے ایک رام پور کے عزیز دوست پر پڑی جو مجمع میں بیٹھے تقریریں سن رہے تھے چونکہ مولانا محمد علی کو رام پور میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی اس لئے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مولانا سے ملنا بھی چاہتے تھے۔ یہ عزیز چوڑی دار پاجامہ، شبنم کا کرتا اور کچی جامدانی کا سفید انگرکھا پہنے تھے۔ مولانا محمد علی انھیں دیکھتے ہی اسٹیج سے اٹھ کر ان کے پاس آئے اور ان سے بغل گیر ہوگئے بہت جوش و خروش سے بوس و کنار شروع ہو گیا اور اسی حالت میں مولانا محمد علی کا ہاتھ ان کے گریبان پر پڑا اور ان کا کرتہ پھاڑنا شروع کر دیا یہاں تک کہ ان کا کرتہ اور انگرکھا دونوں پھٹ کر نیچے گر گئے اور ان کا سینہ عریاں ہوگیا غصہ صرف اس پر تھا کہ یہ میں بدیسی کپڑے کیوں پہن رہے ہیں اور ہاتھ کا کتا موٹا کھدر کیوں استعمال نہیں کرتے۔ یہ مناظر آنے والے انقلاب کا پیش خیمہ تھے جس نے ترک موالات، مکمل آزادی اور ہندوستان چھوڑو کے نعرے اختیار کئے۔ اسی کانفرنس کی شرکت کے لئے علی گڑھ کالج سے چند طلباء آئے جن میں شفیق الرحمن قدوائی صاحب اور ارشاد الحق صاحب خاص طور پر قابل ذکر تھے۔ انھوں نے مولانا محمد علی سے ملاقات کی اور یہ درخواست کی کہ ترک موالات کی تحریک علی گڑھ سے شروع کی جائے یونیورسٹی کے طلباء اس میں شریک ہوں گے اور تمام ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خلاف مظاہرے کریں گے مولانا محمد علی خود دل سے چاہتے تھے کہ یہ تحریک علی گڑھ سے شروع ہو لیکن انھیں ڈر تھا کہ اگر ان کی آواز پر علی گڑھ کے طلباء نے لبیک نہ کہا تو بڑی بھد ہوگی۔

ان طلباء کے اصرار اور یقین دلانے پر وہ گاندھی جی کو علی گڑھ لانے کے لئے آمادہ ہوگئے طلباء کا وفد علی گڑھ واپس گیا اور وہاں اعلان کیا کہ گاندھی جی کے ساتھ مولانا آنے والے ہیں جلسہ کی تیاریاں کی گئیں اور یونین میں گاندھی جی، مولانا محمد علی، شوکت علی اور سروجنی نائیڈو کی تقریریں ہوئیں جو بے حد کامیاب اور مقبول ہوئیں یہ حضرات واپس چلے گئے اس کے بعد یونین کا دوبارہ جلسہ ہوا اور تھوڑے سے اختلاف کے بعد مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی کی مجوزہ تحریک کی موافقت میں قرارداد منظور ہوگئی اس سب تحریک سے ڈاکٹر ضیاالدین صاحب کو شدید اختلاف تھا لیکن طلباء کے جوش اور مولانا محمد علی کی شخصیت کی تابناکی کے آگے ان کی تمام رکاوٹیں ماند تھیں۔ چنانچہ ایک نیشنل یونیورسٹی کا خاکہ تیار کیا گیا تاکہ وہ طلباء جو علی گڑھ کالج سے کنارہ کش ہونا چاہتے ہیں یا جو اس تحریک سے متاثر ہو جانے کی وجہ سے نکال دیئے جائیں گے، ان کی تعلیم اور تربیت کا انتظام کر سکے۔ مقصد یہ تھا کہ طلباء اچھے ہندوستانی اور سچے مسلمان بنیں اور

تعلیم کی زبان مادری ہو۔

مولانا محمد علی یہ چاہتے تھے کہ نیشنل یونیورسٹی کا افتتاح شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے مبارک ہاتھوں سے عمل میں آئے۔ مولانا محمود حسن اس وقت بیمار تھے اور ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کے زیر علاج تھے اسی عالم میں مولانا محمد علی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نیشنل یونیورسٹی کا خاکہ پیش کیا اور اس کے افتتاح کرنے کی درخواست کی ہر چند کہ مولانا شدید بیمار تھے اور معالج ہرگز نہ چاہتے تھے کہ یہ ذرا بھی حرکت کریں لیکن مولانا نے اسی کیفیت میں علی گڑھ جانا طے کر دیا اور فرمایا کہ اگر میرے کسی عمل سے انگریزی حکومت کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے اس پر ضرور عمل کروں گا اور اگر میں راستے میں مر جاؤں تو میرا جنازہ وہاں لے جا کر رکھ دینا چنانچہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ کو مولانا شیخ الہندؒ اسٹریچر پر علی گڑھ تشریف لائے اور یونیورسٹی کی مسجد میں تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ مسجد طلباء سے بھری ہوئی تھی مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے شیخ الہند کا خطبہ پڑھ کر سنایا اور مولانا محمد علی نے انتہائی عالمانہ اور جامع تقریر کی اور نئی یونیورسٹی کا جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے قیام عمل میں آیا۔

حکیم اجمل خاں صاحب امیر جامعہ، مولانا محمد علی پرنسپل اور مولانا ابوالکلام آزاد صاحب ڈین (ناظم دینیات) مقرر ہوئے۔ اسی اثناء میں ڈاکٹر ضیاء الدین نے تمام طلباء کے سرپرستوں کو بلانے کیلئے تار بھیجے تاکہ وہ آکر طلباء کو سمجھائیں یا اپنے ساتھ واپس لے جائیں۔ بیشتر سرپرست طلباء کے احتجاج سے سخت نالاں تھے لیکن طلباء کسی قیمت پر ان کی سننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ بالآخر ایک صبح پولس کے ذریعہ طلباء کو ہوسٹل سے نکال دیا گیا۔ مولانا محمد علی نے چند کوٹھیوں اور خیموں کا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا چنانچہ علی گڑھ سے نکالے ہوئے طلباء کا جلوس مولانا محمد علی کی قیادت میں لال ڈگی پہنچ گیا اور وہاں فروکش ہو گیا۔ ان ہی خیموں اور شامیانوں میں بورڈنگ ہاؤس اور ڈائننگ ہال وغیرہ بنائے گئے اور کلاس باضابطہ شروع ہو گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا محمد علی اور بعد میں مولانا سورتی، مولانا اسلم جیراج پوری، خواجہ عبدالحی اور مولانا شرف الدین ٹونکی نے مختلف مضامین کے کلاس لینے شروع کئے۔ مولانا محمد علی کا مستقل قیام جامعہ میں رہا اس زمانے کے علماء اور بڑے بڑے لیڈر اور ممتاز ہستیاں مختلف وقتوں میں جامعہ پہنچتے رہے ان کی تقریروں اور وعظوں کا یہ اثر تھا کہ جامعہ کے طلباء بڑے بڑے عابد و زاہد سے زیادہ عبادت کرتے تھے اور باجماعت نماز ادا کرتے تھے۔

یہاں تک کہ شدید سردی میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرکے تہجد کی نماز ادا کرتے تھے۔ اس دور کے طلبا میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر محمد اشرف، سید محمد ٹونکی، عبدالعلیم احراری، یوسف حسین خاں اور نورالرحمن وغیرہ تھے جنھوں نے آزاد ہندوستان کے سیاسی، ادبی اور ثقافتی میدانوں میں ممتاز حیثیتیں حاصل کیں۔

مولانا محمد علی کی ہمہ گیر شخصیت، ان کی غیر معمولی ذہنی اور دماغی رفعت، انسانی ہمدردی، وسعت قلب و نظر، دوسروں کا اکرام، ضرورت مندوں کی حاجت روائی، دوستوں اور رفیقوں کے ساتھ وفا شعاری اور سخاوت اور سیر چشمی کے علاوہ ان کا سب سے بڑا وصف ان کا خلوص تھا جس میں وہ اپنے سب ہم عصروں میں نمایاں اور ممتاز تھے۔ ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا۔ ان کی ساری زندگی ایک کھلی کتاب تھی جس میں کوئی راز نہ تھا مصلحت بینی سے وہ کوسوں دور تھے حق گوئی اور بیباکی سے وہ کبھی چوکتے نہ تھے۔ ان کے قریبی دوست ان کی ان اداؤں پر اکثر اعتراض کرتے تھے مگر وہ باز نہ آتے تھے۔ صحافت نگاری میں جہاں ہر آن مصلحت وقت اور دوراندیشی کی ضرورت ہوتی ہے وہ حق گوئی اور جرأت سے باز نہ آتے تھے۔ اسی وجہ سے دوسرے ان سے ہراساں اور شاکی رہتے تھے۔ جب سیاست میں قدم رکھا اور برادران وطن اور عوام کو اپنے گرد پروانہ وار جمع دیکھا تب بھی صدق گوئی بیباکی اور بے خوفی میں کوئی کمی نہیں آئی مولانا محمد علی مکمل آزادی اور غیر مشروط خود مختاری کے قائل اور حامی تھے اور اس سے کم کے لئے وہ کسی صورت میں بھی تیار نہیں تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں جب انہوں نے گول میز کانفرنس میں شرکت کی تو اسی مطالبے پر زور دیا۔ یہی وہ آخری تقریر تھی جس میں اس مرد مجاہد نے غلام ہندوستان کو واپس جانے سے انکار کر دیا تھا اور اپنے محکم عزم سے اس کو سچ کر دکھایا ۴ جنوری ۱۹۳۱ کی صبح کو لندن میں ان کا انتقال ہوا اور بیت المقدس میں مدفون ہوئے۔

ہم نے بلبل سے جو پوچھا دردِ فرقت کا علاج
شاخ گل سے گر پڑی، تڑپی، تڑپ کر مر گئی

امجدی بیگم مرحومہ

خطوط بیگم محمد علی

مولانا محمد علی کے آخری ایام

(ذیل میں بیگم محمد علی کے وہ خطوط شائع کئے جاتے ہیں جو انہوں نے گول میز کانفرنس کے زمانے میں لندن سے اپنی بڑی صاحبزادی، زہرہ بی کو لکھے تھے۔ بیگم محمد علی بقول مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم: محض بیوی نہ تھیں، محبوب اور بڑی چہیتی بیوی تھیں اور آخر وقت میں اپنے شوہر نامدار کا ساتھ دینے کے لئے ہمراہ ہی تھیں اور ان کی آخری عمر کی منزل میں بھی زندگی بھر کی رفاقت کا حق ادا کر رہی تھیں۔ مولانا کی چھوٹی صاحبزادی گلنار بی اپنے شوہر شعیب قریشی (وزیر ریاست بھوپال) کے ساتھ خود بھی اس وقت انگلستان میں تھیں، مولانا شوکت علی بھی لندن ہی میں تھے۔ ان خطوط کو یہاں شائع کرنے کی بڑی اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان سے مولانا کی اُس زمانے کی سرگرمیوں اور ان کی صحت کے بارے میں تفصیل سے صحیح حالات پر روشنی پڑتی ہے۔)

(۱)

۲۹۴۔ مرٹن روڈ، لندن (S. W. 18)　　　　۱۱ر نومبر ۳۰ء

پیاری زہرہ، دعا

تمہارا خط اس ہفتے نہیں آیا، نہیں معلوم کیا بات ہے، ہر ہفتے خط لکھتی رہیں، ناغہ نہ کرنا۔ تمہارے ابا کی طبیعت پھر دو تین روز خراب رہی، کیونکہ یہاں آنے کے بعد لوگوں سے ملنا ملانا رہتا ہے، کمزور بہت ہو گئے ہیں، اس وجہ سے تھک جاتے ہیں۔ اور سے کانفرنس شروع ہے، وہاں جانا ہوتا ہے۔ صبح دس بجے وہ وہاں جاتے ہیں اور مجھے یہاں چھوڑ جاتے ہیں ایک بجے واپس آجاتے ہیں، میں یہاں

گلنار کے پاس رہتی ہوں اور اگر وہ کہیں باہر پھرنے جاتی ہے تو میں بھی چلی جاتی ہوں۔ چونکہ تمہارے ابا اچھے ہوتے تو کہیں لے جاتے اور کچھ دکھاتے۔ لیکن وہ بیمار ہیں، شعیب کو کام سے فرصت نہیں ملتی، بیگم صاحبہ سے ملاقات ہو جاتی ہے، اکثر دوپہر کا کھانا اور شام کی چائے ان کے ساتھ پیتی ہوں، صبح کی چائے اور رات کا کھانا گھر پر کھاتے ہیں۔ دال بھات، پوری ترکاری، زاہدا اور شوکت صاحب بھی مل جاتے ہیں، تمہارے ابا تم کو اور طارق کو پیار کہتے ہیں، انہوں نے اپنے ہاتھ سے تم کو خط لکھا تھا[1]، امید ہے کہ ملا ہوگا اور اس میں سب پورا حال لکھا تھا۔ آج دہلی کی لڑکی رشیدہ آرہی ہے اور ان کی بہن زہرہ کلکتہ والی، چلتے پر گلنار کے پاس۔ میرے نام رشیدہ کا خط آیا تھا تو میں نے رات کو ٹیلیفون کیا تھا کہ تم ضرور آکر ملو اور میں بھی گلنار کے پاس ہوتی ہوں، وہیں آکر چائے پیو تو وہ آرہی ہیں اور آج رات کو مہاراجہ بڑودہ نے کھانے پر صاحب کو بلایا ہے اور مہارانی بڑودہ نے مجھے بلایا ہے، وہاں جانا ہے۔ اگر تمہیں کوئی خاص چیز منگانا ہو تو مجھے لکھو کہ میں تمہارے لئے کیا لیکر آؤں، میرا تو بڑا کوٹ لینے کا ارادہ ہے، اگر صاحب کی دوا سے روپیہ بچا تو، لیکن تم بھی لکھنا کہ تم کو کیا چاہئے اور طارق کے لئے کیا لاؤں، طارق کو خوب پیار۔ تمہارے ابا کی بیماری نے مجھے بھی تھکا دیا، چونکہ کوئی آدمی نہیں، کام کرتے کرتے تھک جاتی ہوں، خط لکھنے کو بھی فرصت نہیں ملتی۔ لیکن تھوڑا سا اس لئے لکھ لیتی ہوں کہ اگر نہیں جائے گا تو تم پریشان ہو جاؤ گی۔ اب رخصت ہوتی ہوں۔ سب کو سلام دعا کہدینا۔ تمہارے ابا طارق کو پیار کہتے ہیں خدا حافظ۔

تمہاری والدہ، امجدی

---

[1] مولانا محمد علی کے جو خطوط میری نظر سے گذرے ہیں، ان میں زہرہ بی کے نام صرف دو ہیں، ایک ۶ نومبر ۱۹۳۰ء کا جو گول میز کانفرس میں شرکت کے لئے جاتے وقت پیرس سے لکھا گیا ہے، جہاں مولانا بیماری کی وجہ سے کچھ روز کے لئے رک گئے تھے، دوسرا ۲۶ دسمبر ۱۹۳۰ء کو لندن سے لکھا گیا ہے۔ یہ دونوں خطوط "محمد علی ۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق" (حصہ دوم) مولفہ مولانا عبدالماجد دریابادی (مطبوعہ ۱۹۵۶ء) میں شائع ہوئے ہیں (صفحات ۱۶۵ - ۱۷۶) ان میں مولانا نے اپنی بیماری کی کیفیت بہت تفصیل سے لکھی ہے۔

(۲)

ہائڈ پارک ہوٹل، نائٹس برج لندن (S.W.1) ۲۷ر نومبر ۱۹۳۰ء

پیاری زہرہ، دعا

تمہارے صرف دو خط آئے ہیں، تم نے اپنے میرٹھ جانے کا لکھا تھا، اس کے بعد سے کوئی خط نہیں آیا ہے۔ میں تم کو برابر ہر ہفتے خط لکھ رہی ہوں۔ تمہارے ابا کی طبیعت اچھی ہے، لیکن پیر کو پیڑو اور رانوں پر ورم بہت زیادہ ہو گیا ہے، اس وجہ سے دو روز سے پلنگ پر ہیں، آرام کر رہے ہیں۔ برابر سب جگہ سے بلاوے آ رہے ہیں، لیکن کوئی ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے نہیں جا سکتی ہوں، تمہارے ابا کی طبیعت درست ہوتی ہے تو کہیں چلی جاتی ہوں، اگر انگریزی جانتی ہوتی تو خود بھی جا سکتی تھی۔

حبابت کی ائی نادرہ ایک روز میرے پاس آئی تھی اور پھر ہم سب کو بلایا تھا۔ میں، صاحب، شوکت حسین اور زاہد گئے تھے کھانے پر لیکن گلنار نہیں گئی تھی۔ پھر رشیدہ دہلی والی اور زہرہ دونوں کو گلنار نے چائے پر بلایا تھا۔ غلطی سے وہ یہ سمجھیں کہ میں نے بلایا ہے۔ میں نے ٹیلیفون میں کہدیا تھا کہ میں روز وہیں ہوتی ہوں، ہم دونوں وہاں مل جائیں گے، وہیں آ کر ہمارے ساتھ چلتے ہو، لیکن وہ میرے یہاں چلی گئی میں ان سے پوری طرح بات بھی نہ کر سکی، کیونکہ صاحب کی طبیعت اس روز اچھی نہیں تھی۔ پھر وہ دونوں مجھے اور گلنار کو لینے آئیں تھیں، میں دوسری جگہ چائے پر گئی تھی، وہ صاحب اندور رہ چکے ہیں، وہاں بیگم بھوپال بھی گئی تھیں، پھر وہاں سے واپسی پر میں رشیدہ کے پاس گئی تو معلوم ہوا کہ انہوں نے کھانے اور چائے دونوں پر بلایا تھا کھانا کھایا ہندوستانی، پھر رات کو واپسی ہوئی، گلنار کو وہاں چھوڑ کر صاحب کو لیکر گھر واپس ہوئی۔ اب کل سے ہم اس ہوٹل میں آ گئے ہیں، کیونکہ وہ جگہ بہت دور تھی، ایک تو موٹر کا خرچہ زیادہ پڑتا تھا، دوسرے آنے جانے میں ایک گھنٹہ لگ جاتا تھا اور پھر صاحب کے دل کے لئے بھی اچھا نہیں تھا کہ اتنی دیر موٹر میں لگے۔ مجھے آرام تھا، چونکہ کھانے کا پوری، ترکاری، دال بھات مل جاتا تھا، اب تو پیرس کی طرح چائے اور ٹوس پر گذر ہو گی، لیکن یہاں صاحب کو آرام ملے گا، یہاں خرچ بھی زیادہ ہو گا، لیکن مجبوری ہے، کیا کیا جائے۔ نواب صاحب کی جگہ سے بھی بہت دور ہے اور جہاں ان کو کانفرنس میں جانا ہوتا ہے، وہ بھی دور۔ یہاں اب دونوں جگہ قریب ہیں اور سب طرح آرام ہے، میں لندن سے بیزار ہو گئی ہوں۔ خدا کرے یہ کام جلدی ہو جائے اور کامیابی ہو تو واپس اپنے گھر جاؤں۔

تم اور طارق بہت یاد آتے ہو بیگم صاحبہ سے بھی قریب قریب روز ملاقات ہو جاتی ہے۔ چونکہ گلنار اوپر کے کمرے میں رہتی ہے، صاحب جب کانفرنس میں جاتے ہیں تو مجھے وہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ گلنا رکھانا جاتے بیگم صاحبہ کے ساتھ ہی کھاتی ہے تو میں بھی اکثر کھانے پہ چلی جاتی ہوں۔ قریب قریب روز، ایک روز دو روز بعد ملاقات ہو جاتی ہے۔ گلنار اچھی ہے اور شعیب بھی اچھے ہیں، دونوں آداب عرض کرتے ہیں۔ شعیب کو کام بہت ہے، دن بھر دیکھنے کو بھی نہیں ملتا گلنار اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی ہے، یا میں جاتی ہوں تو ہم دونوں ہوتے ہیں۔ کبھی بیگم صاحبہ کے پاس چلی جاتی ہے۔ بہن پیاری بیگم کا بھی خط آیا ہے۔ وہ خیریت سے ہیں۔ اب رخصت ہوتی ہوں۔ زاہد، شوکت صاحب سب خیریت سے ہیں۔ میری طرف سے باجی، ذکی کو آداب، قمر کو پیار، عذرا، صفدری، صفیہ کو دعا، عثمان فاروق کو دعا، یہ سن کر خوشی ہوئی کہ فاروق عثمان نوکر ہو گئے۔ طارق کو خوب پیار۔ خدا حافظ

تمہاری دعا گو، والدہ

(۳)

ہائیڈ پارک - نائٹس برج - لندن (ا ۰۱ نمبر S) ۱۴ ر دسمبر ۱۹۳۲ء

پیاری زہرہ، خدا تم کو زندہ و سلامت رکھے۔

تمہارا خط آیا۔ خیریت معلوم ہو کر خوشی ہوئی۔ تم نے جو خط غلطی سے زاہد کا میرے خط میں رکھ دیا تھا وہ خط جب آیا ہے تو زاہد موجود تھے۔ صاحب نے کھولا تو زاہد کا نام دیکھ کر فوراً زاہد کو دے دیا اور زاہد سے کہہ دیا کہ تمہارے نام کے لفافے میں تمہارا خط آئے گا تو مجھے بھیج دینا۔ جب زاہد چلے گئے تو تھوڑی دیر بعد کوئی ایک گھنٹے کے، میرے نام کا خط مل گیا۔ تمہارے ابا کو فکر ہو رہی تھی کہ نا معلوم ہمارے نام کیا لکھا ہوگا اور وہ اس کے مانع ہیں جاتے گا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ اب برابر خیال رکھو کہ پہلے خط لکھ کر پتہ لکھ دیا کرو۔ اس ہفتے تمہارے ابا پلنگ پر رہے، آرام لینے کی غرض سے۔ دوسرے ورم بھی ہے تو چلنے کو ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں، لیکن یہاں جب سے آئے ہیں، لوگ بہت آتے رہتے ہیں اور ٹیلیفون پر بھی باتیں کرتے رہتے ہیں، زیادہ آرام نہیں لیتے، جیسے کہ ان کی عادت ہے اب چار پانچ روز سے اس ڈاکٹر کا علاج شروع کیا ہے جس کے علاج کو مہاراجہ لوٹے نے بھیجا تھا۔ ان سے وہی پھل کھانے کو بتاتے ہیں اور سات روز تک پلنگ پر رہنے کو کہا ہے اور اسی ڈاکٹر کا علاج آج

سے میرا بھی شروع ہوا ہے۔ سب کھانا بند۔ نمک بالکل بند، صبح چائے کے وقت پھل اور شام کو
پھل اور ایک وقت کھانا، مچھلی یا مرغی کا گوشت، روٹی ٹوس نہیں۔ وہی بتائی ہے جو صاحب کو بھی
بتائی تھی۔ زاہد ساتھ گئے تھے اور وہی جایا کریں گے۔ اس ہفتے بلاوے تو بہت تھے لیکن صرف تین
جگہ گئے تھے، ایک کسی عورت کے یہاں چائے تھی ۱۲ر دسمبر کو کل سہ پہر کو ایک بہت بڑا دفتر ہے یا مکان ہے
گرل گائیڈ کا، وہ دیکھنے گئی تھی، گلنار بھی ساتھ تھی پھر ایک بجے لنچ پر وزیر اعظم کے یہاں گئے تھے۔
شوکت ماموں، زاہد تھے، سب عورت مرد پندرہ یا سولہ تھے۔ آج ڈاکٹر کو دکھانے گئی تھی اور
اب چار بجے ایک جگہ چائے پر جانا ہے، اس لئے بہت بڑا خط نہیں لکھ سکتی ہوں۔ اچھا کیا، میلاد شریف
پڑھوا دیا۔ ہر جگہ تم اور طارق بہت یاد آتے ہیں، کل وزیر اعظم کی لڑکی نے بہت خاطر کی اور چلتے وقت
سب سے اپنی کتاب پر نام لکھوائے۔ میں نے بھی لکھا لیکن میرا نام دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ کوئی
نہ کوئی عورت یا مرد ایسا مل جاتا ہے کہ میری ترجمانی کر دیتا ہے۔ تم اپنے ابا کی وجہ سے پریشان نہ ہونا
انشاء اللہ وہ ضرور اچھے ہو جاویں گے۔ اس ڈاکٹر کے علاج سے۔ تم بھی ورزش کرو اور روٹی اور
چاول کھانا چھوڑ دو تو ضرور دبلی ہو گی۔ گلنار اچھی ہے، برابر آتی رہتی ہے۔ تم کو آداب عرض کرتی
ہے۔ شعیب بھی اچھے ہیں۔ دعا کہتے ہیں۔ طارق کو ہم سب کی طرف سے خوب پیار۔ بہن کا بھی خط آیا تھا، وہ
خیریت سے ہیں، ان کے بھائی سے بھی ملاقات ہوئی جو یہاں پڑھتے ہیں۔ مظفر کے خط بھی آرہے ہیں، اس
کی رخصت دسمبر کی ۱۴ر سے جنوری کی ۲ یا ۱۲ تک ہے۔ اس کو صاحب خرچ بھیج کر بلا رہے ہیں۔ باقی
سب خیریت ہے۔ اب رخصت ہوتی ہوں۔ سب کو دعا، سلام، پیار کہہ دینا۔ چمن ماموں کو
بھی خیریت لکھ دینا۔ میں نے ان کو خط نہیں لکھا ہے۔ ابراہیم چچا سے میں کہہ آئی تھی کہ جب تک
ہم یہاں سے واپس ہوں، اماں کی تنخواہ چندریا کی اور دہلی میں چمن ماموں اور خانساماں کی تنخواہ اور کھانے
کا خرچ، مکان کا کرایہ، یہ سب تم کو معلوم ہے، جو جاتا ہے اس کا حساب کر کے ذاکر[52] صاحب
کے پاس بھیج دیا کرنا۔ جب سے لکھ کر منگائے، کوئی ڈھائی سو روپیہ کے چیک صاحب نے ان کو میرے
ہاتھ بھجوا دیئے تھے، وہ روپیہ اب تک ختم ہو چکا ہو گا۔ اس مہینے میں ان کو روپے کی ضرورت

۵۲۔ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب۔

ہو گی تو میرے حساب میں یہ ان کو جب تک ہم واپس ہوں، جاتا رہے، ضرور ضرور۔

خدا حافظ! تمہاری دعاگو، والدہ امجدی

میں خط پورا کر چکی تھی کہ تمہارا ۲۴ر کا خط ملا، اس لئے اس کا بھی جواب لکھے دیتی ہوں۔ کل ایک جگہ چلے گئے تھے تو ڈاک کا وقت نکل گیا تھا، آج اس کو پورا کر رہی ہوں، ہوائی جہاز سے بھیجا جائے گا۔ ایک جگہ سے ابھی آئی ہوں اور دو جگہ رات کو جانا ہے، ایک نواب کروائی کی بہن کے یہاں اور ایک جگہ اور۔ میں نے جو علاج شروع کیا ہے تو آج بہت تھک گئی ہوں۔ تم طارق کو بہت محنت نہ کرنے دو۔ زندہ رہے گا تو پڑھ لے گا ابھی اس کو آرام کرنے دو، بہت روز بیمار رہا ہے اور تمہارے پڑھانے سے میں بہت گھبرائی ہوں، کیونکہ تم اس کو مارتی ہو، میری طرف سے پیار۔ تمہاری خالہ کا بھی خط آیا، تمہارے ابا کی تقریر کی تعریف لکھی ہے اور یہ بھی لکھا تھا کہ زہرہ کا خط آیا ہے، رام پور کے حالات بھی سب معلوم ہوئے۔ اگر میں اس کے علاج سے دبلی ہو گئی تو تم کو بھی سب بتا دوں گی اور ورزش کراؤں گی۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ تم کو درد کی کوئی بیماری نہیں ہے، صرف سوچ بڑھتا ہے اس وجہ سے درد رہتا ہے۔ فقط، تمہاری بی

منو اور ہ کی نسبت معلوم ہو کر بہت صدمہ ہوا، اگر اسکو نوکری کرنا نہیں تھی تو آنے کی کیا ضرورت تھی اور اس کو ہمارے پاس سے کیا عـہ ر (بیس روپے) کم ہوتے، اتنے انعام ملے اور کپڑے اتنے روپیہ کے بناتے، پھر بھی اگر وہ اتنی تنخواہ پر رضامند نہ تھا تو ہم سے کہہ دیتا کہ میری گذر نہیں ہو گی تو اور زیادہ دیتے۔ ہم نے اس کو اپنے گھر کا آدمی سمجھ کر رکھا تھا۔ صفیہ نے کہا کہ وہ بے کار ہے اور نوکری کرنا چاہتا ہے، اس لئے رکھ لیا تھا۔ تم پورا حال معلوم کر کے لکھنا اور اگر وہ نوکر ہو گیا ہے تو کسی اچھے آدمی کی فکر رکھنا۔ علی حسن کو اس کا باپ لے گیا۔ کسی لاوارث لڑکے یا لڑکی کی میرے لئے تلاش رکھنا، کیونکہ یہاں سے جانے کے بعد فوراً ہی ضرورت ہو گی۔ علی حسن سے مجھے بہت محبت ہو گئی تھی لیکن اس کا باپ نہ معلوم اس سے کیا کرے گا، یہاں رہتا تو آدمی ہو جاتا۔ خود بھی خراب ہو رہا ہے، اس لڑکے کو بھی خراب کرے گا۔ خیر اس کو اختیار ہے، تم ضرور لڑکے یا لڑکی کا خیال رکھنا نہ بہت بڑا ہو نہ چھوٹا۔ تمہارے ابا دوسرے ہفتے خط لکھیں گے، اس ہفتے نہیں لکھ سکے۔ میرا، ماماں کو چنڈیا کو سلام، اخلاص کو دعا۔ بھائی جان کو صاحب خط لکھوا دیتے ہیں، اس وجہ سے میں نے نہیں لکھا ہے۔

میرا آداب عرض کر دینا' ماجد کو دعا' بچوں کو پیار' ننو کو بھی دعا' اور تمہارے ابا کہتے ہیں کہ خط صاف، ہاتھ روک کے لکھا کرو۔ ہوائی جہاز سے کیا بھیجتی ہو کہ خط بھی ہوائی جہاز کر دیتی ہو۔ کل تمہارے ابا کا فاقہ تھا، آج پھل کا رس پیا ہے' سوجن ہے' اس وجہ سے پلنگ سے ڈاکٹر اٹھنے نہیں دیتے ہیں۔ ویسے طبیعت اچھی ہے۔ تم دعا کیے جاؤ اور پریشان نہ ہوا کرو کہ جس کام کے لیے آئے ہیں' بیماری کی حالت میں اس میں کامیابی ہوا اور ہم سب زندہ وسلامت خوشی خوشی اپنے گھر واپس جائیں۔ آمین

(۴)

لندن ۱۹ر دسمبر ۳۰ ۱۹ء

پیاری زہرہ، دعا پیار

تم زندہ سلامت رہو۔ اس ہفتے تمہارا خط نہیں آیا، نہ معلوم کیا بات ہے۔ اس ہفتے تو گلنار کے خط میں رکھ کر آیا تھا' اس سے خیریت معلوم ہو گئی۔ قاسم صاحب کی بابت جو تم نے لکھا تھا کہ وہ بیمار ہیں اور علاج کے لیے رخصت پر آرہے ہیں۔ اچھا کیا تم نے ان کو مکان میں رہنے کے لیے لکھ دیا۔ اگر ہم آبھی جائیں گے تو اتنی جگہ ہے کہ سب رہ سکتے ہیں۔

تمہارے ابا کا وہی حال چلا جاتا ہے' چونکہ کمزور ہو گئے ہیں اس لیے اگر تھوڑا بھی کام کرتے ہیں یا کانفرنس میں کسی روز چلے جاتے ہیں تو زور بڑھتا ہے۔ ورم ابھی تک چلا جا رہا ہے۔ پیشاب بڑھانے کی دوا بھی دی۔ ڈاکٹر یہی کہتے ہیں کہ آرام کرنا چاہیے۔ جب سے اس ہوٹل میں آئے ہیں، برابر آرام کر رہے ہیں۔ کہیں آتے جاتے نہیں ہیں' صرف کبھی بہت ضرورت ہوتی ہے تو کام سے چلے جاتے ہیں۔ وہ یہاں سے لفٹ میں گئے ٹیکسی میں بیٹھے' وہاں جا کر لفٹ میں اوپر چلے گئے۔ مظفر اچھے ہیں۔ اچھی طرح ہیں۔ کمزوری بہت ہو رہا ہے' دبلا ہو گیا ہے' صحت اچھی نہیں رہتی ہے۔ امتحان سب پاس ہو گیا، بیگم صاحبہ بھوپال اور لڑکیاں ۲۴ر کو جا رہی ہیں۔ گلنار بھی ساتھ جاتی۔ لیکن ابھی کام شعیب کا ہے' اس وجہ سے وہ بھی نہیں جا سکتی ہیں، اگر شعیب جاتے تو وہ بھی چلی جاتی۔

نواب صاحب بھوپال ابھی نہیں جا رہے ہیں' وہ جب کانفرنس ختم ہو جائے گی تو جائیں گے' سن رہے ہیں کہ جنوری کی شروع تاریخ میں ختم ہو جائے گی، خدا کرے جلد ہو جائے۔

میں تو بہت گھبرا گئی ہوں۔ صاحب کی علالت کی وجہ سے اور اگر وہ اچھے ہوتے تو کچھ نہیں تھا،
کہیں جاتی بھی ہوں تو دل نہیں لگتا، مجبوراً چلی جاتی ہوں۔ اس ہفتے میرا وزن بہت کم ہو گیا۔
ورزش برابر کر رہی ہوں، زیادہ ورزش کرنے کو تو نہیں ملتا، پھر بھی دو وقت کرتی ہوں۔ تھوڑا کچھ گوشت
مچھلی کھا لیتی ہوں اور تھوڑے پھل۔ بہت اچھی طبیعت معلوم ہوتی ہے۔ تم بھی ہلکا کھانے کی کوشش کرو۔
میں اس ہفتے کئی جگہ گئی۔ ۱۵ر کو رات کو ڈنر تھا۔ پرنس آف کناٹ برٹش انڈیا یونین جو اسی ہوٹل میں تھا،
تو میں صاحب کو بھی لے گئی تھی۔ ہر وقت بڑے بڑے ایک ہی خیال دل میں رہتا ہے، آج تک کہیں نہ
جا سکے۔

۱۶ر کو مانوں کا کلب، ۴ بجے چائے پر گئے تھے۔ رات کو ایک یہودی کے یہاں ڈنر تھا، وہاں
لے گئے۔ ہاں پھر ۱۰ بجے وہاں سے لارڈ ریڈنگ کے یہاں ریسیپشن تھا، گئے۔ وہاں پرنس آف ویلز
بھی آئے تھے۔ وہاں سے ۱۱ بجے واپس آئے۔ اس رات کو ۳ بجے دل کا دورہ صاحب کو ہوا۔ مہاراجہ
الور کے دو ڈاکٹر یہاں رہتے ہیں، ان کو بلا کر دکھایا، انہوں نے جو دوائی دی پی رہے ہیں۔ اس سے آرام
ہوا، صبح کو اسی ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا، اس نے کہا کہ کسی کو آنے جانے نہ دو، اب کل سے آج طبیعت
بہتر ہے۔ تم گھبرانا نہیں، میں کُل حال تم کو لکھ دیتی ہوں۔

۱۷ر کی رات کو مہاراجہ صاحب الور کے ہاں دعوت تھی کوئی پانچ سو آدمی کی۔ نہ میں جا سکی اور
نہ صاحب جا سکے، مجبور تھی۔ ۱۸ر کو یہاں کی مسجد کی طرف سے لوگوں کی چائے تھی۔ آج ۱۹ر کو ۴ بجے
برٹش انڈیا یونین کی چائے ہے۔ وہاں جاؤں گی۔ کل ۲۰ر کو نواب صاحب بھوپال کے یہاں ہے، وہاں بھی
جاؤں گی۔ صاحب بیچارے نہیں جا سکتے ہیں، باقی سب خیریت ہے، اب رخصت ہوتی ہوں۔ باقی
پچی کو میری طرف سے اور صاحب کی طرف سے آداب عرض کر دینا اور کہہ دینا کہ مہاراجہ صاحب
اندر پیرس کے بھی باہر رہتے ہیں اور ان سے کسی کو ملنے کی اجازت بھی نہیں ہے اور نہ ان کے اختیار
میں کچھ ہے کہ وہ کسی کے لئے کچھ کر سکیں۔ سب کو دعا سلام، بھائی جان کو میرا اور مظفر کا آداب، تم کو
اور طارق کو مظفر پیار کہتا ہے۔ ننو کو دعا، اچھو کو آداب۔ خدا حافظ!

تمہاری والدہ امجدی

(۵)

ہائیڈ پارک ۔ فائٹس برج، لندن (S.W.1)   ۲۶ر دسمبر ۱۹۳۰ء

پیاری زہرہ،   دعا

تم زندہ، سلامت، تندرست رہو۔ تم پر جو اپنے باپ کی وجہ سے پریشانی گزری ہوگی، اس کا بھی مجھے اندازہ ہے لیکن کیا کیا جائے، اخبار والے نہیں مانتے، لکھ دیتے ہیں، میری رائے نہیں تھی۔ اب سنو کہ کیا ہوا۔ میں بیٹھے بیٹھے تم کو خط لکھ رہی ہوں اور کل حال جو ان کا ہوتا ہے، لکھتی رہی ہوں۔

۱۶ر کو یہاں سے کانفرنس میں گئے، وہاں سے واپس آئے تو کوئی ملنے آیا تھا، اس سے باتیں کرتے رہے، پھر سوگئے۔ رات کو تین بجے دل کا دورہ ہوا، ڈاکٹر کو ٹیلیفون کیا، مہاراجہ الور کے یہاں دو ڈاکٹر رہتے ہیں، مقبول اپنے ساتھ لے کر آئے، وہ مقبول جن کے یہاں شملہ جاتے ہوئے سوسن پر کھانا کھایا تھا، دوا دی۔ میں پہلے وہ دوا رومال میں دے چکی (سونگھا چکی) جو ڈاکٹر رحمن نے چلتے وقت دی تھی کہ کہیں ایسا ہو تو سونگھانا۔ اس سے کچھ آرام آیا، سوگئے، دن کے دس بجے تک سوتے رہے، پھر ڈاکٹر کو ٹیلیفون کرکے بلایا، ڈاکٹر مانک تہمینہ بائی کے شوہر، انہوں نے کہا کہ بیگم صاحبہ میں نے ایسی حالت کسی روز صاحب کی نہیں دیکھی، میں اتنے روز سے علاج کر رہا ہوں، کسی کو کمرے میں نہ آنے دو اور نہ کسی سے بات کرنے دو اور نہ لکھنے پڑھنے کا کام۔

۱۷ر کو مہاراجہ الور کے یہاں ڈنر تھا، وہاں نہیں جاسکے۔ شوکت صاحب چلے گئے۔

۱۹ر کو ہندوستان کی ڈاک لکھواتے رہے، خود بولتے جاتے تھے اور سکریٹری لکھ رہے تھے، لیکن پھر بھی حالت یہ تھی کہ آواز پر کمزوری معلوم ہوتی تھی۔ بھائی کو خط لکھوا رہے تھے۔ بی اماں کو آداب، بہن کو دعا۔ خیر وہ خط پورا ہوا۔ مجھے ایک جگہ چائے پر جانا تھا لیکن نہیں گئی اور اسی روز مہاراجہ الور نے چائے پر بلایا تھا تو صاحب نے کہا کہ اسی ہوٹل بلکہ اسی منزل پر دوسری طرف ہے، چلی جاؤ۔ میں وہاں گئی، وہاں سے واپس آئی تو خط پورا کرا چکے تھے لیکن اسی کا پورا کرنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ ٹیلیفون کرکے ڈاکٹر کو بلایا تو وہ دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس نے دوسرے ڈاکٹر کو جو دل کا علاج کرتا ہے، اس کی برابر رائے لی جارہی تھی، ایک مرتبہ پہلے اس کو دکھا دیا گیا تھا، اس کو بلایا، دونوں نے دیکھا اور مجھے کہا کہ ہم نرس کو بھیجتے ہیں، ایک نرس دن میں اور ایک رات میں رہے گی

اماں کو پلنگ سے ہلنے نہ دو۔ غرض یہ کہ نرس آگئی، رات بڑی تکلیف رہی اور بڑی مشکل سے رات کٹی صبح کو غفلت ہوگئی، گلنار آگئی۔ میں اور وہ بیٹھے دیکھتے رہے، اس وقت تک نہ شوکت ماموں آئے تھے، نہ زاہد۔ زاہد کے پیر میں کچھ تکلیف ہوگئی تھی۔ شعیب کو تو نواب صاحب کے کام سے فرصت ہی نہیں ملتی ہے، کبھی رات کو تھوڑی دیر کو یا کبھی دن کو آگئے۔ وہ رات ایسی کٹی کہ جیسے شملہ[۳۵] پر کٹی تھی۔ وہاں تم بھی تھیں، یہاں نرس اور میں اکیلی اور جب قوت تھی اور اب کمزوری[۳۶]

میں نے گلنار سے کہا کہ میرا تو ان کی حالت دیکھ کر دل گھبرا جاتا ہے، تم جا کر ڈاکٹر رحمٰن کو بھیجو۔ جب ڈاکٹر رحمٰن آئے تو انہوں نے کہا کہ بھابی! دعا کرو اور میں بھی دعا کرتا ہوں تو میں اور گھبرا گئی اور باہر کمرے کے نکل کر آئی کہ شوکت صاحب کو ٹیلیفون کروں، اتنے میں ڈاکٹر آگئے۔ اور انہوں نے رات کی رپورٹ دیکھی اور نبض دیکھی، تو نبض کا پتہ نہیں۔ اس نے گھبرا کر شوکت صاحب کو ٹیلیفون کیا کہ تمہارے بھائی کی یہ حالت ہے، جلد آؤ، یہ بے چاری ایک عورت کیا کرے گی۔ خیر وہ آئے۔ زاہد، شعیب، مظفر سب آگئے۔ میری بری حالت ہوگئی، میں دوسرے کمرے میں آکر رونے لگی۔ پھر دل کا ڈاکٹر رحمٰن اور مانک سب کی رائے ہوئی کہ کیا کیا جائے۔ ڈاکٹر رحمٰن نے کہا کہ حالت نازک ہے۔ لیکن میری رائے ہے کہ جلاب کی دوا دی جائے۔ دوا اور انجکشن دئے گئے، ایک دل کے لئے اور ایک پیشاب کے لئے تو پیشاب آیا اور کہا کہ ۲۸ گھنٹے خطرے کے ہیں، یہ گذر جائیں (تو اطمینان ہو)

رات کو پھر ڈاکٹر آئے تو کچھ حالت بہتر بتائی، اس وقت وہ چلے گئے۔ رات کو شوکت صاحب اور میں دوسرے برابر کے کمرے میں رہے اور جا کر دیکھتے رہے۔ دوسرا کمرہ اور لیا۔ صبح ہوئی تو اجابت

۳۵۔ لندن جاتے وقت جب مولانا کی حالت بہت زیادہ خراب ہوگئی تھی اور انھیں پیرس میں علاج کے لئے اتار لیا گیا تو مولانا نے بھی اس بیماری کی شدت کو شملہ کی بیماری کے مشابہ قرار دیا تھا۔ یہ لکھنے کے بعد: "میں نے دوبارہ زندگی پائی، حقیقتاً جو دھچکا مجھے اس بار لگا ہے وہ سب سے زیادہ سخت تھا" زہرہ بی کے خط میں لکھتے ہیں: "خون کا دباؤ بالکل شملہ کی طرح ۱۹۰ سے اوپر ہوگیا تھا اور لیٹنا سانس کے باعث ناممکن ہوگیا تھا" (ذاتی ڈائری حصہ دوم صفحہ ۱۶۵)

۳۶۔ یہی بات مولانا نے بھی لکھی ہے: "شملہ میں مرض کا پہلا سخت حملہ تھا اور بدن میں مقابلے کی قوت تھی... مگر بدن میں اب جان نہ تھی" (ایضاً صفحہ ۱۶۶)

ہونا شروع ہوئی۔ دن رات میں بارہ انجکشن ہوتے تو پھر ڈاکٹر آتے تو کہا کہ نبض اب کل سے آج بہتر ہے اور کل سے ٹوس اور ابلی مچھلی ملنے لگی ہے، لیکن کمزور بہت ہو گئے ہیں۔ سب ڈاکٹروں کی یہ رائے ہے کہ نرسنگ ہوم میں بھیج دیا جائے، شاید دو چار روز میں بھیج دیں گے اب ان میں اتنی قوت نہیں ہے کہ خدا نہ کرے دل کا دورہ ہو اور اس کی برداشت کر سکیں۔ وہ مانتے نہیں۔ ذرا طبیعت ٹھیک ہوئی تو باتیں کرتے ہیں۔ ہم نے جا کر کہہ دیا کہ آپ کی یہ حالت ہو گئی تھی، خدا نے بچا لیا تو کہہ رہے تھے، نہ جانے میری بیٹی زہرہ کی کیا حالت ہو گئی ہو گی۔ آج کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ میں خط اپنے ہاتھ سے زہرہ کو لکھوں گا۔ میں نے کہا کہ میں تو لکھ رہی ہوں، اگلے ہفتے لکھنا۔

ہم سب وہاں زیادہ نہیں جاتے ہیں کہ یہ باتیں کریں گے، لیکن وہ نرس سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ مظفر کی وجہ سے مجھے بہت آرام ملا کہ میں اکیلی نہیں رہی اور سب تو آتے جاتے رہتے تھے لیکن وہ ہر وقت میرے پاس رات کے گیارہ بجے تک رہتا ہے۔ میں نے تو دو روز کھانا نہیں کھایا، نہ اس نے کھایا، نہ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں جاتا تھا۔ ۲۲ کو دوپہر کو میری بری حالت ہونے لگی بھوک کے مارے، تو یہاں ایک مسلمان کی دوکان ہے، ہوٹل ہے کھانے کا۔ وہاں ہندوستانی کھانا ملتا ہے۔ میں پہلے کبھی ہفتے میں ایک مرتبہ وہاں جا کر کھانا کھا آتی تھی، وہاں سے ٹیلیفون کر کے دو آدمی کا کھانا منگایا، اس وقت گلنار شعیب آئے تو انہوں نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا اور زاہد تھے۔ ہم سب نے مل کر کھایا اور خدا کا شکر ادا کیا۔

تمہارا خط جس میں تم نے روپیہ کا لکھا تھا، تمہارے ابا کے نام تھا، وہ ان کو نہ دکھا سکی، صرف کہہ دیا کہ زہرہ کا خط آیا ہے، وہ خیریت سے ہے تو رونے لگے کہ ارے میری بیٹی کا نہ معلوم کیا حال ہو گا۔

صاحب نے جنوری کو بھوپال سے چچا کو خط لکھ دیا تھا، اگر میرا روپیہ نہیں بھی تھا تو کیا تھا۔ میرا روپیہ جب جمع ہوتا تھا اور برسوں رہا تو تمام خاندان کے خرچ میں آتا تھا اور اب مجھے ضرورت ہے تو دو ہزار نہیں چار ہزار نہیں، صرف تین چار سو کا کسی کو ہمارا اعتبار نہیں تو میں نے بھی بھائی جان کو خط لکھ دیا ہے۔ اور تم بھی ان سے کہہ کر کوشش کر کے، دہلی کو روپیہ بھیج دینا، سب حساب میں لکھتی ہوں۔ کرایہ مکان ۴۰ روپے، تنخواہ چمن ماموں ۱۵ روپے، تنخواہ خواصہ ۲ روپے، خوراک چمن ماموں ۲۱ روپے

خانساماں ۱۲ روپے، مہتر بہشتی ۲ روپے، تیل جلانے کا ایک روپیہ، جیب خرچ زہرہ طارق ۱۵ روپے
تنخواہ ۱۵ آنا ۹ روپے، تنخواہ جھنڈ یا ۱۳ روپے

یہ کل میزان ایک سو تیئس "۲۳" روپیہ ہوتی ہے، تو ایک سو دو روپیہ تو ہر مہینے یعنی یکم دسمبر سے برابر دینا چاہئے۔ جب تک میں واپس ہندوستان آؤں، ذاکر صاحب کے نام ایک سو روپیہ ہر مہینے بھیجدینا یا ایک دم تین مہینے کا حساب کرکے ان کو بھیجدینا، وہ جیسا بھائی جان مناسب سمجھیں، لیکن پہلی کو ان کو مل جانا چاہئے بھائی جان سے کہدینا کہ آپ کہیں سے قرضہ لے کر انتظام کر دیجئے۔ میں وہاں آکر سب ادا کردوں گی اور چھوٹے لال کو بلا کر میرا ابھی حساب لینا کہ میرا کتنا روپیہ ہے۔ میں یہاں سے بھیجدیتی بلکہ صاحب کہہ رہے تھے، میں نے بیماری کی وجہ سے نہیں بھیجا کہ ہم یہاں پردیس میں ہیں، ہم کیا کریں گے۔

قاسم کے دو خط صاحب کے نام آئے لیکن وہ زیادہ بیمار ہوگئے، جواب نہ لکھ سکے۔ میں اکیلی کیا کروں کیسے اتنے خط لکھوں۔ تم ان کو لکھ دینا کہ بھائی تمہاری علالت کی وجہ سے فکر ہے اور میں تو خود بیمار ہو رہا ہوں۔ تم بڑی خوشی سے مکان میں آکر رہو، اگر ہم آئیں گے تو ہم بھی رہ سکتے ہیں۔ خدا حافظ!

دعاگو، تمہاری والدہ امجدی

(۶)

لندن ۹ رجنوری ۱۹۳۱ء

پیاری زہرہ! پیار

میں زندہ ہوں، لیکن مردوں سے بدتر، نہ معلوم میری قسمت میں کیا لکھا ہے کہ اب تک زندہ رہی، جن کی دنیا کو ضرورت تھی، وہ مجھ کو اور تم کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ اسی کا ہر وقت خوف رہتا تھا، وہ سامنے آکر رہا میری ایک بھی قبول نہ ہوئی۔ ان کا دل ہی ہندوستان جانے کو نہیں چاہتا تھا، جب کبھی جانے کا نام آتا تو کہتے تھے کہ میں ابھی نہیں جاؤں گا جب پورا کام ہو جائے گا اس کے بعد پیرس[۵] جاؤں گا، علاج کراؤں گا اور آجاؤں گا۔ میں یہ سنکر اور ان کی کمزوری اور کام دیکھ کر گھبراتی تھی

۵۔ پیرس جانے کا ذکر شاید اس لیے کیا تھا کہ پیرس کے ڈاکٹر نے کہا تھا: "الحمدللہ دل میں جو خرابیاں نظر آتی تھیں وہ سب دور ہوگئی ہیں اور حسب قرارداد سابق اب تم کل ۔ اچھے لندن جا سکتے ہو...جب اس سے (گول میز کانفرنس سے) فارغ ہو جاؤ تو پیرس آکر ہمارا علاج کرانا، انشاء اللہ ایک یا ڈیڑھ مہینے کے علاج کے بعد قلب ایسا ہو جائیگا کہ کبھی گویا یہ مرض ہوا ہی نہ تھا۔" ایضاً صفحہ ۱۷۱)

میری ایک بات نہیں سنتے تھے، اس لئے مجبوراً دُکھنی رہتی تھی۔ جب ۸ر کو زیادہ بیمار ہو گئے تھے اور ہوش آگیا تو میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ آپ انہیں کہیئے کہ ہندوستان جلد چلے جائیں اور جو ان کی حالت ہے ان کو بتلا دو۔

ڈاکٹر مانک نے ایک روز کہا کہ بھائی محمد علی تمہاری حالت ایک شیشے کے گلاس کی طرح ہے کہ اس کو احتیاط سے رکھا جائے تو برسوں رہ سکتا ہے لیکن اگر اس کو زمین پر مار دوگے تو ٹوٹ جائے گا، آپ کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اس قدر سفر کر سکیں، شوکت صاحب اور زاہد چلے جائیں گے، یہ اکیلی بیگم صاحبہ کیا کریں گی، ڈاکٹر علاج کرے گا لیکن نئے گردے کہاں سے لائے گا، آپ کے گردے کام نہیں کر رہے ہیں، صرف دل کا ہی سوال نہیں اور تمہارا علاج سوائے آرام کے کچھ نہیں ہے۔ ایک تو یہ کہ اگر آپ کام نہیں چھوڑیں گے تو آپ جلد اچھے نہیں ہو سکتے ہیں اور سوائے اس کے کہ ڈاکٹر روپیہ لے اور کچھ حاصل نہ ہوگا، آپ کا اچھا ہونا آپکے ہاتھ میں ہے اور آپ آرام کیجئے اور یہاں کی سردی بھی آپ کے لئے اچھی نہیں ہے، میں تو آپ کو یہی رائے دیتا ہوں کہ آپ ہندوستان جلد جایئے اور آپ اکیلے جانے کے قابل نہیں ہیں، کوئی ڈاکٹر ساتھ ہونا چاہیئے تو اس کے بعد کہا کہ اچھا ڈاکٹر اگر آپ کی یہی رائے ہے تو میں ۱۶ر کو یا پھر ۲۳ کے جہاز سے چلا جاؤں گا۔ ۲۱ر کے بعد سے کمزور بہت ہو گئے تھے لیکن پھر برابر طاقت آرہی تھی اور یہ خیال نہیں تھا کہ اس قدر جلدی ہو جائے گی۔

جب ایک ہفتہ گذر گیا تو کہا کہ تم اس کمرے میں آکر کیوں نہیں رہتی ہو؟ میں نے کہا کہ نرس ہوتی ہے، اس کو اچھا معلوم نہیں ہوتا تو کہا کہ اب مجھے رات کو نیند خوب آجاتی ہے اور رات کی نرس کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے بھی کہا کہ اب کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ رات کی نرس بند کر دی گئی، دن کی آتی تھی چہرے پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایسی حالت رہی تو جلد تندرست ہو جائیں گے ڈاکٹر بھی خوش تھا۔

۲۹ر کو کہا کہ میری ایک لڑکی یہاں ہے اور اس کی سالگرہ ۳۰ر کو پوری ہوتی ہے اور میں نے آج تک کچھ نہیں کیا ہے، یہ خوشی تو میں ضرور کروں گا اور سب کو بلا کر کھانا ہندوستانی شفیع کے ہوٹل سے منگا کر کھلا دوں گا لیکن پہلے مہاراجہ الور اور نواب بھوپال سے معلوم کر لوں کہ انہیں کہیں باہر جانا تو نہیں ہے۔ مہاراجہ صاحب کو خط لکھا، انھوں نے منظور کر لیا، ان کے خط میں لکھا تھا کہ ایک مرنے ہوتے کی آخری آرزو ہے کہ آپ میرے ساتھ آکر کھانا کھائیں۔ نواب صاحب چونکہ اور لوگوں کو پہلے سے دعوت دے چکے تھے، وہ نہ آسکے، مہاراجہ صاحب کے یہاں سے ۶ آدمی تھے، پھر ٹیلیفون

کرکے سب کو دعوت دی۔ مہاراجہ جام صاحب چونکہ بیمار تھے نہ آسکے۔ صاحب اسی روز باہر جا رہے تھے ان اہد کی کچھ طبیعت خراب تھی، وہ بھی نہیں آئے۔ مظفر دن بھر رہا اور کام کرتا رہا۔ خود کھانے کے لیے ٹیلیفون سے کہا۔ بادشاہ کے سکریٹری اور وزیرِ ہند کی بیوی بچے، شعیب غرض یہ کہ سب ۱۲ آدمی ڈنر پر تھے، برابر کے کمرے میں میز لگائی گئی، خود گئے، صوفے پر بیٹھے رہے۔ کھانے کے بعد مہاراجہ صاحب نے تقریر کی، ان کا شکریہ خوب ادا کیا۔ خوب خوشی خوشی خود بھی اپنی کشتی میں کھانا کھلاتے رہے۔

جب سب لوگ چلے گئے تو پھر اپنے کمرے میں آگئے، چونکہ گلنار کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی، وہ نہ آسکی تھی، تو جب صبح ہوئی تو کہا کہ گلنار نہیں آئی۔ میں نے کہا، آتی ہوگی۔ وہ آئی تو اس سے خوب باتیں کرتے رہے۔ اس نے کہا کہ ابا! ہم آپ کو مرنے نہ دیں گے اور دل کے مرض والے جلدی نہیں مرتے ہیں تو کہا کہ بیٹی! مجھے تو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ میں مرنے والا ہوں، اب بھی اتنی قوت ہے کہ ہاتھی سے لڑ سکتا ہوں اور خدا کا شکر ہے کہ مرتے مرتے بچ گیا۔ میری بیٹی زہرہ کتنی پریشان ہوگی۔ یہ خبر سن کر میں نے گلنار سے کہا کہ بیٹی! تیرے لڑکا ہوگا تو محمد علی نام رکھیں گے اور لڑکی ہوگی تو فاطمہ۔ غرض یہ کہ ہنستے رہے۔

بیگم کو ۸ بجے ایک جگہ جانا تھا، مجھ سے کہا کہ وہاں ضرور جانا، میں چلی گئی، نرس تھی۔ ۲ر کی دوپہر کو گلنار کا ٹیلیفون آیا کہ میں سینما دیکھنے جا رہی ہوں، تم بھی چلو تو کہا کہ ضرور چلی جاؤ، میں بالکل اچھا ہوں، میں وہاں گئی۔ وہاں سے واپس آئے تو ۴ بجے تھے، دوسرے روز ڈاک کا روز تھا تو میں تم کو اور بھائی جان کو خط لکھنے لگی۔ تمہارا ابھی کامیابی کا خط آیا تھا، وہ مجھے دیا اور کہا کہ میری بیٹی زہرہ کو لکھ دو کہ ۲ر کو تو میری بری حالت ہو گئی تھی، لیکن بچ گیا اور میں آج بہت تھک گیا ہوں، ورنہ خود خط لکھتا۔ میں نے کہا کہ میں نے سب لکھ دیا ہے۔ اسی روز جب کہ میں گئی ہوئی تھی، لکھواتے رہے۔ ڈاکٹر بیٹھے تھے، ان سے کہا کہ اب میرے دل کی حالت دیکھ لو اور پھر بعد میں بھی دیکھ لینا۔ ڈاکٹر نے بعد میں دیکھا تو حالت اچھی تھی۔ کہا کہ اب میں خوش ہوں کہ میں نے اپنا سب کام ختم کر لیا، اس کے بعد اس

ٹہ۔ یہاں "صاحب" سے پہلے غالباً کوئی نام رہا ہوگا جو چھپنے سے رہ گیا، ممکن ہے شوکت صاحب ہوں۔

ٹہ۔ یہ لفظ پڑھا نہیں جا سکا، "مہدی" ہو سکتا ہے۔ آگے چل کر اسی خط میں حیدرآباد کے مہدی یار جنگ کا ذکر ہے۔ شاید وہی ہوں۔

و دیکھتے رہے اور اس کی غلطی نکالتے رہے۔ دوسری کاپی منگائی تھی، کہنے لگے کہ افسوس میں نے
اس قدر محنت بھی کی اور وہ کاپی اب تک نہیں آئی کہ میں ہندوستان بھیجتا۔ میں نے کہا کہ آپ نے
ج بہت کام کیا ہے، اب آرام کیجیے۔ رات کو ۱۱ بجے سو گئے۔ جس طرح روز اٹھتے تھے دو تین
مرتبہ اسی طرح دو تین مرتبہ اٹھ کر پیشاب کیا۔ صبح ۸ بجے مجھے آواز دی کہ اب اٹھئے، میرا منہ
دھلوا دیجیے۔ میں نے منہ دھلوایا، خوب دانت صاف کئے، منہ ہاتھ اپنے ہاتھ سے دھویا اور
پھر میں نے جلاب کی دوا دی۔ پیٹن لگا دیا۔ کہا کہ مجھے بھوک بہت لگی ہے، خود گھنٹی دی۔ نوکر آیا، اس
سے کہا کہ کافی اور ٹوس لا دو۔ وہ لایا، کافی پیتے رہے اور ٹوس کھاتے رہے، اتنے میں ۹ بج گئے۔ نرس
گئی۔ میں نے کہا کہ اب نرس آگئی، میں غسل خانے ہو آؤں، کہا کہ جاؤ میں آگئی تو کہا کہ ابھی تک
لڑکے زاہد اور مظفر نہیں آتے، ٹیلیفون کرکے بلاؤ، ان سے مجھے بہت کام لینا ہے۔ میں نے
ٹیلیفون کیا۔ زاہد نے کہا کہ میں ابھی آتا ہوں۔ اخبار اور ڈاک آگئی، اس کو دیکھتے رہے میں نے
کہا کہ جس قدر لوگ ہندوستان سے آتے ہیں، انہوں نے سب نے جہاز میں انتظام کر لیا، آپ نے
ابھی تک نہیں کرایا ہے تو کہا کہ زاہد آجائے تو ۲۱ کے جہاز سے اور ۲۳ کے جہاز سے انتظام کرتا ہوں۔
زاہد آئے تو ان سے کہا کہ ٹیلیفون کرکے انتظام کر دو چونکہ ہفتے کا دن تھا، انہوں نے کہا کہ آج نہیں ہو
سکتا ہے، اس لئے کہ ۱۲ بج گئے، سب دفتر بند ہو گئے، تو کہا کہ اچھا پرسوں، لیکن اتنی دیر میں مظفر
گئے، ان سے باتیں کرتے رہے، میں نے کہا کہ پان ہے کھلا دو تو کہا کہ ہاں۔ خود کہنے لگے کہ مجھے بھی پان
دو، میں نے پان دیا کھاتے رہے۔

جب مظفر چلے گئے تو پھر ٹیلیفون کرکے حیدرآباد کے مہدی یار جنگ کو بلایا۔ ان سے باتیں
تک گفتگو کرتے رہے۔ دن کے ۲ بج گئے۔ ہندوستانی ہوٹل سے مونگ کی کھچڑی منگائی۔ نرس نے
کہا کہ آپ نے اپنے کھانے میں دیر کر دی، اب کھا لیجیے۔ وہ کھچڑی لے کر آئے، اس کو کھاتے رہے
مکھن ڈال کر، اس کے بعد مجھے کہا کہ یہ کھچڑی تم کھا لو۔ یہاں ہوٹل کا کھانا کھاتی نہیں ہو اور میری
وجہ سے باہر کھانے کو نہیں جاتی ہو، دن بھر بھوکی رہتی ہو۔ میں نے کہا کہ میں نے کبھی مونگ کی
کھچڑی نہیں کھائی اور خالی کاہے سے کھاؤں تو کہا کہ تمہارے پاس چٹنی اچار ہے اس سے کھاؤ
اور پھر گھنٹی دے کر نوکر کو بلایا اور کہا کہ مکھن گرم کرکے لاؤ۔ میں پلنگ کے قریب بیٹھی تھی،

کھاتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ میں نے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی اس وقت مجھے کچھ رونا سا آگیا اور میں کہنے لگی کہ دیکھو آپ کام کرنا نہیں چھوڑتے اور ڈاکٹر خوف دلاتے ہیں اور جب آپ کی طبیعت خراب ہوتی ہے تو میری عجب حالت ہوتی ہے تو کہا کہ ہاں میں جانتا ہوں اور میں نے کہا کہ سوائے آپ کے میرا تو کوئی نہیں تو کہنے لگے کہ یہ نہ کہو، تمہارے بھائی ہیں۔ میں اٹھ کر ہاتھ دھونے چلی گئی۔ اس عرصے میں ڈاکٹر آگئے۔ دونوں بھائی اور ایک یہاں کے مسٹر نہرا ہیں، وہ بھی آئے ہوتے تھے مجھ سے کہا کہ چائے منگاؤ۔ چائے آئی، سب بیٹھے رہے۔ ڈاکٹر سے کہا کہ میرے لئے ایک اچھی موٹر لو تاکہ ہم لوگ جو ہیں، زہرہ، طارق سب آسکیں۔ مسٹر نہرا نے کہا کہ آپ نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا کہ بیگم صاحبہ سے جھنڈا اٹھوانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بھائی! ابھی ہندوستان کا معاملہ تو ٹھیک ہونے دو۔ میں ہی تھا کہ کوکنڈہ (کوکنڈا) میں جھنڈا اٹھایا تھا اور میں ہی ہوں گا کہ جو ہندوستان کا جھنڈا اٹھاؤں گا۔ ابھی اس کا موقع نہیں ہے۔ اتنے میں ۵ بج گئے۔ کہا کہ بھائی! مجھے معاف کرنا کہ میں تھک گیا ہوں، اب سو جاؤں۔ انہوں نے کہا کہ ہاں آپ آرام کیجئے، ڈاکٹر اور وہ سب چلے گئے۔

تھوڑی دیر میں مظفر آیا اس نے چائے پی، نرس باہر چلی گئی، میں کمرے میں بیٹھی رہی۔ دو گھنٹے ہوگئے۔ ۷ بج گئے، اس وقت نرس نبض دیکھنے لگی تو ایک دم بڑے زور کی گلے سے آواز نکلی کہ ان کی دونوں آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور اٹھنا چاہتے ہیں اور الٹا ہاتھ اٹھا رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر پہچانا تو ہاتھ پھیلا دیا میں نے اپنے ہاتھ میں ہاتھ دیا تو مسکرائے، گویا یہ کہ وہ پہچانتے تھے لیکن زبان نہیں چلتی تھی، بہت کوشش کرتے تھے۔ میں اور نرس تھے، میں گھبرائی، نرس سے کہا کہ ٹیلیفون کرو، اس نے ٹیلیفون کیا۔ گلنار کو، شعیب، زاہد سب آگئے، ڈاکٹر آگیا، انجکشن دیا، پھر بڑا ڈاکٹر آیا، مہاراجہ ایلیدیے اتنی دیر میں تین پھیرے کئے۔ دل کا ڈاکٹر جو تھا، اس نے نو بجے آکر دیکھا تو اس نے کہا کہ اب سب کو دھوکے میں رکھنا بے کار ہے ان پر فالج ہوا ہے، ایک ہاتھ ایک پیر بے کار ہے، ہم انجکشن دیتے ہیں، حالت ان کی اچھی نہیں ہے، شاید صبح تک ٹھیک ہو جائے۔ سب کی طرف دیکھتے رہے۔

آخر کار دو بجے تک یہ حالت رہی اور پھر سانس تیز چلنے لگی اور شعیب اور گلنار کو

بھیج دیا تھا۔ زاہد، مظفر اور دو تین لڑکے اور تھے۔ رحمٰن سندھی یٰسین پڑھتے رہے، رات بھر آنکھ بھی بند
ہو گئی، صبح سوا نو بجے ہم سب کو اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔

شوکت صاحب اسٹیشن پر تھے، وہ اس وقت تک نہ آسکے، پانچ منٹ چلے گئے ہو نگے کہ جب وہ
ئے دن بھر سب بیٹھے رہے، قرآن پڑھتے رہے تمام لوگ یہاں کے آتے رہے، کیونکہ دن کو ہوٹل
سے نہیں جاتے ہیں۔ رات کو ۱۲ بجے ان کو دوسری جگہ لے گئے جہاں غسل دیا جانے والا تھا اور صندوق
تیار ہو رہا تھا۔ رات بھر شوکت صاحب رہے۔ صبح کو غسل مظفر، رحمٰن سندھی سب نے۔ مل کر شام کو
نماز ہوئی۔ میں اور گلنار بھی گئی تھیں اور عورتیں بھی تھیں۔ یہاں سب بڑے لوگ ہندو مسلمان انگریز آئے
تھے۔ کانفرنس کو سب تھے۔ اسی روز رات کو شعیب یہاں گلنار کو ساتھ لئے ہوئے آئے تھے۔ صبح
وہ چلی گئی تھی، تین روز تک یہی کیا۔ پھر ہوٹل چھوڑ دیا۔ اب بھی گلنار کے ساتھ رہتی ہوں۔ میں تو رو بھی
نہ سکی، اس لئے کہ ایک تو ہوٹل، پرایا شہر، دوسرے گلنار کی حالت آج کل ایسی ہے کہ اس کی وجہ
سے بھی نہیں روتی۔ اپنے دل پر مارتی ہوں۔ دوسرے تمہاری تنہائی کا خیال پریشان کر رہا ہے۔
پہلے تو ہندوستان لانے کا خیال تھا، پھر تیسرے روز فلسطین سے تار آیا کہ کیا ہم کو آپ اجازت دیں
گے؟ ہم سب یہ چاہتے ہیں کہ یہاں دفن کیا جائے۔ میں نے اپنی رضامندی ظاہر کی، کیونکہ ایسی
جگہ قسمت والے کو ہی ملتی ہے۔ کل میں اور گلنار دیکھنے گئے تھے۔ پانچ روز، دن اور رات ایک
دو آدمی بیٹھے قرآن شریف پڑھتے رہتے تھے۔ بڑی قسمت والا ایسی جگہ پر ہے، کیونکہ جہاز والے
جھگڑا کر رہے تھے۔ اسی جہاز میں ہم سب ۱۶ کو سوار ہو جائیں گے، وہیں، شوکت صاحب، زاہد
پورٹ سعید پر اتر جائیں گے لے کر اور پھر جہاز یا ریل سے بیٹھ کر وہاں پہنچنے کے بعد دفن ہو جاویں
گے۔ تو پھر یہ ارادہ ہے کہ زیارتیں کرتے ہوتے، واپس ہندوستان ہوں گے۔ گلنار سیدھے بھوپال
جائیں گی، میں دہلی آکر سامان وغیرہ کا جو کچھ سب کی رائے ہو گی، وہ کر کے مکان چھوڑ دیں گے۔ اگر
قاسم رکھنا چاہتے ہیں تو میں بھوپال گلنار کے پاس چلی جاؤں گی، وہاں رہوں گی اور اگر زندہ رہی تو
کر زبانی کہانی سنا دوں گی۔

پیاری! تم صبر کرنا، سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس وقت نہ فاتحہ دلا چکی ہوں،
گر فاتحہ دلواؤں تو کس کو دوں۔ صرف کچھ روپیہ خیرات کر دیا۔ تین پونڈ ہے۔ امید ہے کہ تم فاتحہ

دلوا رہی ہوگی اور دلوا تی رہنا ۔ طارق کو پیار ۔

تمہاری بدنصیب والدہ ، امجدی

(علی برادران (مرتبہ: سید رئیس احمد جعفری) مطبوعہ لاہور۔ دسمبر ۱۹۶۳ء صفحات ۶۱۴ - ۶۲۶)

"آخری مشورہ" کے عنوان سے مولانا محمد علی مرحوم کی وہ یادداشت شائع ہوئی ہے جسے انھوں نے انگلستان کے وزیر اعظم کے نام لندن ہوٹل میں یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو قلم بند کرایا تھا اور ۲ کو تصحیح کے ساتھ ساتھ کچھ اضافے کئے تھے، اس کے بعد ۳ کو وہ بے ہوش ہوگئے اور پھر کبھی ہوش نہیں آیا۔ اس کتابچے کے دیباچہ میں، جس پر دریا گنج دہلی کی ۲۰ مارچ ۱۹۳۱ء تاریخ ہے، مولانا شوکت علی مرحوم نے ایک جگہ لکھا ہے: "ماہرین فن اطبا نے مجھ سے کہا کہ محمد علی کی موت، قلب کے رک جانے یا گردے کی تکلیف سے نہیں ہوئی بلکہ اصل سبب یہ تھا کہ آخری یادداشت کے لکھانے میں اس کے دماغ پر اس قدر غیر معمولی زور پڑا کہ دماغ کی رگیں پھٹ گئیں۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ دماغ میں کئی دن پہلے سے خون بہہ رہا تھا اور اس غیر معمولی کام کی وجہ سے فالج کا اثر ہوگیا، جس کے سبب صبح سات بجے اٹھنے کے بعد سے وہ بات چیت نہ کر سکے اور بالآخر ۴ جنوری کی صبح کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ آخری مرتبہ بے ہوش ہونے سے قبل محمد علی دو گھنٹے تک تو نواب سر عبدالقیوم صاحب سے صوبہ سرحد کی اصلاحات کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ ..... اس کے علاوہ دو گھنٹے تک سر شاہ نواز بھٹو سے صوبہ سندھ کے متعلق باتیں کرتے رہے .... باقی دو گھنٹے لاہور کی ایک بہن بیگم عزیز کے ساتھ گفتگو کرتے رہے، غرض اس طرح وہ مرتے دم تک بہادر مجاہد کی طرح کام کرتے ہوئے رحلت کر گئے ۔ ۔ ۔ ۔"

شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں امروہوی

مولانا محمد علی کی آخری علالت

(شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں صاحب (وفات: ۲۱ دسمبر ۱۹۵۶ء) مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۸ء تک، چھ سات سال ان کے ساتھ کام کرنے کی انھیں عزت بھی حاصل تھی۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی مرحوم سے بارہا ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور مارچ ۱۹۱۸ء میں جب موصوف نے بمبئی میں مستقل قیام کر لیا تو کبھی کبھار وہاں بھی مولانا سے ملاقات کے مواقع حاصل ہوئے۔ موصوف نے اپنے استاد پر "حیات اجمل" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو غالباً ۱۹۵۱ء میں دہلی سے شائع ہوئی ہے)

میں ہمیشہ مولانا مرحوم سے کہتا تھا کہ: مولانا! اپنی صحت کو قوم کی خاطر سنبھالئے، آپ کی زندگی کی آپ کو اتنی احتیاج نہیں ہے، جتنی کہ آپ کی درماندہ قوم کو ہے، مگر افسوس انہوں نے ہمیشہ وقتی اور قومی ضروریات کو ترجیح دی اور صحت کی بالکل پرواہ نہ کی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا محمد علی کی ذات سے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی قومی ضرورت انھیں دعوت عمل دے رہی ہے اور وہ اپنی صحت کے لئے بیٹھے رہیں۔ ڈاکٹر چیخا کریں، حکیم چلایا کریں مولانا شوکت علی اپنے بزرگانہ رعب وداب کے ساتھ کتنا ہی شور مچایا کریں لیکن وہ جس کام کا ارادہ کر لیتے تھے پھر دنیا کی کوئی قوت اس سے انھیں باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ بالآخر ملت مسلمہ کو جو نقصان عظیم پہونچنا تھا پہنچکر رہا اور نازک ترین وقت میں مولانا محمد علی

ہم سے جدا ہو گئے جبکہ اس وقت ہمیں ان کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

میں نے اپنی عمر میں سب سے پہلے مولانا محمد علی کو اس روز دیکھا تھا جس روز دہلی میں لارڈ ہارڈنگ پر بم کا گولا پھینکا گیا تھا اور جس روز گورنمنٹ آف انڈیا کا دفتر کلکتہ سے دہلی میں منتقل ہو رہا تھا۔ اس سے دو ماہ پیشتر کامریڈ" اخبار کا دفتر دہلی میں آچکا تھا اور مولانا محمد علی دہلی میں مستقل قیام کی ابتدا کر چکے تھے۔ میں اس زمانے میں مدرسہ طبیہ میں پڑھتا تھا۔ جس روز لارڈ ہارڈنگ کے جلوس پر چاندنی چوک میں بم پھینکا گیا، اس وقت دن کے ۲ بجے کا وقت تھا۔ میں اس وقت جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ایک تماشائی کی حیثیت سے وائسرائے کے شاہی جلوس کا منتظر تھا۔ سڑک پر دو رویہ فوجیں کھڑی ہوئی تھیں۔ فوج کی پشت پر دونوں طرف خلق خدا کا ہجوم اس طرح اپنی جگہ مقید تھا کہ کوئی متنفس اپنی جگہ سے ہل نہ سکتا تھا۔ جامع مسجد کے سامنے جلوس کو جس وقت پہونچنا چاہیئے تھا، اس سے دو گھنٹے کی تاخیر ہو چکی تھی۔ چاندنی چوک میں بم کے دھماکے کو ہم لوگوں نے ریلوے اسٹیشن پر توپوں کی سلامی سمجھ رکھا تھا، یہ کسی کو خبر نہ تھی کہ وائسرائے پر بم پھینکا گیا ہے۔ انگریز اور فوجی افسر اپنے گھوڑوں اور موٹر سائیکلوں پر ادھر اُدھر بدحواس ہو کر دوڑ رہے تھے۔ لوگوں کا انتظار حد سے زیادہ گذر چکا تھا۔ آخرکار ایک فوجی افسر لال قلعہ کی طرف سے آکر جامع مسجد کے سامنے سے گذر رہا تھا، ادھر جلوس کے کوچے کی طرف سے ایک دوسرا انگریز بجلی کی طرح جامع مسجد کے سامنے پہونچا اور اس فوجی افسر کو گریبان میں ہاتھ ڈال کر پکڑ لیا اور کہا: "میں تمہیں ہرگز اس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب تک تم جلوس کے لیٹ ہونے کا صحیح سبب مجھے بتا کر پبلک کو اطمینان نہ دلا دوگے۔" اس زمانے میں کسی صاحب بہادر سے اس قسم کی بے باکانہ گفتگو کو معجزہ سمجھا جاتا تھا۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ یہ بہادر ہندوستانی بصورت انگریز کون ہے، جس نے اس انگریز افسر کو اس طرح پکڑ رکھا ہے۔ بالآخر "کامریڈ" اخبار کے ایڈیٹر مسٹر محمد علی نے اس فوجی افسر سے اصل سبب معلوم کر کے پبلک کے انتظار کو ختم کر دیا اور اعلان کیا کہ وائسرائے پر چاندنی چوک میں بم پھینکا گیا ہے، جلوس اب یہاں نہ آئے گا، آپ لوگ اپنے اپنے گھروں کو جائیں۔ یہ پہلا دن تھا جبکہ ان آنکھوں نے محمد علی کو پہلی بار دہلی میں دیکھا تھا۔ اس کے بعد حضور مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب بہادر کے ہاں، میرے زمانۂ بے کاری میں، شب و روز مولانا محمد علی حکیم صاحب کے ہاں تشریف لاتے تھے اور حکیم صاحب کے ساتھ تمام

قومی کاموں میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ان ایام میں مجھے ان کی خدمت گذاری کا اکثر موقع ملا۔ اس زمانے میں بھی ان کو ذیابطیس کی شکایت رہتی تھی اور کئی برس تک مسلسل سال میں دو تین ماہ تک وہ حکیم صاحب قبلہ کی تجویز سے فولاد، زمرد، جوارش زعفرانی صبح و شام استعمال کیا کرتے۔ ان دواؤں کے استعمال سے افاقہ ہوجایا کرتا تھا، لیکن کچھ عرصے کے بعد جب ان کو ذیابطیس صادق شروع ہوگیا تو یہ دوائیں بیکار ثابت ہوئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام عمر انھوں نے اپنے مرض کا علاج کیا اور بے حد کیا مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ کبھی صحیح اور مکمل علاج نہ کیا یا نہ کرسکے۔ آخر میں گزشتہ سال (۱۹۳۰ء) اپریل کے مہینے میں جب بمبئی تشریف لائے اور میں خلافت آفس میں ان سے ملنے کے لئے حاضر ہوا تو میرے خطاب یابی (شفاء الملک) کے بعد ان سے پہلی ملاقات تھی، ان کی شدت، انتہا پسند اور پکے "اور کٹر" ترک موالاتی ہونے کی حیثیت سے میرا خیال تو یہ تھا کہ آج کی ملاقات میں مجھے مولانا کی زبان سے ضرور دو چار کھری کھری باتیں سننے کے لئے تیار ہوجانا چاہیے، مگر اس کے برخلاف میں نے مولانا کی طرف سے اس وقت ایسے پر اخلاص جذبات کا مشاہدہ کیا جو میرے لئے غیر معمولی طور پر حیرت انگیز تھے اور قابل فخر بھی۔ انھوں نے فرط مسرت کے ساتھ مجھے اپنے سینے سے لگایا، میری پیشانی پر بوسہ دیا، میری خدمات کو پسند کیا اور میری کامیابی پر اظہار مسرت کیا۔ یہ تھا ان کی خادم نوازی کا ایک نمونہ کہ باوجود اپنے عقیدے کے خلاف ورزی کے، انھوں نے اپنے ایک خادم کی فنی کامیابی کو بغیر تحسین کے نہ چھوڑا۔ اس کے بعد میرے اصرار پر کچھ دنوں زاید بمبئی میں قیام کرکے، انھوں نے مجھ کو اپنے مرض کی صحیح تشخیص کرنے اور علاج کرنے کا موقع دیا۔ دوسرے روز صبح کو میں نے انھیں دیکھا، ان کی زبان سے تمام تغیرات بدنی کا حال سنا، ان کے احشاء دیکھے، قارورہ دیکھا اور آخر کار میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ ان کی عام بدنی خرابیوں کا ذمہ دار صرف ان کا مرض ذیابطیس ہے۔ صورت یہ تھی اگر وہ غذا میں ثقیل اور شیرینی کو ترک کر دیتے تھے تو پیشاب میں شکر کا تناسب آدھا یا ایک پرسنٹ رہتا تھا اور اگر غذا کھانے میں ذرا بھی بے احتیاطی کرتے تھے تو شکر کا تناسب ڈھائی سے ۳ پرسنٹ ہوجاتا تھا۔ پیشاب میں مداومت کے ساتھ شکر جانے اور غذائی مادہ ضائع ہونے رہنے کی وجہ سے بالآخر عصبی کمزوریاں شروع ہوگئیں۔ تمام بدن کے اعصاب میں ضعف اور تخدر شروع ہوگیا۔ بعید المنبع اعصاب میں بے حسی شروع ہوگئی۔ چنانچہ اول پاؤں کا انگوٹھا بے حس ہوا اور پھر یہ

بے حسی بڑھنے لگی تو گھٹنے تک تمام پاؤں خدر میں مبتلا ہو گئے۔ یہی حال آنکھوں کے نازک ترین اعصاب کا ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک آنکھ کی بصارت زائل ہو گئی۔ دوسری آنکھ بھی کچھ خفیف کام دیتی تھی اور اس کے بھی ضائع ہو جانے کا ہر وقت اندیشہ لگا ہوا تھا، معدہ اور آنتوں کے اعصاب بھی اپنا کام صحیح انجام نہ دے رہے تھے، جس کی وجہ سے انھیں بھوک نہ تھی، غذا صحیح ہضم نہ ہوتی تھی اور اس طرح ان کے تمام قویٰ یوماً فیوماً ضعیف ہوتے جا رہے تھے۔ یہ حالات تھے جبکہ میں نے ان کا علاج شروع کیا۔ میری مجوزہ دوائیں ان کی طبیعت کو پسند تھیں، بڑی رغبت کے ساتھ وہ انھیں استعمال فرماتے تھے۔ روزانہ صبح کو میں خلافت ہاؤس جا کر انھیں دیکھتا اور تقریباً ہر روز دو گھنٹے ان کے پاس بیٹھتا تھا۔۔۔ الغرض میں آٹھ دس روز ہی علاج کرنے پایا تھا اور ہضم کی اصلاح شروع ہو گئی تھی۔ تمام قوت کسی قدر بہتر ہو چلی تھی، مگر اصل مرض پر اب تک کچھ اثر نہ ہوا تھا کہ مولانا کو مجبوراً دہلی جانا پڑا اور میرے علاج کا سلسلہ شروع ہی ہوا تھا کہ بند ہو گیا اور میرے دل کی حسرت تکمیل علاج دل ہی میں رہ گئی،[1] اس کے بعد میری آخری ملاقات اس شب کو ہوئی جس کی صبح کو مولانا مرحوم لندن روانہ ہونے والے تھے۔ میں مسٹر اشفاق حسین کو ساتھ لے کر خلافت آفس پہونچا۔ وہاں دیکھا تو سینکڑوں آدمیوں کا خلافت ہاؤس میں ہجوم تھا۔ جو مولانا سے ملاقات کے خواہشمند تھے، مگر کسی کو مولانا کے پاس اوپر والے حصہ مکان میں جانے کی اجازت نہ تھی لیکن میرے آنے کی جب انھیں اطلاع ہوئی تو فوراً مجھے انھوں نے اوپر بلایا۔ اس وقت جو میں نے جا کر دیکھا تو ان کے حالات بہت زیادہ بدل چکے تھے۔ گذشتہ چار ماہ سے گاہے گاہے ملیریا بخار کا حملہ ہوتا تھا۔ ضعف بہت زیادہ بڑھ گیا تھا عصبی ضعف کی شدت کی وجہ سے قلبی حرکت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے ہر وقت ہارٹ فیل ہو جانے کا اندیشہ قوی تھا۔ آنتوں کی حالت اب یہ ہو گئی تھی کہ بغیر نمک یا کوئی دوسری جلاب کی دوا لئے ہوئے اجابت نہ ہوتی تھی۔ مختلف گفتگو اور ملاقاتوں سے جو تاثرات بالعموم ہوتے ہیں، وہ قطعاً اس کے برداشت کرنے کے ناقابل تھے۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور اس حالت میں انھیں یہ طویل اور خطرناک سفر پر آمادہ دیکھ کر میری طبیعت بہت زیادہ دلگیر اور مشوش ہو گئی۔ میں نے اس کے متعلق عرض کیا تو مولانا نے فرمایا کہ حکیم صاحب!

---

[1] یہاں تقریباً ۱۲ سطریں حذف کر دی گئی ہیں جو وقتی سیاست سے متعلق تھیں۔

اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں، کیونکہ گول میز کانفرنس کے لئے جو مسلم نمائندگی تجویز ہوئی ہے اس میں کوئی ایک شخص بھی اگر میری جماعت میں کام کا ہوتا یا میری جماعت سے میرے کامل اعتماد کے قابل ہوتا تو میں ہرگز اس وقت نہ جاتا مگر کھلی آنکھوں مسلم مفاد عامہ کو میں پامال ہوتا کس طرح دیکھ سکتا ہوں۔ میری جان چاہے جائے یا رہے مگر میں آخر سانس تک قومی مفاد کی حفاظت کروں گا[2]۔ میں نے اس کے بعد بھی ان سے التوائے سفر کے لئے اصرار کیا، مگر انھوں نے میری ایک نہ سنی اور مجھے اس طرح اطمینان دینا چاہا کہ کیا بعید ہے کہ سمندری ہوائیں میری صحت پر اثر ڈالیں اور وہاں پہونچنے پر حالات بالکل بدل جائیں

---

[2]۔ اسی سلسلے میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی کو ایک خط (مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۳۰ء) میں لکھا تھا: "اب تک صاحب فراش ہوں۔ کانفرنس کے روزانہ اجلاس میں نہ صرف ہندوؤں اور انگریزوں بلکہ سب سے زیادہ خود مسلمان بھائیوں سے ایک ایک نقطہ پر جنگ کرنی پڑے گی۔ ان محاذوں پر جنگ کرتے میں ہر وقت دل کی حرکت یکایک بند ہو جانے کا ابلبتہ ہے۔ ... لیکن اس پر بھی میں سمجھتا ہوں کہ میرا مذہبی فرض ہے کہ اس کانفرنس میں شریک ہوں اور وہاں سلطان جابر اور رعایائے جابر دونوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر سب سے افضل جہاد کروں۔" خطوط محمد علی مرتبہ: پروفیسر محمد سرور۔ مطبوعہ؛ مکتبہ جامعہ۔ اکتوبر ۱۹۴۰ء، صفحہ ۲۴۵)

ڈاکٹر احمد سجاد

محمد علی کی شخصیت کے عناصر اربعہ

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر مر کے جوہرؔ آپ کے جوہر کھلے

مولانا محمد علی جوہرؔ کی یہ منکسرانہ پیشگوئی اگر صحیح ہوتی تو ان کی قابلِ رشک زندگی اور موت پر ایچ جی ویلز جیسے عالمی شہرت کے دانشور یہ نہ کہتے کہ محمد علی کا دل نپولین کا دل تھا، ان کی زبان برک کی زبان تھی اور ان کا قلم میکالے کا قلم تھا، نہ لندن ٹائمز کا ایڈیٹر ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کرتا کہ "محمد علی اصول کے لئے جئے، اصول کے لئے مصیبت اٹھائی اور اصول کے لئے مرے۔" اقبال کا حسب ذیل شعر بھی محمد علی کی شخصیت اور کردار پر بالکل صادق آتا ہے:

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مگر ان شاندار الفاظ اور اشعار سے مولانا محمد علی جوہرؔ کی شخصیت کے خط و خال پوری طرح پھر بھی واضح نہیں ہوتے، لہٰذا تجزیاتی مطالعہ کے لئے ہمیں ایک انگریز مفکر کی دی ہوئی چار کسوٹیوں کے مطابق موصوف کی زندگی اور ان کے کارناموں کا جائزہ لینا ہوگا۔ اس مفکر نے کسی فرد یا قوم کی زندگی کے مکمل مطالعہ کے لئے مندرجہ ذیل چار کسوٹیاں مقرر کی ہیں۔

(۱) ماضی سے تسلسل یعنی اکبر الٰہ آبادی کے لفظوں میں "درخت جڑ پہ ہو قائم تو استوار بھی ہے"۔

(۲) کشادہ ذہنی جس کے بغیر نئے خیالات و افکار اور ترقی کی نئی منزلوں کی نشاندہی ممکن نہیں۔

(۳) ذمہ داری کا احساس جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کے لفظوں میں متمدن زندگی کی بنیاد ہے۔ اسے آپ اسلامی اصطلاحوں میں تقویٰ، عدل، اعلیٰ اخلاق اور قول و فعل میں ہم آہنگی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اور

(۴) جرأت مندی جس کے بغیر اوپر کی تینوں خصوصیتیں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں کیونکہ نمایاں اور

مثالی کردار کو تشکیل دینے والی صفت جرأت مندی ہی ہے۔

قبل اس کے کہ ان چار کسوٹیوں پر مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے ہم پہلے اس تاریخ ساز شخصیت کے ذہنی پس منظر کو آپ اپنے سامنے رکھ لیں تو بہتر ہے اس پس منظر میں ان کی بیوہ ماں کی اسلامی تربیت، علی گڑھ اور آکسفورڈ کی علمی و تعلیمی تربیت، اس عہد کا سیاسی جوش و خروش اور بال گنگا دھر تلک کے غیر معمولی اثرات نیز اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لئے جمال الدین افغانی، علامہ شبلی وغیرہ کی ہمہ گیر کوششوں کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ یہ اور ان کے علاوہ دیگر عوامل نے مغرب کے خلاف شدید ردعمل اور اصلاح و انقلاب کی ایک عمومی فضا بھی قائم کر دی تھی، چنانچہ اجتماعی سطح پر انہی دنوں علی گڑھ کالج، ایجوکیشنل کانفرنس، انجمن حمایت اسلام لاہور، دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء وغیرہ کا قیام عمل میں آیا اور انفرادی سطح پر اقبال، محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی عظیم شخصیتوں کا ظہور ہوا

محمد علی جوہر نے اپنی مختصر خود نوشت سوانح عمری میں یہ اعتراف کیا ہے کہ علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی میں علامہ شبلی کے درس قرآن اور "اسلام اور اسلامی زندگی" پر ان کے لکچر نے ماضی کے تسلسل اور اس کی صحت مند روایتوں سے انہیں زندگی بھر جوڑے رکھا۔ چنانچہ جیل اور قید و بند کے زمانے میں قرآن، تاریخ اسلام اور عبادات کے مشق و مطالعہ کا ذوق کچھ اور نکھر گیا، یہاں تک کہ مولانا عبدالباری فرنگی محل کے مرید ہو گئے۔ ڈاڑھی رکھ لی اور عربی عبا کے عادی ہو کر مسٹر محمد علی سے "مولانا محمد علی" ہو گئے۔ جب علی گڑھ کی انگریزیت و مغربیت کو بدلنے میں ناکام رہے تو جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کی، قرآن و سیرت اور عبادات پر خاص طور سے زور دیا۔ اسلام اور مسلمانوں پر جب اور جہاں بھی چوٹ پہنچی سب سے شدید روحانی تکلیف محمد علی جوہر کو ہوئی" اور جس کا برملا اظہار کرنے میں بھی کبھی نہیں جھجکے"، نہ کبھی مصلحت کوشی کا شکار ہوئے، چنانچہ ایک موقع پر انہوں نے کہا کہ جہاں تک احکام خداوندی کے تعلق کا سوال ہے "میں اول بھی مسلمان ہوں، دوم بھی مسلمان ہوں اور آخر بھی مسلمان ہوں خود انہی کا شعر ہے:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے　　　یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

حد تو یہ ہے کہ بقول جواہر لال نہرو کانگریس کی تجاویز میں بھی کسی نہ کسی بہانے سے مذہب و خدا

کا حوالہ ضرور دیتے تھے۔ پنڈت نہرو اس کی مخالفت کرتے تو ان کے الحاد اور بد دینی پر انہیں خوب ڈانٹتے چنانچہ اسلام اور ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ ہی تھا جس کی بنا پر اچھی خاصی ملازمت کو چھوڑ کر کامریڈ اور ہمدرد کے ذریعہ صحافت و سیاست کے خطرناک میدان میں بے محابا کود پڑے۔ پھر جنگ عظیم اول کے زمانے میں انگریزوں نے مجاہدین آزادی اور مسلمانان ترک و عرب کو جو چرکے لگاتے ان سب کے نتیجے میں مولانا موصوف نے مشہور زمانہ خلافت تحریک شروع کی جس نے ۱۸۵۷ء کے بعد کے مایوس و مضمحل ہندی مسلمانوں کے تن مردہ میں نئی روح پھونک دی اور مولانا محمد علی کے لفظوں میں جس تحریک نے انقلاب فرانس کی یاد تازہ کردی،،

یہ اور اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جن کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا محمد علی جوہر نے ماضی کی صحتمند روایتوں سے مکمل وابستگی کے باوجود ملک و قوم کو نئی زندگی اور نئی آگہی بخشی۔ اس سلسلے میں بڑی بڑی مخالفتوں اور رکاوٹوں کی کبھی پروا نہ کی۔ نہ لیڈری و ناموری کے لئے کبھی ابن الوقتی، چاپلوسی یا بزدلی کی ادنیٰ سے جھلک بھی آنے دی مرحوم کا یہ شعر ان کی شخصیت کا بہترین آئینہ کہا جا سکتا ہے۔

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف　　　کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

جہاں تک دوسری خصوصیت کشادہ ذہنی اور فراخ دلی کا تعلق ہے انہوں نے اپنی تمام اسلامیت کے باوجود زندگی میں کبھی بھی تنگ نظری اور عصبیت کو قریب بھی آنے نہ دیا۔ انفرادی تعلقات سے لے کر ملک و ملت کے اجتماعی مسائل تک میں وہ حق و صداقت کے اندر رہتے ہوئے ہر شخص اور گروہ کو اظہار خیال اور اختلاف رائے کا پورا پورا حق دیتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ نفسانیت، عصبیت اور تنگ نظری کا موصوف پر فی الفور ردعمل ہوا کرتا تھا، اس لئے پوری صفائی کے ساتھ اس کی نشاندہی بھی کر دیتے تھے جس کے نتیجے میں ان کے قریب ترین ساتھیوں کو بھی بسا اوقات غلط فہمی ہو جاتی تھی۔

مہاتما گاندھی نے جنوبی افریقہ میں انسانیت اور سیاست و مذہب جو غیر معمولی خدمات انجام دی تھیں ان سے مولانا موصوف بے حد متاثر تھے جو دھری خلیق الزماں نے بھی اعتراف کیا ہے کہ وہ گاندھی جی کے تقریباً بن دیکھے عاشق تھے ۱۳ اپریل ۱۵ء کو گاندھی جی سے مولانا کی پہلی بار ملاقات ہوئی تو وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ پہلی ہی نظر میں ان کی محبت کا قائل ہو گیا،،

پنڈت جواہر لال نہرو سے فکری تضاد کے باوجود اپنے دورِ صدارت میں انہیں زبردستی آل انڈیا کانگریس پارٹی کا جنرل سکریٹری منتخب کروایا۔ ترکِ موالات کی تحریک شروع ہوئی تو اس کے بعد زندگی بھر کھدر پوش رہے یہاں تک کہ کفن بھی کھدر ہی کا تھا۔ آخر آخر میں انہیں کانگریس سے شکایات پیدا ہوگئی تھیں، مگر اس کے باوجود مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو وغیرہ سے آخر وقت تک اپنے ذاتی تعلقات میں کوئی فرق آنے نہ دیا۔

موصوف نے ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کی جنگِ آزادی کی کامیابی کے لئے اتنا کچھ لکھا اور کہا ہے کہ ان کا بڑے سے بڑا مخالف انھیں تنگ نظر اور فرقہ پرست نہیں کہہ سکتا۔

بپن چندرپال نے ہندوستانی قومیت کی جب فرقہ پرستانہ تعبیر کی تو ۱۵ اپریل ۱۹۱۳ء کے کامریڈ میں اس پر شدید تنقید کی۔ اسلامی معاملات میں جہاں خود کو اول و آخر مسلمان کہتے تھے، وہیں ملکی اور قومی امور میں خود کو اول و آخر ہندوستانی بھی کہتے تھے گاندھی جی کی خدمات پر ایک مرتبہ جب انہوں نے تنقید کی تھی اور اس پر جو ہنگامہ ہوا تھا تو اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ سیاسی معاملات میں میں گاندھی جی کو اپنی والدہ مکرمہ اور پیر و مرشد سے بھی زیادہ قابلِ احترام تصور کرتا ہوں ملکی اتحاد اور ہندو مسلم مسئلہ پر انہوں نے پچاس ساٹھ سال قبل جو کچھ کہا ہے اسے آج بھی ان کی اعلیٰ ظرفی ہی پر محمول کیا جائے گا۔ فسادات کے موقع پر وہ ہمیشہ صبر و ضبط اور امن و امان قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں کو اپنی جانوں تک کو قربان کر دینے کی تلقین کرتے۔ ڈاکٹر مونجے کی سنگھٹن تحریک اور آریہ سماجی لیڈر سوامی شردھانند کی شدھی تحریک کے جواب میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو وغیرہ نے جب تبلیغ و تنظیم کی تحریک شروع کی تو مولانا نے ڈاکٹر سیف الدین کی مخالفت کر کے مسلمانوں کے غیظ و غضب کو اپنے خلاف دعوت دے دی۔

گول میز کانفرنس کے موقع پر ارباب اقتدار سے دو ٹوک انداز میں کہہ دیا کہ ہندو مسلم فرقہ وارانہ مسئلہ دراصل انگریزوں کی ظالمانہ پالیسی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کا براہ راست شاخسانہ ہے

اقلیتی مسئلہ پر جب بھی گفتگو کی تمام اقلیتوں کو سامنے رکھ کے کی۔ مولانا کے الفاظ ہیں:
"ہندوستان میں بلاشبہ اقلیتیں ہیں۔ اور یقیناً ہم کو ان کے لئے ایسا انتظام کرنا چاہیئے کہ

وہ یہ محسوس کریں کہ آئندہ حکومت محض ایک یا دو اقوام کی حکومت نہ ہوگی بلکہ تمام ہندوستانیوں کی حکومت ہوگی جس میں ذات اور عقائد کا امتیاز باقی نہ رہے گا۔"

وہ حقیقی اتحاد کے لئے ہمیشہ تڑپتے رہے۔ جمہوریت کی کامیابی کے لئے انھوں نے جن پانچ نکات پر زور دیا تھا ان کی اہمیت و افادیت آج بھی قائم ہے۔ وہ پانچ یہ ہیں (۱) ہندو مسلم اتحاد (۲) اقلیتوں میں احساس سلامتی (۳) نسل پرستی سے علیحدگی (۴) تعلیم میں سدھار (کیونکہ جدید تعلیم نے ان کے خیال میں مذہب پرستی کے بجائے فرقہ پرستی سکھائی ہے) اور (۵) رائے عامہ کی تربیت۔

ان کی اسی بلند حوصلگی اور کشادہ ذہنی کا نتیجہ تھا کہ ان کی موت کی خبر سے بلا تفریق مذہب و ملت نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم انسانیت کو صدمہ ہوا۔ گاندھی جی نے ان الفاظ میں اظہار غم کیا: "مولانا محمد علی جوہر کی موت اس وقت واقع ہوئی جبکہ ہمیں ان کی ضرورت تھی۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے زبردست کام کیا ہے۔" جواہر لال نہرو نے فرمایا: "مولانا محمد علی جوہر کو رجعت پسندوں سے کوئی نسبت ہی نہ تھی جو فرقہ وارانہ مسائل کے علمبردار بنے گھوم رہے ہیں۔"

تیسری خصوصیت ذمہ داری کے احساس اور عدل و انصاف کے معاملے میں تو ان کے احساسات بہت شدید تھے۔ اس معاملے میں مداہنت، ابن الوقتی یا تعصب کو انگیز کرنا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ ۱۹۲۸ء میں موتی لال نہرو رپورٹ کی کھل کر صرف اس لئے مخالفت کی کہ اس میں مکمل آزادی کے نصب العین سے پہلوتہی کی گئی تھی اور مسلمانوں کے بعض مطالبات کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ جامعہ ملیہ کے لائق و فائق شاگرد رانا جنگ بہادر نے واشگاف لفظوں میں "اعلیٰ مقاصد کے لئے ان کی بے داغ ایمانداری اور وطن کے لئے ناقابل تردید دیانتداری" کو تسلیم کیا ہے۔

مولانا محمد علی جوہر کی جرأت اور بیباکی کا تو سارا زمانہ ہی معترف تھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جنگ آزادی کی پوری تاریخ میں اس جیسے جری اور بے خوف لیڈر بہت کم ہوں گے یوں تو مجاہدین آزادی کی صفوں میں ایک سے ایک نڈر موجود تھے، جو حکومت وقت، جیل اور پھانسی تک کو خاطر میں نہ لاتے تھے، مگر ان میں بہت کم ایسے رہنما تھے جو وقت آنے پر اپنی پارٹی، اپنی قوم، یہاں تک کہ دوست و احباب اور عزیز و اقارب کو بھی انصاف کے معاملے میں کھری کھری سنانے کی ہمت رکھتے ہوں یہ نمایاں جرأت اگر کسی میں سب سے زیادہ تھی تو وہ محمد علی جوہر تھے خود ان ہی کا شعر ہے:

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو　　　خوش ہوں کہ وہ پیغام وفا میرے لئے ہے

یہ محض خوش گمان شاعر کی ترنگ نہیں بلکہ ان کی پوری زندگی اس کی شاہد ہے۔ اس بے مثال جرأت مندی اور بیباکی در اصل ان کی والدۂ محترمہ کی ذہنی تربیت کی رہین منت ہے۔ ذرا ان کی والدۂ مکرمہ کی ہمت اور بہادری کا اندازہ تو کیجئے کہ ۱۹۱۷ء میں چھنڈوارہ کی نظر بندی کے زمانے میں جب انھیں یہ خبر ملی کہ ان کے صاحبزادے کو بعض ہتک آمیز شرطوں پر حکومت آزاد کرنے کو تیار ہے تو انہوں نے اپنا وہ تاریخی بیان دیا جو جنگ آزادی کی تاریخ میں آج تک کسی ماں نے نہ دیا ہوگا۔ "آزادی حاصل کرنے کے لئے اگر میرے بیٹے کوئی ایسی شرط قبول کریں گے جو اسلام کی شان کے خلاف اور مفاد ملک کے منافی ہوگی، تو باوجود اس تمام محبت کے جو قدرتاً مجھے اپنے بیٹوں سے ہے، اس کے قبل کہ وہ صراطِ مستقیم سے ہٹ سکیں، اپنے ضعیف ہاتھوں سے ان کا گلا گھونٹ دونگی"۔ ایک ایسی ماں کا بیٹا اگر "اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد" کہتا ہے تو اس میں شعریت سے زیادہ اس کے حقیقی جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے۔

۲۵ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو پانچ سالہ نظر بندی کے بعد مولانا چھوٹے تو بال بچوں سے ملنے کے بجائے سیدھے امرتسر پہنچے جہاں جلیانوالہ باغ کے حادثۂ عظیم کے بعد کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت تحریک کے پرجوش اجلاس ہو رہے تھے۔ وہاں ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ مولانا نے اپنی ایک پرجوش تقریر میں فرمایا:

> "میں کہتا ہوں، اس آزادی کے لئے مسٹر تلک کو پھر جیل جانا چاہئے، مجھے دوبارہ عمر بھر کے لئے نظر بند ہونا چاہئے، مسز بسنت کو پھانسی پر چڑھ جانا چاہئے مگر اس قسم کے مظالم کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہونا چاہئے جیسے کہ پنجاب میں ہوئے۔"

پروفیسر مجیب جیسے عظیم مورخ اور محمد علی کے ناقد بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ زندگی میں کبھی بھی احساس کسری کے شکار نہ ہوتے۔ بڑی سے بڑی شخصیت سے کبھی مرعوب نہ ہوتے۔ پروفیسر مجیب کے الفاظ یہ ہیں

> "اکتوبر ۱۹۲۱ء میں کراچی میں اپنے خلاف مقدمے کے دوران انھوں نے جس طرح اور جس خود اعتمادی کے ساتھ جج اور جیوری کا مذاق اڑایا تھا، اس سے متاثر نہ ہونا ممکن نہیں۔"

(جامعہ مولانا محمد علی نمبر ص ۹۳)

چنانچہ سائمن کمیشن کی آمد کے موقع پر ریمزے لیک ڈونلڈ وزیراعظم برطانیہ کے خلاف لکھتے ہوئے طنزاً ان کے نام کو مسخ کرکے "رام جی مکندلال" تک لکھا۔

دنیا جانتی ہے کہ تحریک خلافت، ترک موالات اور کانگریس کی جس جوش وخروش اور ہمت و جرأت کے ساتھ محمد علی نے قیادت کے فرائض انجام دیئے اس کی بنا پر ہندوستان کے مسائل نے بین الاقوامی حیثیت حاصل کرلی" کانگریس جو اب تک تعلیم یافتہ خوش حال اور خواص کی پارٹی تھی اب عوامی بن گئی۔ بدیشی مال کا ملک گیر پیمانے پر بائیکاٹ کیا جانے لگا اور عبد الماجد دریابادی کے لفظوں میں جیل جانا ہنسی کھیل ہوگیا۔

شمع آزادی کا یہ پروانہ جان لیوا بیماریوں سے نحیف ہو چکا تھا مگر فرض پکارتا ہے تو عزیزوں کی مخالفت کے باوجود جان ہتھیلی پر رکھ کر گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن کا سفر کرتا ہے۔ وہاں اس نے برطانوی سامراج کو جس انداز سے خطاب کیا اسے راناجنگ بہادر کے لفظوں میں "عالم نزع کا نعرہ" کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ شہید آزادی نے فرمایا تھا:

"میں اپنے ملک کو اسی صورت میں واپس جاؤنگا جب ایسی آزادی جس پر آزادی کا اطلاق ہوسکے، میرے ہاتھ میں ہو۔ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا۔ میں ایک غیر ملک میں، بہ شرطیکہ وہ آزاد ملک ہو، مرنے کو ترجیح دوں گا۔ اگر آپ ہندوستان کو آزادی نہیں دیں گے تو آپ کو یہاں میرے لئے قبر کا انتظام کرنا ہوگا۔"

خدا نے اس مجاہد اعظم کے الفاظ کی لاج رکھ لی اور غلام ہندوستان میں واپس آنے کے بجائے وہیں لندن میں اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کردی اور ان کے بلند مرتبہ کی مناسبت سے ان کی آخری آرام گاہ کے لئے سرزمین انبیاء یعنی بیت المقدس میں جگہ ملی اور ان کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

یہ تھی وہ مختصر سی روداد جوان کی شخصیت کے عناصر اربعہ کے سلسلے میں پیش کی جاسکتی تھی۔

اس مثالی شخصیت کی ان چار خصوصیات کو اب شاعر مشرق علامہ اقبال کے ان چار عناصر پر

پرکھ کر دیکھ لیجئے، آپ دونوں کسوٹیوں میں حیرت انگیز مماثلت پائیں گے :

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

مولانا محمد علی نے ۱۹ نومبر ۱۹۳۰ء کو گول میز کانفرنس لندن میں جو مشہور تقریر کی تھی، اس میں ایک جگہ فرمایا تھا کہ: "جن امور کا ہندوستان سے تعلق ہے، میں اول ہندوستانی ہوں، دوم ہندوستانی ہوں اور آخر میں ہندوستانی ہوں اور ہندوستانی کے سوا کچھ نہیں۔ میں ان مساوی الجسامت دائروں سے تعلق رکھتا ہوں جن کے دو مختلف مرکز ہیں، ایک ہندوستان اور دوسرا دنیائے اسلام۔ جب میں ۲۰ء میں وفد خلافت کے صدر کی حیثیت سے انگلستان آیا تو میرے دوستوں نے مجھ سے کہا کہ آپ کو اپنے سامان کیلئے کوئی نشان خصوصی مقرر کر لینا چاہئے۔ میں نے اس پر عمل کیا اور اس کو دو دائروں میں تقسیم کر دیا۔ ایک دائرے میں لفظ "ہندوستان" تھا اور دوسرے دائرے میں "اسلام" لفظ خلافت کے پہلو میں موجود رہتا۔ ہم بہ حیثیت مسلمانانِ ہند کے دونوں دائروں میں شامل ہیں۔ ہم ان دونوں دائروں سے تعلق رکھتے ہیں جس میں سے ہر ایک تیس کروڑ نفوس انسانی پر مشتمل ہے اور ہم ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑ سکتے۔"

(حیاتِ جوہر مرتبہ: نشتر بلرامی (مطبوعہ: علی گڑھ جنوری ۱۹۳۱ء صفحہ ۹۷)

معین شاکر

ترجمہ: محمد خلیق

ہندوستانی سیاست میں محمد علی کا حصہ

محمد علی مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی فکر کے بظاہر متضاد رجحانات میں ہم آہنگی کی نمائندگی کرتے تھے۔ وہ مذہب کی اقدار اور روح کیطرف بے توجہی برتنے بغیر سائنس اور جدیدیت کے حامی تھے۔ وہ نہ تو علماء کی جماعت کے ساتھ تھے اور نہ غیر علماء کے گروہ کے ساتھ بلکہ یہ چاہتے تھے کہ ان دونوں میں پائی جانے والی خلیج کو پر کرنے کی کوشش کی جاتے جو اس زمانے یعنی انیسویں صدی کے اواخر میں عملاً ناممکن نظر آتا تھا۔ محمد علی میں دو رجحانات بیک وقت نظر آتے ہیں۔ یہ جتنے پرجوش علم بردار اسلام کے تھے اتنے ہی پر جوش قوم پرست بھی تھے۔ گاندھی جی کی طرح محمد علی بھی مذہب اور سیاست کے اتحاد کی نمائندگی کرتے تھے۔

محمد علی کو علی گڑھ تحریک نے جنم دیا تھا۔ انیسویں صدی کے آخری نصف میں سرسید نے جو کوشش کی تھی اس کی تاریخی اہمیت کو وہ سمجھتے تھے اور اس پر یقین رکھتے تھے کہ یہ تحریک ہندوستانی مسلمانوں کے مفاد میں ہے۔ انھیں مغربی تعلیم کی افادیت سے انکار نہیں تھا لیکن وہ اس کی کورانہ تقلید کے حق میں نہیں تھے اور نہ یہ چاہتے تھے کہ مشرقی یا ہندوستانی روایات کو بالکل ترک کر دیا جائے۔ لیکن چونکہ علی گڑھ تحریک کا بنیادی مقصد یعنی فلسفے، سائنس اور مذہب میں امتزاج نہیں حاصل ہو سکا تھا اس لئے تحریک کی اصلاح کی ضرورت تھی۔ علی گڑھ تحریک کے تجربے سے محمد علی کو یقین ہو گیا تھا کہ مغربی تعلیم میں بعض خامیاں تھیں۔ مغربی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں نہ تو پچھلی روایات کی قدر تھی اور نہ حق کی تلاش اور تحقیق کا جذبہ باقی تھا۔ روحانی اور غیر روحانی مسائل سے متعلق ان کا تصور نیم پختہ تھا۔ برطانوی طریقۂ تعلیم ہندوستانی مزاج سے میل نہیں کھاتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایسے لوگوں کو جنم دیا تھا جو مذہبی سے زیادہ فرقہ

پرست تھے۔ لیکن مولانا آزاد اور شبلی نعمانی کی طرح انھوں نے انگریزی تعلیم کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا

[یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اٹھارھویں اور ابتدائی انیسویں صدی میں مسلمانوں کا سیاسی رجحان سرگرم سامراج دشمنی کی طرف مائل تھا۔ مسلمان انگریزوں کو نکالنا اور ملک میں ہندوستانی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان کا نعرا اسلام کے احیا میں تھا بلکہ یہ غیر ملکی حکومت کو ختم کرنے کے تھے ملک کے تمام فرقوں میں اشتراک اور اتحاد کے خواہاں تھے۔ مسلمان ملکوں کی طرف ان کا رویہ ہمدردی کا تھا تعلیم اور مذہب کے میدان میں بعض برطانوی پالیسیوں سے اس جذبے کو اور بھی تقویت ملی۔ سرسید کی قیادت کے ابھرنے سے انگریز دشمنی کی روایت نہیں ختم ہوئی۔ ان کے سیاسی طرز عمل کے نتیجے میں مسلمان افسروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو حکومت کا وفادار تھا لیکن اس کو حکومت کا اعتماد نہیں حاصل تھا۔ برطانوی حکومت کا ایک حصہ ایسا تھا جس کے نزدیک مسلمانوں کی وفاداری مشتبہ تھی۔ اس کو یقین تھا کہ مسلمان صرف مسلم حکومت کے وفادار ہو سکتے ہیں۔ سر اے۔ پی میگڈونل کو اس نظریے کا نمائندہ سمجھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے صاف صاف لارڈ کرزن سے کہا تھا کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کے غلبے کو ترجیح دیں گے کیونکہ مسلمان قدرتاً انگریزوں کے خلاف تھے۔ اسی طرز فکر کا نتیجہ تھا کہ الہ آباد یونیورسٹی کے نصاب سے فارسی کو خارج کر دیا گیا۔ تحصیلداری اور ڈپٹی کلکٹری کے امیدواروں کی فہرست کو اسلئے منسوخ کر دیا گیا کیونکہ اس میں مسلمانوں کے بہت نام تھے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی کہ پولیس کے شعبہ میں ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد کیوں زیادہ تھی حکم جاری ہوا کہ حکومت کے کسی شعبے میں ہندوؤں کے مقابلے میں تین سے زیادہ مسلمانوں کا تقرر نہ کیا جائے۔ مسلمانوں کی تشویش میں اور بھی اضافہ ہوا جب اس وفد کی ہمت افزائی کی گئی جس کا یہ مطالبہ تھا کہ فارسی کی جگہ دیوناگری رسم الخط ہونا چاہئے۔ اس سے سرسید کی تحریک کو یقیناً سخت دھکا لگا اور مسلمانوں میں بے اطمینانی کی لہر دوڑ گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم قیادت زمینداروں کے بااثر حلقے کے ہاتھ سے نکل کر ترقی پسند رجحانات رکھنے والے نوجوانوں کے ہاتھ میں آگئی اور یہی لوگ احتجاجی تحریک کے روح رواں بن گئے' اور اول الذکر صرف تماشائی بن کر رہ گئے۔ یہ نوجوان لیڈر کانگریس کے دشمن اور انگریزوں کے حامی نہیں بننا چاہتے تھے۔ یہ لوگ عوامی سیاست پر یقین رکھتے تھے اگرچہ ان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلم یونیورسٹی کی خصوصیت کو برقرار رکھا جائے اور سول سروس

اور حد لینے میں مسلمانوں کو بھرتی کیا جائے۔ ترقی پسند رجحان رکھنے والے انھیں مسلمان نوجوانوں میں محمد علی بھی تھے

دوسرے مسلمان نوجوانوں کی طرح محمد علی کی بھی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی، اور یہ جمال الدین افغانی، آرنلڈ اور شبلی کی تعلیمات سے متاثر تھے۔ یہ اسلام کو قوم سے بالاتر سمجھتے تھے۔ عالمی خلافت پر عقیدہ رکھنے کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے اپنے ملک کی سرحدوں سے باہر دیکھنا ضروری تھا۔ خلافت کا اسلامی سیاسی نظریے کا ایک حصہ تھی۔ عثمانی خلافت میں مسلمانوں کی دلچسپی کی تاریخ ابتدائی انیسویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔ یہ دلچسپی سیاسی نہیں بلکہ مذہبی تھی۔ انگریز اس حقیقت سے واقف تھے اور اس کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے ۱۸۰۵ء میں برطانیہ عثمانی خلافت سے یہ اعلان کرانے میں کامیاب ہوا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو برطانیہ کا وفادار رہنا چاہئے۔ عزیز احمد کے مطابق جنگ کریمیا سے ۱۸۷۷ء تک برطانوی پالیسی یہ تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کے ترک دوستی کے جذبے کی ہمت افزائی کی جائے۔ ۱۸۷۷ء کی روس اور ترکی کی لڑائی میں مسلمانوں نے ترکی کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ آگے چل کر مسلمانوں کی اس ہمدردی کا برطانوی پالیسی سے تضادم ناگزیر تھا کیونکہ اس کے بعد سے برطانوی خارجہ پالیسی ترکی اور مصر کے خلاف ہو گئی۔ ڈبلو۔ اس بلنٹ نے لکھا ہے کہ مشتبہ برلن معاہدے، سائپرس پر ناجائز قبضے اور مصر میں برطانوی جارحیت نے مسلمانوں کے ایک گروہ کو برطانیہ کے خلاف کر دیا۔ برطانیہ کے ساتھ سرسید کی وفاداری اور سلطان عبد الحمید سے مخالفت کے باوجود یہاں اسلامی جذبات بڑھتے رہے۔ بیسویں صدی کے شروع میں مسلمانوں کی حیثیت کو سامراجی طاقتوں سے خطرہ تھا اور برطانیہ کی چشم پوشی کی وجہ سے مراکش فرانسیسی مقبوضہ بن گیا تھا اور عثمانی صوبے لیبیا پر اطالوی تسلط قائم ہو گیا تھا۔ عام طور پر یہ شبہ کیا جانے لگا تھا کہ فارس اور ترکی کو آپس میں بانٹ لینے کے لئے برطانیہ اور روس کے مابین خفیہ معاہدہ تھا۔ ۱۳-۱۹۱۲ء کی بلقان جنگ کے دوران مسلمانوں کا ایک طبی وفد وہاں بھیجا گیا تھا پہلی عظیم جنگ کے دوران ترکی کے ساتھ مسلمانوں کی ہمدردی اور دلچسپی ایک رومانی قسم کی تھی جو انگریزوں سے منافرت کا نتیجہ تھی۔ میکڈونل نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ "اس میں شک نہیں کہ ترکی کے ساتھ بڑی ہمدردی پائی جاتی ہے اور یہ کہ اس جذبے نے اسلامی احیاء کی شکل اختیار کر لی ہے جو میرے خیال میں کچھ تو خارجی ہمت افزائی اور کچھ داخلی حالات کا نتیجہ ہے۔ یہ جذبہ ایک مدت سے آہستہ

آہستہ پروان چڑھا ہے آگرہ کے کمشنر نے مجھ کو بتلایا کہ جلاہوں کی بڑھتی ہوئی تعداد ترکی ٹوپی بننے لگی ہے جس سے ہوا کے رخ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔" مسٹن کا کہنا تھا کہ پان اسلامیت صرف ایک مقصد کی خاطر تھی جس کے ذریعہ مسلمان ایک عظیم روایت کے ساتھ رشتہ قائم رکھنا چاہتا تھا ممکن ہے کہ یہ کوئی اخلاقی نصب العین نہ ہو لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک محاربانہ رشتہ ہے کیونکہ اس نظریہ پہنچکر اسکا رابطہ ان جارحیت پسند مولویوں کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے جو ناواقف عوام کے جذبات سے کھیلنا چاہتے ہیں۔ پان اسلامیت یہیں جنم لیتی ہے اور یہیں سے مسلمان قومیت کا تصور پیدا ہوتا ہے۔

یہ وہ پس منظر ہے جس میں محمد علی کے رول کو دیکھنا چاہئے۔ برطانوی عملے اور برطانوی خارجہ پالیسی کا مسلمانوں کی طرف سے جو رویہ تھا اس نے ہندوستان میں مسلم انتہاپسندی کے لئے راہ ہموار کی۔ اس کے چیمپین محمد علی تھے جو ترقی پسند رجحان رکھنے والے نوجوان حلقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے کہ محمد علی تلک کو اپنا سیاسی گرو مانتے تھے۔ تلک کی طرح یہ بھی ملک کی سیاسی تحریک کو عوامی بنیاد فراہم کرنے کے قائل تھے اور دونوں ہی کا مقصد خود اختیاری حاصل کرنا تھا اور دونوں ان طریقوں کو ناپسند کرتے تھے۔ جو اس دور کے آزاد خیال لوگوں نے اختیار کر لئے تھے یہ دونوں مذہب کو سیاسی مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ محمد علی گاندھی جی اور ان کی قیادت کو اسی انتہاپسند زاویے سے دیکھتے تھے۔ یہ ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانے اور اسلامی مفاد کے تحفظ کے لئے گاندھی کی حمایت کرتے تھے۔

محمد علی کے ذہن میں اسلام کا وہ روحانی تصور تھا جس کی شبلی نعمانی اور سید امیر علی نے کی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ محمد علی کے لئے اسلام اور پان اسلامیت میں کوئی فرق نہیں تھا ان کے خیال میں اسلام اور پان اسلامیت دنیا بھر کے مسلمانوں کی ایک اعلیٰ تنظیم تھی جو قومی حدود سے بالاتر تھی۔

یہ دونوں روحانی اتحاد اور سماجی نظام کا سرچشمہ تھے۔ محمد علی کی پان اسلامیت کا اظہار ۱۹۱۹ء کی خلافت تحریک کی شکل میں ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ خلافت کا مسئلہ سارے عالم اسلام کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور خلافت مسلمانوں کے بنیادی ادارے کی حیثیت سے ضروری ہے۔ ترکی کا خلیفہ پیغمبر اسلام کا جانشین ہے اور تمام مسلمانوں کے لئے قائد کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ ہندوستان کو آزاد کرائیں کیونکہ غلام ہندوستان ترکی اور اس کے خلیفہ

کی کوئی مدد نہیں کرسکتا اس طرح محمد علی نے ہندوستانیت اور پان اسلامیت کے درمیان مصالحت کی راہ نکالی۔ انھوں نے اعلان کیا "جہاں تک حکم خداوندی کا سوال ہے میں اول و آخر مسلمان اور صرف مسلمان ہوں لیکن جہاں تک ہندوستان کا سوال ہے میں اوّل و آخر ہندوستانی اور صرف ہندوستانی ہوں۔"

اسلام کے رومانی تصور کے مطابق اسلام زندگی کا ایک مکمل لائحۂ عمل اور سماجی زندگی کا ایک جامع نظام ہے جس کے دائرے میں پورا عالم انسانیت آتا ہے۔ اسلام کا یہ رومانی تصور یا تو آزاد اور محمد علی کی پان اسلامیت کی طرف لے جاتا ہے یا مولانا مودودی کے احیائے مذہب کی طرف۔ رومانی نظریے میں اسلام کی کسی تخلیقی تشریح کی گنجائش نہیں تھی۔

اپنے زمانے کی سیاسی مصلحت کے پیش نظر محمد علی کو رومانیت کا سہارا لینا پڑا۔ عملاً اس کا مطلب یہ تھا کہ اسلام کی تعلیم پر سختی سے قائم رہتے ہوئے عقلیت پسندی استدلالی نقطۂ نظر مثبت سائنس اور غیر تقلیدانہ فلسفے سے متصادم ہونے سے بچا جائے۔

محمد علی کی پان اسلامیت کے مضمرات کافی اہم تھے۔ چونکہ اسلام کے ہر پہلو کی تائید وہ اپنا فرض سمجھتے تھے اس لئے ان کی سیاسی فکر پر سیکولرزم سے زیادہ مذہبی رنگ غالب تھا۔ محمد علی کا خیال تھا کہ سیکولرزم اسلام کے دائرے کو محدود کر دے گی اور غیر دینی معاملات میں اس کو غیر مؤثر بنا دے گی۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ سیکولرزم قرآن کے احکامات اور پیغمبر اسلام کی سنت کے منافی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ 'جبر مذہب میں نہیں بلکہ مذہب کا ہے۔' مولانا عبدالباری کے نام ایک خط میں انھوں نے لکھا "جہاں تک سیاسی معاملات کا تعلق ہے ہر فرقے میں لیڈر ہیں۔ لیکن زندگی کی سب سے اہم چیز مذہب ہے اور اس میدان میں ہم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کوئی عالم دین ہمارا لیڈر نہ ہو"۔ انھوں نے اس نظریے کو سخت ناپسند کیا کہ مذہب اور سیاست کو الگ الگ رکھنا چاہیئے۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ مسلمان یا تو اپنے مذہب کی پیروی نہ کرسکیں کیونکہ مسلمان کی زندگی کا ہر شعبہ مذہب کا تابع تھا' یا یہ کہ سیاست کو روحانیت سے مبرا کر دیا جائے اور اس طرح اس کو عطائیوں اور بہروپیوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنا دیا جائے۔ ان کے خیال میں سیکولرزم ایک مغربی تصور تھا جس کو مشرق میں نہیں برتا جا سکتا تھا۔ اصل مسئلہ مذہب کے حدود کو متعین کرنے کا تھا اور ان کے

خیال میں وہ باتیں جو مغرب میں سیاست کا حصہ تھیں وہ اب بھی مشرق میں مذہب کا حصہ تھیں۔ وہ حکومت الہیہ کا تصور کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے اور ان کے ہر سماجی اور سیاسی تصور پر یہی تصور حاوی تھا۔ انھوں نے کہا "مجھے اپنی غلطی کا اعتراف صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب قرآن، حدیث یا مقتدر علماء کے ارشادات سے یہ ثابت کر دیا جائے کہ میرا راستہ غلط ہے۔"

چونکہ اسلام میں رنگ اور علاقے کی بنا پر فرق نہیں کیا جاتا اس لئے مختلف لوگوں میں اتحاد اور تعاون مشترک مذہب کے اصولوں کی بنیاد پر ہی ممکن تھا۔ اہمیت قوم پرستی کی نہیں بلکہ اتحاد کی تھی محمد علی مغربی قوم پرستی کو اس لئے مضر سمجھتے تھے کیونکہ اس کی ماہیت سیکولر تھی۔ قوم پرستی کسی ایک ملک یا جغرافیائی علاقے کے لوگوں کے لئے ہوتی ہے جہاں مادر وطن کی پرستش مذہبی فریضے کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن انسان بحیثیت انسان اپنے مذہب کا وفادار رہتا ہے اور مذہب قومی سرحدوں سے باہر بھی ہو سکتا ہے۔ اسلام میں علاقائی قوم پرستی کا کوئی مقام نہیں۔ کیونکہ یہ عرب اور غیر عرب میں امتیاز نہیں کرتا محمد علی نے لکھا: "اسلام ان تعصبات کی مذمت کرتا ہے جو انسانیت کی جگہ پر قومیت کو جنم دیتے ہیں۔ عربی اور عجمی یا آریائی اور غیر آریائی یا دوسری نسلوں کے ہونے کی بنا پر مسلمانوں میں کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ میں نے ان تفرقوں کے بھیانک نتائج دیکھے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ماہیت کے اعتبار سے اسلام قومیت سے بالاتر ہے اور اس لئے سیکولرزم کا مخالف ہے۔ سیکولر قوم پرستی خدا کا عطیہ نہیں شیطان کا عطیہ ہے۔ قوم پرستی اور مذہب میں زمین اور آسمان کا بعد ہے۔ مذہب کے بغیر قوم پرستی حق و باطل کی تمیز کے لئے زہر ہوتی ہے۔ ایک صالح مسلمان کو اس قوم پرستی سے احتراز کرنا چاہیئے جس کا نعرہ یہ ہوتا ہے" ہمارا ملک ہمارا ملک ہے خواہ وہ غلط ہو یا صحیح "۔ قوم پرستی کسی ملک کی پرستش کی تلقین کرتی ہے جبکہ اسلام صرف ایک اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتا ہے اور وہ خدا کا اقتدار ہے جو بلا شرط، لاشریک اور ناقابل تنسیخ ہے لیکن قوم پرستی اگر اسلام پر مبنی ہے تو وہ قابل قبول ہو سکتی ہے کیونکہ اس صورت میں یہ علاقائی یا سیکولر نہیں رہے گی اور نسل و مقام کے حدود سے آزاد ہوگی۔ یہ رویہ محمد علی کے خیالات کے عین مطابق تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ ایک طرف خلافت کو برقرار رکھا جائے اور دوسری طرف ملک کے اتحاد اور اس کی آزادی کی جدوجہد کو جاری رکھا جائے۔

محمد علی کے یہاں فرقہ پرستی کا مخصوص مفہوم تھا۔ ملک کی آزادی کے ساتھ ملک کے مختلف

فرقوں کو ایک دوسرے کی بالادستی کے خوف سے آزاد ہونا ضروری تھا تاکہ مسلمان اپنے کچر کا تحفظ کر سکیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب اور نسلوں سے مل جل کر ہی قوم بن سکتی ہے اور سیاسی اتحاد سیاسی سطح اور کچھ حد تک معاشرتی سطح پر ہو سکتا ہے۔ محمد علی کو ہمیشہ فرقہ پرست لیڈروں کی ہندو قوم پرستی کی طرف سے تشویش رہی۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانی قومیت اور ہندو مذہب کے حدود کو مشترک نہیں تصور کیا جا سکتا کیونکہ ان دونوں کو اگر ہم مرتبہ سمجھا جاتے تو مختلف مذاہب کے ماننے والے کروڑوں ہندوستانی اس سے خارج ہو جائیں گے۔ چنانچہ محمد علی جو پہلے فرقہ وارانہ انتخابی حلقوں کے خلاف تھے اب اس کے حامی بن گئے۔ وہ فرقہ وارانہ نمائندگی اور انتخاب کے حق میں اس لئے تھے کہ مسلمانوں کو یہ تشویش ہو گئی تھی کہ سوراج عملاً ہندو راج کے مترادف تھا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے پان اسلامیت کے زوال کے بہت تباہ کن نتائج برآمد ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پان اسلامیت مسلمانوں کی قرون وسطیٰ کی یک جہتی پر مبنی تھی جو اب قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ خلافت تحریک کے نتیجے میں بہت سے مسلمان ہندوستان سے ہجرت کر گئے۔ محمد علی کا خیال تھا کہ مسلمان اگر خلافت کا تحفظ نہیں کر سکتے تو انھیں ہندوستان کو چھوڑ کر کسی اسلامی ملک میں چلے جانا چاہئے۔ اس پروپگنڈے کے بہت غیر صحت مند نتائج برآمد ہوئے۔

مسلم سیاست کے ارتقاء پر محمد علی کی پان اسلامیت کے اہم اثرات مرتب ہوئے۔ انھوں نے انگریز دشمنی اور غیر دستوری اقدام کے استعمال کا جواز نکال لیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر برطانیہ ترکی کی خلافت کو ختم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو مسلمانوں کو یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ قبائلی علاقے میں اسلحہ سازی کے کارخانوں کی کیا صورت ہے اور وقت ضرورت کتنے اسلحے تیار کئے جا سکتے ہیں۔ سامراجیت کے خلاف ان کے احتجاج اور ہندوستان کی آزادی کے لئے ان کی جدوجہد کے پس پشت یہ یقین تھا کہ انگریز مسلمانوں کے مذہبی دشمن ہیں۔ انھیں اس بات کا خیال نہیں رہا کہ اگر مذہب کی بنیاد قوم پرستی پر رکھی گئی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مسابقتی قومیتیں پیدا ہو جائیں گی اور ہندوستانی معاشرے میں خلفشار پھیل جائے گا۔ اپنی عدم استقامت پر قائم رہتے ہوئے انھوں نے ہندوستان میں مذاہب کے اتحاد کا نصب العین پیش کیا جسکو وہ معاشرتی وفاق یا مذاہب کے وفاق کا نام دیتے تھے۔

مسلمانوں کی سیاست میں محمد علی کے حصے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ پہلے لیڈر تھے کہ جنھوں نے

علماء اور مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس سے اسلام اور ملک کی آزادی دونوں کو تقویت ملے گی۔ خلافت کی تحریک علماء۔ اور مغربی تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں کے اتحاد کی نشانی تھی جس کا واحد مقصد مسلمانوں میں یکجہتی پیدا کرنا تھا۔ محمد علی کے انتقال کے بعد علماء۔ اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کے درمیان خلیج زیادہ گہری ہوگئی یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے محمد علی کا طریقہ اختیار کیا تھا انھیں نے پاکستان کے لئے جدوجہد کی اور اس کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

تقریباً پونے پانچ سال کی نظربندی سے رہا ہونے کے بعد، مولانا محمد علی امرتسر پہنچے تو ۳۱ دسمبر ۱۹۱۹ء کو کانگریس کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوتے انھوں نے فرمایا کہ: "ہم یہاں اس لئے جمع نہیں ہوئے ہیں کہ دوزانو جھک کر یہ درخواست کریں کہ ہم کو جیل خانوں سے آزاد کرادو، ہم کو پھانسی کے تختے سے بچالو۔ میں اپنے لئے اپیل نہیں کرتا۔ مجھے چند آدمیوں کی رہائی کی فکر نہیں ہے، ہم چند آدمیوں کو آزاد کرا کے سارے ملک کو غلام بنانا نہیں چاہتے۔ میں اس ملک کے نام پر بول رہا ہوں جس کی آزادی ہم کو بہت زیادہ عزیز ہے بہ نسبت کسی شخص واحد کی آزادی کے، خواہ اس کی پوزیشن اور حقیقت کتنی ہی اعلیٰ اور بڑی کیوں نہ ہو۔

میں ضرور جیل بھیج دیا جاؤں۔ مسٹر تلک اگر ضرورت ہو تو تیسری مرتبہ جیل خانے روانہ کر دئے جائیں۔ مسز بیسنٹ دوبارہ نظربند کر دی جائیں بلکہ اس بڑھاپے میں اگر ضرورت ہو تو ان ہی کے بالوں سے جکڑ کر ان کو پھانسی دیدی جائے، لیکن ہندوستان کو آزاد ہوتے دیکھئے تاکہ کوئی شخص آئندہ کسی ہندوستانی مرد اور عورت کے بارے میں یہ نہ کہہ سکے کہ تو پیدائشی غلام ہے۔"

اوراق گم گشتہ، مرتبہ: رئیس احمد جعفری (مطبوعہ، لاہور۔ ۱۹۶۸) صفحہ ۵۰

قاضی محمد عبدالغفار مرحوم

مولانا محمد علی بحیثیت صحافی

پیش نظر مضمون قاضی محمد عبدالغفار (۱۸۸۹ - ۱۷ جنوری ۱۹۵۶) کی ایک ریڈیو تقریر ہے جو دسمبر ۱۹۴۴ء میں حیدر آباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئی تھی اور اسی سال ۱۲ دسمبر کے روزنامہ "خلافت" (بمبئی) میں شائع ہوئی تھی۔ محمد ظہیر وارثی صاحب (کامٹی) نے ازراہ عنایت، جامعہ کے محمد علی نمبر کے لیے اس کی نقل بھیجی ہے اور ہماری درخواست پر "خلافت" کا وہ شمارہ بھی جس میں یہ تقریر شائع ہوئی ہے۔ اخبار بہت ہی بوسیدہ ہے اور کہیں کہیں سے پھٹ گیا ہے، جس کی وجہ سے بعض جگہوں پر مضمون کی متعدد سطریں غائب ہو گئی ہیں مگر چونکہ خوش قسمتی سے یہ مضمون دو جگہ اور چھپا ہے۔ ایک علی گڑھ میگزین کے علی گڑھ نمبر (مرتبہ: نسیم قریشی، ۵۵-۱۹۵۳ء) میں، دوسرے "علی برادران" (مرتبہ: رئیس احمد جعفری، مطبوعہ: لاہور، ۱۹۶۳ء) میں، اس لیے ان مضامین کی مدد سے تصحیح میں آسانی ہو گئی۔

پیش نظر مضمون اور باقی دونوں مضامین میں خاصا فرق ہے۔ کہیں کہیں الفاظ اور جملوں کا فرق ہے، مگر آخری حصہ بالکل مختلف ہے۔ علی گڑھ نمبر جب شائع ہوا تھا تو اس وقت قاضی صاحب مرحوم، انجمن ترقی اردو (ہند) کے سکریٹری کی حیثیت سے علی گڑھ ہی میں تھے، اس لیے انھوں نے "علی گڑھ نمبر" کی مناسبت سے نظر ثانی کے علاوہ آخری حصے میں بنیادی تبدیلیاں بھی کی ہیں۔ غالباً یہیں سے یہ مضمون "علی برادران" میں نقل کیا گیا ہے۔ لیکن یہ مضمون بنیادی طور پر وہ ہے جو حیدر آباد ریڈیو سے نشر ہوا تھا اور "خلافت" میں شائع ہوا تھا۔

فاضل مضمون نگار اردو کے مشہور ادیب اور ممتاز صحافی ہیں۔ صحافت کا آغاز مولانا محمد علی کی نگرانی اور تربیت میں ہوا ہے، اس لیے انھیں اپنا استاد مانتے ہیں اور خود مولانا نے انھیں "اردو کا محمد علی" لکھا ہے۔ اپنے ایک خط میں قاضی صاحب کو لکھتے ہیں: "خدا تمھیں سلامت رکھے، خوب کام کر رہے ہو۔ واللہ بسا اوقات رشک آتا ہے۔ اگر اپنی تعلّی نہ سمجھو تو کہوں کہ اردو کے محمد علی ہو۔" (خطوط محمد علی صفحہ ۲۷۶)

موسم سرما اور وہ بھی دلی کا موسم سرما اور وقت صبح ۵ بجے۔ شوکت بھائی (یعنی مولانا شوکت علی) چند ماہ پہلے مجھے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دلا کر یہاں لے آئے تھے۔ اب دسمبر ۱۳ء کی اس صبح کو ۶ بجے کلکتہ کی سکونت ترک کر کے پہلی دفعہ دلی آرہے تھے۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا اور میں چیلوں کے کوچے سے بھاگم بھاگ چاندنی چوک تک پہنچا۔ اس وقت کوئی تانگہ بھی میسّر نہ آیا، اس لئے ریلوے اسٹیشن تک کا فاصلہ تقریباً دس میل بھاگتے بھاگتے طے کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میری عمر ۲۱ سال سے زیادہ نہ تھی، اس لئے دلی میں دسمبر کی کڑکڑاتی سردی میں ایک جوان جسم پر پسینے کا لطف دوبالا ہو گیا تھا۔ اس وقت تک تو میں شوکت علی سے خوب واقف تھا، اس لیے کہ وہ میری شادی کے دن میری سسرال میں (یعنی سر محمد یعقوب کے مکان پر) اس وقت تشریف لائے تھے جب میں دولہا بنا بیٹھا تھا اور پہلا کام انھوں نے یہ کیا تھا کہ میرے سامنے سلامی کا جس قدر روپیہ رکھا تھا وہ سب اٹھا کر مسلم یونیورسٹی کے چندے میں شریک کر لیا تھا۔ مگر محمد علی کو میں نے ایک دو مرتبہ دور سے ہی دیکھا تھا۔ البتہ اب دسمبر کی اس ٹھنڈی صبح سے میرا ان کا وہ رابطہ شروع ہوتا تھا جو ان کی زندگی کے غروب آفتاب تک قائم رہا۔ "کامریڈ" والے محمد علی سے اس قدر قریب آنے کا شوق میری جوانی کو بیتاب کر رہا تھا اور دلی ریلوے اسٹیشن کے اس پلیٹ فارم پر دسمبر کی وہ صبح میری زندگی کا ایک نیا باب شروع کر رہی تھی۔

ہوڑہ ایکسپریس اپنے مقررہ وقت کے چند منٹ بعد پلیٹ فارم پر پہنچا اور ٹرین کی ایک آخری گاڑی سے ایک سُرمئی رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے محمد علی برآمد ہوئے۔ میری جوانی

بھی اس زمانے میں لباس اور فیشن کی ترغیبات سے ہم آغوش تھی، اس لیے پہلی چیز جس کا رعب مجھ پر پڑا وہ محمد علی کے انگریزی لباس کی تراش خراش اور موزونیت تھی۔ آج تک یاد ہے کہ ان کے سرمئی سوٹ کے ساتھ ان کے جوتے اور موزے بھی سرمئی تھے۔ زندگی کے اس دور میں جوتوں اور موزوں کی رنگ آمیزی ہم نوجوانوں کی معاشرت کا گویا ایک بہت ہی اہم عنصر تھا۔ علی گڑھ میں ہم اس جامہ زیبی کا سبق پڑھتے تھے اور اس کو اپنی تعلیم و تربیت کا ایک امتیازی نشان سمجھا کرتے تھے۔ زندگی کی یہ قیمتیں ہمارے لیے اس وقت تک نہ بدلیں جب تک کہ مسٹر محمد علی اپنی عبا و ردا کے ساتھ مولانا محمد علی نہ بن گئے۔ اس دن صبح کو دلی کے ریلوے اسٹیشن پر جبکہ میں نے اس شخص کو دیکھا جس سے میری زندگی کو سالہا سال وابستہ رہنا تھا تو وہ نظر صرف اتنی ہی وسیع تھی کہ پہلی نظر آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ محمد علی کے سوٹ کی تراش اور سوٹ کے ساتھ موزوں اور جوتوں کے رنگ کے ربط پر گئی، باقی جو کچھ دیکھا تھا وہ بعد میں دیکھا۔ ۲۲ سال کی عمر میں جس کا ایک حصہ سرکاری ملازمت میں گزرا تھا ابھی اپنی نظر کا زاویہ قائم نہ کر سکی تھی۔ میں "کامریڈ" کے مضامین پڑھا کرتا تھا اور ان مضامین کے مطالب سے زیادہ انگریزی زبان پر محمد علی کے قلم کی قدرت کو دیکھا کرتا تھا۔ میرا دل اور میری طرح اس زمانے کے ہزارہا نوجوانوں کا دل جدید افکار کی وسعتوں اور خیالات کی بلندیوں سے ناآشنا تھا۔

"ہمدرد" کے شعبۂ ادارت میں جب میں ایک ادنیٰ شاگرد بن کر محمد علی کے سامنے بیٹھا تب کہیں ان چنگاریوں کی گرمی میں نے محسوس کی جو "کامریڈ" کے جواں سال اور بے باک ایڈیٹر کی شخصیت سے نکل کر ان کے نوجوان شاگردوں کو اذیت کوش ہونے کی دعوت دیتی تھی۔ ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو "ہمدرد" کا ایک ورقہ "نقیب ہمدرد" کے نام سے شائع ہوا تھا، اس وقت تک بیروت سے ٹائپ کی کافی مقدار وصول نہ ہوئی تھی اس لیے یکم جون ۱۳ء سے پہلے "ہمدرد" اپنے پورے حجم کے ساتھ شائع نہ ہو سکا۔ یکم جون ۱۳ء کے بعد سے شعبۂ ادارت کا پورا کام شروع ہوا اور میں نے پہلی دفعہ محمد علی کے مددگار کی حیثیت سے صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ ایک ادنیٰ شاگرد کی حیثیت سے میں نے

اُن کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا تھا اور جب تک ۱۹۱۴ء کی جنگ کا ہنگامہ شروع نہ ہوا اور محمد علی کی مدیرانہ حیثیت قومی کاموں میں منتقل نہ ہوگئی وہ "ہمدرد" کے شعبۂ ادارت کی نگرانی کرتے رہے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ ایک ایسے استاد کی طرح جو بیک وقت شفیق بھی تھا اور سخت گیر بھی، انھوں نے صحافت کے ابتدائی اصول اپنے نوجوان مددگاروں کو سمجھانے کا طریقہ اس طرح مقرر کیا کہ ہفتے میں صرف ایک یا دو مضامین لکھ دئے جاتے تھے۔ ہر روز شام کو ادارت کے اراکین کی ایک مجلس مشاورت چیف ایڈیٹر کے کمرے میں منعقد ہوتی تھی۔ اس مجلس میں مرحوم اپنے ہر مددگار کے لیے ایک مضمون تجویز کرتے تھے، پھر اس مضمون کے متعلق کتابوں کی ایک فہرست لکھاتے تھے۔ بہت سی کتابیں اپنے کتب خانے سے نکال کر دیتے تھے ان کے خاص خاص ابواب اور صفحات کی نشان دہی وہی کرتے تھے اور بار بار اس اصول کو ذہن نشین کراتے رہتے تھے کہ لکھنے سے پہلے اور لکھنے سے زیادہ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ بعض دفعہ دس بارہ کتابیں پڑھنے کے بعد ایک اداریہ لکھنا ہوتا تھا۔ میرا پہلا اداریہ "ہمدرد" کی پہلی جلد کے آٹھویں پرچے میں ۱۰ رجون کو شائع ہوا تھا لیکن میں یہ بتاؤں کہ وہ لکھا کس طرح گیا تھا تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ فن صحافت میں محمد علی کے شاگرد کس طرح تربیت حاصل کرتے تھے۔ دس بارہ کتابیں مجھے دی گئی تھیں تاکہ میں ان سب کو پڑھ لوں، کچھ نوٹ محمد علی نے لکھوائے تھے، آٹھ دس دن تک میں لکھنے کی تیاری کرتا رہا، پھر جب ایک حصہ لکھ لیا تو مسودہ ان کے پاس لایا۔ مجھے یاد ہے کہ چند ہی سطریں پڑھنے کے بعد انھوں نے منہ بنایا اور یہ کہہ کر مسودہ پھینک دیا کہ "یہ کیا فضولیات گھسیٹ کر لائے ہو۔"

میں کیا کہوں کہ اُس دن ایک خام کار نوجوان کی کس قدر دل شکنی ہوئی جس کو اپنے خیال میں بڑا ناز تھا اس بات پر کہ وہ "ہمدرد" کے ادارتی شعبہ جات میں اپنی خواہش کے اصرار پر شریک کیا گیا ہے، حالانکہ عمر اور تجربے میں وہ محمد علی کے تمام دوسرے شاگردوں سے کم نہیں تھا مگر چیف ایڈیٹر کی رائے میں اس کے پہلے ہی مضمون کا مسودہ فضولیات قرار پایا تو ظاہر ہے کہ اس نوجوان کی خود بینی کو جس قدر بھی صدمہ پہنچا

ہوا وہ کہ مجھے بڑی ذلت اور شرمندگی محسوس ہوئی۔ کچھ غصہ بھی آیا مگر اتنی جرأت نہ تھی کہ اس غصے کا ذرا بھی اظہار کیا جاتا۔ پھر ایک گھنٹے تک ان کا لکچر سنا، پھر بہت کوشش کر کے ان کے خیالات کے مطابق از سر نو مضمون لکھا، پھر بھی وہ ناپسند ہوا مگر اتنا زیادہ نہیں جتنا کہ پہلی دفعہ۔ ہدایت ہوئی کہ ایک دفعہ پھر لکھو۔ رات بھر بیٹھ کر پھر لکھا اور صبح کو پیش کیا، پورا مضمون پڑھا، گلے سے لگا لیا۔ تو لفظوں کے پل بندھ گئے۔ پہلے جس قدر ان کی تنقید سے شرمندہ ہوا تھا اب اپنی توصیف سے شرمندہ ہوا۔ معلوم ہوا کہ اس تنقید کی تلخی میں شہد اور دودھ کی نہریں بھی بہا کرتی ہیں۔ ہفتوں میرے ان مضامین کی تعریف ہوتی رہی، چنانچہ حوصلہ بڑھا اور خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ اب ان کی بات سمجھ میں آنے لگی۔ ان کا سا حافظہ یا ان کی سی ذہانت تو نصیب نہ ہوئی تھی اس لیے بلا مبالغہ سینکڑوں اور ہزاروں کتابیں اس طرح پڑھی ہیں کہ پنسل اور نوٹ بک پاس رکھی ہے، کام کی باتیں نوٹ کرتا جاتا ہوں، ہر مضمون سے متعلق حاصل کردہ معلومات کو ایک علٰحدہ فائل میں محفوظ کر دیتا ہوں اور ضرورت کے وقت ان سے کام لیتا ہوں۔ مضمون لکھتا ہوں تو زیادہ کوشش اس بات کی کرتا ہوں کہ وہ معلومات سے پُر ہو اور معلومات بھی ایسی جو صحیح ہوں۔ خود محمد علی کو جب کوئی مضمون لکھنا ہوتا تھا تو وہ راتوں کو اس طرح جاگتے تھے کہ ان کے بستر پر کتابوں، اخباروں، رسالوں اور تراشوں کا ایک انبار ہوتا تھا اور سرخ پنسل ہاتھ میں ہوتی تھی۔ ان تیاریوں کے بعد وہ لکھنے بیٹھتے تھے تو اپنی طرز نگارش کے ساتھ اپنی بیش بہا معلومات اور دلائل کی قوت میں اضافہ کرتے تھے۔ ان کی دوسری اہم خصوصیت یہ تھی کہ ہر مسئلے کی تفصیلات پر گہری نظر ڈالتے تھے اور بعض اوقات تو یہی سمجھتا تھا کہ وہ بال کی کھال نکال رہے ہیں لیکن بعد کو معلوم ہوتا تھا کہ نہیں چھوٹی چھوٹی تفصیلات ہی سے بڑے بڑے دلائل مستحکم کیے جاتے ہیں۔

ہر شریک کار کو ان کے خلوص اور محبت سے بھرے دل میں جگہ ملتی تھی۔ ظاہری عتاب اور غصہ، جو آخر میں اعصابی امراض کی وجہ سے زیادہ ہو گیا تھا، محض عارضی ہوتا تھا۔ ایک دفعہ ان کے ایک مضمون کا پروف میں نے دیکھا تھا، اس میں کوئی غلطی رہ گئی تھی

مزاج برہم ہوگیا۔ دفتر میں آکر بس مجھ پر برس پڑے۔ میں بھی کچھ برسا اور اسی وقت استعفیٰ دے کر گھر چلا آیا۔ دوسرے دن شوکت بھائی زبردستی پکڑ کر لے گئے اور میں گیا بھی تو یہ سُن کر کہ محمد علی نے کل سے کھانا نہیں کھایا ہے اور بہت مغموم ہیں۔ ان کے سامنے پہنچا تو شکایت حکایت تو کجا لپٹ کر اس طرح رونے لگے کہ مجھ پر ہزاروں گھڑے پانی پڑ گئے۔ میری شکایت ندامت بن گئی اور توبہ کرنی پڑی کہ اب ایسا نہ ہوگا۔ اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں سے محبت کے جواب میں وہ محبت مانگا کرتے تھے اور اگر ہم اپنی کم فہمی سے ان کی کسی شکایت اور غصے سے خفا ہو جاتے تھے تو ان کے قلبِ صافی کی سادگی ایسی تھی کہ وہ خود ہی حیران ہو جاتے تھے کہ میں نے یہ کیا کیا۔

جو کچھ اس بے مثل اُستاد، اس محبت کرنے والے بھائی، اس شفیق دوست سے میں نے سیکھا وہ میری زندگی کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ صحافت ان کی زندگی کا کوئی واحد مقصد نہ تھا بلکہ وہ تو کسی بڑے مقصد کے لیے محض آلۂ کار تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو محمد علی ہندوستان میں آج سب سے بڑے اور کامیاب صحیفہ نگار سمجھے جاتے۔ "ہمدرد" کے اجراء کے چند ہی روز بعد ان کی قومی مصروفیت نے اپنے لیے بڑے میدان اور خارزار پیدا کر لیے تھے، اس لیے وہ صحافت کو اپنی نظر میں اس سے زیادہ کچھ نہ سمجھتے تھے کہ:

میرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں یہ بھی

چنانچہ رفتہ رفتہ "کامریڈ" اور "ہمدرد" کے کاموں سے ان کا تعلق بہت کم ہوگیا اور "ہمدرد" کی ذمہ داریاں بڑی حد تک مجھ پر اور سید جالب مرحوم پر اور "کامریڈ" کی ذمہ داریاں راجہ غلام حسین پر عاید ہوگئیں۔ ان کی نظر بندی کے بعد بھی کچھ عرصے تک میں "ہمدرد" سے وابستہ رہا، لیکن بعد میں خود ان ہی کے اشارے سے میں نے کلکتہ جا کر وہاں سے روزنامہ "جمہور" جاری کیا، اس طرح میں ان سے دور ہوگیا لیکن بقول استاد مرحوم کے:

دل کی فضا میں بُعدِ زمان و مکاں نہیں

محمد علی کی صحافت کی زندگی کی ایک اور خصوصیت قابلِ ذکر ہے وہ فرماتے تھے کہ بغیر کسی عقیدے کے اخبار نویسی محض دوکانداری ہے۔ اخبار کا کام رائے عامہ کی رہنمائی

کرنا ہے نہ کہ اس کی تقلید ۔ وہ اس طریقے کو معیوب سمجھتے تھے کہ اخبار کے کاروبار کی کامیابی کے لیے اور اخبار کو ہر دل عزیز بنانے کے لیے پڑھنے والوں کے خیالات کی تائید کی جائے۔ اس اصول کی خاطر انھوں نے "ہمدرد" کی عام مقبولیت کو نقصان پہنچانا گوارا کیا لیکن اپنے عقاید کی انفرادیت کو متاثر کرکے اپنے اخبار کو کامیاب بنانا کبھی پسند نہیں کیا۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ اخبار میں اس کے مدیر کی شخصیت کا عکس پوری طرح نمایاں رہے۔ شہرت کے پلّے میں عوام کے مذاق اور خواہشات کو رکھ کر اس پلّے کو بھاری رکھنا وہ اپنے عقائد کی توہین قرار دیتے تھے۔ اس لیے خود ان کے سیاسی عقاید کے مدوجزر کے ساتھ ان کا اخبار بھی بہت سے نشیب و فراز سے گزرتا رہا ہے تا آنکہ عامیوں کی بدمذاقی سے عاجز آکر ان کی زندگی ختم ہوگئی۔

تیسری بات جو میں نے ان سے سیکھی یہ تھی کہ عدم تعاون کی تحریک سے پہلے بحیثیت ایک صحیفہ نگار کے وہ سرکاری حلقوں میں ایک خاص اثر رکھتے تھے اور بعض اوقات اسی وجہ سے ان کے مخالفین ان پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ سرکاری حلقوں کے زیرِ اثر ہیں۔ ایسے لوگوں سے جیسے کہ مرحوم نواب صاحب رام پور یا مہاراجہ الور یا آغا خاں، مہاراجہ محمود آباد یا سر سید علی امام تھے۔ مرحوم کے تعلقات بظاہر گہرے تھے اور اس وقت تک جبکہ عدم تعاون کی تحریک نے ان کو سرکاری حلقوں سے بالکل جدا نہ کر دیا وہ حکومت کے اندرونی حلقوں میں بہت با اثر سمجھے جاتے تھے۔

خود فرمایا کرتے تھے کہ ان کی وقعت ان حلقوں میں محض ان کی قابلیت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ زیادہ تر اس لیے ہے کہ حکومت جانتی ہے کہ ان کا عقیدہ مستحکم ہے اور ان کی شخصیت ترغیبات سے بالاتر ہے، اس لیے ان کی آواز میں زور تھا اور ان کے الفاظ میں اثر۔ پہلی دفعہ جب نظربند ہوئے تو اس وقت تک میں ان کے افکار سے بہت قریب ہو چکا تھا اور سرکاری حلقوں میں ان کی گفت و شنید سے واقف رہتا تھا۔ کہا کرتے تھے کہ حکومتیں ہم جیسے لوگوں کی کمزوریاں تلاش کیا کرتی ہیں۔ جب کوئی کمزوری ہاتھ نہیں آتی تو وہ ہماری باتیں سننا چاہتی ہیں۔ یہی وقت ہے جب انھیں متاثر کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی صحافت کے ابتدائی زمانے

کا سرکاری حلقوں سے کافی اتصال قائم رہا، لیکن بگڑتے تھے وہ اس وقت جبکہ کسی عقیدے اور اصول کا سوال سامنے آتا تھا۔ اصول اور عقیدے کے معاملے میں ہمدرد کے اجراء کے بعد ان کی پامردی بہت نمایاں ہو چکی تھی اور جہاں کوئی ایسی تنقیح پیدا ہوتی تھی تو سرکاری حلقوں میں ان کا کوئی بڑے سے بڑا دوست بھی ان کو متاثر نہ کر سکتا تھا۔

یہ تھے محمد علی میرے محبوب استاد، ان کی صحیفہ نگاری نے اردو صحافت کا ایک نیا دور شروع کیا تھا اور وہ اردو کی پسماندہ صحافت میں بعض اہم اصلاحات کے بانی تھے۔

مثلاً "ہمدرد" پہلا روزنامہ تھا جو لیتھو کے بجائے ٹائپ میں چھپا۔ "ہمدرد" پہلا روزنامہ تھا جس کے مضامین کا معیار اس زمانے کی عام صحافت سے بہت زیادہ بلند تھا۔ بہت سے مشہور شعراء اور ادیبوں کو جو صحافت سے دور رہتے تھے، محمد علی کی شخصیت نے پہلی دفعہ ہمدرد کے صفحات پر پیش کیا۔ حالی، اقبال اور شبلی کی نظمیں اور پریم چند کے افسانے غالباً پہلی دفعہ ایک اردو کے روزنامے میں شائع ہوئے۔ طنز اور مزاح نگاری کا ایک ایسا معیار "ہمدرد" نے قائم کیا جس کا اس سے پہلے اردو صحافت میں کوئی وجود نہ تھا۔ بھبوق اور محفوظ علی اس فن کے استاد مانے گئے اور آج بھی جو اچھے مزاح نگار اور طنز نگار ہیں انھوں نے "ہمدرد" کی روایات سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ یہ سب محمد علی کی شخصیت کا کرشمہ تھا اور ان کے شاگردوں کو اگر خوش مذاقی سے کچھ حاصل ہوا تو وہ بھی انھیں کی عطا ہے۔

میری عمر بھر کی یہ داستان ہے، اُسے میں صرف پندرہ منٹ میں کیا بیان کر سکتا۔ قائد ملت محمد علی کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا لیکن صحیفہ نگار محمد علی کے متعلق ابھی کچھ نہیں لکھا گیا۔ اب وہ اپنے رب کی رحمتوں کے آغوش میں محو خواب ابد ہیں لیکن ان کی روایات اب بھی اپنے اندر زندگی کی حرارت رکھتی ہیں۔ جب کبھی وہ یاد آتے ہیں تو اس عہد رفتہ کے بہت سے مُردے کروٹیں بدلتے ہیں۔ ہمارے دلوں میں وہ اب بھی زندہ ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ مر گئے:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

حواشی :

۱۔ مہینہ اور سنہ دونوں غلط ہیں۔ کلکتہ سے کامریڈ کا آخری شمارہ ۱۴ر ستمبر ۱۹۱۲ء کو اور دہلی سے پہلا شمارہ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۱۲ء کو نکلا تھا اور مولانا ۱۲ر ستمبر ۱۹۱۲ء کو دہلی آئے تھے۔

۲۔ چیلوں کے کوچے سے۔ جسے آجکل کوچہ چیلاں کہتے ہیں۔ پرانی دہلی کے ریلوے اسٹیشن کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی میل ہوگا۔

۳۔ باقی دونوں مضامین میں ۲۳ سال چھپا ہے۔ قاضی صاحب کا سنہ ولادت ۱۸۸۸ء ہے اور اس لحاظ سے اُس وقت ان کی عمر ۲۵ سال کے قریب رہی ہوگی۔

۴۔ اس لفظ سے ایسی غلط فہمی پیدا ہوئی ہے کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مولانا نے "نقیب ہمدرد" کے نام سے کوئی اخبار نکالا تھا۔ یہ غلط فہمی شاید مولانا دریا آبادی کے اس جملے سے پیدا ہوئی کہ: "کچھ عرصے کے بعد "نقیب ہمدرد" کے نام سے ایک مختصر روز نامہ نکلنے لگا۔" (ذاتی ڈائری صفحہ ۵) مگر اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ مولانا نے عارضی طور پر جو اخبار نکالا تھا اس کا نام بھی روز نامہ "ہمدرد" تھا۔ اصل اور عارضی میں صرف یہ فرق ہے کہ عارضی پر جلد کی جگہ "سلسلۂ خاص" لکھا ہوتا تھا، یکم جون ۱۹۱۳ء سے جب اصل اخبار نکلا تو اس پر جلد ا نمبر ا لکھا گیا۔ عارضی اخبار ۲۳ر فروری سے ۱۳ر مئی (نمبر ا تا ۶۹) یک ورقہ نکلا اور اس کے بعد سے ۳۱ر مئی (نمبر ۸۵) تک دو ورقہ تھا۔

۵۔ اس اداریہ کا عنوان "مصر" ہے اور ۱۰ر سے ۱۲ر جون تک تین قسطوں میں شائع ہوا ہے اور کل ۱۶ کالم کا ہے۔ تفصیل یوں ہے، پہلی قسط ۵½ کالم، دوسری ۴½ کالم، تیسری: ۶½ کالم

۶۔ مولانا نے اپنی نامکمل آپ بیتی میں لکھا ہے کہ: "در اصل جس چیز نے مجھے صحافت میں جانے پر اس ناقابل مدافعت حد تک مجبور کر دیا وہ یہ بھی کہ اُس وقت میں صحافت ہی کے ذریعہ اپنی ملّت کے مسائل کے سلسلے میں کام کر کے ملّت کے لیے ایک حد تک مفید بھی ہو سکتا تھا۔"

خواجہ حسن نظامی دہلوی

مولانا محمد علی بحیثیت ایڈیٹر

مولانا محمد علی اردو انگریزی کے بہت اچھے ایڈیٹر تھے اور ہندوستان میں ان جیسی معلومات کے ایڈیٹران کے ابتدائی زمانے میں بہت کم ملتے تھے۔ مرحوم بحیثیت لیڈر کے عوام کے ذہن اور خیال تک پہنچ سکتے تھے، مگر بحیثیت ایڈیٹر کے ان کو عوام کی خواہش کا احساس نہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کا اخبار "کامریڈ" تو بہت مقبول ہوا، کیونکہ اس کے ناظرین اعلیٰ تعلیم یافتہ اور "کامریڈ" کی اعلیٰ انگریزی کے قدرداں تھے، مگر "ہمدرد" مقبول عوام نہ ہو سکا، کیونکہ مرحوم اس کو بھی "کامریڈ" کی طرح اعلیٰ سطح پر رکھنا چاہتے تھے، حالانکہ اس کے ناظرین کم علمی کے سبب اپنے مذاق کا اخبار چاہتے تھے۔ مرحوم کے مزاج میں شاہ خرچی شروع سے تھی۔ اخبار "ہمدرد" جاری کرنے کا ارادہ ہوا تو کئی مہینے پہلے سے مولانا عبدالحلیم شرر وغیرہ کو بلوا لیا گیا اور ان کو گھر بیٹھے تنخواہیں ملتی رہیں، مگر ٹائپ آنے میں کئی مہینے لگ گئے اور اخبار بہت دیر میں شائع ہوا۔

اخبار نویسی میں ان کی نظر بہت بلند تھی، ورنہ اردو کے ایک روزانہ اخبار کے لیے انھوں نے جو شاہانہ اہتمام رکھا تھا وہ اردو اخباروں کی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ان کی شاہانہ طبیعت کے سبب بہت سے بیکار لوگ بھی ان کے آس پاس جمع ہو گئے تھے اور انھوں نے ان کو روزگار دینے کے لیے اخبار کا دفتر وائسرائے کے دفتر سے مشابہ بنا دیا تھا۔ "ہمدرد" جاری ہوا اور خرچ آمدنی سے بہت بڑھ گیا اور ناواقف لوگوں کی بھیڑ سے کام نہ چلا اور شکایتیں بڑھنے لگیں تو مرحوم نے مجھے بلایا، کیونکہ میں ان کے مکان کے قریب ملا واحدی صاحب کے مکان میں رہتا تھا اور اسی جگہ میرا دفتر تھا۔ میں واحدی صاحب کو لیکر ان کے مکان پر گیا اور مرحوم نے مجھے اور واحدی صاحب کو سارا دفتر دکھایا اور مشکلات کو بیان کیا۔ میں نے اور واحدی صاحب نے کہا کہ یہ مشکلات ایک گھنٹے میں دور ہو سکتی ہیں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان سب فضول آدمیوں کو علیحدہ کر دیجیے

انتظامی عملے میں دو تین آدمی کافی ہیں۔ ان بیسیوں کی کیا ضرورت ہے؟! مرحوم نے ہنس کر کہا کہ آپ تجارتی رائے دیتے ہیں اور میں یہ کام تجارت کے لیے نہیں کرتا بلکہ قومی خدمت کے لیے کرتا ہوں۔ میں نے کہا لیکن جب تک اخبار کا نظم درست نہ ہو تو قومی خدمت کیا ہو سکے گی۔ مرحوم نے کہا میں نے ہر کام ایک ایک آدمی کے سپرد کر دیا ہے اور ہر ایک کام کا اس کو ذمہ دار بنا دیا ہے، لہٰذا اس عملے میں سے ایک آدمی بھی کم نہیں ہو سکتا۔ میں نے کہا کہ ان میں سے ایک آدمی بھی ذمہ داری سے واقف نہیں ہے اور کسی کو بھی جواب دہی کا خوف نہیں ہے۔ جانتے ہیں، آپ کو غصہ آئے گا، آپ ناراض ہوں گے؛ گردن جھکا کر آپ کی ناراضگی سن لیں گے، کیونکہ تھوڑی دیر کے بعد آپ کی شاہانہ شان ان کو معاف کر دے گی اور ان کی پرورش کا جذبہ آپ کو مغلوب کر لے گا۔

بہرحال مرحوم عملے کی تخفیف کے لیے کسی طرح راضی نہ ہوئے اور ہم دونوں اپنے مکان پر واپس آ گئے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ انگریزی کے ایڈیٹر بہت اچھے تھے مگر اردو کے ایڈیٹر اچھے نہ تھے لیکن کمی صرف اتنی تھی کہ عوام کی خواہش کی پروا نہ کرتے تھے، ورنہ اردو کی ایڈیٹری بھی ان کی اعلیٰ تھی جو "ہمدرد" کی لاجواب ترتیب سے معلوم ہو سکتی ہے[1]۔

جب میری ان کی اخباری جنگ ہو رہی تھی تو میں ان کی تحریری میگزین سے واقف رہنے کی بہت کوشش کرتا تھا۔ اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود ہی سب کچھ لکھتے ہیں، سب ایڈیٹروں کی تحریریں ان کو پسند نہیں ہیں، اس واسطے زیادہ کام کرنے کے سبب اخبار میں دیر ہو جاتی ہے اور چھاپنے والے جلدی کرتے تھے تو ان کو غصہ آ جاتا تھا۔

ان کی ایڈیٹری انگریزی کی کیسی ہی ہو مگر اردو کی ایڈیٹری میں یہ نقص ضرور تھا کہ وہ مخالف فریق کے اشتعال دلانے سے مشتعل ہو جاتے تھے۔ چنانچہ میرے ساتھی یہ سمجھ کر کہ فلاں طرز تحریر سے ان کو غصہ آئے گا اور وہ اصل مبحث سے ہٹ جائیں گے، یہ تحریری حربہ استعمال کرتے تھے اور کامیاب ہوتے تھے۔

بہرحال ان کی ایڈیٹری کی خوبیاں مذکورہ برائیوں سے بہت زیادہ تھیں۔

(روزنامہ خلافت ۔ محمد علی نمبر، مورخہ ۳ر فروری ۱۹۳۵ء صفحہ ۱۴)

---

[1] اس کے بعد کی عبارت پڑھی نہ جا سکی اس لیے دو سطریں حذف کر دی گئی ہیں

مفتی محمد رضا انصاری

مولانا محمد علی اور مولانا فرنگی محلی

محمد علی ـــــ مسٹر بی۔ اے (آکسن) ـــــ نے ٹھیٹھ مذہبی ماحول میں آنکھ کھولی اور مذہب ہی کی گود میں پرورش پائی۔ انگریزی اعلیٰ تعلیم اور کچی عمر میں قیام لندن کے باوصف اپنے عہد کے دیگر لندن پلٹ ہندوستانی نوجوانوں کے برعکس نوجوانی میں بھی، جدید فیشن کے برتنے اور جدید معاشرے کے تقاضوں پر عمل پیرا ہونے کے باوجود وہ مذہبی رہے۔

ذہنی اور عملی دونوں پہلوؤں سے ایک ممتاز مذہبی شخصیت، وہ اپنی نظر بندی ـــــ سنہ ۱۹۱۵ء سے سنہ ۱۹۱۹ء تک کے زمانے میں بنے اور اس نظر بندی کے زمانے میں رمضان[1] سنہ ۱۳۳۳ھ (مطابق جولائی سنہ ۱۹۱۵ء) میں اس وقت کے ایک خاندانی عالم اور رشید نام ور مجاہد مولانا محمد قیام الدین عبد الباری فرنگی محلی (وفات جنوری سنہ ۱۹۲۶ء)[2] کے ہاتھوں پر، اپنے بڑے بھائی اور نظر بندی میں برابر کے شریک، مولانا شوکت علی کے ساتھ بیعت ہو گئے۔

مولانا عبد الباری فرنگی محلی عموماً سلسلۂ قادریہ کی رزاقیہ شاخ اور سلسلۂ چشتیہ کی صابریہ شاخ میں حسب خواہش ارادت مند بیعت کر لیتے تھے۔ محمد علی کے

۱۔ کاغذات مولانا عبد الباری فرنگی محلی۔

۲۔ پیدائش ۱۸۷۸ء وفات: ۱۹ جنوری ۱۹۲۶ء

ایک تذکرہ نگار[۱] نے سلسلۂ قادریہ رزاقیہ میں ان دونوں بھائیوں کے مرید ہونے کی جو تخصیص کی ہے، اپنے ذرائع سے میں اس کی توثیق نہیں کرسکا، نہ اس تذکرہ میں مذکور اس روایت کی تصدیق اب ممکن ہے کہ علی برادران کے کچھ اعزا، مولانا عبدالباریؒ کے خاندان میں پہلے سے ہی مرید تھے۔ اس خاندان میں مریدوں کی کوئی فہرست تیار نہیں کی جاتی تھی۔

علی برادران اپنے ان ہی مرشد کے مدرسہ "مدرسہ عالیہ نظامیہ" واقع فرنگی محل سے ۱۹۲۰ء میں "مولانا" کی اعزازی سندیں پاکر "مولانا" ہوئے۔ اس وقت سے "مولانا محمد علی" اور "مولانا شوکت علی" کے نام سے یاد کئے جانے لگے۔ اور ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے۔ جب کبھی بھی یاد کیے جائیں گے! میں نے ان اعزازی سندوں کا مثنیٰ دیکھا ہے .... وہ مولانا عبدالباریؒ (منصرم مدرسہ) کی مہروں سے مزین تھے۔ اور مضامین ممتحنہ کے ذیل میں "خدمۃ الاسلام والمسلمین" درج تھا۔

آخر دسمبر ۱۹۱۹ء میں علی برادران پانچ سال کی نظربندی اور جیل کے بعد جب رہا ہوئے تو چہروں پر داڑھی اور جسموں پر لانبی عبا کے باوصف "مسٹر محمد علی" اور "مسٹر شوکت علی" ہی تھے۔ کلنڈر ۱۹۱۹ء کا آخری ورق الٹا اور ۱۹۲۰ء شروع ہی ہوا تھا کہ یہ دونوں بھائی اپنے مرشد کے پاس فرنگی محل آکر رخصت ہوئے تو ہندوستان کے طول عرض میں "مولانا محمد علی" اور "مولانا شوکت علی" کے نام سے ہر طبقہ اور ہر حلقہ میں یاد کیے جارہے تھے۔ اعزازی سندیں اس اعزاز کی سند کے طور پر ان کے پاس تھیں۔ دیکھا دیکھی ہر ترک موالاتی مسلمان کو "مولانا" کہا جانے لگا۔ ۱۹۲۰ء کے صدر انڈین نیشنل کانگریس پنڈت موتی لال نہرو کو بالآخر گھبرا کر اس سلسلے میں مولانا

۱۔ محمد علی ـــــ ذاتی ڈائری از مولانا عبدالماجد دریا بادی

عبدالباری سے ایک بھی خط کے ذریعہ رجوع کرنا پڑا کہ ہندی کے "شری" یا "شریمان" کی طرح اردو میں کوئی بھی ایسا ہی عام تعظیمی لفظ ہے؟ ہر مسلمان کے لیے مولانا کا استعمال کچھ نامناسب معلوم ہوتا ہے۔[1]

جس مرشد کے مولانا محمد علی مرید ہوئے اور جس مدرسہ سے "مولانا" کی سند پائی اس مرشد سے ان کی وفات سے صرف سوا تین گھنٹے قبل ۱۹ جنوری ۱۹۲۶ء کو قبل عشاء اپنے خاندان کے چند ہم سنوں کے ساتھ، جو سب کے سب دس سال سے کم عمر کے تھے، مجھے بھی مرید ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اور مدرسہ سے جب "مولانا" کی سند، جو فرنگی محل کے مدرسہ کی آخری سند تھی، ملی تو بانی مدرسہ کی وفات کو پورے دس سال، اور پیر بھائی اور ہم سند مولانا محمد علی کی وفات کو پورے پانچ سال گزر چکے تھے۔ اگرچہ ہم دونوں کی عمروں میں ساڑھے چار دہائیوں کا اور مرتبے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پھر بھی ؎

من و تو ہر دو خواجہ تاشانیم
بندۂ بارگاہِ سلطانیم

مزید خوش قسمتی یہ کہ سات آٹھ سال کی مدت تک بالکل پڑوس میں مولانا محمد علی کو بارہا قیام پذیر پایا۔ اپنے دیوان خانے میں، اپنے بزرگوں کے ساتھ چائے پیتے سرگرم گفتگو دیکھا اور سنا۔ لکھنؤ کے بعض جلسہائے خلافت میں رفاہ عام میں ان کو تقریر کرتے اور آنسو بہاتے اور پونچھتے قریب سے دیکھا۔ اور ایک دفعہ موٹر میں ادھر ادھر اپنے شہر کا چکر بھی ان کے ساتھ کاٹا۔ اور یہ سب سنِ شعور سے پہلے، دس سال سے کم عمر میں! دس سال کی عمر کے بعد شعبان ۱۳۴۹ھ (مطابق ۴ جنوری ۱۹۳۱ء) میں شب برات

۱۔ موتی لال نہرو کا اردو خط۔ بنام مولانا عبدالباری (کاغذات مولانا عبدالباری)

کے دن جب مولانا محمد علی کی وفات کی خبر بذریعہ تار، ان کے اور میرے مرشد کے جانشین مولانا قطب میاں (وفات ۱۹۵۴ء) کے پاس آئی تو یہی احساس ہوا کہ خاندان ہی کا کوئی بزرگ اٹھ گیا ہے۔ جب مرشد کے جانشین نے مولانا شوکت علی کو لندن تار دے کر مولانا محمد علی کو مرشد کے پہلو میں دفن کرنے کی پیش کش کی تو ایک نہج کا احساسِ فخر اپنے اندر پایا۔ پھر وہ تعزیتی جلسہ کبھی فراموش نہ ہوگا جو امین آباد پارک (گھنٹہ گھر والے پارک) میں بعد مغرب ہوا۔ سارا شہر سنسان تھا۔ نہ سڑکوں پر سواریاں، نہ تجارتی مرکزوں میں دکانیں۔ نہ خوانچہ والے، نہ شربت پانی والے۔ گھر سے جلسہ گاہ تک تقریباً دو، پونے دو میل، پیدل جانا اور پیدل آنا۔ اس سے پہلے اتنا پیدل چلنے کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی۔

ایک ممتاز شخصیت کے دوسری ممتاز شخصیت سے تعلقات کی متعین تاریخ اور ان کی نوعیت کا معاملہ تاریخی تحقیقات کے لیے عموماً پل صراط کی حیثیت رکھتا رہا ہے۔ یہی سوال یہاں مرید و مرشد کے سلسلہ میں بھی جواب طلب ہے۔ خوش قسمتی سے اس سلسلہ میں ایک مستند مطبوعہ تحریر[1] میرے استاد اور جدید مولانا مفتی عنایت اللہ فرنگی محلی (وفات ۱۹۴۱ء) کی موجود ہے۔ جس کا خلاصہ اپنے الفاظ میں یہ ہے:

> "مولانا عبد الباری نے اپنے شاگرد رشید اور رشتہ کے بھائی مفتی عنایت اللہ (راقم تحریر) سے جو فرنگی محل کے نوجوانوں کی ایک علمی انجمن "مجلس الاصلاح" کے سکریٹری تھے، فرمایا کہ مسٹر محمد علی کو لکھو کہ اگر ہند اور بیرون ہند کے ملی مسائل کے سلسلہ میں ہم لوگوں کی خدمات درکار ہوں تو ہم حاضر ہیں۔ جواب آیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور

۱۔ حسرۃ الآفاق بوفاۃ مجمع الاخلاق اردو مطبوعہ

مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی نے جلسوں میں شرکت کے لیے علی برادران دسمبر ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ آ رہے ہیں۔ اس وقت بالمشافہ گفتگو ہوگی۔ مسلم لیگ کونسل، فاؤنڈیشن کمیٹی اور انجمن ہلال احمر کے اجلاسوں میں شرکت کے لیے یہ دونوں دسمبر کے آخری ہفتہ میں لکھنؤ آئے اور ۳۱ دسمبر ۱۹۱۲ء کو پہلی بار شیخ مشیر حسین قدوائی کے ہمراہ فرنگی محل تشریف لائے اور اسی دن انجمن خدام کعبہ کی داغ بیل پڑی۔"

شیخ مشیر حسین قدوائی: سیاست ملی کا ایک فراموش کردہ انتھک مجاہد بلکہ قائد (وفات ۱۹۳۷ء) ترکوں کا عاشق، اسلام کی عالمگیر برادری کا پرجوش مبلغ اور نوجوان "موہن داس کرم چند گاندھی" کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے ۱۹۱۵ء میں لندن سے اپنے ایک خط کے ذریعہ متعارف کرانے والا، اودھ کا ایک تعلقہ دار بیرسٹرایٹ لا اور انجمن خدام کعبہ کا دو جنرل سکریٹریوں میں سے ایک۔ اودھ خلافت کانفرنس فیض آباد منعقدہ ۱۹۲۰ء میں شیخ صاحب کا مفصل خطبۂ صدارت نہ صرف مسائل خلافت اسلامیہ پر بھرپور روشنی ڈال رہا ہے بلکہ صاف دکھا رہا ہے کہ انگریز حکومت ترک سلطنت سے نہیں، بلکہ عیسائیت اسلام سے چن چن کے بدلے چکا رہی تھی۔

مولانا مفتی عنایت اللہ کے بیان کے مطابق انجمن خدام کعبہ کے اغراض و مقاصد اور دستور العمل کے تحریر کرنے میں کچھ وقت لگا۔ مولانا شوکت علی کا بیان ہے کہ ۶ مئی ۱۹۱۳ء کو انجمن خدام کعبہ کا باضابطہ قیام فرنگی محل میں عمل میں آیا۔ جس کے صدر یا خادم الخدام مولانا عبدالباری اور معتمدین خادم الخدام یا جنرل سکریٹری مولانا شوکت علی اور شیخ مشیر حسین قدوائی ہوئے۔ اس وقت انجمن کا فنڈ کل تیئیس روپے تھا۔ سو روپے مولانا عبدالباری سے قرض لیے گئے جو بعد میں انھیں ادا کر دئے گئے۔[1]

۱۔ مولانا شوکت علی: مطبوعہ تقریر۔

محمد علی ایڈیٹر کامریڈ بھی انجمن خدام کعبہ کی مرکزی کمیٹی کے ممبر بنے۔ انجمن کا مرکزی دفتر مولانا شوکت علی کے قیام کے خیال سے دہلی منتقل ہو گیا۔ ممبر دو قسم کے رکھے گئے "شیدائی" اور "فدائی"۔ مولانا شوکت علی کا بیان ہے کہ سال بھر میں انجمن کے ممبروں کی تعداد بیس ہزار ہو گئی۔ جن میں نواب وقار الملک سکریٹری ایم۔ اے۔ او کالج۔ علی گڑھ ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا شبلی نعمانی کے نام بھی ملتے ہیں۔ مرکزی دفتر سے "ڈیلی رپورٹ" خادم الخدام کے پاس لکھنؤ بھیجی جاتی اور خادم الخدام بھی بار بار دہلی کا دورہ کرتے تھے۔[1]

مئی ۱۹۱۳ء میں انجمن خدام کعبہ قائم ہوئی۔ اگست ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مچھلی بازار کی مسجد کی شہادت کا سانحہ پیش آیا۔ اس سانحہ پر احتجاج کرنے والے کانپور کے مسلمانوں کو فوج کی گولیوں سے بھون دیا گیا۔ اور اشتعال انگیزی کے الزام میں بڑی تعداد میں گرفتاریاں کی گئیں۔ مولانا عبدالباری لکھنؤ کے احتجاجی جلسہ میں سیاسی پلیٹ فارم پر پہلی بار آئے اور ایک پرجوش تقریر کی۔[2] اس مسجد کے قضیہ کو لے کر محمد علی اور وزیر حسن وفد کی شکل میں لندن گئے۔ وائس رائے لارڈ ہارڈنگ، شملہ کی بلندیوں سے اتر کر کانپور آئے اور دروازۂ مسجد پر مولانا عبدالباری کے تجویز کردہ شرعی حل پر مہاراجہ محمود آباد سر محمد علی محمد، وزیر علی امام ممبران وائسرائے کونسل کی موجودگی میں مولانا سے تبادلۂ خیال کیا اور تجویز کردہ حل کو قبول اور اس پر عملدرآمد کا وعدہ کیا۔

انجمن خدام کعبہ سرگرم عمل تھی کہ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کی گھنگھور گھٹا اٹھی اور برسنا شروع ہو گئی۔ ترک انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے پر مجبور ہوئے۔ مولانا عبدالباری نے بحیثیت خادم الخدام، خلیفۃ المسلمین سے بذریعہ تار درخواست کی کہ

۱۔ کاغذات عبدالباری

۲۔ حسرۃ الآفاق بوفاۃ مجمع الاخلاق۔ ار۔ و مطبوعہ

آپ جنگ میں غیر جانب رہیں یا کم از کم انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ نہ لیں۔ اس میں ناکامی کے بعد بحیثیت خادم خدام مولانا عبدالباری نے کمشنر لکھنؤ پر دباؤ ڈالا کہ حکومت برطانیہ اعلان کرے کہ حرمین شریفین اور مقامات مقدسہ کو دائرہ جنگ سے باہر رکھا جائے گا۔ بہ صرف کمشنر نے کیا۔ وائسرائے اور وزیر اعظم برطانیہ نے بھی یہ ضمانت دی اور باقاعدہ پارلیمنٹ میں اس ضمانت کا اعلان کیا گیا۔

برق رفتاری سے بدلتے ہوئے جنگی حالات نے مسلمانان ہند میں جو ہیجان اور بے چینی پیدا کی اور بڑھائی اس کا مداوا ایسی لفظی ضمانتیں نہ بن سکیں۔ مولانا عبدالباری برابر آگاہی دیتے رہے کہ اگر ضمانت کی خلاف ورزی ہوئی تو ہندوستان کی مسلم رعایا کی وفاداری خطرے میں پڑ جائے گی۔ مولانا محمد علی ایڈیٹر کامریڈ مولانا عبدالباری کی اس جسارت حق گوئی کو سنت رسول اور اکابر امت کا اسوہ قرار دیتے اور مولانا عبدالباری کو اس راہ پر، جس پر نشانِ قدم مٹ چکے تھے، گامزن ہونے پر مبارکباد دیتے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن ہندوستان سے باہر جا چکے تھے۔ علمائے ہند میں مولانا عبدالباری ہی تھے جو مسند درس اور سجادۂ ارشاد کی ذمہ داریوں سے صرف نظر کرکے اس جہاد میں سپہ سالار کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

محمد علی اور شوکت علی ۱۹۱۵ء میں نظربند ہوگئے۔ پہلے دہلی کے قریب مہرولی میں، پھر لینسڈاؤن میں، پھر چھندواڑہ میں اور آخر میں بیتول جیل میں۔ مولانا عبدالباری کا ایک کام یہ بھی بڑھ گیا کہ وہ ہر ماہ ان نظربندوں سے ملنے کے لیے جائیں۔ اسی ایک سفر میں علی برادران نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

آخر دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر خلافت کانفرنس نے مسئلہ خلافت اسلامیہ کی اہمیت برطانوی مدبرین کو بتانے کے لیے لندن ایک وفد بھیجنا تجویز کیا جس کے ارکان میں مولانا عبدالباری کا نام بھی تھا۔ جن کا مسئلہ کی شرعی حیثیت کی تشریح کرنے کے لیے جانا ضروری قرار دیا گیا۔ مولانا نے اپنے قائم مقام کی حیثیت سے علامہ سید سلیمان ندوی کو وفد کے لیے نامزد کر دیا۔

اور اس قائم مقام نے قائم مقام وزیر ہند مسٹر فشر سے لندن میں جب بات کی تو خلافت اسلامیہ اور مقامات مقدسہ کی مذہبی حیثیت بتاتے ہوئے کہا :

"نہ میں پولٹیکل آدمی ہوں، اور نہ وہ جن کا میں قائم ہوں وہ پولیٹکل ہیں۔
ہم لوگ خالص علمی اور مذہبی خدمت کرنے والے ہیں[1]۔"

وفد لندن سے ناکام ہی واپس آیا۔ محمد علی بھی واپس آ گئے۔ ان کے مرشد کی رہنمائی میں اس بیچ، عدم تشدد کا اصول مسلمانوں نے بطور حربۂ جنگ مان لیا تھا۔ اور گاندھی جی کو تحریک خلافت کا مسلمہ قاید بھی۔ محمد علی آئے اور تحریک خلافت کے قاید کے ہمنوا ہوکر سرگرم عمل بھی ہو گئے۔ ۱۹۲۰ء ختم۔ ۱۹۲۱ء شروع ہوا۔ محمد علی اپنے بھائی شوکت علی اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ مقدمۂ کراچی کے نتیجے میں دو سال کے لیے اسیر فرنگ ہو گئے۔ مقدمہ کے دوران اپنے بیان وغیرہ سے قبل عدالت سے انھوں نے درخواست کی کہ چوں کہ وہ اپنے مذہب کے احکام کی تعمیل میں سرکار کے مجرم قرار پائے ہیں، اس لیے اپنے دفاع میں ان کو بہت سے مذہبی مسائل سے کام لینا پڑے گا۔ لہٰذا اس میں مدد کے لیے مولانا عبد الباری کو ان سے جیل میں ملنے کی سہولت ملنا چاہیے[2]۔

مولانا عبد الباری دوران کارروائی مقدمہ کئی بار کراچی گئے۔ اور ملزمان مقدمۂ کراچی سے ملاقات کی۔ پھر ملزمان کو سزا ہوئی قید تنہائی کی ـــــ محمد علی نے اس قیدِ تنہائی میں اسلام پر ایک کتاب انگریزی میں تحریر کرنا شروع کی۔ اس میں اپنے "روحانی مرشد" کا اپنے خود نوشت حالات کے ضمن میں حوالہ آیا ہے۔ ان کے الفاظ میں :

"مولانا عبد الباری صاحب سے مل کر جو علمائے فرنگی محل لکھنؤ کے اس مشہور

۱۔ "برید فرنگ" لندن سے علامہ سید سلیمان ندوی کے خطوط کا مطبوعہ مجموعہ

۲۔ روئیداد مقدمۂ کراچی

معروف خاندان کے سربراہ تھے جس نے گزشتہ چار صدیوں میں ہندوستان کو مسلسل بغیر کسی انقطاع کے بیک وقت عابد، زاہد، صوفیا اور متبحر علما عطا کیے۔ ۱۹۱۳ء کے موسم گرما میں میرے بھائی شوکت صاحب نے انجمن خدام کعبہ کی بنیاد رکھی!

۱۹۲۳ء میں قید تنہائی سے چھوٹے۔ کانگریس کے صدر ہوئے۔ ہندو مسلم فسادات نے جو اُن کے زمانۂ اسیری میں ہندوستان بھر میں پھوٹ پڑے تھے، بحیثیت مسلمان صدر کانگریس کے پیٹے۔ ان کے مرشد ان ہی ناخوشگوار حالات سے کبیدہ خاطر ہوکر سرگرم سیاست سے اس لیے پیچھے ہٹنے لگے کہ ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ مسلمانوں کی طرف سے ان ہی نے لگایا تھا۔ ان ہی نے "قربانی گاؤ" کے ترک کا اولیں اعلان کیا تھا۔ اور انھوں نے ہی باوجود اس یقین کے کہ حق کی حمایت میں تلوار اٹھانا اسلام کا حکم ہے، عدم تشدد کا اصول بطور حربۂ جنگ کے بحیثیت عالم دین کے مانا اور مسلم رہنماؤں سے منوایا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جس خلافتِ اسلامیہ کی حفاظت کے لیے وہ سر بکف میدان میں اترے تھے۔ اسے خود ترکوں نے ۱۹۲۴ء میں ختم کر دیا۔ اور ایک وجہ اور تھی اور وہ مسئلہ حجاز، جو ۱۹۲۴ء ہی میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مولانا عبدالباری حجاز کے حکمراں شریف حسین کے مؤید تھے۔ محمد علی[1] تابعی حکمران ابن سعود کے عقاید سے مکمل اختلاف کے باوجود سیاسی اور ملی نقطۂ نظر سے ان کے حامی تھے۔ یہ مسلمانانِ ہند کا اپنا مسئلہ تھا۔ مرید و مرشد دو مختلف کیمپوں میں ہو گئے۔ اس اختلاف رائے میں کوئی حرج نہ تھا۔ اگر وہ طوفانِ بدتمیزی نہ ہوتا جو دونوں کیمپوں میں ۱۹۲۵ء میں پوری طرح سرایت کر گیا تھا۔

متواتر اور مسلسل بدقسمتی یہ ہے کہ ممتاز شخصیتوں کے اختلاف رائے کو وہ لوگ

---

[1] محمد علی کی نامکمل آپ بیتی

شخصی مخالفت بنا دینے میں تن، من، دھن سے لگ جاتے ہیں جو خود چھوٹے ہوتے ہیں۔ مگر بڑوں کے کندھوں پر کھڑے ہو کر بڑا اور زندۂ جاوید بننے کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔ دونوں کیمپوں میں ایسے لوگ خاصی تعداد میں تھے جو اپنے اپنے سربراہ کو انتقامی کارروائیوں پر اکساتے رہتے تھے۔ محمد علی کا اخبار روزنامہ "ہمدرد" دلی سے نکلتا اور مخالف کیمپ پر تابڑ توڑ حملے کرتا۔ سمجھا یہی جاتا کہ محمد علی حملہ آور ہیں۔ محمد علی کی تقریروں کے ایسے اقتباسات مولانا عبدالباری تک پہنچائے جاتے جو اصولی اختلاف کے بجائے ذاتی مخاصمت کے آئینہ دار ہوتے۔ دونوں طرف کے ان "چھوٹوں" کے ناموں سے واقفیت اس وقت کوئی دشوار معاملہ نہیں ہے۔ لیکن ابھی وہ نسل موجود ہے جو چاہے ان بدتمیزیوں میں بذاتِ خود شریک نہ ہو۔ مگر جذباتی رجحان اس کا ادھر یا ادھر تھا بہر حال اب بھی اس لیے ان ناموں کو پوشیدہ رہنے دیجئے اور یہ دیکھئے کہ مولانا محمد علی اور مولانا عبدالباری کا غلط فہمیوں کی اس یلغار میں اپنا اپنا طرز عمل کیا رہا۔

جہاں تک "ہمدرد" کے معاندانہ مضامین کا تعلق ہے تو اسی ۱۹۲۵ء کے وسط میں جو بے اعتدالیوں کے شباب کا سال ہے، مولانا محمد علی اپنے ایک طویل خط میں مولانا عبدالباری کو برسبیل تذکرہ لکھتے ہیں:

> "(ہمدرد میں) ـــــ خود میرے مضامین مہینوں کے بعد بھی نظر نہ آتے تھے۔ گو بہت سے مضامین میرے ایما سے لکھے جاتے تھے۔ جن خیالات کا اظہار ہمدرد میں ہوتا تھا، وہ اکثر میرے خیالات کے خلاف نہ ہوتے تھے۔ لیکن وہ خود میرے خیالات نہ ہوتے تھے۔"[1]

"اپنے خیالات کے خلاف نہ ہوتے تھے" اور "خود میرے خیالات نہ ہوتے تھے"۔ بظاہر

۱۔ مکتوبات رئیس الاحرار (سیاسی) مورخہ ۲۵ مئی ۱۹۲۵ء

کچھ بہت زیادہ فرق نہیں رکھتے۔ مگر جب خیالات کے ساتھ ذاتی مخاصمت کا عنصر بھی شامل ہو تو وہ لکھنے والے ہی کا کارنامہ ہوگا، اس کا نہیں جس کے ایما سے یہ تحریر لکھی گئی ہو

ہمدرد کے لیے کتابت ہو جانے والے بہت سے ایسے ہی مضامین اگر محمد علی دیکھ پاتے تو ان پر انھوں نے سیاہی پھر وادی اور لکھنے والے منہ تکتے رہ گئے۔ البتہ جو ان کے دیکھے بغیر چھپ گئے ان کے بارے میں افسوس کرنے کے علاوہ وہ بھی کیا کر سکتے تھے۔

مولانا محمد علی کے تحریری پہلو کا جائزہ لیتے وقت اس صورت حال پر گہری نظر رکھنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اداریہ تک لکھنے کا وقت محمد علی نہیں نکال پاتے تھے۔ اس لیے کہ :

پورے ہفتہ کی غلامی ایک "کامریڈ" ہی کرا لیتا ہے۔ پھر "ہمدرد" کے لیے وقت کہاں سے نکالوں؟ چونکہ اس کے لیے برا بھلا دوسرے بھی لکھ سکتے ہیں اس لیے ان پر چھوڑ دیتا ہوں اور خود کامریڈ کے لیے جس کے لیے ایک لکھنے والا بھی نہیں ملا، وقف ہو جاتا ہوں۔[۱]

اس خط مورخہ ۲۵ر مئی ۱۹۲۵ء میں مولانا محمد علی فرنگی محل کے ایک اور خلافتی لیڈر مولانا سلامت اللہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"مولوی سلامت اللہ صاحب نے یا تو اس قدر شور اشوری سے مضمون (متعلقہ قتل مرتد) لکھنے کے لیے غیر ضروری اجازت حاصل کرنا چاہی یا جب میں نے اس کا انتظار کرنا شروع کیا تو بے نمکی کا ثبوت دیا۔"

یہ مولوی سلامت اللہ (وفات ۱۹۳۲ء) جو لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل میں ۱۹۲۱ء میں پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، چودھری خلیق الزماں، بابو موہن لال سکسینہ وغیرہ کے رفیق جیل تھے

۱۔ مکتوبات رئیس الاحرار (سیاسی) مورخہ ۲۵ر مئی ۱۹۲۵ء

میرے دادا کے حقیقی بھائی، مولانا عبدالباری کے شاگرد، مرید، خلیفہ اور ملکی و ملی سرگرمیوں میں ان کے دست راست اور مولانا محمد علی کے پیر بھائی تھے۔ مولانا محمد علی سے عمر میں چھوٹے تھے اس لیے اس بے تکلفی سے ان کا ذکر کرنے میں مولانا محمد علی نے کوئی قباحت محسوس نہیں کی۔

ان ہی مولانا سلامت اللہ کی جیبی سائز کی ڈائریاں میرے بچپن میں ایک درجن کے قریب تھیں۔ ان کے فالج میں مبتلا ہونے کے زمانے تک یعنی مارچ ۱۹۲۹ء تک سنہ ۱۹۳۲ء میں ان کی وفات کے بعد یہ ہمارے خاندان کے کتب خانے میں داخل کر دی گئیں۔ جب مجھے ادھر توجہ ہوئی تو صرف تین سال کی ڈائریاں موجود پائیں۔ بے حد مختصر الفاظ میں وہ دن بھر کی نجی، سیاسی اور خاندانی یادیں ہر تاریخ کے تحت لکھ لیا کرتے تھے۔ خوش قسمتی سے سنہ ۱۹۲۵ء کی ڈائری موجود ہے۔ وہی سال جو پیر و مرید کی آویزش کا سنگین سال بتایا جاتا ہے۔ اس سال کے آخری مہینوں میں ابن سعود کی حمایتوں کے ۷ر اکتوبر اور ۸ر نومبر کو لکھنؤ میں ہونے والے وہ دو جلسے ابن سعود کے مخالفوں نے ناکام بنا دیے تھے۔ جن میں مولانا محمد علی خاص طور پر تقریر کرنے لکھنؤ آئے تھے۔ ان جلسوں کی مزاحمت کرنے والے مولانا عبدالباری کے ماننے والے سمجھے جاتے تھے۔ اور مولانا عبدالباری کو پس پردہ شریک کار قرار دیا جا رہا تھا۔

یہ اسی ڈائری کے اس زمانے کے وہ اقتباسات ہیں جن سے اپنے مرشد کے بارے میں مولانا محمد علی کے حقیقی رویہ پر روشنی پڑتی ہے اور ابن سعود مخالف کیمپ کے ذہنی رویہ پر بھی۔ ملحوظ رہے کہ ۸ر نومبر کے جلسے کے پورے ڈھائی مہینے کے بعد مولانا عبدالباری کا انتقال ہو گیا۔

پس منظر یہ ہے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ۱۸ر ۱۹ر اکتوبر کو سیتاپور میں ہونے والا تھا۔ جس میں شرکت کے لیے گاندھی جی، علی برادران اور دیگر سیاسی رہنما

سیتاپور جانے کے لیے لکھنؤ پہنچ رہے ہیں۔ مولانا محمد علی بھی عازم سیتاپور ہیں۔ ان کے پہنچنے سے قبل ابن سعود مخالف کیمپ کی قائم کردہ انجمن خدام الحرمین کا ایک وفد سیتاپور جاکر علی برادران کے وہابی عقائد بیان کر کے مسلمانان سیتاپور کو ان کے استقبال سے باز رہنے کی تلقین کر چکا تھا۔ اب سنیے ڈائری کے اقتباسات :

۱۹ اکتوبر ۱۹۲۵ء : چار بجے سہ پہر کو ..... صاحب سیتاپور سے واپس آئے۔ معلوم ہوا کہ علی برادران کے استقبال کا بائیکاٹ ہو گیا۔ جس کی وجہ سے مولانا محمد علی کو سخت اشتعال ہو گیا۔ گزشتہ شب کے جامع مسجد والے جلسے اور نیز برسوں بھی جناب مولوی صاحب (مولانا عبد الباری فرنگی محلی) و مولانا حسرت موہانی و مولوی سلیمان صاحب (پھلواروی) اور مجھ کو (ڈائری نویس، مولانا سلامت اللہ) سیکڑوں گالیاں دیں اور مضحکہ اڑایا جس سے تمام مسلمانوں کو رنج پہنچا۔ مولوی عبد الماجد بدایونی و ڈاکٹر کچلو کو بھی بہت برا کہا گیا۔ افسوس۔ .....

۲۰ اکتوبر: مولانا محمد علی مع بیگم صاحبہ گزشتہ شب کو آگئے اور خلیق الزماں کے یہاں مقیم ہیں۔ نوٹس شائع ہوا ہے کہ آج چار بجے سہ پہر کو رفاہ عام میں مولانا محمد علی اور توفیق رفیق شامی نجد و حجاز پر کچھ دیں گے۔ . . . مولانا حسرت موہانی و سردار احمد بھی کانپور سے آگئے اور مولانا محمد علی کی ملاقات کو گئے۔ گیارہ بجے دن کو مولانا محمد علی و مولوی عبد الماجد دریابادی مع حسرت موہانی کے فرنگی محل آئے۔ میں ان کو مولوی صاحب (مولانا عبد الباری) کے مکان میں لے گیا۔ (مولانا عبد الباری ان دنوں حیدر آباد دکن گئے ہوئے تھے) اور ان کی بیگم صاحبہ زنانے مکان میں مغرب کے وقت تک مقیم رہیں۔ مولانا محمد علی و حسرت موہانی اور میں نے ساتھ کھانا کھایا و چائے نوشی ہوئی۔ آپس کے شکایات ہوئے۔ مولانا محمد علی نے سیتاپور وغیرہ میں مولوی صاحب (مولانا عبد الباری) کو برا کہنے کے واقعات سے شرعی قسم کھا کر انکار کیا۔ اور "ہمدرد" کے مضامین کو اپنے قلم سے لکھے ہونے سے انکا

کیا - البتہ ذمہ داری لیتے ہیں - بعض (مضامین) کو انھوں نے اب تک نہیں دیکھا ہے۔ قبہ جات کے متعلق مولوی صاحب (مولانا عبدالباری) کے قول کے پیرو ہیں ۔ خود اپنی ماں اور صاحبزادی کا مزار سنگ سرخ سے بنوائے ہیں - اور ابن سعود کے تسلط کے خلاف ہیں - مولوی ..... کو بہت برا کہتے ہیں - مولوی صاحب (مولانا عبدالباری) کے ساتھ محبت بدستور قائم ہے ...... ڈیڑھ بجے دن کو واپس گئے - پانچ بجے شام کو رفاہ عام میں جلسہ شروع ہوا - خلیق (خلیق الزماں) کی صدارتی تقریر، توفیق شامی کی تقریر جو ابن سعود کی مدح سرائی میں تھی، صبر وسکون سے سنی گئی - سات بجے شام کو توفیق شامی کی تقریر ختم ہونے پر زور وشور سے مطالبہ ہوا کہ جواب میں حسرت موہانی کی تقریر ہو - خلیق صدر نے سخت الفاظ میں روکا اور مولانا محمد علی کو تقریر کے لیے کھڑا کر دیا - حاضرین نے ان کی تقریر سننے سے انکار کیا اور جلسہ درہم برہم کر دیا - محمد علی صاحب لکھنؤ والوں کو گالیاں دیتے ہوئے واپس گئے اور رات کو دہلی گئے -

۲۳ر اکتوبر : آج "ہمدرد" میں مولانا محمد علی کا بیان گزشتہ جلسہ لکھنؤ کے متعلق شائع ہوا ہے - ٹھاکر نواب علی خاں (اودھ کے ایک شیعہ تعلقہ دار) پر زیادہ الزام دیا ہے جو ایک حد تک صحیح ہے ....

۶ر نومبر : جناب مولوی صاحب (مولانا عبدالباری) بمبئی سے آج دس بجے دن کو لکھنؤ پہنچے .... بمبئی میں مولانا شوکت علی سے ملاقات کا حال بیان کیا اور ۸ر نومبر کے جلسہ کے لیے (جو ابن سعود کی حمایت میں ہونے والا ہے اور جس میں مولانا محمد علی تقریر کرنے والے ہیں) خلیق الزماں سے مل کر معاملات طے کرا دینے کو فرمایا کہ دونوں فریق تقریر کر سکیں ..... بعد عصر جناب مولوی صاحب (مولانا عبدالباری) خلیق الزماں کے یہاں گئے اور مسلمانوں کے درمیان فتنہ کو روکنے کی کوشش کی - طے پایا کہ پرسوں کے

جلسہ میں صدر غیر جانب دار ہو اور دونوں فریق کو تقریر کا موقع دیا جائے۔

۷ رنومبر: معلوم ہوا کہ شرائط صدارت کا مسئلہ حسب دل خواہ سب کو منظور ہے مگر ....
(ایک مقامی خلافتی لیڈر) نہیں مانتے ...... سات بجے شام کو خدام الحرمین کے مشورے کا جلسہ ہوا ...... بالاتفاق کل کے جلسہ کی مزاحمت طے ہوئی اور ہر قسم کے خطرے کا مقابلہ کیا جانا تجویز ہوا اور انتظامات شروع کیے گئے۔

۸ رنومبر: (اس تاریخ کے تحت جو کچھ تحریر ہے وہ سب نقل کیا جارہا ہے۔ اس جلسے کے ناکام ہونے کا ذکر ابن سعود کے حمایتوں کی مطبوعہ تحریروں میں آچکا ہے۔ مخالف کیمپ کا یہ وہ بے کم وکاست بیان ہے جو اشاعت کے لیے نہیں تحریر ہوا تھا۔ اس لیے برہنہ صداقت کا حامل ہے۔ انشاپردازی سے عاری اس سچائی کا اظہار حقیقی تاریخ کا فطری تقاضا ہے)

—— تمام کبڑیوں کو جلسہ میں حاضری پر آمادہ کر لیا۔ موہان کسمنڈی، گھیلا دملیح آباد و قرب وجوار کے مواضعات کے لوگ اور شہر میں مفتی گنج، مدح گنج، مصاحب گنج، کھدرا، بانس منڈی، مقبرہ گولہ گنج وغیرہ کے مسلمان بلائے گئے اور دو بجے دن تک سب مسلح ہو کر یتیم خانہ (جلسہ گاہ) میں پہنچ گئے۔ گیارہ بجے دن کو مولانا شوکت علی و مولانا محمد علی، جناب مولوی صاحب (مولانا عبد الباری) سے ملاقات کو آئے مگر مولوی صاحب نے ملاقات سے انکار کر دیا، بوجہ اس کے کہ گذشتہ آمد (۲۰ راکتوبر) کے موقع پر محمد علی صاحب نے قبہ شریف کے متعلق نا ملائم الفاظ استعمال کیے تھے۔ (یہاں میں اپنی سماعت سے یہ تشریح کرنا چاہتا ہوں کہ گذشتہ آمد کے موقع پر بھی جب مولانا عبد الباری لکھنؤ میں موجود نہیں تھے۔ مولانا محمد علی مولانا عبد الباری کے یہاں آئے تھے، جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے مولانا حسرت موہانی سے گفتگو کے دوران مولانا محمد علی نے قبہ شریف یعنی گنبدِ خضرا کے بارے میں یہ الفاظ بڑے پرجوش انداز میں کہے تھے۔ "اگر شریعت سے

ثابت ہو جائے کہ قبہ بنانا ناجائز ہے تو حضورؒ کے مزار پر سے اس غلاظت کو میں خود اپنے ہاتھوں سے دور کروں گا۔" ظاہر ہے ان الفاظ سے ایک شرعی حکم کی تعمیل پر آمادگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ مگر الفاظ کی درشتی صوفیا کے حلقوں میں بہت زیادہ ناگواری کا سبب بن گئی۔

دونوں بھائی باہر والے مکان میں ٹھہرے رہے۔ آخر میں قطب میاں (مولانا عبد الباری کے بھتیجے و داماد اور بعد کو جانشین) و ممتاز میاں صاحب (سلسلۂ قادریہ رزاقیہ کے ایک پیرزادے) کی سفارش سے اور محمد علی صاحب کے اظہار ندامت پر ڈیڑھ بجے ان کو محل سرا میں اجازت آنے کی مل گئی۔ معلوم ہوا کہ معافی ہو گئی لیکن حالات حاضرہ کے متعلق کچھ نہیں طے ہوا۔ سوا دو بجے علی برادران واپس گئے ... .

میں و .. .... و........ و قطب میاں و حسرت موہانی و مشیر حسین صاحب وغیرہ سب (جلسہ گاہ) پہنچ گئے۔ مگر یتیم خانہ کے دروازہ میں اندر سے قفل پڑے ہوئے تھے اور اندر ظفر الملک، محمد علی (لکھنؤ والے) ملک رفیع (بارہ بنکی) عبد العلی بھیاروی (ضلع بارہ بنکی) عبد الماجد دریابادی، احمد حسین قدوائی (مشہور ٹینس کھلاڑی) تکمیل خاں ملیح آبادی اور دیگر ان کے ہم خیال قریب تیس چالیس آدمیوں کے موجود تھے۔ کچھ لوگ چھت پر تھے۔ اور چار بوجھ لاٹھیاں اندر کوٹھوں میں رکھے جاتے ہوئے میں نے و .... .. وغیرہ نے دیکھا۔ تین بجے جلسے کا وقت تھا۔ باہر دو ہزار مسلح و غیر مسلح آدمی کھڑے رہے۔ پانچ بجے شام کو علی برادران آئے۔ دروازے کھلے مگر بخوف بدامنی و عدم ضمانت ظفر الملک نے جلسہ ملتوی کر دیا اور خدام الحرمین کی فتح کا اعلان ہماری طرف سے کیا گیا۔ راجہ صاحب سلیم پور (راجہ سید احمد علی علوی) کے یہاں ہوتے ہوئے ساڑھے سات بجے رات کو مکان پہنچے۔ ساڑھے چھ بجے شام کو مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا۔ محمد علی صاحب کی تحریک متعلق صدارت و مقام و وقت جلسہ

غلبہ رائے سے مسترد ہوگئی اور علی گڑھ میں سالانہ جلسہ ہوگا۔ راجہ صاحب محمود آباد (مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں آف محمود آباد) (اودھ) کو علی برادران لانا چاہتے تھے۔ یہ دوسری شکست ہوئی۔

۶ نومبر: صبح کو ممتاز میاں صاحب کے یہاں حاضر ہوا........ مولوی صاحب (مولانا عبدالباری) و حسرتا میاں موہانی تشریف لائے۔ دوران گفتگو میں، میں نے صاف عرض کر دیا کہ مولانا محمد علی کے خلاف یہاں سے سخت پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ سیتاپور کے واقعہ کی تصدیق نہیں ہے۔ آپ فوراً باور نہ کر لیا کیجئے۔ مولوی صاحب کو تعجب ہوا۔ آٹھ بجے مکان آیا۔ معلوم ہوا کہ ٹھاکر نواب علی خاں و مولوی عنایت اللہ خیالی گنج (چودھری خلیق الزماں کی قیام گاہ جہاں علی برادران اس دفعہ قیام پذیر تھے۔) مولانا محمد علی صاحب کے پاس اپنی طرف سے جلسہ کر کے مدعو کرنے گئے ہیں۔ چنانچہ دس بجے یہ لوگ واپس آئے۔ مولانا محمد علی صاحب نے تقریر کرنا منظور کر لیا ہے مگر ان کی پارٹی والے سخت برہم ہیں۔ چنانچہ یہاں سے باضابطہ دعوت نامہ ان کو بھیجا گیا۔ گو مولانا سلیمان صاحب پھلواروی اور بشیر حسین صاحب مخالف تھے اور وکٹوریہ پارک (چوک) میں اجازت لے کر جلسہ کا انتظام دو بجے کے لیے کیا گیا اور مولانا حسرت موہانی کاکوری سے (لکھنؤ سے پندرہ کلومیٹر پر واقع قصبہ جہاں ان تاریخوں میں سالانہ عرس ہو رہا تھا جس میں شرکت کے لیے مولانا حسرت موہانی گئے ہوئے تھے۔) بلوایا گیا۔ مگر افسوس ہے ساڑھے بارہ بجے محمد علی کا جواب آیا کہ خدام الحرمین اگر جلسہ کرے تو میں تقریر کروں گا۔ یہاں سے مجبوری ظاہر کی گئی۔ چنانچہ تین بجے سہ پہر تک انتظار کر کے ہمارے یہاں جلسہ شروع کیا گیا۔ اور مولوی عنایت اللہ صاحب نے تقریر کی۔ اور فریقین کی خط و کتابت جلسہ کو سنا کر ساڑھے چار بجے ختم کر دیا گیا........ اندازہ ہے کہ خلیق (چودھری خلیق الزماں)، ظفر الملک، عارف ہنسوی (اسسٹنٹ ایڈیٹر

روزنامہ ہمدرد دہلی) وغیرہ کا اثر مولانا محمد علی پر پڑ گیا ... عصر کے بعد سے بارش شروع ہوگئی۔ مولانا شوکت علی کے نام سے چھ بجے شام کو جمعیۃ خلافہ کے جلسۂ عام کا اشتہار شائع ہوا۔ لاٹھی وغیرہ کی مخالفت تھی۔ امین الدولہ پارک کے بجائے محلسرا ممتاز حسین مرحوم میں (ممتاز دارالیتامیٰ سے متصل نجی رہائش واقع گونگے نواب، امین آباد) بوجہ بارش جلسہ کیا گیا۔ سات بجے بصدارت مولوی ظہور احمد (سابق جنرل سکریٹری، آل انڈیا مسلم لیگ) جلسہ شروع ہوا۔ مولوی صاحب (مولانا عبدالباری) خود تشریف لے جانے والے تھے مگر ..... (نام پڑھا نہیں گیا) صاحب و ممتاز میاں کے اصرار سے نہیں گئے۔ مولانا حسرت موہانی، ممتاز میاں، قطب میاں ..... شریک جلسہ ہوئے۔ علی برادران نے تقریر میں کوئی لفظ خلاف نہیں کہا۔ حسرت موہانی نے تائید کی۔ صرف ابن سعود کے متعلق اختلاف کر دیا۔ دس بجے رات کو سب واپس آئے۔

۱۰ر نومبر: صبح کو ٹھاکر نواب علی خاں صاحب دفتر (خدام الحرمین واقع گلی پارچہ متصل فرنگی محل) میں آئے اور مولوی صاحب (مولانا عبدالباری) بھی راجہ صاحب (غالباً راجہ صاحب سلیم پور) و مشیر صاحب (مشیر حسین قدوائی) کے یہاں سے ہوکر تشریف لائے اور گزشتہ شب کے جلسۂ خلافت کا حال سنا اور مولانا محمد علی اور شوکت علی کی تقریروں پر اطمینان ظاہر کیا ..... مغرب کے بعد سے نو بجے رات تک آج پھر ممتاز دارالیتامیٰ والے پارک میں جلسہ ہوا۔ مولانا شوکت علی جو صبح کو کانپور گئے تھے، شام کو واپس آکر جلسہ کے صدر تھے، مولوی عبدالحلیم نائب ناظم جمعیۃ علماء اور مولوی حبیب الرحمان لدھیانوی کی تقریریں ہوئیں۔ کوئی دل آزار بات نہیں کہی البتہ شہر خلافت کمیٹی جدید قائم کرنے کی کوشش میں ظفر الملک صاحب نے اچھے الفاظ نہیں استعمال کیے۔ خواجہ کرامت علی (اودھ خلافت کمیٹی قدیم

کے ایک عہدیدار اور مولانا عبدالباری کے مرید نے ٹوکا - مولانا شوکت علی صدر
نے اس جھگڑے کو مرکزی خلافت کمیٹی میں طے کرنے کو کہا .... نو بجے
رات کو منشی محمود علی (لکھنؤ کے مشہور بڑی والے) کے یہاں شوکت صاحب کی
دعوت تھی - مولوی صاحب (مولانا عبدالباریؒ) بھی شریک ہوئے - کوئی خلاف
بات نہیں پیش آئی ..... مولانا محمد علی صاحب سہ پہر کو دہلی روانہ
ہو گئے -

۱۲ر نومبر : مغرب کے وقت مولوی عبدالماجد دریا بادی اور ظفر الملک میرے یہاں
بغرض ملاقات مولوی صبغت اللہ سلمہٗ (ڈائری نویس کے حقیقی بھتیجے) آئے - آٹھ بجے رات
تک متفرق گفتگو آپس میں رہی - میں نے غلط فہمیوں کے رفع کرنے کی کوشش اور
مسلمانوں کو فتنہ سے محفوظ رکھنے کے متعلق عرض کیا مگر بحث ومباحثہ سے یہ ظاہر
ہوا بلکہ صاف طور سے دونوں نے کہدیا کہ ہم مولوی اور پیرزادوں کے اقتدار کو
توڑنا چاہتے ہیں - اصولی اختلاف واقع ہو گیا ہے - کوئی مفاہمت نہیں ہو سکتی
...... اخبار ہمدرد دہلی مولوی صبغت اللہ کے نام جاری تھا - اس کو آج سے
مولانا محمد علی صاحب نے بند کر دیا -

۱۴ر نومبر : گیارہ بجے دن کو ڈاکٹر کچلو صاحب و کنور عبدالوہاب صاحب منشی احترام علی
کاکوروی کے ہمراہ فرنگی محل تشریف لائے ..... موجودہ آپس کے نفاق پر گفتگو
کی - تجویز ہوا کہ حکیم اجمل خاں صاحب مسلم لیڈران کی گول میز کانفرنس جلد از جلد
لکھنؤ یا دہلی میں طلب فرما دیں - اور آپس میں مفاہمت کرا دیں - ساڑھے
بارہ بجے ڈاکٹر صاحب وغیرہ واپس گئے ....

یہ اس نجی ڈائری کے اقتباسات ہیں جو مشتہر کرنے کے خیال سے قطعی نہیں لکھی گئی
تھی - اسی لیے ان میں اپنی طرف کی غلط روی پر بھی نکتہ چینی ہے اور مولانا

محمد علی کے متعلق پھیلائی گئی غلط فہمیوں کی تردید کی ہے اور مرشد مولانا عبدالباری سے استدعا بھی کہ ہر ایک شخص کی بات کو فوراً باور نہ کرلیا کریں وغیرہ وغیرہ۔

۱۹۲۵ء کی ڈائری ختم۔ ۱۹۲۶ء کی مفقود۔ اسی سال کے پہلے مہینے کی ۱۹ تاریخ مولانا عبدالباری تین دن کی سخت علالت اور برابر غشی و بے ہوشی میں رہنے کے بعد سوا گیارہ بجے رات کو وفات پا گئے۔ مولانا محمد علی کو دوسرے دن ۲۰ جنوری کو سنگین علالت کی اطلاع لکھنؤ کے اخبارات سے ہوئی۔ دہلی سے فون کر کے مرشد کی خیریت پوچھی۔ سانحۂ ارتحال کی اطلاع دی گئی۔ اسی وقت دہلی سے روانہ ہو کر دوسرے دن یعنی ۲۱ جنوری کو لکھنؤ پہنچے۔ مرشد کے مزار پر حاضر ہو کر فرنگی محل آئے۔ فرنگی محل کے پھاٹک میں میں نے ان کو اس طرح داخل ہوتے دیکھا کہ سفید رومال سے آنسو پونچھتے تھے۔ اور ساتھیوں میں سے کسی سے ہم کلام نہ تھے۔ اس مکان میں جہاں مرشد کا سجادہ ہے اس طرح آئے کہ ڈیوڑھی میں رک کر آنسو پونچھے، عینک صاف کی۔ کوئی نو بجے صبح کا وقت ہوگا۔ اسی وقت مولانا عبدالباری کے وصیت نامے کی وہ دفعہ پڑھی گئی جس میں مخلصین سے خصوصاً اور عامہ مسلمین سے عموماً اپنی غلطیوں کی معافی چاہی گئی تھی۔ اور وہ دفعہ پڑھی گئی جس میں اپنے حقیقی بھتیجے اور داماد قطب میاں کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ یہ دفعات مولانا سلامت اللہ نے بلند مگر گلوگیر آواز سے سنائیں۔ مولانا محمد علی سجادہ کے بالکل مقابل نڈھال بیٹھے تھے۔ میں اپنے ہم سنوں کے ساتھ مجمع کی یورش سے بچا کر سجادے کے بائیں طرف بٹھا دیا گیا تھا۔ اس لیے کہ مرشد کے جانشین ان کی گدی پر بٹھائے جانے والے تھے اور مریدین کو نذریں پیش کر کے اپنی ارادت کا اظہار کرنا تھا۔ ہمیں بتا دیا گیا تھا کہ قطب میاں کو گدی پر

بٹھا کر سب سے پہلے مولانا سلامت اللہ نذر پیش کریں گے ۔ اس کے بعد اور لوگ اسی میں ہم لوگ بھی نذر پیش کریں گے۔ سب سے پہلے مولانا سلامت اللہ نے نذر پیش کی ۔ اس کے بعد مرید مولانا محمد علی نے اپنی طرف سے ایک اور دوسری نذر ۔ اپنے بھائی مولانا شوکت علی کی طرف سے ۔ سب لوگوں نے کھڑے ہوئے جھک کر نذر دی ۔ مولانا محمد علی سجادے سے قریب بھی تھے اور ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کھڑے نہیں ہو پائیں گے ۔ انھوں نے بیٹھے بیٹھے نیم دراز ہو کر نذر پیش کی ۔ اس کے بعد ان کے دوسرے پیر بھائیوں نے اور ان ہی میں اس کم سن پیر بھائی نے بھی نذر پیش کی ۔

پیر اور مرید کی باہمی آویزش کا ذکر، پیش نظر مضمون میں آچکا ہے اور بقول مولانا عبدالماجد دریا آبادی : "مرید اپنے مرشد کا محض مطیع ہی نہ تھا، دوست اور محب بھی تھا، عاشق و شیدائی بھی تھا، ممنونِ کرم بھی رہا کرتا تھا۔" ۱۹ر اور ۲۰ر جنوری ۱۹۲۶ء (منگل اور بدھ) کی درمیانی شب میں جب مولانا فرنگی محلی کا انتقال ہوا اور مولانا محمد علی کو اس حادثے کی اطلاع ملی تو فوراً ہی اپنی بیگم کے ساتھ دہلی سے روانہ ہوئے اور ۲۱ر جنوری کو صبح سویرے لکھنؤ پہنچے تو سیدھے قبرستان گئے اور مولانا دریا آبادی کے لفظوں میں: "مٹی کے ڈھیر سے لپٹ کر رونے لگے

بہ جنازہ گر نہ آئی ، بہ مزار خواہی آمد

دل ایک دن قبل ہی سے رو رہا تھا، اس وقت آنکھوں سے بھی چشمے ابل پڑے ، آہ! جو قلب سرتاپا درد تھا، یکسر سوز و گداز تھا، اجنبیوں اور بیگانوں کے لیے بھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتا تھا، اس وقت اپنے محبوب ترین دوست کی قبر پر کھڑا تھا، اپنے مرشد کے مزار پر حاضر تھا، جذبات میں جتنا بھی تلاطم ہوتا سب بجا تھا...."

(ذاتی ڈائری کے چند ورق ۔ حصہ اول صفحہ ۳۱۹)

Regd. No D-(S.E.)-108 Vol 77 No. 1-2 Jan. & Feb 1980
THE MONTHLY JAMIA, Jamia Nagar, New Delhi-110025

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبداللطیف اعظمی

خط وکتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

The Monthly Jamia

Jamia Nagar New Delhi-110025

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی • مطبوعہ: جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۶ • ٹائیٹل: فائن پریس دہلی ۶

شذرات

۲۱؍مارچ ۸۰ء کو دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ جشن کا سہ روزہ اجلاس شروع ہو رہا ہے۔ اس موقع پر ہم جامعہ ملیہ اسلامیہ کی طرف سے تمام علمائے دیوبند اور فضلائے دارالعلوم کو جو زندہ ہیں، مبارکباد دیتے ہیں اور وہ جو اس دنیا میں نہیں ہیں، ان کی یاد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مسجد جامع میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے جو بانیٔ دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے شاگرد رشید تھے، یہ کہہ کر رکھی تھی۔

"اے نونہالِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا۔

کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو میرے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتلائیں لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے۔"

شیخ الہندؒ کا درد وہی تھا جو مولانا محمد قاسم نانوتوی کا تھا، یعنی برطانوی سامراج کی مخالفت اور ہندوستان میں علوم اسلامی، ثقافت اسلامی اور شعائر اسلامی کی حفاظت،

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جب ٹھنڈی پڑی تو پتہ چلا کہ مسلمان بری طرح تباہ و برباد ہوئے ہیں جس پیمانے پر ان کا جانی و مالی نقصان ہوا اور جس شدت سے انگریزوں نے ان پر ظلم توڑے اور من حیث القوم جس طرح انھیں رسوا اور ذلیل کیا گیا، اس کے بعد کسی قوم میں جینے کے حوصلہ کا باقی رہ جانا ایک معجزہ سے کم نہیں، دارالعلوم دیوبند اسی زندہ معجزہ کی ایک زندہ علامت ہے۔ ۱۸۵۷ء کی تباہی و بربادی کے دس برس اسی علاقے میں جہاں بانیانِ دارالعلوم نے علمِ بغاوت بلند کیا تھا، ۱۸۶۷ء میں

جامعہ

جلد ۷۷ | بابت ماہ مارچ ۱۹۸۰ء | شمارہ ۳

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبداللطیف اعظمی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

The Monthly Jamia

Jamia Nagar, New Delhi-110025

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی • مطبوعہ: جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۶ • ٹائیٹل: فاتح پریس دہلی

شذرات

۲۱ مارچ ۱۹۸۰ء کو دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ جشن کا سہ روزہ اجلاس شروع ہوتا ہے۔ اس موقع پر ہم جامعہ ملیہ اسلامیہ کی طرف سے تمام علمائے دیوبند اور فضلائے دارالعلوم کو جو زندہ ہیں، مبارکباد دیتے ہیں اور وہ جو اس دنیا میں نہیں ہیں، ان کی یاد کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مسجد جامع میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے جو بانیِ دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے شاگرد رشید تھے، یہ کہہ کر رکھی تھی۔

"اے نونہالِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا۔

کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو میرے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتلائیں لیکن اہلِ نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے۔"

شیخ الہندؒ کا درد وہی تھا جو مولانا محمد قاسم نانوتوی کا تھا، یعنی برطانوی سامراج کی مخالفت اور ہندوستان میں علوم اسلامی، ثقافت اسلامی اور شعائر اسلامی کی حفاظت،

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جب ٹھنڈی پڑی تو پتہ چلا کہ مسلمان بُری طرح تباہ و برباد ہوئے ہیں جس پیمانے پر ان کا جانی و مالی نقصان ہوا اور جس شدت سے انگریزوں نے ان پر ظلم توڑے اور من حیث القوم جس طرح انھیں رسوا اور ذلیل کیا گیا، اس کے بعد کسی قوم میں جینے کے حوصلہ کا باقی رہ جانا ایک معجزہ سے کم نہیں، دارالعلوم دیوبند اسی زندہ معجزہ کی ایک زندہ علامت ہے۔ ۱۸۵۷ء کی تباہی و بربادی کے دس برس اُسی علاقے میں جہاں بانیانِ دارالعلوم نے علمِ بغاوت بلند کیا تھا، ۱۸۶۷ء میں

دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی جس کے پیچھے مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی اور مولانا رشید احمدؒ گنگوہی کے مجاہدانہ کارناموں اور ان کی فغانِ نیم شبی کی صورت میں اللہ کا ہاتھ تھا اور جسے حاجی امداد اللہؒ کی دعائیں حاصل تھیں کہ وہ مستجاب الدعوات تھے ۔ ان بزرگوں کے توسط سے اس عظیم مقصد کا سلسلہ جو دارالعلوم دیوبند کے قیام کا تھا ، مولانا مملوک علیؒ ۔ شاہ محمد اسحٰقؒ ، سید احمد بریلویؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ سے گذر کر شاہ ولی اللہؒ تک پہونچ جاتا ہے ، اب تک مجموعی طور پر شمشیر وسناں سے کام لیا گیا تھا ، اب زبان وقلم سے کام لیا جانے والا تھا ، اب تک سیاسی ومذہبی آزادی کے لئے افراد موت کے گھاٹ اترتے تھے ، اب اسی مقصد کے لئے افراد پیدا کئے جانے والے تھے ۔ مسلمانوں میں مذہبی شعور بیدار کرنے اور ان میں اسلام اور قرآن کی صحیح سمجھ پیدا کرنے کے لئے شاہ ولی اللہ اور ان کے جلیل القدر فرزندوں نے فارسی اور اردو میں قرآن کے ترجمے کئے تھے اور ان زبانوں میں اسلامی تعلیمات کی تشریحیں بھی کی تھیں ۔ دیوبند میں اسی مقصد کو توسیع دے کر ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی کہ مسلمان قرآن ، حدیث ، فقہ اور متعلقہ علوم الٰہیہ کو ایک ہی احاطے میں حاصل کریں اور پھر یہاں سے نکل کر اس ملک میں ملت اسلامیہ کی عزت وآبرو کی ضمانت بن جائیں ۔

بلاشبہ دارالعلوم دیوبند اپنے اس مقصد میں کامیاب رہا اور اس کی قدامت پسندی ہندی مسلمانوں کے بہت کڑے وقت میں کام آئی ۔ اس قدامت پسندی میں تازگی کا ایک پہلو یہ تھا کہ اس نے بدعات کے ساتھ کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا اور مسلسل اس بات کے لئے جد وجہد کی کہ مسلمانوں کی زندگی میں وہ رسم ورواج مستحکم نہ ہونے پائیں جو اسلامی تعلیمات کے بنیادی مزاج اور اسلام کے نظریۂ توحید کے منافی ہیں ، اس راہ میں اس کے علماء کو سخت آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا ، لیکن وہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ ڈٹے رہے ۔ دارالعلوم کی قدامت پسندی کا ایک تازہ کار پہلو یہ بھی تھا کہ اس نے برطانوی سامراج کے سامنے کبھی سپر نہیں ڈالی اور ایک مکتب خیال کے طور پر یہ جنگ آزادی میں اس تجدد پسندی کے دوش بدوش کھڑی رہی جس کی نمائندگی ملکی اور غیر ملکی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ افراد کر رہے تھے ۔

دارالعلوم دیوبند نے معارف قرآنی کو عام کیا اور اس ملک میں علم حدیث کی ایسی خدمت کی جس کا

مثال اس معہد کے عالم اسلام میں اور کہیں نہیں ملتی، عرب ہو یا عجم، ساری دنیائے اسلام کو اس کے دارالحدیث سے روشنی ملی، حقیقت یہ ہے کہ اگر دارالعلوم نہ ہوتا تو نہیں کہا جا سکتا کہ حدیث کے علم پر کیا گذرتی۔ اس بات کا اعتراف علمائے ازہر اور سلفیوں نے بھی کیا جن کی اسلامی خدمات خود اپنی جگہ مستند اور مشہور ومعروف ہیں۔ فقہ میں دارالعلوم دیوبند حنفی المسلک رہا ہے' (اسے میں محض تاریخی عوامل کا ایک منطقی نتیجہ سمجھتا ہوں) یہاں کے دار الافتاء نے مذہبی ومعاشرتی مسائل میں مسلمانوں کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے اور بہت بڑی حد تک ان کی ہیئت اجتماعی کو مجتمع و مستحکم رکھا ہے۔ دارالعلوم کے فضلاء دور دور، چھوٹے چھوٹے گاؤں اور قریوں تک پہونچے اور ان کے ذریعہ اس درسگاہ کا تعلق عوام سے جڑا رہا، اسی کے ساتھ انھیں فضلاء کے ہاتھوں جنھیں اکثر جدید تعلیم یافتہ حضرات اپنی تنگ نظری اور ناسمجھی کے سبب اپنے سے کمتر درجہ کی مخلوق سمجھ کر 'مولوی' اور 'ملّا' کہتے رہے ہیں، دور دراز علاقوں میں بھی مسلمانوں کی مذہبی وثقافتی ضرورتیں پوری ہوتی رہی ہیں ـــ اس طرح دارالعلوم دیوبند کی خدمات گوناگوں اور بے شمار ہیں اور اسی لئے یہ تاریخ ساز بھی رہا ہے اور عہد آفریں بھی۔

کوئی زمانہ ایسا نہیں جو فتنوں سے خالی رہا ہو اور آئندہ بھی کوئی دور ایسا نہ ہوگا جب فتنے نہ ہوں، سماج ہو یا ادارے، فتنے باہر سے بھی ان میں در آتے ہیں اور اس کے اندر سے بھی اٹھتے ہیں، سماجوں اور اداروں کو ان کی طرف سے ہمہ وقت ہوشیار رہنا چاہئے، اسی میں زندگی، استحکام اور روایت کے تسلسل کی بقا ہے۔ دارالعلوم دیوبند جن ہاتھوں سے قائم ہوا، وہ ہاتھ اُس وقت کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھے تھے، گویا اس درسگاہ کا خمیر ہی چیلنجوں کے قبول اور فتنوں کے رد سے تیار ہوا تھا۔ دیوبند کے علماء وفضلاء، اساتذہ وطلباء، اس کے ارباب انتظام واہتمام اور اس کے تمام ہمدردوں اور مخلصوں کا یہ فرض ہے کہ وہ یہ سمجھیں کہ اس زمانے کے فتنے اور چیلنج کیا ہیں اور ان کا مقابلہ کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ آج کے چیلنجوں کا جواب دینے کے لیے کس قسم کے ارباب فکر ونظر کی ضرورت ہے اور ان کی تربیت کس نہج پر کی جاسکتی ہے۔ صد سالہ جشن کے موقع پر ان اور اس طرح کے دوسرے مسائل پر اگر غور وفکر نہ ہوا تو یہ بڑی کمزوری اور غفلت کی بات ہوگی اور ہم دارالعلوم کے گذشتہ کارناموں پر فخر تو کرسکیں گے لیکن اپنے آپ کو اپنے اکابر کا صحیح

عمارت نہ کہہ سکیں گے۔ زندگی وہی گذارنے کے قابل ہے جس کی جانچ برابر کی جاتی رہے، ایک سو تیرہ برس کے بعد دارالعلوم کو یہ تو دیکھنا ہی ہوگا کہ ملیّ زندگی کی شاہراہ پر اس کا یہ طویل سفر کہاں سے شروع ہوا تھا اور اب کس منزل میں ہے۔ خود اس وقت اس کا اپنا کیا حال ہے اور آگے اس کا سفر کس منزل کی طرف ہوگا۔ اس کے احاطہ میں جو تعلیم دی جاتی ہے، پہلے اس کا کیا معیار تھا اور اب کیا ہے، پہلے جو خدا ترسی اور للّٰہیت تھی وہ اب ہے یا نہیں ہے، بڑھی ہے تو کتنی اور گھٹی ہے تو کس حد تک، علوم دینی اور سنتِ نبوی کی خدمت کا وہ جذبہ جس سے پہلے اس کا ذرہ ذرہ سرشار تھا، آج بھی موجود ہے یا نہیں، اس میں اضافہ ہوا ہے یا کمی واقع ہوئی ہے۔ پہلے جو ایک فقر و درویشی اور بے سروسامانی کی پر نور فضا اس ادارہ پر چھائی رہتی تھی۔ وہ باقی ہے یا ختم ہوگئی ہے۔ اگر خوشحالی ہے تو کہیں یہ عذاب تو نہیں بنتی جارہی ہے۔ اساتذہ وطلبہ کے سامنے وہ مشن ہے یا نہیں جو دارالعلوم دیوبند کا بنیادی مشن رہا ہے ــــ یہ اور اسی قسم کے اور بھی موضوعات اور عنوان ہیں جن پر اس صد سالہ اجلاس کے موقع پر غور کرنا اور کسی نتیجہ پر پہنچنا ہے۔ بلاشبہ اس عظیم الشان عالمی اجتماع میں جلیل القدر علماء، عظیم المرتبت اولیاء، روشن ضمیر صوفیاء، اصحاب فکر زعماء، نامور فضلاء اور ممتاز دانشور شریک ہوں گے۔ ایسا شاندار اجتماع شاید ہم میں سے وہ بھی جو ابھی جوان ہیں، پھر نہ دیکھ سکیں، کیسی بدنصیبی کی بات ہوگی اگر دارالعلوم اس موقع پر بھی اپنے ماضی کے ساتھ اپنے حال کا معروضی جائزہ نہ لے سکے اور مستقبل کا کوئی جامع پروگرام نہ پیش کرسکے جو ملتِ اسلامیہ ہند کے لئے عہد آفریں ثابت ہو۔ ہمیں امید ہے کہ اس عالمی اجتماع سے فائدہ اٹھاکر دارالعلوم ایک بار پھر مسلمانوں کی مذہبی و تہذیبی قیادت کا بوجھ اپنے کاندھوں پر لے گا اور اپنے بانیوں اور اکابر کی ان روایات کو زندہ رکھے گا جو ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

پروفیسر علی اشرف

مولانا محمد علی کے سیاسی افکار

(ایک اور پہلو)

مہاتما گاندھی کے علاوہ ہندوستانی رہنماؤں میں مولانا محمد علی ہی ایسے رہنما تھے جو مذہب وسیاست کے مسئلہ پر مسلسل اور موثر طریقہ سے لکھتے اور بولتے رہے۔ سیاست اور مذہب کا مسئلہ بڑا اہم اور نازک مسئلہ رہا ہے اور آج بھی ہمیں کسی نہ کسی شکل میں اس مسئلہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مذہب کے نام پر دوقومی نظریہ اور اس بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم کے بعد بھی یہ سوال زیر بحث رہا ہے کہ ملک کی سیاسی زندگی میں مذہب کی کیا اہمیت ہونی چاہیئے۔ بنگلا دیش کی جنگ آزادی نے اس بحث کو اس حد تک ضرور کمزور اور لاحاصل بنادیا کہ محض مذہب کی بنیاد پر قومیت کے تصور کو رد کر دیا گیا اور اس بات کا احساس عام ہوا کہ موجودہ قومیت کا انحصار مذہب کے علاوہ مشترکہ زبان وکلچر، یا تاریخی وسیاسی عناصر پر ہے۔ لیکن ملک وملت سے متعلق ان خوش آئند واقعات کے باوجود مذہب اور سیاست کے متعلق کئی پیچیدہ سوال ہنوز جواب کے طالب ہیں۔ ان سوالوں اور اُن کے جوابات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اس مختصر مقالہ کا مقصد یہ ہے کہ ان سوالوں کو مولانا کی طرف رجوع کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ مولانا ان کا کیا جواب پیش کرتے ہیں اور ان کے خیالات کہاں تک ہماری موجودہ زندگی میں منزل کی نشان دہی کرتے ہیں اور کس حد تک

پروفیسر علی اشرف ، صدر شعبۂ سیاسیات ، جامعہ ملیہ اسلامیہ ۔ دہلی

ہمیں نئے جواب تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

مولانا محمد علی کی زندگی میں مساوی طور پر اسلام اور ہندوستان کی عظمت واحترام اور آزادی کا بے پناہ جذبہ یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔ اور اسی جذبہ کے تحت وہ انگریزی سامراج کے کٹر مخالف رہے۔ ہندوستان اور عالم اسلام کی غلامی مغربی سامراجیت کا مشترکہ نتیجہ تھی اور تحریکِ خلافت سامراجیت کی مخالف تحریک تھی۔ تحریکِ خلافت کے سربراہوں کے نزدیک سوال ترکوں کا نہیں بلکہ سامراجیت سے نجات اور آزادی کے حصول کا تھا۔ اس کے باوجود سلطنت عثمانیہ اور حجاز کی سیاست سے متعلق مولانا کے جو خیالات تھے ان سے چند باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اسلام کا وقار اور غلام ملکوں کی آزادی ان کی نظر میں عزیز ترین مقاصد تھے۔ لیکن انھوں نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ اسلام کے اقدار اور تاریخی اداروں میں فرق ہو سکتا ہے۔ اسلام کے وقار اور مرکزیت کو دولتِ عثمانیہ کے مترادف سمجھنا اور ترکی سلطنت اور ملوکیت کی حمایت کرنا مصلحت سے زیادہ اہمیت کے حامل نہیں تھے۔ ترکی حکومت ایسی نہ تھی کہ اصولاً وہ حمایت اور ہمدردی کی مستحق ہوتی۔ اور یقینی طور پر ایسی نہ تھی کہ اس کی خاطر عربوں کے حق خود ارادیت کو نظر انداز کر دیا جاتا۔ مسلمانوں کے سیاسی افکار میں اس بات کی کمی معلوم ہوتی ہے کہ آئیڈیل اور عملی سیاست کے فرق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً یہی کیفیت پاکستان اور بنگلا دیش کی جنگ کے وقت ظاہر ہوئی جب بنگلا دیش کے جائز مطالبات کے سامنے پاکستان کی سالمیت کو مذہب کے وقار اور اتحاد کے مترادف سمجھا گیا۔ پاکستان کا وجود ویسا ہی تھا جیسا ترکوں کا۔ جس طرح عربوں کو آزادی ملی اسی طرح بنگلا دیش کو آزادی حاصل ہوئی۔ عالم اسلام کی وحدت اور عزت کی بنیاد کن باتوں پر ہونی چاہیئے اور اس کے وسائل کیا ہو سکتے ہیں اس پر سنجیدہ طریقہ پر وسیع النظری سے غور نہیں کیا گیا ہے۔ 'مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا' ایک نیک خیال ضرور ہو سکتا ہے لیکن حقیقت سے کتنا پرے ہے۔؟

فرقہ وارانہ تعلقات کو خوش گوار بنانے کے سلسلہ میں دو مختلف اور متضاد زاویہ نظر کارفرما رہے ہیں۔ ایک نظریہ تو یہ رہا ہے کہ مذہب کو سیاست کی بنیاد بنانا ہی غلط ہے۔

اس نظریہ کی شدید ترین دشواری یہ ہے کہ مذہب ہی ایک ناقص شے ہے اور زندگی کو لادین، منطقی اور باشعور بنانے کا راستہ ہی قومی ہم آہنگی اور سیاسی امن و امان کا واحد راستہ ہے۔ مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی کا نظریہ مذہب کا حامی تھا۔ دونوں زندگی کو، خواہ نجی ہو یا اجتماعی، مذہب سے الگ کرنے کے مخالف تھے۔ دونوں کا یہ خیال تھا کہ مذہب ہی اخلاقی اقدار کی بنیاد ہے اور انسان کی زندگی اخلاقی اقدار کے بغیر ناقص ہے۔ دونوں کا یہ عقیدہ تھا کہ انسان کی مذہبی جڑیں مضبوط ہونی چاہئیں، اور اسے محدود اور تنگ نظر نہیں ہونا چاہئے۔ دونوں نے اس بات پر زور دیا کہ مذہب اور انسانیت میں کوئی تصادم نہیں بلکہ انسانیت کا بہی خواہ ہونے کے لیے اپنے مذہب و ملت سے متعلق صادق ہونا لازمی ہے۔ غرضیکہ قوم و ملت اور انسانیت کی مختلف کڑیاں ہیں جو ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور ان میں ایک دوسرے سے تصادم یا تضاد کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے جب گاندھی جی کی قومیت کے خیال پر تنقید کی تو مہاتما نے جواب میں کہا تھا کہ قبل اس کے ہم انسانیت کے لیے جان دیں، ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے جینا سیکھنا چاہئے۔ یہی منطق ہے جو ملّی ذات کی یک جہتی اور وابستگی کو مسلّم کرتی ہے۔ مولانا محمد علی نے یہ اعلان کیا کہ "میں مذہبی معاملات میں اول و آخر مسلمان ہوں اور مسلمان کے سوا کچھ نہیں، اور ہندوستانی معاملات میں اول و آخر ہندوستانی ہوں اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔"

یہی وہ منطق تھی جس نے مولانا کو متحدہ قومیت کے ایسے تصور کو رد کرنے پر مجبور کیا جسے مذہب و ملت کے منافی قرار دیا گیا تھا۔ ۱۹۲۶ء میں جب موتی لال نہرو نے مولانا ابوالکلام کے تعاون سے انڈین نیشنل یونین کے نام سے ایک مجلس قائم کی تو اس کی رکنیت کے لیے یہ شرط لازمی قرار دی کہ اس مجلس کا کوئی رکن کسی فرقہ وارانہ تنظیم کا رکن نہیں ہو سکتا۔ مولانا نے ایسی متحدہ قومیت کو ملّی وابستگی کے منافی سمجھا اور ہمدرد میں لکھا:

"حقیقت یہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا قوم پرور اور ملت پرور اپنے نفس کی حفاظت اور اپنے خاندان اور کنبہ والوں کی تربیت و تنظیم سے بے اعتنائی نہیں

کرسکتا۔ منظم کنبوں اور خاندانوں کے بغیر نہ ایک۔ ملت تنظیم پاسکتی ہے نہ ایک قوم، اسی طرح جس ملک میں مختلف ملتیں آباد ہوں، اس میں تنظیمِ قومی کی تنظیم ہی لازمی اور لابدی ہے، لیکن ارتقا کی ہر منزل میں ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اس منزل سے آگے بھی ایک اور یا چند اور منزلیں ہیں۔ آخری منزل یا نقطہ نہ اپنا نفس ہے، نہ خاندان ہے، نہ ملت ہے نہ قوم۔ بلکہ نوعِ انسانی یا اس سے بھی آگے تمام مخلوقات اور کائنات ہے۔ جو شخص اپنے نفس کی حفاظت اور تربیت سے غافل ہے وہ اپنے خاندان کو کیا نفع پہونچا سکتا ہے۔ جو اپنے خاندان والوں کے سود و بہبود سے غافل ہے وہ ملت کے سود و بہبود کے لئے کیا کر سکے گا۔ اور جو ملت کے لئے کچھ نہیں کرسکتا ہے، وہ بھلا قوم اور ملک کے لئے کیا کر سکے گا۔"

مولانا کے یہ بصیرت افروز ارشادات آج بھی اتنی ہی اہمیت کے حامل ہیں جتنے کہ وہ پچاس سال قبل جب وہ ہمدرد میں شائع ہوئے تھے۔ آج یہ طرزِ فکر بھی رائج ہے کہ مذہب اور ملت سے کنارہ کشی ہی میں فلاح و کامرانی ہے۔ ایسے حضرات ہمیں ملتے ہیں جو ملی تعلقات کو باعثِ شرم اور نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ انسان کے لیے اپنی ذات سے وابستگی اور اس میں فخر کا احساس ایک مضبوط اور صحت مند کردار کی اساس کے لیے ضروری ہے۔ آج کی نفسیات اور سماجیات میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ انسان کی جڑیں اس کی ذات میں استوار ہوں ورنہ وہ کٹی ہوئی پتنگ یا بے جڑ کے درخت کی مانند بے یار و مددگار ہو کر اپنے وجود کے مقصد سے محروم رہ جائے گا۔ ملت کی رکنیت انسان کی جڑوں کو مضبوط رکھتی ہے اور اسے تنہائی اور علاحدگی کے احساس سے محفوظ رکھتی ہے۔ اگر ملی احساس کی خرابی سے کٹرپن اور ضد پیدا ہوسکتی ہے تو قومیت کے احساس سے بھی شدت نفرت اور بین الاقوامی جنگ پیدا ہوسکتی ہے۔ اگر قومیت کی شدت اور تعصب کے باوجود اس کو رد نہیں کیا جاسکتا تو ملیت کو بھی اس کی خرابیوں کی وجہ سے رد کرنے کی ضرورت نہیں۔ مناسب یہ ہے کہ دونوں کے تعمیری تاثرات کو قبول کیا جائے اور پھر ان میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی دونوں کا پیغام اسی

ہم آہنگی کا پیغام ہے۔

ملّی اور قومی ہم آہنگی کے لیے یہ لازمی ہے کہ دونوں کے دائرہ عمل کی حدود کو الگ رکھا جائے۔ اور جب مولانا محمد علی نے یہ فرمایا کہ میں مذہبی معاملات میں مسلمان ہوں اور قومی معاملات میں قوم پرور تو انھوں نے ملّی اور قومی دائرہ عمل کو الگ الگ قرار دیا لیکن یہ علیحدگی مذہب وملّت سے منکر نہیں بناتی بلکہ علیحدہ ہوکر بھی ہم آہنگ بناتی ہے۔ اور دونوں کو فرد اور انسانیت کے درمیان ضروری منازل قرار دیتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے مولانا کے مذہب وسیاست کے متعلق خیالات بہت اہم، عمیق اور تعمیری ہیں۔ فرد ہو یا ملت وقوم ان کی تعمیر و بقا کے لیے اپنی ذات میں احساسِ فخر اور رواداری دونوں کا صحت مند امتزاج ہونا چاہیئے۔ اور اس طرح کا امتزاج مولانا کی شخصیت اور افکار میں قریب قریب ویسا ہی ہے جیسا مہاتما گاندھی میں تھا۔

افراد یا کسی فرقہ یا ملک وقوم کی تعمیر و فلاح کے لیے جو بھی خدمت انجام دی جائے، اس پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے اور خلوص کے ساتھ جو بھی اور جیسی بھی خدمت کی جائے اس کے اثرات دیرپا اور دور رس ہوتے ہیں۔

عام طور سے فطرت کا رجحان تخریب کی طرف مائل ہوتا ہے۔ نیک سے نیک اصول اچھے سے اچھے ادارے خراب وخستہ ہو جاتے ہیں۔ سیکڑوں نبی پیدا ہوئے اور سبھوں نے اچھا سبق سکھایا مگر ان کی تعلیمات مسخ ہو گئیں۔ اصول واقدار کی روح ختم ہو جاتی اور انسان لکیر کا فقیر بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ رجحان تمام مذاہب وتمدن میں رونما ہوتے ہیں۔ اس لئے تعلیم کتنی ہی مکمل اور پختہ کیوں نہ ہو اس کی روح کو زندہ رکھنے کے لئے مسلسل جائزہ کی ضرورت ہے۔ اور اس بات کی گنجائش رکھنے کی ضرورت ہے کہ مذہبی تعلیم کی روح کو کیسے زندہ رکھا جائے تاکہ محض خارجی اور سطحی پیروی سے روحِ مذہب پامال نہ ہو۔ مولانا محمد علی نے اپنے افکار اور اعمال میں اس پہلو سے دلچسپی کا اظہار نہیں کیا کہ مذہبی طریقوں یا اداروں میں بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں کسی عنوان سے تبدیلی لائی جائے۔ یہ کمی اکثر مسلم مفکرین میں رہی ہے۔ اگر کوئی تبدیلی کی بات بھی کرتا ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ سنت اور خلافت راشدہ

کی بازیافت کرتا ہے۔ اسلام کی مرکزیت کے لیے دولتِ عثمانیہ کے علاوہ اور کیا سبیل نکل سکتی تھی، اس بات پر مولانا نے کبھی غور نہیں کیا اور جب کمال اتاترک نے خلافت کا خاتمہ کر دیا تو مولانا مجروح ہو کر رہ گئے۔

شریعت کا مقصد یہ ہے کہ قوانین کی مدد سے مذہب کی روح اور اس کے مقاصد برقرار رہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ممکن ہے ایک مذہب کی روح کو دوسرے مذہب کے پیرو اچھی طرح نہ سمجھ سکیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ شرعی طریقوں میں سرے سے تبدیلی نہ لائی جائے خصوصاً ان معاملوں میں جو ممنوع نہیں قرار دئے گئے اور جن پر پابندی عائد نہیں کی گئی۔ مسلمان اگر چاہتے ہیں کہ غیر مسلم حکومتیں ان کی شریعت میں مداخلت نہ کریں تو یہ لازم ہے کہ وہ خود ہی شرعی قوانین کا جائزہ لیں تاکہ جہاں اصلاح اور بہتری کی ضرورت ہو وہاں ایسا کیا جا سکے۔ دین عالمگیر ہے، اٹل ہے اور آخری ہے۔ لیکن قوانین زمانہ اور حالات کے پیداوار ہوتے ہیں۔ قوانین کو دین کا حامل ہونا چاہیے۔ مگر دین کی ضرورت مختلف حالات میں مختلف قوانین سے پوری ہو سکتی ہے۔ مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی کے مندرجہ ذیل ارشادات قابلِ غور ہیں کہ

> "یہی اصل دین ہے جو دنیا جہان پورب، پچھم، اتر، دکھن جہات کے لحاظ سے عربی، سنسکرت، عبرانی اور چینی وغیرہ وغیرہ زبانوں کے لحاظ سے ایک ہی ہے، ایک ہی رہے گا۔ رہی فقہی جزئیات اور باریکیاں وہ مقامی اور وقتی تھیں۔ جب وہ باریکیاں کسی ایک دین کی طرف منسوب جماعتوں میں ایک نہیں، پھر بھلا دنیا جہان کے سارے مذاہب میں بالکل ہو بہو ایک کیسے ہو سکتی ہے۔"

جب اس طرح دین اور فقہی جزئیات کا فرق سمجھا جائے گا تو کیا فقہہ کا دین کی طرح اٹل ہونا ضروری نہیں ہے؟ فقہی اور شرعی جزئیات کا جائزہ لینا، اگر ضروری اور مفید ہو تو ان جزئیات میں تبدیلی کرنا دین کے خلاف ہے یا نہیں؟ یہ

ایک اہم بحث ہے اور اس کی اہمیت اسی لئے ہے کہ مذہب کی اہمیت مسلم ہے اور مذہب کی تطہیر اور ملت کی فلاح و بہبود ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ مولانا محمد علی کا حوصلہ بلند تھا اور مسلک صحیح مگر ان کا کام ادھورا رہ گیا ہے اور ہنوز باقی ہے۔

مولانا محمد علی کے بارے میں بعض لوگوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ایک باکمال آدمی تھے مگر ان کا کوئی ایسا کارنامہ نہیں ہے جو ان کی زندگی کے بعد بھی یاد کیا یا بالفاظ دگیر آج کی نسل کے لیے اس میں کوئی معنویت ہوتی۔ مولانا نے ملک وقوم کی آزادی اور وقار کے لیے جان دی، شہید کا کارنامہ شہادت ہے جس کا صلہ دنیا دینے سے قاصر ہے مگر مولانا کا ایک تعمیری کارنامہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی شکل میں موجود ہے جس کا آغاز مولانا نے علی گڑھ یونیورسٹی کے زیر سایہ چند خیموں میں کیا تھا، وہ آج بھی باقی ہے اور نہ صرف باقی ہے بلکہ ترقی کے میدان میں آگے بڑھ رہی ہے اور ایک ایسا اقلیتی ادارہ ہے جس سے ہر ملت و مذہب کے لوگ وابستہ ہیں، جہاں مسلمان اساتذہ اور ہندو طلبا کی کثرت ہے، جہاں شائستگی اور رواداری کی بے نظیر روایت ہے، جہاں ہندو مسلمان، چھوٹے بڑے باہمی رفاقت سے مل جل کر کام کرتے ہیں، مولانا اور مہاتما گاندھی دونوں اس ادارے کے بانیوں میں سے ہیں اور دونوں کی روح اس ادارے کی ترقی اور خدمات کو دیکھ کر خوش ہوتی ہوگی اور مولانا فخر کے ساتھ فرماتے ہوں گے کہ دیکھو ملک وملت میں کوئی تضاد نہیں ہے، مذہب کسی تعمیری کام کے خلاف نہیں ہے اور یاد رکھو کہ قومی زندگی میں شرکت اور کامیابی کے لیے اپنی ملی زندگی کو سنوارو اور جامعہ جامعہ جیسے ادارے قائم کرو، اداروں کے ذریعہ خود جیو اور دوسروں کی خدمت کرو۔

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ

اُردو کی کوزی آوازیں اور اُن کا ارتقا

اٹھارہویں صدی کے اختتام تک اردو کی موجودہ تمام آوازوں کا ارتقا عمل میں آچکا تھا۔ اُردو کی تمام مُصوّتی آوازیں (VOWEL SOUNDS) وسطی ہند آریائی سے ہوتی ہوئی قدیم ہند آریائی سے ارتقا پذیر ہوئی ہیں۔ اُردو کی بیشتر مُصمّتی آوازوں (CONSONANTAL SOUNDS) کا بھی ماخذ قدیم ہند آریائی ہے۔ اٹھارہویں صدی کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے اردو نے فارسی اور عربی کی بھی چند آوازیں مثلاً ف، ز، ژ، غ اور ق مکمل طور پر اپنالی تھیں۔ ان کے علاوہ اردو کے ارتقا کے دوران اردو کی دو اپنی آوازوں ڑ اور ڑھ کا بھی ارتقا عمل میں آیا۔ چند دیگر غیر ممیّز (NON-DISTINCTIVE) آوازیں جو اردو کے ارتقا کے دوران ارتقا پذیر ہوئیں یہ ہیں: مھ، نھ، رھ، وھ اور یھ۔ اردو نے اپنے ارتقا کے کسی بھی دور میں سنسکرت کی کوزی انفی (RETROFLEX NASAL) آواز ݨ (ण) کو قبول نہیں کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ݨ کی آواز دکنی تصانیف میں خال خال پائی جاتی ہے[1] لیکن شمالی ہند کی کسی بھی تصنیف میں

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ پرنسپل اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر، سولن، ہماچل پردیش

[1] دیکھیے شمائل الاتقیا از میراں یعقوب، مرتبہ بدیع حسینی

اس کا وجود نہیں پایا گیا۔

اردو میں عربی کی مُصمتی آوازوں مثلاً ث، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ اور ع کا وجود نہیں پایا جاتا۔ اردو میں ان کی حیثیت محض حروف کی ہے۔ چوں کہ ان آوازوں کا تلفظ اردو میں ادا نہیں کیا جاتا اس لیے پروفیسر مسعود حسین خاں نے انھیں صوتی نقطۂ نظر سے "مُردہ لاشیں" قرار دیا ہے جسے اردو رسم خط اٹھائے ہوئے ہے، صرف اس لیے کہ ہمارا لسانی رشتہ عربی سے ثابت رہے[۵]۔ قدیم اردو تصانیف میں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جہاں اِن حروف کا استعمال خارج قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً عاشور نامہ میں الودا (الوداع)، باد (بعد)؛ کربل کتھا میں ہوّا (حوّا)؛ دیوانِ آبرو میں عبس (عبث)، مِصرا (مصرع)، ہال (حال) اور دیوانِ شاکر ناجی میں سدا (صدا) وغیرہ۔

اردو میں مُصمتی آوازوں کی مجموعی تعداد ۳۷ ہے۔ اردو کی ان آوازوں کا ارتقا حسبِ ذیل مآخذ سے ہوا ہے[۶]:

۱۔ ہند آریائی عربی فارسی مشترک مآخذ: ب ت ج د ر س ش ک ل م ن و ہ ی۔

۲۔ ہند آریائی عربی مشترک مآخذ: ب ت ج د ر س ش ک ل م ن و ہ ی

۳۔ ہند آریائی فارسی مشترک مآخذ: ب پ ت ج چ د ر س ش ک گ ل م ن و ہ ی

۴۔ عربی فارسی مشترک مآخذ: ب ت ج ح خ د ر ز س ش غ ف

---

[۵] "اُردو میں صوتیات کا خاکہ"، شعر و زبان، حیدرآباد: شعبۂ اردو، عثمانیہ یونی ورسٹی (۱۹۶۶ء) ص ۲۵۲۔

[۶] ایضاً، ص ۲۵۰

ک ل م ن و ہ ی۔

۵۔ خالص عربی ماخذ : ق

۶۔ خالص فارسی ماخذ : ژ

۷۔ خالص ہند آریائی ماخذ : ٹ ڈ ڑ بھ پھ تھ ٹھ جھ چھ دھ ڈھ ڑھ کھ گھ۔

جن آوازوں کا ارتقا خالص ہند آریائی سے ہوا ہے اُن میں اردو کی سبھی کوزی یا معکوسی آوازیں (RETROFLEX SOUNDS) اور سبھی ہکاری آوازیں (ASPIRATED SOUNDS) شامل ہیں۔ اردو کی کوزی آوازیں چھ ہیں جن میں تین غیر ہکاری (ٹ ڈ ڑ) اور تین ہکاری (ٹھ ڈھ ڑھ) ہیں۔ کوزی آوازوں کا سلسلۂ ارتقاء دیسی زبانوں سے بھی جا ملتا ہے۔ دیسی زبانیں سنسکرت کے آغاز و ارتقا سے قبل کی آسٹرک اور دراوڑی زبانیں ہیں۔ ان زبانوں کے الفاظ مثلاً پیٹ، کٹورا، کٹار، ڈھول، گھونٹ، گھاٹ، ٹوپی، ٹپکا، ڈنک، ڈیڑا، ڈور اور ڈھیلا وغیرہ اردو میں اس طرح گھُل مِل گئے ہیں کہ یہ ہرگز گمان نہیں ہوتا کہ ان کی تاریخ کئی ہزار سال پرانی ہے۔ اردو میں کوزی آوازوں کے حسب ذیل اقلی جوڑے (MINIMAL PAIRS) پائے جاتے ہیں :

۱۔ /ٹ : ڈ/ ٹال : ڈال

۲۔ /ٹ : ٹھ/ ٹاٹ : ٹھاٹ ، پیٹ : پیٹھ

۳۔ /ڈ : ڈھ/ ڈال : ڈھال ، ڈور : ڈھور

۴۔ /ڑ : ڑھ/ باڑ : باڑھ ، بڑا : بڑھا

۵۔ /ت : ٹ/ تال : ٹال ، بات : باٹ

۶۔ /تھ : ٹھ/ ساتھ : ساٹھ

۷۔ /د : ڈ/ در : ڈر

۸۔ /دھ : ڈھ/ دھونا : ڈھونا

۹- /ڑ : ڑ / ڑھ : ڑھ

اردو میں ڑ اور ڑھ کی آوازیں لفظ کی ابتدائی حالتوں میں نہیں پائی جاتیں یعنی اردو کا کوئی لفظ ڑ یا ڑھ سے شروع نہیں ہوتا۔ ڑ کی مشدّد (GEMINATED) شکل بھی اردو میں نہیں ملتی۔ لفظ کی درمیانی اور آخری حالتوں ڑ اور ڑھ کی آوازیں دوسری کوزی آوازوں ڈ اور ڈھ کے ساتھ بدل جاتی ہیں مثلاً ایڈ اور ایڑ (عاشور نامہ) یا بوڈھا اور بوڑھا (کربل کتھا) وغیرہ۔ جدید اردو میں بھی یہ تبدیلی عام ہے مثلاً علی گڈھ اور علی گڑھ، ٹھڈی اور ٹھوڑی وغیرہ۔ لفظ کی درمیانی اور آخری حالتوں میں ڈ کی آواز انفیائی مصوتے (NASAL CONSONANT) اور انفی مصوتے (NASALISE VOWEL) کے بعد آتی ہے مثلاً پانڈی، سانڈ، جھنڈا، ٹھنڈا وغیرہ۔ ڈ اور ڈھ کی آوازیں لفظ کے شروع میں آتی ہیں مثلاً ڈال، ڈھال، ڈور، ڈھور وغیرہ۔ انگریزی الفاظ اور چند دیسی الفاظ مثلاً اُجڈ، کھڈ وغیرہ میں ڈ کی آواز آخر میں بھی آتی ہے۔ ڈ کی آواز جب درمیانی حالت میں آتی ہے تو مشدّد ہو جاتی ہے مثلاً بڈّی، گڈّی، اڈّا وغیرہ

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اردو کی بیشتر آوازوں کا ارتقا قدیم ہند آریائی مآخذ سے ہوا ہے۔ قدیم ہند آریائی سے یہ آوازیں وسطی ہند آریائی میں داخل ہوئیں اور جدید ہند آریائی زبانوں کے ارتقا کے دوران اردو میں داخل ہو گئیں۔

قدیم ہند آریائی دور ۱۵۰۰ ق م تا ۵۰۰ ق م تسلیم کیا گیا ہے۔ اِس دور میں ویدک سنسکرت اور کلاسیکی سنسکرت کا ارتقا ہوا۔ ہندوستان کی قدیم ترین تصنیف رِگ وید اور دیگر ویدوں کی تخلیق اسی دور میں عمل میں آئی۔ پاننی بھی اسی دور میں پیدا ہوا جس نے اشٹادھیائی کے نام سے سنسکرت زبان کی قواعد تخلیق کی۔ اِس دور میں آریوں کا عمل دخل شمال مغربی ہندستان سے بڑھ کر

جنوب اور وسطی ہند تک پھیل گیا تھا۔ اس پھیلاؤ کا اثر آریوں کی زبان پر بھی پڑا اور ان کی زبان کی مرکزی حیثیت ختم ہونے لگی ۔

قدیم ہند آریائی دور کے بعد وسطی ہند آریائی دور ۵۰۰ ق م تا ۱۰۰۰ عیسوی قائم رہتا ہے ۔ اس دور کے ابتدائی عہد میں پالی اور اشوک کے کتبوں کی زبانوں کے نمونے ملتے ہیں ۔ درمیانی عہد میں پانچ ادبی پراکرتیں : مہاراشٹری، شورسینی، ماگدھی، اَردھ ماگدھی اور پشاچی ظہور پذیر ہوتی ہیں اور آخری عہد میں اِن پراکرتوں کے زوال کے بعد انھیں علاقوں میں اپ بھرنشیں پیدا ہوتی ہیں ۔ اُردو کا تعلق شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش سے ہے ۔

سنسکرت کے زوال کے بعد سنسکرت کے بے شمار الفاظ مختلف صوتی تبدیلیوں سے گذر کر پراکرت میں داخل ہوئے اور پراکرت سے پھر اپ بھرنش میں آگئے ۔ ۱۰۰۰ عیسوی کے بعد جب جدید ہند آریائی زبانوں کے آغاز و ارتقا کا سلسلہ شروع ہوا تو یہی الفاظ مزید صوتی تبدیلیوں کے بعد اردو اور دیگر جدید ہند آریائی زبانوں میں داخل ہو گئے ۔

ذیل میں اردو کی کوزی آوازوں ٹ ، ڈ ، ڑ ، ٹھ ، ڈھ اور ڑھ کا تاریخی ارتقا بیان کیا جاتا ہے ۔

۱۔ کوزی آواز ٹ کا ارتقا :

ابتدائی ٹ :

	سنسکرت	پراکرت	اردو
(۱)	ت ر	ٹ	ٹ
	تْرُٹ	ٹُٹّ	ٹوٹ

درمیانی ٹ :

(۱)	ٹ	ٹ	ٹ
	کنٹکَ	کنٹ اَ	کانٹا

(۲)	رت	ٹّ	ٹ
	آرُتَ	اَٹّ اَ	آٹا
(۳)	تّ	تّ	ٹّ
	مِرتِکا	مِٹّ آ	مِٹّی

آخری ٹ :

(۱)	شٹ ر	ٹّ	ٹ
	اُشٹر	اُٹّ	اونٹ
(۲)	شٹ	ٹّ	ٹ
	اِشٹ	اِٹّ	اینٹ
(۳)	شٹھ	ٹھّ	ٹ
	اوشٹھ	اوٹھّ	ہونٹ

۲۔ کوزی آواز ٹھ کا ارتقا :

ابتدائی ٹھ :

	سنسکرت	پراکرت	اردو
(۱)	ستھ	ٹھ	ٹھ
	ستھگ	ٹھگ	ٹھگ

درمیانی ٹھ .

(۱)	شٹھ	ٹھّ	ٹھ
	مِشٹھ	مِٹھّ	میٹھا
	انگشٹھ	انگٹھ	انگوٹھا

آخری ٹھ

(۱)	شٹ	ٹھّ	ٹھ
	اشٹ	اٹھّ	آٹھ

(۲)	شٹھ	ٹھ	ٹھ
	پرشٹھ	پٹھ	پیٹھ
(۳)	تھ	ٹ	ٹھ
	گرنتھ	گنٹھ	گانٹھ

۳۔ کوزی آواز ڈ کا ارتقا :

ابتدائی ڈ :

	سنسکرت	پراکرت	اردو
(۱)	ڈ	ڈ	ڈ
	ڈولکا	ڈولیا	ڈولی
	ڈاکنی	ڈاینِ	ڈائن
(۲)	ڈ	ڈ	ڈ
	ڈَر	ڈَر	ڈر

درمیانی ڈ :

(۱)	ڈ	ڈ	ڈ
	انڈک	انڈا	انڈا

۴۔ کوزی آواز ڈھ کا ارتقا :

ابتدائی ڈھ

سنسکرت	پراکرت	اردو
—	ڈھ	ڈھ
—	ڈھنکنی	ڈھکنی

درمیانی ڈھ :

سنسکرت	پراکرت	اردو
ردھ	ڈھ	ڈھ
وردھ	بڈھ	بڈھا

۵۔ کوزی آواز ڑ کا ارتقا:

درمیانی ڑ :

	سنسکرت	پراکرت	اردو
	ٹ	ڈ	ڑ
	گھوٹکَ	گھوڈاَ	گھوڑا
	کیٹَ	کیڈُ	کیڑا
	جوٹکَ	جوڈاَ	جوڑا
	مَرکٹِکا	مکڈِاَ	مکڑی

۶۔ کوزی آواز ڑھ کا ارتقا:

درمیانی ڑھ :

	سنسکرت	پراکرت	اردو
(۱)	ردھ	ڈھّ	ڑھ
	وردھاکَن	بڈّھکِاَ	بڑھئی
(۲)	ہِ دّھ	ڈھّ	ڑھ
	وہِ دّھ	بُڈّھ	بوڑھا

آخری ڑھ :

	سنسکرت	پراکرت	اردو
(۱)	ردھ	ڈھ	ڑھ
	دِوِ اَرُدَھ	دِ اَ ڈّھ	ڈیڑھ
(۲)	ڈھ	ڈَھ	ڑھ
	اشاڈھَ	اَساڈھ	اُساڑھ

تجزیاتی مشاہدے

۱۔ ٹ کی آواز کا ارتقا پراکرت کی ٹ ، مشدّد ٹّ ، مشدّد ٹھّ

اورسنسکرت کی ٹ ، مصمتی خوشے ت ر ، رت ، ش ٹ ٹ ، ش ٹ ٹھ ، ش ٹ ر
اور مشدد تت سے ہوا ہے۔

۲۔ ٹھ کی آواز کا ارتقا پراکرت کی ٹ ، ٹھ ، مشدد ٹھ اور سنسکرت کی تھ ، مصمتی خوشے ش ٹھ اور ش ٹ ٹ سے ہوا ہے۔

۳۔ ڈ کی آواز کا ارتقا سنسکرت اور پراکرت کی ڈ سے ہوا ہے۔

۴۔ ڈھ کی آواز کا ارتقا پراکرت ڈھ اور سنسکرت ڈھ اور ر دھ سے ہوا ہے۔

۵۔ ڑ کی آواز سنسکرت اور پراکرت میں ناپید ہے۔ پراکرت میں ڑ کی جگہ پر ڈ پایا جاتا ہے۔ اس آواز کا ارتقا پراکرتوں کے بعد عمل میں آیا۔ اردو کی یہ خالص اپنی آواز ہے۔ ٹ ، ٹھ اور ڈ ، ڈھ کی آوازیں سنسکرت میں بھی پائی جاتی ہیں اور پراکرت میں بھی لیکن ڑ کی آواز نہ تو سنسکرت میں ملتی ہے اور نہ ہی پراکرت میں۔ اسی طرح ڑھ کی آواز بھی اِن زبانوں میں نہیں پائی جاتی۔ یہ بھی پراکرت کے بعد ارتقا پذیر ہونے والی آواز ہے۔ ڑ کی آواز پراکرت کی ڈ اور سنسکرت کی ٹ سے نکلی ہے۔ ڑھ کی آواز پراکرت کی ڈھ اور مشدد ڈھ اور سنسکرت کی ڈھ ، ر دھ اور ر دھ سے ارتقا پذیر ہوئی ہے۔

۶۔ پراکرت میں آوازوں کے مشدّد ہونے کا رجحان زیادہ ہے۔ اُردو میں پراکرت کی مشدد آوازیں مفرد آوازوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

۷۔ سنسکرت میں مصمتی خوشے (COSONANTAL GEMINATIONS) زیادہ پائے جاتے ہیں۔ سنسکرت کے مصمتی خوشے پراکرت میں آسان (SIMPLIFY) ہو کر مشدّد بن جاتے ہیں۔

۸۔ سنسکرت اور پراکرت میں الفاظ کے آخر میں بھی حرکت ہوتی ہے یعنی ان زبانوں کے الفاظ کا آخری مصمتہ (CONSONANT) کسی نہ کسی مصوتے (VOWEL) پر ختم ہوتا ہے۔ اردو کا کوئی لفظ مختصر مصوتے پر ختم نہیں ہوتا۔

محمد دستگیر خاں

نواب محسن الملک

نواب محسن الملک سید مہدی علی خاں مرحوم کی تاریخ ولادت ۹ دسمبر ۱۸۳۷ء ہے ۔ یہ اٹاوے کے مشہور سیدوں کے خاندان کے چشم و چراغ تھے ۔ ننھیالی سلسلہ ان کا ایک قدیم عباسی خاندان (شیخ پور، فرخ آباد) سے ملتا تھا، اس لئے شرافت کا اعلیٰ جوہر اور تہذیب کا گہرا شعور انھیں ورثے میں ملا تھا۔ لیکن مالی کمزوری انسانی زندگی کا وہ گھن اور مرض ہے کہ اس میں انسان اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانے سے معذور و مجبور ہوجاتا ہے اور اس کے تمام حوصلے پست اور ارادے کمزور ہوجاتے ہیں اور اکثر باصلاحیت ہستیوں کی زندگیاں اس کی نذر ہوکر رہ گئیں، لیکن وہ نادر اور مغتنم ہستیاں جنھیں قدرت کی طرف سے ہر ابتلا میں قوت برداشت اور کوہ شکن عزم کی صفات مرتفع سے مکلف بناکر بھیجا جاتا ہے وہ کسی افتاد زمانہ اور زندگی کی کسی مشکل کو اپنے ارادے اور حوصلے میں سد راہ بننے نہیں دیتیں ۔ انھیں ہستیوں میں سے محسن الملک کی ہستی تھی کہ جنھیں مالی مشکلات کی تمام دشواریاں ورثے میں ملی تھیں مگر ساتھ ہی خوش بختی یہ بھی تھی خاندان کا خاندان تعلیم و تربیت اولاد کے حسنِ انتظام اور قومی و ملی خدمات کے جذبہ سے سرشار تھا جو اس زمانے میں شرفار کی خاص وضع داری اور خصوصی صفت ہوتی تھی، چنانچہ محسن الملک کی مذہبی تعلیم کے لئے حسب دستور گھر پر ہی بندوبست عمل میں آیا اور جب ان کی خداداد ذہانت اور حصول علم سے والہانہ شغف کا پتہ چلا تو پندرہ برس

ابوالاختر۔ محمد دستگیر خاں ۔ یوسف زئی نیما ہیڑھوی (راجستھان)

کی عمر میں ہی ایک مشہور عالم عنایت حسین صاحب پھپھوندی کی شاگردی میں بٹھا دیا گیا، استاد کی کمال قابلیت اور مربیانہ شفقت اور شاگرد کی ذہانت اور طبع رسا نے انسانی اقدار اور شخصی تشخص کی شہرت دوام حاصل کر لی تھی لیکن کسی مخصوص وجہ سے یہ درس و تدریس کا سلسلہ منقطع ہو گیا مگر خداداد ذہانت ہر طرح اپنا ظہور دکھاتی ہی ہے اور ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات ہوتے ہی ہیں چنانچہ ان کی صلاحیت و ذہانت نے کسی قباحت کو بار خاطر نہ ہونے دیا اور بہر طور اپنی لیاقت و سیادت کا سکہ بٹھا دیا۔

گو خاندان میں ملازمت کو مستحسن خیال نہیں کیا جاتا تھا اور نہ پسندیدہ سمجھا جاتا تھا پھر بھی ان کے ایک عزیز سید ظہور علی صدر الصدور کے عہدے (چیف جج) پر مامور تھے اور یہ ایک زمانہ میں نواب وزیر الدولہ والئ ریاست ٹونک میں وزارت کے منصب پر فائز رہ چکے تھے، محسن الملک کی نگاہ اپنے ماحول سے ہٹ کر گرد و پیش پر پڑتی تو انھیں اپنی بے بسی و کم مائیگی کا شدید احساس ہوتا تھا۔ مجبور ہو کر دس روپے کی ماہانہ تنخواہ کی محرری پر اٹاوے میں ملازم ہو گئے۔ مگر چونکہ زمانہ کا یہ دستور چلا آتا ہے کہ جن ہستیوں کو قدرت نے معراج کمال تک پہنچایا وہ اکثر و بیشتر کچی دیواروں کے مکانوں اور پھونس کی جھونپڑیوں کے ہی رہنے بسنے والے تھے جن میں مٹی کے دیئے یا چاند کی روشنی ہی رات میں میسر ہوتی تھی اور بلا مدد غیر جو چیز قوتِ بازو سے حاصل کی جاتی ہے وہی قابل تحسین ہوتی ہے اور اسی سے اعتراف عظمت کے لئے باعظمت کی شرط بھی پوری ہوتی ہے۔ زمانہ کو کیا خبر تھی کہ یہ دس روپے کا آج کا کلرک جو مختصر سا سامان ساتھ لئے پھرتا ہے اور بوریہ نشینی کی حالت میں زندگی گذار رہا ہے کل شہرت و عظمت کے آسمان پر آفتاب بن کے چمکے گا اور اس کی زندگی قومی زندگی کے مترادف ہو گی۔ محرری کی خدمت اگرچہ ایک معمولی خدمت تھی لیکن اس کا تعلق جہاں دفتری کام اور اس کے نظم و ضبط سے متعلق ہوتا ہے وہاں مخلوق کے ساتھ حسن سلوک اور اچھے اخلاق سے پیش آنا بھی حسن کارگذاری میں داخل ہوتا ہے۔ پھر وہ زمانہ جو غیر ملکی تسلط اور انقلاب کا زمانہ تھا جس میں ہر بات کو جو کہا اور پرکھا جا رہا تھا، محسن الملک کی اعتدال پسندی نے وقت کے کلکٹر مسٹر ایلن ہیوم

کے دل میں ان کی حسن کارگزاری کا یہ تاثر پیدا کیا کہ ۱۸۵۷ء میں محرری سے اہلمدی کی خدمت پر مامور کردیا اور ڈیڑھ سال کے بعد ہی مسٹر ہیوم کلکٹر نے سررشتہ دار اور پھر پیشکار بنادیا، اور یہ ۱۸۶۱ء میں تحصیلداری کے عہدہ پر فائز ہوگئے جو زمانہ کی رفتار کے اعتبار سے عجوبہ روزگار شمار ہونے والی بات تھی جبکہ خطاب کا زمانہ نہ تھا بلکہ عتاب کا بازار گرم تھا۔ آج بھی انہی کے زمانے کی یادگاروں میں اٹاوے کی بہت سی سڑکیں اور سرکاری عمارات رفاہِ عامہ کے کام سمجھے جاتے ہیں، زمانہ تحصیلداری میں بھی محسن الملک نے انتظامی امور اور قانون دانی میں بڑی شہرت پائی اور چند مفید کتب بھی اس کی تصنیف وتالیف کیں۔ ۱۸۶۳ء میں ہائیر سٹینڈرڈ یعنی ڈپٹی کلکٹری کے درجہ کے امتحان کے مقابلہ میں جس میں انگریز بھی شریک تھے، بڑی نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اس کی بنا پر ڈپٹی کلکٹر کے خصوصی اختیارات زمانہ تحصیلداری میں ہی مل گئے۔ ۱۸۶۷ء میں وہ مرزاپور کے ڈپٹی کلکٹر بنا دیے گئے اور حسن کارگزاری میں یکتائے روزگار سمجھے جانے لگے محسن الملک کی لیاقت اور ذہانت ہی کا یہ ثمرہ تھا کہ انگریزی کی تعلیم کوئی خاص نہ ہوتے ہوئے بھی انگریزی تسلط میں نہ صرف شہرت پائی بلکہ خطاب کا مقام بھی پالیا۔

اسی شہرت کے سبب سالار جنگ کی نظر انتخاب جن کی شخصیت مردم شناسی، قدر نوازی، علم پروری کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھی، محسن الملک پر پڑی۔ چونکہ ریاست حیدرآباد کی ترقی کے پیش نظر بہت کچھ اصلاحیں ان کے زیر غور تھیں اور محسن الملک کا شہرہ عام تھا اس لیے ان کی خدمات حاصل کر لی گئیں، ادھر ان کے دل میں بھی اپنی اعلیٰ دماغی قوت کی آزمائش کے لیے وسیع میدان کی تلاش تھی۔ چنانچہ ۲۴ ستمبر ۱۸۷۴ء کو یہ انتخاب عمل میں آیا اور وہ انسپکٹر جنرل مال کے عہدے پر مامور ہوئے، پھر کمشنر بندوبست بنا دیے گئے اور سالار جنگ نے اپنا ریونیو سکریٹری بھی بنا لیا اور محسن الملک ان کے دست راست بن گئے۔ ۱۸۸۴ء میں فنانشل پولیٹیکل سکریٹری کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہوئے۔ وہ ہستی جو دس روپے ماہانہ پر گذر بسر کے لئے کل مجبور ہوئی تھی آج دوہزار آٹھ سو روپیے پاتی دکھائی دے رہی تھی اور حسن کارگزاری کے صلے میں قدر دانی کے ساتھ

منیر نواز جنگ، محسن الدولہ، محسن الملک بہادر کے خطاب مستطاب سے نوازی جارہی تھی، اسی زمانے میں ایک کان کنی کے حادثے کے مقدمہ میں جو لندن اسپشیل کمیٹی کے اندر سردار دلیر جنگ عبدالحق کے خلاف دائر تھا اس کی پیروی کو ریاست کی جانب سے بھیجا گیا اور کامیاب لوٹے جس کی وجہ سے حضور نظام کی نگاہ میں اور مقرب و محبوب بن گئے، محسن الملک کی قابلانہ پیروی اور مدبرانہ عمل سے وزیر اعظم انگلستان مسٹر گلیڈسٹون بہت متاثر ہوئے اور دونوں میں تمام عمر دوستانہ تعلقات برابر قائم رہے۔

۱۸۸۳ء میں سرسالار جنگ کا انتقال ہوگیا اور ریاست آسمان جاہ کے عہد میں سازشوں کی انجمن میں پڑگئی تو محسن الملک ۱۵ جولائی ۱۸۹۳ء کو آٹھ سو روپیہ پنشن کے ساتھ سبکدوش ہوگئے اور آزاد دل کی حکمرانی کے مالک بن گئے اور جو دماغ ریزی دوسروں کی بھلائی وبہتری کے لئے کی جارہی تھی وہ اب قومی خدمت کے لئے وقف ہوگئی۔ اس قومی خدمت کی تمہید اس طرح پڑی جبکہ سرسید احمد خاں مرحوم نے "تفسیر التوریت والانجیل" شائع کی جس پر بحث ومباحثہ کا دروازہ کھلا اور محسن الملک نے ان کی تصنیف پر انھیں مرتد تک بنا دیا مگر انھیں کیا خبر تھی کہ آج جس ہستی کو وہ مرتد ٹھہرا رہے ہیں کل اسی کے مداح بھی ہوں گے، جب ۱۸۶۳ء میں سرسید غازی پور میں چیف جج تھے اس وقت محسن الملک سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی جس کے نتیجہ میں محسن الملک کے خیالات میں سرسید کی نسبت بہت کچھ تبدیلی آچکی تھی، پھر علی گڑھ میں سید صاحب کے یہاں ان کو قیام کا موقع ملا اور قومی وملی گفتگو کی نوبت آئی اور وقتِ قیام سید صاحب کو نماز پڑھتے اور پابندِ شرع پایا تو شک وشبہات دور ہوگئے مگر جس سمت میں سرسید نماز پڑھ رہے تھے وہ سمت ان کے خیال میں کعبہ کی سمت نہ تھی۔ یہ شبہ جب ظاہر کیا گیا تو سید صاحب نے یہ آیت اینما تولوا فثم وجہ اللہ پڑھی اس پر خوب بحث ہوئی۔ بالآخر سید صاحب نے بتایا کہ یہ کوٹھی ٹھیک قبلہ رخ بنی ہوئی ہے اور کمپاس سے اس کو ثابت کرکے بتلا دیا جس سے محسن الملک بہت محظوظ ہوئے۔ پھر تو محسن الملک مرسید

کے ہر اس کام میں معین و مددگار کی حیثیت سے لگے رہے جو اس مصلح قوم نے وقت کے تقاضے کے پیش نظر شروع کیے تھے۔ محسن الملک اور سید صاحب کے تعلقات اتنے گہرے اور یگانگت کے ہو گئے تھے کہ تنگ نظروں کی نگاہ میں محسن الملک کرسٹان خیال کیے جانے لگے کیونکہ سرسید کی تحریک کو قدیم خیالات کا حامل طبقہ "مداخلت فی الدین" سمجھے ہوئے تھا۔ اور یہ امر کچھ اس زمانے کے ماحول اور طرز فکر پر محمول بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ ۱۸۶۹ء میں سرسید نے ولایت جا کر "خطبات احمدیہ" کی اشاعت کا انتظام کیا۔ اس میں محسن الملک کی مالی امداد وافر رہی جس کا اعتراف بطور احسان مندی سید صاحب کی ذات سے مظہر رہا، اور ان میں باہمی طور پر محبوب و محب کی سی صورت پیدا ہو گئی تھی جیسا کہ ولایت کی واپسی اور قیام کے حالات اور خط و کتابت سے ثابت ہے۔ "تہذیب الاخلاق" کی اشاعت اور اس کام میں محسن الملک کی سرگرمی اور دلچسپی سے بھی ظاہر ہے۔ بنارس میں ترقی تعلیم کے سلسلہ میں جو کمیٹی منعقد ہوئی تھی اس میں شرکت کی غرض سے محسن الملک بنارس وقت سے پہلے پہونچے اور شب میں تعلیم کے فارمولے پر گفتگو رات گئے تک دونوں میں ہوتی رہی۔ پھر جب وہ سونے کے لئے لیٹے تو ۲ بجے محسن الملک کی آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ سید صاحب برآمدے میں زار و قطار رو رہے ہیں، دریافت کرنے پر اور رونے لگے کہ قوم بگڑتی جا رہی ہے اور کوئی صورت سدھرنے کی نظر نہیں آتی۔ اس قومی درد اور اس کی تڑپ سے محسن الملک بہت متاثر ہوئے اور خود بھی اسی درد میں مبتلا ہو گئے۔

محسن الملک نے اٹھارہ برس حیدر آباد میں بڑی شان و شوکت سے گذارے تھے مگر اپنی درماندہ قوم کی حالت سے ان کا دل کبھی غافل نہیں رہا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ علی گڑھ کالج کی امداد میں وہ بے دریغ حصہ لیتے رہے اور ۱۸۹۳ء میں حیدر آباد سے پنشن پا کر لوٹے تو بجائے اپنے وطن مالوف کے علی گڑھ کو اپنا مستقر ٹھہرایا، اور سید صاحب کے ہر کام کو فروغ دیا، کالج کے کاموں کو سنوارا، تہذیب الاخلاق کو

دوبارہ جاری کرایا، ۱۸۹۶ء میں جو کانفرنس میرٹھ میں ہوئی اس کی کامیابی کا سہرا محسن الملک کی کوششوں کے سر تھا۔ سرسید قوم کو مردہ تصور کرتے تھے مگر محسن الملک نے اپنی کوششوں سے قوم کو زندہ ثابت کر کے دکھا دیا۔ سید صاحب کے مزاج میں کہن سالی کے باعث جو تلخی آ گئی تھی اس کے تاثرات کو رفع کرنے میں محسن الملک کا کردار ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا۔ محسن الملک کو عام طور پر مولوی ہی سمجھا جاتا تھا لیکن ۱۸۹۰ء کی کانفرنس الہ آباد اور علی گڑھ کی کانفرنس ۱۸۹۴ء اور ۱۸۹۶ء میں میرٹھ کانفرنس میں انھوں نے قومی ترقی و تنزل پر جو پرمغز اور فصیح و بلیغ تقریریں کیں، انھوں نے ان کی جادو بیانی کا سکہ ہر ایک کے دل میں بٹھا دیا تھا۔ سرسید کے انتقال اور سید محمود کے سبکدوش ہو جانے کے بعد تمام کالج کا بار محسن الملک کے کندھوں پر تھا۔ کالج باہمی چپقلش کا شکار تھا، قرضوں کے بار تلے دبا جا رہا تھا۔ ایک تو بانی کالج کی وفات اور پھر آپسی اختلاف، سخت حوصلہ شکن صورت ہو چلی تھی۔ یہ محسن الملک کی دانشمندی اور تدبر ہی کا کام تھا کہ ایسے سخت وقت میں کالج کی مالی حالت کو سدھارا اور باوجود پیرانہ سالی کالج کے ہر شعبہ میں حیرت انگیز ترقی کے کام سرانجام پائے۔ یہ محسن الملک کی مقتدر ہستی کا کارنامہ تھا کہ ولی عہد انگلستان اور شاہ افغانستان جیسے بلند پایہ لوگوں سے معقول امداد حاصل کی، اور یہ محسن الملک کا ہی کارنامہ تھا کہ کالج کی حیثیت کو فروغ دینے میں سر آغا خاں اور سر آدم جی وغیرہ معزز ہستیوں کو کالج سے وابستہ کیا۔ بعد وفات سرسید قوم کو عموماً اور خصوصاً محسن الملک وغیرہ محبانِ اردو کو جو پریشانی پیش آئی اور جس کا مقابلہ ان کے سامنے تھا وہ اردو ہندی کا ریزولیوشن جس کا محرک "سر انٹونی میکڈانل" تھا، محسن الملک جیسے شخص کے لئے یہ سوہان روح ضرور تھا لیکن بعض وقتی مصالحت اور دور رس نتائج کے پیش نظر اس بات کو باوجود بڑی اہمیت کے بادل ناخواستہ اس کو طرح دے دی تھی جسے بعض مفکروں نے محل نظر بھی بتایا تھا حالانکہ زبان کی حمایت میں انھوں نے لکھنؤ میں ایک جلسہ بھی منعقد کیا تھا اور بڑی پر زور تقریر کی تھی، محسن الملک کی دانشمندی اور کمال سوجھ بوجھ اور قوم کے اس

محسن کا وہ کارنامہ جو انھوں نے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو آل انڈیا محمڈن ڈیپوٹیشن کے وقت قوم کی تہذیب و تمدن اور وقار کو سمجھنے اور قومی حیثیت کو دنیا بھر میں تسلیم کئے جانے کی نسبت سرانجام دیا قوم میں اسم بامسمّٰی بنے ان کے اس احسان عظیم سے قوم ہمیشہ زیر بارِ احسان رہے گی اور تاریخ بھی اس امر کو بطور یادگار دہرا تی رہے گی ،

محسن الملک بہت نرم خو اور مرنجان مرنج ہستیوں میں سے تھے۔ شرافت نسبی ان کا شیوۂ زندگی تھا جو شعارِ اسلام میں ڈھلا ہوا تھا اور کچھ زمانے کا یہ دستور بھی رہا ہے کہ بعض مفسد خیال لوگ اکثر و بیشتر کسی کی شرافت سے کھیلتے بھی رہے ہیں ۔ جیسا کہ حضرت خلیفۂ سوم کا زمانہ زبان زد عام ہے ۔ چنانچہ محسن الملک کی حلیم الطبع کے نتیجے سے ان کی اواخر زندگی میں کالج کے اندر اسٹرائیک کا ناگوار معاملہ بھی پیش آیا اور سرسید مرحوم کے مشن کے خلاف جو ملک میں ایک رجعت پسند تحریک مذہبی نقطۂ نگاہ کے پیش نظر چلائی جارہی تھی اور اس میں کالج کی ہر بات کو تنکے سے شہتیر بنانے کی اسکیم بھی چل رہی تھی تو کالج کی ہر بات کو"بات کا بتنگڑ" بنایا جارہا تھا جس کی وجہ سے محسن الملک افسردہ خاطر ضرور ہوئے لیکن دل برداشتہ پھر بھی نہیں ہوئے تھے کیوں کہ بشر ہی تو تھے جن کے ساتھ بشری کمزوریاں بھی تھیں پھر سکریٹری کی کارکردگی ٹرسٹیوں کے زیرِ اثر چلتی ہے اور یہی محتاجگی بعض دفعہ ہی نہیں بلکہ اکثر و بیشتر قابل سے قابل لوگوں کی کمزوریوں کا سبب بنتی ہی رہتی ہیں وہی صورت محسن الملک کے سامنے تھی پھر محسن الملک کے دست راست میں وہ لوگ نہ تھے جو سرسید مرحوم کو میسّر تھے سب کاموں کا بار محسن الملک کے ہی کاندھوں پر تھا گویا بمصداق ؎

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ

بہر کیف محسن الملک کی بے لوث خدمات ایک وقائع نگار کی نگاہ میں ان کی خوبیوں کے مقابلے میں کمزوریاں کوئی وقعت نہیں رکھتیں اور نہ محلِ نظر ہوسکتیں وہ ایک محسنِ قوم اور بہی خواہ ہر حالت میں تھے اور نہایت محبوب و مقبول اور مقتدر و مفتخر قوم کے منفرد انسانوں میں سے تھے جن کی موت نے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک تہلکہ مچا دیا تھا ، بوجہ کثرت کار

پھر پیرانہ سالی کے انحطاط اور اعضاء کے ضعف نے نحیف جہاں بنایا وہاں مرض لاعلاج ذیابیطس کے شکار ہو گئے تھے۔ ۱۹۰۷ء میں آب و ہوا کی تبدیلی کی غرض سے بمبئی گئے اور آل انڈیا محمڈن ڈیپوٹیشن کے سلسلہ میں والسرائے ہند سے گفتگو کے لئے شملہ بھی اسی علالت کی حالت میں گئے اور کچھ آب و ہوا کی موافقت سے روبہ صحت بھی ہو چلے تھے مگر ساتھ ہی "نزلہ برعضوِ ضعیف می ریزد" مقولے کے تحت ۱۴ر اکتوبر ۱۹۰۷ء کو سرخ بادہ میں مبتلا ہو گئے جس کی وجہ سے نقاہت بہت بڑھ گئی تھی۔ دوست احباب اور یہ خود زندگی سے مایوس ہونے جا رہے تھے تو احباب کو گواہ کر کے خدا کی وحدانیت تسلیم اور تصدیق رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا اظہار کرتے تھے اور کلمہ شریف کا ورد زبان پر رہتا تھا اور یہ بیان بھی کرتے تھے کہ

> "میں نے جو کچھ قوم اور ملک کی خدمات کی ہیں وہ نیک نیتی کے ساتھ کی تھیں اگر ان میں کوئی غلطی واقع ہوئی تو اس سے میں بے قصور ہوں کیونکہ ہر کام میں میرا خلوص تھا اور غلطی میری فطرت تھی جس کا علم خدائے پاک کو ہے۔"

محسن الملک مرحوم کے اس آخری بیان اور اس کے خلوص سے ان کی پوزیشن صاف ہو جاتی ہے اور تمام شکوے شکایت دور ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ شخصیت جو قوم کے لئے رحمت خداوندی تھی چند انسانی فطری لغزشوں کی بنا پر موردالزام یا اس کا کوئی عمل و فعل محل نظر نہیں رہتا اور نہ بنایا جا سکتا۔ افسوس کہ یہ محسنِ قوم ہستی ۱۶ر اکتوبر ۱۹۰۷ء کو داغِ مفارقت دے کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ ان کی وصیت تھی کہ انھیں اٹاوے میں دفنایا جائے لیکن ان کے عزیزوں کی رضامندی اور ٹرسٹیوں کی خواہش پر اور وقار الملک وغیرہ کی رائے پر بالآخر علی گڑھ میں دفن کیا گیا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

محسن الملک نے جب سرسید مرحوم کی معاونت اختیار کی اور تہذیب الاخلاق میں ان کے مضامین شائع ہوئے تو انھیں بھی نیچری مان لیا گیا تھا۔ چونکہ محسن الملک کا

خاندان اثناے عشری تھا مگر یہ بالذات سنی عقائد رکھتے تھے، کسی سنی صاحب نے ان کے چچا سے کرسٹان ہو جانے کی خبر دی تو جواب میں ان کے چچا نے کہا تھا کہ ہم تو اسی دن روئے جس دن وہ سنی بنے تھے اب تو تمھیں رونا چاہیئے۔ اس امر سے محسن الملک کے عقائد اور مسلک کا صحیح پتہ چل جاتا ہے اور کوئی شک شبہ باقی نہیں رہتا۔ زمانے کا بھی عجیب انداز و رنگ ہے کہ جب سر سید احمد مرحوم مسلمانوں کی تعلیم اور اصلاح کی تحریک چلا رہے تھے تو رجعت پسند لوگ باوجود اس کی اہمیت و افادیت کے مخالفت پر کمر بستہ تھے اور زمانہ کی رفتار اور اس کے ڈھنگ کو بالکل نظر انداز کر کے انھیں اور ان کے رفقاء کار کو ناکام بنانے کی کوشش میں تھے مگر چونکہ اس تحریک میں خلوص اور للّٰہیت کا جذبہ کار فرما تھا اس لئے وہ نہ صرف کامیاب رہی بلکہ معراج کمال کو پہونچی اور کچھ ہی عرصہ بعد خود مخالفین نے زمانے کے دھارے کو پہچانا اور اس کی اہمیت کو سمجھا تو جس تحریک کو اور ان کے محرک بانیوں کو زندگی میں بدنام اور مطعون کیا جا رہا تھا بالآخر اس کے گن گائے جانے لگے اور ان کی زندگیوں کو سرمایۂ حیات سمجھ کے مشعلِ راہ خیال کیا جانے لگا اور بعد وفات آج بھی یہ ہستیاں دن بہ دن محبوب و مقبول ہوتی جا رہی ہیں چنانچہ اسی کے پیشِ نظر محسن الملک کی چند تصنیفات اور ان کے موضوعات کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔ اور ان کے موضوعات سے محسن الملک کے عقائد و مسلک، فہم و فراست، تدبر و دانشمندی کی صحیح نشاندہی بھی کی جا سکے گی۔ چنانچہ ان کی چند تصنیفات کا مختصراً تعارف پیش کیا جاتا ہے:

ملائکہ و حور و غلمان

اس رسالے میں محسن الملک نے حور و غلمان اور فرشتوں کی حقیقت اور ان کی کائنات کی نسبت اسلامی نظریہ و عقائد سے متعلق بحث کر کے علمائے سابقہ کے خیالات و عقائد کی روشنی میں موجودہ زمانے کے عقائد اور غلط فہمیوں کا اظہار کر کے اور پیغمبران علیہم السلام کے معجزات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

تقلید و عمل بالحدیث

یہ سات مضامین پر مشتمل رسالہ ہے، جس میں مذاہب اربعہ سے پہلے کا حال، پھر

اس کی بنیاد قائم ہونے کا سبب، اور پابندی کا زمانہ عمل، باہمی اختلافات اجتہاد اور عمل بالحدیث کا فرق، مقلد غیر مقلد پر تقلید بالحدیث اور قول فیصل بہ نسبت تقلید اور عمل بالحدیث کو اجاگر کیا ہے۔

فطرت اور قانونِ فطرت

اس میں قانونِ فطرت کے مسئلہ پر بحث کر کے اس کے صحیح مفہوم کی نشاندہی قرآن و حدیث کی روشنی میں علمائے اسلام کے نظریات سے کر کے اس کو ثابت کیا گیا ہے۔

اسلام

دین اسلام ایک دینِ فطرت ہے، اس کے فطری اصولوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ جس کے ذریعہ انسانی تہذیب و تمدن کو ہر طرح سدھار اور سنوار کر صالح معاشرہ کی بنیادیں قائم کی جا سکتی ہیں اور دین اسلام کے اصول اپنانے سے ہی مسرت بخش حضارت نصیب ہو سکتی ہے۔

کتاب المحبۃ والشوق

اس میں احیاء العلوم کے باب کتاب المحبۃ میں امام غزالیؒ نے جن حکایات سے اس کو ثابت کیا ہے انھیں محسن الملک نے اپنی تشریحات و توضیحات کے ساتھ اور مفید و موثر بنایا ہے جس سے ان کی لیاقت اور علمیت کا درجہ متعین ہوتا ہے۔

پروفیسر مشیر الحق

رہ نوردِ شوق

(ایک مکتوبی سفرنامہ)

اردو میں مکتوبی ادب کو روشناس کرانے کا سہرا غالباً غالبؔ کے سر ہے پھر بعد میں کچھ لوگوں نے اسے اظہارِ خیال کا ایک ذریعہ بھی بنا لیا جیسے قاضی عبدالغفارؔ کی "لیلیٰ کے خطوط"۔ مکتوبی ادب کا مزا یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی مصنف سے زیادہ مرتب کی شہرت ہو جاتی ہے اور وہ ہلدی پھٹکری لگائے بغیر چوکھے رنگ کا مزا اٹھاتا ہے۔ سمجھا یہی جاتا ہے کہ خط لکھنے والے یہ سوچ کر خط نہیں لکھتے کہ وہ بعد میں شائع کئے جائیں گے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ہر "بڑے" شخص کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں یہ بات پڑی رہتی ہے کہ اس کے خطوط کہیں بعد میں شائع نہ ہو جائیں۔ اس خیال کا اثر آپ کو ہر اس مطبوعہ خط میں جھلکتا نظر آئے گا جسے لکھنے والے نے بظاہر نہ چھپنے کے ارادہ سے لکھا ہوگا۔ بہرحال مختلف نوعیتوں کے نجی اور کاروباری خطوط کے مجموعے بازار میں آچکے ہیں۔ گھریلو اور سماجی تعلقات کی زندگی میں صرف ایک رشتہ ایسا ہے جہاں کاتب صفحات پر اپنا دل کھول کر رکھ دیتا ہے اس اعتماد کے ساتھ کہ وہ خلوت میں باتیں کر رہا ہے۔ چونکہ بات خلوت کی ہوتی ہے اس لیے ان خطوط میں قلبی تعلق اور بے تکلفی کی ایسی فضا ملتی ہے جو ابھی تک ادب کی کسی دوسری صنف میں نہیں دکھائی دیتی یہ خلوت کی "باتیاں" بھی چھپنے سے نہ بچ سکیں اور اردو ادب کی جلوت میں شاید سب سے پہلے "زیرِ لب" کے ذریعہ آئیں۔ زیرِ لب کی مصنفہ اپنے شوہر

ڈاکٹر مشیر الحق، پروفیسر و صدر شعبۂ اسلامک وعرب ایرانین اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

کی عاشق تھیں اور یہی فضا زیرِلب میں رچی بسی ہے ۔ لیکن رہ نوردِ شوق[1] میں معاملہ الٹا ہے ، یہاں ایک شوہر اپنی بیوی سے مخاطب ہے ۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑا فرق زمانہ کا بھی ہے۔ زیرِلب کے خطوط عمر کی اس منزل میں لکھے گئے تھے جب آتشِ نمرود میں کود جانے کے لیے خوف وخطر کی پروا نہیں کی جاتی ۔ اس کے برعکس رہ نوردِ شوق اس وقت کی یادگار ہے جسے ٹھہراؤ کی منزل کہتے ہیں ۔ ہمارے "اردو معاشرہ" کی پرورش کچھ اس نہج پر ہوئی ہے کہ یہاں اظہارِ محبت کو عمر کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے اور بزرگی کا رکھ رکھاؤ ہر ہر قدم پر پہرہ بٹھائے رکھتا ہے ۔ تاہم کبھی کبھی کوئی نہ کوئی بزرگ ایسی مثال قائم کر جاتا ہے جس کے بغیر اردو ادب بہت حد تک تہی مایہ رہ جاتا ۔ ۱۹۶۸ میں جب ۷۶ سالہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی رفیقۂ حیات نے ۵۲ سال کی رفاقت کو ذرا سی آنکھ موند کر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تو اپنی "عقل" اور "سال" دونوں کی بزرگی کے باوجود عاشق عبدالماجد نے اپنی "محبوبہ" کا جس انداز سے ماتم کیا وہ اپنی مثال آپ ہے ۔ میں نے یہ ماتمی تحریر نہ پڑھی ہوتی تو رہ نوردِ شوق کو پڑھ کر مجھے حیرت ہوتی اس وجہ سے نہیں کہ عابد صاحب خط نہیں لکھ سکتے تھے ، بلکہ اس وجہ سے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ عمر کی آخری منزل پر پہونچ جانے کے بعد بھی ایک شخص اپنی بیوی کو خط لکھتے وقت حال کے بجائے ماضی کے اجالے میں چلا جائے ۔ رہ نوردِ شوق در اصل اسی کیفیت کی ایک دستاویز ہے ۔

۱۹۶۷ میں عابد صاحب نے چند ماہ کے لئے یوروپ و امریکہ اور شرق اوسط کے بعض ممالک کا دورہ کیا تھا ، اس سفر کا مقصد یہ تھا کہ وہ ان ملکوں کے اہلِ علم وفکر سے تبادلۂ خیال کر کے اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی کے قیام کے امکانات کا جائزہ لے سکیں ۔ ۳۰ مارچ ۱۹۶۷ کو وہ دہلی سے روانہ ہوئے اور ۱۴ جولائی کو دہلی واپس آگئے ۔ گویا کل ۳½ ماہ وہ گھر سے باہر رہے جس میں سے اچھا خاصا وقت فضا میں گزر گیا اس کے

---

[1] رہ نوردِ شوق (سفرنامہ) از ڈاکٹر سید عابد حسین ، مرتبہ صالحہ عابد حسین ، صفحات ۱۴۴ ، نومبر ۱۹۷۹ء قیمت ۱۴ روپے پچاس پیسے ، ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔ جامعہ نگر ۔ نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۲۵

باوجود انھوں نے ہر ہر منزل سے اپنی شریک حیات کو خط لکھے جن کی تعداد ۲۵ تک پہونچ گئی۔ یہ خطوط عابد صاحب نے اس غرض سے لکھے تھے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی شریک سفر کو اپنا حالِ سفر دکھا سکیں۔ اس طرح یہ خطوط ادبی شہ پارہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسے سفرنامہ کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں جس میں مغربی اور وسطی دنیا کے نامور اہلِ علم و فکر سے ہماری ملاقات ہوتی ہے۔ ان ملکوں کی معاشرتی زندگی کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور اس پر مستزاد عابد صاحب کا بیان!

وہ نورِ دیشوق کے ہر خط میں بے تکلفی اور بانعلقی کی ایک خاص فضا ہے۔ ۱۲ مارچ کو دلّی سے چلتے ہیں تیسرے دن بمبئی سے لکھتے ہیں "... ابھی تک گھر کی اور گھر والی کی یاد دن رات ساتھ رہتی ہے۔ میں نے چاہا کہ بمبئی تک پہونچا کر واپس چلی جائے مگر وہ نہیں مانتی، بغیر ٹکٹ بغیر پاسپورٹ اور دوسرے لوازمات کے ساتھ سارے سفر میں ساتھ رہنے پر مُصر ہے، بتائیے کیا کروں؟" ——— ۳ اپریل کو قاہرہ سے یہ اطلاع دی کہ بمبئی میں آپ کا خط ملا جس میں دیدہ و دل ملفوف تھے۔ سچ مچ آپ کے دیدہ و دل میرے ہمراہ ہیں۔ آپ ہی کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں اور آپ ہی کے دل سے محسوس کرتا ہوں۔" ہوائی جہاز کا سفر ویسے تو بہت اچھا ہوتا ہے لیکن جب آپ کسٹم اور پاسپورٹ کے مراحل سے گذر کر انتظار گاہ میں آجائیں اور جہاز کا دور دور پتہ نہ ہو تو اس وقت کی کیفیت انھیں نہیں بتائی جاسکتی جن پر یہ عالم بیتا نہیں ہے۔ اس کیفیت کو عابد صاحب کے الفاظ میں سنئے۔ (اعزہ) مجھے سنتا کروز کے ہوائی اڈے پر کسٹم کے سپرد کر کے چلے گئے۔ وہاں صرف پاسپورٹ دیکھا گیا اور دومنٹ میں چھٹی ہو گئی۔ اب آدھی رات ادھر، آدھی رات اُدھر، مسافروں کا ہجوم اور ہجوم میں تنہائی کا احساس۔ جہاز کا انتظار اور جہاز کا کہیں پتا نہیں۔" جب خدا خدا کر کے جہاز روانہ ہوا تو جہاز کے پرسر (منتظم سامان خورد و نوش) جن سے عابد صاحب کا بمبئی میں تعارف کرا دیا گیا تھا، رات بھر خاطر مدارات کی کوشش کرتے رہے یعنی عرق انگور جو فرسٹ کلاس کے مسافروں کو مفت، اکانومی کلاس کے لوگوں کو قیمتاً ملتا ہے مجھے تحفے کے طور پر باصرار

پیش کرتے رہے مگر میں ایسا بدتوفیق اور بدمذاق کہ اس کے بدلے کوکو کولا پر قناعت کی۔"
قاہرہ ایرپورٹ پر انھیں امید تھی کہ ڈاکٹر کلووس مقصود (عرب لیگ کے انچارج) خود یا ان کا کوئی آدمی یا پیام موجود ہوگا" مگر اے دلِ زار یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں، کا عالم تھا۔ ایرانڈیا کی بس میں ایرانڈیا کے دفتر کو سوا سات بجے پہنچا مگر وہاں ایک حمال کے سوا کوئی نہ تھا اور وہ انگریزی بس اتنی سمجھتا تھا کہ اگر بالکل نہ سمجھتا تو بات بالکل نہ الجھتی اس لئے کہ ہوتی ہی نہیں۔ پہلے اس سے اور پھر دوسرے حمال سے سوا دو گھنٹے بات کی ڈوری الجھتی رہی"۔ اسی سلسلے میں ایک دوسرا لطیفہ یہ پیش آیا کہ ہندوستانی سفارت خانہ کے کلچرل اتاشی جنھیں وزارت خارجہ کی ہدایت کے مطابق عابد صاحب کا استقبال کرنا تھا وہ اپنی جگہ عابد صاحب کی تلاش میں سرگرداں تھے کیونکہ ان کے پاس ہوائی اڈے سے ایک مسٹر حسین کا فون آیا یہ بیچارے ان کو ڈاکٹر عابد حسین سمجھ دوڑے ہوئے پہنچے اور ان کی بڑی خاطر مدارات کی مگر تھوڑی دیر بعد محسوس ہوا کہ وہ سب ضائع ہو گئی اس لئے کہ وہ غلط حسین تھے۔" انقرہ (ترکی) میں ایک ٹیکسی روکی اور اس سے بات کرنا چاہا تو 'زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم' کا مصرعہ اس صورتِ حال پر لفظ بلفظ صادق آیا۔"

عابد صاحب جن دنوں مانٹریال میں تھے ہندوستان میں ذاکر صاحب کی صدارت کا الکشن ہو رہا تھا۔ یہ دونوں تمام عمر کے دوست تھے، نتیجہ کی فکر عابد صاحب کے دل سے لگی ہوئی تھی۔ جس دن الکشن ہونے والا تھا اس دن کے خط میں انھوں نے لکھا" ذاکر صاحب کا الکشن یہاں کے وقت کے لحاظ سے آج آدھی رات کے کچھ دیر بعد شروع ہوگا، یہاں غالباً کل دوپہر تک ورنہ شام تک نتیجے کی خبر آئے گی۔ اب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ

حسبی اللہ ونعم الوکیل ۔ نعم المولی ونعم النصیر

کی تسبیح پڑھی جائے سو وہ دل ہی دل میں پڑھ رہا ہوں" اور جب انھیں نتیجہ معلوم ہوگیا تو فوراً مبارکباد کا تار بھیجا، مرشد (ڈاکٹر ذاکر حسین) کو جو تار میں نے بھیجا تھا اس کا مضمون صرف اتنا تھا ALHAMDAULELLAH (الحمد للہ)۔ اب میں نے مرشد کو لکھا ہے کہ وہ تار

در اصل اللہ میاں کے نام تھا آپ کو تو صرف اس کی نقل بھیجی تھی۔"

کتاب کے ابتدائی ۴۳ صفحات پر عابد صاحب کی زندگی کی ایک جھلک مرتب کتاب نے "ہم سفر" کے عنوان سے پیش کی ہے علاوہ ازیں سفر کی مناسبت سے ہم سفر میں بیگم عابد حسین نے ڈاکٹر صاحب کے اس سفر جرمنی کی داستان تفصیل سے سنائی ہے جو انھوں نے اپنی شریک حیات کے ساتھ ۱۹۵۳ء میں کیا تھا "نامہ ہائے سفر" عابد صاحب کے قلم سے ہے تو "ہم سفر" ان کی بیگم کے قلم سے ـــ وہ سفر سمندری جہاز سے ہوا تھا۔ میاں بیوی دونوں جہاز کے کھانے پینے سے پریشان تھے۔ عابد صاحب کو تو خیر کھانا ناپسند تھا مگر بیگم کو گوشت کی بو ناپسند "پھر ذبیحہ نہ ہونے کا اندیشہ۔ مرغی مچھلی میں کبھی کھاتی نہیں تھی۔ بیچارا لمبا تڑنگا اطالوی ویٹر بہت رنجیدہ ہوتا تھا کہ مادام کچھ کھاتی نہیں اور موسیو پیتے نہیں، مفت کی شراب کو بھی، جو قاضی کو بھی حلال ہوتی ہے، یہ ماڈرن ڈاکٹر ہاتھ لیعنی منہ نہ لگاتا تھا۔" سمندر ہی میں عید الضحیٰ کا دن آگیا۔ "علی الصباح عابد صاحب سیاہ گرم اچکن، سفید آڑا پاجامہ اور سفید گاندھی کیپ (جو وہ ہمیشہ ترچھی لگاتے تھے) پہن کر نماز عید کے لئے تیار ہوگئے ...۔ عرشے پر آئے تو فرسٹ کلاس اور ٹورسٹ کلاس کے سبھی مسلمان حضرات اپنے قومی لباس میں اور عورتیں قیمتی ساڑھیوں میں ملبوس موجود تھیں۔ عرشے کے ایک کونے میں نمازِ عید ادا کی گئی۔ عورتیں خاموش سر جھکا کر پیچھے کھڑی ہوگئیں۔ فرسٹ کلاس کے "محمود" اور ٹورسٹ کے "ایاز" سب ایک ہی صف میں اپنے خالق کے حضور میں عید کا دوگانہ ادا کر رہے تھے اور جہاز کے دیگر مسافر حیرت سے یہ دلکش اور بارعب عبادت دیکھ رہے تھے۔ نماز کے بعد سب لوگ گلے ملے اور پھر سب "محمود" اپنے درجے میں اور سارے "ایاز" ادھر رہ گئے۔"

نامہ ہائے سفر (ص ۴۴ تا ۱۰۹) کے بعد "بدیسی ملکوں کا سفر" (ص ۱۱۰ تا ۱۳۲) کے عنوان سے بیگم صالحہ عابد حسین نے اس انگریزی روداد کا ترجمہ شامل کر دیا ہے جو سفر سے واپس آنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے لکھی تھی۔ اس روداد میں انڈونیشیا اور ملیشیا کے سفر کے حالات بھی آگئے ہیں جو انھوں نے یورپ سے واپسی کے فوراً بعد کیا تھا اور وہاں سے جو خطوط انھوں نے اپنی بیگم کو لکھے تھے وہ "خطوط کے ڈھیر میں کہیں

کھو گئے ۔"

خطوط کا یہ مختصر سا مجموعہ صرف ادبی حیثیت ہی نہیں رکھتا بلکہ یہ ایک تاریخی دستاویز بھی ہے، یہ ایک عالم اور مفکر کا سفر نامہ ہے جس کی معیت میں ہم گھر بیٹھے قاہرہ، تہران، بیروت، دمشق، انقرہ، استنبول، لندن، مانٹریال، ہملٹن (امریکہ) نیو ہیون، نیو یارک، پرنسٹن، واشنگٹن، فلاڈلفیا، لائیڈن (ہالینڈ) پیرس، بون (جرمنی) ہائیڈل برگ، میونخ، کراچی، لاہور، اسلام آباد، کوالا لمپور، جکارتا، غرضیکہ تقریباً "تیس شہروں اور بارہ (بلکہ چودہ) ملکوں کا دورہ" کر سکتے ہیں۔ یہاں کی مشہور درسگاہوں اور علمی اداروں کو اندر سے دیکھ سکتے ہیں۔ اور علماء اور مفکرین کو باتیں کرتے سن سکتے ہیں۔

اپنے معنوی حسن کے ساتھ ساتھ آفسٹ کے ذریعہ چھپی ہوئی مجلد کتاب اپنے ظاہری حسن میں بھی مکتبہ جامعہ کی بہترین طباعتی روایات کی حامل ہے۔

اکا دکا نقطے اور شوشوں کی غلطیاں رہ گئی ہیں، جس کے معنی بہرحال بدل جاتے ہیں (مثلاً: اضع بجائے تواضع، ص ۵۴: SHITE بجائے SUITE ص ۵۰؛ ص ۱۱ پر کہیں پونا اور کہیں پولنے؛ ص ۶ پر نیچے سے تیسری سطر میں "مستقبل" کے بجائے "ماضی"؛ کینٹول (اسمتھ) کے بجائے ص ۸۵ پر کینیمول اسمتھ اور ص ۱۱۵ اور ۱۲۰ پر کینمول اسمتھ؛ ص ۱۱۲ پر پروفیسر نکولا زیادے کا املا ایک جگہ نکولا زیاں اور دوسری جگہ نکولایاں؛ ص ۱۲۶ کی پہلی سطر میں "حقیقت" کے دائیں بائیں دونوں طرف "یہ"؛ ص ۱۲۷ پر پلان کے بجائے پلین) بہرحال یہ چھوٹی چھوٹی "نظر چوک" غلطیاں ایسی ہیں جن سے کوئی بھی کتاب خالی نہیں ہوتی۔ مگر کاغذات کو ترتیب دینے میں ایک الٹ پلٹ ایسی ہو گئی ہے جس کی تصحیح بہت ضروری ہے۔ ص ۱۱۵ کی ابتدا "کالگیٹ یونیورسٹی میرے دوست پروفیسر کینمول اسمتھ کی قائم کی ہوئی ہے" کے بجائے "میکگل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز (مانٹریال) میرے دوست پروفیسر کینٹول اسمتھ کا قائم کیا ہوا ہے" ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح ص ۱۱۴ پر مرتب کا نوٹ موجودہ صورت کے بجائے حسب ذیل شکل میں

ہونا چاہئے تھا۔

"رپورٹ کا ایک کاغذ غائب تھا اس لئے مشرق سے (امریکہ کی طرف روانگی اور مانٹریال یونی ورسٹی جانے" کے بجائے) لندن کی طرف روانگی اور وہاں کی ملاقاتوں کا حال رہ گیا۔ لیکن خطوط کے سفرنامے میں اس کا حال موجود ہے ("مانٹریال سے وہ کالگیٹ یونی ورسٹی گئے" کے بجائے) لندن سے وہ مانٹریال گئے۔ وہاں کے حالات سے یہ حصہ شروع ہوا ہے۔"

کتاب مرتب اور مصنف دونوں کی تصویروں سے مزین ہے، اور ایک بار پڑھ کر رکھ دینے کے بجائے بار بار پڑھنے اور ہر بار نیا لطف اٹھانے کو جی چاہتا ہے۔

اسلام اور عصر جدید

زیر تبصرہ "رہ نوردِ شوق" کے آخر میں سہ ماہی رسالہ "اسلام اور عصر جدید" کا، جس کے لیے اس کے ایڈیٹر سید عابد حسین صاحب نے ۱۹۶۷ء میں دنیا کا سفر کیا تھا، پہلا اداریہ شائع کیا گیا ہے (دیکھئے صفحات ۱۳۳-۱۴۴) اس کے دوسرے پیرے میں عابد صاحب نے لکھا ہے کہ:

"اسلام کو اپنی تاریخ میں کئی قدیم اور اعلیٰ درجے کے متمدن معاشروں سے سابقہ پڑا۔ اس نے ان پر اثر ڈالا اور ان کا اثر قبول کیا مگر اس طرح سے کہ اس کی اپنی بنیادی خصوصیات قائم رہیں، مگر عصر جدید سے اس کا سابقہ بحرانی نوعیت کا ہے اور یہ خطرہ بے جا نہیں کہ اگر اس نے پوری احتیاط سے کام نہ لیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ عصر جدید کی ٹکر سے اس کی اپنی ماہیت ہی بدل جائے" عابد صاحب کی وفات کے بعد اردو کا یہ رسالہ اور انگریزی کا رسالہ "اسلام اور ماڈرن ایج" دونوں سہ ماہی رسالے جامعہ سے شائع ہوتے ہیں۔

تفصیلات اور نمونے کے لیے لکھئے:

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰

عبداللطیف اعظمی

عابد صاحب پر سیمینار — ایک رپورتاژ

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کو اردو کے منفرد ادیبوں اور ممتاز دانش وروں میں بلند مقام حاصل ہے اور جامعہ ملیہ کے ان چند برگزیدہ استادوں اور مخلص حیاتی اراکین میں سے تھے جن کا جامعہ کے معماروں میں شمار ہوتا ہے۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۷۸ء کو ان کے انتقال کو ایک سال ہوگیا، اس لیے جامعہ کے شعبۂ اردو میں ان کی پہلی برسی منانے کے لیے ۲۲ فروری کو ان کی علمی و ادبی اور قومی و تہذیبی خدمات پر ایک روزہ سیمینار منعقد ہوا جس میں اردو کے مشہور ادیبوں اور دانش وروں نے تقریریں کیں اور خطبات اور مقالے پڑھے۔ سیمینار کے تین اجلاس تھے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب نے کی، دوسرے کی صدارت پروفیسر آل احمد سرور نے اور تیسرے کی پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اور کرنل بشیر حسین زیدی صاحب نے سیمینار کا افتتاح فرمایا۔

شعبۂ اردو کے پروفیسر اور صدر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب نے مہمانوں اور حاضرین جلسہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کے بارے میں فرمایا کہ:

"وہ ایک سچے مسلمان، ایک مخلص محب وطن، ایک خوش مذاق ادیب، ایک روشن ضمیر مفکر، ایک شفیق اور ہر دلعزیز معلم اور جیّد عالم تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک سچے اور کھرے انسان تھے اور ایسا دل رکھتے تھے جو صدق و صفا، مہر و وفا اور دردمندی و انسان دوستی کی دولت سے مالا مال تھا، وہ اُس معنی میں ایک جامع حیثیات شخصیت تھے جس معنی میں حالی نے اس ترکیب کو غالب، فیضی اور خسرو کے تاریخی تناظر میں دیکھا تھا۔ عابد صاحب کی علمی و ادبی زندگی موجودہ صدی کے بڑے حصے پر محیط ہے۔ جس طرح مرجان طوفان میں

پرورش پاتا ہے، قوم پرستی اور تحریک آزادی کی موج خیزیوں کے زمانے میں، عابد صاحب کے ذہن کی نشوونما ہوئی یہاں کی تربیت اور ذوق کی جلا میں مشرقی اور اسلامی علم و ادب کے ساتھ ساتھ مغربی فکر و فلسفہ کا بھی ہاتھ تھا، انھوں نے جرمنی سے فلسفے میں ڈاکٹریٹ حاصل کی اور ۱۹۲۶ء میں اپنی پوری زندگی جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے قومی اور غریب تعلیمی ادارے کی خدمت میں کھپادی۔۔۔" اپنے استقبالیہ خطبے کے آخر میں نارنگ صاحب نے فرمایا کہ: "عابد صاحب کی شخصی اور نجی زندگی اگرچہ طرح طرح کی بیماریوں، دکھوں اور تکالیف کا مقابلہ کرتے ہوئے گزری، لیکن حرف شکایت ان کی زبان پر کبھی نہیں آیا۔ بیس برس سے بھی زیادہ مدت تک مجھے ان سے ذہنی قربت حاصل رہی ہے اس زمانے میں کیسے کیسے مصائب انھوں نے جھیلے اور کیسی کیسی مشکلوں کا سامنا کیا، لیکن میں نے انھیں کبھی دل شکستہ اور مایوس نہیں دیکھا اور مشکل سے مشکل وقت میں بھی انھوں نے صبر و ثبات اور عزم و استقلال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ان کی رجائیت پسندی نے، جو در اصل سچی لگن تھی، ان کی زندگی میں دکھ درد کے تاریک گوشوں کو بھی ہمیشہ روشن رکھا اور اب جو اس دنیا سے گزرے ایک سال ہو گیا ہے، جامعہ ملیہ کے تعلیمی ادبی دور کا، جس کا ایک روشن نام ڈاکٹر سید عابد حسین بھی تھا، ایک تابناک باب ختم ہو گیا، ایک ورق پلٹ گیا:

کچھ ہوا تیز تھی، کھلی تھی کتاب
ایک پچھلا ورق پلٹ آیا

اس کے بعد کرنل بشیر حسین زیدی صاحب نے سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ: "ڈاکٹر عابد حسین مرحوم اوصاف و محاسن کا ایک پر وقار مجموعہ تھے۔ عالم، معلم، مفکر، دانشور، محب وطن، ممتاز اہل قلم، بلند پایہ مترجم، مگر ان سب صلاحیتوں اور کمالات سے بڑھ کر وہ ایک عظیم انسان تھے۔" اپنے افتتاحی خطبے کے آخر میں زیدی صاحب نے فرمایا کہ: "افسوس کہ ایوان جامعہ کا ایک گراں قدر ستون گر گیا۔ پرانے بزرگوں میں اب صرف مجیب صاحب کی ذات باقی ہے، خدا انھیں

مدتوں ہمارے درمیان قائم رکھے اور جامعہ ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی۔ ۱۹۴۶ء میں سلور جوبلی کے موقع پر اگر وہ چاندی تھی تو اگلے برس جب ڈائمنڈ جوبلی آئے تو وہ ہیرا بن کر چمکے اور ایک ایسا تعلیمی ادارہ ہو، جہاں طالب علم درس و تدریس کے علاوہ انسانیت، تہذیب، روشن خیالی، وسیع النظری، اخلاق، حب وطن اور خدمت خلق کا سبق سیکھیں کہ یہی عابد حسین کی دلی تمنا اور عمر بھر کی کوششوں کا مقصود تھا۔"

افتتاحی خطبے کے بعد کالج کے پرنسپل اور فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ سائنسز کے ڈین جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اور شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں عابد صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا اور ان کے ایثار و قربانی کا تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد ان کی مخلصانہ اور شاندار خدمات کو سراہا۔ مرحوم سے ضیاء صاحب کے تعلقات بہت دیرینہ اور مخلصانہ تھے، ان کو جامعہ لانے میں مجیب صاحب کے علاوہ عابد صاحب کا بھی بڑا حصہ تھا اور ان کی باہمی ملاقات قریب قریب روزانہ ہو جاتی تھی، کبھی ٹہلتے وقت ساتھ ہو جاتا اور کبھی ضیاء صاحب عابد صاحب کے گھر چلے جاتے، ان ملاقاتوں میں ملی و قومی مسائل، جامعہ کے انتظامی و تعلیمی امور، ملکی و بین الاقوامی سیاسیات اور مسلمانوں کے علمی و مذہبی موضوعات پر گفتگو رہتی۔ ان دونوں دانشوروں کے خیالات میں بڑی حد تک یکسانیت اور ہم آہنگی تھی، ان کے تعلقات پر اس سے اور زیادہ مہر تصدیق ثبت ہو گئی کہ عابد صاحب نے اپنی زندگی کے آخری حصے میں جو دو سہ ماہی رسالے، ایک اردو میں "اسلام اور عصر جدید" اور دوسرا انگریزی میں "اسلام اینڈ ماڈرن ایج" نکالے تھے، اب یہ دونوں رسالے ضیاء صاحب کی ادارت میں نکل رہے ہیں۔ ضیاء صاحب کی ادارت میں آنے کے بعد، اس کے پہلے اداریہ میں عابد صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ: "عابد صاحب ہمارے بزرگ تھے، ایسے بزرگ کہ وہ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم زندگی کی دھوپ میں تنہا کھڑے ہیں اور کوئی شجر سایہ دار نہیں جس کی چھاؤں میں پناہ لیں۔" جامعہ کی خدمات کے سلسلے میں لکھا ہے کہ: "جامعہ ملیہ اسلامیہ کو بنانے اور

باوجود اس کے کہ جامعہ چھوٹی تھی، اسے اعلیٰ معیار کی درس گاہوں کا مرتبہ دینے میں عابد صاحب کی علمی کاوشوں کا بہت زیادہ دخل تھا۔ ان کی تصنیفات و تالیفات، ان کے ترجموں اور ان کے قلم سے نکلے مقالوں اور مضمونوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔" آگے چل کر فرماتے ہیں کہ: "عابد صاحب مسلمانوں کے ذہنی جمود و افسردگی اور ان کے شدید احساسِ کمتری کی طرف سے بہت متفکر اور مضطرب رہتے تھے۔ مجھے اکثر وہ اپنی اس فکرمندی اور اضطراب میں شریک کرلیا کرتے اور کہتے کہ جس ملت کے پاس اسلام کی شکل میں خدا کا وہ عالم گیر پیغام موجود ہے جس نے تاریخ کے اس عہد میں جب مغرب میں ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا، ایک عظیم الشان تہذیب کی بنیاد ڈالی تھی، وہ کیوں آج اپنے آپ کو اس طرح بے چارہ، کمتر اور مجبور سمجھتی ہے ....." کچھ ایسے ہی الفاظ اور خیالات تھے جن کے ذریعہ ضیاء صاحب نے مرحوم عابد صاحب کو اپنا خراجِ عقیدت پیش کیا۔

اگرچہ افتتاحی اجلاس میں مقالات کا پروگرام شامل نہیں تھا مگر چونکہ اگلے اجلاس کی صدارت پروفیسر آلِ احمد سرور کو کرنی تھی اس لیے ان کا مقالہ "عابد صاحب — ایک دانشور" اسی اجلاس میں پڑھا گیا۔ سرور صاحب ان چند مخصوص لوگوں میں سے ہیں جن کے جامعہ کے اربابِ حل و عقد سے گہرے روابط تھے اور ان میں سے مجیب صاحب سے، جو ہماری خوش قسمتی سے ابھی حیات ہیں، ویسے ہی مخلصانہ تعلقات ہیں، جیسے ذاکر صاحب اور عابد صاحب سے تھے، اس لیے قدرتی طور پر انھوں نے اپنے مقالے کا آغاز ان تینوں بزرگوں کے ذکرِ خیر سے کیا۔ عابد صاحب کے ایک مضمون "سچا افسانہ" کے اقتباس کے بعد جس میں چند ہندوستانی نوجوانوں کا ذکر ہے جو اس وقت وسطِ یورپ کے ایک مشہور شہر میں زیرِ تعلیم تھے، انھوں نے فرمایا کہ: "یہ چند نوجوان ذاکر حسین، عابد حسین اور محمد مجیب تھے، جن کی کوششوں سے جامعہ ملیہ کا خواب حقیقت بنا اور جنھوں نے اپنے خونِ جگر سے قومی تعلیم کے اس تجربے کو وہ کامیابی اور شہرت عطا کی کہ ہندوستان کے اہلِ نظر اور بیرونِ ہندوستان کے اربابِ بصیرت نے اس کی

معنویت اور قدر و قیمت کا اعتراف کیا۔" عابد صاحب کی دانش وری کے سلسلے میں فاضل مقالہ نگار نے فرمایا کہ: "ان کے سارے کارناموں کو ذہن میں رکھا جائے تو جو پہلو سب سے نمایاں نظر آتا ہے وہ دانش وری کا ہے۔ اردو میں دانشوری کی روایت سرسید اور ان کے رفقا کے یہاں ملتی ہے، بیسویں صدی میں یہ ابوالکلام آزاد، محمد علی، نیاز فتحپوری اور اقبال سے ہوتی ہوئی جامعہ کے ارکان ثلاثہ یعنی ذاکر صاحب، عابد صاحب اور مجیب صاحب تک پہنچی ہے، ان تینوں میں عابد صاحب کی اہمیت مسلّم ہے۔"

مقالے کے آخر میں سرور صاحب نے جامعہ کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ "جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اربابِ اختیار کو یہ سوچنا ہے کہ کیا وہ جامعہ کو دوسرے اداروں کی طرح ایک ادارہ بنانا چاہتے ہیں یا اس سے ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی رہنمائی کا کام لینا چاہتے ہیں۔ اگر وہ جامعہ کی تاریخ پر اور اس کے مخصوص رول پر غور کریں تو یہ بات واضح ہوجائے گی کہ پہلا کام آسان ہے اور دوسرا مشکل مگر کرنے کا کام دوسرا ہی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ایک طرف اچھا اور سچا مسلمان بنانا اور اچھا انسان بنانا، دوسری طرف اسے ہندوستانی تہذیب، تاریخ اور قومیت کے ورثے پر فخر کرنا سکھانا، تیسرے جدید دور میں اپنے لیے راستہ نکالنا اور اسلام اور سوشلزم کے باہمی رشتے کو سمجھنے میں اس کی مدد کرنا، یہی میرے نزدیک اس وقت سب سے اہم کام ہے، یہی ذاکر صاحب اور عابد صاحب کا کام ہے، عابد صاحب تو غالب کی زبان میں کہہ رہے ہیں:

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی نگرانی میں تیار کیا تھا' اس لیے انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں عابد صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ: "میرے یہ معروضات نہ خطبۂ صدارت کے ذیل میں آتے ہیں اور نہ ان کی حیثیت ایک تنقیدی مقالے کی ہے۔ گرۂ نیم بازیر ایک قرض تھا جسے میں عابد صاحب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے ادا کرنا چاہتا

ہوں، آپ چاہیں تو اسے خراجِ عقیدت کہہ لیں، اگرچہ سعدی شیرازی کے الفاظ میں یہ بھی خوب جانتا ہوں کہ

سلطاں نخواہد خراج از خراب

اس ایک روزہ سیمینار میں جو مقالے پڑھے گئے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ عابد صاحب ایک دانشور	پروفیسر آل احمد سرور
۲۔ عابد صاحب، گھر میں	بیگم صالحہ عابد حسین
۳۔ "ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں"	سید شہاب الدین دسنوی
۴۔ عابد صاحب اور مسلمانوں کے مسائل	سید حامد
۵۔ عابد صاحب کا طرز فکر	ڈاکٹر وحید اختر
۶۔ عابد صاحب کی مذہبی فکر	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی
۷۔ عابد صاحب کی صحافت نگاری	عبد اللطیف اعظمی
۸۔ عابد صاحب میرے استاد	خواجہ حسن نظامی ثانی
۹۔ عابد صاحب کے ادبی تصورات	ڈاکٹر شمیم حنفی
۱۰۔ ڈاکٹر عابد حسین بحیثیت طنز نگار	ڈاکٹر مظفر حنفی
۱۱۔ ڈاکٹر عابد صاحب کی شاعری	حنیف کیفی

پروفیسر مسعود حسین صاحب، سابق شیخ الجامعہ، نے عابد صاحب کے اسلوب پر لکھا تھا مگر وہ کسی وجہ سے تشریف نہ لاسکے، اس کے علاوہ حسب ذیل مقالے، وقت کی تنگی کی وجہ سے، خود فاضل مقالہ نگاروں کی اجازت سے پڑھے نہیں جا سکے:

۱۔ عابد صاحب کا تہذیبی شعور	پروفیسر گوپی چند نارنگ
۲۔ عابد صاحب بحیثیت مترجم	ڈاکٹر محمد ذاکر
۳۔ عابد صاحب اور جامعہ ملیہ	ڈاکٹر صغریٰ مہدی

امید ہے کہ یہ مقالات کتابی صورت میں شائع ہوں گے۔

مولانا محمد علی نمبر حصہ دوم ـــــ چند رائیں

جامعہ کے مولانا محمد علی نمبر حصہ دوم کے بارے میں چند قارئین جامعہ نے اپنی رائیں بھیجی ہیں، ان کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

پروفیسر نورالحسن ہاشمی (لکھنؤ)

رسالہ جامعہ کا مولانا محمد علی نمبر حصہ دوم بھی آپ نے بہت خوب نکالا۔ سب بڑے کام کے مضامین آپ نے جمع کر دئے ہیں، اب یہ دونوں نمبر ملاکر مولانا مرحوم کے حالات زندگی اور کارناموں پر ایک دستاویزی کتاب کے طور پر سمجھے جائیں گے، آئندہ انھیں آپ کتاب کی صورت میں مکتبہ جامعہ سے شائع بھی کروا سکتے ہیں۔

حکیم محمد حسین خاں شفا رام پوری (رام پور)

جامعہ کا محمد علی نمبر حصہ دوم ملا، آپ کی تحقیق و تلاش نے حقیقت میں اسے لاثانی بنادیا مگر اس میں آپ بہت کم نظر آرہے ہیں۔

مولوی عبدالرحمان ناصر اصلاحی جامعی (سرائے میر، اعظم گڑھ)

کل ماہنامہ جامعہ کا دوسرا محمد علی نمبر ملا، مضامین سب اچھے ہیں، مگر مولانا شوکت علی مرحوم کا مضمون بہت ہی "پرشوکت" اور "بھرپور زندگی" کا حامل ہے، بہت پسند آیا۔ "مصنوعی" مضامین کے درمیان جب کوئی زندہ مضمون مل جاتا ہے تو بس مزا آجاتا ہے۔ بعض لوگ جامعہ پر الزام لگاتے تھے کہ خیالات کے اختلاف کی وجہ سے، اس نے

مولانا محمد علی مرحوم کو بالکل بھلا دیا ہے مگر اس نے ماہنامہ جامعہ کے دو شاندار نمبر نکال کر ان معترضین کرام کو بڑا مسکت جواب دیا ہے، کیا ہی اچھا ہو اگر ان دونوں نمبروں کے منتخب مضامین کتابی صورت میں شائع کر دیے جائیں۔

ظہیر علی صدیقی (رام پور)

آپ کی عنایت سے جامعہ محمد علی نمبر حصہ دوم، جنوری و فروری ۱۹۸۰ء ملا۔ شکریہ!
ابھی کل تین مضامین پڑھے ہیں۔ (۱) مولانا محمد علی کی ابتدائی زندگی: مولانا شوکت علی۔ (۲) مولانا محمد علی پر پہلا مضمون: تحقیق حکیم محمد حسین خاں شفا اور (۳) بیگم محمد علی کے خطوط۔

مولانا شوکت علی نے ایک جگہ لکھا ہے:

"چنانچہ فروری ۱۹۰۲ء میں اس [محمد علی] نے رام پور سے استعفیٰ دے دیا۔" ص ۳۷

مولانا محمد علی کا تقرر بحیثیت ایجوکیشن آفیسر و مدرس، ۱۴ر جنوری ۱۹۰۲ء کے فرمان کے ذریعے ہوا۔ یہ فرمان ۲۰ر جنوری ۱۹۰۲ء کے رام پور گزٹ میں شائع ہوا ہے۔ اور ۵ر مارچ ۱۹۰۲ء کے ایک فرمان کے ذریعے ان کی تین ماہ کی رخصت منظور کی گئی ہے۔ یہ فرمان اسٹیٹ گزٹ ۱۳ر مارچ ۱۹۰۲ء کے صفحہ ۱ پر شائع ہوا ہے، جس کی نقل "ہماری زبان" جنوری ڈیکم فروری ۱۹۷۹ء (ص۱۹)۔ اور جامعہ بابت اکتوبر ۱۹۷۹ء (صد ۵۳۴) میں بھی شائع ہوئی ہے۔

۵ر مارچ ۱۹۰۲ء کو چھٹی منظور ہونے کے معنیٰ ہیں کہ استعفیٰ اس تاریخ کے بعد کبھی دیا گیا ہوگا۔ اس طرح مولانا شوکت علی کا بیان فروری ۱۹۰۲ء درست معلوم نہیں ہوتا۔

حکیم محمد حسین خاں کے مضمون کے حواشی میں صفحہ ۷۴ پر درج ہے کہ:

"شیخ علی بخش خاں بہادر ..... ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں ولی عہد

رام پور ، یوسف علی خاں کے خانسامہ کی حیثیت سے رام پور میں آئے
..... افغانانِ رام پور میں ۔ . جب رؤسا نے سیدات کا اعلان
کیا تو یہ لوگ ’خاں‘ کہلانے لگے ۔“

۱۔ علی بخش خاں رام پور میں نواب محمد سعید خاں کے زمانے میں آئے ۔ ولی عہد کے اہلکار کی حیثیت سے ابتدا میں رہے ۔ لیکن ان کی صلاحیتوں کو دیکھ کر انھیں ’خانساماں‘ کا عہدہ دیا گیا، مگر ان کی حیثیت ’خانساما‘ (باورچی) کی نہیں تھی ۔ ’خانِ ساماں‘ مغلوں کے زمانے کا عہدہ ہے اور یہ HOUSE HOLD ہوتا تھا (تذکرہ کاملانِ رام پور ص۸۴)
رام پور کی ریاست میں ایسے بہت سے واقعات ملیں گے کہ عہدہ کچھ اور ہوتا تھا لیکن کام دوسرے قسم کے سپرد ہوتے تھے ۔

۲۔ اس خاندان نے ’خاں‘ کا لفظ اس خاندان میں آن کر لکھنا شروع نہیں کیا، بلکہ محبوب بخش خاں (علی بخش خاں کے والد) کے نام کے ساتھ بھی ’خان‘ کا لفظ ملتا ہے ، ملاحظہ ہو:

“علی بخش خاں ولد محبوب بخش خاں ۱۸۱۳ء
نجیب آباد میں پیدا ہوئے ۔“ ص۴۶۶

محبوب بخش خاں کی جائیدادوں کے کاغذات میں ان کے اور اجداد کے جو دستخط ہیں، ان میں بھی ’خان‘ کا لفظ موجود ہے ۔ ضمناً عرض کر دوں کہ میں نے ان کاغذات کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری، جامعہ کو تحفتاً دی ہیں جو سمینار کے موقع پر نمائش میں لگائی گئی تھیں ۔ نیز اگر ۱۸۵۷ء کے غدر سے متعلق مختلف کتابوں کو دیکھا جائے تو ان میں بھی رشد علی خاں، ابادی بیگم عرف بی اماں کے اجداد کے نام کے ساتھ بھی ’خان‘ کا لفظ ملتا ہے[۲] ۔

بیگم محمد علی کے مکتوب بتاریخ ۱۶ر دسمبر ۱۹۳۰ء (لندن) ص۶۵ پر تحریر ہے :

“بی اماں کو آداب“

بی اماں کا انتقال ۱۹۳۰ء سے بہت پہلے ہو چکا تھا[۳] ۔ اب یہ تلاش کرنا

پڑے گا کہ یہ "بی اماں" کون ہیں۔ ممکن ہے خاندان کی کوئی اور بزرگ خاتون ہوں۔

آپ نے روزنامہ خلافت (بمبئی) کے مضامین شائع کر کے سیکڑوں دعائیں لی ہیں، خدارا آپ اس طرح کے مضامین کتابی شکل میں کیوں نہیں شائع کرتے، تاکہ یہ محفوظ ہو جائیں اور ان کی افادیت میں اضافہ ہو جائے۔"

حواشی:

۱۔ اس خیال سے مجھے بھی اتفاق ہے، مگر میرے خیال میں یہ غلطی مولانا کی نہیں کتابت کی ہے، میرے نزدیک ۱۹۰۲ء نہیں ۱۹۰۳ء ہے، اس لیے کہ چند ہی سطروں کے بعد ہے: "فروری ۱۹۰۳ء میں وہ اور احمدی بالو میرے اور میری مرحومہ بیگم کے ہمراہ آگئیں"۔ فاضل مراسلہ نگار کو غالباً یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ پیشتر میں نے انھیں لکھا تھا کہ اگر رام پور گزٹ میں مولانا محمد علی کے استعفا کے بارے میں کوئی فرمان یا اطلاع شائع ہوئی ہو تو مجھے لکھیں اور انھوں نے مجھے نفی میں جواب دیا تھا۔ مجھے بروڈا جانے کی صحیح تاریخ کی بھی تلاش ہے۔

۲۔ جناب حکیم محمد حسین خاں شفا رام پوری نے "خانساماں" اور "خان" کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اور جو کچھ فاضل مراسلہ نگار نے لکھا ہے، دونوں میں مجھے کوئی تضاد نظر نہیں آتا، صرف تفصیلات کا فرق ہے۔

۳۔ یہ صحیح ہے، بی اماں کا انتقال ۱۹۲۴ء میں ۱۲ اور ۱۳ نومبر کی درمیانی شب میں ہوا مگر زیر تذکرہ خط میں ان ہی بی اماں کا ذکر ہے اور محترمہ احمدی بیگم کے لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ انتہائی کمزوری کی وجہ سے مولانا کا ذہن ٹھیک طور پر کام نہیں کر رہا تھا اور وہ بے خیالی میں اپنی مرحومہ والدہ کو آداب لکھوا رہے تھے۔

۴۔ جی ہاں، کچھ اضافے کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

عبداللطیف اعظمی

کوائف جامعہ

گاندھی جی کی یاد میں جلسہ

ہر سال ۳۰ رجنوری کو گاندھی جی کی یاد میں جامعہ میں جلسہ منعقد ہوتا ہے جس میں طلباء اور طالبات گاندھی جی پر مضامین اور نظمیں پڑھتے ہیں اور شیخ الجامعہ صاحب کے علاوہ کوئی خصوصی مہمان گاندھی جی کی شخصیت اور خدمات پر تقریر کرتے ہیں۔

حسب معمول امسال بھی ۳۰ رجنوری کو شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب کی صدارت میں جامعہ یکجہتی سمیتی کے اہتمام میں طالب علموں، استادوں اور کارکنوں کا جلسہ منعقد ہوا۔ سب سے پہلے تلاوتِ قرآن مجید کی گئی، اور دوسرے مذاہب کی مقدس کتابوں کے اقتباسات پڑھے گئے، اس کے بعد مختلف تعلیمی اداروں کے طلباء اور طالبات نے گاندھی جی کی زندگی اور کارناموں پر مضامین پڑھے اور ترنم کے ساتھ مشہور شاعروں کی نظمیں سنائیں۔ اس سال شعبۂ اردو کے پروفیسر اور صدر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ خصوصی مقرر تھے، انھوں نے گاندھی جی کا پیغام اور اس کی معنویت پر ایک پر مغز اور مدلل تقریر کی۔ انھوں نے کہا افسوس ہے کہ چند برس کے اندر اندر گاندھی جی کی شخصیت اور ان کا پیغام ہماری تاریخ کے افسانہ و افسوں کا حصہ بن کر رہ گیا ہے۔ اس دور میں گاندھی جی کا نام جتنا زیادہ لیا جاتا ہے، ان کی قدروں سے ہم اتنے ہی دور ہو گئے ہیں۔ گاندھی جی انسانوں کی طرح سامنے آئے، رہنماؤں کی طرح جئے اور انھوں نے پیغمبروں کی طرح جامِ شہادت نوش کیا، وہ اپنی ذات سے صرف ایک انجمن یا ادارہ یا تحریک ہی نہیں بلکہ تاریخ کا ایک مکمل دور تھے، انھوں نے ایک غریب،

نادار، محتاج، مفلس اور نہتے ملک کو آزادی کی منزل تک پہنچا دیا۔ گاندھی جی کی طاقت کا سرچشمہ خدا کی ذات میں ان کا یقین محکم تھا اور یہی یقین ان کے پیغام میں مرکزیت پیدا کرتا ہے وہ اگرچہ راسخ العقیدہ ہندو تھے لیکن مذہب ان کے نزدیک حق و صداقت، سچائی اور رواداری، عدم تشدد اور عالمگیر محبت کے راستے پر چلنے کا نام تھا، ان کا فلسفۂ زندگی زیادہ تر ہندوستانی ذہن کے مذہبی خمیر سے پیدا ہوا تھا جس کی بازیافت انھوں نے ذاتی روحانی تجربے سے کی۔ وہ محبت کو عرفانِ حقیقت کا ذریعہ سمجھ کر اسے بھی تقریباً اتنی ہی اہمیت دیتے تھے جتنی حق و صداقت کو" پروفیسر نارنگ نے اپنی تقریر رَوِش صدیقی کی اس شاہکار نظم پر ختم کی جسے اردو والے عام طور پر فراموش کر چکے ہیں۔

آخر میں صدر جلسہ جناب قدوائی صاحب نے تقریر کی، انھوں نے فرمایا کہ چار دن پہلے پورے ملک میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ یوم جمہوریت منایا گیا، آج کا دن اس سے بھی زیادہ اہم دن ہے، آج کی تاریخ میں گاندھی جی کی شہادت کا جو واقعہ پیش آیا وہ انسانی زندگی کا ایک عظیم ترین واقعہ ہے۔ ایسا ہی ہے جیسے حضرت عیسیٰ کی سُولی کا واقعہ پیش آیا تھا۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ مجھے بڑی خوشی ہے کہ جامعہ میں یہ دن ہر سال بڑے اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ میری خواہش اور دعا ہے کہ ہمارے بچوں میں سے کوئی گاندھی جی کا جانشین پیدا ہو اور ملک و قوم کی بے لوث خدمت کرے۔ آج کل ملک کے حالات بہت خراب اور مایوس کن ہیں، ضرورت ہے کہ کوئی گاندھی پیدا ہو اور ان خرابیوں کو دور کرے۔ شیخ الجامعہ صاحب کی تقریر کے بعد طلباء اور طالبات نے قومی ترانہ پیش کیا۔

ذاکر صاحب کا ۸۳ واں یوم پیدائش

۹ فروری کو تیسرے شیخ الجامعہ اور چوتھے امیر جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا ۸۳ واں یوم پیدائش منایا گیا۔ مرحوم کی تاریخ پیدائش ۸ فروری ۱۸۹۷ء ہے، اس لیے ۸ فروری کو صبح کے وقت ان کی قبر پر قرآن خوانی کی گئی اور دوسرے روز سہ پہر میں شیخ الجامعہ جناب

انور جمال قدوائی صاحب کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کا انتظام ٹیچرز کالج نے کیا تھا، اس جلسہ کے خصوصی مہمان پروفیسر نور الحسن صاحب اور وزارت تعلیم کے ڈپٹی سکریٹری جناب ایس این پنڈتا صاحب تھے۔ ٹیچرز کالج کے پرنسپل اور فیکلٹی آف ایجوکیشن کے ڈین جناب عبدالحق صاحب نے شیخ الجامعہ اور خصوصی مہمانوں کا خیر مقدم کرنے کے بعد ذاکر صاحب مرحوم کے بارے میں فرمایا کہ: "ذاکر صاحب ترتیب کے لحاظ سے اگرچہ تیسرے شیخ الجامعہ ہیں اور بانیانِ جامعہ میں عمر کے لحاظ سے سب سے چھوٹے تھے مگر اس لحاظ سے جامعہ کی تاریخ میں ان کی بڑی اہمیت ہے کہ وہ پہلے شیخ الجامعہ ہیں جنھوں نے جامعہ میں تعلیمی فضا پیدا کی اور جامعہ کو سیاست کے نرغے سے نکالا اور جامعہ کی سربراہی کی ذمہ داری اس وقت سنبھالی جب جامعہ کی مالی حالت بہت خراب ہو چکی تھی اور اس کے ٹرسٹیز اس کو بند کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔" موصوف نے مزید فرمایا کہ: "آج جامعہ کی تعلیمی دنیا میں بڑی شہرت اور وقعت ہے اور یہ صرف ذاکر صاحب اور ان کے چند ساتھیوں کے خلوص اور ان کی ان تھک کوششوں اور قربانیوں کا نتیجہ ہے۔"

خاں صاحب نے اپنی تقریر اس پر ختم کی کہ: "ذاکر صاحب صحیح معنی میں ایک معلم تھے، اول معلم، آخر معلم اور ایسے ہی معلم ہندوستان اور اس کے نوجوانوں کی قسمت کو سنوار سکتے ہیں۔" اس کے بعد معزز مہمانوں نے اور آخر میں صدر جلسہ جناب قدوائی نے تقریریں کیں اور ذاکر صاحب کی شخصیت اور خدمات پر روشنی ڈالی۔ جلسے کا آغاز قرآن پاک کی تلاوت سے ہوا تھا، اس کے بعد ٹیچرز کالج کی طالبات نے جامعہ کا ترانہ پیش کیا تھا اور مدرسہ ثانوی کے استاد جناب شکیل اللہ صاحب نے اپنے دلکش ترنم میں اقبال کی مشہور نظم "تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز" جو ذاکر صاحب کو بہت پسند تھی، پڑھ کر سنائی۔

فانی بدایونی پر توسیعی لکچر

شوکت علی خاں فانی بدایونی کی پیدائش کو پچھلے سال ۱۳ ستمبر کو سو سال ہو گئے، وہ بدایوں کے ایک قصبے اسلام نگر میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد شجاعت علی خاں تھانیدار کی حیثیت سے مقیم تھے اور ۲۷ اگست ۱۹۴۱ء کو شام کے پونے چھ بجے حیدرآباد میں انتقال کیا۔ وہ جس مرتبے کے شاعر

تھے اس لحاظ سے نہ تو ان کی زندگی میں ان کی قدر کی گئی اور نہ ان کی وفات کے بعد انھیں مناسب طور پر یاد کیا گیا۔ اب جب مرحوم کی پیدائش کو سو سال پورے ہو گئے تو مناسب تھا کہ ان کی صد سالہ تقریب مناسب طور پر منائی جاتی، مگر دوسرے ہنگاموں میں غریب فانی کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ سرور صاحب کی کوششوں سے اتنا ہوا کہ مختلف یونیورسٹیوں میں مرحوم کی یاد میں جلسے ہو گئے۔ شیخ الجامعہ صاحب کی عنایت اور نارنگ صاحب کی توجہ سے پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے مرحوم پر ایک توسیعی خطبہ دینا منظور فرمایا اور ۶، فروری کو شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب کی صدارت میں اس سلسلے میں جلسہ منعقد ہوا اور سرور صاحب نے اپنا خطبہ پڑھا جس میں انھوں نے فرمایا کہ :

" فانی بدایونی ہمارے ان شاعروں میں سے ہیں جن کی شخصیت اور نفسیات کو سمجھے بغیر ان کی شاعری کا عرفان ہونا مشکل ہے۔ فانی ایک ایسی تہذیب کے نمائندے تھے جس میں وضعداری، آن بان، تصوف کی طرف ایک میلان اور زبان و ادب کا ایک رچا ہوا شعور، بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ فانی نے میر، غالب، ناسخ اور حسرت سے اثر قبول کیا ہے مگر ان کی ایک انفرادیت ہے اور ان کا اپنا ایک رنگ ہے جسے عرفانِ غم کہہ سکتے ہیں۔ فانی اپنے دور میں خاصے مقبول رہے گو ان کے انتقال کے بعد رجائیت پر سطحی عقیدت اور مقصدیت کی بلند آہنگ آواز کی وجہ سے ان کی سچی اور کھری شاعری کا پورا اعتراف نہ ہوا۔ فانی کے یہاں عرفانِ غم کے ساتھ واردات حسن و عشق کی بڑی دلکش تصویریں ملتی ہیں اور ان کے فکری میلان نے ان میں ایک گہرائی پیدا کر دی ہے۔ فانی شعر میں پہلے شعریت دیکھتے تھے، وہ موزونیت کو ثانوی درجہ دیتے تھے، ان کے فن میں بڑی پختگی اور ان کی زبان میں حیرت انگیز روانی ہے۔ وہ ایک طور پر میر کے جانشین ہیں، مگر زادِ راہ غالب سے لیتے ہیں۔ اقبال بلندیوں کے شاعر ہیں، فانی گہرائیوں کے۔ اقبال کی طرح تصوف اور قرآن سے انھیں بھی دلچسپی ہے، اپنے ہم عصروں میں اقبال اور یگانہ کو چھوڑ کر وہ سب سے ممتاز ہیں۔"

شعبۂ اردو کے صدر اور پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے معزز مہمان کا خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا کہ سرور صاحب چونکہ فانی کے اداشناس اور رمز آشنا ہیں، اس لیے فانی کی شاعری پر توسیعی خطبہ دینے کے لیے موصوف کا انتخاب کیا گیا، امید ہے کہ آپ ان کا خطبہ سن کر خوش ہوں گے" ۔ آخر میں ڈاکٹر محمد ذاکر نے مہمان اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

پاکستانی ادیب جامعہ میں

پچھلے سال کے اواخر میں پاکستان کے کچھ مشہور ادیب و محقق دلی آئے تھے، ان میں سے جناب شان الحق حقی اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری جامعہ بھی تشریف لائے، جن کے اعزاز میں شعبۂ اردو میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت قائم مقام شیخ الجامعہ جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے کی اور صدر شعبۂ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ان معزز مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ جناب حقی صاحب نے پاکستان میں لسانی تحقیق کی سمت اور رفتار پر روشنی ڈالی ۔ ترقی اردو بورڈ کی کارگذاریوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ اردو لغت کے لیے تیرہ لاکھ اسناد جمع کی گئی ہیں ۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے، جو کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر اور نیاز فتحپوری مرحوم کے مشہور ماہنامہ "نگار" کے ایڈیٹر ہیں، پاکستان کے تحقیقی و تنقیدی کاموں کا تفصیل سے جائزہ لیا۔ آخر میں جناب حقی صاحب نے اپنے کلام سے حاضرین جلسہ کو محظوظ کیا۔ قائم مقام شیخ الجامعہ جناب فاروقی صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ ادیبوں اور شاعروں کی آمد و رفت سے دونوں ملکوں کے تعلقات پر خوشگوار اثر پڑتا ہے اور بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ اگر دونوں ملکوں کے درمیان کتابوں اور رسالوں کا بغیر کسی رکاوٹ کے لین دین شروع ہو جائے تو اس سے بڑے دور رس اور خوشگوار نتائج برآمد ہوں گے ۔

میر تقی میر کا تخلیقی ذہن

کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر، پروفیسر حامدی کاشمیری نے ۲ فروری کو شعبۂ اردو

میں پیش نظر عنوان پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ کلام میر کے تاریخی اور خارجی پہلوؤں پر خاصی توجہ کی گئی ہے لیکن میر کے یہاں جو سرّیت اور زندگی کے عام خارجی مظاہر کی جو کیفیت ملتی ہے، اس کی طرف اب تک خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی۔ جلسے کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے شروع میں معزز مہمان کا خیر مقدم کرتے ہوئے حاضرین جلسہ سے ان کا اور ان کے کاموں کا تعارف کرایا اور جلسے کے آخر میں میر کی شعری خصوصیات پر روشنی ڈالی۔

پی ایچ ڈی کے مقالات کی منظوری

جامعہ ملیہ کے مختلف شعبوں کے پی ایچ ڈی کے چار مقالات سند دینے کے لیے منظور کئے گئے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالر سید فرحت حسین صاحب کا مقالہ جس کا عنوان ہے: خواجہ غلام السیدین ــ حیات اور ادبی کارنامے"۔ نگراں: پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور جناب سعید انصاری۔

۲۔ شعبۂ تاریخ کے ریسرچ اسکالر ایس۔ ایم۔ عزیز الدین حسین کا مقالہ جس کا عنوان ہے: "کلمات طیبات: تعارف و تحشیہ"، نگراں: پروفیسر اظہر انصاری اور جناب ایس۔ اے۔ آئی ترمذی۔

۳۔ شعبۂ اسلامیات اینڈ عرب ایرانین اسٹڈیز کے ریسرچ اسکالر عماد الحسن آزاد فاروقی کا مقالہ جس کا عنوان ہے: "ترجمان القرآن ــ تفہیم قرآن کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کے فکر اور طریق کار کا تنقیدی تجزیہ"، نگراں: پروفیسر ڈاکٹر مشیر الحق

۴۔ شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالر بیگم صادقہ ذکی کا مقالہ جس کا عنوان ہے: "پروفیسر محمد مجیب ــ حیات اور خدمت اردو۔ نگراں: پروفیسر گوپی چند نارنگ اور جناب ضیاء الحسن فاروقی۔ (کوائف نگار)

مولانا محمد علی نمبر

ماہنامہ جامعہ کے مولانا محمد علی نمبر کے دو حصے شائع ہوئے ہیں، جن میں مولانا مرحوم کی شخصیت اور خدمات پر بہترین مضامین شامل ہیں اور حصہ اول میں آرٹ پیپر پر متعدد تصاویر بھی شامل ہیں اور مولانا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک غزل کا بلاک بھی شائع کیا گیا ہے۔

قیمت حصہ اول : آٹھ روپے

قیمت حصہ دوم : پانچ روپے

فیس رجسٹری و محصول ڈاک : ۴ روپے

ماہنامہ جامعہ کا سالانہ چندہ : چھ روپے صرف

بیان ملکیت ماہنامہ جامعہ و دیگر تفصیلات

(بمطابق فارم نمبر ۴، قاعدہ نمبر ۸)

۱۔ مقام اشاعت : جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

۲۔ وقفہ اشاعت : ماہانہ

۳۔۴۔ پرنٹر و پبلشر کا نام : عبداللطیف اعظمی

قومیت : ہندوستانی

پتہ : ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

۵۔ اڈیٹر کا نام : ضیاء الحسن فاروقی

قومیت : ہندوستانی

پتہ : پرنسپل جامعہ کالج، جامعہ ملیہ۔ نئی دہلی ۲۵

۶۔ ملکیت : جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔ ۲۵

میں عبداللطیف اعظمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط پبلشر : عبداللطیف اعظمی

۲۶ر فروری ۱۹۸۰ء

No. D-(S.E.)-108 Vol. 77 No. 3 March 1980

THE MONTHLY JAMIA, Jamia Nagar, New Delhi-110025

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

ضمیمہ ماہنامہ جامعہ بابت ماہ اپریل سنہ 1980ع

ہمیں افسوس ہے کہ کاغذ کی کمیابی اور طباعت کی دقتوں کی وجہ
، ادھر کچھ عرصے سے ماہنامہ جامعہ خاص تاخیر سے شائع ہو رہا ہے ۔
ں اشاعت کو وقت پر لانے کے لیے اگلا شمارہ دو مہینوں ، مئی اور
پر مشتمل ہوگا اور جون کے اواخر میں ارسال کیا جائے گا ۔ لہذا
ن جامعہ سے گذارش ہے کہ وہ مئی اور جون کے مشترک شمارے کے لیے
کے اواخر تک انتظار کرنے کی زحمت فرمائیں ۔

معذرت خواہ

منیجر ماہنامہ جامعہ

جامعہ

جلد ۷۷ | بابت ماہ اپریل ۱۹۸۰ء | شمارہ ۴

فہرست مضامین

مجلس ادارت

پروفیسر محمد مجیب	پروفیسر مسعود حسین
ڈاکٹر سلامت اللہ	ضیاء الحسن فاروقی

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مُدیر معاون

عبداللطیف اعظمی

خط وکتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی • مطبوعہ: جمال پریس دہلی • ٹائیٹل: فائن پریس دہلی

شذرات

۱۵ اپریل کو جین پال سارتر جن کے فلسفۂ وجودیت کا دوسری جنگِ عظیم کے بعد مغرب میں بڑا چرچا رہا اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کی وفات پیرس میں ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر ۷۵ سال تھی۔ وہ اس صدی کے بڑے ممتاز مفکر اور ادیب تھے۔ وہ ۱۹۰۵ء میں ایک مذہبی خاندان میں پیدا ہوئے، شروع میں تو وہ خود ایک مذہبی انسان تھے لیکن رفتہ رفتہ وہ انکار والحاد کی طرف بڑھتے گئے اور آخر میں تو ان کی پوری زندگی ایک مکمل بغاوت بن گئی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ پہلے لے ہاور میں اور پھر پیرس میں فلسفے کے معلم رہے۔ پیرس میں اُن کی ملاقات ایک حسین اور امیر خاتون سیمون ڈی بیوائر سے ہوئی جو فلسفہ پڑھاتی تھیں اور ان کی ہم خیال تھیں۔ شادی ان دونوں کی کبھی نہیں ہوئی کیونکہ دونوں شادی کو ایک بورژوا 'ادارہ' تصور کرتے تھے۔ ان کے باغیانہ خیالات میں سے ایک خیال ان کا یہ بھی تھا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد یورپ میں جو ذہنی و اخلاقی بحران پیدا ہوا اور اس بحران نے جس طرح نوجوان ذہنوں کو متاثر کیا، وہ ایک دردناک کہانی ہے جس سے مغربی تہذیب کی اساس کا کھوکھلا پن ظاہر ہوتا ہے۔ سارتر کا خیال تھا کہ حالات کی ان تاریکیوں میں اس کا فلسفۂ وجودیت ہی امید کی کرن ہے اور اسی کو اپنا کر یورپ کی نوجوان نسل زندگی میں کوئی معنی اور مقصد دیکھ سکتی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ آزادی انسان کا مقدر ہے اور وجودِ انسانی اپنی تمام معنویت کے ساتھ اس بات پر منحصر ہے کہ انسان کو جہد و عمل کی مختلف راہوں میں سے کسی ایک راہ کو منتخب کرنے کی آزادی ہو۔ انتخاب کی یہ آزادی اُسے ہر لمحہ حاصل ہونی چاہیئے۔ کوئی بات، کوئی واقعہ، انسان کا کوئی عمل پہلے سے طے شدہ نہیں ہے، وجود ہی سب کچھ ہے، نہ کچھ پہلے ہے اور نہ کچھ بعد میں۔ یہ دعویٰ بہت بڑا دعویٰ تھا اور اس کے پیچھے نظریہ پرستی کا پورا کٹر پن بھی تھا۔ لیکن دوسری جنگِ عظیم

کے بعد کی نوجوان نسل کو جو ایک بھیانک یاس (دراحساسِ جُرم کا شکار تھی، فلسفۂ وجودیت نے اپنے آپ کو اس احساس سے محفوظ کر لینے کے لیے عارضی طور پر ایک موقع فراہم کیا۔

فلسفۂ وجودیت کی تمام اساسی کمزوریوں کے باوجود، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سارتر اس بیسویں صدی کا ایک عظیم دانشور، مفکر اور ادیب تھا۔ اس زمانے کے مغربی فکر پر اُس کی چھاپ گہری ہے۔ وہ ایک ایسا مفکر تھا جو اپنے افکار و خیالات کے شیش محل میں نہ تو مقید رہ سکتا تھا اور نہ فرد کی آزادی کے اس تصور پر قانع رہ سکتا تھا کہ اُسے سماجی و قومی مقاصد سے کوئی سروکار نہ ہو۔ سماجی فلسفوں میں اُس کا جھکاؤ بائیں بازو والے فلسفے ہی کی طرف رہا اور اس نے مارکسزم کے بھی گُن گائے لیکن وہ کبھی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر نہیں بنا۔ درحقیقت مارکسزم کی جبریت اور اس تصور میں کہ انسان کو انتخاب کی آزادی ہے، ہم آہنگی نہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۵۶ء میں سوویٹ یونین نے ہنگری میں طاقت کا مظاہرہ کیا تو اِس بڑے ملحد کا مادہ پرستی کا بُت پاش پاش ہو گیا۔ اگرچہ وہ اس کا قائل رہا کہ مارکسزم کا سماجی اور تاریخی تجزیے کا مسلک عصرِ حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق ہے لیکن اس نے اس کے دوسرے پہلوؤں پر سخت تنقید بھی کی۔ الجیریا میں فرانس کے جبر و ظلم کے خلاف بھی اس نے آواز اٹھائی اور جب اس سلسلے میں ڈیگال کے کچھ دوسرے نقاد گرفتار ہوئے تو سارتر نے اپنی گرفتاری کے لیے حکومت فرانس کو چیلنج کیا، لیکن اُس کا چیلنج منظور نہیں کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ چارلس ڈیگال نے اس موقع پر یہ کہا کہ "کوئی والٹیر پر بغاوت کا مقدمہ نہیں چلاتا۔" وہ ویت نام میں امریکی فوجی کارروائی کا بھی مخالف تھا۔ اس طرح سارتر نے سماجی، قومی اور انسانی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اُسی فرد پر ڈالا جس کی آزادی کا وہ ایک بڑا علمبردار تھا۔ سارتر کی شخصیت اور خیالات میں ہمیں تضادات ملتے ہیں۔ قنوطی ہونے ہوئے بھی اس کا خیال تھا کہ انسان کی اصلاح ہو سکتی ہے، عینیت پرستی کا مخالف ہوتے ہوئے بھی اُس نے عینیت پرستانہ مقاصد کا ساتھ دیا۔ مارکسزم کا ہمنوا ہوتے ہوئے بھی وہ 'جبریت' کا قائل نہ تھا، بڑے بڑے خواب دیکھنے والے اس مفکر نے انسان کی کوتاہ اندیشی کا کوئی خیال نہ کیا اور اپنے افکار کی بھٹی میں اس عجلت پسند اور کوتاہ نظر ہستی کو جھونک دینے کی کوشش کی ــــ اسی میں اس کی بڑائی بھی ہے اور اسی میں اس کا المیہ بھی۔

قومی اور ملی حلقوں میں یہ خبر بڑے رنج والم کے ساتھ سنی گئی کہ ۲۲ مارچ کو قاضی محمد عدیل عباسی کا انتقال ہو گیا۔ ابھی تحریک خلافت پر مرحوم کی تصنیف کا چرچا ہی تھا کہ لکھنے والا اللہ کو پیارا ہو گیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کے مراتب بلند فرمائیں اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دیں۔ آمین۔ قاضی صاحب علی گڑھ کے نامور گریجویٹ اور بستی کے مشہور وکیل تھے۔ انھیں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر قدرت تھی۔ انھوں نے ایک عرصہ تک مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ ان کے اخبار زمیندار میں کام کیا تھا اور شاید اسی صحافتی تجربے کے سبب ان کا قلم اتنا منجھا ہوا تھا کہ مختلف النوع موضوعات پر قلم برداشتہ لکھ سکتے تھے۔ اپنے سیاسی افکار میں وہ بڑے پختہ تھے۔ تحریک خلافت کے دوران انھوں نے بڑے مجاہدانہ کارنامے انجام دیئے اور کانگریس میں بھی بڑے پُرجوش طریقے سے وہ قومی مقاصد کی ہمنوائی کرتے رہے۔ اپنی حق گوئی اور بیباکی سے انھوں نے کانگریس میں بھی اور کانگریس کے باہر بھی اپنا ایک مقام پیدا کر لیا تھا اور ہر حلقے میں انھیں عزت اور احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ سیاست ہو یا مذہب، دونوں میں وہ کھرے اور جھکنے والے نہ تھے۔ دینی حمیت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، فکر و عمل دونوں میں وہ مذہبی شعائر کے پابند تھے معاملات کو خوب سمجھتے تھے اور حالات اور ان کے تقاضوں پر نظر رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی اور مذہبی حلقوں پر اُن کی شخصیت کے نقوش گہرے پڑے۔

مولانا علی میاں نے آزادی کے بعد ان کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے کیسی سچی بات کہی ہے کہ "دینی حمیت اور ملت کی فکرمندی نے ان کو ۱۹۵۹ء میں اپنے شہر بستی میں اس عظیم الشان دینی تعلیمی کانفرنس کے انعقاد پر آمادہ کیا جس کے نتیجے میں دینی تعلیمی کونسل کی جیسی مبارک تنظیم کا وجود عمل میں آیا جس سے زیادہ ٹھوس، مفید اور تعمیری تحریک ادھر ایک طویل عرصہ سے مسلمانان ہند کی تاریخ میں وجود میں نہیں آئی۔ واقعہ یہ ہے کہ قاضی صاحب ہی کے اس درد اور فکرمندی نے جو ہندوستانی مسلمانوں کی نئی نسل کے بارے میں ان کو بے چین کئے ہوئے تھی، بیسیوں علما اور اہل دین کو تڑپا دیا اور ان کو ان کے گوشۂ عزلت سے باہر لے آئی۔ خود اس ناچیز کا شمار بھی انھیں لوگوں میں ہے

اور وہ قاضی صاحب کے اس احسان کو مدت العمر نہیں بھول سکتا"۔ دینی تعلیمی کونسل کے کام کی توسیع و استحکام میں قاضی صاحب نے اپنی زندگی کے آخری سال، جو آرام اور گوشہ نشینی کے سال بھی ہو سکتے تھے، صرف کر دیئے اور مسلمان بچوں کو نئے تعلیمی نظام اور نئی نصابی کتابوں سے جو خطرات پیدا ہو گئے تھے، محفوظ رکھنے کا عظیم کارنامہ انجام دیا۔ وہ یہ تمام کام بڑی خاموشی اور تن دہی سے کرتے تھے کیونکہ وہ خوب سمجھتے تھے کہ یہ کام سیاسی کام سے مختلف ہے اور اس کے مثبت نتائج صبر و تحمل، انتظار اور مسلسل جدوجہد کے طالب ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ مرحوم کا یہ کام ایک تاریخ ساز کام ہے اور اس راہ میں ان کی خاموش اور ان تھک کوشش ایک دعوت ہے اس امر کی کہ زندگی کا ہر لمحہ قیمتی ہے اور اُسے قومی و ملی کاموں میں کھپا کر نتیجہ خیز بنایا جا سکتا ہے۔

اب قاضی صاحب اس دنیا میں نہیں رہے اور یہ ملک اور اس ملک کے مسلمان ان کی دیدہ وری، ان کی جگر سوزی اور ان کے عمل مسلسل کی برکتوں سے محروم ہو گئے۔ لیکن ان کی بھرپور زندگی ہم سب کے لئے ایک لمحۂ فکریہ فراہم کرتی ہے اور غور و فکر کی دعوت دیتی ہے کہ زندگی وہی گذارنے کے قابل ہے جو کسی بڑے مقصد کی خاطر گذاری جائے، زندگی کا اصل راز کارگاہ عمل میں ہے، خود زندگی کے لامتناہی امکانات میں ہے، گوشۂ عافیت میں نہیں کہ یہ راہ تو ایک کمزور بوڑھی عورت بھی اختیار کر سکتی ہے۔

تصحیح: پچھلے شمارے کے شذرات میں صفحہ ۱۳۲ پر گیارہویں سطر میں "علوم آلیہ" کے بجائے "علوم الٰہیہ" چھپ گیا ہے، براہ کرم قارئین تصحیح فرمالیں۔

ڈاکٹر مشیر الحق

علماء اور ہندوستانی مسلم سیاست

ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں مذہب کے رول کا اندازہ کرنے کی غرض سے اس مضمون میں ہندوستانی مسلم قیادت کی ماہیت اور خصوصیات کے مطالعے کی ایک کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں چونکہ اس بات کا علم ضروری ہے کہ اس صدی میں آزادی کی جد وجہد کے دوران مسلمانوں کو کس قسم کی قیادت حاصل تھی، اس لئے یہ مقالہ اگر ایک طرف ماضی قریب کے واقعات کی تصویر کشی کرتا ہے تو دوسری طرف آئندہ پیش آنے والے حالات کی کسی حد تک نشاندہی بھی کرتا ہے۔

(۱)

اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ غدر سے قبل برطانیہ کے سیاسی اور سماجی اثرات کو قبول کر لینے والے دوسرے علاقوں کی طرح دہلی اور اس کے اطراف کے مسلمان بھی نئی زندگی سے اپنی دلچسپی کا اظہار کرنے لگے تھے، دہلی میں انگریزوں کے قائم کردہ دہلی کالج میں مسلمان طالب علم بھی تھے اور استاد بھی۔ بعض لوگوں نے مغربی علوم وفنون اور سائنس کو اردو میں منتقل کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ یہ بھی نظر آتا ہے کہ علماء، جن پر اکثر وبیشتر مسلمانوں

ڈاکٹر مشیر الحق، پروفیسر و صدر شعبۂ اسلامک اینڈ عرب ایرانین اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

پیش نظر مضمون اصل میں انگریزی میں لکھا گیا تھا جو سہ ماہی "اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج" کے شمارہ نومبر ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا ہے، اس کا اردو ترجمہ جناب محمد اسلم اصلاحی لکچرر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کیا ہے۔

اور جدید طرز زندگی کے درمیان حد فاصل بن جانے کا آج الزام لگایا جاتا ہے فی الحقیقت شروع میں نہ تو انگریزوں سے وحشت کھاتے تھے اور نہ انگریزی چیزوں سے، اس زمانے کے فتووں، یاد داشتوں، سوانح عمریوں اور سرگزشتوں کا بے لاگ مطالعہ ہر شخص کو یہ باور کرادے گا کہ علماء نے ان محرکات کی شدید مخالفت کرنے کے باوجود جوان کی فہم و فراست کے مطابق لامذہبیت کی طرف لے جاسکتے تھے۔ مذہب اور لا مذہب کے درمیان حد بندی کی ایک لائن کھینچ رکھی تھی، ان دو باتوں کے مابین توازن و اعتدال قائم رکھتے ہوئے انھوں نے مسلمانوں کو ضرورت پر انگریزی پڑھنے، مغربی لباس پہننے اور عیسائیوں کے ساتھ سماجی تعلقات قائم کرنے کی اجازت دے رکھی تھی[1]؛ لیکن ان اقدامات کا غدر کے ساتھ ہی خاتمہ ہوگیا اور غدر کے بعد حالات نے جو رُخ اختیار کیا اس کے پیش نظر مذکورہ بالا خطوط پر پیش رفت کرنے والوں کو مختلف مشکلات کا سامنا کرنا پڑا[2]۔

حقیقتاً غدر نے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان اتنی بڑی خلیج حائل کردی تھی کہ لوگ دونوں کو قریب لانے کی بات کا بمشکل ہی اظہار کرسکتے تھے پھر بھی یہ صورت حال زیادہ دنوں تک باقی نہ رہی۔ وقتاً فوقتاً لوگوں نے حالات پر نظر ثانی کرنے اور حاکم فرنگیوں اور محکوم مسلمانوں کے درمیان خوشگوار روابط کو زندہ کرنے کی مخلصانہ کوشش شروع کردی۔ مثلاً کلکتہ میں ایک خطاب یافتہ مسلمان نواب عبداللطیف نے "محمڈن لٹریری سوسائٹی" قائم کی۔ اعلیٰ اور خوشحال متوسط طبقے کے مسلمانوں پر مشتمل اس سوسائٹی کو وہاں کے بعض مشہور اور مستند علماء کی بھی تائید حاصل تھی۔ اس سوسائٹی کی غرض و غایت بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کے سماجی، سیاسی اور مذہبی مسائل پر غور و فکر کرنا تھا۔ سوسائٹی کے علماء نے اپنے اوپر یہ بات لازم کرلی تھی کہ وہ مسلمانوں کے ذہنوں سے اس غلط فہمی کو نکال پھینکیں گے کہ انگریز ان کے مذہب کو مٹانے کے درپے ہیں، فی الحقیقت یہ ایک انتہائی مشکل کام تھا اس لئے کہ مسلم عوام بالخصوص بنگال اور بہار کے مسلمان فرائضی اور نام نہاد وہابی تحریک

کے گہرے اثرات کے تحت مذہبی بنیادوں پر نہ صرف انگریزوں کے دشمن تھے بلکہ ہر وقت ان کے خلاف جہاد کا نعرہ بلند کرتے رہتے تھے چونکہ "محمڈن لٹریری سوسائٹی" کو اس رجحان کے خلاف لڑنا تھا لہٰذا اس کے ممتاز علماء نے اپنے فتووں کے ذریعہ برملا کہنا شروع کیا کہ ہندوستان کے حالات جہاد کے متقاضی نہیں ہیں[۳]۔ اس کے علاوہ سوسائٹی نے مغربی علوم اور انگریزی تعلیم کی نشر و اشاعت پر بہت زیادہ توجہ صرف کی۔ سوسائٹی کے صدر کے بمطابق "ہندوستان میں اگر کوئی زبان واقعی اپنے پڑھنے والے کی زندگی میں انقلاب برپا کر سکتی ہے تو وہ انگریزی زبان ہے.... انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان جانتے ہیں کہ جان و مال کا تحفظ برطانوی حکومت کے استحکام پر منحصر ہے[۴]۔"

لیکن دلی کی صورت حال کلکتہ سے مختلف تھی۔ دہلی نے غدر کے دوران اپنے آپ کو باغیانہ سرگرمیوں کی آماجگاہ ثابت کر دیا تھا یہاں کے مسلم عوام و خواص غدر کے تلخ نتائج کو بھگت رہے تھے اور مسلمان اور انگریز دونوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ شدید نفرت اور عداوت کا اظہار کر رہے تھے۔ ایسے حالات میں کسی کا پیش رفت کر کے اس جمود و تعطل کی فضا کا استیصال کرنا ضروری تھا اور سرسید نے اس چیلنج کو قبول کر لیا۔

سرسید احمد خاں (۱۸۱۷-۱۸۹۵) نے زندگی کے ہر میدان میں خواہ وہ سماجی رہا ہو یا سیاسی یا مذہبی، مسلم معاشرے کی از سر نو قوت آفرینی کے پروگرام کا آغاز کیا۔ اس وقت ان کے لئے مسلمانوں کو اپنی نیک نیتی کا یقین دلانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس علاقے کے علماء کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ عیسائی مبلغین برطانوی حکومت کی مدد سے ان کے مذہب کو مٹا دینا چاہتے ہیں[۵]۔ اپنے طرز زندگی میں تبدیلیوں کے اندیشہ سے علماء نے مذہبی تعلیم کا سہارا لیا اور اس مقصد کی خاطر انھوں نے حکومت کے مالی اور انتظامی تعاون سے آزاد رہ کر مدرسوں کو قائم کرنا شروع کر دیا[۶]۔

مسلمانوں کے عہد حکومت میں مدرسہ ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں لوگوں کو دینی اور دنیاوی تعلیم فراہم کی جاتی تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز سے ان مسلم مدرسوں کے علاوہ عیسائی مشن کے تحت چلنے والے اسکولوں کا بھی رواج ہوا، اگرچہ مشن کے یہ اسکول ترقی کی راہ

میں تیزی کے ساتھ مسلسل آگے بڑھ رہے تھے تاہم ان مدرسوں نے بھی کم ازکم اس صدی کے نصف آخر تک اپنی اہمیت بنائے رکھی کیونکہ اس وقت تک ان مدرسوں کے فارغین کو بھی سرکاری ملازمتوں کے لئے پورے طور پر اہل سمجھا جاتا تھا۔ البتہ ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریزوں نے مسلمانوں کے ہاتھوں سے حکومت چھین لی تو ان مدرسوں کے تعلیم یافتہ حضرات کے لیے حکومت کے کسی اہم عہدہ کا حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا، مزید برآں برطانوی حکومت نے مسلمانوں کے قدیم طرز تعلیم کی حوصلہ افزائی کرنے میں بھی کوئی خاص دلچسپی نہ لی، لہذا مسلمانوں نے آئندہ پیش آنے والے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کا فیصلہ کیا کہ اپنے بچوں کی مذہبی تعلیم کی غرض سے وہ اپنے ذاتی اور خود مختار مدرسے قائم کریں گے، ان اداروں کے انتظامی امور میں سرکاری مداخلت کے اندیشے کے پیش نظر انھوں نے سرکاری امداد قبول کرنے سے گریز کیا۔

درج بالا خطوط پر موجودہ اترپردیش کے مغربی حصے میں دہلی کے قریب دیوبند جیسے ایک چھوٹے سے قصبے میں سب سے پہلا مدرسہ ۱۸۶۷ء میں قائم کیا گیا۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام نے مسلمانوں کو ملک کے مختلف حصوں میں نئے مدرسے قائم کرنے کی جرآت و ہمت دلائی۔ ان مدرسوں کے قیام کا اولین مقصد مسلمانوں کے تعلیمی اور تہذیبی ورثہ کو برقرار رکھنا تھا جس کی تباہی و بربادی فرنگی دورِ حکومت میں علین ممکن نظر آ رہی تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں ان مدرسوں کی اہمیت کو کم کئے بغیر یہ بات بلا جھجھک کہی جا سکتی ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل تک ان مدرسوں کے فارغین نے سیاسی سرگرمیوں میں جی کھول کر حصہ لینے کے بجائے مسلمانوں کے روایتی طور وطریق کو برقرار رکھنے میں دلچسپی لی۔

علماء کے برخلاف سرسید کی نظر مستقبل پر تھی، انھوں نے ماضی کے دھندلکوں میں رہنا پسند نہیں کیا، ان کی یہ آرزو تھی کہ مسلمان زندگی کے حقائق کو سمجھیں اور پھر انھیں بحسن و خوبی اختیار کریں، اس مقصد کے حصول کی خاطر انھوں نے مختلف جہتوں سے الگ الگ مرحلوں میں اپنی مہم کا آغاز کیا پہلا مرحلہ انگریزوں اور مسلمانوں

کے درمیان مفاہمت کا تھا یہ غدر اور ان کے سفر برطانیہ (۱۸۶۹) کا درمیانی عرصہ تھا، اسی زمانے میں انھوں نے فارسی میں "اسباب بغاوت ہند" نامی کتاب لکھی[۹] ۔ اس کے علاوہ برطانیہ کے وفادار مسلمانوں کے حالات پر مشتمل کتابچوں کا ایک سلسلہ شائع کرنا شروع کیا تاکہ وہ حکمراں طبقے کو اس بات کی یقین دہانی کرا سکیں کہ غدر جیسے باغیانہ فعل میں مسلمانوں کا ہاتھ بالکل نہیں یا بہت ہی معمولی تھا[۹] دریں اثنا جن جن جگھوں پر انھیں سرکاری ملازم کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا وہاں انھوں نے نئے نئے اسکولوں کی داغ بیل ڈالی ۔ ان اسکولوں کے طلبا اور عام اردو قاری کے استفادہ کے پیش نظر انھوں نے مغربی ادب اور سائنس پر مشتمل کتابوں کے ترجمہ کے لئے ایک "ٹرانسلیشن سوسائٹی" بھی قائم کی تھی "تاکہ لوگ اپنے واہموں اور مفروضوں سے باہر نکلنے کا چلن سیکھ سکیں اور برطانوی راج کی افادیت اور قوت کو بنظر استحسان دیکھ سکیں[۱۰] ۔"

دوسرے مرحلہ پر سرسید نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کی ذمہ داری اٹھائی اور دونوں مذہبوں کے درمیان رشتۂ اتصال کو ثابت کرنے کی کوشش کی ۔ اسی مقصد کے تحت انھوں نے بائبل کی ایک تشریح شائع کی[۱۱] ۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے مقالات میں عیسائیوں کے ساتھ سماجی تعلقات قائم کرنے پر زور دیا[۱۲] ۔

اس کے بعد ہی انھوں نے انگلینڈ کا بحری سفر کیا جہاں کی تہذیب اور جدید تعلیم سے متاثر ہو کر انھوں نے لکھا: "ہندوستانی باشندے خواہ وہ ادنیٰ ہوں یا اعلیٰ، سرمایہ دار ہوں یا معمولی دوکاندار، عالم ہوں یا جاہل، علم و اخلاق اور ایمانداری میں انگریزوں کے بالمقابل یوں نظر آتے ہیں جیسے لائق اور خوبصورت انسان کے بالمقابل گندے جانور[۱۳] ۔" اپنے خیالات کی تشہیر کے لئے اسی زمانے میں انھوں نے اپنا اردو رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا، اس رسالے نے جلد ہی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کر دیا اور سرسید کے ارد گرد ایسے باصلاحیت افراد اکٹھا ہونے

لگے جو سماجی اور سیاسی مسائل پر انھیں جیسے خیالات رکھنے کے باوجود اس وقت تک ایک طرح سے بے راہبر تھے۔ اسی کامیابی سے حوصلہ پاکر سرسید نے اپنے اس خیال کی تبلیغ شروع کردی کہ مسلمانوں کا ایک ایسا کالج ہونا چاہیئے جہاں اسلام کی اخلاقی قدروں کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب اور یوروپی زبانیں پڑھائی جاسکیں۔

(۲)

علماء اور سرسید ابتداء سے ہی دو مختلف راستوں پر چل رہے تھے۔ علماء جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ مذہبی روایات سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے، نتیجتہً وہ عہد وسطیٰ کے مسلمانوں کی تعلیمی میراث کو برقرار رکھنے نیز اس کو ترقی دینے کے زیادہ خواہاں تھے، ازمنہ وسطیٰ سے اپنی اس گرویدگی کے سبب انھوں نے فطری طور پر "جدت مخالف" یا بظاہر "برطانیہ مخالف" رویہ اپنا رکھا تھا دوسری طرف سرسید کے نزدیک جدید قدروں بلکہ حقیقتہً برطانوی قدروں کا دل وجان سے اختیار کرلینا ترقی کے لیے ضروری تھا۔ مختصراً ان دونوں گروہوں کے درمیان سب سے بڑا اختلاف جس بات پر تھا اسے آج ہم "ماڈرنزم" کہہ سکتے ہیں علماء کی نظر میں "ماڈرن" ہونے کا مطلب "ارتداد" تھا جبکہ علی گڑھ تحریک کے نزدیک وہ اسلام ہی نہیں ہوسکتا تھا جس کی تشریح وتفسیر جدید انداز اور نئے اسلوب میں نہ کی جاسکے۔ مذہبی مسائل پر سرسید کی تحریریں اور ان کے مخالفین کے ذریعہ ان کی تنقیدیں ان دونوں رجحانات کی بیّن مثالیں ہیں۔

کسی ملک میں مسلمانوں کی سیاسی قوت کا زوال تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں، تنزل وانحطاط کی ایسی مثالیں بے شمار ہیں، دراصل ہندوستان میں مسلم دورِ حکومت کے اختتام کی بنیادی اہمیت اس حقیقت میں پوشیدہ ہے اور اس کی اسلامی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان اپنے سابقہ محکومین کو نہ صرف اپنے مساوی بلکہ مدمقابل کی حیثیت سے تسلیم کرنے پر مجبور تھے، انگریزوں کی آمد کے بعد مواقع روزگار کے جو بھی محدود امکانات تھے ان میں انھیں اپنی بقا کے لئے ہندوؤں کے دوش بدوش جدوجہد کرنا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد یہاں کوئی امیر المومنین نہیں ہوگیا تھا جو مسلمانوں کے سیاسی مفادات کی

نگہداشت کرتا نہ ہی ایسا کوئی ادارہ بچا تھا جو اسلام کو اندرونی شکست و ریخت اور بیرونی حملوں سے محفوظ رکھتا۔ اب تک ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں اسلام پر ایسا وقت نہیں آیا تھا جب اسے اپنی حیثیت کا دفاع کرنا پڑا ہو، لوگوں کو اس کی آزادی حاصل تھی کہ یا تو وہ اس کی قطعیت کو تسلیم کریں یا پھر اس سے بے تعلق رہیں لیکن کسی کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی کہ وہ علی الاعلان کہتا پھرے کہ وہ اسلام کو رسمی طور پر قبول کئے بغیر بہتر زندگی گذار رہا ہے یا گذار سکتا ہے۔ انیسویں صدی میں اور خاص طور سے ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی مرتبہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی مناظروں کی ایک ہوا چل پڑی تھی۔ ان مناظروں کا بنیادی مقصد ایک دوسرے کو سمجھنے سے زیادہ ان کا مذاق اڑانا تھا (میرے علم میں ان مذہبی مناظروں کی تفصیلات انگریزی زبان میں موجود نہیں ہیں، یہ زیادہ تر ان اردو کتابوں میں پائی جاتی ہیں جو اس زمانے میں اس مقصد کے تحت لکھی گئی تھیں کہ ان مناظروں کے نتائج کو محفوظ کیا جا سکے۔ بظاہر یہ کتابیں مسلم نقطۂ نظر کی حامل ہیں، لیکن اس وقت ہندوستان کے مختلف مذہبی طبقوں کے مابین کیا کچھ ہو رہا تھا اس کو سمجھنے کے لئے یہ اب بھی مفید اور کارآمد ہیں)[۱۴]

عہد ماضی کے معروضی مطالعہ کی بنیاد پر ممکن ہے کہ آج کوئی شخص یہ نتیجہ نکالے کہ انیسویں صدی کا ہندو سماج اپنی فطرت کے لحاظ سے جارحیت پسند نہیں تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس وقت کے ان کے معاصرین حالات کو کس نظر سے دیکھ رہے تھے۔ دور سے نظر آنے والی اشیاء کو جب نگاہِ ژرف بیں سے دیکھا جاتا ہے تو وہ بسا اوقات جوں کی توں نہیں معلوم ہوتی ہیں مثلاً یہ ایک حقیقت ہے کہ غدر کے بعد کا ہندو سماج اپنے ان لیڈروں کے اثر میں آتا جا رہا تھا جو سماجی مصلح کی حیثیت سے میدان میں وارد ہوئے تھے، اس زمانے کی بیشتر ہندو تحریکات اصلاحی تحریکات کے طور پر وجود میں آئی تھیں ان میں سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ موثر بالخصوص شمالی ہندوستان میں، پنڈت دیانند سرسوتی کی سرکردگی میں چلنے والی تحریک آریہ سماج تھی۔ آریہ سماج جیسی تحریکات بنیادی طور پر ہندو سوسائٹی کی ان سماجی برائیوں کے انسداد کی

خواہاں تھیں جو اس وقت ہندو مذہب کا جزء بن گئی تھیں لہٰذا ان کے لیڈروں نے سیاسی اور روحانی بیداری کی خاطر مسلم عہد حکومت سے قبل کی ہندوستانی تاریخ کو اپنا مطمح نظر بنایا ۱۸۷۵ء میں پنڈت دیانند نے اپنی مشہور اور متنازعہ فیہ کتاب "ستیارتھ پرکاش" شائع کی جس میں انھوں نے ہندو مذہب کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کے علاوہ غیر ہندو مذاہب پر کسی حد تک غیر شائستہ زبان میں اظہارِ خیال کیا تھا۔ آریہ سماجیوں کے نزدیک اس کتاب کا مقام ہمیشہ بلند رہا اور یہ ان کے لئے ایک طرح سے "صحیفۂ مذہبی" بنی رہی ہے بایں ہمہ ہندوؤں کی طرف سے شاید ہی کوئی ایسی کوئی کوشش کی گئی ہو جس میں آریہ سماجیوں کو یہ سمجھایا گیا ہو کہ وہ "ستیارتھ پرکاش" اور خاص طور سے اس کے ان ابواب کی زبان اور لہجہ پر نظر ثانی کرلیں جن میں دوسرے ہندوستانی مذہبی طبقوں سے بحث کی گئی ہے۔ شروع سے ہی اس کتاب کے ایڈیشن پر ایڈیشن شائع ہوتے رہے اور ہندوستان کے مختلف مذاہب کے مابین اور خاص طور سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت و عناد کی آگ بھڑکاتے رہے، اس کتاب کی اشاعت کے چند سال بعد ۱۸۸۲ء کے قریب پنڈت دیانند جی نے تحفظ گاؤ کے مسئلہ پر اپنی کتاب "گوکرونا ندھی" شائع کی اور اسی زمانے میں انھوں نے "گورکھشنی سبھا" ("مجلس تحفظ گاؤ") قائم کی، فارکہر (Farquhar) کے الفاظ میں اس تنظیم کا مقصد گائے اور بچھڑے کے ذبیحہ کے سوال پر عیسائیوں اور مسلمانوں کے خلاف ہندو عوام کے جذبات کو بھڑکانا تھا نیز حکومت کے سامنے اسی دیو قامت عرضداشت کو پیش کرنا تھا جس میں گائے کے ذبیحہ پر پابندی لگانے کی درخواست کی گئی تھی۔[۱۵]

آج کوئی اپنے قاری کو اس بات کا یقین تو دلا سکتا ہے کہ انیسویں صدی کی یہ ہندو تحریکات محض اصلاحی اور تہذیبی نوعیت کی تھیں تاہم اس زمانے کے معاصرین کے خدشات اور اندیشوں کو ناقابل توجہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ لاہور کے ڈاکٹر گرسولڈ (Griswold) کی انڈین ایونجیکل ریویو کے شمارہ جنوری ۱۸۹۲ء میں تحریر کردہ درج ذیل سطروں سے کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آریہ سماج کی سرگرمیوں کو اس کے معاصرین کن نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"بالآخر پنڈت دیانند سرسوتی نے برہمنیت کے اثر و رسوخ سے یوں آزادی حاصل کرلی جس طرح لوتھر (Luther) نے رومن کلیسا کے دائرہ اثر سے نجات پالی تھی۔ لوتھر کا نعرہ "اگر بائبل کی طرف رجوع" "Back to Bible" تو پنڈت دیانند کا نعرہ "ویدوں کی طرف مراجعت" تھا۔ اس مذہبی نعرے کے ساتھ ساتھ گو صریحاً نہیں لیکن عملی طور پر ایک دوسرا نعرہ جوڑ دیا گیا تھا یعنی "ہندوستان ہندوستانیوں کے لئے ہے"۔ ان دو نعروں کے ساتھ ساتھ ہمارے پیش نظر دیانندجی کا یہ مذہبی اور سیاسی اصول بھی ہے کہ ہندوستان کا مذہب اور ہندوستان کی حکومت ہندوستانی لوگوں کے ہاتھوں میں ہونی چاہیئے، دوسرے الفاظ میں ہندوستانی مذہب ہندوستانیوں کے لئے اور ہندوستانی اقتدار ہندوستانیوں کے لئے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ایک طرف اگر ویدوں کی طرف رجوع کر کے ہندوستانی مذاہب کی تطہیر و اصلاح کرنا تھا تو دوسری طرف اسلام اور عیسائیت جیسے غیر ملکی مذاہب کو ملک بدر کرنا بھی تھا۔ اس طرح ان کے پروگرام میں دیسی مذاہب کی اصلاح اور بدیسی مذاہب کی ملک بدری شامل تھی۔"

دونوں گروہوں کے مذہبی لیڈروں نے عوامی سطح پر جب مذہبی تنازعات کے حل کرنے کی کوشش کی تو اس چیز نے پہلے ہی سے بگڑتے روابط کو اور بھی بگاڑ دیا۔ یہ جھگڑے مسلمانوں کے ذہنوں میں دو طرح کے خیالات پیدا کر رہے تھے، ایک تو یہ کہ انھوں نے محسوس کیا کہ ہندو ان پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں دوسرے یہ کہ ہندوؤں کی ان کوششوں کے پسِ پردہ انگریزوں کا ہاتھ ہے اس طرح وہ ہندوؤں اور انگریزوں دونوں سے بدگمان ہو گئے۔

(۳)

علی گڑھ سیکولر مکتبۂ فکر کو ہندو مذہب پر اسلام کی برتری ثابت کرنے سے کہیں زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی مفادات کا تحفظ کیسے کیا جائے، سرسید

کے زیر قیادت یہ گروپ ان مسلمان "شرفاء" پر مشتمل تھا جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں مسلم دور حکومت کے باقاعدہ خاتمہ سے بہت پہلے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ اس ڈرامہ کا اختتام قریب آ پہنچا ہے جس میں مغلیہ حکومت ایک نمایاں رول ادا کر رہی تھی۔ مثلاً سر سید احمد خاں (۱۸۱۷۔ ۱۸۹۸) نذیر احمد (۱۸۳۱۔ ۱۹۱۲) ذکاء اللہ (۱۸۳۲۔ ۱۹۱۴) محسن الملک (۱۸۳۷۔ ۱۹۰۷) الطاف حسین حالی (۱۸۳۷۔ ۱۹۱۴) اور علی گڑھ برادری سے متعلق دیگر سربرآوردہ حضرات نے غدر سے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا کہ جلد یا بدیر برطانوی حکومت مغلوں کی جگہ لینے والی ہے، غدر کے دوران ان لوگوں کی عمریں کچھ زیادہ نہیں تھیں اور یہ سب کے سب "ایسٹ انڈیا کمپنی کی خدمت میں کسی نہ کسی طرح مشغول تھے (سر سید منصف تھے، محسن الملک شعبۂ مالیات میں کلرک تھے، حالی لاہور میں انگریزوں کے قائم کردہ حکومت پنجاب کے بک ڈپو میں مترجم تھے، اور نذیر احمد ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول تھے۔)

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ مذکورہ شخصیتوں میں شاید ہی کسی کو جدید تعلیم حاصل کرنے کا بھرپور موقع ملا ہو تقریباً سبھی کی تعلیم و تربیت عہد وسطی کے تعلیمی نظام میں مکمل ہوئی تھی، مغربی خیالات سے ان کی واقفیت ثانوی ذرائع کی رہین منت تھی ـــــ یا تو مغربی کتابوں کے اردو ترجموں کے ذریعہ یا پھر اپنے انگریز دوستوں کے ذریعہ جو برطانوی دفاتر میں ملازم تھے۔ لیکن یہی لوگ مسلمانوں میں مغربی قدروں کے واحد ترجمان تھے، نتیجتہً ان لوگوں نے جب اپنے قدیم سرمایے کی چھان بین شروع کی تو اعتدال و توازن کی روش قائم نہ رکھ سکے۔ مثلاً ڈپٹی نذیر احمد، جن کا شمار اساطین اردو میں کیا جاتا ہے، اپنے ادبی سرمائے سے نہ صرف یہ کہ غیر مطمئن تھے بلکہ مغربی ادب کے مقابلہ میں اسے گھٹیا سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں ان کا اپنا ادب غلط بیانی اور خوشامد کا پٹارہ تھا۔ اگرچہ وہ بقول خود بڑھاپے میں میاں مٹھو کی طرح انگریزی کے کچھ الفاظ بولنے لگے تھے لیکن حقیقتاً مشرقی ادب کے مطالعہ نے ان کی ذہنی بالیدگی کو جو نقصان پہونچایا تھا اس کا مداوا نہیں ہو سکتا تھا۔[16] اسی طرح حالی کی آنکھیں بھی انگریزی ادب کی چمک دمک سے خیرہ ہو چکی تھیں، اور خود ان کے کہنے کے مطابق انگریزی ادب کی محبت نے آہستہ آہستہ ان کے دل سے مشرقی خصوصاً فارسی ادب

کی محبت کو نکال پھینکا تھا۔"

بہر حال مشرق و مغرب کے پیچیدہ مسائل کا ناقص علم رکھنے کے باوجود علی گڑھ مکتب فکر نے ہی خلا کو کسی حد تک پر کیا اور وہ مسلم طبقے کا ترجمان بن گیا، مسلمانوں کی فلاح وبہبود کی خاطر اس گروپ کو حکمراں طبقے پر مکمل بھروسہ کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ مسلمان حکومت کے دست راست بن جائیں اور زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر ملازمتیں حاصل کریں، اردو کے مشہور طنز نگار شاعر اکبرالہ آبادی (۱۸۴۶ء — ۱۹۲۱) نے جنھیں ان کے ہمعصروں نے "لسان العصر" کا خطاب دیا تھا اس صورت حال کی تصویر کشی اپنے خاص انداز میں کی ہے:

انگریز خوش ہے مالک ابرو پیین ہے
ہندو مگن ہے اس کا بڑا لین دین ہے
بس اک ہمیں ہیں ڈھول کا پول اور خدا کا نام
بسکٹ کا صرف چور ہے لمنڈ کا پھین ہے

بسکٹ کا چورا اور لمنڈ کا پھین بھی صرف اسی وقت تک مل سکتا تھا جب تک حکومت خوش رہتی۔ اس طرح گورنمنٹ کی رضا جوئی ایک ایسے محور کے مانند تھی جس پر علی گڑھ کی گاڑی چکر لگا رہی تھی۔ کسی حالت میں بھی یہ لوگ برطانوی حکومت کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے، آج ہمیں سننے میں یہ بات بھلے ہی اچھی نہ معلوم ہو کہ علی گڑھ کی قیادت نے برطانیہ کے ساتھ تعلقات و روابط قائم کرنے میں کچھ زیادہ ہی فراخ دلی کا ثبوت دیا لیکن اگر ہم اس وقت کے عام حالات کے پس منظر میں امر واقعہ کا تجزیہ کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ ان کے موقف میں معقولیت تھی۔ یہ حقیقت تقریباً تسلیم شدہ ہے کہ غدر میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مساوی حصہ لیا تھا لیکن بغاوت کو کچلنے کے بعد انگریزوں نے خاص طور سے مسلمانوں کو اس تحریک کے بھڑکانے کا ذمہ دار قرار دیا اور انھیں اپنے انتقام کا خاص نشانہ بنایا۔ صرف افراد کو سزائیں نہیں دی گئیں بلکہ مسلمانوں پر بحیثیت مجموعی سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کر دیے گئے۔ انگریزوں کے اس

امتیازی رویے کو ہندوؤں نے بالعموم سراہا لیکن جب مختلف اسباب کے پیش نظر حکومت نے اپنی اس پالیسی پر نظر ثانی کی اور مسلمانوں کے ساتھ مصالحانہ حکمت عملی اختیار کی تو ہندوؤں نے اس بات کو پسند نہ کیا اور ان کے اخبارات نے ناقابل تسخیر کو مسخر کرنے کی غیر عاقلانہ کوششوں پر لمبے چوڑے مضامین شائع کئے۔"[۱۹] ۱۸۷۰ء میں کلکتہ کے ہندو پیٹریاٹ (HINDU PATRIOT) نے حکومت سے اس بات کی اپیل کی وہ مسلم نواز پالیسی سے باز آجائے، کیونکہ تمام مسلمان غدار اور انگریزوں کے دشمن ہیں[۱۹]۔

اس جائزے سے بہر حال ایک بنیادی اور واضح نکتہ یہ سامنے آتا ہے کہ اس وقت تک نہ تو علی گڑھ اسکول کی جمہوری قیادت کو اور نہ ہی علماء کی مذہبی سیادت کو کل ہند پیمانے پر سربراہی کا درجہ حاصل تھا۔ غیر ملکی حکمرانوں کے بارے میں جہاں تک علماء کا رویہ تھا تو ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ بنگال میں ان کا ایک گروپ کھل کر مسلمانوں کو انگریزوں سے قریب لانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ علی گڑھ کی "آل انڈیا" حیثیت اس وقت واضح ہو جاتی ہے جب ہم ہندوستان کے جنوبی اور مغربی حصوں کی سیاسی اور سماجی صورت حال پر نظر ڈالتے ہیں۔

جنوب مغربی ہندوستان کے مسلم طبقوں کی معاشی اور سماجی بنیادیں شمالی ہند کے مسلمانوں کی سماجی اور معاشی بنیادوں سے قطعی طور پر مختلف تھیں۔ شمال مسلم حکومت کا گڑھ رہ چکا تھا لہذا یہاں جاگیردارانہ نظام کو فروغ حاصل تھا۔ اس کے برخلاف ملک کے جنوبی اور مغربی حصے کے لوگ اپنی بقا کے لئے حکمراں طبقے پر انحصار نہیں کرتے تھے، اس چیز نے ہندوستان کے دونوں حصوں کے مسلمانوں کے نقطۂ نظر میں خاصا فرق پیدا کر دیا تھا۔ چونکہ بمبئی اور مدراس کے مسلمانوں کو اپنی روٹی روزی کے لئے حاکموں پر بہت زیادہ بھروسہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی اس لئے مغلیہ سلطنت کے زوال کا بھی ان پر بہت کم اثر پڑا۔ یہاں کا سربرآوردہ طبقہ پیشہ ورانہ اور تاجرانہ حلقے سے تعلق رکھتا تھا۔ مزید برآں تعلیمی لحاظ سے بھی یہ لوگ شمال کے مسلمانوں کے بالمقابل زیادہ ترقی یافتہ

تھے، اس لئے فطری طور پر شمالی ہند کے مسلمان اور مغرب سمیت جنوب کے مسلمان معاش پر مبنی سیاسی مسائل کو ایک ہی عینک سے نہیں دیکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شمالی ہند کے مسلمانوں کے برخلاف جنوب اور مغرب کے ممتاز لوگ کانگریس میں شمولیت کو نقصان دہ نہیں تصور کرتے تھے۔ غالباً اسی لیے کانگریس کے تیسرے سالانہ جلسے میں اپنے صدارتی خطبے کو پیش کرتے ہوئے بدرالدین طیب جی نے اس بات پر حیرت ظاہر کی تھی کہ "مسلمان اپنے برادران وطن کے ساتھ مشترکہ فائدے کی خاطر شانہ بشانہ چلنے کے لئے تیار نہیں ہیں... حالانکہ بمبئی پریزیڈنسی میں ہم نے اسی اصول پر عمل کیا ہے"[۲۰]

یہ ایک قابل لحاظ حقیقت ہے کہ گاندھی جی کی کانگریس میں شمولیت سے قبل (۱۸۸۵ـ۱۹۲۰) تین مسلمان کانگریس کی صدارت کے عہدہ تک پہنچ چکے تھے، لیکن ان میں سے کسی کا تعلق شمال سے نہ تھا۔ پہلے صدر تو بمبئی کے بدرالدین طیب جی تھے (تیسری کانگریس، مدراس ۱۸۸۷ء) دوسرے صدر رحمت اللہ محمد سیانی تھے (۱۲ویں کانگریس، کلکتہ ۱۸۹۱ء) ان کا تعلق بھی بمبئی سے تھا۔ تیسرے صدر مدراس کے رہنے والے سید محمد تھے (۲۸ویں کانگریس، کراچی ۱۹۱۳ء) سید محمد کے سلسلے میں ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ کانگریس کی تاریخ میں وہ واحد شخص تھے جنھیں تین امتیازات حاصل تھے، یعنی وہ استقبالیہ کمیٹی کے چیرمین (۱۹۰۳)، پارٹی کے صدر (۱۹۱۳ء) اور اس کے سکریٹری (۱۹۱۴ـ۱۷ء) تھے۔[۲۱]

اس حقیقت کے باوجود کہ جنوب اور مغرب کے مسلمان اصولی طور پر ہندوؤں کے ساتھ مل کر سیاسی جدوجہد کرنے کو ضروری سمجھتے تھے۔ وہاں کے مسلمان لیڈروں پر یہ الزام قطعاً نہیں لگایا جا سکتا کہ انھوں نے ہندو دوستی کی خاطر مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی طرف سے نظریں بند کر لی تھیں، اس کے برعکس وہ مسلم مسائل میں کھلم کھلا دلچسپی دکھاتے تھے، مثلاً بدرالدین طیب جی نے اپنے آپ کو مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی خدمات کے لئے وقف کر دیا تھا۔ انھوں نے بمبئی میں "انجمن اسلام" قائم کی جس کے زیر نگرانی چلنے والے اسکولوں، اقامت گاہوں، ورزش گاہوں اور کلبوں

کے ذریعہ نہ صرف انھوں نے مسلم طبقے میں جدید تعلیم کو مقبول بنایا بلکہ اور بہت سی دوسری سماجی اور معاشرتی اصلاحات کا آغاز بھی کیا۔ وہ تعلیم نسواں کے بہت بڑے حامی تھے، علاوہ ازیں بمبئی میں "اسلام کلب" اور "اسلام جمنازیم" (اب جمخانہ) جیسے جدید ثقافتی مراکز کے قیام کی ذمہ داری بھی طیب جی کے سر جاتی ہے[۲۲]۔ اسی طرح جنوب میں سید محمد اتنے زیادہ باعزت اور باحیثیت تھے کہ جب ۱۹۰۶ء میں شمالی ہند کے مسلمان قائدین لارڈ منٹو کے پاس وفد لے کر جانے لگے تو وہ ان کو نظرانداز نہ کر سکے۔ منتظمین وفد نے ان سے اس وفد میں شمولیت کی درخواست کی۔ لیکن انھوں نے شرکت کرنے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ وفد ان کے اس مشورے کو ماننے پر تیار نہ تھا کہ عرضداشت سے "علاحدہ فرقہ وارانہ نمائندگی" کے سوال کو ختم کر دیا جائے[۲۳]۔

(۴)

اب غالباً یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر تک جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، مسلمانوں کی اپنی کوئی مخصوص سیاسی تنظیم نہیں تھی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہندوستانی مسلمان بحیثیت مجموعی سیاست سے بیگانہ تھے کیونکہ اس وقت بھی کچھ مسلمان انڈین نیشنل کانگریس میں تھے اور کچھ سرسید کے سیاسی فلسفے کی اتباع کر رہے تھے، بہرحال مسلمانوں کی اپنی کوئی باقاعدہ پارٹی نہیں تھی، بیسویں صدی کے آغاز میں بعض مسلمان لیڈروں نے جن کا سیاسی رجحان سرسید سے مختلف نہ تھا مسلمانوں کی ایک سیاسی پارٹی ——— آل انڈیا مسلم لیگ ——— بنائی۔ جس کی تشکیل میں مختلف خیالات ظاہر کیے جاتے ہیں۔ بعض لوگ یہ الزام لگاتے ہیں کہ مسلم لیگ مسلمانوں کے درمیان کانگریس کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کے لیے لارڈ منٹو کے اشارے پر بنائی گئی تھی۔ یہ الزام صحیح ہے یا غلط اس سے یہاں بحث نہیں، بہرحال اس کے قیام کے متعلق ایک تشریحی بیان مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ ـ ۱۹۳۱) کا موجود ہے جن کا اس پارٹی کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے سوال پر انھوں نے اپنے اردو اخبار "ہمدرد" میں لکھا تھا کہ:

"میں بار بار کہہ چکا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ یہ ایک اتفاقی امر نہیں ہے کہ کلکتہ، مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیوں کے قیام کے ٹھیک تیس سال بعد کانگریس کی بنیاد رکھی گئی اور علی گڑھ کالج کے قیام کے ٹھیک تیس سال بعد مسلم لیگ کا آغاز ہوا اور علی گڑھ کالج کی تعلیم اور لیگ کے قیام کا تعلق اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کے بانی تقریباً تمام کے تمام سید احمد ہی کے کالج کے سپوت تھے۔

اب مسلمانانِ ہند کی سیاسی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا، چند ماہ قبل مسلمانوں کا ایک وفد لارڈ منٹو وائسرائے ہند کے پاس اس غرض سے شملہ جا چکا تھا کہ مجوزہ مارلے منٹو اسکیم کے متعلق اپنے مطالبات پیش کرے، اگر زمانہ جنگ کے برطانوی اخبار نویسوں کے فیشن کی تقلید کی جائے جو ہر بات کے متعلق بعد میں یہ کہا کرتے تھے کہ اب اس کے اظہار میں کوئی قباحت نہیں ہے تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ اب اس کے اظہار میں کوئی قباحت نہیں کہ یہ وفد حسب الحکم شملہ گیا تھا، ظاہر ہے کہ گورنمنٹ اس وقت تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے مطالبات رد نہیں کر سکتی تھی لہذا اس کا ارادہ تھا کہ حسب عادت ایک لقمہ دے کر کچھ دن کے لئے ان کی دہان بندی کر دے۔ اس وقت تک مسلمانوں کی مثال اس آئرش قیدی کی سی تھی جس نے جج کے اس سوال پر کہ اس کا کوئی وکیل بھی ہے جو اس کی طرف سے پیروی کرے، صاف صاف کہہ دیا کہ "نہیں، میں نے وکیل تو نہیں کیا لیکن جوری میں میرے دوست ہیں" لیکن اب جوری میں مسلمانوں کے جو دوست تھے انھوں نے آہستہ سے ان کے کان میں کہہ دیا کہ مجرم کو اور لوگوں کی طرح باقاعدہ مشیر قانونی کی ضرورت ہے۔"[۲۴]

مسلم لیگ کے قیام کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے دو پارٹیاں تھیں جن میں سے کسی ایک کا انتخاب انھیں کرنا تھا۔ پہلی پارٹی تو انڈین نیشنل کانگریس تھی جو مذہبی تفریق سے بلند ہو کر تمام ہندوستانیوں کی نمائندگی کی دعویدار تھی۔ دوسری پارٹی خود آل انڈیا مسلم لیگ تھی جو اس عزم وارادہ کے ساتھ میدان سیاست میں اتری تھی کہ وہ مسلمانوں کے مخصوص مفادات کی نگہداشت کرے گی۔ اس وقت تک دونوں جماعتوں کی قیادت بلا شرکت غیرے مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کے ہاتھوں میں تھی۔ علماء مجموعی طور پر سیاست سے کنارہ کش

تھے ۔ ان حالات میں کلکتہ کے افق پر ایک نوجوان ابھرتا ہے اور دیکھتے دیکھتے علمار کو میدانِ سیاست میں گھسیٹ لاتا ہے ۔

یہ مولانا ابوالکلام آزاد تھے جن کے بارے میں دیوبند کے مشہور عالم شیخ الہند مولانا محمود حسن نے فرمایا تھا کہ ہم (علمار) سو رہے تھے ، ابوالکلام نے ہم لوگوں کو نیند سے بیدار کیا۔[۲۵]

ہندوستانی سیاست کے اسٹیج پر علمار کے اس یکایک ظہور نے ملک کی مسلم سیاست میں ایک نیا زاویہ پیدا کر دیا ۔ اب تک مذہب اور سیاست دونوں اپنا الگ الگ میدان عمل رکھتے تھے ۔ لیکن علمار کی آمد کے بعد سیاست کو مذہب کا ایک گوشہ قرار دیا گیا ۔ ہمیں معلوم ہے کہ گذشتہ صدی کے اختتام پر سرسید نے مسلمانوں سے درخواست کی تھی کہ وہ عملی سیاست سے احتراز کریں لیکن یہ درخواست مذہبی بنیادوں پر نہ تھی ۔ ان کی واحد دلیل یہ تھی کہ مسلمان چونکہ تعلیمی میدان میں پیچھے ہیں اس لئے وہ برطانوی حکومت کی مدد کے بغیر سرکاری ملازمتوں میں اپنا مکمل حصہ نہیں پاسکیں گے ۔ ان کی اس دلیل میں اس بات سے قطع نظر کہ صحیح ہے یا غلط مذہب کا کوئی رول نہیں تھا ۔ انھوں نے کبھی نہیں کہا کہ سیاست میں حصہ لینا مذہبی لحاظ سے ممنوع ہے ۔

دوسری طرف جب مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کو ہندوستانی سیاست کی بازی گاہ میں اترنے کے لئے اکسایا تو اپنے سیاسی خیالات کی پوری عمارت انھوں نے مذہبی بنیادوں پر استوار کی ۔ سیاست کا جھنڈا اٹھانے والے علمار نے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو خوب خوب بھڑکایا ۔ انھوں نے مسلمانوں کو یہ بات باور کرانے کی کوشش کی کہ مذہبی آزادی سیاسی نجات سے کہیں زیادہ اہم اور ضروری ہے ۔[۲۶]

اس چیز کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ سیاسی امور میں مسلمانوں کی رہنمائی مذہب کے نام پر اس انداز سے کی گئی کہ جس بات کے متعلق بھی انھیں بتا دیا جاتا تھا کہ یہ شریعت کے خلاف ہے تو اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی وہ جرأت نہیں کرسکتے تھے ۔

یہ رجحان برابر قائم رہا جدوجہد آزادی کے دوران پہلی صف میں براجمان علمار کو

ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مذہبی حوالوں کے بغیر بات نہیں کرتے تھے اور ہر مسئلہ کا تصفیہ مذہبی بنیادوں پر کرتے تھے۔ علماء کے خیال کے مطابق اس وقت کے مسلمانوں سے یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ مذہبی فرض کے طور پر خلافت تحریک کے مقاصد کی تائید اور تعاون کریں گے۔[۲۷] بیرونی سامانوں کا بائیکاٹ ان پر اس لئے لازم تھا کہ ان کے مذہب کا یہی فیصلہ تھا۔[۲۸] ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا بھی ان پر یوں ضروری تھا کہ خدا نے اس کا حکم دیا تھا۔[۲۹]

ایک مرتبہ جب مسلمانوں کی تربیت اس انداز سے کردی گئی کہ وہ سیاست کو مذہب کی عینک سے دیکھا کریں تو ان سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ مذہبی دلائل کے علاوہ وہ کسی اور بات پر دھیان دھریں گے۔ جب تک علماء بحیثیت مجموعی قوم پرست تھے اس وقت تک مسلم عوام کو اپنے ساتھ لے کر قومی سیاست کی ڈگر پر چلتے رہنا ان کے لئے آسان تھا لیکن جب بعض علماء پر مسلم لیگ نے دسترس حاصل کرلی تو یہ صورت حال جاتی رہی۔ لیگی علماء جمعیۃ علمائے اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور نیشنلسٹ علماء کے ہر اقدام کی مذہبی بنیادوں ہی پر مخالفت کرنے لگے، مسلم اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کے اس فیصلے کو ہر شخص غیر منطقی کہے گا جس کے تحت انھوں نے مطالبۂ پاکستان کی حمایت کی تھی لیکن گذشتہ صفحات میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کی روشنی میں اس پر حیرت واستعجاب کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ سب سے پہلے نیشنلسٹ علماء نے قرآن واحادیث کی بنیاد پر اپنے سیاسی موقف کو ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ وقت آنے پر لیگی علماء نے مطالبۂ پاکستان کی تائید میں انھیں ماخذ وحوالہ جات کا سہارا لیا اور اپنے فعل کو اسلامی عمل قرار دینے کی پوری کوشش کی۔ اس موقف کے علاوہ ہر خیال ان کے نزدیک غیر اسلامی تھا۔ پاکستان روئے زمین پر حکومت الٰہیہ قائم کرنے کی جانب پہلا قدم تھا اس لئے اس بات پر زور دیا گیا کہ الکشن میں اگر مسلم لیگ کو شکست ہوئی تو ایک صالح اور صحتمند اصول ہمیشہ کے لئے دفن ہوجائے گا۔[۳۰]

ہندوستانی مسلمانوں سے قوم پرست علماء مذہب کی راہ میں قربانی کا مستقل طور پر

مطالبہ کرتے رہے تھے ۔ مثلاً ۱۹۲۰ء میں ہزاروں مسلمان اپنی مساجد و مقابر کو غیر مسلموں کے حوالے کر کے علماء کی اس یقین دہانی پر ملک سے ہجرت کر گئے تھے کہ ایسا کرنا ان کی مذہبی ذمہ داری تھی۔ تحریک عدم موالات کے دوران مسلم وکلاء اور تجار نے اپنا پیشہ ترک کر کے اور بیرونی سامان کا بائیکاٹ کر کے غربت و افلاس کو صرف اس وجہ سے گلے لگا لیا تھا کہ ان کے سامنے ترک موالات کی منطق کو مذہبی پلیٹ فارم سے پیش کیا گیا تھا[۳۱] اگر اس وقت کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو مسلمانوں کو ان کی مذہبی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے روک سکتی تو تقسیم کے دوران کون سی ایسی چیز ہو سکتی تھی جو ان کو اپنی قربانیوں سے باز رکھ سکتی تھی ۔ یہ بہرحال مذہبی سیاست کی ایک شاندار فتح تھی کہ ملک تقسیم ہو گیا اور ہندوستان میں بود و باش کو ترجیح دینے والے مسلمانوں کے سامنے نئے نئے مسائل آ کھڑے ہوئے ۔[۳۲]

(۵)

جمہوریۂ ہند میں مسلمانوں کو ایک غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنا پڑا ۔ آل انڈیا مسلم لیگ جو اب تک مسلم مفادات کی واحد ترجمان ہونے پر مصر تھی میدان سے یکایک غائب ہو گئی ۔ نام نہاد سیکولر ذہن رکھنے والے مسلم رہنما یا تو مسلمانوں کو اپنی حکومت کا وفادار رہنے کی تلقین کر کے پاکستان پرواز کر گئے یا پھر اپنے گذشتہ اعمال کی تلافی اس بات کے اظہار کے ذریعہ کرنے لگے کہ وہ وفاداروں سے بڑھ کر وفادار اور مخلص ہیں ۔

ان سب باتوں کے علاوہ تقسیم ملک کے ساتھ ہی خونریزی، قتل و غارت گری اور بڑے پیمانے پر ہجرت کا سلسلہ چل نکلا اس طرح مسلم سیاست کچھ عرصہ کے لئے معطل ہو کر رہ گئی اور ۱۹۴۸ء کے لکھنؤ اجلاس میں مسلمانوں نے یہ طے کر لیا کہ اب وہ علحدہ مسلم سیاسی جماعتیں نہیں بنائیں گے ۔ درحقیقت یہ فیصلہ ان کی اس دیرینہ روش سے زبردست انحراف کے مترادف تھا جن کے مطابق ان کی سیاسی تربیت ہوئی تھی لیکن حالات کا دباؤ اتنا شدید تھا کہ علماء بھی سیاست کو مذہب کی حدود سے باہر رکھنے پر مجبور ہو گئے حتیٰ کہ جمعیۃ علمائے ہند نے بھی مستقبل میں صرف مذہبی اور سماجی مقاصد کے لئے جدوجہد کرنے

کا اعلان کر دیا۔ ان حالات میں عین ممکن تھا کہ مسلمان غیر مذہبی سیاست کو اپنا لیتے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی ہندوستانی سیکولر قیادت کے سامنے کوئی واضح پروگرام نہیں تھا۔ اس طرح خود "سیکولر سیاست" ایک بے معنی لفظ بن کر رہ گئی اور اس دوران غیر سیکولر قوتیں اپنے کام میں برابر مشغول رہیں اور مسلمانوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ وہ اب اپنے مذہبی امتیازات کو برقرار رکھے بغیر زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتے۔ فرقہ وارانہ فسادات اور مسلم طبقے کے ساتھ انتظامیہ کے سوتیلے پن نے ان لوگوں کی راہیں ہموار کر دیں اور اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کی خاطر آواز بلند کرنے کو اپنی مذہبی ذمہ داری خیال کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ علماء نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ آزادیِ وطن کے لئے اپنی قربانیوں کے باوجود مسلمانوں کو اپنے ہی ملک میں مذہبی انداز سے زندگی گذارنے کے حق سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ اس طرح وہ علی الاعلان یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ برطانوی راج سے نجات پانے کے لئے مسلمانوں کا جوش وخروش مدھم پڑ جاتا اگر انھیں پہلے سے یہ معلوم ہو جاتا کہ آزادی کے بعد اسلامی عقیدے کے مطابق زندگی گذارنے کی ان کی فطری اور آئینی خواہش کو پروان چڑھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔[۳۲]

رفتہ رفتہ حالات نے انھیں لکھنؤ کے فیصلے پر نظر ثانی کے لئے مجبور کر دیا اور انھوں نے مستقبل کے لئے متعدد پروگرام بنائے اس طرح ۱۹۶۴ء میں مسلم مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا جس میں جماعت اسلامی نے بھی جو اب تک عملی سیاست سے کنارہ کش تھی، حصہ لیا۔ اپنے منشور کے مطابق مشاورت کوئی سیاسی پارٹی نہیں تھی لیکن سیاست سے بہر حال اس کا گہرا تعلق تھا اس نے حق رائے دہندگی کے سلسلے میں مسلمانوں کو مثبت رہنمائی بہم پہونچانے کا اہتمام کیا۔ اس سے قبل مسلمان بالعموم اپنے ووٹ کانگریس کی حمایت میں ڈالتے تھے۔ مشاورت نے مسلمانوں سے درخواست کی کہ وہ اپنے ووٹوں کا استعمال ان لوگوں کی تائید میں کریں جو ان کے مقاصد کے سلسلے میں تعاون دینے کا عہد کریں بہر حال یہ کسی قدر ایک نیا تجربہ تھا لیکن الیکشن کے فوراً بعد ان لوگوں نے جن پر مشاورت

اپنا دعویٰ رکھتی تھی، جتلا دیا کہ وہ اپنی پارٹی کے سوا اور کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں۔

حالات ایسے حوصلہ شکن ثابت ہوئے کہ مشاورت کے ایک گروپ نے مسلم مفادات کی نگہداشت کی خاطر ایک علٰحدہ تنظیم بنانے کی بابت سوچنا شروع کر دیا۔ کچھ ہی دنوں بعد ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی مرحوم کی قیادت میں مشاورت کے وہ تمام لوگ اکٹھا ہونے شروع ہو گئے جو تنظیم کے جامد اور انفعالی طریق کار سے متفق نہیں تھے اور انھوں نے مسلم مجلس کے نام سے ایک الگ سیاسی جماعت بنائی جو آج بھی موجود ہے۔

علماء کا اب بھی یہ خیال ہے کہ وہ مسلم طبقے کے مذہبی مفادات کے تحفظ کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں سے پہلو تہی نہیں کر سکتے اسی لئے ایسی ہر کوشش کا جس میں مسلمانوں کے مذہبی تشخص کے ضائع ہونے کا ذرا بھی امکان پایا جاتا ہو مقابلہ کرنا اور اسے شکست دینا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس احساسِ ذمہ داری کی تازہ مثال دلی میں منعقدہ ۱۹۷۷ء کا ملی کنونشن ہے جس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے مسلمان اپنی مذہبی وحدت کو ظاہر کرنے کے لئے اکٹھا ہوئے تھے۔

نتھوانی کمیشن[۳۴] کے بارے میں جو بوہرہ طبقے کے سیدنا پر ان کے باغی متبعین کے ذریعہ لگائے گئے مبینہ الزامات کی تحقیقات کر رہا تھا، کنونشن نے ایک تجویز پاس کر کے ان لوگوں کے خیالات کی تائید کر دی جو اس قسم کے تحقیقاتی کمیشن کی تقرری کو اقلیت کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی تصور کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو یہ بات یقیناً حیرت انگیز معلوم ہو گی کہ ایسے وقت میں جبکہ پاکستان احمدیہ فرقے کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دے رہا تھا ہندوستان کے مسلم علماء بوہروں کو کلیجے سے لگا رہے تھے، بہر حال اس سلسلے میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے تاہم اس سے اس بات کا تو پتہ چلتا ہے کہ علماء مسلم طبقے کی جانب سے اپنے اوپر عائد شدہ ذمہ داریوں کے بارے میں فکر مند ہیں۔

آج کی مسلم سیاست قطعی طور پر اس سے مختلف ہے جس کا تصور ملک کی آزادی کے فوراً بعد کیا گیا تھا۔ آج مسلمان لیڈر اور مسلم جماعتیں خواہ وہ سیاسی ہوں یا غیر سیاسی

اپنے مطالبات کا اظہار الفاظ چبا چبا کر نہیں کرتیں بلکہ کھل کر ملازمتوں اور پارلیمنٹ میں بہ لحاظ تعداد مسلمانوں کی نمائندگی کا مطالبہ کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر حالیہ پارلیمانی الیکشن کے موقع پر جمعیۃ علمائے ہند نے فوج، پولیس اور دفاعی محکموں میں مسلمانوں کے لئے ۳۳ فی صد جگہیں مخصوص کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اسی طرح مسلم مجلس مشاورت بھی اس بات کے حق میں تھی کہ پولیس اور انتظامی محکموں میں مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ نمائندگی ملنی چاہیئے۔ مولانا عبد اللہ بخاری امام جامع مسجد دہلی نے اپنے اس مطالبے کو پوری شد و مد کے ساتھ پیش کرنا شروع کر دیا تھا کہ مسلمانوں کو نظم ونسق قائم کرنے والے اداروں میں ۲۰ فی صد ریزرویشن ملنا چاہیئے۔ نیز پولیس اور مسلح افواج میں ۲۰ فی صد ریزرویشن کے ساتھ انھیں اتنی ہی مخصوص نشستیں لوک سبھا میں بھی ملنی چاہئیں۔[۳۵] اس مقصد کے تحت مختلف مسلم جماعتیں ایسے سیاسی گروہوں کے ساتھ انتخابی سمجھوتہ بھی کر رہی تھیں جو ان کے مطالبات پورا کرنے کی حامی بھر لیتے تھے۔ گذشتہ انتخاب میں جس طرح مختلف سیاسی پہلوانوں نے ووٹ حاصل کرنے کی غرض سے علماء کا دل جیتنے کی کوشش کی تھی وہ یقیناً قابل دید تھی۔ بہرحال ان سب باتوں سے قطع نظر ایک نکتہ واضح طور پر سامنے آتا ہے کہ ہندستانی سیاست کے اسٹیج پر مذہب ایک بار پھر فیصلہ کن رول انجام دینے والا ہے۔

حوالہ جات۔

۱۔ مثال کے لئے دیکھیں شاہ عبدالعزیز کی "فتاویٰ عزیزی" (بزبان فارسی) دو جلدوں میں، دہلی ۱۸۹۳، ۱۸۹۶

۲۔ ڈبلیو، سی، اسمتھ، "ماڈرن اسلام ان انڈیا" (لندن ۱۹۴۶) صفحہ ۱۴

۳۔ مثال کے لئے "اے لکچر بائی کرامت علی آف جونپور" دیکھیں (کلکتہ ۱۸۷۱) ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر کی کتاب "دی انڈین مسلمانس" میں اس کا خلاصہ موجود ہے ضمیمہ ۲

۴۔ بحوالہ اسمتھ، "ماڈرن اسلام ان انڈیا" صفحہ ۱۵

۵ ۔ مثال کے لئے ضیاء الحسن فاروقی کی کتاب "دیوبند اسکول اینڈ دی ڈیمانڈ فار پاکستان" (بمبئی ۱۹۶۳ء) دیکھیں ۔

۶ ۔ ہندوستان میں مکتبی نظام تعلیم کی تفصیل کے لئے ایس مقبول کا مضمون "مدرسہ سسٹم آف ایجوکیشن" ایس، ٹی لوکھنڈ والا کی مرتبہ کتاب "انڈیا اینڈ کنٹمپریری اسلام" (شملہ ۱۹۷۱) صفحہ ۲۵ ۔ ۳۶ پر ملاحظہ کریں ۔

۷ ۔ مثال کے لئے مصنف مضمون ہذا کی کتاب "مسلمان اور سیکولر ہندوستان" کا مذہبی تعلیم پر مبنی باب دیکھیں (دہلی ۱۹۷۲)

۸ ۔ اسباب بغاوت ہند ۱۸۵۷، "دی کازز آف انڈین ریوولٹ" کے نام سے بعد میں چھپی (۱۸۷۳) اس کا ترجمہ سر آکلینڈ کولون اور جی، ایف، آئی گراہم نے کیا ہے ۔

۹ ۔ سرسید، دی لائل محمڈن آف انڈیا ۱۸۶۰ ۔ ۱۸۶۱

۱۰ ۔ ڈبلیو، سی، المتقد، صفحہ ۱۶ ۔ ۱۷ ۔ یہ اقتباس ٹرانسلیشن سوسائٹی کے افتتاح کے موقع پر (غازی پور ۱۸۶۴) سرسید کی تقریر پر مبنی ہے جسے گراہم کی کتاب لائف اینڈ ورک آف سرسید خاں میں دیا گیا ہے سکنڈ ایڈیشن صفحہ ۵۲ ۔ ۵۴

۱۱ ۔ سرسید، "دی محمڈن کمنٹری آن بائیبل" اس کے تنقیدی مطالعہ کے لئے دیکھیں کرسچین ڈبلیو ٹرال کی کتاب سرسید احمد خاں، اے ری انٹرپریٹیشن آف مسلم تھیالوجی" (دہلی ۱۹۷۸)

۱۲ ۔ مثال کے لئے سرسید کا رسالہ احکام طعام اہل کتاب" دیکھیں ۔

۱۳ ۔ گراہم دی کازز آف انڈین ریوولٹ صفحہ ۲۶ ۔ ۱۲۵

۱۴ ۔ مثال کے لئے بانی دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی اور پنڈت دیانند سرسوتی کے درمیان نیز مولانا اور پادری تارا چند کے درمیان مناظرانہ مباحث ۱۸۷۲ کے شاہجہاں پور میں منعقدہ "میلہ خداشناسی" کی رپورٹ ملاحظہ ہو تفصیل کے لئے مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب "سوانح قاسمی" (تین جلدوں میں مولانا کی اردو سوانح حیات) دیوبند ۱۹۵۳ جلد ۲ صفحہ ۲۵۸ ۔ ۵۱۲

۱۵ ۔ جے، این، فارکر، "ماڈرن ریلیجس موومنٹ ان انڈیا" (نیویارک ۱۹۱۵)

۱۶۔ ڈپٹی نذیر احمد، "مسلمانوں کی حیات تعلیمی" بحوالہ رفیق زکریا "رائز آف مسلمس اِن انڈین پالٹیکس" (بمبئی ۱۹۷۰) ص ۳۲۵

۱۷۔ مبنی بر الطاف حسین حالیؔ "ترجمہ حالیؔ" دیکھئے عبدالحق (بابائے اردو) کی مرتبہ "مقالات حالی" (دہلی، ۱۹۴۳)

۱۸۔ سید محمود، "ہندو مسلم کلچرل اکارڈ" (بمبئی، ۱۹۴۹) ص ۱۶

۱۹ بشیر احمد ڈار، ریلیجس تھاٹ آف سید احمد خان (لاہور ۱۹۵۷) ص ۷۶

۲۰۔ اینڈریوز اور مکھرجی، "دی رائز اینڈ گروتھ آف دی کانگریس ان انڈیا" اسمتھ کے حوالے سے صفحہ ۲۸

۲۱۔ کانگریس انسائیکلوپیڈیا (انڈین نیشنل کانگریس ۱۸۸۵-۱۹۲۰) مصنف، کے، ایشور دت (دہلی نیا ایڈیشن) صفحہ ۲۷۰

۲۲۔ رفیق زکریا، رائز آف مسلمس ان انڈین پالٹیکس (بمبئی ۱۹۷۰) صفحہ ۳۴۴ تا ۳۴۵

۲۳۔ ایضاً صفحہ ۳۴۹، ۵ر نومبر ۱۹۰۷ کے روزنامہ پائنیر (لکھنؤ) کے حوالہ سے

۲۴۔ ہمدرد ۱۰ر جنوری ۱۹۲۷ دوبارہ اشاعت مضامین محمد علی (دو جلد) مرتبہ محمد سرور (دہلی ۱۹۳۸) جلد ۱ صفحہ ۲۹۲-۲۹۱

۲۵۔ مرزا فضل الدین احمد، ابوالکلام آزاد کی کتاب "تذکرہ" (پہلی اشاعت ۱۹۱۹، دوبارہ اشاعت لاہور صفحہ ۱۳) کا پیش لفظ، مولانا آزاد کی سند پر یہ جملہ مولانا محمود حسن سے منسوب کیا ہے۔

۲۶۔ مولانا محمد میاں، جمعیۃ کیا ہے؟ جلد ۲ (دہلی ۱۹۴۶) صفحہ ۱۵

۲۷۔ ابوالکلام آزاد، "خطبات آزاد"، دہلی ۱۹۵۹ صفحہ ۵۵ نیز مولانا عبدالماجد بدایونی "درس خلافت" (پہلی اشاعت ۱۹۲۰ پانچویں اشاعت میرٹھ) صفحہ ۴۴

۲۸۔ مولانا محمود حسن، ترک موالات (بجنور ۱۹۱۹) صفحہ ۳۶

۲۹۔ آزاد، الہلال جلد ۱ شمارہ ۳، ۲۷ر جولائی ۱۹۱۲ء

۳۰۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، پیغام بنام موتمر کل ہند جمعیۃ علمائے اسلام لاہور ۱۹۴۵ء صفحہ ۴۴

۳۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سہ ماہی "اسلام اور عصر جدید" جلد ۱۲ شمارہ ۲ (اپریل ۸۰ء)
میں مصنف مقالہ کا مضمون "مذہب اور ہندوستانی مسلم سیاست"۔
۳۲۔ تفصیل کے لئے مصنف مقالہ کی کتاب "مسلم پالٹیکس ان انڈیا" ملاحظہ کیجئے
(میرٹھ ۱۹۷۰)
۳۳۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی، صدارتی خطبہ (بزبان اردو) دینی تعلیمی کونسل مرادآباد
اجلاس ۱۴ جون ۱۹۶۹
۳۴ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نا تھوانی کمیشن رپورٹ (داؤدی بوہرہ کمیشن) ۔ مقرر کردہ
سٹی زنس فارڈیموکریسی، بمبئی، مطبوعہ ۱۹۷۹
۳۵۔ ٹائمس آف انڈیا نئی دہلی ۲۸ ستمبر ۱۹۷۹ صفحہ ۳

ظفر احمد صدیقی

مولانا شبلی کی شاعری

عجیب بات ہے کہ شبلی شاعر ہوتے ہوئے بھی شاعر تسلیم نہیں کیے جاتے، ادبی تاریخیں اور تذکرے عموماً شاعر شبلی کے ذکر سے خالی ہیں۔ ناقدوں کی نگاہ میں بھی ان کی شاعرانہ حیثیت مشتبہ ہے۔ اسی لیے اب تک نہ تو ان کی شاعری کا تحقیقی جائزہ لیا گیا اور نہ ہی اس موضوع پر کوئی سیر حاصل بحث کی گئی۔

شبلی کی شاعری کے ساتھ بے اعتنائی کا بڑا سبب نفسیاتی ہے۔ انسانی کمالات کے اعتراف میں شخصیتوں کے طریق تعارف اور انداز پیش کش کا اہم حصہ ہوتا ہے۔ فرض کیجیے الف کا تعارف کسی ادبی حلقے میں اس طور پر کرایا جائے؛ "موصوف فلاں اسکول میں چپراسی کی خدمت پر مامور ہیں۔ وقت پر گھنٹہ بجاتے ہیں، کمروں کی صفائی بھی خوب کرتے ہیں، بہت نیک آدمی ہیں اور شاعر بھی ہیں۔" تو یقیناً الف کی منصبی حیثیت اس کی شاعرانہ حیثیت پر غالب آجائے گی۔ شبلی کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا، انھوں نے ملک میں ہمہ گیر شہرت و مقبولیت حاصل کی، لیکن اس حیثیت سے کہ وہ ایک عالم دین اور مورخ ہیں، الفاروق اور سیرۃ النعمان کے مصنف ہیں، تحریک ندوہ کے سرگرم رکن ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے ان کی شاعری دب گئی یا غیر اہم قرار دے دی گئی۔

اس سلسلے میں کچھ قصور خود شبلی کا بھی ہے۔ انھوں نے مصلحت وقت اور ہم عصر

ظفر احمد صدیقی صاحب، لکچرر شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی۔ ورناسی (یوپی)

علمار کے تاثر و تعصب سے مرعوب ہو کر اپنی شاعرانہ سرگرمیوں پر نہ تو زور دیا، نہ ہی اُسے منوانے کی خاطر خواہ کوشش کی۔ دراصل ان کے دل میں بھی یہ چور تھا کہ عالمِ دین پر شاعری کی قبا راست نہیں آتی۔

شبلی اور ان کے ہم عصر اس باب میں معذور قرار دیے جاسکتے ہیں، لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ان کی سوانح عمری لکھنے کا کام بھی سید سلیمان ندوی کے حصے میں آیا جو بذاتِ خود نہایت ثقہ اور معتبر عالم تھے۔ اس لیے انھیں علمار کے گروہ میں استاد کی حیثیت مستحکم کرانے کا خیال زیادہ رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے بھی ان کی شاعرانہ سرگرمیوں کو غیر اہم اور ثانوی قرار دینے کی پوری کوشش کی حتیٰ کہ کلیات شبلی کے دیباچے میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھ گئے:

> "مولانا ے مرحوم کے علمی کمالات میں اگرچہ فارسی اور اردو کی شاعری بھی داخل ہے، تاہم انھوں نے بذاتِ خود کبھی اس کو اپنا قابلِ فخر کارنامہ نہیں قرار دیا اور اس حیثیت سے کبھی اپنے ہم عصروں کی صف میں حریفانہ حیثیت سے کھڑے نہیں ہوئے، بلکہ یہ ان کا صرف ایک تفریحی مشغلہ اور زیادہ تر اس کی تحریک خاص خاص موثرات و محرکات کی وجہ سے ہوتی تھی۔"

جب عزیز اور لائق شاگرد و جانشین نے یہ روش اختیار کی تو دوسروں نے بھی تحقیق و تفتیش کی زحمت گوارا کیے بغیر آواز میں آواز ملانا ہی مناسب سمجھا، اس طرح شبلی کی شاعرانہ سرگرمیاں پسِ پردہ رہ گئیں۔

مزید برآں شبلی کی ایک بدقسمتی یہ بھی رہی کہ ان کی شاعری کا ایک معتدبہ حصہ منظرِ عام پر نہیں آسکا۔ مثلاً ان کا ابتدائی فارسی کلام جس بیاض میں جمع تھا، وہ غازی پور کے ایک جلد ساز کے یہاں سے غائب ہو گئی۔ ابتدائی دور کی بیشتر اردو غزلیں اب دستیاب نہیں۔ اعظم گڑھ کے مشاعروں کی بھی اکثر غزلیں محفوظ نہیں۔ علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں بیاض کا نصف حصہ دوبارہ چوری ہو گیا۔ دیوان فارسی طبع ہوا تو اس کے خیر مقدم اور بیشتر مرثیے شریکِ اشاعت نہیں کیے گئے۔ حیدر آباد کے مشاعروں اور صحبتوں کی یادگار بھی بجز ایک غزل کے اور کچھ باقی نہیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی مصلحت کے پیش نظر خود شبلی نے اپنے بعض اشعار کا انتساب اپنی طرف مناسب نہیں سمجھا۔ اس سلسلے میں ظفر الملک علوی مدیر الناظر کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں، لکھتے ہیں :

"ایک مرتبہ راقم الحروف کو ایک قلمی بیاض سے مولانا شبلی کے کچھ اشعار کی نقل مل گئی، لیکن جب مولانا سے ذکر آیا اور الناظر میں ان کی اشاعت کا ارادہ ظاہر کیا تو انھوں نے بہ اصرار اس سے باز رکھا، بلکہ یہاں تک کہا کہ اگر ان کی اشاعت کی جائے گی تو راقم الحروف سے تمام تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔"

(دیباچہ مجموعۂ کلام شبلی : مرتبہ ظفر الملک علوی، بار اول ۱۹۱۸ء)

خلاصہ یہ ہے کہ مختلف اسباب کی بنا پر شبلی کی شاعرانہ سرگرمیاں منظر عام پر نہ آسکیں، اس لیے ضروری ہے کہ ان کی شعر گوئی اور شاعرانہ سرگرمیوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ ان میں شاعری کا فطری جوہر موجود تھا یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ شعر وسخن کا مذاق انھوں نے ورثے میں پایا تھا اور اس کے آثار بچپن ہی سے نمایاں تھے۔ ان کے نانا شیخ قربان علی قنبر انصاری وکالت جیسے خشک پیشے کے ساتھ شاعری بھی کرتے تھے اور والد بزرگوار شیخ حبیب اللہ وکالت، زمینداری اور دوسری مصروفیات کے ساتھ فارسی شعر وادب کا پاکیزہ اور مثالی ذوق رکھتے تھے۔ خود شبلی کے بارے میں ان کے بچپن کے دوست مولوی محمد عمر صاحب کا بیان ہے: "مولانا میں ادبی مذاق بچپن ہی سے تھا، اس زمانے میں جب وہ محض مبتدی تھے کوئی اچھی نظم دیکھتے تو اس کے پڑھنے کے لیے بے تاب ہو جاتے اور کوئی اچھا شعر سنتے تو ان کو وجد آجاتا۔" (حیات شبلی، صفحہ ۱۷)

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں : "وہ مجھ سے خود فرماتے تھے کہ بچپن میں وہ فرصت کے اوقات شہر کے ایک کتب فروش کی دکان پر بسر کرتے تھے۔ کتابیں الٹتے پلٹتے اور شعراء کے دیوان پڑھتے اور مناسبت طبع سے ان کے اچھے اشعار یاد رہ جاتے تھے۔" (حیات شبلی، صفحہ ۱۷)

ان کے بالکل ابتدائی دور کے استاد مولوی عبد اللہ صاحب فرماتے تھے "مولوی شبلی میں بچپن ہی سے آثار کمال پائے جاتے تھے۔ ایک رات کو میں سو رہا تھا، قریب ایک بجے

کا وقت تھا۔ یک بیک میری آنکھیں کھل گئیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی شبلی ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں۔ پوچھا تو معلوم ہوا ایک قطعۂ تاریخ لکھ رہے ہیں۔"
(حیات شبلی، ص ۱۰۷)

طالب علمی کے زمانے میں انھیں ایک چادر کی ضرورت محسوس ہوئی تو والد کو یہ شعر لکھ بھیجا :

پدر جس کا ہوں صاحب تاج ہو
پسر اس کا چادر کو محتاج ہو

لیکن عہدِ طفلی یا عنفوانِ شباب کی دلچسپیوں کو نہ استحکام ہوتا ہے نہ ثبات۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سلامت روی کج روی سے اور شاعرانہ طبیعت خشک مزاجی سے بدل جاتی ہے یا بچپن کا ذوق و شوق سرزنش اور فہمائش کے سامنے سپر ڈال دیتا ہے لیکن شبلی اس نازک مرحلے سے بھی صحیح وسلامت گذر گئے۔ خوش قسمتی سے ان کے گھر کا ماحول ایک حد تک ادبی تھا اور اساتذہ بھی عموماً شعر و سخن کے ادا شناس تھے۔ اس لیے ان کا ادبی مذاق نامساعد حالات کا شکار ہونے کے بجائے نکھرتا اور سنورتا ہی گیا۔ اس سلسلے میں شبلی کا ایک اپنا بیان ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں :

"میرا طالب علمی کا زمانہ تھا کہ ایک دن ایک صحبت میں کسی نے کلیم کا یہ شعر پڑھا :

سر بہ بستاں چوں دہد جلوۂ یغمائی را
اول از سرو کند جامۂ رعنائی را

والد مرحوم بھی تشریف رکھتے تھے۔ میں نے کہا کپڑا اتارنے کو 'جامہ کشیدن' بھی کہتے ہیں، اس لیے شاعر 'کند' کے بجائے 'کشد' کہتا تو زیادہ فصیح ہوتا 'جامہ کندن' گو صحیح ہے فصیح نہیں۔ سب چپ ہو گئے۔ والد مرحوم نے ذرا سوچ کر کہا : نہیں یہی لفظ شعر کی جان ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق باغ میں جب غارت گری کی شان دکھاتا ہے تو پہلے سرو کی رعنائی کا لباس اتار لیتا ہے۔ لباس اتارنے کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ مثلاً کوئی شخص گرمی وغیرہ کی وجہ سے کپڑا اتار کر رکھ دے یا اس کا نوکر

اتار لے۔ دوسرے یہ کہ سزا کے طور پر کسی کے کپڑے اتروا لیے جائیں یا نچوائے جائیں۔ فارسی میں ان کے لیے دو مختلف لفظ ہیں 'جامہ کشیدن' اور 'جامہ کندن'۔ چونکہ یہاں مقصود یہ ہے کہ معشوق ذلت کے طور پر سرو کا کپڑا اتار لیتا ہے۔ اس لیے یہاں 'جامہ کندن' کا لفظ 'جامہ کشیدن' سے زیادہ موزوں ہے۔ تمام حاضرین نے اس توجیہہ کی بے ساختہ تحسین کی۔"

(شعر العجم جلد چہارم، ص ۱۸)

شعری مزاج کی ساخت و پرداخت میں یہ اندازِ تربیت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اب اساتذہ کو لیجئے، شبلی کے ادبی مزاج کی تشکیل میں حصہ لینے والے اساتذہ میں مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی، مولانا فاروق چریاکوٹی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر کا شمار اردو کے معروف شاعروں میں ہوتا ہے۔ موصوف ایک زمانے میں مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور کے مہتمم تھے اور شبلی اس مدرسے کے طالب علم۔ اس عمومی رشتے کے علاوہ استاد کو عزیز شاگرد سے تعلق خاطر بھی تھا نیز مولوی محمد عمر کے نام، ۲ اکتوبر ۱۸۸۲ء کے ایک فارسی مکتوب سے شعر و شاعری میں استفادے کی شہادت بھی ملتی ہے۔ مولانا فاروق چریاکوٹی فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے اور کبھی کبھی اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ شبلی کا ذوق فارسی گوئی بطور خاص انھیں کا رہینِ منت تھا۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری اپنے دور میں عربی زبان و ادب کے سب سے بڑے رمز شناس اور بلند پایہ ادیب و شاعر تھے۔ کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہتے۔ شبلی کے اندر نثر و نظم کا صحیح ذوق انھیں کا پیدا کردہ تھا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد شبلی بسلسلۂ ملازمت علی گڑھ، حیدر آباد اور لکھنؤ میں قیام پذیر رہے۔ اسے حسنِ اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے کہ اس دوران پیشے کے اعتبار سے وہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف جیسی مشغولیتوں سے وابستہ رہے۔ ساتھ ہی حلقۂ احباب بھی علم دوست، ادب نواز اور شعرا ہی پر مشتمل رہا۔ اس لیے انھیں کبھی ماحول کے خلاف کبھی علمِ بغاوت بلند کرنے یا طبیعت پر جبر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ علی گڑھ میں شہر بھر کے مانے ہوئے استاد تلیس تو پڑوس ہی میں رہتے تھے،

ان کی اکثر آمد و رفت رہتی تھی۔ اکبر الہ آبادی بھی اس زمانے میں بہ حیثیت منصف علی گڑھ میں ہی مقیم تھے، ان سے گاڑھی چھنتی تھی۔ مولانا حالی جب آ جاتے تو ان سے بھی ملاقاتیں رہتی تھیں۔ حیدر آباد پہنچ کر داغ دہلوی سے بہت اچھے روابط پیدا ہو گئے تھے، اس لیے ان کے ساتھ شہر کی ادبی محفلوں میں برابر شریک ہوتے تھے۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کی معتمدی کے دوران عموماً سال میں ایک بار بمبئی جاتے تھے۔ یہاں کے خوش گوار ماحول اور دلچسپ صحبتوں نے بھی ان کے ذوق شعر گوئی کی آبیاری میں حصہ لیا ہے۔

حاصل گفتگو یہ ہے کہ شبلی فطری طور پر شعر و سخن کی طرف میلان رکھتے تھے۔ پھر ان کی شاعرانہ طبیعت اور ذوق سخن وری کو سازگار حالات اور ماحول نے کچھ اور سنوار دیا تھا، ایسے میں ان کی شاعرانہ سرگرمیوں پر تعجب کی ضرورت نہیں بلکہ اس کا فطری و منطقی جواز موجود ہے۔

یہاں ایک سوال یہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ اگر شبلی شاعر اور فطری شاعر تھے تو انھوں نے اپنے خطوط میں دوسروں کو بار بار یہ باور کرانے کی کوشش کیوں کی کہ شاعری ان کے لیے محض تفریح طبع کا ذریعہ ہے، ورنہ وہ حقیقی معنوں میں شاعر نہیں بلکہ انھیں شعر و سخن پر اس قدر بھی قدرت نہیں کہ ولادت، وفات یا ایسے ہی کسی موقع پر فرمائش اور خواہش کے باوجود کوئی قطعۂ تاریخ لکھ سکیں، چنانچہ ایسے تمام خطوط کے اقتباسات درج ذیل ہیں:

"میاں عثمان کے صاحبزادے کے لیے نظم کیا لکھوں؟ اب وہ دل نہیں رہا، وہ طبیعت نہیں رہی۔ میاں اسحق و مہدی کو خدا اولاد دے تب بھی کچھ نہ لکھ سکوں گا۔ شعر کہنا اب ایسا پہاڑ ہو گیا ہے کہ سابق کے اشعار دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ کیا میں نے ہی لکھے ہیں۔"

(بنام محمد شفیع / ۱۵ مارچ ۱۸۹۵ء)

"شاہ صاحب کی قبل از وقت جدائی نے واقعی سخت صدمہ پہنچایا، شعر و شاعری پر اب میرا قابو نہیں بلکہ میں اس کے قابو میں ہوں، ورنہ قطعۂ تاریخ لکھنا محبت اور اخلاق کا فرض تھا۔"

(بنام مہدی افادی۔ ۸ مئی ۱۹۰۷ء)

میں نظم پر باوجود ہزاروں شعر کہنے کے بالکل قادر نہیں، یعنی بغیر کسی فوری تاثر کے ایک حرف نہیں لکھ سکتا۔ بارہا احباب نے فرمائشیں کیں اور کئی کئی دن طبیعت پر زور ڈالا لیکن کچھ کہہ نہ سکا، اس لیے طالب معافی ہوں۔"

(بنام عبدالحکیم دسنوی۔ ۲۳ر ستمبر ۱۹۱۲ء)

"اخبارات میں نظمیں دیکھ کر آپ مجھ کو زندہ تصور کرتے ہیں، لیکن کبھی اتفاق سے دیکھنے کا اتفاق ہو تو آپ کو رحم آئے گا کہ ایک مردہ متحرک فرمائش کے لیے موزوں نہیں۔"

(بنام غلام غوث۔ ۹ر نومبر ۱۹۱۳ء)

"میری شاعری محض عطائی ہے۔ نہ کبھی اس میں اشتغال رہا، نہ برسوں کچھ کہنے کا اتفاق ہوتا۔"

(بنام نواب ریاض حسن خاں۔ ۱۳ر مارچ ۱۹۰۸ء)

"جناب ایڈیٹر صاحب! زاد لطفہٗ

آپ نے اپنے پرچے میں لکھا ہے کہ میں خواجہ عزیز الدین صاحب کا شاگرد ہوں۔ خواجہ صاحب میرے مخدوم ہیں لیکن میں ان کا شاگرد نہیں۔ میں نہ شاعر ہوں، نہ میں نے کسی شاعر سے اصلاح لی ہے۔ یہ جو کبھی کبھی موزوں کر لیتا ہوں۔ یہ شاعری نہیں تفریح طبع ہے۔"

(بنام ایڈیٹر 'الناظر'۔ ۲ر اگست ۱۹۰۹ء)

ان خطوط کے پیش نظر راقم السطور پر بظاہر مدعی سست گواہ چست کی مثل صادق آتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر خطوط فرمائشی تاریخ گوئی سے معذرت کے طور پر لکھے گئے ہیں اور آئے دن کی فرمائشوں سے تنگ آکر شبلی نے احباب کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ان کی شاعری چونکہ الہامی اور عطائی ہے اس لیے اس قسم کی تعمیل ارشاد ان کے بس کی بات نہیں۔ ویسے نفس تاریخ گوئی کے سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر زہرا بیگم کے نام ایک خط میں وضاحت کے ساتھ آگیا ہے۔ لکھتے ہیں:

آپ نے تاریخ کی فرمائش کی ہے۔ یہ امر محتاجِ اظہار نہیں کہ مجھ کو آپ کے کسی کام کے انجام دینے سے کس قدر خوشی ہو سکتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مجھ کو حرفوں کے عدد سے تاریخ نکالنا نہیں آتا۔ اتفاقیہ کبھی کوئی تاریخ خیال میں آجائے تو اور بات ہے۔ البتہ اگر آپ کہیں تو قطعۂ وفات کہہ دوں۔"

(بنام زہرا بیگم - ۱۵ر فروری ۱۹۰۹ء)

اسی طرح ایڈیٹر الناظر کے نام خط میں اصل زور شاگردی کی نفی پر ہے۔ شاعری کی نفی کو جذبۂ خاکساری پر محمول کیا جا سکتا ہے البتہ اس سے انکار مشکل ہے کہ وہ شاعری کو اپنی عالمانہ شان کے منافی سمجھتے تھے اور شاعرانہ سرگرمیوں کا بے محابا اظہار انھیں پسند نہیں تھا۔ اس کی جانب اجمالی طور پر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہاں اس کے اسباب تفصیل سے بیان کیے جاتے ہیں:

شبلی نے قدیم طرز کے مدارس میں قدیم طرز کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ اب ان کے سامنے دو ہی راستے تھے؛ یا تو نیاز فتح پوری کی طرح اس کوچے کو خیرباد کہہ دیتے یا اپنی روایت کا جزو بن کر کسی نمایاں مقام کے حصول کے لیے جد و جہد کرتے۔ حالات و واقعات بتاتے ہیں کہ انھوں نے دوسری راہ اختیار کی۔ چنانچہ ان کی بیشتر تصانیف اپنے آخری تجزیے میں مذہبی ہیں۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور حیدر آباد کی مشرقی یونیورسٹی کے لیے ان کا مرتبہ نصابِ تعلیم علوم قدیمہ ہی کی تشکیلِ جدید ہے۔ اسی طرح ان کی وضع قطع، نشست و برخاست اور کردار و گفتار پر بھی عالمانہ چھاپ گہری تھی۔ دوسری طرف چونکہ شاعری کا بیشتر حصہ اسلامی اقدار پر پورا نہیں اترتا، اس لیے علماء اسے بہت زیادہ قدر و منزلت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی "اسلام اکثر فنونِ لطیفہ کی طرح عموماً شاعری کا بھی ہرگز قدرداں نہیں اور نہ شاعروں کی ہمت افزائی کرنا چاہتا۔ اسلام کے دربار میں کوئی کرسی ہرگز شاعروں کے لیے نہیں۔ اس لیے کہ عام شاعری میں بجز خیال آرائی اور مبالغہ پروری کے اور کچھ نہیں ہوتا۔" (تفسیر ماجدی جلد دوم ص ۷۶۲) اس صورتِ حال کے پیشِ نظر شبلی "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" والی کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔ بالآخر

انھوں نے حریفوں کو مطمئن کرنے کے لیے اعلان کردیا کہ شاعری میرے لیے نہ ذریعۂ کمال ہے، نہ ذریعۂ عزت، بلکہ محض وقتی مشغلہ اور تفریح طبع کی آڑ میں مسلسل دادِ سخن دیتے رہے۔ دوسرے قرائن و شواہد کے علاوہ اس کی تصدیق مندرجہ ذیل مکتوب سے بھی ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"فغاں کہ از خرد و عشق کردہ ایم قبول
دو کارخانہ کہ بایک دگر نمی گردد

ندوہ کی جھنجھٹ اور شاعری ساتھ چلنے کی چیزیں نہیں، لیکن بہرحال چارہ بھی نہیں۔ ندوہ فرض مذہبی ہے اور شاعری فرض طبعی۔ کس کو چھوڑوں؟"

(بنام زہرا / ۲۷ فروری ۱۹۰۹ء)

شبلی کی شاعرانہ شخصیت کے بارے میں بہت سے اختلافی مسائل ان کے خطوط کی مدد سے حل کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً یہی مسئلہ کہ وہ شاعری کو تفریح طبع کا سامان سمجھتے تھے یا قابل فخر کارنامہ گردانتے تھے؟ مکاتیب شبلی کے درج ذیل اقتباسات کی مدد سے طے کیا جاسکتا ہے:

"میر اکبر حسین منصف (اکبر الہ آبادی) سے تو خوب چھنتی ہے، میرے فارسی اشعار بھی انھوں نے سنے اور خوب داد دی۔"

(بنام مولوی محمد سمیع / اپریل ۱۸۸۱ء)

"مرثیہ، جو تم بھی دیکھ چکے ہو گے، جن لوگوں نے اس کی فارسی دیکھی ہے، از بس پسند فرمائی ہے، میر اکبر حسین بھی اس میں داخل ہیں۔"

(بنام سمیع / ستمبر ۱۸۸۳ء)

"ان دنوں میں نے ایک واسوخت لکھا ہے۔ مجھے خود حیرت ہے کہ میں کیونکر اس کو لکھ سکا ہوں۔ واقعی نہایت پُر درد ہے۔"

(بنام سمیع / ۲۷ مارچ ۱۸۸۴ء)

واسوخت فارسی کے پندرہ بند ہیں یعنی ۴۵ شعر... حضرت استاد نے بھی واسوخت

کو نہایت پسند کیا۔"

(بنام سمیع / ۲۴ اپریل ۱۸۸۴ء)

"چونکہ ردیف کی غزل یہاں ایک لطیفہ ہوا۔ چند لڑکوں نے کہا کہ استاد کی غزل پر غزل لکھنی اس سے کیا حاصل ؟ ع ہمتا سے فلک نہ ہو گا بادل

میں نے کہا ع دریا نہیں کاربند ساقی

غرض میری اور علی حزیں کی غزل خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز مصنف قیصر نامہ اور نیّر دہلوی کے پاس بغرض محاکمہ ارسال کی گئی۔ یہ وہی نیّر صاحب ہیں جن کو غالبؔ نے لکھا ہے، ع

مجھ سے تمھیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی

فارسی نہایت عمدہ کہتے ہیں اور غالبؔ کے تلمیذ ارشد ہیں۔ دونوں نے تسلیم کیا کہ اہل زبان کا کلام ہے۔ نیّر نے تو بہت تعریف لکھی اور لکھا کہ سلف کے کلام کے ہم پلہ ہے۔"

(بنام سمیع / اپریل ۱۸۸۴ء)

"سنیے ! ایک بہاریہ قصیدہ لکھنا شروع کیا ہے۔ اگرچہ ابھی تک صرف ۲۷ شعر ہوئے مگر امید ہے کہ امید سے بڑھ کر ہوئے۔ غالباً غالبؔ سے کم رتبے کا نہ ہو۔ توارد کے ڈر سے 'قصائد غالبؔ' تم سے طلب کیا۔"

(بنام سمیع / جون ۱۸۸۶ء)

"ان دنوں سید محمود حسن صاحب وزیر ریاست پٹیالہ تشریف لائے ہیں .... جلسۂ دعوت میں سید محمود کی فرمائش سے میں نے چند بند فارسی میں لکھے اور کھانے کے بعد پڑھے۔ عجیب سماں بندھ گیا تھا۔ تمام حضار مجلس حقیقت میں بے تاب ہو گئے۔ سید محمود صاحب اٹھ اٹھ کر ہر بند کو کئی بار پڑھواتے۔ وزیر صاحب نے بڑھ کر کہا ان شعروں میں آپ نے میرا ذکر کیا ہے ورنہ میں اس کی پوری داد دیتا۔"

(بنام سمیع / مارچ ۱۸۸۶ء)

"داغ کا دوسرا دیوان بھی چھپ گیا اور تیسرا چھپ رہا ہے۔ مثنوی نہایت خراب لکھی ہے۔ میری مثنوی میرے ساتھ آوے گی۔ عموماً اہلِ سخن نے نہایت پسند کیا۔"

بنام سمیع / مارچ ۱۸۹۶ء

"انصاری وفد جو قسطنطنیہ سے واپس آیا اس پر میں نے ایک نظم لکھی تھی، شاید تم نے دیکھی ہو۔ 'زمیندار' اور 'وکیل' میں چھپی تھی۔ جلسے میں تمام لوگ بے اختیار روتے تھے۔ مجھ پر خود بھی رقت طاری تھی۔"

(بنام مولانا حمید الدین فراہی / ۲۰ راگست ۱۹۱۳ء)

"کل ایک غزل قلم سے نکلی۔ میر اکبر حسین صاحب کو بھیجی وہ بہت ریجھے۔ ان کا خط بھیجتا ہوں، لیکن اس پر یقین نہ کیجئے گا، ورنہ غزل پھیکی نظر آئے گی۔"

(بنام مہدی افادی / ۱۰ راپریل ۱۹۰۷ء)

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان سطور کا لکھنے والا اپنی شعری تخلیقات کو ناقدری کی نگاہ سے دیکھتا ہے یا شاعرانہ احساسِ کمال کے جذبے سے محروم ہے بلکہ صاف ظاہر ہے کہ مکتوب نگار اپنی شاعری کا قدرداں ہے اور سخن فہم دوستوں سے دادِ ہنر کا طالب بھی۔

اسی طرح یہ سوال کہ شبلی کی شاعرانہ سرگرمیوں کی نوعیت کیا تھی؟ اس کا شافی جواب بھی ان کے خطوط کی ہی مدد سے دیا جا سکتا ہے، کیونکہ ان کے شاعرانہ مزاج و کردار کی بھرپور آئینہ داری مکاتیب ہی کے ذریعہ ہوتی ہے اور یہیں ان کی شاعرانہ نفسیات کے سبھی پہلو کھل کر سامنے آتے ہیں۔ مثلاً اپنی شعری کاوشوں سے محبت و شیفتگی احباب سے مزے لے لے کر ان کا تذکرہ، کبھی مطالعہ کی فرمائش، کبھی سنانے کا وعدہ کبھی شعری گلدستوں کے تحفے پر تحفہ اور کبھی تہی دامنی کا شکوہ۔ یہ وہ شاعرانہ ادائیں ہیں جو شبلی کے خطوط کے علاوہ اور کہیں محفوظ نہیں۔ اس لیے مندرجہ ذیل اقتباسات اپنی کثرت کے باوصف توجہ کے مستحق ہیں:

"معلوم نیست کہ قصیدہ بہ مولوی عبد الاحد شمشاد سپردی یا ہمچو نام من او را ہم از یاد بردی۔"

(بنام مولوی محمد عمر / ۷ راکتوبر ۱۸۸۲ء)

"دریں ایام طرح مشاعرہ انداختہ اند۔ بہ تقاضائے احباب غزلے گفتہ آمد کہ باخویشتن خواہم آورد۔"

(بنام سمیع/ ۲۰ رمئی ۱۸۸۳ء)

"غزل پھر کبھی بھیجوں گا۔"

(بنام سمیع/ ۱۸۸۳ء)

"آپ کی عزیزی مہدی کی فرمائش تھی کہ راجندر کی تاریخ وفات لکھی جائے، اس خط میں بس اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔"

(بنام سمیع/ ۱۲راپریل ۱۸۸۳ء)

"دریں نزدیکی بیتے چند بہ روش بحر طویل بود، از زبان خامہ بروں جست۔ آئینہ راز است پارۂ آناں می نویسم۔"

(بنام مولانا فراہی/ ۱۷رجنوری ۱۸۸۴ء)

"آج کل تنہائی کی وجہ سے گھبراتا ہوں، مگر اتنا ہے کہ اس کی بدولت کبھی کبھی کچھ موزوں کرلیتا ہوں۔ رات بیٹھے بیٹھے ایک غزل لکھ ڈالی۔ دو تین شعر مزے کے ہیں، تمھیں بھیجتا ہوں۔"

(بنام سمیع/ ۱۸رجنوری ۱۸۸۴ء)

"دو غزلیں حال میں لکھی گئی ہیں۔ تم کو بھیجتا ہوں۔ فارسی غزل جو حمید کو بھیجی گئی ہے، عمدہ پرواز پر لکھی گئی ہے۔ اگرچہ فہم کی توقع نہیں ہے تاہم اسے دیکھنا تم۔"

(بنام سمیع/ ۲۶رجنوری ۱۸۸۴ء)

عزیزی اسحٰق کو ایک خط نظم میں لکھا ہے.... دو شعر اس میں اور بڑھالو...

ایک اردو غزل ذیل میں پاؤ گے، ایک دن یونہی لکھ دی تھی.... تم دو قصیدے مانگتے ہو، دو کون؟ ایک عید کا قصیدہ تو البتہ میں نے لکھا تھا، وہ میرے پاس موجود ہے، کبھی تم کو بھیج دوں گا۔"

(بنام سمیع/ فروری ۱۸۸۴ء)

"ان دنوں اور غزلیں بہ تتبع حزیں لکھی گئی ہیں اور دلچسپ ہیں۔"

(بنام سمیع / ۲۴ر اپریل ۱۸۸۴ء)

"قصیدے جدید کون ہیں؟ واسوخت البتہ ہے مگر اس کے سننے کا لطف میری ہی زبان سے ہے۔"

(بنام سمیع / ۹ر اپریل ۱۸۸۴ء)

"مولوی صاحب موصوف نے مجھ سے اشعار طلب فرماتے ہیں۔ میں نے ان دنوں کچھ لکھا نہیں، ورنہ ارسال خدمت کرتا۔۔۔ فرحت احمد کے بھتیجا پیدا ہوا۔ تاریخ کی فرمائش تھی۔ میں نے یہ شعر لکھے۔"

(بنام سمیع / ۲۷ر نومبر ۱۸۸۴ء)

"یہاں پرسوں ایک عظیم الشان جلسہ ہے ۔۔۔۔ شاید کوئی نظم اس وقت پڑھوں۔"

(بنام سمیع / ۱۴ر فروری ۱۸۸۶ء)

"ان دنوں اردو کی ایک غزل لکھی تھی اور حمید کو بھیج دی۔ تم ان سے منگالو۔"

(بنام سمیع / مارچ ۱۸۹۶ء)

"میں نے عیدیہ قصیدے میں ایک تقریب سے کچھ تغیر کیا ہے۔ کوئی ۲۶ شعر بڑھا دیے ہیں۔ مگر اتنے ہی اصل سے نکال بھی دیے ہیں۔ واقعی یہ شعر جو بڑھائے گئے ہیں، بلند پایہ ہیں۔"

(بنام سمیع / ۲۷ر نومبر ۱۸۹۶ء)

"میں نے ایک نظم لکھنی شروع کی ہے، جس کا پہلا مصرع یہ ہے:

ع اے دکن اے کہ بہار چمن جاں از تست

(بنام حبیب الرحمٰن خاں شروانی / ۱۹۰۱ء)

"ایک نئی غزل کے چند اشعار حاضر ہیں۔"

(بنام شروانی / ۵ر نومبر ۱۹۰۶ء)

"تین چار غزلیں لکھیں جو کبھی آپ کی نظر سے گذریں گی۔"

(بنام مہدی افادی / ۱۱ر نومبر ۱۹۰۶ء)

"بمبئی کے ایک آدھ شعر حاضر ہیں۔"

(بنام شروانی / ۱۶ر نومبر ۱۹۰۶ء)

"اب کے مخزن میں میری ایک غزل شائع ہوئی ہے۔ دیکھیے گا۔"

(بنام مہدی / ۲۶ر اکتوبر ۱۹۰۶ء)

"میری ایک فارسی غزل 'دکن ریویو' میں چھپی ہے۔ مخزن کی غزل تو ضرور نظر سے گذری ہوگی۔"

(بنام مہدی / ۱۳ر دسمبر ۱۹۰۶ء)

"کل ایک غزل قلم سے نکلی۔"

(بنام مہدی / ۱۰ر اپریل ۱۹۰۷ء)

"نواب مزمل اللہ خاں صاحب کو ایک غزل بھیجی، رسید تک نہ دی۔ خیر آپ لے کر دیکھیے گا۔"

(بنام شروانی / ۶ر مئی ۱۹۰۷ء)

"آج میر اکبر حسین صاحب کے ہاں سے دعوت کا رقعہ آیا تھا۔ میں نے جواب میں (ایک قطعہ) لکھ بھیجا۔"

(بنام مہدی / ۲۳ر نومبر ۱۹۰۷ء)

"بہت سی پرجوش غزلیں لکھیں، آیئے تو سناؤں۔"

(بنام شروانی / ۲۱ر جنوری ۱۹۰۸ء)

"حسب ارشاد سامی سب سے پہلی غزل حاضر ہے۔"

بنام شروانی / ۳ر فروری ۱۹۰۸ء

"ایک غزل بھیجتا ہوں، اس کو اخیر میں چھاپ دینا۔"

(بنام سید سلیمان ندوی / ۳ر فروری ۱۹۰۸ء)

"غزل بھیج چکا ہوں۔"

(بنام شروانی / ۶ر فروری ۱۹۰۸ء)

"ایک غزل کا ایک شعر مجھ کو مختلف وجوہ سے پسند آیا۔ آپ کو لکھتا ہوں۔ واقعیت اور اظہارِ قدرت پر نظر کیجیے۔"

(بنام شروانی / ۱۸ فروری ۱۹۰۸ ء)

"بمبئی میں بڑی دلچسپیاں رہیں، جو موزوں ہو کر قلم سے نکلیں، سولہ صفحے ہو گئے تو چھپنے کو دے دیئے۔۔۔۔ اس میں کچھ پچھلے سال کا بھی حصہ ہے۔ بعض غزلیں زیادہ شوخ ہو گئی ہیں، جو شاید ایک پنجاہ سالہ مصنف کے چہرے پر نہ کھلیں، لیکن حافظ تو کہتے ہیں ع ہرگہہ کہ یاد روے تو کردم جواں شدم۔"

(بنام مہدی / ۲ مارچ ۱۹۰۸ء)

"بمبئی کی غزلیں چھپنے کو دے دی ہیں، کوئی سولہ صفحے ہو جائیں گے۔"

(بنام شروانی / ۵ مارچ ۱۹۰۸ء)

"چند غزلوں کا مجموعہ چھپ رہا ہے۔ تیاری پر بھیج دوں گا۔"

(بنام عطیہ فیضی / ۲۳ مارچ ۱۹۰۸ء)

"بمبئیات چھپ رہی ہے، لیکن نام بدل دیا ہے یعنی "دستۂ گل" تیار ہونے پر بھیج دوں گا۔ ایک دو غزل حال میں لکھیں وہ بھی شامل ہیں۔"

(بنام شیخ عبدالقادر / ۱۴ اپریل ۱۹۰۸ء)

"وداعیہ نظم پہنچی ہوگی۔"

(بنام عطیہ / ۲۰ اپریل ۱۹۰۸ء)

"میرا چھوٹا فارسی دیوان یعنی حال کی غزلیں چھپی ہیں اور میں نے برعکس نہند نام زنگی کافور ان کانٹوں کا نام "دستۂ گل" رکھا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ بھیج دوں، لیکن زیادہ شوخ اور آزاد اشعار قلم سے نکل گئے ہیں۔ اس لیے ان کا پردہ ہی میں رہنا مناسب ہے۔"

(بنام زہرا / ۲ مئی ۱۹۰۸ء)

"یہ دیوان تو نہ بھیجوں گا، لیکن وقتاً فوقتاً معتدل غزلیں نکال کر بھیجتا

رہوں گا۔"

(بنام زہرا/ ۱۰ر مئی ۱۹۰۸ء)

"دستۂ گل' کی کم مائیگی پر افسوس آتا ہے۔ بمبئی پہنچوں تو کچھ پھول اور ہاتھ آئیں۔"

(بنام مہدی/ ۹ر اگست ۱۹۰۸ء)

"باوجود کثرت شغل آج کل بہت سی غزلیں لکھیں، بعض اشعار لکھتا ہوں۔"

(بنام مولانا فراہی/ ۲۷ر اگست ۱۹۰۸ء)

"حال میں خیر مقدم لکھا، دو شعر آپ بھی سن لیجے۔"

(بنام مہدی/ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۰۸ء)

"تہنیت کی غزل الگ مرسل ہے۔"

(بنام عطیہ/ ۷ر اکتوبر ۱۹۰۸ء)

"بوئے گل' جدید غزلوں کا مجموعہ جلد تر آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔"

(بنام مہدی/ ۱۲ر دسمبر ۱۹۰۸ء)

"بوئے گل' کہیے تو آپ کو بھیج دوں ۔ 'دستۂ گل' کی نسبت مہذب ہے۔"

(بنام زہرا/ ۲۳ر فروری ۱۹۰۹ء)

"بوئے گل' جس وقت مطبع سے آیا، ہدیۂ خدمت ہوگا۔"

(بنام زہرا/ ۲۷ر فروری ۱۹۰۹ء)

"بوئے گل' کا ایک نسخہ عطیہ کو دے آیا۔ آپ نے شاید دیکھا ہو۔ آپ چاہیں تو بھیج دوں۔"

(بنام زہرا/ ۱۵ر اپریل ۱۹۰۹ء)

"بوئے گل' کی نسبت اہل نظر کی رائے ہے کہ 'دستۂ گل' اور اس میں جذب و سلوک کا فرق ہے۔"

(بنام مہدی/ ۸ر مئی ۱۹۰۹ء)

"آج بیگم صاحبہ بھوپال کے شکریے کا جلسہ ہے۔ میں ایک نظم بھی پڑھوں گا۔"

(بنام ضیاء الحسن ندوی/ ۱۹ر نومبر ۱۹۰۹ء)

"میں مدت ہوئی واپس آیا، لیکن :

دردم کہ ہوائے چمن بمبئی امسال
سرمایۂ یک تازہ غزل نیز نبوداست"

(بنام شروانی / ۲۹ر نومبر ۱۹۰۹ء)

"بمبئی سے اب کے بالکل خالی ہاتھ واپس آیا، ایک غزل کا سرمایہ بھی نہ ہوسکا۔ اس شکایت میں ایک غزل لکھی، وہ بھی وہاں سے نکل کر، مطلع یہ ہے :

ہرچند غلط نیست کہ شبلی دل ودیں باخت
ایں حرف ولی مصلحت آمیز نبوده است"

(بنام مہدی / ۴ر دسمبر ۱۹۰۹ء)

"یہاں فارسی کی چند غزلیں لکھیں، لیکن ان میں نعد اور اثر نہیں۔"

(بنام عطیہ / ۱۹۰۹ء)

"بمبئی میں اب کے غزلیں، پھیکی رہیں۔ جوش کا سامان نہ تھا۔"

(بنام مہدی / ۲۲ر دسمبر ۱۹۱۰ء)

"جزیرہ پہنچ کر آب وہوا کی لطافت نے اسی وقت ارتجالاً ایک غزل لکھوائی ہے، جس کے دو شعر یہ ہیں ۔"

(بنام ابوالکلام آزاد / ۱۸ر مئی ۱۹۱۱ء)

"غزلیں ہو رہی ہیں لیکن پھیکی، کہاں تک ؟ آخر عمر اور سن کا بھی کچھ تقاضا ہے ۔"

(سید سلیمان / ۲۹ر مئی ۱۹۱۱ء)

"غزل کدۂ بمبئی میں آگیا ہوں، لیکن افسوس ہے کہ ابھی آب وہوا میں وہ زور نہیں آیا ہے، غزلیں ہو رہی ہیں، لیکن پھیکی ۔کسی پرچے میں ایک آدھ غزل شاید نکلے ۔"

(بنام مہدی / ۶ر جون ۱۹۱۱ء)

یُہاں کے جلسے میں میں نے چند شعر پڑھے تھے ۔ مناسبت موقع سے چند شعر درج ہیں ۔"

(بنام ظفر علی خاں / ۱۶ر نومبر ۱۹۱۲ء)

"بلقان پر نظم لکھی تھی دیکھی ہوگی ۔"

(بنام مہدی / ۱۳ر دسمبر ۱۹۱۲ء)

"چند تاریخی اور اخلاقی نظمیں لکھنی شروع کی ہیں ۔ قرنِ اول کے اخلاقی واقعات نظم میں آجائیں تو اچھا ہے ۔"

(بنام مولانا عبدالباری ندوی / یکم مارچ ۱۹۱۳ء)

" 'الہلال' میں میری خاص نظمیں اب چھپیں گی، جن میں اخلاق عرب کے واقعات ہیں ۔ محض تاریخی واقعات ہیں، انشاطرازی نہیں ۔"

(بنام مہدی / ۱۴ر اپریل ۱۹۱۳ء)

"ایک نظم 'الہلال' میں اپنے نام سے بھیج دی ہے، زیادہ پرجوش ہے، لوگ اور بُرا مانیں گے ۔"

(بنام عبدالباری / ۱۰ر جون ۱۹۱۳ء)

"یہ تو آپ کو لکھ چکا ہوں کہ میری جدید نظمیں علی گڑھ والے چھاپ رہے ہیں ۔ 'کشافیات' پر بھی ان کی نظر ہے ۔"

(بنام ابوالکلام / ۲۰ر اگست ۱۹۱۳ء)

"کانپور کے واقعے پر ایک مختصر سی نظم 'زمیندار' میں بھیج دی ہے ۔ دیکھنا !"

(بنام سید سلیمان / ۲۳ر اگست ۱۹۱۳ء)

"اردو میں تاریخی نظمیں جو میں نے 'الہلال' میں لکھی تھیں، علی گڑھ والے علاحدہ مع فوٹو چھپوا رہے ہیں ۔"

(بنام سمیع / ستمبر ۱۹۱۳ء)

"جدید اردو نظمیں تم آگرہ سے لائے ہو گے ۔ پولٹیکل نظمیں ایک صاحب چھاپ رہے

ہیں۔ یہ بڑھاپے کا زور ہے۔"

بنام سمیع / جنوری ۱۹۱۴ء

"تاریخی نظموں کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا ہے۔"

(بنام عبدالماجد دریابادی / جون ۱۹۱۴ء)

مندرجہ بالا اقتباسات تاریخی ترتیب سے نقل کئے گئے ہیں اور ۱۸۸۲ء سے ۱۹۱۴ء تک یا بہ الفاظ دیگر شبلی کے عہد شباب سے سنہ وفات تک کے زمانے کو محیط ہیں۔ یہاں ان کی نقل میں طوالت وکثرت کو محض اس لیے روا رکھا گیا کہ ان کے ذریعے شبلی کی شاعرانہ سرگرمیوں سے پردے اٹھائے جاسکیں اور اندازہ ہوسکے کہ ان کی فکر زندگی کے ہر دور میں کس طرح شعروشاعری کے محور پر رقص کرتی رہی ہے؟ سوانح نگاروں کے بیان کے مطابق ابتدا میں انھیں مولویانہ مناظروں سے زیادہ دلچسپی رہی، قیام علی گڑھ کے دوران تاریخی و سوانحی رجحان غالب رہا، حیدرآباد پہنچ کر علم کلام کا غلبہ ہوگیا، ندوۃ العلماء کی معتمدی کے دوران شعرالعجم تصنیف کی اور زندگی کے آخری دو سال سیرت نبوی کی تالیف میں بسر کیے۔ لیکن محولہ بالا خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس تمام مدت میں گوناگوں مصروفیات ورجحانات کے باوجود انھوں نے شاعری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ یہی نہیں بلکہ احباب سے باربار اور مختلف پیرایوں میں اپنی شاعرانہ سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے، جو خالی از علت نہیں۔ اس لیے یہ دعویٰ حق بجانب ہوگا کہ شاعرانہ سرگرمیاں شبلی کی زندگی کا لازمی وبنیادی عنصر رہی ہیں، جسے نظرانداز کرکے ان کے ساتھ انصاف ممکن نہیں۔

شبلی کی شاعرانہ نفسیات کا ایک اور پہلو قابل ذکر ہے۔ چھپنے چھپانے کا شوق کسے نہیں ہوتا، لیکن شاعر میں یہ جذبہ اپنی انتہائی شکل میں پایا جاتا ہے۔ شبلی بھی اس سے مبرا نہیں۔ ذیل کے چند اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلام کی اشاعت کا انھیں بہت خیال رہتا تھا۔ لکھتے ہیں:

• "افسوس میرے قصیدے کی متعدد کا پیاں نہیں۔ ایک پرچہ جو میرے پاس تھا وہ اس قدر سارے مدرسے میں ہفتوں تک دست بدست پھرا کیا کہ مل دل کر پرزے

پڑے ہو گیا۔ اگرچہ بہت سے لوگوں نے اس کی نقلیں بھی لیں، مگر چھپا ہوتا تو خوب ہوتا۔"

(بنام سمیع / اپریل ۱۸۸۱ء)

"گیا کچھ زمانے کے موافق نہیں ورنہ اب کی پورا قصد تھا کہ دیوان فارسی مرتب کروں۔"

(بنام سمیع / فروری ۱۸۸۴ء)

"میں نے مولوی فاروق صاحب سے عرض کیا تھا کہ میرا فارسی کلام کسی قدر چھاپا جائے گا۔ اس واسطے اگر آپ اس کو دیکھ لیں تو بہتر ہے۔ حضرت موصوف نے منظور فرما لیا ہے۔ میرے پاس جو کلام ہے وہ میں بھیج دوں گا، مگر فارسی کے نامے اور غزلیں وغیرہ جو تمہارے پاس ہیں، نہایت جلد مولانا کے پاس.... بھیج دو۔"

(بنام سمیع / ۲۷ مارچ ۱۸۸۴ء)

میرا قصد تھا کہ صرف واسوخت اور نامہ سرِدست چھپ جاتے، مگر روپیہ نہیں، کہیں سمیع نہ سن پائیں نہیں تو وہ روپیوں کے ڈھیر لگا دیں گے کہ اتنے کے لیے چھپنا کیوں بند رہے۔"

(بنام سمیع / ۲۴ اپریل ۱۸۸۴ء)

"میرا مجموعۂ نظم فارسی مطبع میں چھپنے کے لیے گیا اور امید ہے کہ جلد تیار ہو جائے۔ اخبار کے پرانے فائلوں اور بعض اور طریقوں سے جہاں تک ہو سکا اشعار جمع کیے گئے۔ میاں مہدی کے واپس آنے پر میں نے مشن اسکول کے جلسے کے لیے ایک نظم لکھی تھی 'آمدہ' اس کی ردیف ہے، اگر تم اس کو بہم پہنچا کر بھیج دو تو وہ بھی چھپ جائے۔ تمہارے ذریعہ اگر اس مجموعے میں اضافہ ہو سکتا ہے تو اٹھا نہ رکھو۔"

(بنام سمیع / مارچ ۱۸۹۲ء)

"بہرحال اگر آپ سیاسی نظمیں بھی چھاپنا چاہتے ہیں تو میرے تینوں آرٹیکل پولٹیکل کروٹ والے بھی شامل کیجئے۔ اس نظم کی وہ نثر شرح ہے۔ کچھ دیباچہ بھی ہونا چاہیئے وہ میں لکھ دوں گا۔"

(بنام منشی محمد امین زبیری/ ۵ رجنوری ۱۹۱۳ء)

آپ میری تمام نظمیں لیں۔۔ لیکن شرط یہ ہے کہ چھپائی اور کاغذ اعلیٰ درجہ کا ہو۔۔۔۔ ہاں نظمیں میرے پاس نہیں۔ 'الہلال' سے مہیا کرنی پڑیں گی۔ بعض نظمیں 'زمیندار' اور 'ہمدرد' میں ملیں گی۔ میں ان کو مہیا کر دوں گا۔

(بنام زبیری/ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۱۳ء)

نظموں کے دو حصے ہونے چاہئیں؛ اخلاقیات وسیاسیات ۔۔۔۔ اردو نظمیں جس قدر 'الہلال' میں ہیں، سب لکھوا کر میرے پاس بھجوا دیجے تو یاد آئے کہ اور کیا کیا باقی ہے۔ میرے پاس کچھ موجود نہیں لیکن دماغ پر زور ڈال کر پتہ لگا لوں گا۔"

(بنام زبیری/ یکم نومبر ۱۹۱۳ء)

شبلی کی شاعرانہ سرگرمیوں کا موازنہ اگر ان کے معاصر شعراء آزاد، حالی، اسماعیل وا کبر سے کیا جائے تو کئی حیثیتوں سے شبلی کو ترجیح حاصل ہوگی:

(الف) شبلی کے معاصر شعراء ادب کی دنیا میں محض اردو شاعر کی حیثیت سے متعارف ہیں اور ان کی فکری کاوشوں کا وقیع اور گراں قدر سرمایہ صرف اردو شاعری کی شکل میں محفوظ ہے۔ اس کے برخلاف شبلی نے اردو و فارسی دونوں زبانوں میں گراں قدر شعری سرمایہ یادگار چھوڑا ہے اور بحیثیت شاعر ان کی شہرت و مقبولیت میں اردو کے علاوہ فارسی کا حصہ بھی ناقابل فراموش ہے، بلکہ بعض حیثیتوں سے ان کا فارسی کلام قابل ترجیح ہے۔ اسی لیے ان کے سب سے بلند پایہ ہم عصر شاعر حالی نے "دستۂ گل" (شبلی کی فارسی غزلیات کا مجموعہ) کی اشاعت کے بعد شبلی کو یہ الفاظ لکھ کر بھیجے تھے: "میرا ارادہ تھا کہ اپنا فارسی کلام نظم، نثر جو کچھ ہے اس کو بھی چھپوا کر شائع کر دوں، مگر "دستۂ گل" دیکھنے کے بعد میری غزلیں خود میری نظر سے گر گئیں۔"

(ب) مختلف اور متنوع اصناف سخن میں طبع آزمائی کے لحاظ سے بھی شبلی اپنے معاصرین میں ممتاز ہیں۔ چنانچہ ان کے مجموعہ اردو وفارسی کلیات میں مجموعی طور پر غزلیات، قصائد، مثنویات، مراثی، رباعیات، قطعات، ترکیب بند، مسدس، شہرآشوب اور طرح طرح کی نظمیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ۴۵ بند پر مشتمل ایک معرکہ آرا واسوخت بھی کہا تھا جواب ناپید ہے۔ اصناف سخن میں تنوع اور رنگارنگی کی یہ کیفیت شبلی کے ہم عصروں کے یہاں نہیں پائی جاتی۔

(ج) شبلی کی شاعری کے موضوعات کا دائرہ بھی ان کے ہم عصروں کے مقابلے میں وسیع ہے چنانچہ ان کے یہاں مذہبی، اخلاقی، قومی، سیاسی، تاریخی، عاشقانہ اور رندانہ ہر قسم کے موضوعات پر طبع آزمائی کی مثالیں ملتی ہیں۔

(د) شبلی کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ انھوں نے سنجیدہ شاعری کے پہلو بہ پہلو طنزیہ شاعری میں بھی قابل قدر نمونے یادگار چھوڑے ہیں، جبکہ ایک طرف حالی، آزاد اور اسماعیل نے اس وادی میں قدم ہی نہیں رکھا اور دوسری طرف اکبر اسی میدان کے مرد ہو کر رہ گئے۔

ان حقائق کے پیش نظر یہ دعویٰ حق بجانب ہوگا کہ شاعرانہ جامعیت کا جو وصف شبلی میں موجود تھا، اس سے ان کے ہم عصر خالی تھے۔

مشرق میں شاعرانہ سرگرمیوں کی ایک شاخ تلامذہ کے کلام پر مشوروں اور اصلاح کی خدمت کی انجام دہی بھی ہے۔ شبلی کے اس طرح کے تلامذہ کا اگرچہ کوئی حلقہ نہ تھا تاہم "مکاتیب شبلی" کی ورق گردانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کسی قدر یہ خدمت بھی انجام دی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام لکھے گئے خطوط خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔ ہم ذیل میں اس کی ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں:

"غزل دیکھی بعض شعر بہت اچھے ہیں مثلاً "چو آشنا نگہے کرد" الخ۔ جو الفاظ بے کار اور بھدّے ہیں ان پر خط کھینچ دیا ہے۔ "ضیائے شمع تراشب چراغ ویرانہ" محض 'شمع' ہونا اور ضرورت ہی ہو تو 'ضیائ' کے بجائے 'فروغ' ہونا چاہئے۔ 'دیدۂ محمود' کے

بجائے "نرگس مخمور" ہونا چاہیے۔ "انداز ناز جانانہ" یاد نہیں آتا کہ "انداز" کے جو معنی اردو میں ہیں، فارسی میں بھی آتے ہیں۔ "بہ قلب خویش" قلب کا لفظ بہت بھدا ہے۔ "بہ صف لشکری" "ی" بالکل ناجائز ہے محض "لشکر" کہیے عروض کی رو سے بھی ناجائز ہے۔" (۱۷راگست ۱۹۰۰ء)

شبلی کی شاعرانہ سرگرمیوں کے اس تفصیلی جائزے کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ان کا شاعرانہ کردار نہایت صحت مند اور جاندار رہا ہے۔ اس لیے سید سلیمان ندوی، آل احمد سرور اور سلام سندیلوی وغیرہ کی اس متفقہ رائے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ "شبلی نے سنجیدگی اور باقاعدگی کے ساتھ شاعری نہیں کی بلکہ ان کی شاعری محض وقتی تاثر یا تفریح طبع کا نتیجہ تھی"، کیونکہ قرائن وشواہد اس کے خلاف ہیں۔

جامعہ کے خریداروں سے ضروری گذارش

۱۔ بہ وجوہ جامعہ کی روانگی کی تاریخیں ہر ماہ کی ۲۰ اور ۲۱ مقرر ہوتی ہیں۔ اس مرتبہ کاغذ کی دقتوں کی وجہ سے خاصی تاخیر ہوگئی ہے جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔

۲۔ بعض خریدار اپنا چندہ کسی شخص کے نام یا مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے پتے پر بھیجتے ہیں یا مکتبہ جامعہ کے رسالوں ——— ماہنامہ کتاب نما یا ماہنامہ پیام تعلیم ——— کے چندے ماہنامہ جامعہ کے چندے کے ساتھ بھیج دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں انتظامیہ کو سخت دشواری پیش آتی ہے اور خواہ مخواہ کے لیے خریداروں کو شکایت پیدا ہوتی ہے اس لیے گذارش ہے کہ جامعہ کا چندہ اور دیگر انتظامی خطوط، مینیجر ماہنامہ کے نام بھیجا کریں

مینیجر ماہنامہ جامعہ

تعارف وتبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

خدا بخش لائبریری جرنل

مجلس ادارت: قاضی عبد الودود (چیرمین) سید حسن عسکری۔

افسر الدولہ فیاض الدین حیدر۔ عابد رضا بیدار (سکریٹری)

پٹنہ (بہار) کی خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری ہندوستان کے ان چند کتب خانوں میں سے ہے، جسے مختلف خصوصیات کی وجہ سے بڑی شہرت اور اہمیت حاصل ہے اور جب سے مرکزی حکومت کی سرپرستی میں آئی ہے اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار اس کے ڈائرکٹر مقرر ہوتے ہیں، اس کی خصوصیات اور افادیت میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔ ان ہی خصوصیات میں سے ایک زیر تبصرہ جرنل بھی ہے۔ اب تک (اپریل ۱۹۸۰ء تک) اس کے چھ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ تین شمارے ۱۹۷۷ء میں اور تین شمارے ۱۹۷۸ء میں۔ اس کا سائز ۱۸×۲۲/۸ ہے۔ اور ایک شمارے کی قیمت پندرہ روپئے، مضامین کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے کہ: "اس سہ ماہی مجلے میں انگریزی، اردو، فارسی یا عربی میں ایسے مضامین شائع ہوں گے جو خدا بخش لائبریری کے نادر مواد پر مبنی ہوں یا لائبریری سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھتے ہوں"۔ نمونے کے طور پر پہلے اور چھٹے شمارے کے مضامین کی فہرست ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔ اس سے رسالے کی نوعیت اور معیار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پہلا شمارہ: (۱) تعارف از قاضی عبد الودود (۲) فارسی اور ہندوستان از ڈاکٹر نذیر احمد (۳) غزالی مشہدی و مثنوی اش نقش بدیع از افسر الدولہ فیاض الدین حیدر (۴) فالنامۂ حافظ شیراز مولفہ عنایت خاں راسخ از ادارہ (۵) دیباچہ کلیات مرزا جان طپش دہلوی از ادارہ (۶) طبقات الحنفیہ و مولفوھا از ڈاکٹر عبد الرشید (۷) تیج بہادر سپرو کا رسالہ کشمیر درپن از عابد رضا بیدار (۸) موتی لال

نہرو کی ایک اردو تقریر از ادارہ (۹) مطبوعات جدیدہ: بہ تحقیق از قاضی عبدالودود (۱۰) تصحیح و اضافہ: دیوان رضا از قاضی عبدالودود (۱۱) نوادر: ابوالکلام آزاد کی خود نوشت تحریر: لائبریری کے وزیٹر رجسٹر سے ماخوذ عکسی تحریریں (گاندھی جی اور پنڈت نہرو) (۱۲) میرے والد (انگریزی) از مرحوم صلاح الدین خدابخش (۱۳) مکتوبات مظفر شمس بلخی — ایک مطالعہ (انگریزی) از ڈاکٹر سید حسن عسکری۔

چھٹا شمارہ : (۱) صحف ابراہیم: تذکرۂ شعرای فارسی (سدۂ دوازدہم) مولفہ علی ابراہیم خاں خلیل از ادارہ (۲) دیوان تونی خبوشانی از قاضی عبدالودود (۳) تصحیح و اضافہ: فالنامۂ مخدوم الملک منیری — خدابخش لائبریری کا قیام: سال اوّل از ڈاکٹر عابد رضا بیدار (۴) بانی کتاب خانہ کی تقریر (۱۸۹۰ء) از خدابخش خاں (۵) بانی سکریٹری کی رپورٹ (۱۸۹۱ء) از خدابخش خاں (۶) خدابخش لائبریری کے بارے میں چند تاثرات از شبلی نعمانی (۷) نوادر: لائبریری کے وزیٹر رجسٹر سے ماخوذ عکسی تحریریں (لارڈ منٹو، لارڈ ماؤنٹ بیٹن؛ لارڈ ویول؛ لارڈ لنلتھگو وائسرائے) (۸) اسلامی کتاب خانے (انگریزی) از خدابخش خاں (۹) اشارات: مخدوم بہار کی طرف منسوب ایک تصنیف (انگریزی) از ڈاکٹر سید حسن عسکری۔

اس کتب خانے کے بانی خدابخش خاں، اپنے دور کی بڑی اہم اور نامور شخصیت تھے، وہ ۲ اگست ۱۸۴۲ء کو چھپرا (بہار) میں پیدا ہوئے اور ۳ اگست ۱۹۰۸ء کو پٹنہ میں انتقال کیا۔ ان کی علمی اور ملکی خدمات کے اعتراف میں حکومت نے ۱۸۸۱ء میں خان بہادر کا اور ۱۹۰۳ء میں سی۔ آئی۔ اے کا خطاب دیا۔ ان کے والد مولوی محمد بخش مرحوم بھی بڑے ذی علم اور عالم فاضل تھے اور انہیں کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ خدابخش خاں کو نادر کتابوں اور قیمتی مخطوطات کے جمع کرنے کا شوق اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا۔ ان کے والد نے ۱۸۲۸ء میں ایک چھوٹا سا کتب خانہ قائم کیا تھا اور ۱۸۷۶ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو اس کتب خانے میں ۱۴سو کتابیں تھیں جن میں اکثر قلمی تھیں ۵ اکتوبر ۱۸۹۰ء کو جب خدابخش خاں مرحوم نے خدابخش لائبریری کے قیام اور اس کو عام استفادے کے لئے وقف کرنے کا باقاعدہ اعلان کیا تو اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ: "میں نے حسب وصیت اپنے والد مرحوم کے اس کتب خانے کو وقف کر دیا ہے۔ یہ وقف مسلمین پر خصوصاً اور علم دوست قوموں پر عموماً ہے، اس وقف میں مجھ کو انسان مختلف الالوان والاقسام کا خیال نہیں

اور غرض ہماری محض خیر جاری ہے۔ اس سے کوئی افتخار دنیاوی مقصود نہیں، کوئی حصول امر از حکام منظور نہیں . . . " (جرنل جلد ۶ صفحہ ۱۷۹) برصغیر کے مشہور عالم و فاضل مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء۔ ۱۹۱۴ء) نے ۲۳ فروری ۱۸۹۱ء کو اس کتب خانے کے بارے میں لکھا ہے کہ : "ایک مدت سے ہم اس کتب خانے کا شہرہ سنتے تھے۔ دہلی اور لکھنؤ میں بعض تاجر ہیں جو قلمی نایاب کتابیں جا بجا سے بہم پہنچاتے ہیں اور ان کو نہایت گراں قیمت پر بیچتے ہیں۔ ہم جب کبھی ان سے ملے اور کمیاب نسخوں کی فرمائش کی تو انھوں نے کہا کہ اس قسم کی کتابیں سب سے پہلے مولوی خدا بخش کے پاس جاتی ہیں کیونکہ ہمارے ملک میں کوئی شخص ان سے زیادہ قیمت نہیں دے سکتا۔ ان باتوں نے ہم کو کتب خانہ مذکور کا نہایت مشتاق بنا رکھا تھا۔ اسی شوق نے آخر پٹنہ پہنچایا اور چار دن رہ کر ہم نے اس نادر کتبخانے کی سیر کی " آخر میں مولانا نے لکھا ہے " حقیقت یہ ہے کہ یہ کتب خانہ پٹنہ اور پٹنہ والوں کے لئے بڑے فخر کی چیز ہے، بلکہ ہندوستان کے عام مسلمان اس پر فخر کر سکتے ہیں " (جرنل جلد ۶ صفحات ۱۷۷ و ۱۸۰)

ہمیں خوشی ہے کہ جس قدر اہم اور مفید یہ کتب خانہ ہے، اسی قدر اہم اور مفید اس کا زیر تبصرہ ترجمان سہ ماہی جرنل ہے۔ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس پورے برصغیر ہند و پاک میں جو تحقیقی مجلے شائع ہوتے ہیں ان میں " خدا بخش لائبریری جرنل " ممتاز اور منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ اس کا یہ مجلے کی اشاعت پر کتب خانے کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار اردو کے ریسرچ اسکالروں کے دلی شکریے کے مستحق ہیں۔ امید ہے کہ علمی اور تحقیقی حلقوں میں رسالے کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ملنے کا پتہ : خدا بخش اورنٹیل لائبریری، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۴

(عبد اللطیف اعظمی)

اور غرض ہماری محض خیر جاری ہے، اس سے کوئی افتخار دنیاوی مقصود نہیں، کوئی حصول اعزاز کا منظور نہیں ۔۔۔" (جرنل جلد ۶ صفحہ ۱۶۹) برصغیر کے مشہور عالم و فاضل مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷ ۱۹۱۴) نے ۲۳ فروری ۱۸۹۱ء کو اس کتب خانے کے بارے میں لکھا ہے کہ : "ایک مدت سے ہم اس کتب خانے کا شہرہ سنتے تھے۔ دہلی اور لکھنؤ میں بعض تاجر ہیں جو قلمی نایاب کتابیں جابجا سے بہم پہنچاتے ہیں اور ان کو نہایت گراں قیمت پر بیچتے ہیں۔ ہم جب کبھی ان سے ملے اور کمیاب نسخوں کی فرمائش کی تو انھوں نے کہا کہ اس قسم کی کتابیں سب سے پہلے مولوی خدابخش کے پاس جاتی ہیں کیونکہ ہمارے ملک میں کوئی شخص ان سے زیادہ قیمت نہیں دے سکتا۔ ان باتوں نے ہم کو کتب خانہ مذکور کا نہایت مشتاق بنا رکھا تھا۔ اسی شوق نے آخر پٹنہ پہنچایا اور چار دن رہ کر ہم نے اس نادر کتبخانے کی سیر کی " آخر میں مولانا نے لکھا ہے :" حقیقت یہ ہے کہ یہ کتب خانہ پٹنہ اور پٹنہ والوں کے لئے بڑے فخر کی چیز ہے، بلکہ ہندوستان کے عام مسلمان اس پر فخر کر سکتے ہیں " (جرنل جلد ۶ صفحات ۱۷۷ و ۱۸۰)

ہمیں خوشی ہے کہ جس قدر اہم اور مفید یہ کتب خانہ ہے، اسی قدر اہم اور مفید اس کا ترجمان سہ ماہی جرنل ہے۔ بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس پورے برصغیر ہند و پاک میں جو تحقیقی مجلے شائع ہوتے ہیں ان میں " خدابخش لائبریری جرنل " ممتاز اور منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ اس کا معیاری مجلے کی اشاعت پر کتب خانے کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار اردو کے ریسرچ اسکالروں کے دلی شکریے کے مستحق ہیں۔ امید ہے کہ علمی اور تحقیقی حلقوں میں رسالے کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ملنے کا پتہ : خدابخش اورینٹل لائبریری۔ پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۴

(عبداللطیف اعظمی)

سالانہ چندہ
چھ روپے

جامعہ

قیمت فی شمارہ
پچاس پیسے

جلد ۷۷ | بابت ماہ مئی و جون ۱۹۸۰ء | شمارہ ۵-۶

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبداللطیف اعظمی

خط وکتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

The Monthly Jamia

Jamia Millia Islamia, New Delhi-110025

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی • مطبوعہ: جمال پریس دہلی ۶ • ٹائٹل: فائن پریس دہلی ۶

شذرات

ابھی حال میں ایک مضمون نظر سے گزرا جس کا عنوان ہے "اختصاص کا وحشی پن"۔ اس مضمون میں پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح انیسویں صدی کے تمدن نے بے چہرہ ازدحامی انسان (Mass-Man) کو جنم دیا ہے اور پھر یہ کہا گیا ہے کہ آج "مہذب انسان" خال خال ہی ملتے ہیں۔ "مہذب انسان" کی اصطلاح سے مراد مضمون نگار کے نزدیک ایسی شخصیت سے ہے جو علم کی زیادہ سے زیادہ جہتوں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے ایسے عالم اور سائنسداں پیدا ہونے لگے جو اپنی مثال آپ تھے، تاریخ میں ان کی نظیر نہ ملے گی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایک ہی علم سے واقف تھے جبکہ صاحب الرائے ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وسیع ذخیرہ علوم میں سے معقول حد تک علم سے واقفیت ہو۔ پھر یہ کہ ان عالموں اور سائنس دانوں کی اس علم کے کسی حقیر سے گوشے ہی کی شناسائی تھی جس کے وہ پرجوش محقق تھے۔ یہ صورت حال بڑھتے بڑھتے اب اور بھی نزاکت اختیار کر گئی ہے۔

یہ دور سائنس اور ٹیکنولوجی کا دور ہے، اور ہمارے موجودہ تمدن کی اصل وعلامت سائنس ہی بن گئی ہے جو محض اوسط درجہ کی ذہنیت اور قابلیت کے لوگوں ہی کے لئے جگہ، اور وہاں انھیں کامیابی سے معروف رکھنے کا موقع نکالتی ہے۔ مضمون نگار نے اس بات کا سبب میکانکیت کو قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہی چیز جدید سائنس اور اس تمدن کے لئے جس کی رہنمائی اور نمائندگی کی یہ ضامن ہے، نفع بخش بھی ہے اور خطرناک بھی۔ فائدہ اس میں یہ ہے کہ اختصاص کی بدولت سائنسی تحقیق کی بیشتر مقدار ایسے ذہنی کام پر مشتمل ہوتی ہے جو سراسر میکانکی ہے۔ بے شمار تحقیقات کرنے کے لئے سائنس کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں بانٹ دینا اور اپنے آپ کو ان میں سے کسی ایک میں محصور کر لینا اور باقی تمام چیزوں کو ذہن بدر کر دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ طریقۂ کار اگر درست ہے تو کام بڑے میکانکی انداز میں مکمل ہو جاتا ہے اور وافر نتائج کے حصول کے لئے ان کے اصول ومعانی جاننے کی جانکاہ کوشش اور فکر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جس طرح شہد کی مکھی چھتے کے کسی خلیے میں محصور ہوتی ہے بالکل اسی طرح

ہمارے اکثر سائنس داں اپنے عمل میں محصور و مقید رہ کر سائنس کی عمومی ترقی کا باعث بنتے ہیں۔

مضمون نگار نے اس کے بعد لکھا ہے کہ لیکن اس کے نتیجے میں ایک غیر معمولی طور پر عجیب و غریب فرد جنم لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسا محقق جس نے فطرت کی ایک نئی جہت کا کھوج لگایا ہو۔ یقیناً آپ کو ایک ایسے شخص کے روپ میں دکھتا ہے جو علیم ہے، حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اس کے اندر ایک عظیم شے کا صرف ایک جزو موجود ہے جیسے بعض ایسے دیگر اجزاء سے مربوط و منضبط کر کے ہی جو ایک شخص کے باطن میں موجود نہیں ہیں، حقیقی علم وجود میں لایا جا سکتا ہے۔ یہ ہے ایک متخصص کی سچی باطنی تصویر جو اس صدی کے پہلے چند برسوں میں غلو اور مبالغے کی انتہائی وحشت تک پہنچ گیا ہے۔ یہ متخصص اپنی کائنات کے ایک نہایت ننھے گوشے سے تو بخوبی واقف ہے لیکن باقی تمام جہات اور ابعاد سے یکسر بے خبر! اب صورت یہ ہے کہ اس سے پہلے ہم افراد کو آسانی سے علماء اور جہلاء میں تقسیم کر سکتے تھے جن میں سے کم و بیش کچھ کا ایک حلقے اور کچھ کا دوسرے حلقے سے تعلق ہوتا تھا لیکن آج کے اس متخصص کو ان میں سے کسی ایک کے تحت نہیں لایا جا سکتا۔ وہ عالم نہیں ہے اس لئے کہ وہ اپنے تخصیصی میدان سے باہر کی ہر چیز سے بے خبر ہے لیکن وہ جاہل بھی نہیں ہے اس لئے کہ وہ سائنس داں ہے اور کائنات سے متعلق اپنے نہایت چھوٹے سے حصے کا بخوبی "علم" رکھتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ "عالم جاہل" ہے اور ایسا ہونا باعث تشویش ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جاہل ہے مگر جاہل آدمی کے طرز پر نہیں بلکہ اس شخص کے طرز پر جو اپنے خاص میدان کا عالم تنک مایہ ہوتا ہے

اس مضمون میں جسے مغرب کے ایک صاحب نظر نے لکھا اور جس کا ترجمہ تحسین فراقی نے معاصر (لاہور) کی ایک خاص اشاعت میں شائع کرایا ہے، اس سلسلے میں یہ کہا گیا ہے کہ حقیقت میں ایک متخصص کا رویہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ جو صاحب بھی اس کی تصدیق کرنا چاہیں وہ فکر، رائے اور عمل کی اس حماقت کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں جو آج کل سیاست، فنون، مذہب اور زندگی کے عام مسائل میں اور اہل سائنس اور ان کے اتباع میں ڈاکٹروں، انجینئروں، سرمایہ کاروں، معلموں اور بعض دیگر افراد میں پائی جاتی ہے۔ یہ بات بار بار کہی جا چکی ہے کہ سُنی ان سُنی کرنے اور اپیل کی اعلیٰ عدالتوں سے رجوع نہ کرنے کا رجحان فرد عامی انسان کی غالب خصوصیات ہیں اور یہی خصوصیات ان جزوی سند یافتہ اصحاب (جن کا ابھی ذکر ہوا) کے یہاں

اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہیں۔ یہی لوگ عامۃ الناس کی حقیقی مملکت محروسہ کی نمائندگی کرتے ہیں اور بڑی حد تک اس کی تشکیل کے ذمہ دار ہیں۔ انہیں لوگوں کی بربریت یورپ کے اخلاقی انحطاط کا فوری سبب بنی ہے۔ مزید براں یہی لوگ اس امر کا بھی واضح ثبوت مہیا کرتے ہیں کہ گزشتہ صدی کا تمدن کس طرح اپنے ہی ہاتھوں وحشی پن اور بربریت کے نئے جنم کا باعث بنا ہے

مضمون کے آخر میں جو بات کہی گئی ہے وہ مندرجہ بالا امور سے زیادہ ہماری توجہ اور غور وفکر کی طالب ہے۔ مضمون نگار لکھتے ہیں کہ اس غیر متوازن اختصاص کا فوری نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج عام طور پر مہذب انسان کا فقدان ہے اور اس صورت حال کا بدترین پہلو یہ ہے کہ سائنس کے یہ جزوی اور بے خبر خدمت گار خود سائنس کی حقیقی ترقی کی کوئی ضمانت مہیا نہیں کرتے۔ سائنس اپنی ترقی کے لئے وقتاً فوقتاً تشکیل نو کی کٹھنائیوں کا تقاضا کرتی ہے۔ نیوٹن اس قابل تھا کہ فلسفے کا کاوسیع علم نہ رکھنے کے باوجود طبیعات کے ایک سسٹم کی بنیاد رکھ سکے لیکن آئن سٹائن کے لئے ازبس لازم تھا کہ اپنے متوازن امتزاج تک پہنچنے سے پہلے کانٹ اور ماخ کی فتوحات علمی کا باقاعدہ استیعاب مطالعہ کرے۔ کانٹ اور ماخ تو درحقیقت اس عظیم فلسفیانہ فکر کی دو علامتیں ہیں جنھوں نے آئن سٹائن پر خاصا اثر ڈالا، اس کے ذہن کو آزادی سے ہمکنار کیا اور اس کی ایجاد و ابداع کے لئے راستہ نکالا لیکن محض آئن سٹائن ہی کافی نہیں۔ طبیعات اپنی تاریخ کے نہایت نازک دور میں داخل ہو رہی ہے اور اسے بچانے کے لئے کہیں زیادہ منظم اور جدید تبحر علمی کی ضرورت ہے۔

پس اختصاص جس نے گزشتہ ایک صدی میں تجربی سائنس کے محیر العقول کارناموں کو ممکن بنایا ہے، ایک ایسی منزل میں پہنچ گیا ہے جہاں تخصص کے لئے اپنی مخصوص سائنس کے باطنی فلسفے کا بھی ضروری ہو گیا ہے، اور اسی کے ساتھ اس کی اُن تاریخی شرائط سے بھی واقفیت ضروری ہے جن سے انسان کی ہمہ جہتی ترقی کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ اسی طرح سماج اور قلب انسانی کی دھڑکنوں کو باہم منظم اور منضبط کیا جا سکتا ہے ـــــــ گزشتہ چند برسوں میں سائنس کے مختلف گوشوں میں محسوس کی جانے والی کمی ہر اس شخص کے لئے پریشان کن ہے جسے صاف طور پر معلوم ہو کہ

انسان کیا ہے، اس کی خارجی اور باطنی ضروریات کیا ہیں، اخلاقیات کا ایک اچھے معاشرے کی ترقی و تعمیر میں کیا حصہ ہوتا ہے، یعنی جیسے یہ معلوم ہو کہ تمدن کیا ہوتا ہے اور اس کے خد و خال کن مادی، اخلاقی اور روحانی قوتوں کے سہارے ابھرتے اور ترقی پذیر ہوتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہمارا آج کا سائنس داں ان امور سے عام طور پر نا واقف رہتا ہے حالاں کہ یہی سائنس داں ہمارے موجودہ تمدن کا نقطۂ کمال ہے۔

پھلواری شریف (بہار) سے ایک رسالہ المجیب نکلتا ہے۔ اس کے ایک حالیہ شمارے میں میرے اس سفر نامے پر جو ماہنامہ جامعہ کے ستمبر اور اکتوبر ۱۹۷۵ء کے شماروں میں "امام بخاری، بابر اور احمد دانش کے دیس میں" کے عنوان سے چھپا تھا، جناب مہدی بخاری صاحب نے جو آرہ کی جامع مسجد میں امام ہیں، میرا سخت تعاقب کیا ہے اور میری نیت پر بھی شبہ کیا ہے۔ افسوس ہے کہ میرے سفر نامہ کی روح مہدی بخاری صاحب کی گرفت سے باہر رہی اور انھوں نے خواہ مخواہ میرے اور اپنے قدیم ہم وطنوں کے ایمان کا جائزہ لینے میں اپنا وقت ضائع کیا۔ ایسی صورت میں تو میں ان کی خدمت میں علامہ اقبال کا ایک شعر ہی پیش کر سکتا ہوں:

حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے

ڈاکٹر حنیف نقوی

وفاتِ جوہر

پر

اقبال کے قطعے کی دو تضمینیں

میرے نانا مرحوم منشی شاکر حسین نکہت[1] سہسوانی فارسی زبان وادب کے ان متبحر عالموں اور رمز شناسوں میں سے تھے جو صحیح معنی میں ہزاروں میں ایک کہے جانے کے مستحق ہوتے ہیں، وہ فن تاریخ گوئی کے یگانۂ عصر استاد منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی کے حقیقی بھتیجے اور شاگرد تھے۔ اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے، لیکن فارسی شاعری بالخصوص قصیدہ گوئی سے ان کی طبیعت کو خاص مناسبت تھی۔ مشہور اساتذہ کی زمینوں میں ان کے قصائد، طویل بیانیہ نظمیں اور غزلیات، جو ہنوز اشاعت سے محروم ہیں، فارسی زبان سے ان کے غیر معمولی شغف اور اس کے اسالیب بیان پر حاکمانہ قدرت کی نشان دہی کرتی ہیں۔ احمد علی شوق قدوائی[2] اپنے ایک خط مورخہ ۴ر اگست ۱۹۲۰ء میں ان کے ایک فارسی قصیدے کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حضرت کرم فرمائے بندہ! سلام شوق۔ خط مع قصیدے کے مجھے پہنچا، شکریہ۔ رسید مع الخیر سے اطمینان ہوا۔ قصیدہ بہت عمدہ ہے۔ پروفیسر اولاد حسین شاداں[3] نے بھی دیکھا، پسند کیا۔ منشی واحد علی صاحب آبر[4]

ڈاکٹر حنیف نقوی، لکچرر شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی۔ ورناسی (یوپی)

نے تو مجھ سے لے ہی لیا"......

اب میری رائے، پروفیسر صاحب کی رائے اور آبر صاحب کی رائے، غرض آپ کے نیازمندوں کی متفقہ رائے یہ ہے کہ فارسی میں آپ اپنی حدتک کمال حاصل فرما چکے ہیں۔ اب آپ کو اپنی زبان اردو پر توجہ فرمانا چاہیے۔ اپنی قابلیت کا صرف اپنے ہی ملک کے لیے بہت زیادہ مفید ہے۔ اردو کو آپ سے قابل مصنفوں کی ضرورت بھی بے حد ہے۔ یہ رائے ہے اور سچی محبانہ اور دوستانہ رائے ہے[۵۶]۔"

ہندوستان میں اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لیے ارباب کمال کو مناسب ذرائع و وسائل عموماً خود ہی تلاش کرنا پڑتے ہیں۔ یہاں جس نے شہرت طلبی یا نام و نمود سے گریز کی یا نامور معاصرین میں کسی کے ساتھ بالارادہ کسی مباحثے میں الجھ کر دوسروں کو اپنی صاحب نظری اور دیدہ وری کے اعتراف پر مجبور نہیں کیا وہ ہمیشہ کے لیے گمنامی اور کس مپرسی کا شکار ہو گیا۔ نکہت بھی اسی بنا پر روشناس خلق ہونے سے محروم رہے۔ انھوں نے ماہنامہ شمع (آگرہ)، خیابان (لکھنؤ) جامعہ (دہلی) اور امین الادب (لوہارو) کے لیے ان کے مدیروں کی فرمائش پر بعض معلومات افزا علمی و تحقیقی مضامین بھی لکھے، لیکن ان کی تعداد اتنی کم اور ان کے زمانۂ اشاعت کے درمیان تفاوت اتنا زیادہ ہے کہ پڑھنے والوں کے ذہن پر ان کی شخصیت کا کوئی مستقل اور پائیدار نقش نہ بن سکا۔ ان کے مذاق شعر گوئی سے واقفیت رکھنے والوں کا دائرہ اس سے بھی محدود تر تھا۔ چنانچہ ان مخصوص احباب و معاصرین کے ساتھ جو نجی صحبتوں میں ان کے کلام سے لطف اندوز ہوتے رہتے تھے، رفتہ رفتہ ان کی فن کارانہ عظمت کے قدر شناسوں کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا ہے۔

نامور معاصرین میں جن لوگوں سے نکہت کے مخلصانہ روابط اور برابری کے تعلقات تھے، ان میں مرزا ثاقب لکھنوی کے بعد سید محفوظ علی بدایونی[۵۷] کا نام

سرفہرست ہے۔ سید صاحب اپنے زمانے کے مشہور ادیبوں اور صحافیوں میں شمار کیے جاتے تھے اور مزاح نگاری میں ایک خاص طرز کے موجد تھے۔ کامریڈ اور ہمدرد کی ادارت اور انتظامی امور میں انھیں مولانا محمد علی جوہر کے دست راست کی حیثیت حاصل تھی۔ مولانا محمد علی شروع ہی سے ایک شعلہ بار مقرر اور تحریک آزادی کے زبردست مبلغ و مجاہد کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے، لیکن خلافت تحریک کی کامیاب قیادت نے ان کی شخصیت کو اس طرح "مرجع ثقات وکرام" بنا دیا کہ ان کی ذات شمع آزادی کے ہر ہر پروانے کے لیے سرچشمۂ فیضان اور مرکز عقیدت بن گئی۔ نکہت بھی اپنے سیاسی مسلک کے اعتبار سے ہمیشہ سے انگریزوں کے سخت مخالف اور نیشنلسٹ خیالات کے حامل تھے۔ اس لیے تحریک خلافت وعدم تعاون کے زمانے میں وہ بھی مولانا محمد علی کے ارادت مندوں میں شامل ہو گئے اور سید صاحب کے واسطے سے رفتہ رفتہ یہ تعلق خاطر براہ راست روابط میں تبدیل ہو گیا۔ دہلی میں جامعہ ملیہ کے جلسۂ تاسیس کے لیے انھوں نے فارسی میں قصیدے کے انداز پر ایک نہایت پرجوش اور بلند آہنگ نظم لکھی، جو اسی زمانے میں شائع ہوئی تھی۔ اس سے قبل ایک اور قصیدہ نما نظم میں بھی، جو دراصل خلافت عثمانیہ کے زوال کا مرثیہ ہے، انھوں نے مولانا محمد علی کی ملی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا تھا۔

۱۹۳۰ء کے اواخر میں مولانا محمد علی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن پہنچے اور طبیعت کی شدید خرابی کے باوجود اس کی کارروائیوں میں سرگرم حصہ لیا۔ اسی کانفرنس کے ہال میں ان کی وہ پرجوش صدائے حریت بلند ہوئی۔ جس میں انھوں نے ایک غلام ملک (ہندوستان) کی طرف واپسی پر ایک غیر مگر آزاد ملک میں مرنے کو ترجیح دی تھی۔ آزادئ ہند کی منزل بہت قریب ہوتے ہوئے بھی ابھی کافی دور تھی اور ان کے قویٰ ان کا ساتھ دینے سے قاصر ہو چکے تھے۔ تمنا کی بے تابی کو حالات کی صبر طلبی سے حریف نبرد رہنے کا حوصلہ کھوتے ہوئے دیکھ کر ان کے آقا و مولا نے جس سے وہ کسی بھی حالت میں اپنا ناتا توڑنے کے لیے تیار نہ تھے، ان کے

اس آبرومندانہ فیصلے کو اس طرح شرفِ قبولیت عطا کیا کہ انھوں نے ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کی صبح کو لندن کی آزاد سرزمین پر زندگی کی آخری سانس لی اور بیت المقدس میں، جو اولوالعزم پیغمبروں کا وطن ہے، دفن کے لیے جگہ پائی۔

محمد علی کی موت مجاہدینِ آزادی اور خاص طور پر ملت اسلامیہ کے لیے ایک زبردست سانحہ ثابت ہوئی، کوئی حساس اور دردمند دل ایسا نہ تھا جس نے اس صدمے کی خلش نہ محسوس کی ہو اور کوئی ذی حس آنکھ ایسی نہ تھی جس نے غریب الوطنی کی اس موت پر آنسو نہ بہائے ہوں۔ ملک کے گوشے گوشے میں تعزیتی جلسے ہوئے۔ مقررین نے تقریروں کے ذریعے، صحافیوں نے اخبارات کے اداریوں میں، ادیبوں نے مضامین کی صورت میں اور شعراء نے مرثیے اور نوحے لکھ کر مادرِ ہند کے اس جیالے فرزند کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ نظموں میں علامہ اقبالؒ کا یہ فارسی قطعہ عام طور پر پسند کیا گیا اور دیکھتے دیکھتے اس کے اشعار مرنے والے کے نام کی طرح اس کے چاہنے والوں کے وردِ زباں ہو گئے۔

قطعہ

یک نفس جانِ نزارِ او تپید اندر فرنگ
تا شرہ برہم زنیم، از ماہ و پرویں در گزشت

اے خوشا مشتِ غبارِ او کہ در جذبِ حرم
از کنارِ اندلس واز ساحلِ بربر گزشت

خاکِ قدس اُو را بہ آغوشِ تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

می نگنجد جز بہ آں خاکے کہ پاک از رنگ و بو ست
بندۂ کو از تمیزِ اسود و احمر گزشت

جلوۂ او تا ابد باقی بہ چشمِ آسیاست
گرچہ آں نورِ نگاہِ خاور از خاور گزشت

سید محفوظ علی کے لیے محمد علی کی موت ایک ذاتی غم کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ صرف اپنے ایک دیرینہ رفیق یا عزیز بھائی کی رفاقت و محبت ہی سے عمر بھر کے لیے محروم نہیں ہوئے تھے، ترغیب و تحریک کے اس سرچشمے سے بھی محروم ہو گئے تھے جس نے ان کے قلم کو توانائی اور تحریر کو زندگی عطا کی تھی۔ انھوں نے خود بھی مرنے والے

کو اپنا آخری نذرانۂ عقیدت پیش کیا اور اس کے دوسرے مداحوں اور نیازمندوں کو بھی اس ماتم میں شریک کرنے کی کوشش کی تاکہ مرحوم کی ملکی و ملی خدمات کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو سکے اور وقت کی ہوائے تند اس کی یادوں کے چراغ بجھانے میں کامیاب نہ ہو ۔ قومی تحریکات سے براہ راست وابستگی اور شعر و ادب سے طبعی مناسبت نے سید صاحب کو علامہ اقبال سے بھی قریب تر کر دیا تھا ۔ اس دوگونہ تعلق کی بنا پر ان کا یہ قطعہ جس میں شاعر کے دلِ دردمند کی صدا نفاستِ زبان و لطافتِ بیان کے پورے اہتمام کے ساتھ الفاظ و معانی کے قالب میں ڈھل کر خود ان کے دل کی آواز بن گئی تھی ، ان کے لیے خاص دلچسپی اور کشش کا سبب ثابت ہوا ۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ایک فاضل ہم وطن قاضی غلام امیرؒ سے اس قطعے پر مصرعے لگانے کی فرمائش کی ۔ قاضی صاحب سید صاحب کے رفیقِ انیق ہونے کے علاوہ مولانا محمد علی کے مداح اور علامہ اقبال کے شیدائی بھی تھے ، اس لیے انھوں نے اس فرمائش کی تعمیل میں پس و پیش نہیں کیا اور تضمین مکمل کر کے ایک مختصر وضاحتی خط کے ساتھ کسی ذریعے سے سید صاحب کی خدمت میں روانہ کر دی ۔ خط اور مخمس پر مشتمل اس مسودے کی نقل سطورِ ذیل میں پیش کی جاتی ہے :

"۲۶ فروری ۱۹۳۱ء

عزیزی مولانا سید محفوظ علی صاحب بالقابہ ۔ بہ تعمیلِ ارشاد ڈاکٹر اقبال کے اطلسی قطعے میں گاڑھے کا پیوند لگا دیا ۔ مجھے اردو شعر بھی کہنا نہیں آتا چہ جائیکہ میں نے شعرائے عجم کی روح پر شدید حملہ کر دیا ۔ یہ آپ کے حکم کی تعمیل ہے ورنہ اس جرأت کا موقع نہیں تھا ۔ اردو میں ان قوافی پر تخمیس نہیں ہو سکتی تھی ، جو کچھ ہو سکا حاضر ہے ۔ اگر آپ کو پسند ہو تو کسی اخبار میں شائع کرا دیجئے یا حوالہ چراغ علی کے کیجئے :

رفت آں غواصِ بحرِ عشق تا نمیس زنگ | روحِ پاکش در جسد از دردِ قومی بود تنگ
ناگہاں بیروں بر آمد چوں شرر خیزد ز سنگ | یک نفس جانِ نزارِ او تپید اندر فرنگ

تا مژہ برہم زنیم از ماہ و پرویں درگزشت

گشت چوں غم خوارِ ملت راہیِ ملکِ عدم | اللہ اللہ آں غریبے را چہ ساماں شد بہم
بیتِ مقدس گفت خاکش را کہ جائے در دلم | اے خوشا مشتِ غبارِ او کہ از جذبِ حرم

از کنارِ اندلس واز ساحلِ بربر گزشت

جاں نثارِ قوم و ملت دید ایں روزِ سعید | آنکہ از ادراک بالا بُد، بہ آں منزل رسید
قابلِ رشک است عز و شانِ معراجِ شہید | خاکِ قدس او را بہ آغوشِ تمنا درکشید

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

راست گویم بے نیاز از مدح و ذم فرزانہ بود | جوہرِ ملت نواز این آں بیگانہ خو ست
از ازل ارضِ مقدس منزلِ زیبائے اوست | می نگنجد جز بہ آں خاکے کہ پاک از رنگ و بو ست

بندۂ کو از تمیزِ اسود و احمر گزشت

حاصلِ مرگ و حیاتش خلق را شمعِ ہُدا است | روحِ پاکش مستنیر از قربِ نورِ کبریاست
تا بکے شکوہ ؟ امیرِ خستہ! کو از ما جدا است | جلوۂ او تا ابد باقی بہ چشمِ آسیاست

گرچہ آں نورِ نگاہِ خاور از خاور گزشت

نامہ سیاہ آمیر نقاد بدایونی"۔

تضمین نگار کا اصل کمال یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ شاعر کی فکر کے نہاں خانوں میں داخل ہو کر اس کے خیال کی اس طرح توسیع کرے کہ اصل شعر تضمین کے مصرعوں کے بغیر نامکمل معلوم ہو۔ اس کے ساتھ ہی تضمین کے مصرعوں کو زبان، اسلوب اور لہجے کے اعتبار سے بھی اصل مصرعوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ قاضی صاحب فارسی میں فکرِ شعر پر قادر نہ تھے، چنانچہ انھوں نے اقبال کے اشعار پر جو مصرعے لگائے ہیں، ان میں زبان کی لطافت، محاورے کی صحت، بیان کی دلکشی اور بندش کی چستی مفقود ہے۔ سید صاحب نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اشاعت سے قبل ان خامیوں کی اصلاح ضروری ہے، قاضی صاحب کا مسودہ نکہت کے پاس بھیج دیا، جو دونوں کے مشترک دوست تھے اور جن کا دونوں یکساں احترام کرتے تھے[۱۲]۔ سید صاحب نے اس کے ساتھ

ایک خط بھی لکھا تھا جو حسب ذیل ہے :

"برادر محترم ! السلام علیکم ۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا ۔ سنا ہے اس عرصے میں آپ بدایوں تشریف لائے تھے ۔ نہ ملنے کی شکایت ہے ۔

حضرت قاضی صاحب مد اس کلاں نے اس مرتبہ فارسی کی ٹانگ توڑی ہے، یعنی سر اقبال نے مولانا محمد علی کی وفات پر پانچ شعر لکھے ہیں، حضرت قاضی صاحب نے ان کا خمسہ کیا ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ اشاعت سے پہلے آپ نہایت غور و فکر سے اصلاح فرمائیں اور نہایت خوش خط لکھ کر میرے پاس بھیج دیں، تاکہ کسی اخبار میں چھپوا دوں ۔ اصلاح سرسری نہ ہو بلکہ تضمین اقبال کے کلام کے شایانِ شان ہو جائے ۔

جلد بھیج دیں ۔ کیا اس عرصے میں ملاقات نہ ہوگی ؟ کارخانہ مشکبار کی جنتری بھجوا دیجے ۔ انھیں کہلا بھیجئے کہ ایک جنتری میرے پاس بھیج دیں ۔

امید کہ بیوی بچے بخیر ہوں گے ۔

خاکسار

سید محفوظ علی

۳ ؍ مارچ ۱۹۳۱ء

برادر مکرم ! بعد اصلاح فوراً واپس بھیجئے تاکہ الایمان، دہلی کو جس کا محمد علی نمبر عنقریب نکلنے والا ہے، بھیج دوں ۔ اگر مولانا محمد علی کے متعلق کوئی نظم یا تاریخ لکھ سکیں تو وہ بھی بھیج دیجے، مگر جلد ۔

محفوظ "

قاضی صاحب کے مصرعے اپنے چند در چند اسقام کی بنا پر غیر معمولی ترمیم کے طالب تھے اور ان کے نظم کردہ مضامین و قوافی کو وسیع تر کرتے ہوئے وسیع تر رد و بدل کی گنجائش مفقود تھی ۔ دوسری طرف سید صاحب کا ارشاد تھا کہ تضمین کلام اقبال

کے شایانِ شان ہونا چاہئے اس لئے نکہت نے ایک دو مصرعوں کے علاوہ باقی تمام مصرعے ازسرِ نو نظم کرکے مخمس کی ابتدائی شکل یکسر تبدیل کر دی۔ فکر کے سیلِ رواں کو کسی دوسرے شاعر کے تخیل، زبان اور اسلوب کا تابع رکھ کر مخصوص قوافی کی پابندی کے ساتھ شعر کہنا کسی موضوع پر آزادانہ طبع آزمائی سے زیادہ وقت طلب ہوتا ہے۔ نکہت نے یہ مرحلۂ دشوار جس فن کارانہ مہارت اور خوش اسلوبی کے ساتھ طے کیا ہے، اس کا اندازہ خمسے کی اس بدلی ہوئی شکل سے کیا جا سکتا ہے:

گوہرِ دُرجِ معالی، جوہرِ ناموس و ننگ   باخت کو در عشقِ ملک و قوم جاں را بیدرنگ
داشت بالِ ہمتش یارب چہ مایہ تابِ سنگ   یک نفس جانِ نزارِ او تپید اندر فرنگ
تا فرہ برہم زنیم، از ماہ و پرویں درگزشت

گشت در غربت روانش چوں سبک سیرِ عدم   خاکِ پاکش یافت جا در قلبِ ارضِ محترم
حبذا بر آں کمالِ سعی و ایں فوزِ اتم   اے خوشا مشتِ غبارِ او کہ از جذبِ حرم
از کنارِ اندلس از ساحلِ بربر گذشت

در رہِ حسنِ عمل از یاریٔ بختِ سعید   پایۂ او جز کجا بود و کجا در دم رسید
در خورِ دید ست آرے شانِ معراجِ شہید   خاکِ قدس او را بہ آغوشِ تمنا درکشید
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

جوہرِ ملت نواز از ایں و آں بیگانہ خوست   زاں بہ قلبِ قدس از روزِ نخستیں جائے اوست
راست می گویم کہ حرفِ راست مطبوعِ نکوست   می نگنجد جز بہ آں خاکے کہ پاک از رنگ و بوست
بندۂ کو از تمیزِ اسود و احمر گذشت

بسکہ روحش مستنیر از نورِ فیضِ انبیا ست   باز از مرگ و حیاتش تابشِ شمعِ ہدا ست
اے امیرِ خستہ ایں طرفہ بقا اندر فنا ست   جلوۂ او تا ابد باقی بہ چشمِ آسیا ست
گرچہ آں نورِ نگاہِ خاور از خاور گذشت

سید صاحب نے قاضی صاحب کی تضمین بنظرِ غائر اصلاح کی فرمائش کے ساتھ یہ خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ نکہت خود بھی مولانا محمد علی کے متعلق کوئی نظم یا قطعۂ تاریخ لکھیں۔

غالباً عجلت تمام کی شرط کے باعث وہ کوئی ایسی نظم تو نہ کہہ سکے جو ان کی فکر شاعرانہ کی نمائندگی کے قابل ہو، البتہ قاضی صاحب ہی کی طرف سے تین اشعار کا ایک قطعۂ تاریخ بھی نظم کر دیا جو درج ذیل ہے:

بر محمد، بر علی دل دادہ، بطلِ حریت — رفت در غربت بہ ملکِ جاوداں واحسرتا
چوں بہ لندن شد وفاتش، سرزمینِ تو بگفت — تو کجا و بوم کفر؟ ایں جا بیا، ایں جا بیا!
ریخت دُرِّ اشک در سالِ غمش کلک (امیر) — یافتہ جوہر جوارِ دلکشائے انبیا

۱۳۴۹ھ

نکہت کے ہاتھ کا لکھا ہوا جو مسودہ اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے، اس میں تضمین کے اشعار سیاہ روشنائی سے اور یہ قطعہ آخر میں نیلی روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ مسودے میں اس قطعے کا پانچواں مصرعٔ "کلک" پر ختم ہو جاتا ہے، لیکن وزن کے اعتبار سے اس کے بعد لفظ نکہت کے اضافے کی گنجائش نہیں، صرف 'امیر' یا اس کا ہم وزن کوئی لفظ موزوں ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہم یہ سوچنے میں حق بجانب ہیں کہ یہ قطعہ بھی قاضی صاحب ہی کی طرف سے موزوں کیا گیا تھا اور اس مصرعے میں ان کا تخلص بربنائے سہو شامل ہونے سے رہ گیا ہے۔ تضمین کے بعض مصرعوں پر بھی اس مسودے میں نظرثانی کی گئی ہے۔ مثلاً ابتدا میں پانچویں بند کا پہلا مصرع قاضی صاحب کے دوسرے مصرعے میں الفاظ کے معمولی الٹ پھیر کے ساتھ اس طرح نظم کیا گیا تھا:

گر روح پاکش مستنیر از نورِ قربِ کبریاست

بعد میں "قربِ کبریاست" کو قلم زد کر کے اس کی جگہ "فیضِ انبیاست" اور "روح پاکش" کو علیٰ حالہ برقرار رکھتے ہوئے اس کے اوپر "بسکہ روحش" لکھا گیا ہے۔ اس بند کے مصرعِ ثانی کے نیچے "ہم حیات و ہم مماتش" تحریر ہے، جسے "باز از مرگ و حیاتش" کا متبادل کہا جا سکتا ہے۔

انھیں دو مصرعوں کے مقابل یہ دو مصرعے بھی لکھے ہوئے ہیں:

بسکہ جوہر، جوہرِ فردِ جہانِ اہتدا است
در بقا و در فنا یکساں وجودش رہنما ست

اسی طرح پہلے بند کے پہلے اور دوسرے بند کے تیسرے مصرعے کے اوپر بعض متبادل الفاظ لکھے ہوئے ہیں، لیکن ہم نے آخری بند کے مصرعِ اول کے علاوہ جس کا ایک حصّہ واضح طور پر قلم زد کر دیا گیا ہے، باقی تینوں مصرعے بجنسہ برقرار رکھے ہیں، کیونکہ ہمارے نزدیک یہ زیادہ بامعنی، خوش آہنگ اور رواں ہیں۔

الایمان کا متذکرہ بالا محمد علی نمبر یا اس زمانے کا ایسا کوئی رسالہ جس میں یہ تضمین شائع ہوئی ہو، اس وقت ہماری دسترس سے باہر ہے۔ محمد انصار احمد صدیقی کے مرتبہ مجموعے "غم کے آنسو" میں بھی، جو مولانا محمد علی کی وفات پر مشہور شعراء کے لکھے ہوئے نوحوں، مرثیوں اور نظموں پر مشتمل ہے، یہ مخمس شامل نہیں ہے۔ اس لیے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ سید صاحب کو بھیجنے کے لیے اس مسودے کی "خوش خط" نقل تیار کرتے وقت اس میں کون کون سی ترمیمیں قبول کی گئیں، کون سی رد کی گئیں اور مزید کوئی رد و بدل ہوا یا نہیں؛ تاہم موجودہ صورت میں بھی اس لعلِ گم شدہ کی بازیافت یقیناً اہلِ نظر اور اربابِ ذوق کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگی۔ اس تضمین سے جہاں ماضیٔ قریب کے ایک غیر معروف فارسی گو شاعر کی قدرتِ کلام اور شیرینیٔ گفتار کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں اس بات کی شہادت بھی ملتی ہے کہ ہمارے ملک میں ایسے باکمالوں کی بھی کمی نہیں جن کی روشنیٔ طبع نے خود ان کی ذات کو اندھیرے میں رکھ کر دوسروں کی شہرت کے چراغ روشن کیے ہیں۔

حواشی

[۱] نکہت ۱۰ ربیع الثانی ۱۲۸۸ھ مطابق ۲۹ جون ۱۸۷۱ء کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۹۷ھ/۸۰-۱۸۷۹ء میں اپنے والد اور اہلِ خاندان کے ہمراہ بھوپال پہنچے۔ وہاں مولوی محمد عمر ولایتی شاگرد مولانا امام بخش صہبائی، مولانا محمد بشیر محدث سہسوانی اور شیخ حسین عرب وغیرہ سے تحصیل و تکمیل علم کی۔ اردو میں سید جمیل احمد جمیل سہسوانی شاگرد منیر شکوہ آبادی سے اور فارسی میں اپنے عمِ محترم منشی انوار حسین تسلیم

سہسوانی سے اصلاح لی۔ کم وبیش اڑتیس سال کی عمر تک بھوپال میں قیام رہا، بعد ازاں شعبان ۱۳۲۷ھ مطابق اگست ۱۹۰۹ء میں ملازمت سے مستعفی ہوکر سہسوان چلے آئے اور ۲۳ دسمبر ۱۹۵۲ء کو وہیں وفات پائی۔

۲؎ منشی احمد علی شوقؔ قدوائی نے یہ خط رام پور سے لکھا ہے۔ اس سے قبل وہ ایک عرصے تک ریاست بھوپال سے منسلک رہ چکے تھے۔ نکہتؔ سے اسی زمانے میں روابط قائم ہوئے۔ شوقؔ بہ اعتبار عمر اگرچہ ان سے بڑے تھے لیکن ان کی فضیلت علمی کے معترف تھے اور ان کے کلام کو بنظر استحسان دیکھتے تھے۔ [شوقؔ کا سنہ پیدائش: ۱۸۵۳ء اور سنہ وفات: ۱۹۲۵ء ہے۔ ماہنامہ زمانہ (کانپور) بابت ماہ مئی ۱۹۲۵ء کے مطابق تاریخ وفات ۲۷ اپریل اور وقت غروب آفتاب ہے۔ (صفحہ ۳۵۱) لطیف اعظمی]

۳؎ پروفیسر اولاد حسین شاداںؔ بلگرامی فارسی زبان وادب کے جید عالم اور اپنے دور کے نامور استاد تھے۔ عرصے تک مدرسہ عالیہ رام پور سے وابستہ رہے اور صدہا طلبہ کو فیض یاب کیا۔ اردو کے مشہور محقق، ناقد اور شاعر ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب انھیں کی نسبت سے خود کو 'شادانی' لکھتے تھے۔

۴؎ منشی واحد علی آبرؔ، منشی احمد علی شوقؔ کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔

۵؎ بحوالہ ماہنامہ "آج کل" دہلی، شمارہ ماہ دسمبر ۱۹۵۷ء

۶؎ سید صاحب ۸ مئی ۱۸۷۰ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ بریلی سے ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد علی گڑھ پہنچے، جہاں سے ۱۸۹۵ء میں مولوی عبدالحق، مولانا شوکت علی اور مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ بی۔اے کیا۔ علی برادران سے ۱۸۸۸ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول بریلی کے بورڈنگ ہاؤس میں ان کے داخلے کے وقت پہلی بار ملاقات ہوئی جو آہستہ آہستہ دوستانہ روابط اور بعد ازاں عمر بھر کی رفاقت میں تبدیل ہوگئی۔ بی۔اے کرنے کے بعد سید صاحب تقریباً ۵ برس بحیثیت سکریٹری ریاست خیرپور میں، تقریباً تین برس بحیثیت جج صومالی لینڈ (صومالیہ) میں اور تھوڑی مدت کے لیے دوبار بمبئی

اور ایک بار حیدر آباد میں مقیم رہے۔ باقی عمر کا بیشتر حصہ یا تو بدایوں میں یا مولانا محمد علی کی رفاقت و معیت میں بسر ہوا۔ مولانا محمد علی کی عمر کل باون برس ہوئی۔ سید صاحب کے اپنے الفاظ میں "باون برس کی اس مدت میں سے اکتیس برس کی مولانا کی کتاب زندگی پوری ان کے پیش نظر تھی بلکہ اس کے اکثر باب ان کے سامنے لکھے گئے تھے۔" پروفیسر رشید احمد صدیقی کے بقول کامریڈ اور ہمدرد کا خواب محمد علی اور سید صاحب دونوں نے مل کر دیکھا تھا۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے الفاظ میں سید صاحب "علم و آگہی میں اپنی ذات سے ایک دائرۃ المعارف یا انسائیکلو پیڈیا تھے۔ مذہب، تاریخ، ادب، شاعری، لغت، فلسفہ کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس پر ان کی پوری نظر نہ ہو اور جس پر وہ اعتماد کے ساتھ گفتگو نہ کر سکتے ہوں۔" (ماہنامہ جامعہ دہلی، محمد علی نمبر ۱۹۷۹ء ص ۵۱)
سید صاحب نے ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو بعارضۂ فالج بدایوں میں وفات پائی۔ مولانا ضیاء احمد بدایونی نے سالِ وفات ۱۹۴۴ء لکھا ہے (مباحث و مسائل ص ۲۸۷) جو درست نہیں۔

۷ہ مولانا محمد علی ۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۸۸ء میں بغرض تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول بریلی میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے بی۔ اے کیا۔ ۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء کو کلکتہ سے کامریڈ جاری کیا۔ دارالحکومت کے کلکتہ سے دہلی منتقل ہونے کے بعد ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو کامریڈ دہلی سے شائع ہوا۔ اسی زمانے میں مولانا، سید صاحب کو بدایوں سے دلی لے آئے۔ ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو ہمدرد کا ایک ورقہ ایڈیشن شائع ہوا۔ جسے عرف عام میں "نقیب ہمدرد" کہتے ہیں۔ یکم جون ۱۹۱۳ء کو اصل ہمدرد شائع ہوا۔ سید صاحب ان اخبارات کی ادارت سے دفتر کی تنظیم تک اور بعد ازاں تحریک خلافت کی سرگرمیوں میں برابر مولانا کا ہاتھ بٹاتے رہے۔

۸ہ علامہ اقبال کو مولانا محمد علی سے اور مولانا کو علامہ اقبال سے ایک قسم کی شدید قلبی وابستگی تھی لیکن مولانا نے دیرینہ تعلقات کے باوجود بقول خود دسمبر ۱۹۱۸ء سے قبل علامہ اقبال کا ایک شعر بھی نہیں پڑھا تھا۔ اس کے بعد جب انھیں کلام کے مطالعے کا موقع ملا

تو وہ اس سے اس حد تک مسحور ہوئے کہ صدہا اشعار وردِ زبان ہو گئے اور کامریڈ اور ہمدرد کے کالم ان سے مزین ہونے لگے (بحوالہ اقبال ۔ دانائے راز، از عبداللطیف اعظمی) عبداللطیف اعظمی کے الفاظ میں باخبر حضرات کے بقول مولانا محمد علی بات بات میں اقبال کے اشعار پیش کیا کرتے اور ان کے پڑھتے وقت ان پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی (اقبال ۔ دانائے راز ص ۲۱۰) دوسری طرف اقبال کی والہانہ ارادت مندی کا یہ حال تھا کہ جب انھیں مولانا کے بیتول جیل سے ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہا ہونے کے بعد کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کے اجلاسوں میں شرکت کی غرض سے براہ راست امرتسر پہنچنے کی اطلاع ملی تو وہ محض ان سے ملاقات کرنے کے لیے بعض احباب کو ساتھ لے کر بذریعہ کار لاہور سے امرتسر پہنچے اور اثنائے راہ میں وہ مختصر نظم لکھ ڈالی جو "اسیری" کے زیر عنوان "بانگِ درا" میں شامل ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں ناقل ہیں کہ جب انھوں نے ۱۹۲۴ء کی گرمیوں میں لاہور میں علامہ اقبال سے پہلی ملاقات کی تو وہ بار بار مولانا محمد علی کا ذکر کرتے رہے ۔ (یادوں کی دنیا ص ۱۹۴)

۵۹ یہ قطعہ سب سے پہلے روزنامہ انقلاب میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت اس میں صرف تین شعر تھے ۔ آخر کے دو اشعار اس کے بعد اضافہ کیے گئے ۔ تیسرے شعر کا پہلا مصرع ابتدا میں علامہ اقبال نے اس طرح نظم کیا تھا ع مشتِ خاکش را بخاکِ پاکِ قدس آمیختند ۔ بعد میں اسے بھی موجودہ مصرعے سے تبدیل کر دیا (بحوالہ "سرودِ رفتہ" مرتبہ غلام رسول مہر وصادق علی دلاوری ص ۱۹۲) زیر بحث تضمینوں میں اس بدلے ہوئے مصرعے کے آخری لفظ "گرفت" کو "کشید" سے بدل دیا گیا ہے ۔ یہ تبدیلی ارادی ہے یا اتفاقی ؟ یہ بتانا مشکل ہے ۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے اس مصرعے کی بلاغت ومعنویت کچھ اور بڑھ گئی ہے ۔

۶۰ سید صاحب اور علامہ اقبال کے درمیان بھی خصوصی مراسم تھے ۔ علامہ اقبال سید صاحب کے علم وفضل، زہد واتقا اور شرافتِ نفس سے بے حد متاثر تھے ۔

جناب مبشر علی صدیقی علی گڑھ میگزین کے اکتوبر ۱۹۳۲ء اور جنوری ۱۹۳۹ء کے شماروں کے حوالے سے ناقل ہیں کہ علامہ نے سید صاحب کے نام اپنے ایک خط میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "اگر میں کسی کے ہاتھ پر بیعت کرتا تو وہ آپ کی ذات ہوتی"۔ ایک دوسرے خط میں جو ۱۹۳۵ء میں سید صاحب کی طرف سے بدایوں تشریف آوری کی دعوت کے جواب میں لکھا گیا تھا، تحریر فرماتے ہیں: "مخدومی! السلام علیکم، میں گذشتہ ۱۸ ماہ سے علیل ہوں سفر بہت کم کرتا ہوں، اگر بدایوں آتا تو ضرور آپ کے ہاں ٹھہرتا اور آپ کے روحانیات سے مستفیض ہوتا"۔ (مبشر علی صدیقی - بنام راقم الحروف مورخہ ۸ و ۲۱ دسمبر ۱۹۷۰ء)

لـہ قاضی غلام امیر صاحب بدایوں کے شیوخ صدیقی کے ایک ممتاز گھرانے کے فرد، ثقہ اور باوضع بزرگ، متقدر رئیس اور صف اول کے مختار تھے۔ عمر میں سید صاحب سے کچھ بڑے تھے (سال ولادت ۱۸۷۰ء)۔ تعلیم بالکل مشرقی انداز پر ہوئی تھی، لیکن ذہن کشادہ اور مطالعہ وسیع تھا۔ ادیبوں اور شاعروں کے درمیان معاصرانہ رقابتیں اور حریفانہ گروہ بندیاں ہر دور اور ہر شہر میں عام رہی ہیں۔ بدایوں بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں لیکن قاضی صاحب کو اپنے ہم عصر ارباب فضل و کمال میں یہ امتیاز حاصل تھا کہ مشاعروں کی صدارت کے لیے ان کی شخصیت اور متنازعہ فیہ ادبی معاملات میں ان کا فیصلہ ہر گروہ کے لیے قابل قبول ہوتا تھا۔ قاضی صاحب کو شاعری کے پہلو بہ پہلو نثر نویسی بالخصوص تنقید نگاری سے بھی دلچسپی تھی، چنانچہ انھوں نے لفظ "نقاد" کو اس طرح اپنے نام کا جزو بنا لیا تھا جس طرح مشہور انشاپرداز مہدی حسن خود کو "افادی الاقتصادی" لکھنے لگے تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۶ء میں ماہنامہ "الناظر لکھنؤ" کی طرف سے "بہترین غزل گو" کے زیر عنوان انعامی مقابلے کے لیے ذوق کی شاعری پر ایک مبسوط مضمون لکھا تھا، جو اولاً اس رسالے کے اکتوبر و نومبر ۱۹۲۶ء کے شماروں میں شائع ہوا۔ اس کے بعد "الناظر پریس" ہی سے مئی ۱۹۲۷ء اور جون ۱۹۴۱ء میں کتابی صورت میں اس کے دو ایڈیشن منظر عام پر آئے۔ اس سے قبل

ان کی دو اور کتابیں "اسلام بجواب رد اسلام" میں قرآنی تعلیمات پر عبدالغفور دھرم پال کے اعتراضات کا مفصل و مدلل جائزہ لیا گیا ہے اور "ریویو" میں آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند کی سوانح عمری ان کے مذہبی نظریات و تعلیمات "پر فلسفیانہ تنقید" کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ غزلوں اور نظموں کا ایک انتخاب بھی نظامی پریس بدایوں سے شائع ہو چکا ہے۔ قاضی صاحب تا عمر بدایوں ہی میں مقیم رہے۔ وہیں ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء میں تقریباً ۷۵ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ نکہت نے "غلام امیرم" سے تاریخ وفات نکالی۔

لله سید صاحب نکہت سے عمر میں ایک سال اور قاضی صاحب اس سے بھی کچھ زیادہ بڑے تھے، لیکن دونوں ان کے علم و فضل کی بنا پر ہمیشہ انھیں اپنے بزرگ کی حیثیت سے مخاطب کرتے تھے۔

انور صدیقی

جین پال سارتر
فکر و فن کی ایک نئی فضا

کسی کا قول ہے کہ عالم کی موت عالم کی موت ہے۔ اس قول کی سچائی کی تصدیق سارتر کی موت سے زیادہ اور کس کی موت سے ہوگی۔ موت سے ملتے جلتے اذیت ناک تجربوں کی روداد، سارتر کے تخلیقی سفر، کا سرنامہ ہے۔ زندگی کی طرح موت بھی ایک تاریک، تہ دار، پیچیدہ، اور پر اسرار، وجودی تجربہ ہے۔ سارتر، اب اس تجربے کی آزاد ابدیت کا حصہ بن چکا ہے۔ عام طور پر، انسان خود موت کا انتخاب نہیں کرتا، موت اس کا انتخاب کرتی ہے۔ سارتر کہ اس دور میں انسان کے انتخاب کی آزادی کا المیاتی حدوں تک پر شکوہ علمبردار تھا، کیا عجب کہ خود اس نے اپنی موت کا انتخاب کیا ہو ! مگر موت کے اس بسیط و بیکراں تجربے کے مرتعش سکوت کو اپنے زندہ، معتبر اور متحرک لفظوں کی گونج سے اب کون توڑے گا ؟ وہ، جو یہ سمجھتا تھا کہ ادیب کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے لفظوں سے وجود کے سکوت کو توڑتا ہے، آج صوت و صدا اور لفظ و معانی کی پامال کائنات سے دور، ایک سناٹے کی کائنات کا حصہ بن چکا ہے اور ہمیں شے اور لاشے، وجود اور جوہر، آزادی اور ذمہ داری کی مبہم اور بیکراں پیکر انسانی اور لسانی کائنات میں مبہوت اور متحیر چھوڑ گیا ہے۔ وہ اپنی پُر اذیت ذمہ داری سے

جناب انور صدیقی، ریڈر شعبۂ انگریزی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۲۵

اپنی حدود تک سبکدوش ہو چکا ہے، مگر ہم میں جو سوچتے ہیں، محسوس کرتے ہیں اور لکھتے ہیں اور اس سے زیادہ ایک بکھرتے ہوئے، ٹوٹتے ہوئے، لمحہ بہ لمحہ پیچیدہ ہوتے ہوئے آشوب آگہی سے گراں مایہ اور گرانبار ایک ایسے عہد میں جی رہے ہیں، جہاں ایک رنگ دوسرے رنگ کو کاٹتا ہے، جہاں ایک ادھوری سچائی دوسری ادھوری سچائی پر طعنہ زن ہے، جہاں 'یا یہ یا وہ' کی برہنہ اور پُر رعونت جنگ جاری ہے، جہاں شفا اور شفاعت کے ارضی اور مابعد الطبیعاتی سہاروں سے محرومی کی بے ستارہ تاریکی گہری ہوتی جا رہی ہے، جہاں انسانی مقدر پر سوالیہ نشانات کی خیرہ کن بھرمار ہے، ہمارے لیے، اس کے جانے کے بعد بھی ذمہ داریوں کی اذیت ناکی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے بلکہ اضافہ ہی ہوا ہے۔ یہی ذمہ داری اس کی وراثت ہے اور ہم اسے مانیں یا نہ مانیں، ہم اس کی وراثت کے جبر سے آزاد نہیں ہو سکتے۔

موت خواہ کسی کی ہو مرنے والے کو سکون اور پس ماندگان کو کسی نہ کسی حد تک، مبالغے، جذباتیت اور اضطراب میں مبتلا کر دیتی ہے اور یہ مبالغہ، جذباتیت، ارادت اور عقیدت کی مہکتی ہوئی دُھند پیدا کر دیتی ہے۔ آئیے کچھ دیر کے لئے اس نیم تاریکی سے نکلیں اور اس ادیب اور دانشور کے ساتھ چند لمحے گزاریں جو اگرچہ ہم میں سے اُٹھ گیا ہے، مگر پھر بھی اپنے احساسات اور افکار کی ساری معنویت اور سارے تضادات کے ساتھ ہم میں موجود رہے۔

سارتر نے اپنی خود نوشت میں ایک جگہ لکھا ہے:

> "میں ایک اجاڑ اور سنسان شیش محل تھا جس میں ہنگامی صدی اپنی اکتاہٹ کا عکس دکھاتی تھی۔ میں اس عظیم ضرورت کو پورا کرنے کے لئے پیدا ہوا تھا جو مجھے اپنے وجود کی تھی۔"

اب ذرا اس اجاڑ اور سنسان شیش محل کی داستان سنئے کہ یہ اجاڑ کیونکر ہوا۔

سارتر کا بچپن ایک شدید مذہبی ماحول میں گزرا جہاں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ اثرات ایک دوسرے سے کشمکش کے مرحلے میں تھے۔ اس کا سارا بچپن اپنے نانا

کے زیرِ سایہ گزرا جو ایک خوش حال بوژوا خاندان کے فرد تھے اور کٹر مذہبی انسان تھے ۔ ان کا حلیہ کچھ ایسا تھا جو بقول سارتر اللہ میاں سے ملتا جلتا تھا، ویسا ہی پرجلال چہرہ اور اس چہرے کی سب سے نمایاں خصوصیت تھی سفید چھتنار ڈاڑھی۔ ان کا جلال و جبروت کچھ ایسا تھا کہ اس کے آگے کسی کی نہیں چلتی تھی ۔ ان کی قاہری نے دو بیٹوں کو پامال کر دیا تھا ، اور وہ اپنی حقیقی شناخت اور شخصیت سے محروم ہو چکے تھے ۔ سارتر کے سلسلے میں وہ کچھ نرم تھے ۔ وہ اسے استاد بنانا چاہتے تھے اور وہ مصنف بننا چاہتا تھا ــــــ ایک ایسا مصنف جسے کوئی بڑا مشن یا مقصد سونپا گیا ہو ۔ سارتر کی ذہانت نے جلد بھانپ لیا کہ اس کے نانا کے گھر کی مذہبیت ایک پرشکوہ سوانگ سے زیادہ کچھ نہیں ہے ۔ اگرچہ مادی اعتبار سے اس کا بچپن خوشحال تھا، مگر تمام عمر وہ اس پر نازاں نہیں، نادم رہا ۔ ابتدائی تعلیم و تربیت کے زیرِ اثر وہ کچھ دنوں خدا پرست رہا ۔ اس کے بعد اس نے ۱۹۲۴ء میں نارمل اسکول میں داخلہ لیا، ۱۹۲۹ء میں فلسفے کی اعلیٰ ترین ڈگری حاصل کی ۔ اسی زمانے میں اس کی سیمون دو بوار سے دوستی اور رفاقت کی ابتدا ہوئی جو خود بھی فلسفے کی تعلیم کی تکمیل کر چکی تھی ۔ اس زمانے میں کیسے کیسے تہلکوں ، طوفانوں اور تبدیلیوں سے سارتر کا شعور آشنا ہوا ، یہ ایک لمبی داستان ہے جس کا یہ موقع نہیں ۔ پھر بھی اس کے کچھ نقوش اور کچھ رنگ اس کی خود نوشت سوانح کے سہارے سمجھے جا سکتے ہیں ، نطشے پہلے ہی خدا کی موت کا اعلان کر چکا تھا ۔ خدا سے سارتر کی شناسائی اس کے اپنے خاندان میں ہو چکی تھی ۔ اب جو صورت حال تھی اسے سارتر کی زبان سے سنئے :

> "خدا ، بجائے اس کے کہ میرے دل میں جڑ پکڑتا ، وہ کچھ عرصے مجھ میں برگ و بار لایا اور پھر چل بسا ۔ آج کل جو بھی مجھ سے اُس کا ذکر کرتا ہے تو میں اس خوش شکل مگر بوڑھے آدمی کی سی خود اعتمادی کے لہجے میں کہتا ہوں جس کی ملاقات ایک حسین مگر بوڑھی عورت سے ہوئی ہو ۔"

"اگر پچاس برس پہلے ہمارے درمیان وہ غلط فہمی نہ پیدا ہوئی ہوتی جس نے

ہمیں مختلف راہوں پر ڈال دیا تھا تو ممکن تھا کہ ہماری بچ جاتی ۔"

الحاد کے ساتھ اس میں کچھ اور بھی تبدیلیاں آئیں ذہنی اور جذباتی :

"میری ساری خود فریبیاں پارہ پارہ ہو چکی ہیں۔ شہادت، نجات اور ابدیت کے سارے تصورات بکھر رہے ہیں، ساری عمارت منہدم ہو رہی ہے۔ میں نے تہ خانے میں روح القدس کا گریبان پکڑا اور اسے باہر دھکیل دیا۔ الحاد ایک سفاک اور طویل المدت معاملہ ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ میں نے اس کی تکمیل کر لی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میرے حقیقی کام کیا ہیں۔ میں یقیناً ایک اچھی شہرت کے لئے انعام کا مستحق ہوں۔ تقریباً گزشتہ دس سال سے میری حالت اس شخص کی سی ہے جو بیدار ہو رہا ہو، جو ایک طویل، تلخ و شیریں دیوانگی سے نجات پا چکا ہو اور جو اپنے رویوں پر ہنس رہا ہو"

شکست خواب کے اس اندوہ ناک منظر نامے پر ایک نئی فکر، ایک نئی حسیت، ایک نئی آگہی اور ایک نئے شعور کا بے رحم سورج چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دو بڑی جنگوں نے بہت سے طلسم توڑ دیے، انیسویں صدی کے معانی سہارے اور آدرش ٹوٹے، کچھ آدرش رہے، فرد اپنی انفرادیت سے محروم ہوا، جمہوری اور غیر جمہوری اجتماعیت نے اجتماع کو بھی ایک بے چہرہ ہجوم میں تبدیل کر دیا۔ سائنسی تجربیت کے حدود واضح ہوئے، کانٹ اور ہیگل بے دخل کئے گئے۔ ڈیکارتی ثنویت کا کفر ٹوٹا۔ فلسفے اور سائنس دونوں کی نارسائیوں کا عرفان عام ہوا، ایک نئی انسانی صورت حال میں ایک نئے اصولِ حقیقت کی تلاش کی لے تیز ہوئی جو ادھوری سچائیوں پر مبنی نہ ہو، جو انسان اور انسانی کائنات کو اس کی کلیت میں دیکھ سکے اور جو انسان کے شعور کو اپنے مطالعہ کا نقطۂ آغاز بنائے۔ اسی تلاش و طلب کے نتیجے میں وجودیت کے فلسفہ کا ظہور ہوا۔ وجودیت کے دو بہت اہم رجحانات ہیں۔ ایک دینوی اور دوسرا دنیاوی۔ دینوی یا مسیحی وجودیت کی نمائندگی کیر کے گارد کرتا ہے۔ اس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے زمانے کے موجود فلسفوں کی کچھ اس طرح تشکیل نو کی کہ اس میں زندہ فرد کے لئے گنجائش پیدا ہو گئی۔ کیر کے گارد کے خیال میں وجود ہر فرد کی ایک ذاتی مہم ہے جس میں اس کا سامنا دوسرے افراد سے بھی ہوتا ہے، خدا سے بھی اور خود سے بھی۔ وہ اس وجود کو المیاتی سمجھتا ہے اور خطرات سے معمور، وجودیت نے ہسرل

کی مظہریت سے بھی بہت کچھ کسب نور کیا ہے ۔ اس فلسفہ کا مقصد اُن طریقوں کا مطالعہ ہے جن طریقوں
سے مظاہر اپنے آپ کو شعور کے ذریعہ ظاہر کرتے ہیں۔ ہم جس چیز کو "دنیا" قرار دیتے ہیں وہ دراصل شعور
کے انھیں مظاہر سے تشکیل پاتی ہے۔ خارجی دنیا کا ہمارا سارا علم ہمارے "شعور" کی فراہم کردہ معلومات پر
مبنی ہے۔ پھر بھی سارا شعور کسی شے کا شعور ہے۔ "حقیقی باطنی دنیا، حقیقی خارجی دنیا ہے"۔ یہاں
مادے اور خیال کی دوئی نہیں ہے۔ شعور کا وجود اپنے لئے ہے۔ ہر شے کی فطرت بے بصر اور
بے حس ہوتی ہے لیکن شعور اپنے آپ کو دیکھتا ہے، اس میں اپنے آپ کو ماضی سے منقطع کر لینے اور مستقبل
میں اپنے آپ کو منعکس کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ آزاد ہوتا ہے۔ یہی نکتہ وجودیت کی اساس
ہے۔ وجودیت آزادی کا فلسفہ ہے اور یہ فلسفہ انسانی ارادے کی مرکزیت پر اصرار کرتا ہے۔ انسان کی
آزادی مطلق ہے مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر فرد سب کچھ کر گزرنے کے لئے آزاد ہے۔ ہم جیتے ہیں اور
ہم اپنے ارادوں پر عمل کرتے ہیں۔ مگر یہ عمل ایک مخصوص صورت حال کے حدود میں ہوتا ہے۔ انسان
اپنے منصوبوں کے مطابق زندگی گزار سکتا ہے مگر وہ اپنے منصوبوں کی تعمیر میں، صورت حال کو نظر انداز
نہیں کر سکتا۔ اگر انسان صورت حال کو نظر انداز کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ مگر اس طرح وہ اپنے آپ
کو غیر مؤثر بنائے گا۔ سارتر کے لفظوں میں اس شخص کی حالت، اس آدمی کے عمل سے مشابہ ہوگی جو چلتی ہوئی
گاڑی کو روکنا چاہے اور اس طرح اس کی زد میں آجائے۔ انسان دراصل وابستہ یعنی Engaged
ہے ہم میں ہر شخص اپنے عمل کے ذریعہ وابستہ ہے اور اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ وہ وابستگی سے منکر ہے تو دراصل
وہ خود بھی وابستہ ہے۔ اس کا انکار ہی اس کی وابستگی ہے۔ فکر کی یہی وہ منزل ہے جہاں سارتر کے
ذہن میں وابستہ ادب یا Engaged Literarure کا تصور پیدا ہوا۔ اس کا خیال ہے کہ
سارا ادب وابستہ ہے حتیٰ کہ وہ ادیب بھی جو غیر سنجیدگی کو منتخب کرتا ہے، اس کی غیر سنجیدگی بھی وابستگی کی
ہی ایک شکل ہے۔ اس موضوع پر بعد میں سارتر کے خیالات میں جزوی طور پر تبدیلی پیدا ہوئی مگر اس تبدیلی
کے باوجود، وہ ادب کو صرف ایک وسیلہ ہی سمجھتا ہے۔ بعض خیالات کو 'ادبی رنگ' میں پیش کرنے کا۔ سارتر
نے فن کے مسئلہ پر توجہ ضرور دی ہے مگر یہ توجہ ہمیشہ منتشر سی رہی ہے اسی لئے ہم کسی نئے جمالیاتی اصول
کو اس کی فطانت سے وابستہ نہیں کر سکتے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ نثری ادب سے تو وابستگی کا مطالبہ
کرتا ہے مگر شاعری کو اس سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے۔ اس فرق کے پیچھے جو ادبی اصول کارفرما ہے اُسے

اُس کے بعض ناقدین نے نظرانداز کر دیا ہے۔ نثر اور شاعری اگرچہ دونوں لسانی اظہار ہیں۔ مگر بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف لسانی اظہار۔ اظہار کے اس فرق کی طرف میلارمے نے توجہ دلائی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ نثری صیغۂ اظہار Reportage ہے اور شعری اظہار موسیقی (Musique)

نثری اظہار معنیاتی اظہار ہے کہ وہ اشیاء کو معنی بخشتا ہے۔ وہ عقل کا وسیلہ ہے۔ شعری اظہار غیر معنیاتی اظہار ان معنوں میں ہے کہ وہ چیزوں کو پیش کرتا ہے، ان کی نمائندگی نہیں کرتا، وہ مصوری اور موسیقی کی طرح اشیاء کے احساس کو نمایاں کرتا ہے۔ نثری اظہار کا تعلق لکھنے والے کے شعور اور ارادے، اس کے احساس ذمہ داری اور اس کی اخلاقیات سے ہے۔ شعری اظہار کا تعلق لاشعور اور سرّیلی دنیا سے ہے اور شاعر کے وجود کے داخلی ایجاد سے۔ اس دنیا کا اظہار صرف استعارے کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک کا تعلق حقیقت سے ہے اور دوسرے کا تخیل سے۔ پہلے تصوّر کے متعلق سارتر نے بہت کچھ لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ سب کا سب اس کے مجموعۂ مضامین سچوایشن ۲ میں شامل ہے شعری اظہار کے سلسلے میں اس کے خیالات تمام تر یہ ہیں اس کے مضمون اور سچوایشنس ۱ ۲ کے بعض صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ نثری اظہار، اس کے خیال میں خطابت کی طرف رجحان رکھتا ہے اور شعری اظہار ایمائیت کی طرف۔ ایک جدید فرانسیسی ادیب کی حیثیت سے سارتر نے شعری اظہار کے سلسلے میں رومانی اور علامتی جمالیات کے اثرات قبول کرتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اس نثری کلاسیکی روایت سے وابستہ رکھا ہے جو دانش پر بھی زور دیتی ہے اور خطابت پر بھی۔

وجودیت کے فلسفہ کے سلسلے میں سارتر نے جو کچھ لکھا ہے، خواہ اس کی حیثیت مانگے کے اجالے کی کیوں نہ ہو، خواہ ہم اس فلسفے اور اس کے زیر اثر ابھرنے والے اسلوب زیست کو قبول کریں یا نہ کریں، خواہ ہمیں اس کے افکار تضادات سے گراں بار نظر آئیں، ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ وجودیت کے تمام مفسرین میں تنہا وہی ہے، جسے اس نئی فکر کا سب سے مؤثر نمائندہ سمجھنے میں کسی کو کسی قسم کی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے افکار کے اظہار کے لئے ادب کو وسیلہ بنایا ہے۔ وہ خیالات، جو اپنی تجریدی حیثیت سے مبہم اور پیچیدہ لگتے ہیں، اور جنھیں سارتر کی معروضیت نے اور بھی بے رنگ کر دیا ہے، جب اس کے ڈراموں، ناولوں اور کہانیوں میں ایک محسوس صورت حال کا حصہ بنتے ہیں تو ایک نئی حرارت اور تخلیقی توانائی سے جگمگانے لگتے ہیں۔ انسان کی آزادی انتخاب، اس کے

خلاق ارادوں، اس کے شعور کی فیصلہ کن بیداری کی باتیں اس کی فلسفیانہ نثر میں، کچھ اتنی دل نشین نہیں لگتیں جتنی کہ اس کے ڈراموں اور دوسری ادبی تحریروں میں۔ مثلاً اس کے ناول The Age of Reason، کو لیجئے جس میں اس نے میتھیو کے کردار کے ذریعہ ایک ایسے دانش ور کی تصویر کشی کی ہے جس نے اب تک عمل کے ذریعہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے سے انکار کیا ہے۔ اس نے اپنی محبوبہ سے جو حاملہ ہے، شادی نہیں کی ہے۔ وہ اسقاط کی فکر میں ہے۔ اپنے ایقانات کے باوجود اُس نے اسپین کی خانہ جنگی میں شرکت نہیں کی ہے۔ اسے اپنی آزادی کا احساس ہے مگر وہ اس احساس کو عملی نہیں بنا پایا ہے۔ ناسیا کے ہیرو روکنتین کی طرح ایک شدید بوریت اور اکتاہٹ کا شکار ہے۔ وہ جو کچھ چاہتا تھا، اسے حاصل ہے۔ پھر بھی وہ ان لوگوں پر رشک کرتا ہے جو عملی وابستگی سے گریز نہیں کرتے۔ خاص طور پر اس کا دوست برونے اس کے لئے بڑی کشش رکھتا ہے۔ وہ کمیونسٹ ہے اور اطمینان و سکون کے ساتھ زندگی گزار رہا ہے۔ اس کا ایک مقام ہے، اس کے ذمے پارٹی کا کام ہے۔ اس نے اپنے لئے راہ عمل منتخب کرلی ہے۔ میتھیو اور اس کے عمل کے درمیان فاصلہ باقی رہتا ہے۔ ناول کی تیسری جلد میں وہ اپنے آپ سے شرمندہ ہے اُس کے اندر اپنی آزادی کا ایک شدید جذبہ موجزن ہے۔ وہ عمل کے ذریعہ اپنی آزادی کے اظہار کا خواہاں ہے۔ وہ عمل خواہ کتنا ہی مہمل اور لایعنی کیوں نہ ہو، کچھ بھی نہ ہو تو کم از کم اس عمل سے اس کی سابقہ بے عملی کی تلافی تو ہو ہی جائے گی۔ چنانچہ وہ رائفل لے کر ایک گرجا گھر کے مینار پر چڑھ جاتا ہے اور وہاں سے جرمن بکتر بند گاڑیوں پر گولیاں برسانے لگتا ہے۔ یہ ایک لا حاصل عمل ہے۔ مگر اس عمل کے ذریعہ آزادی اس کے لئے حقیقی مفہوم کی حامل ہو جاتی ہے۔ اس کی تمام کہانیاں اور ڈرامے وجودی آزادی کا استعارہ ہیں۔ سارتر کا خیال ہے کہ ادب ایک ایسی آزادی ہے جو آزادی کو اپنا مقصد بنا لیتا ہے۔ ادب کی یہی صورت حال اس کا مقصد بھی ہے۔ سارتر ادبی فن کو ایک طرح کی اخلاقی بلندی عطا کرتا ہے کہ اس کے نزدیک ادب کا مقصد ابہام کو دور کرنا ہے، عقیدے کی نشاندہی کرنا ہے اور احساس ذمہ داری کو بیدار کرنا ہے۔ اس نے ایک جگہ ادب کو Reading قرار دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ادیب اور اس کے پڑھنے والوں کے درمیان ایک گہرے رشتے کی بات کر رہا ہے۔ وہ فن پارے کے سلسلے میں پڑھنے والوں کی آزادانہ شرکت کی بات بار بار کرتا ہے اور اس بات کا خواہاں ہے کہ اشتراکِ عمل اس

کی آزادی میں توسیع ہو، دوسرے لفظوں میں وہ یہ چاہتا ہے کہ ادیب اپنے پڑھنے والوں کے حلقے کو برابر وسعت دیتا رہے، وہ Elites پر اپنے انحصار کو کم کرے اور ایک ایسے فن کی تخلیق کرے جو عوام کے لئے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سارتر سرریلی فن کے سلسلے میں مخالفت اور مخاصمت کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ وہ اسے ابہام کا شکار بتاتا ہے اور اس کی ناکامی کی وجہ "اخلاقی سنجیدگی" کے فقدان کو قرار دیتا ہے۔

میرے خیال میں سارتر کی فکر میں جو چیز سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے وہ ہے وجودی آزادی کے سلسلے میں اس کا رویہ۔ وہ چاہتا ہے کہ مجبوریوں اور معذوریوں کی اس دنیا میں جہاں انسان طرح طرح کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے ـــــ ایسی زنجیروں میں جو دکھائی دیتی ہیں اور جو نہیں دکھائی دیتیں ـــــ وہ اپنے شعور کے سہارے، جو آزادی کا دوسرا نام ہے، اپنی وجودی آزادی کا اعلان کرے۔ یہ اعلان انکار کی آزادی ہے، نفی کی آزادی ہے۔ ہر اس چیز سے انکار جو باہر سے اس کا تعین کرتی ہے اور اسے ایک طرح کی تجرید میں تبدیل کر دینے کے درپے ہے۔ انسانی شعور بنیادی طور پر کسی خارجی جبر کو قبول نہیں کرتا، اس سے انکار کرتا ہے۔ سارتر کا خیال ہے کہ انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے شعور کو جو دراصل اس کی آزادی کا شعور ہے، کسی طرح مجروح نہ ہونے دے۔ شعور کی اسی آزادی میں انسان کے لئے امید بھی ہے اور امکان بھی۔ یہ آزادی جب عمل بنتی ہے، تو بشارت بن جاتی ہے۔ اس اعتبار سے بقول سارتر وجودیت کوئی قنوطی نظریہ نہیں ہے، وہ ایک انتہائی رجائی نظریہ ہے۔ وہ جبر اور جبریت کا نظریہ ہے اور انسانی ارادے اور اختیار کے اثبات پر اصرار کرتا ہے۔ اسی لئے سارتر اسے ایک نئی ہیومنزم قرار دیتا ہے۔ اس نئی ہیومنزم کی تلاش و تشکیل میں سارتر نے فکر و عمل کی بہت سی وادیوں کی خاک چھانی، خیال کے بہت سے جبر سے اس کے لئے کشش و گریز کا سبب بنے۔ مارکسزم سے اس کا رشتہ کچھ اسی قسم کی کشش اور گریز کی داستان ہے۔ وجودیت جو ہر طرح کی اور ہر رنگ کی جبریت کی نفی کا نظریہ ہے نہ جانے کیوں اور کس طرح اسے مارکسزم کی طرف لے جاتی ہے جس کی اساس معاشی جبریت پر ہے۔ مارکسزم کا نقطۂ آغاز یہ تصور ہے کہ انسانی شعور کا تعین، حیاتیاتی، سماجی اور اقتصادی عناصر کرتے ہیں جبکہ سارتر کی وجودیت اپنی بات انسانی تجربے، شعور اور فرد سے شروع کرتی ہے۔ سارتر کا المیہ یہ ہے کہ وہ وجودیت اور مارکسزم کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس ہم آہنگی کی کوشش میں اس کی اپنی فکر اپنے آہنگ سے محروم ہو جاتی ہے۔ وہ ایک نئی مارکسیت کی تشکیل کے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ وہ مارکسزم میں زندہ فرد کو بحال کرنے کا آرزومند ہو جاتا ہے۔

وہ اپنے دور کے مارکسی نظریات کو محدود سمجھتا ہے۔ اس کی نظر میں معاصر توجیہات نے مارکسزم کو ایک طرح کی "Empirical Anthropology" میں تبدیل کر دیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مارکسزم کو ایک متحرک نظام فکر کی حیثیت سے پیش کرے اس سلسلے میں اس کی کوشش یہ ہے کہ مارکسزم میں ان ضوابط علوم کے لئے گنجائش پیدا کی جائے جو اب تک اس سے باہر ہیں۔ خاص طور پر وہ اس میں فینامینولوجی کو شامل کرنا چاہتا ہے۔ اس خواہش کے پیچھے اس کا یہ احساس ہے کہ مارکسزم بھی دوسری عصری سچائیوں کی طرح ایک نامکمل اور ادھوری سچائی ہے۔ وہ اسے مکمل سچائی میں تبدیل کرنے کی خاطر ۱۹۶۰ء میں 'Criticism of Dialectical Reasoning' لکھتا ہے۔ اس کتاب میں وہ بار بار یہ کہتا ہے کہ عمل کی سطح پر تو جدلیاتی مادیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ مگر فکر کی سطح پر وہ پوری اور ٹھوس سچائی کی تعبیر سے قاصر ہے۔ نارسائیوں کے اس سارے عرفان کے پیچھے بیسویں صدی کی دانشوری کی بنیادی جستجو پوشیدہ ہے ایک ایسے نظام فکر کی جو پورے انسان کے وجود کی مختلف اور متضاد جہتوں پر محیط ہو۔ سارتر کی دانشوری اسی جستجو کا خواب بھی ہے اور شکستِ خواب بھی، اسی کا نشاط بھی ہے اور عذاب بھی۔ یہی وجہ ہے کہ خود اس کے اپنے نظام فکر میں بہت سے تضادات ہیں، یہاں بھی نارسائیوں کے المیئے ہیں۔ مگر یہ تضاد ہمارے دور کی ذہنی زندگی کی خصوصیت ہے، جدید انسان کا خاصہ ہے پال ویلری کا یہ قول توجہ طلب ہے:

> "جدید انسان اپنے اور دنیا کے بارے میں جو تصور رکھتا ہے وہ ایسا کوئی بندھا ٹکا تصور نہیں ہے۔ وہ دنیا کے بارے میں بہت سے تصورات رکھنے پر مجبور ہے۔ اس کے لئے تصورات کی متضاد کثرت کے بغیر جینا مشکل ہی نہیں محال بھی ہے۔"

سارتر کے یہاں تصورات کی متضاد کثرت اسے ہم سے قریب کرتی ہے۔ وہ جدید دور کے انسان کے گومگو کی سفاک اذیت کا ایک حساس ترجمان ہے، وہ ہماری فکری اور جذباتی زندگی پر کچھ اس طرح اور اتنے عرصہ چھایا رہا ہے کہ وہ ہمارے وجود کا، ہمارے عہد کے وجود کا حصہ بن چکا ہے۔

ڈاکٹر شعیب اعظمی

"رسالہ در نظم تمدن و تعاون"

اسلامی تمدن کی وسعت اور اشاعت میں عربی، ترکی اور فارسی زبان نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے اور بعد کی صدیوں میں تو یہ اولیت صرف فارسی ہی کو حاصل رہی جس نے وسط ایشیا اور برصغیر ہند و پاک جیسے ممالک کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ اگر ایک طرف قرآن، فقہ، تفسیر اور حدیث کے لئے عربی زبان ناگزیر تھی تو دوسری طرف تاریخ، ادب، انشا، طب، نجوم اور شاعری کے لئے فارسی زبان و ادب پر انحصار بھی ضروری تھا۔ چنانچہ ان تمام ممالک کی تاریخی، علمی، ادبی، فنی، شعری اور تمدنی میراث کی واحد زبان فارسی ہی کہی جا سکتی ہے۔ یہ سلسلہ نویں صدی سے شروع ہو کر اٹھارھویں صدی کے آخر تک چلا اور یہ زبان ہر جگہ روایتی اقدار کے ساتھ اسلامی تمدن اور ثقافت کے اثرات بھی قبول کرتی رہی۔

مرکزی ایشیا میں سمرقند اور بخارا کے علاقے آج سوویت روس کے زیر نگیں ہیں جہاں کی معتدبہ آبادی مسلمان ہے اور نصف صدی سے زیادہ کی مدت میں وہاں کمیونسٹ نظام اپنی پوری شدت سے نافذ رہا ہے، اگرچہ آج وہاں فارسی زبان اپنا اصل مقام کھو چکی ہے اور تاجیکی نام سے یاد کی جانے والی زبان روسی رسم خط میں لکھی جاتی ہے، لیکن داستان پارینہ ہو جانے کے باوجود اس کے شیدائیوں، خاور شناسوں اور شرق شناسی کے مستند اداروں کی خدمات اور جد و جہد کی دنیا میں فارسی زبان و ادبیات کے محققین اس تہذیبی ورثہ کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور وہاں کے علماء و فضلاء اس کے ادبی شہ پاروں کو نہ صرف پڑھتے ہیں بلکہ زیور طبع سے آراستہ کر کے منظر عام پر بھی لا رہے ہیں۔ ان میں وہ چیزیں

ڈاکٹر شعیب اعظمی، ہیڈ شعبۂ اسلامیات و عرب ایرانین اسٹڈیز۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

بھی ہیں جو خالصتاً عہد اسلامی کی نمائندہ اور اسی معاشرت کا جزو اعظم ہیں اور عہد رفتہ کے اس نظام سے یہ دلچسپی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ تاجیکستان کے یہ مسلمان آج بھی اپنے ماضی اور اسلاف کی اقدار کو بہ ہر صورت زندہ و پائندہ رکھنا چاہتے ہیں۔

ان درجنوں تصنیفات میں مشہور تاجیکی ادیب اور شاعر احمد مخدوم دانش عرف کلّا کا رسالہ " در نظم تمدن و تعاون " مخصوص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ رسالہ تاجیکستان کے روسی علوم کی اکاڈمی نے دوشنبہ کے رودکی زبان و ادبیات کے انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع کیا ہے۔ اس رسالہ کی توضیح اور تصحیح تاجیکی محقق نذر اللہ رستم وف نے کی ہے اور مشہور تاجکی محقق اور نقاد رسول ہادی زادہ نے اس کے متن سے متعلق اہم اشارے کئے ہیں۔ اس رسالہ کا سن طباعت ۱۹۷۶ء ہے۔

احمد ولد ملّا ناصر المتخلص بہ دانش معروف بہ کلّا اس رسالہ کے مصنف کے مختصر احوال زندگی سے واقفیت خالی از دلچسپی نہیں۔ یہ رسالہ دانش کی شہرہ آفاق تصنیف " نوادر الوقائع " کا ایک جزو ہے۔ " نوادر الوقائع " کے بارے میں صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ زین الدین واصفی کی تصنیف " بدائع الوقائع " کے مقابلہ میں یہ کتاب قدیم اور جدید کے امتزاج کا قابل قدر مرقع ہے۔ پرانی تمدنی اور اخلاقی قدروں کے ذکر کے ساتھ جدید عہد کی بہت سی قابل قبول چیزوں کو اختیار کر لینے کا مشورہ بھی ہے۔ دانش نے جس عہد میں آنکھ کھولی تھی وہ ہر لحاظ سے فرسودہ اور کہنہ ہو چکا تھا۔ وہ ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء میں بخارا میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ماں کی آغوش تربیت ہی میں حاصل کی اور اپنے والد کی خواہش پر قرّار اور حفّاظ کے مدرسہ میں قرأت اور حفظ قرآن کی نیت سے داخل ہوئے لیکن زبان میں لکنت ہونے کی بنا پر اور اس وجہ سے بھی کہ قاری یا حافظ کا پیشہ بے فائدہ ہوگا، والد کے اصرار کے باوجود اس تعلیم سے کنارہ کش ہو گئے اور ایک مدت تک بخارا کے علمی مدرسہ میں مروجہ علوم کی تحصیل میں مصروف رہے۔ لیکن ان کی روشن طبعی اور متلاشی فطرت صرف مروجہ علوم کے پڑھنے تک ہی محدود نہ رہی بلکہ انھوں نے خود گزشتہ علوم میں سائنسی مضامین کی تلاش شروع کی اور ریاضی، ہیئت، نجوم، فلسفہ اور دیگر علوم کی کتابوں سے اپنا دامن بھر لیا اور جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں " بغیر کسی استاد کی رہنمائی کے اپنی فطری صلاحیت اور سخت محنت اور کوشش سے "۔

اس کے علاوہ انھوں نے خوش نویسی، ڈزائن سازی، ڈرائنگ اور فن نقشہ نویسی میں بھی دستگاہ

بہم پہنچائی انسان کا شمار اس عہد کے ممتاز فن کاروں میں ہونے لگا۔

جدید علوم کے حصول سے دانش کا منشا یہ نہ تھا کہ وہ روایتی لوگوں کی مانند قضا یا مدرسی کا عہدہ حاصل کر کے جاہ و ثروت حاصل کریں گے بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنے ملک اور عوام کی خدمت کریں۔ وہ اپنی جوانی سے قبل ہی دیدہ ور اور زمانہ شناس ہو چکے تھے، انھوں نے بہت پہلے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ مدارس کے علماء اور اساتذہ کی قدامت پرستی، حکمراں طبقے کی ستم روی اور استحصال امراء کی بے پناہ منافع خوری اور بادشاہوں سے لے کر عہدہ داران سلطنت تک کی صدیوں سے جاری لوٹ کھسوٹ سے نجات کا راستہ کیا ہو اور ملک و عوام کو اس آشوب سے چھٹکارہ کیسے حاصل ہو؟ وہ اگرچہ امیر بخارا کے دربار میں اہم عہدے پر مامور تھے مگر ہمکاروں کی جعل سازیوں، ہمنشینوں کی خوشامدانہ روش اور امراء اور وزراء کی شاطرانہ چالوں کے پیش نظر وطن عزیز اور عوام کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے تھے۔

امیر بخارا کی طرف سے وہ کئی بار سفارتی وفد کے ممبر کی حیثیت سے ۱۸۵۷ء، ۱۸۶۹ء اور ۱۸۷۴ء میں سفارتی مشن پر پیٹرس برگ گئے۔ انھیں متعدد سفروں کی بدولت دانش جہاں بین نے اپنی زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی محسوس کی۔ روس کی علمی اور فنی ترقی اور وہاں کی اجتماعی اور سیاسی پیش رفت بخارا کے جاگیردارانہ نظام کے مقابلہ میں یقیناً بہت بہتر تھی۔ دانش کے لئے روس کی یہ ترقی ایک مثالی اور قابل تقلید چیز تھی۔ ان کی متجسس اور متلاشی طبیعت نے بہت جلد یہ معلوم کر لیا کہ روس اور دیگر یوروپی ممالک نے علم و حکمت کے ذریعہ اور انسانی عقل و خرد کے بل بوتے پر زندگی کے ہر شعبہ میں اور خصوصاً سیاسیات، اقتصادیات اور ٹکنالوجی کے میدان میں اتنی سبقت حاصل کر لی ہے جو ان کے تمام ہمکاروں کی عقل و فہم سے بالاتر ہے۔

جب دانش ۱۸۷۵ء میں اپنے تیسرے روسی سفر سے لوٹے تو بخارا کے امیر مظفر نے دانش سے خواہش کی کہ وہ ایک باقاعدہ عہدہ دار کی حیثیت سے دربار سے وابستہ ہو جائیں، انھوں نے امیر کو اشارۃً یہ بتایا کہ جب تک انھیں نظام سلطنت میں اصلاح اور تبدیلی کے اختیارات نہ مل جائیں وہ حکومت کا کوئی عہدہ قبول نہیں کریں گے۔ یہی زمانہ تھا جب کہ انھوں نے انتظام سلطنت میں اصلاحات کا ایک جامع پروگرام مرتب کر کے امیر کے سامنے پیش کیا۔ یہی اصلاحی پروگرام آگے چل کر "رسالہ در نظم تمدن و تعاون" کی صورت میں منتقل ہوا اور یقیناً دانش کی یہ کوشش ایک جرأتمندانہ

اقدام تھا جس کی بدولت بخارا کی سلطنت کو حکمرانی اور شہرداری کے لیے ایک اجتماعی اور سیاسی نظام کا خاکہ میسر ہوا۔

اگرچہ امیر بخارا نے دانش کی یہ اصلاحی تجاویز قبول نہ کیں اور اس کے مرتب پر امیر کا عتاب بھی نازل ہوا لیکن اہلِ علم و فضل اور ادبی حلقوں میں اس رسالہ نے ایک فکری انقلاب برپا کر دیا۔ دانش جو اپنی آرزوؤں کے اس حشر پر دل شکستہ اور مایوس ہو گئے تھے، اب درباری ملازمت سے دست بردار اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو علم و ادب کی خدمت میں صرف کرنے پر کمربستہ ہو گئے اور تقریباً دس سال کی محنت شاقہ کا ثمرہ مشہور و معروف کتاب "نوادر الوقائع" کی صورت میں ظاہر ہوا، اگرچہ ان کی دیگر تصنیفات بھی ہیں اور وہ بحیثیت شاعر بھی مشہور ہیں مگر "نوادر الوقائع" ان کا شاہکار ہے اور "رسالہ در نظم تمدن و تعاون" اس کتاب کا باب الخاتمہ ہے۔ اگر ایک جانب "نوادر الوقائع" اس عہد کی آسودگی کی تاریخ ہے تو دوسری جانب یہ رسالہ اور اس کی مجوزہ اصلاحات مصنف کی دور بینی اور روشن خیالی کی دلیل بھی۔

یہ بدیہی ہے کہ اس رسالہ کو تحریر کرتے وقت احمد دانش نے تہذیب و تمدن اور مدنی زندگی پر قلم اٹھانے والے فارسی کے مصنفین محمد غزالی اور علی بن شہاب الدین ہمدانی کی تصانیف کو پیش نظر رکھا ہوگا علاوہ ازیں دانش نے اپنے ہمعصروں اور شاعروں کی مانند خود اپنے تہذیبی عقیدے اور عصری معاشی تقاضوں کے مطابق اپنے افکار کو قرآن اور احادیث سے استناد بخشا ہے اور متشدد علماء کے بیشتر اعتراضات کو آیات قرآنی اور اقوال محمدی کے حوالوں سے رد بھی کیا ہے۔

اگرچہ احمد دانش اپنے اس رسالہ کی مقبولیت سے پُر امید نہ تھے لیکن اجتماعی اور مدنی زندگی کے انتظام و انصرام سے متعلق ان کا یہ کارنامہ ایک پیشین گوئی کی حیثیت رکھتا تھا اور اسے اُن کے عہد کے ایک اہم علمی اور ادبی کارنامہ کا مرتبہ حاصل ہوا۔ بعد میں بھی اس رسالہ کی ہمہ گیر افادیت کی بنا پر صدر الدین عینی، برتلس، علاؤ الدین بہاؤ الدینوف اور ظریف رجباف جیسے تاجیکی اور خاور شناسوں نے اس رسالہ کے مصنف اور مواد کے بارہ میں ضروری تفصیلات بہم پہنچائیں۔ ہاں "نوادر الوقائع" مکمل طور پر زیورِ طباعت سے آراستہ نہ ہو سکی، صرف یہ رسالہ علیحدہ صورت میں اس وقت شائع ہوا جبکہ

۵۔ مثلاً ترجمہ احوال امیران بخارا شریف، تاریخچہ، ناموس الاعظم اور مرآۃ التدین

دانش کا ایک سو پچاسواں سال پیدائش منایا گیا۔ دانش کی وفات ۱۸۹۷ء میں ہوئی جبکہ وہ اکہتر سال کے تھے۔

محققین اور خود اس مطبوعہ رسالہ کے مرتب نے اس نسخہ کو بنیاد بنایا ہے جو دانش کا لکھا ہوا ہے اس مخطوطہ کا سال کتابت ۱۸۷۵ء ہے اور جو لینن گراڈ میں شرق شناسی کے انسٹی ٹیوٹ کی اکاڈمی علوم اتحاد جماہیر شوروی میں محفوظ ہے

۲۸۸ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ متعدد ابواب میں تقسیم ہے اور دانش نے شروع میں اس کی غرض و غایت بیان کردی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"یہ دستور بادشاہوں کے رہن سہن کے طور طریق، عہدیداروں اور حکام کے معاملات زندگی، ان کے ماتحت اور متعلق لوگوں سے معاملات میں اعتدال اور مناسب زندگی گزارنے کے لیے خیر الامور اوسطہا کے مصداق ہے"

ابواب کی تقسیم سے قبل رسالہ کی تشریح اور توضیح کے لیے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے جس سے مصنف اس تصنیف کی غرض و غایت ظاہر ہوتی ہے۔ مقدمہ میں بنیادی طور پر اس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نے انسان کی تخلیق کیوں کی اور جب وہ وجود میں آگیا تو پھر اس کی فلاح و بہبود کس چیز میں ہے اور اسے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے ؟۔

پہلے باری تعالیٰ کا ازلی وجود، عالم علوی و سفلی، جسم، روح، عناصر کے موالید کی تخلیق، کثیف و لطیف، نور و ظلمت کی حقیقت کے ساتھ حکمت، نبوت، ولایت اور بادشاہت کا برتری مفہوم بتانے کے بعد یہ وضاحت ہے کہ ان موضوعات میں اللہ تعالیٰ نے کس طرح اس کون و مکان کے دقیق مسائل پوشیدہ رکھے ہیں۔ انبیاؑ کی رسالت کیوں اور کس لئے ہے، اس سلسلہ میں گناہ، دوزخ اور عذاب کی حقیقت کو قرآن کی آیت كُلَّمَا أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ، قَالُوا بَلَىٰ قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ فَكَذَّبْنَا کی تفسیر جن الفاظ میں کی ہے ان کا ترجمہ یہ ہے :

جب دوزخ میں ایک گروہ ڈالا جائے گا تو عذاب کے فرشتے پوچھیں گے کہ کیا نہیں آیا تمھارے پاس کوئی عذاب سے ڈرانے والا تاکہ نہ کرتے گناہ ؟ اصحاب دوزخ کہیں گے کون نذیر اور کیسا خوف؟ فرمائیں گے بھیجے گئے تمھارے پاس نبی، بتایا تھیں سیدھا راستہ لیکن تم لوگوں نے قبول نہ کیا، عضاً

روحی نے تم کو منع کیا اعمال بد کے ارتکاب سے لیکن تم باز نہ آئے۔ تمہارے سروں اور ہاتھوں کو تکلیف میں مبتلا کیا گیا، تمہارے جسم اور اعضا پر نمرود کی ضرب پہنچائی گئی، تمہارے گھر ویران کردیئے گئے اور صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کردئے گئے، تمہارے بیٹے اور عورتیں جدا کردئے گئے تم سے اور متنبہ نہیں ہوئے تم اور اختیار نہ کی سچائی کی راہ اور ہیچ رہے گئے گناہ اور فساد میں تم۔ اعتراف کریں گے پس اہل دوزخ اس وقت اور کہیں گے کہ اس قسم کی مثالیں ہم پر بہت آئیں لیکن ہم پر شقاوت غالب آگئی اور ہم نے اسے صحیح نہ سمجھا پس ہو جائیں گے وہ لوگ مایوس نجات سے اور آمادہ ہو جائیں گے وہ لوگ عذاب کے لئے "

اس طرح سلطنت کیا ہے کہ تفسیر قرآن کی آیت وَاطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم کے ضمن میں یوں لکھا ہے :۔

عقل کی رو سے شہنشاہیت اور پیغمبری ایک انگوٹھی کے دو نگینے ہیں ـــ پس ضروری ہوا کہ جو کوئی سپہ سالار اور سردار ہو اور راہنما ہو اور کاروان کا محافظ ہو، چاہئے کہ انصاف، امانت، دینداری اور ایمان داری کی خوبیوں سے آراستہ ہو تاکہ عوام میں اس کی "ہاں" اور "نہیں" اثر انداز ہو، اور اگر وہ خود اس بارے میں معتدل نہ ہوگا تو اس کے احکام و مناہی دلوں پر کچھ اثر نہ کریں گے اور اگر زور اور بہادری سے اوامر و نواہی نافذ کرے گا تو ظاہر تو کچھ ہوگا لیکن بباطن اس کا الٹا ہوگا"

ابواب ذیلی عنوانوں سے اس طرح تقسیم ہیں :۔

فصل اول ـــ در فضیلت امارت و ریاست و معاملت سلاطین با حق۔

فصل دوم ـــ در سلوک اُمراء با سپاہ و خدم و حشم

فصل سوم ـــ در طریقت رعیت داری و فقرا پروری و رسیدن بغور مہام زیردستان۔

خاتمہ ـــ در تعیین مجلس و معاشرت و معاملت ملوک بندما و مقربان

پہلی فصل میں بادشاہت کے لئے دس شرطیں ضروری قرار دی ہیں جس میں خدا کی نیابت، عدالت، حاجت روائی، قناعت، گفتگو، کبر، مشورہ، نیکوں کی صحبت، خیانت، شہوت اور غفلت جیسے عنوانات کی مثالیں پیش کر کے بادشاہوں کو درس عبرت دیا ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد، حضور صلعم، ہشام بن عبدالملک، حضرت عمر، خلیفہ مامون، بوذر جمہر، شقیق بلخی، عبداللہ بن مسعود اور حجاج بن یوسف

جیسی معروف شخصیتوں کی حدیثوں، روایتوں، اقوال اور حکایتوں کو بیان کرکے بادشاہت کے وسیع مفہوم کو واضح کیا ہے۔

اس قسم کے اقوال اور امثال بے حساب ہیں اور اس قدر مؤثر کہ نہ صرف قاری کو عبرت دیتی ہیں بلکہ زبان و بیان کی چاشنی بھی بخشتی ہیں۔ ایک واقعہ مثال کے طور پر نقل ہے:

"جنگ بدر کے روز رسول صلعم سائے میں تشریف فرما تھے۔ حضرت جبرئیل آئے اور کہا اصحاب دھوپ میں ہیں اور آپ سائے میں۔ اس وحی میں اتنا عتاب پنہاں تھا کہ رسول صلعم نے فرمایا جو شخص دوزخ سے نجات کا خواہشمند ہے اور بہشت میں داخل ہونا چاہتا ہے، چاہئے کہ مرتے وقت کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ وردِ زبان ہو اور یہ کہ جو چیز اپنے لئے پسندیدہ نہ ہو وہ کسی مسلمان کے لئے روا نہ جانے۔"

اسی طرح حلال روزی کے سلسلہ میں داؤد علیہ السلام کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ وہ بھیس بدل کر باہر نکلتے اور جو کوئی ملتا اس سے حضرت داؤد کی سیرت کے بارے میں پوچھتے۔ ایک روز حضرت جبرئیل آدمی کی صورت میں ان کے سامنے آئے۔ حضرت داؤد نے ان سے بھی یہی سوال کیا۔ انھوں نے جواب دیا: داؤد نیک آدمی ہیں لیکن اپنی محنت کی روٹی کھانے کے بجائے بیت المال کی روٹی کھاتے ہیں۔ پس حضرت داؤد خدا کے حضور گڑگڑائے اور یہ عاجزی کی کہ اے میرے پروردگار مجھے کوئی ہنر عطا کرتا کہ میں محنت کی روٹی کھاؤں۔ پس اللہ نے انھیں زرہ سازی کا فن سکھایا۔

"حضور اکرمؐ سے ایک اور واقعہ منسوب کیا ہے اور عدل و انصاف کی اہمیت جتاتے ہوئے عبداللہ ابن مسعود سے مروی یہ روایت بیان کی ہے کہ ایک بار حضورؐ کچھ تقسیم فرما رہے تھے۔ کسی نے کہا یہ وہ تقسیم نہیں ہے جو خدا تعالیٰ نے فرمائی ہے یعنی آپ انصاف نہیں فرما رہے ہیں۔ حضور کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا اور اس سے زیادہ کچھ نہ کہا کہ اللہ تعالیٰ میرے بھائی موسیٰ پر رحمت فرمائے کہ ان کو لوگوں نے اس سے زیادہ رنج پہنچایا۔ انھوں نے صبر کیا اور میں بھی صبر کرتا ہوں۔"

فصل دوم میں فوج کے نظم و نسق، ملک اور عوام کی اہمیت، شہرداری، آبادی، صنعت، زراعت، آبیاری، عشر و خراج، محصولات، فوجیوں کی تنخواہ، عہدے، مراتب، ریٹائرمنٹ، دفاع، حملہ، اسلحہ سازی، درباداری، مصاحبین، سخن پروری، اہل علم و ہنر کی ہمت افزائی، بادشاہوں کی مصلحت پسندی، بذلہ سنجی،

معاملہ فہمی کا مفصل ذکر ہے، خصوصاً فوجی اخراجات سے متعلق دانش نے حسب مرتبہ فوجیوں کی تنخواہ، وظائف اور نقد و جنس کی فراہمی پر زیادہ زور دیا ہے۔ محتاجوں، یتیموں، بیواؤں، ضعیفوں، ملاداروں، خیرخواہوں اور بدخواہوں کی ملک میں موجودگی، اس کے نفع و ضرر میں اہل علم و فضل سے مشورہ اور مسائل کے حل میں نشیب و فراز کی طرف اشارہ ہے۔ اس باب میں واقعات کم ہیں مگر چھوٹے چٹکلوں، لطائف اور برمحل استشہاد سے اپنے موقف کو محکم تر بنایا ہے۔

دانش نے شہرداری کے سلسلہ میں قدیم حکما کی یہ کلیت بیان کی ہے کہ جہاں پانچ چیزیں موجود نہ ہوں وہ شہر کبھی آباد نہیں ہو سکتا ہے اور عقل مند وہاں سکونت اختیار نہیں کرتے ہیں۔ عادل اور طاقت ور حکمراں، دیندار اور ایماندار افسران، طبیب حاذق، اہل خیر و بخشش اور دریا، چشمے اور نہریں۔ پھر ان کے وجود کے فائدے اور عدم وجود کی صورت میں نقصانات کا ذکر کرتے ہوئے یہ دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے:۔

"ایک بار ہندوستان کا سفیر امیر بخارا کے دربار میں آیا۔ اسے تفریح کی غرض سے چہار باغ سلطانی میں لے گئے۔ وہ عمارتوں کی خوبصورتی اور پر فضا موسم کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا اور پوچھا: کیا بخارا میں ندیاں، نہریں اور چشمے ہیں؟ جواب ملا نہیں۔ پھر پوچھا پانی کہاں سے حاصل کیا جاتا ہے؟ کہا سمرقند سے۔ سوال کیا سمرقند کس کا ہے۔ کہا ہمارا۔ پوچھا اگر بالفرض سمرقند تمھارے قبضہ سے نکل جائے؟ جواب دیا یہ تو وہم و گمان سے باہر ہے دونوں ایک جان دو قالب ہیں اور علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ کہا اگر ایسا ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ یہ شہر دریائے آمو کے کنارے ہونا چاہیے یا پھر آمو سے پانی لانا چاہیے تاکہ یہ عمارتیں اور زراعت ہمیشہ پانی سے سیراب ہوتی رہیں۔"

فصل سوم میں بادشاہوں اور امرا کو غریبوں، عام رعایا، زیردستوں اور مجبوروں کے حال احوال سے مکمل باخبر رہنے اور ان کی ضروریات زندگی کو حتی الامکان پورا کرنے کا ذکر ہے۔ حکمراں کی استقامت، عدل پروری اور فلاحی پروگراموں سے ملک کی معیشت ترقی کرتی ہے۔ زراعت، عمارت اور آبادی سے خوش حالی میں اضافہ ہوتا ہے۔ شفقت، کرم اور غربا پروری اور امن و سکون کا ماحول ملک میں سیاحوں، مسافروں اور تاجروں کو متوجہ کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں گزشتہ بادشاہوں، خلفا اور امرا کے تاریخی واقعات کی شہادت کے لیے پیغمبروں، صحابہ کرامؓ اور صوفیا کے پیغامات، ملفوظات اور مواعظ کی درجنوں مثالیں پیش کی ہیں۔

فاسقوں، فاجروں، بے ایمانوں، ظالموں اور باغیوں کو ملک بدر کرنے کے بعد ائمہ، صلحا، علما،

فقراء اور اہل اللہ کو ملک میں بسانے کی تاکید میں بھی احادیث، اخبار اور اقوال سے مدد لی ہے۔
ہر فن کے لوگوں کو ان کی صلاحیت کے مطابق کام دینے، گداگروں اور بے کاروں کو مدارس میں بھیج کر انھیں مصور، صحاف، قوال، لوہار، خطاط بنانے کی تجویزیں پیش کی ہیں۔ یہاں تک کہ پیدائشی معذوروں خصوصاً لنگڑوں، اور بہروں کی تربیت کا انتظام ایک اچھے حکمراں اور ریاست کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔

باب الخاتمہ دو بڑے حصوں میں منقسم ہے اور مضامین اور موضوعات بھی گزشتہ ابواب سے زیادہ مختلف نہیں ہیں، لیکن پیرایہ بیان اور انداز تحریر جداگانہ ہے۔ بادشاہت کے معنی اور پھر بادشاہ کو کیسا ہونا چاہئے۔ اس کی معاشرت خلفائے راشدین کی روایت اور طرز عمل کے منافی نہ ہو۔ شوکت، ہیبت اور جلال کے متوازی عدالت، شفقت اور محبت بھی اس کی شخصیت کا جزو ہو۔ حضر کی زندگی سفر کی بھی محتاج ہے ملک کے مختلف علاقوں میں آمد و رفت کی بدولت ہر قسم کے فرقہ اور طبقہ سے واقفیت بھی ہوگی۔ مختلف آب و ہوا میں رہ کر زمانہ کے سرد و گرم کا تجربہ ہوگا۔ گلستانوں، باغوں اور چمنستانوں میں بسر ہونے والی طبیعت، صحراؤں، ریگزاروں اور بے آب و گیاہ میدانوں کی زندگی نشیب و فراز زمانہ سے لذت آشنا کرے گی۔
بادشاہ کس قسم کے لوگوں کے ساتھ مصاحبت کرے۔ ان کے مراتب اور ملاقاتوں کے اوقات کیا ہوں۔ موضوع سخن کیا ہو؟ اسی دوران یہ نکتہ بھی بتایا ہے کہ عقلمند بادشاہ کی خدمت کے لائق نہیں ہوتا ہے اور جاہل کی تربیت اور خدمت سلطان کے شایانِ شان بھی نہیں ہوتی۔ بادشاہ ظل اللہ اور خلیفۃ اللہ ہے چنانچہ الناس علیٰ دین ملوکہم والی بات اسی وقت صادق ہوگی جب کہ حکمراں اور سلاطین خود ذمہ داری محسوس کریں گے۔ اس ضمن میں خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا واقعہ نقل کیا ہے:

"عید کے دن عمر بن عبدالعزیز کے بیٹوں نے ان سے اصرار کیا کہ ہمیں نئے کپڑے چاہئیں تاکہ ہم عوام سے ممتاز نظر آئیں۔ سلطان نے خزانچی کو حکم دیا کہ اس کی تنخواہ سے نئے کپڑے بنوا دئے جائیں۔ عرض کیا کہ سلطان کا ماہانہ حق جو ذمیوں سے حاصل ہوتا ہے فلاں مد میں خرچ ہو گیا ہے اور پیسے زیادہ نہیں ہیں کہ شہزادوں کے کپڑے بن سکیں۔ حکم ہوا قرض فراہم کرے، کہا سلطان ضمانت کی یہ تحریر لکھے کہ آئندہ مہینے وہ زندہ رہے گا اور اس کا حق بیت المال پر ثابت ہوتا ہے۔ کہا ٹھیک کہتا ہے۔ چنانچہ لڑکے اسی طرح بیٹھے اور پرانے کپڑوں میں ملبوس نماز پڑھنے گئے"
فقراء اور غریب عوام کے ساتھ پیش آنے کے لئے یہ مخصوص ہدایت ہے کہ کون سے طریقے اختیار کئے جائیں اور

گزشتہ زمانوں میں فرمانروا خداوندی کے تحت شریعت محمدی، اسوۂ صحابہ، طریقۂ خلفاء اور سلاطین اسلام کی کیا روش رہی ہے۔ حکمرانی اور جہاں بانی کے اصولوں میں رعایا کو بھی اس کے فرائض کی اہمیت بتائی ہے۔ ایک جگہ اس کی وضاحت یوں کی ہے:

"بادشاہ کو اس بات کا علم ہو کہ اہل سیف اور صاحبانِ قلم کے بعد رعایا دو حصوں میں منقسم ہوتی ہے۔ اہل حرفہ اور اہل زراعت۔ انھیں اپنے بادشاہ سے پہلی توقع یہ ہے کہ ان پر کسی منصف حاکم کا تقرر ہو تاکہ وہ ان کے درمیانی جھگڑوں کا فیصلہ کرے۔ ایسے اہل کار ہوں جو ان سے زکوٰۃ اور ٹیکس کی رقموں کو بقدر ضرورت وصول کرے۔ تیسرے یہ کہ پولیس اور نگراں کی دیکھ بھال ایسی ہو کہ لوگوں کی آمد و رفت کے راستے چوروں اور رہزنوں کی دست برد سے محفوظ ہوں۔ چوتھی بات ایسے وکیل اور نمائندے ہوں جو بازاروں میں ناپ تول کے پیمانوں میں کسی قسم کی بے ایمانی پر نظر رکھیں اور سامانوں کا نرخ مقرر کریں۔ پانچویں ایسے کوتوال ہوں جو ان کے گھروں اور مال گوداموں کی رات میں حفاظت کریں اور ایسے ماتحت مقرر ہوں جو کھیتوں میں پانی فراہم کریں اور مویشیوں کی دیکھ بھال بھی کر سکیں۔"

تھوڑے سے غور و فکر کے بعد یہ صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ آج جدید دور میں دنیا کی حکومتیں اپنے یہاں جو فلاحی اسکیمیں چلاتی ہیں اور نظم و نسق سے متعلق جو قوانین وضع کرتی ہیں کیا ان تجاویز سے مطابقت نہیں رکھتی ہیں جو مندرجہ بالا پیراگراف میں پیش کی گئی ہیں؟

دانش نے اسی باب میں تمام تجاویز کے بعد چودہ نکات ترتیب دیے ہیں جو بادشاہ اور رعایا کے درمیان یا حاکم اور محکوم کے مابین فرائض اور حقوق کا عنوان ہیں۔ جن لوگوں کے واقعات اور مثالیں پیش کی ہیں ان میں نوشیرواں، سکندر ذوالقرنین، ارسطو، حضور صلعم، حضرت علی، بہلول، ذوالنون مصری اور حضرت حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔ انتہائی مختصر اور مؤثر الفاظ میں بیان شدہ واقعات میں سے ثواب و عتاب کے بارے میں ایک نکتہ یوں بیان کیا ہے:۔

"کسی خلیفہ نے بہلول سرمست سے درخواست کی کہ مجھے کچھ نصیحت کیجیے:۔ کہا، اس دنیا سے آخرت کے لیے کوئی چیز نہیں لے جائی جا سکتی ہے بجز نیکی و بدی۔ یعنی ثواب و عتاب۔ اب تم دونوں میں سے کون سی چیز لے جانا چاہتے ہو"

معاشرت کے عام آداب اور دوستوں کے گھروں پر آمد و رفت کے بارہ میں محتاط رہنے کی ایک مثال آنحضرت صلعم کے فرمودات سے نقل کی ہے :-

"حضور صلعم نبوت کے شرف اور جلال کے باوجود جب کسی مسلمان کے گھر کے دروازہ پر تشریف لے جاتے تو تین بار آواز دیتے۔ اگر اجازت ملتی اندر تشریف جاتے ورنہ لوٹ آتے اور رنجیدہ نہ ہوتے۔ اور فرمایا حضور صلعم نے کہ صاحب خانہ سے تین بار اجازت مانگنی چاہیے۔ پہلی آواز سنیں، دوسری آواز پر خود کو اور ملاقات کی جگہ کو درست کریں اور تیسری آواز پر مصلحت کے مطابق یا اجازت دے دیں یا پھر منع کر دیں"

عام شہری زندگی میں مسلمان اور غیر مسلموں کے حقوق اور مراتب کے بارے میں بھی مفید مشورے ہیں۔ مساجد، خانقاہیں، کاروانسرائیں اور پل کی تعمیر تو فلاحی چیزیں ہیں ہی۔ دانش نے سڑکوں پر اور ان پر سایہ دار درختوں کو لگانے، فرسخ، فرسنگ اور میل کے نشانوں کو جلی طور پر نمایاں کرنے کے لیے لکڑیوں کے تختے نصب کرنے اور مسافروں کے لئے ہر قسم کی مناسب سواریاں فراہم کرنے تک کی بھی سخت تاکید کی ہے۔

باب الخاتمہ میں ہی دانش نے گزشتہ ابواب کا پھر ایک جائزہ پیش کیا ہے اور جہاں تک ممکن ہو سکا ہے مختصراً اور ایجازاً موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اور بزرگوں، مشاہیر اور کلام الٰہی سے موثر بنایا ہے۔

روایتی طور پر دانش نے اس معرکۃ الآرا رسالہ کو فارسی کے اس مشہور اور مروجہ قطعہ پر ختم کیا ہے جو ہندوستان، ایران اور افغانستان میں ہاتھ سے لکھی گئی بیشتر کتابوں کے تتمہ پر ملتا ہے۔

غرض نقشیست کز من باز ماند　　　که هستی را نمی بینم بقائی
مگر صاحبدلی روزی برحمت　　　کند در حق این مسکین دعائی

دیگر کاتبوں اور مصنفوں کی مانند دانش کی دعا قبول ہوئی۔ ان کا یہ نقش ان کی زندگی میں اور بعد میں بھی اہل بینش اور علم و ادب کے حلقہ میں وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ علمی، دینی اور سیاسی اور مدنی نقطۂ نظر کے علاوہ اس رسالہ کی علمی حیثیت جداگانہ مقالہ کی متقاضی ہے۔ جہاں ایک طرف قریباً تیس قرآنی آیات، پچاس سے زائد حدیثیں اور عربی کے مقولے اس رسالہ کی مذہبی وقعت کے

منظر میں دبیں فارسی زبان و ادب کے سیکڑوں اشعار، انشا پردازانہ نمونے، اور اساتذہ کے اقوال اس کی ادبی حیثیت کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔

دانش کے رسالہ کی زبان ہماری ہندوستانی فارسی سے بڑی قریب ہے جگہ جگہ فارسی کے مشہور اشعار اُن شعرا کے ہیں جو ہمارے یہاں بڑے محترم ہیں، چنانچہ اخلاقیات اور مذہبیات اور معاشرت کے نکات میں جگہ جگہ سعدی اور جامی کے اشعار کا حوالہ انتہائی موزوں، مؤثر اور دلچسپ ہے افغانستان کی طرح تاجیکستان بھی بیدل سے کافی متاثر ہے، چنانچہ دانش نے بیدل کے متعدد اشعار نقل کئے ہیں۔ دانش خود شعر کہتے تھے اور بسا اوقات اپنے اشعار بھی لکھے ہیں لیکن نثر کے مقابلہ میں ان کے اشعار جاندار نہیں ہیں۔

بہر صورت دانش کا رسالہ در نظم تمدن و تعاون آج کے اسلامی معاشرے اور جمہوری، اشتراکی ممالک اور فلاحی ریاستوں میں مطابقت، یگانگت اور تعاون کے لئے بڑی افادیت رکھتا ہے اور علمی حیثیت سے اسے قابوس نامہ، سیاست نامہ، گلستاں اور دوسری اخلاقی کتابوں کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

قارئین جامعہ سے

پچھلے اعلان کے مطابق یہ شمارہ مئی اور جون پر مشتمل ہے، مگر ہمیں افسوس ہے کہ کتابت کا معقول انتظام نہ ہونے کی وجہ سے صفحات میں اضافہ نہ ہو سکا، مگر ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ کسی مناسب موقع پر اس کمی کو ضرور پورا کر دیا جائے گا۔

(ادارہ)

ویریندر پرشاد سکسینہ

منشی مادھو رام جوہر

منشی مادھو رام جوہر فرخ آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام جواہر لل تھا جو بڑے اللہ والے بزرگ تھے، ان کا خاندان فرخ آباد میں بہت ممتاز اور باوقار سمجھا جاتا تھا۔ شاعری ان کے گھر کی لونڈی تھی کیونکہ ان کا سارا خاندان شعر و سخن سے طبعی مناسبت رکھتا تھا۔ جوہر کے والد جواہر لل بھی اردو میں شعر کہتے تھے، ان کا کلام بعض پرانے گلدستوں میں شائع ہوا ہے۔ جوہر کے دو صاحبزادے تھے: منشی شیو پرشاد متخلص بہ جوہری اور منشی رام پرشاد متخلص بہ گوہر۔ ان کا شمار بھی فرخ آباد کے استادوں میں تھا، بیسوں حضرات نے جوہری اور گوہر سے مشورۂ سخن کیا تھا۔ منشی شیو پرشاد جوہری نے اپنے والد کا دیوان مطبع حسنی فتح گڈھ سے بہ اہتمام حسین بخش سنہ ۱۳۲۰ھ میں طبع کرایا تھا۔ امتیاز علی خاں کاپی نویس نے کتابت کی تھی۔ یہ دیوان جوہر کی وفات کے بارہ سال بعد شائع ہوا۔ منشی شیو پرشاد جوہری نے ایک قطعہ تاریخ بھی کہا تھا جو دیوان میں موجود ہے۔

چھپا وہ حضرت جوہر کا دیوان — کہ ہر اہل سخن تھا جس کا شیدا
ہر اک مطلع ہے جس کا مطلع نور — مہ و خورشید کا سب کو ہے دھوکہ
گل اشعار ہیں رنگین ایسے — کہ ہے باغ سخن سرسبز کیا کیا
سکندر کی قسم آئینے کی شکل — یہ بندش ہے کہ مطلع سب ہے مصفا

جناب ویریندر پرشاد سکسینہ، بدایوں کے رہنے والے ہیں، اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں، خاص طور پر اردو کے ادیبوں اور شاعروں پر۔

جو دیکھا نکتہ بینوں نے اسے خوب — بنایا شوق سے آنکھوں کا تارا
ہر اک اہلِ سخن یوں کہہ رہا ہے — یہ یکتا ہے یہ یکتا ہے یہ یکتا
لکھوا ئے جوہرِی ایمان سے تم — بنا گل مصحفِ مضمون یہ دیکھا

سنہ ۱۳۲۰ھ

جوہر کے صاحبزادے منشی رام پرشاد گوہر کے پسر اکبر منشی لچھمی نرائن متخلص گہر کا قطعۂ تاریخ بھی ملاحظہ کیجئے:-

ہے یہ دیوان جدا مجد کا — شاعرو اس کا مرتبہ دیکھو
گلشنِ نظم اس کو کہتے ہیں — غور سے اس کو جا بجا دیکھو
آج باغِ سخن ہوا شاداب — ہر طرف سے ہرا بھرا دیکھو
شعراء کا دماغ کرتی ہے تر — گلِ اشعار کی ہوا دیکھو
اے گہرؔ اس کی یوں لکھو تاریخ — جوہرِ نظم یہ کھلا دیکھو

سنہ ۱۳۲۰ھ

جوہر نے ابتدائی تعلیم فرخ آباد کے ممتاز اساتذہ سے حاصل کی۔ فرخ آباد میں اس وقت منیرؔ شکوہ آبادی کے کمال کا بڑا چرچا تھا اس لیے ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ منیرؔ کو اپنے اس شاگرد پر بڑا ناز تھا۔ منیرؔ اور جوہرؔ نے دہلی، لکھنؤ، اور اکبر آباد کے جو علم وادب کے مرکز تھے، مشاہیر شعراء اور ادیبوں سے اپنے کمال کی داد پائی۔ حضرت جگر بریلوی یاد رفتگان میں لکھتے ہیں:-

"سخن سنجی و سخن گستری میں اپنے وقت کے مسلمہ استاد تھے۔ اہلِ ہنر اور اہلِ سخن کے بڑے قدر داں تھے ان کے ساتھ بہت سلوک و مراعات کیا کرتے تھے۔ منیرؔ ان کی وجہ سے اکثر مدتوں فرخ آباد میں قیام کرتے شب و روز شعر و سخن کے چرچے اور جلسے رہتے۔ کبھی جوہرؔ خود دہلی لکھنؤ اور اکبر آباد میں جو شاعری کے گہوارے تھے، جا کر مہینوں قیام کرتے۔ اہلِ کمال سے صحبتیں گرم رہتیں، سخنوری و سخن فہمی کی داد دیتے۔

غرض جوہر شمع کمال کے پروانے تھے اور دن رات اسی کے عشق میں زندگی کاٹتے تھے۔"

بہادر شاہ ظفر کے دورِ حکومت میں جوہر مختار شاہی کے معزز عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جوہر نے انگریزوں کا ساتھ نہیں دیا بلکہ تن من دھن سے محبانِ وطن کے شریک رہے۔ اس کے انتقام میں انگریزوں نے ان کی جائداد ضبط کر لی تھی۔

سید رفیق مارہروی نے "ہندوؤں میں اردو" میں جوہر کا سال وفات ۱۸۸۹ء لکھا ہے۔ اور عشرت لکھنوی نے اپنے "تذکرہ ہندو شعراء" میں سال وفات ۱۸۹۰ء لکھا ہے۔ مگر یہ دونوں سنہ غلط ہیں۔ جوہر مرحوم کے شاگرد منشی شنکر لال مجنوں کا قطعۂ تاریخ وفات ملاحظہ ہو، انھوں نے وفات کا صحیح سنہ "محبت" سے نکالا ہے:-

جو رحلت لالہ مادھو رام نے کی — ہر اک سر پیٹ کے کہنے لگا حیف
نظر آتا ہے ہر سو ایک اندھیرا — ہوا رنج و الم کا سامنا حیف
سخن داں و سخن سنج و سخن گو — قیامت ہے کہ دنیا سے اٹھا حیف
پروئے گا سخن میں کون موتی — کہ حسن شاعری جاتا رہا حیف
تو لکھ محبت میں یہ تاریخ مجنوں — غم جوہر قیامت کا ہوا حیف

(محبت سنہ ۱۹۲۶ء)

اس حساب سے جوہر کا انتقال ۱۸۹۳ء میں ہوا۔

جوہر نے اپنے متعدد اشعار میں اپنے استاد منیر سے والہانہ محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ تین غزلوں کے مقطعے ملاحظہ فرمایئے:

جوہر مجھے ہے عشق جناب منیر سے
کس طرح وصف خوبیٔ استاد کیجئے

جوہر کرے کیا وصف منیر سخن آرا
یادی یہی، مرشد یہی، استاد یہی ہے

ہر طرف نام ہے روشن صفتِ مہر منیر

جوہر آفاق میں شہرت مرے استاد کی ہے

کلب حسین خاں نادر شاگرد ناسخ حضرت جوہر کے جگری دوست تھے۔ جب نادر مرحوم فرخ آباد میں ڈپٹی کلکٹر تھے تو انھوں نے جوہر کے ارشاد پر ایک بزم مشاعرہ کی بنیاد ڈالی تھی، جس میں فرخ آباد کے مشاہیر شعرا ہی اپنا کلام سناتے تھے۔ نادر کا جب انتقال ہوا تو جوہر نے حسب ذیل قطعہ تاریخ کہا:۔

حضرت نادر جناب میرزا کلب حسین

نکتہ سنج اہل سخن شیریں زباں شاعر بمرد

مصرع سال وفاتش جوہر محزوں بگفت

طوطی ہند آہ ایں نادر بیاں شاعر بمرد

۱۲۹۵ ھجر

حضرت جوہر اردو زبان کے ایک لاثانی شاعر تھے۔ ان کی غزلیں اب بھی ہندوستان کے گوشے گوشے میں گائی جاتی ہیں، یہ اردو کی بدنصیبی ہے کہ ہمارے ادیبوں نے ابھی تک حضرت جوہر جیسے شاعر پر قلم نہیں اٹھایا۔ تلسی داس، پنڈت دیا شنکر نسیم اور مومن کے بعد اگر کوئی شاعر ہے جس کے بے شمار اشعار ضرب المثل ہو کر ہماری گھریلو زندگی کا جزو بن گئے ہیں تو وہ حضرت جوہر ہیں، ان کے چند ضرب المثل اشعار ملاحظہ فرمائیے، یہ اشعار بہتوں کے زبان زد ہوں گے لیکن بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ ان کا خالق کون ہے:۔

بھانپ ہی لیں گے اشارہ سر محفل جو کیا

تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

اب عطر بھی ملو تو تکلف کی بو کہاں

وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا

نالۂ بلبلِ شیدا تو سُنا ہنس ہنس کر
اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی

دوست دو چار نکلتے ہیں کہیں لاکھوں میں
جتنے ہوتے ہیں سوا اتنے ہی کم ہوتے ہیں

کیا بتاؤں کس طرح دل آگیا
کیا کہوں کیونکر محبت ہو گئی

تلاش کرنے پر جوہر کے ایسے بہت سے اشعار مل سکتے ہیں جن کی حیثیت ضرب المثل کی ہے۔

جوہر کے ہر شعر سے عشق ٹپکتا ہے۔ غزل کی نرم، سادہ اور صاف زبان میں محبت کی کیفیتوں اور وارداتوں کی رنگینیاں ہیں۔ اندازِ بیاں میں اس درجہ تاثیر ہے کہ غزل پڑھ کر طبیعت مسرور ہو جاتی ہے اور وہی عاشقانہ فضا پیدا ہو جاتی ہے جس پر داغ کی شہرت کی بنیاد ہے۔ جوہر کی غزلیات کے بارے میں حضرت جگر بریلوی یادِ رفتگاں میں لکھتے ہیں :-

" کلام میں صرف غزلیات کا کچھ انتخاب نظر سے گزرا۔ بڑا عمدہ اور مزیدار کلام ہے۔ مضامین کے لحاظ سے تو وہی شانہ و آئینہ، رقیب و رقابت، طعن و تشنیع، بوسہ و دشنام، نامہ و پیام، ہجر و وصال کے افکار و معاملات ہیں لیکن اس صفائی، شوخی اور خوبصورتی سے نظم ہوئے ہیں کہ طبیعت پھڑک اٹھتی ہے"

نیند آنکھوں میں بھری ہے کہاں رات بھر رہے — کس کے نصیب تم نے جگائے کدھر رہے
تڑپ رہا ہے دل اک ناوکِ جفا کے لئے — اسی نگاہ سے پھر دیکھئے خدا کے لئے

محبت کیجئے ظاہر نہ مجھ سے، بندہ در گزرا — بڑے میرے نصیب، اللہ مجھ پر آپ مرتے ہیں

بوئے گل سونگھ کر بگڑتے ہیں — یہ پری رو ہوا سے لڑتے ہیں

اسی رنگ میں درد و اثر کی کیفیت بھی پیدا کرتے ہیں :-

اس نے پھر کر بھی نہ دیکھا میں اسے دیکھا کیا دیدیا دل راہ چلتے کو یہ میں نے کیا کیا
غیر ممکن ہے جو ٹھنڈا ہو کلیجہ ان سے اور وہ آگ لگائیں گے بجھانا کیسا
یوں تو منہ دیکھے کی ہوتی ہے محبت سب کو جب میں جانوں کہ مرے بعد میرا دھیان رہے
جن نگاہوں سے لیا ہے دل شیدا میرا ڈھونڈھتا ہے انھیں تیروں کو کلیجہ میرا
ہوگی ضرور صبح تیری اے شب فراق ہم کو نصیب دیکھئے ہو یا سحر نہ ہو

کبھی ایسی صفائی اور درد کے ساتھ سچی اور لگتی ہوئی باتیں کہہ جاتے ہیں جو استادوں کی ہی خصوصیت ہے۔

کیا یاد کر کے روؤں کہ کیا شباب تھا کچھ بھی نہ تھا ہوا تھی، کہانی تھی، خواب تھا
ذرہ سمجھ کے یوں نہ ملا مجھ کو خاک میں اے آسمان میں بھی کبھی آفتاب تھا
میرے ہونے نگہہ قہر رقیبوں کی طرف دیکھئے دیکھئے یہ تیر خطا ہوتا ہے

اب آخر میں جوہر کی چار غزلوں کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں :-

محمل نشیں جب آپ تھے لیلیٰ کے روپ میں مجنوں کے بھیس میں کوئی خانہ خراب تھا
پیری میں ایک ہی سے ہمیشہ رہیں گے دن وہ اور تھا زمانہ جسے انقلاب تھا
تیرا قصور وار خدا کا گناہگار جو کچھ کہ تھا یہی دل خانہ خراب تھا

رات دن چین ہم اے رشکِ قمر رکھتے ہیں شام اودھ کی تو بنارس کی سحر رکھتے ہیں
بھانپ ہی لیں گے اشارہ سرِ محفل جو کیا تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں
اشک قابو میں نہیں راز چھپاؤں کیوں کر دشمنی مجھ سے مرے دیدۂ تر رکھتے ہیں
رشک پرواز کریں کیوں نہ اسیرانِ قفس ہم صفیرانِ چمن بازو و پر رکھتے ہیں
دل تو کیا چیز ہے پتھر ہو تو پانی ہو جائے میرے نالے ابھی اتنا تو اثر رکھتے ہیں
در بدر خاک بسر پھرتے ہیں مارے مارے خانہ برباد محبت کہیں گھر رکھتے ہیں

کون سوتا ہے کہ ہجر میں نیند آتی ہے — خواب میں کس نے تمھیں ایک نظر دیکھ لیا
آنکھیں ملوادیں مگر ذوق تصور نہ گیا — گو نظر بند ہوئی تو بھی اُدھر دیکھ لیا
بچ گیا نقد دل اب کے تو نظر سے اس کی — آئے گا پھر بھی اگر چور نے گھر دیکھ لیا
اتنی سی بات پر آنکھیں نہ نکالو صاحب — کیا خطا کی تمھیں جوہر نے اگر دیکھ لیا

وصف لکھا ہے جو ابروئے بت دلخواہ کا — میرے مطلع پر ہے دھوکا سب کو بسم اللہ کا
وصف حسن پاک کی تحریر ہے اے شمع طور — صفحۂ دیواں میں ہے عالم تجلی گاہ کا
ہیں تری درگاہ میں ہم دوش فقر و سلطنت — مرتبہ یکساں نظر آیا گدا و شاہ کا

بقیہ : تعارف و تبصرہ (بہ سلسلہ صفحہ ۲۹۶)

ہو چکے ہیں ان میں سے بیشتر کا سال وفات قوسین میں دیدیا گیا ہے۔ یہ بڑی قابل تعریف کوشش ہے۔ اگر سنہ وفات کے بجائے تاریخ وفات اور اسی کے ساتھ تاریخ پیدائش بھی دیدی جاتی تو بہت اچھا ہوتا۔ مگر یہ کام بڑا مشکل اور دیدہ ریزی کا ہے۔ اس کتاب میں جو سنہ وفات یا ایک آدھ جگہ تاریخ وفات دی گئی ہیں ان میں سے بعض کو میں نے اپنی نوٹ بک سے ملایا تو چند غلط نظر آئیں۔ مثلاً مہاراج بہادر برق دہلوی کی وفات کے بارے میں درج ہے: "برق کا انتقال ۱۹۳۶ء کی جنوری کے اواخر میں ہوا" (صفحہ ۴۸) میری نوٹ بک کے لحاظ سے فروری ۱۹۳۶ء میں بہ مقام پانی پت ہوا۔ (زمانہ اپریل ۱۹۳۶ء) اسی طرح میراجی کا سال وفات ۱۹۵۲ء درج ہے (صفحہ ۵۵) میری نوٹ بک میں ۳ر نومبر ۱۹۴۹ء درج ہے (بحوالہ "ماہ نو" کراچی، دسمبر ۱۹۴۹ء) بابائے اردو مولوی عبدالحق کا سنہ وفات ۱۹۵۸ء لکھا ہے۔ (صفحہ ۷۵) اور میرے یہاں ۱۶ر اگست ۱۹۶۱ء ہے (مشاہیر کے خطوط مرتبہ عبداللطیف اعظمی صفحہ ۴۳)

میں نے اس کتاب میں ضیا صاحب کا اصلی نام تلاش کرنے کی کئی بار کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا یہ بات تو سمجھ میں نہیں آئی کہ فاضل مصنف نے پورا نام کہیں لکھا ہی نہ ہوگا۔ بس سمجھ لیا کہ خود اپنی ہی نظر کمزور ہے۔ لیکن آخر قارئین جامعہ کیوں اصل نام جاننے سے محروم رہیں اس لیے مالک رام صاحب سے فون پر پوچھا لیا تو معلوم ہوا کہ اصلی نام مہر لال سونی ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ ایک اچھے شاعر اور اردو کے مخلص خدمت گذار پر ایک اچھی کتاب لکھی گئی ہے، مجھے امید ہے کہ ادبی حلقوں میں قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھی جائیگی اور قبول عام حاصل کرے گی۔

(عبداللطیف اعظمی)

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ

مصنف: فخرالدین نظامی
مرتبہ: ڈاکٹر جمیل احمد جالبی

سائز ۲۲×۱۸/۸، حجم ۲۹۲ صفحات، مجلد مع گرد پوش۔ قیمت: تیس روپے
اشاعت اوّل: ۱۹۷۳ء۔ نیا ایڈیشن نظرثانی کے بعد: ۱۹۷۹ء
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ گلی عزیزالدین وکیل۔ کوچہ پنڈت دہلی۔ ۶

اردو زبان میں مثنوی کی روایات کے ذریعے ہندوستانی اقوام کی تاریخ میں اخوت و مساوات، وسیع النظری اور فراخ دلی کا وہ پہلو نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے جسے اس سرزمین کا امتیاز و افتخار کہا جاتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب "مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" اس وقت تک دستیاب شدہ اردو تصانیف کی پہلی کڑی تسلیم کی گئی ہے جو آج سے تقریباً پونے چھ سو سال پہلے بہمنی دور میں فخردین نظامی نے لکھی تھی۔ اس مثنوی کے بارے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے "اردو مثنویاں" میں لکھا ہے: "اتفاق کی بات ہے کہ اس زمانے میں جب اردو شاعری ابھی ارتقا کی منزلیں مذہب و تصوف کے سہارے طے کر رہی تھی، اردو کی اولین مثنوی میں ایک ہندوستانی قصے کو موضوع بنایا گیا ہے۔" اس سے ظاہر ہے کہ "مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" نہ صرف یہ کہ اردو زبان کے آغاز و ارتقا کا ایک اہم اور اولین نقش پیش کرتی ہے بلکہ پونے چھ سو سال پہلے کی تہذیبی ہم آہنگی اور معاشرتی ہم مشربی پر روشنی بھی ڈالتی ہے۔ لسانی تعصبات کے موجودہ دور میں اس مثنوی کی اہمیت

یہ بھی ہے کہ آجکل جس زبان کو ناقابل اعتنا اور بے جا گردانا جاتا ہے یہ مثنوی اس کے لسانی سلسلے کو چھ سو سال پیچھے تک دراز کرتی ہے۔ کسی زبان کے زندہ کہلانے، اس کی لسانی قوت کے مظاہرے اور اس کی جڑیں عوام میں گہری اتری ہوئی ہونے کا ثبوت اس زبان کے قدیم تر کلاسیکل سرمائے سے ملتا ہے۔ یہ سرمایہ جس قدر قدیم اور وافر ہوتا ہے، زبان اتنی ہی متنوع اور جاندار تسلیم کی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے مثنوی کدم راؤ پدم راؤ اردو زبان کی لسانی روایات اور تہذیبی حیثیت کا وہ تاریخ ساز زندہ و توانا مرقع ہے جو اس کی بقا اور مقبولیت کی ضمانت کی حیثیت رکھتا ہے۔

تقریباً پچاس سال قبل نصیر الدین ہاشمی نے اس مثنوی سے اردو دنیا کو واقف کرایا تھا۔ مثنوی کا مخطوطہ مرحوم لطیف ادریسی حیدر آبادی کی ملکیت تھا۔ اب یہ مخطوطہ انجمن ترقی اردو کراچی کے ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہے۔ گزشتہ عرصے میں اس مثنوی کے زبان و بیان کے متعلق مختلف اوقات میں مختلف بزرگوں کے خیالات سامنے آتے رہے لیکن مخطوطے کا رسم الخط انتہائی مشکل اور زبان کے الفاظ غیر مانوس ہونے کی وجہ سے کوشش کے باوجود اس کا متن ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا تھا۔ اس لیے وہ پوشیدہ ہی رہا۔ ڈاکٹر جمیل احمد جالبی لائق صد تحسین ہیں کہ انھوں نے اس ہفت خواں کو پار کر لیا اور اس کی نقل تیار کر کے اصل مخطوطے کے عکس کے ساتھ پوری مثنوی اردو دنیا کے سامنے کھول کر پیش کر دی جو مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے نام سے ۱۹۷۳ء میں کراچی سے اور اب ۱۹۷۹ء میں دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ مخطوطے کا عکس دیکھنے سے ان دشواریوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے جو ڈاکٹر جمیل جالبی کو اس مثنوی کے پڑھنے اور نقل تیار کرنے میں پیش آئیں اور جن کا ذکر انھوں نے کتاب کے مقدمے میں کیا ہے۔ وہ یقیناً یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ "اس مخطوطے کو انتہائی دیدہ ریزی و محنت سے پڑھنے کی منزل سر کر کے مجھے وہی خوشی حاصل ہوئی ہے جو سر ایڈمنڈ ہلاری کو دنیا کی سب سے

مولانا محمد علی مرحوم کے بارے میں انیس آپا کا یہ تبصرہ بہت پسند آیا: "ان کی دو کمزوریاں تھیں، دسترخوان پر لذیذ غذا دیکھ کر اپنے کو روک نہ پاتے تھے چاہے اس سے کتنا ہی نقصان پہنچ جائے اور دماغ میں بہترین جملہ آجاتے تو کہے بغیر نہ رہ سکتے تھے خواہ اس کے اثرات کتنے ہی دور رس کیوں نہ ہوں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کمزوری نے انکی صحت کا ستیاناس کیا اور دوسری نے ان کی قابلیت اور سیاست کو تدبر سے محروم کردیا۔" (صفحہ ۳۰) البتہ ان کی اس رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ اگر محمد علی کی زندگی وفا کرتی تو "آزاد ہندوستان میں ان کا ٹھکانا جیل ہوتا یا تختۂ دار، کیونکہ مردانِ حق کو دنیا سے آخر یہی انعام ملا ہے۔" اس لیے کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ آزاد ہندوستان میں کوئی مردِ حق تھا ہی نہیں اور یہ واقعہ ہے کہ کسی مردِ حق کو تختۂ دار نصیب نہیں ہوا۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی زندگی کے آخری دور کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مصنفہ نے لکھا ہے کہ "نیشنلسٹ مسلمانوں میں سے بہتیرے لوگوں کا یہی حال ہوا، کسی کو غم و غصہ نے پاگل کردیا، کوئی رجائیت و قنوطیت کے مارے دم بخود ہوگیا، کسی نے آستانِ حکومت پر جبہہ سائی شروع کردی اور کوئی صرف داغ ہائے سینہ کا شمار کرتا رہا۔ تھوڑے ہی سے تھے جو سینہ سپر رہے۔" ہے تو یہ بڑی دردناک بات مگر شاید اس سے انکار کرنا مشکل ہے۔

ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم کے مضمون میں "اسلام اینڈ ماڈرن ایج سوسائٹی" کے قیام اور اردو سہ ماہی "اسلام اور عصر جدید" [انگریزی سہ ماہی "اسلام اینڈ ماڈرن ایج" کا ذکر رہ گیا ہے] کے اجرا کا ذکر کرتے ہوئے موصوف نے لکھا ہے کہ:

"اب اس یادگار کو کون قائم رکھے گا؟ اتنی وسعت (؟ محنت) و کاوش کون کرے گا؟ اس کے لیے شاید ہمیں ابھی کچھ انتظار کرنا پڑے گا لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کے شاگردوں کی صف میں کوئی نہ کوئی تو "حریفِ مردافگنِ عشق" ضرور ہی نکلے گا جو عصر جدید کی اس آواز کو بلند کرسکے ......" (صفحہ ۱۱۹) یہ کتاب اسی سال اپریل ۱۹۸۰ء میں چھپی ہے اور عابد صاحب مرحوم کے انتقال کے کچھ ہی عرصے کے

بعد جامعہ ملیہ نے ان دونوں رسالوں کی اشاعت کی ذمہ داری لے لی اور ۱۹۷۸ء کے اواخر سے ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے اہتمام اور اسی ادارے کے اعزازی ڈائرکٹر جناب ضیاء الحسن فاروقی کی ادارت میں یہ رسالے پابندی کے ساتھ نکل رہے ہیں اور اسلام اینڈ ماڈرن ایج سوسائٹی حسبِ معمول ایک کمیٹی کی نگرانی اور انتظام میں بدستور قائم ہے۔ غالباً یہ مضمون ڈاکٹر صاحب مرحوم کے انتقال کے فوراً بعد لکھا گیا ہے اس لئے ان باتوں کا ذکر رہ گیا، مگر ایسی صورت میں مکتبہ جامعہ کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ فاضل مصنفہ سے گذارش کرتا کہ وہ اس حصے کو بدل دیں یا ناشر کی طرف سے ایک نوٹ لکھ دیا جاتا، تاکہ جو لوگ حقیقتِ حال سے واقف نہیں ہیں، ان کو کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہو۔

پچھلے کچھ عرصے میں ہندوپاک میں اہم اور مشہور شخصیات پر اردو میں متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب ان چند کتابوں میں سے ہے۔ جنھیں مزور پڑھنا چاہیے اور جنھیں ہر کتب خانے میں موجود ہونا چاہیے۔

بوڑھا درخت ۔ مطالعۂ ضیا فتح آبادی

مولفہ: ڈاکٹر زرینہ ثانی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۶۰ صفحات، قیمت: پندرہ روپے۔ مطبوعہ: اگست ۱۹۷۹ء

ناشر: رادھا کرشن سہگل ۔ جے ۵/۲ راجوری گارڈن۔ نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۲۷

ضیا فتح آبادی اردو کے مشہور و معروف شاعر ہیں، وہ جتنی اچھی غزل کہتے ہیں اتنی ہی اچھی نظم بھی کہتے ہیں، انھوں رباعیاں اور قطعے بھی کہے ہیں اور ان کا حق ادا کیا ہے۔ سانٹ انگریزی کے اثر سے اردو شاعری میں در آئی ہے اور چیدہ چیدہ شعراء نے اس طرف توجہ کی ہے، ان میں سے ایک ضیا بھی ہیں۔ وہ اگرچہ خاندانی لحاظ سے پنجاب کے رہنے والے ہیں، ان کے آباو اجداد کا تعلق امرتسر کے ایک چھوٹے سے گاؤں فتح آباد سے تھا، اسی لحاظ سے ضیا صاحب اپنے آپ کو فتح آبادی لکھتے ہیں اور ان کی جائے پیدائش سابق ریاست کپور تھلہ ہے جہاں وہ ۹ فروری ۱۹۱۳ء کو

اتوار کی صبح کو پیدا ہوئے۔ لیکن ایک طویل عرصے سے دہلی میں ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں ایم اے کرنے کے بعد، دوسرے سال جنوری ۱۹۳۶ء میں انھیں دہلی کے ریزروبنک میں ملازمت ملی، اس وقت سے ۱۹۵۲ء تک دلی میں قیام رہا، ۱۹۵۲ء میں ان کا تبادلہ مدراس ہوگیا اور وہاں تقریبًا ۸ سال قیام رہا، ۱۹۶۰ء کے اواخر میں دلی آگئے اور پھر یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ گویا اب وہ دلّی والے ہیں۔

۱۹۳۶ء ہی سے میرا قیام بھی دلّی میں ہے، چار پانچ سال تو طالب علمی کا زمانہ رہا، اس کے بعد خوش قسمتی سے جامعہ ملیّہ میں کام کرنے کا موقع مل گیا اور اب تک اسی سے وابستہ ہوں۔ مجھے شروع سے ادبی جلسوں سے دلچسپی رہی ہے، مشاعروں سے کم، بہت کم اور مقالات کی مجلسوں سے زیادہ۔ ان ہی جلسوں میں ضیاء صاحب سے ملاقات ہوتی رہی اور رفتہ رفتہ اچھی خاصی بے تکلفی پیدا ہوگئی۔ میں دلّی کے ایک سرے پر رہتا ہوں اور ضیاء صاحب دوسرے سرے پر، دونوں کے درمیان طویل فاصلہ حائل ہے، مگر اردو کی کشش نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے۔ ایک مرتبہ ان کے مکان پر ایک ادبی جلسے میں شرکت کرنے کا موقع ملا، کوثر چاندپوری صاحب خصوصی مہمان تھے، ان کے مقالے کے بعد مشاعرہ کا دور شروع ہوا، حاضرین کی تعداد اچھی خاصی تھی، مشاعرے کا آغاز ہوا تو یہ معلوم کرکے سخت حیرت ہوئی کہ میرے اور خصوصی مہمان کے علاوہ سبھی حاضرین شاعر ہیں اور لطف یہ کہ سبھی کا کلام اسقام سے پاک تھا اور بعض بعض غزلیں تو خوب تھیں، بحث و گفتگو سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ اردو ادب کے مسائل اور تنقید کے آداب و فن سے لوگ واقف ہیں۔ یہ سب ضیا صاحب کے ادبی و شعری ذوق اور ان کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب سے ضیا صاحب کے حالاتِ زندگی اور ان کے شاعرانہ کمالات پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ کتاب کا پہلا عنوان ضیا صاحب کے اس شعر سے ماخوذ ہے:

بوڑھا درخت ہوں مجھے جڑ سے اکھاڑ دو   میرا پھٹا ہوا ہے لباس، اور پھاڑ دو

اس کتاب میں بہت سے شاعروں اور ادیبوں کا ذکر آیا ہے اور ان میں سے جو مرحوم

(باقی صفحہ ۲۸۹ پر)

gd. No. D-(S.E.)-108 Vol. 77 Nos. 5-6 May, June 1980

THE MONTHLY JAMIA, Jamia Nagar, New Delhi-110025

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

سالانہ چندہ
چھ روپے

جامعہ

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۷۷	بابت ماہ جولائی ۱۹۸۰ء	شمارہ ۷

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبداللطیف اعظمی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی ● مطبوعہ: جمال پریس دہلی ۶ ● ٹائٹل: فائن پریس دہلی ۶

شذرات

کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر آل احمد سرور ہیں جو نہ صرف یہ کہ اردو کے ممتاز ادیب اور نقاد ہیں، بلکہ علم و فکر کے رمز شناس اور صحیح معنوں میں ماہر اقبالیات ہیں۔ ۸، ۹، اور ۱۰ جولائی کو ان کی رہنمائی میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام "تشخص کی تلاش اور اقبال" کے عنوان پر سری نگر میں یونیورسٹی کیمپس میں ایک سہ روزہ سیمینار منعقد ہوا۔ سیمینار کا افتتاح ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ جناب شیخ عبداللہ نے فرمایا۔ اجلاس میں شرکت کی پروفیسر مشیر الحق (جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)، ڈاکٹر امتیاز احمد (جواہر لال یونیورسٹی، نئی دہلی) پروفیسر ساجدہ زیدی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)، بلراج پوری (جموں)، ضیاء الحسن فاروقی (جامعہ)، پروفیسر آل احمد سرور (اقبال انسٹی ٹیوٹ) ڈاکٹر عالم خوندمیری (عثمانیہ یونیورسٹی، حال وزیٹنگ پروفیسر اقبال انسٹی ٹیوٹ) پروفیسر سید مقبول احمد ڈائرکٹر، سنٹر آف سنٹرل ایشین اسٹڈیز، کشمیر یونیورسٹی) پروفیسر پی، این پشپ (سابق پروفیسر کشمیر یونیورسٹی)، ڈاکٹر رفیقی (صدر شعبہ تاریخ، کشمیر یونیورسٹی) اور ڈاکٹر حامدی کاشمیری نے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب، ڈاکٹر قمر رئیس صاحب اور ڈاکٹر جاوید اشرف صاحب نے بھی بحث میں حصہ لیا، یہ حضرات ان دنوں وہیں مقیم تھے۔ یونیورسٹی کے بعض دوسرے اساتذہ اور طلبا بھی سیمینار میں پابندی سے شریک ہوئے۔

سیمینار کے موقع پر اقبال لائبریری میں اقبالیات سے متعلق کتابوں اور رسالوں کی ایک نمائش کا بھی انتظام کیا گیا تھا جس میں ایسے رسائل اور کتابیں بھی تھیں جنھیں پاکستان سے حاصل کیا گیا ہے۔ اقبال لائبریری کے لیے مشہور اور مایۂ ناز مصور مقبول فدا حسین نے اقبال کی تصویر بنائی ہے۔ وہیں اس کی نقاب کشائی کی تقریب بھی ہوئی۔ تصویر کے ساتھ علامہ کا یہ شعر بھی ہے۔

خودی کا سرِ نہاں لا اِلٰہ اِلّا اللہ
خودی ہے تیغ، فساں لا اِلٰہ اِلّا اللہ

تصویر کی نقاب کشائی کے سلسلہ میں جناب شیخ عبداللہ نے فرمایا کہ "مجھے امید ہے کہ رفتہ رفتہ اقبال انسٹی ٹیوٹ اور اقبال لائبریری میں اقبالیات کا وہ سارا ذخیرہ فراہم ہو جائے گا جو اب تک کہیں بھی شائع ہوا ہے، تاکہ ہماری یونیورسٹی اقبال پر کام کرنے والوں کے لئے ایک رہنما بن سکے اور اقبال کے فکر وفن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مسرت اور بصیرت کا مخزن بن جائے۔"

سمینار میں راقم الحروف نے جو مقالہ پڑھا اس کا عنوان "بدلتی ہوئی دنیا میں تشخص کا مسئلہ" تھا۔ میں نے اپنے مقالہ میں کہا تھا کہ جس طرح افراد کے تشخص کی ایک صورت ہوتی ہے اسی طرح جماعتوں اور قوموں کے تشخص کی بھی ایک صورت ہوتی ہے۔ بدلتی ہوئی دنیا میں فرد کے لئے حالات سے مطابقت کا مسئلہ ہوتا ہے، بالکل اسی طرح ایک وسیع سطح پر جماعتیں، ملتیں اور قومیں بھی اس مسئلہ سے دوچار ہوتی ہیں۔ انسان نے جب پہلی بار عالم فطرت کی نیرنگیوں کو دیکھا تھا، اسی وقت سے اسے اس مسئلہ کا سامنا ہے۔ پھر جب زندگی کی ضرورتوں نے اسے مل کر رہنا سکھایا اور رفتہ رفتہ بستیاں بسیں، معاشرہ وجود میں آیا، زندگی کا کاروبار چلانے کے لئے معاشرہ کی تنظیم ہونے لگی تو پہلے فرد نے نئے حالات سے مطابقت پیدا کی اور پھر بستیوں اور معاشروں کو بھی اس عمل سے گزرنا پڑا۔ اس وقت سے لے کر آج تک یہ سلسلہ جاری ہے اور نہ معلوم کب تک جاری رہے گا۔ کار جہاں بہر حال دراز ہے، نہ ابتدا کی خبر ہے اور نہ انتہا معلوم ہے۔

حالات سے مطابقت میں فرد کو بھی مشکلیں پیش آتی ہیں اور جماعتوں اور قوموں کو بھی۔ فرد کی قوت حافظہ مطابقت کے اس عمل میں اس کی مدد بھی کرتی ہے اور راہ میں بھی ڈالتی ہے۔ قوموں کی تاریخ کا، جو ان کے تجربوں کی سرگذشت ہوتی ہے اور جسے فرد کی قوت حافظہ کے مماثل کہا جا سکتا ہے، ان کی اپنی زندگی میں یہی رول ہوتا ہے ——— مسلمانوں کی تاریخ بھی تسلسل اور تغیر کے نشیب و فراز سے اسی طرح گزری ہے جیسے قانون فطرت کے مطابق دنیا کی دوسری قومیں گزرتی رہی ہیں۔ اس وقت مسلمانوں کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ وہ آج کی ہر آن بدلتی ہوئی دنیا میں کس طرح اپنی انفرادیت یا اپنے تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے نئے حالات سے مطابقت پیدا کریں۔ اس بات کو یوں بھی

کہہ سکتے ہیں کہ وہ کس طرح نئے حالات سے ایسی مطابقت پیدا کریں کہ اسلامی ثقافت کا تاریخی تسلسل بھی باقی رہے اور جدید کے تقاضوں کے مطابق فعال، مفید اور ترقی یافتہ شہریت کے مطالبے بھی پورے ہوں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ معاشرہ میں تحفظ پسندی کا ایک عنصر ضرور کار فرما رہنا چاہئے کیونکہ کوئی سماجی تبدیلی یا ترقی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک وہ قوت موجود نہ ہو جو تغیر و تبدل کے عمل کے دوران تسلسل کے عنصر کو تغیر میں شامل کرتی رہے۔ اقبال کے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ اسلام کا نظریۂ توحید اور نظریۂ نبوت مسلمانوں کی عقلی اور جذباتی زندگی میں، اپنے تمام مضمرات کے ساتھ، زندہ اور دوامی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہی نظریے فی الحقیقت روحانی اساس ہیں زندگی کی۔ اس لئے "اسلام کے نزدیک حیات کی یہ روحانی اساس ایک قائم و دائم وجود ہے جسے ہم اختلاف و تغیر میں جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ اب اگر کوئی معاشرہ حقیقت مطلقہ کے اس تصور پر مبنی ہے تو پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ثبات اور تغیر دونوں خصوصیات کا لحاظ رکھے۔" کیونکہ جس طرح کوئی معاشرہ محض تغیر ہی پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح کوئی معاشرہ عرصہ تک محض تحفظ پسندی کے سہارے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔

اسلام میں زمان اور کائنات کا جو تصور ہے، وہ حرکی تصور ہے اور اس لئے تاریخ کا جو تصور ہے وہ بھی مسلسل اور مجموعی حرکت کا تصور ہے اور چونکہ تاریخ ایک مسلسل حرکت ہے زمانے کے اندر، لہٰذا یہ ماننا ہوگا کہ اس کی نوعیت فی الحقیقت تخلیقی ہے۔ اقبال نے یہ کہہ کر

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرف محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ

ماضی پرستی ہی پر تنقید نہیں کی بلکہ اسلامی تصور زماں کا اثبات بھی کیا تھا اور بتانا چاہا تھا کہ زمانے کی گردش دائرے کی سی گردش نہیں ہے۔ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے "کہ زندگی، واقعات اور حادثات، سب بار بار اپنے آپ کو دہراتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حرکت غیر تخلیقی ہے اور زندگی میں تغیر

اور ترقی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسلامی تصورِ حیات و کائنات اس نظریے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہ نظریہ تعلیمات قرآن کے سراسر منافی ہے۔ اس لئے میرے نزدیک اس میں تسلسل اور تغیر میں فی نفسہ کوئی کشاکش نہیں ہے اور یہ اسلامی ثقافت اور مسلم معاشرہ کی بڑی خدمت ہوگی اگر اس حقیقت کو مسلک راسخ العقیدگی کے پرجوش حامی اور اصلاح و تجدد کے مخلص دونوں عقیدے کی سی پختگی کے ساتھ تسلیم کرلیں۔

تغیر کو آیت الٰہی کہا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابتداء میں سب ایک تھے لیکن پھر مشیت الٰہی نے انھیں قبائل و شعوب میں تقسیم کر دیا تاکہ وہ ایک دوسرے کو پہچان سکیں، گویا ملی اور قومی تشخص کے پیچھے ایک ماورائی مصلحت ہے۔ اس لئے جہاں تغیر آیت الٰہی ہے وہیں ملی اور قومی تشخص بھی آیت الٰہی ہے اور خدا نے زمانے کی قسم بھی کھائی ہے۔ پس زمانے میں خواہ کتنی ہی سرعت کے ساتھ تغیر و تبدل رونما ہو اس سے اللہ کی دوسری آیات میں کوئی فرق نہیں پڑتا، وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔ زندگی کے بارے میں قرآن مجید کی نگاہ جمود کے بجائے حرکت پر ہے، اس لئے اس کا مطمح نظر ارتقاء کے خلاف نہیں، لیکن زندگی چونکہ ماضی کا بوجھ اٹھائے آگے بڑھتی ہے اس لئے معاشرتی تغیر و تبدل کے کسی نقشے میں قدامت پسندانہ قوتوں کی قدر و قیمت اور وظائف کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کی کوئی قوم اپنے ماضی سے قطع نظر نہیں کر سکتی، اس لئے کہ یہ ان کا ماضی ہی ہے جس سے ان کا موجودہ تشخص متعین ہوتا ہے۔

اکٹر تنویر احمد علوی

انتخابِ دواوین

"انتخابِ دواوین"، جیساکہ اس کے نام سے ظاہر ہے، مختلف دواوین کا ایک شعری انتخاب ہے
ں کے مرتب عہدِ ظفر کے ایک بڑے عالم مولانا امام بخش صہبائی ہیں۔

صہبائی کا شمار اپنے زمانہ کے ممتاز علما اور اہلِ ادب میں ہوتا تھا، بالخصوص فارسی ادبیات پر
ہ استادانہ دست رس رکھتے تھے اور بیان و بلاغت اور قواعد و لغت کے مسائل سے انھیں گہری
بسپی تھی خان آرزو اور شیخ حزیں کے مابین جن مسائل پر معارضہ ہوا ان میں جن لوگوں نے اس کے بعد قلم
ٹھایا ان میں صہبائی کا نام امتیازی حیثیت میں سامنے آتا ہے۔

قدیم دہلی کالج کے اساتذۂ ادبیات میں سے تھے۔ دہلی کے آثار میں سر سید نے آثار الصنادید کے
م سے جو کام کیا اس میں صہبائی کی معاونت کو بھی دخل تھا، مرزا قادر بخش صابر کے تذکرہ گلستانِ سخن کو ان کے
ض معاصرین صابر کی نہیں ان کے استاد صہبائی کی تالیف مانتے تھے۔ سنہ ستاون کے ہنگامہ میں
گریزی فوجوں کے ہاتھوں جن اکابرِ دہلی کا قتل عمل میں آیا ان میں صہبائی بھی شامل تھے۔ مفتی صدر الدین نے
کے قتل پر اپنے اس شعر میں اظہارِ ملال کیا ہے:

کیونکر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

ہبائی کے علمی آثار میں مختلف ادبی رسائل کے علاوہ "قولِ فیصل"، "رینۂ جواہر" اور میر شمس الدین فقیر کی کتاب
دائق البلاغت کا ترجمہ بطورِ خاص اہم ہیں۔ انھوں نے دہلی کالج کے لئے خواجہ میر درد دہلوی کے اردو دیوان

اکٹر تنویر احمد علوی، ریڈر شعبۂ اردو، دلی یونیورسٹی۔ دہلی۔ ۱۱۰۰۰۷

کو بھی مرتب کیا تھا اور دہلی کالج کے مطبع ہی سے اس کی اشاعت عمل میں آئی تھی، دیوان ورد کی اس نادر اشاعت کا ایک نسخہ ہارڈنگ لائبریری دہلی میں محفوظ ہے۔

انتخاب دواوین انھوں نے دہلی کالج کے پرنسپل بوترس کی فرمائش پر مرتب کیا تھا۔ "صاحب والا مناقب ۔ ۔ ۔ بوترس صاحب بہادر، پرنسپل کے ارشاد سے دواوین اردو میں سے ہر صنف کے اشعار انتخاب ہو کر ایک مجموعہ مرتب ہوا تاکہ ناظرین کو اکثر شعراء کے کلام سے ایک جا ہونے میں احتظاظ وافر ۔ ۔ ۔ حاصل ہو اور از بسکہ مبتدیان کو ہر صنف کی تعریف پر اطلاع نہیں ہوتی اس وجہ سے چند ورق اس باب میں سیاہ کئے جاتے ہیں اور بہ نظر اس امر کے کہ یہ سب اصناف اس مجموعہ میں بالاستیعاب مذکور ہیں ان کی مثالیں ترک کیں۔" [۱]

اس کام کی نوعیت انتخابی امر کی سی ہے۔ اس کی طرف اشارہ خود مرتب کے بیان میں موجود ہے۔ صاحب انتخاب نے چند معروف شعراء ہی کے انتخابات کو اس میں شامل کیا ہے اور ان میں ایک آدھ ایسا نام بھی شامل ہے جسے اردو ادبیات کی تاریخ کا غیر معروف نام کہا جا سکتا ہے مقام حیرت ہے کہ غالب اس انتخاب میں شامل نہیں۔

ایسا بھی نہیں کہ ہر شاعر کے دیوان سے براہ راست انتخاب کیا گیا ہو، بعض شعراء کے اشعار اس سے پہلے دوسرے اہل تذکرہ کے یہاں شامل ہو چکے ہیں۔ شاہ نصیر اس کی نمایاں مثال ہیں جن کے اشعار کا انتخاب ان کے کسی دیوان سے نہیں کیا گیا جس کے یہ معنی ہیں کہ شاہ نصیر کا دیوان صہبائی کو دستیاب نہیں ہوا۔ مرتب کے بیان کے مطابق اس میں ہر صنف شعر سے انتخاب دیا گیا جس سے انتخاب کا مطالعہ کرنے والوں کو مختلف اصناف شعر کے نمونوں سے متعارف کرانے کی شعوری کوشش کا اندازہ ہوتا ہے ان مطالعہ کرنے والوں میں مبتدیین کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے اور اسی لئے مرتب نے بیان و بلاغت کے بعض ضروری مسائل کی بھی اپنے مقدمہ میں تشریح کی ہے۔ صہبائی مدرس تھے اور ایک مدرس کے رشتہ سے ان کو طالب علموں کی ضرورتوں اور دشواریوں کا احساس تھا۔ اس عہد کے اہل ادب کے نزدیک اشعار سے حظ و انبساط حاصل کرنے کے لئے شعر کے اجزائے ترکیبی اور مختلف انواع شعر کی اپنی نوعی خصوصیات سے واقفیت ضروری تھی۔

بعض تعریفیں جو صہبائی نے اپنے مقدمہ میں پیش کی ہیں انھیں بطور مثال یہاں درج کیا جاتا ہے:

"شعر لغت میں جاننے کو کہتے ہیں اور اصطلاح شعراء میں (وہ) ایک کلام ہے کہ وزن اور قافیہ رکھتا ہو اور شاعر نے اس کو شعر کے "قصد" سے کہا ہو۔۔۔

۔۔۔ ردیف شعر کی ماہیت میں شامل نہیں اور یہ مذہب جمہور ہے۔

شعر دو فقرہ (پارہ) موزوں کا نام ہے۔ جزو (واحد) کو مصرع کہتے ہیں مصرع اول کے پہلے جزو کو صدر اور اسی مصرع کے جزو آخر کو عروض کہتے ہیں اور دوسرے مصرع کے جزو اول کو مطلع اور ابتدا اور اس کے جزو آخر کو ضرب اور عجز مطلع۔۔۔۔۔" [1]

غزل کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے

"غزل لغت میں عورتوں کی باتیں اور عورتوں کے عشق کی باتیں کرنے اور اس سخن کو بھی کہتے ہیں جو عورتوں کی تعریف میں کہا جائے اور اصطلاح میں کئی ایسی بیتوں کا نام ہے کہ سب کا وزن ایک ہو اور پہلے بیت کے دونوں مصرع ہم قافیہ ہوں اور باقی ابیات کے دوسرے مصرع، پہلے بیت کو مطلع کہتے ہیں اور دوسرے بیت کو جو مطلع کے بعد ہے حسن مطلع اور بیت آخر کو مقطع کہتے ہیں اور اور شعرائے متاخر قاطبۃً اپنا نام جس کو تخلص کہتے ہیں مقطع میں داخل کرتے ہیں [2]

اس ضمن میں فارسی اور عربی شاعری میں روایت عشق کا ذکر کرتے ہوئے صاحب بحر تحریر نے کہا ہے

"معلوم کیا چاہیئے کہ عرب میں مرد کا عشق عورتوں پر ہوتا ہے اور فارس میں مرد کا عشق غالباً اطفال پر اور کبھی عورت پر بھی اور فارسیوں کے اتباع سے اردو گو بھی یہی روایہ برتتے ہیں اگرچہ ہند میں عورت کا عشق مرد پر شائع ہے اور یہ امر گیت اور دوہروں سے ظاہر ہے۔ اور ازبسکہ عربی غزلوں میں حدیث عورتوں کی ہوتی ہے اس واسطے اس کا نام غزل رکھا [3]

"قصیدہ" لغت میں مغز غلیظ کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں ایک کلام ہے

---

[1] انتخاب دواوین: [2] ایضاً: [3] ایضاً:

اتحاد وزن اور قافیہ میں مثل غزل کے مگر اتنا فرق ہے کہ اشعار اس کے گیارہ بارہ بیت سے زیادہ نہیں چاہیئے اور قصیدہ کے واسطے ابیات کی کچھ حد معین نہیں۔ اور اس کے مضامین مختلف ہیں" [1] کبھی ساری غزل یا اس کے اکثر شعر ایک دوسرے سے متعلق ہوتے ہیں ایسی غزل کو قطعہ بند کہتے ہیں۔

رباعی دو بیت ہیں کہ مصرع اول و دوم و چہارم ہم قافیہ ہوتا ہے اور کبھی چاروں مصرع ہم قافیہ ہوتے ہیں اس کو چار مصرعی اور دو بیتی بھی کہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اور تفصیل اوزان رباعی کی حدایق البلاغت کے ترجمۂ اردو میں مرقوم ہے۔ [2]

مثنوی ایسی بیتیں ہیں کہ وزن سب کا علیحدہ اور قافیہ دو دو مصرع کا متفق اور ہر بیت کا قافیہ جداگانہ رکھتی ہے حد مثنوی کی متعین نہیں جیسے مثنوی میر حسن کی ہے۔ [3]

مصنف نے اوزان و بحور اور ان کے ارکان تقطیع سے بھی اپنے اس مقدمہ میں بحث کی ہے اور مختلف انواع شعر جو اپنی ہیئت ترکیبی سے جنم لیتی ہیں ان کی مثالیں بھی پیش کی ہیں

حدایق البلاغت کے ترجمہ کے ذکر سے مترشح ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنے اس مقدمہ کی تحریر کے وقت اسے پیش نظر رکھا ہے۔ اس بحث میں ایک موقع پر صہبائی نے اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ اردو کا پہلا شاعر شمس ولی اللہ ہے۔ آزاد نے بھی آب حیات میں ولی کو اردو شاعری کا "باوا آدم" کہا ہے۔

اس میں مندرجہ ذیل شعرا کا انتخاب کیا گیا ہے

ولی شمس ولی اللہ (۲۰ - ۲۹) خواجہ میر درد (۶۶ - ۳۱) سودا (۹۸ - ۶۷) میر تقی میر (۱۲۳ - ۹۸) جرأت (۱۵۱ - ۱۱۳) میر حسن (۱۶۴ - ۱۵۲) نصیر (۱۷۷ - ۱۶۵) ممنون (۱۹۶ - ۱۶۸) ناسخ (۲۱۸ - ۱۹۷) مول چند (۲۳۱ - ۲۱۹) ذوق (۲۵۷ - ۲۳۲) مومن خاں (۲۶۹ - ۲۵۸) گیت (۲۷۱ - ۲۷۰)

گیتوں کا انتخاب گویا ان انتخابات کے ضمیمہ کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر یہ اہم بات ہے کہ صہبائی گیتوں کی روایت کو اردو ادبیات ہی کا حصہ سمجھتے ہیں۔ مول چند کا انتخاب اگر صہبائی اپنے یہاں شامل نہ کرتے تو ان کی فکر فرمائیوں کا وہ حصہ ضائع ہوگیا ہوتا جو اب صرف انتخاب کے صفحات میں محفوظ ہے۔

---

[1] انتخاب دواوین ص ۔ [2] ایضاً ص ۲ [3] ص ۳

تذکرہ نگاری کی روایت ہی بیاض سازی کے ادبی فن اور انتخاب اشعار کے شعری ذوق سے پیدا ہوتی ہے اردو میں تذکروں سے قطع نظر بعض اچھے انتخابات بھی ملتے ہیں۔ دیوان جہاں، گلدستۂ نشاط اور مجمع الانتخاب تذکرہ ہوتے ہوئے بھی اپنی امتیازی حیثیت میں انتخابات ہی ہیں۔

اسی زمانہ میں جب کہ صہبائی نے یہ انتخاب شائع کیا مولوی کریم الدین نے گلدستۂ نازنیناں کے نام سے اسی نوع کا اور تقریباً انہی خطوط پر ایک اور انتخاب کر کے شائع کیا۔

بہارستان سخن میں آتش ناسخ اور آباد (لکھنو کے) تین شاعروں کا انتخاب لکھنؤ سے شائع ہوا اور ایسا ہی ایک انتخاب نگارستان سخن کے نام سے عمو جان نے، مطبع احمدی شاہدرہ دہلی سے شائع کیا۔ یہ انتخابات کچھ بعد کی اشاعتیں ہیں لیکن اس عہد کے ایک ادبی رجحان کو پیش کرتی ہیں۔ انتخابات کو تذکرے کا روپ نہیں دیا گیا مگر صہبائی اور ان کے معاصر مولوی کریم الدین کے یہاں اس کا واضح میلان موجود ہے۔ ہر انتخاب سے پہلے شاعر کا تعارف نامہ ہے۔ جو اگرچہ مختصر ہے اور اس میں تذکرہ احوال پر مرتب نے کوئی دھیانی توجہ بھی نہیں کی لیکن ان نگارشات کے باعث انتخاب میں تذکروں جیسا ایک انداز ضرور آ گیا ہے۔

صہبائی اگر توجہ فرما ہوتے تو جن شعرا کا انھوں نے طویل انتخاب دیا ہے ان کا ترجمۂ احوال بھی فی الجملہ تفحص اور تحقیق کے ساتھ مرتب کر سکتے تھے مگر سوانح و سیرت پر گفتگو ان کے دائرہ کار میں بالکل ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔

انھوں نے ان ترجموں میں صاحب ترجمہ شاعر کی خصوصیات فکر و فن کے بارے میں بھی کوئی قابل ذکر بات نہیں کی جب کہ ان میں بعض ان کے معاصرین ہیں۔ اس میں ایک حیرت آفریں بات یہ ہے کہ صہبائی غالب کو ان کے اردو کلام کے انتخاب کے ساتھ اس میں شامل نہیں کرتے جس سے ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ وہ مرزا کو اردو کا شاعر نہیں سمجھتے تھے یا پھر کسی معاصرانہ زاویۂ نگاہ کے تحت انھوں نے دانستہ اپنے اس ممتاز معاصر کو نظر انداز کیا جب کہ مول چند اس میں موجود ہیں جن کا شمار اس دور میں بھی اردو کے ممتاز شعرا میں نہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس کے ترجموں پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> کسی شاعر کے کلام کا انتخاب دس بارہ صفحہ سے کم میں نہیں ہے۔ ہر صفحہ میں بیس اشعار ہیں شعرا کے حالات بھی درج ہیں لیکن مختصر، نصف صفحہ سے زیادہ کسی کے متعلق نہیں لکھا دوسرے شعرا مثلاً غالب، ذوق اور مومن جن سے صہبائی بخوبی واقف تھے ان کے متعلق بھی صرف چند

سطریں لکھی ہیں۔

یہاں فاضل مبصر سے تسامح ہو گیا ہے، غالب صہبائی کے معاصر ضرور ہیں لیکن اس انتخاب میں ان کا ترجمہ موجود ہی نہیں اختصار اور غیر اختصار کا کیا سوال ہے یہاں غالب کا ذکر ایک طرح کا مغالطہ ہے جس سے مصنف کا ذہن دوچار ہوا۔ ان تراجم کی تسوید میں جن سوانح کو رائف کو سامنے لایا گیا ہے ان میں صہبائی نے بیشتر سنی سنائی باتوں پر انحصار کیا ہے اور ان کی صحت و عدم صحت کے بارے میں کسی تحقیقی فکر سے کام نہیں لیا، ولی کے متعلق لکھا ہے

"... مشہور شعرائے دکن سے ہے اور لوگ بیان کرتے ہیں کہ عہد عالمگیر اورنگ زیب کے میں وارد دہلی ہوا اور شاہ والا جاہ نے اس کی قدر دانی کر کے پرورش فرمائی"

اس سے یہ تو ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ اس وقت یہ روایت افواہ عوام کا ذریعہ تھی لیکن اس کی صحت سے بلا تکلف انکار کی گنجائش ہے اس لیے کہ جس زمانہ میں ولی دہلی آئے عالمگیر خود دکن میں تھا اور دہلی میں ولی کے ساتھ بادشاہ کا اندازہ قدر دانی و پرورش کوئی حسن سلوک ایک بے بنیاد بات ہے۔

سودا کے لئے لکھا ہے کہ "وہ ایام جوانی میں لکھنؤ کو گیا" جو تاریخی صداقت کے طور پر محل نظر ہے۔ میر کے ترجمہ میں سراج الدین خاں آرزو کے نام کے ساتھ نواب بھی شامل کیا ہے اور نواب سراج الدین علی خاں لکھا ہے جو صحت سے بعید ہے۔

تنقیدی رائیں بھی بہت سرسری اور سطحی ہیں۔ مثال کے طور پر میر کے بارے میں ان کی یہ رائے "ان کی تعریف میں زبان انسان کی عاجز ہے ریختہ گوئی اور محاورات (کذا) شاعر بے بدل بلکہ شاعر نہ تھا ساحر تھا" اس رائے کا کسی تنقیدی بصیرت سے کوئی رشتہ نہیں۔ میر حسن کے والد میر ضاحک کے ساتھ "ہراتی" بھی لکھا ہے جب کہ ان کا خاندان بہت پہلے ہرات سے دہلی آچکا تھا اور ان کے واقعہ وفات سے متعلق کہ فیض آباد میں انتقال کیا۔

ان کے انتخاب میں جو اشعار پیش کئے ہیں وہ ان کی مثنوی سے لئے گئے ہیں۔ جہاں دوسرے شعراء کا انتخاب براہ راست ان کی شعری تخلیقات سے کیا ہے وہاں شاہ نصیر کے لئے لکھا ہے:

"یہ چند اشعار بطور یادگار تذکرہ (مجموعہ نغز) مصنفہ حکیم فاضل دانشمند میر قدرت اللہ مرحوم، تخلص قاسم سے اور ادھر جا سے لئے گئے ہیں"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاسم کا تذکرہ صبہائی کے ماخذیں سے ہے ـــــــ یہ تذکرہ ۱۲۲۱ھ میں مرتب ہوا تھا اسی زمانہ میں اس کا ضمیمہ بھی ترتیب دیا گیا تھا۔ شاہ نصیر سنہ ۱۲۵۴ھ تک زندہ رہے۔ ظاہر ہے کہ اس اثنا میں کچھ دوسرے قلمی مجموعوں اور تذکروں میں بھی ان کا کلام شامل ہوتا رہا ہوگا۔ لیکن اس موقع پر کون سے دوسرے ماخذان کے پیش نظر رہے اس کی وضاحت صبہائی کے بیان میں موجود نہیں۔

ممنون کا انتقال ۱۲۶۰ھ میں ہوا اس کے یہ معنی ہیں کہ اس انتخاب کی ترتیب کے زمانہ میں ممنون حیات تھے مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ ممنون نے اس انتخاب کے سلسلہ میں خود بھی کسی دلچسپی کا اظہار کیا۔ تذکرہ کی اشاعت کا زمانہ ۱۸۴۴ عیسوی مطابق سنہ ۱۲۶۰ہجری النبوی ہے لیکن ترجموں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی اساسی روایت کی تسوید کا کام اس سے تین چار سال پہلے انجام دیا جا چکا تھا۔ اس خیال کی تائید جرأت کے ترجمہ میں آمدہ اس اطلاع سے بھی ہوتی ہے قریب تیس برس گزرے کہ اس جہان فانی سے انتقال کیا۔ جرأت کا سال وفات ۱۲۲۵ھ ہے اس حساب سے ان کا ترجمہ ۱۲۵۵ھ یا اس کے قریبی زمانہ میں ترتیب دیا گیا۔

ناسخ کے ترجمہ میں ان کے سال وفات ۱۲۵۴ھ کو دو تین سال پہلے کا بیان کیا ہے۔ اس سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ یہ انتخاب ۵۸-۱۲۵۵ھ کے مابین زیر ترتیب تھا۔ ناسخ کے ترجمہ میں یہ بھی لکھا ہے یہ تھوڑے سے شعر اُن کے دیوان سے انتخاب کیے ہیں، ناسخ کے دیوان کی اشاعت اول سنہ ۱۲۵۸ھ کا واقعہ ہے اور یہ انتخاب اس کے قریبی زمانہ سے تعلق رکھتا ہے

منشی تخلص لالہ مول چند قوم سے کایستھ تھے۔ قلعہ سے تعلق تھا اور حکیم قدرت اللہ قاسم کی روایت کے مطابق شاہ عالم ثانی کی فرمائش کے مطابق کوئی قصہ نظم کر رہے تھے صبہائی نے لکھا ہے کہ انھوں نے شاہنامہ کے بعض حصوں کو اردو میں منتقل کیا تھا جس کے اقتباسات اس نگارش کے ساتھ انتخاب دواوین میں پیش کیے گئے ہیں۔

"اکثر قصص شاہنامہ کے زبان ریختہ میں نظم کیے ہیں چنانچہ بطریق یادداشت یہ
اس کے شاہنامہ سے انتخاب کیے"[1]

انتخاب دواوین شروع سے اخیر تک صرف ایک ہی نوع کے اشعار و ابیات پر مشتمل نہیں ہے۔ منشی

---

[1] انتخاب دواوین: ۱۲۰

مول چند کے علاوہ میر حسن کا ترجمہ اشعار بھی ان کی معروف مثنوی سے دیا گیا ہے۔ دواوین سے جو انتخابات دیے گئے ہیں وہ زیادہ تر صنف غزل سے متعلق ہیں۔ قصائد کو بالعموم نظر انداز کیا گیا ہے اس سے ایک گونہ صہبائی کے ذوق شعری پر بھی روشنی پڑتی ہے

گیت کے عنوان سے جرأت کی ۹ غزلیں درج کی گئی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ غزلیں صہبائی کے زمانہ میں ارباب نشاط کی زبان پر ہوں گی اور ان کے منتخب اشعار محفلوں میں غنائی شاعری کے مختلف اصالیب کے ساتھ پیش کیے جاتے ہوں گے ——— ایک غزل کے ساتھ بطور مقطع یہ شعر موجود ہے۔

اے صبا چہرۂ تابان صنم دیکھتے ہی
مہ دخورست فلک پیر نے منھ پھیر لیا

ایک برج گیت کے بول گیت خیال کے عنوان سے دیے گئے ہیں ایک پنجابی ٹپہ کے عنوان سے درج ہے اور دو گیت ملار کے نام سے پیش کیے گئے ہیں۔

یہ انتخاب بہت کم یاب ہے اس کا ایک نسخہ جس کا سرورق موجود نہیں نیشنل لیاقت لائبریری کراچی میں محفوظ ہے۔ ایک اور مکمل نسخہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے بیان کے مطابق ڈاکٹر عندلیب شادانی کے ذاتی ذخیرہ کتب کے ساتھ اس لائبریری کو منتقل ہوا ہے۔

ایک نسخہ جس سے راقم الحروف نے استفادہ کیا ہے عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری کی زینت ہے اور بگمان غالب ہندوستان میں موجود واحد قلمی نسخہ ہے۔ اس کے سرورق کے اندراجات حسب ذیل ہیں

Selection
from the most celebrated Hindoustany Poets
Viz
Wali, Dard, Sauda Meer Takee
Jourut, Meer Hassun Nasseer, Mumnoon
Nasiek, Moolchand, Zouk Moumeen Khan
with
a few popular songs
and
an introduction on the
different kinds of Hindee Verse
by
Moonshee Imam Bux of the Delhi College

انتخاب دیوانوں شعرا مشہور زماں اردو کا اور بعض گیت کا معہ بیان ہر قسم کے شعر کے
مولوی امام بخش مدرس اول فارسی مدرسہ ہذا سے
۱۸۴۳ء میں کیا
دہلی اردو اخبار پریس مکان مولوی محمد باقر صاحب واقعہ گذر اعتقاد خاں میں
باہتمام پنڈت موتی لعل پرنٹر اور پبلشر کے چھاپہ ہوا ۱۸۴۴ء
۱۸۴۴ء

سرورق کی پیشانی پر کتب خانہ سرکار عالیہ کی قدیم مہر موجود ہے مگر صاف پڑھی نہیں جاتی۔

مقدمۂ کتاب کے اندراجات صفحہ ۲۸ کے نصف تک پھیلے ہوئے ہیں اس کے صفحات پر "ہر قسم کی نظم کا بیان" بطور اشارۂ مضمونِ گفتگو لکھا ہے

انتخاب دیوان ولی کا، انتخاب دیوان درد کا، انتخاب دیوان سودا کا مختلف شعرا کے منتخبات کے لئے بطور سرنامہ درج کیا گیا ہے۔ ذوق اور شاہ نصیر کے لئے اشعار ذوق اور اشعار نصیر لکھا گیا ہے۔ میر حسن اور مول چند کے انتخابات کے ساتھ " انتخاب مثنوی میر حسن کا "، اور انتخاب شاہنامہ مول چند کا بطور نمونہ عنوان موجود ہے۔ عنوانات و اشارات کی تحریر میں بے ضابطگی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ بعض مقامات پر چھپائی اتنی مدھم ہے کہ متن کی قرأت مشکل ہے۔ اغلاط کتابت کی درستی و تصحیح کا مناسب انتظام نہیں کیا گیا۔ ان ظاہری کوتاہیوں کے باوصف اس انتخاب کی اپنی تاریخی و ادبی اہمیت ہے اور صہبائی کے زمانہ کے بعض اہل ادب نے اس سے نمایاں طور پر استفادہ کیا ہے۔ مولوی کریم الدین کے تذکرۂ گلدستۂ نازنیناں میں اس سے خوشہ چینی کی واضح مثالیں سامنے آتی ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے دونوں تذکروں کے تقابلی مطالعہ سے اخذ کردہ نتائج کو پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

> تقابلی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ گلدستہ نازنیناں کو انھوں نے صہبائی کے انتخاب دواوین کے طرز پر مرتب کیا تھا غالباً صہبائی ہی کی تقلید میں شعرا کے حالات و انتخاب کلام کے ساتھ علم عروض و قواعد سے بحث کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن وہ ایسا نہ کر سکے آغاز شاعری سے متعلق بھی انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ انتخاب دواوین سے ماخوذ ہے یہی نہیں بعض شعرا

کے تراجم کا بیشتر حصہ حرف بہ حرف صہبائی کے تذکرے سے ہی کیا ہے فرق یہ ہے کہ صہبائی نے صرف ۲۱ ممتاز شعرا کا انتخاب کلام دیا ہے اور کریم الدین نے چند شعرا و شاعرات کا اضافہ کر کے ان کی تعداد ۲۷ کر دی ہے [1]

جن شعرا کا انتخاب اس میں شامل ہے ان کے کلام کے تحقیقی مطالعہ میں صہبائی کے اس انتخاب کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] اردو شعرا کے تذکرے : ۳۲۲

جامعہ کا مولانا محمد علی نمبر

مولانا محمد علی مرحوم کی شخصیت بڑی تہہ دار اور رنگا رنگ تھی اور ان کی ملکی و ملّی خدمات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ مگر افسوس کہ اردو میں کوئی ایسی کتاب نہیں ہے، جس میں ان کی سیرت و شخصیت اور قومی و ملی خدمات کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہو۔ ابھی حال میں ماہنامہ جامعہ کے دو خصوصی نمبر شائع کیے گئے ہیں جن میں بڑی تحقیق و جستجو کے بعد ایسے مضامین شائع کیے گئے ہیں جن میں مولانا محمد علی مرحوم کے حالات زندگی، سیاسی خدمات، صحافت اور شاعری پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

قیمت حصہ اول: آٹھ روپے   حصہ دوم: پانچ روپے

ماہنامہ جامعہ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

املین دو ڈے
تلخیص: انور صدیقی

محمد علی اور بپن چندر پال
ایک تلخ بحث ۱۹۱۹ – ۱۹۲۵ء

(بپن چندر پال، ۷ نومبر ۱۸۵۸ء کو سلہٹ کے ایک گاؤں پیل میں، جو اب بنگلا دیش میں ہے، ایک خوش حال کائستھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۷۴ء انٹرنس کا امتحان پاس کیا مگر کالج کے امتحان (۱۸۷۷-۷۸ء) میں دو مرتبہ فیل ہوئے اور یہیں پر تعلیم ختم ہو گئی۔ سیاسی میدان میں داخل ہوئے تو پہلے پہل سریندر ناتھ بنرجی کو اپنا گرو بنایا، مگر کچھ عرصے کے بعد ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور تلک، لاجپت رائے اور اربندو کے ساتھ کام شروع کیا، مہاراشٹر کے رانا ڈے کے اثرات بھی کسی حد تک قبول کئے۔ پہلی مرتبہ کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۸۸۶ء میں سلہٹ کے ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے شرکت کی، مگر اس کے بعد ایک طویل عرصے تک کانگرس سے بے تعلق رہے اور ۱۹۱۶ء میں دوبارہ کانگریس میں شرکت کی۔ انھوں نے اپنے زمانے میں اتحاد اسلامی اور خلافت تحریک پر شدید اعتراضات کئے۔ ۲۰ مئی ۱۹۳۲ء کو ان کا انتقال ہوا۔

مولانا شوکت علی کی بپن چندر پال سے جب پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی تو وہ ان کے خیالات سے بے حد متاثر ہوئے، چنانچہ انھوں نے اپنے ایک خط میں اپنے پیر و مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو لکھا کہ: "کریم گنج میں جو ضلع کی کانفرنس ہو رہی ہے، اس کے صدر بپن چندر پال تھے"

جناب املین دو ڈے (Amalendu De) جادو پور یونیورسٹی کلکتہ کے شعبہ تاریخ میں لکچرر ہیں اور اس مضمون کے مترجم جناب انور صدیقی جامعہ کالج کے شعبہ انگریزی میں ریڈر ہیں۔

انھوں نے خلافت میٹنگ میں شرکت کی اور بنگلہ زبان میں وہ تقریر کی جو کوئی مسلمان نہ کرتا۔ ان سے بہت امید ہے۔" (علی برادران مرتبہ رئیس احمد جعفری، صفحہ ۱۴۳)

چودھری خلیق الزماں صاحب نے بھی اپنی سوانح آپ بیتی "شاہراہ پاکستان" (مطبوعہ کراچی، اکتوبر ۱۹۶۷) میں بپن چندر پال کے متعلق ایک دلچسپ بات لکھی ہے۔ کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس ۸ر ستمبر ۱۹۲۰ء کو لالہ لاجپت رائے کی صدارت میں کلکتہ میں منعقد ہوا تھا جس میں گاندھی جی حکومت سے عدم تعاون کی تجویز پیش کرنے والے تھے اور بقول چودھری خلیق الزماں صاحب مسلمانوں کا خیال تھا کہ: "لالہ لاجپت رائے اور بپن چندر پال گاندھی جی کی مخالفت کریں گے اور جہاں تک ہو سکے گا وہ داس کو بھی گاندھی جی کی تائید سے روکیں گے۔ اس اجلاس میں مولانا محمد علی بھی شریک نہیں تھے کیونکہ وہ لندن سے، جہاں وہ خلافت وفد کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے، واپس نہیں آئے تھے اور کچھ ناگزیر حالات کی بنا پر ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں بھی شریک نہیں ہو سکے تھے۔" چودھری صاحب لکھتے ہیں: "اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی تو گاندھی جی نے اپنی عدم تعاون کی تحریک پیش کی جس میں انھوں نے اس تحریک کو صرف خلافت اور پنجاب کے مسئلے پر محمول کیا۔ جیسے ہی گاندھی جی نے اپنی تقریر ختم کی مسٹر بپن چندر پال فوراً کھڑے ہو گئے اور ترمیم پیش کی کہ خلافت کے مسئلے کے ساتھ سوراج کا لفظ بھی اس میں شریک کر دیا جائے۔ بپن چندر پال یہ سمجھتے تھے کہ مسلمان سوراج کے لفظ کی شرکت کو کبھی نہیں مانیں گے اور ان کو موقع مل جائے گا کہ وہ اس حالت میں نفس تجویز کی مخالفت کریں۔ گاندھی جی جواب میں صرف اتنا کہہ پائے تھے کہ: "وہ ہندو ہمدردی کا سودا نہیں کر رہے ہیں" کہ ہم لوگ سب مولانا شوکت علی کے پاس دوڑ پڑے اور ان سے کہا کہ آپ گاندھی جی کو یقین دلا دیں کہ ہم ترمیم کو قبول کرتے ہیں۔ مولانا شوکت علی نے کھڑے ہو کر گاندھی جی سے اپیل کی کہ آپ مسلمانوں کے دل نہ توڑیں اور ترمیم کو منظور کر لیں۔ چنانچہ گاندھی جی نے ترمیم کو قبول کر لیا اور بپن چندر پال کی اسکیم کا سارا تار و پود بکھر گیا۔" (صفحہ ۳۰۷)

(مدیر معاون)

یہ مقالہ انگلش مین اور کامریڈ کی فائلوں پہ مبنی ہے اور پانچ حصوں میں منقسم ہے (۱) کانگریس کا امرتسر اجلاس : بپن چندر اور مولانا محمد علی کی پہلی ملاقات (۲) بپن چندر مخالف گروہ میں (۳) دیش بندھو، مہاتما گاندھی اور علی برادران پر بپن پال کا حملہ (۴) مولانا محمد علی کا بپن پال کو جواب (۵) بحث کا خلاصہ ۔ اس مقالہ کا مقصد ان مباحث اور مسائل کا جائزہ لینا ہے جو ہندوستان کی جنگ آزادی کے دو ممتاز رہنماؤں کے درمیان بحث سے ابھر کر سامنے آئے ۔

مولانا محمد علی اور بپن چندر پال ۱۹۱۹ء میں کانگریس کے امرتسر کے اجلاس کے موقع پر ایک دوسرے سے پہلی بار ملے ۔ اس ملاقات کا ذکر خود مولانا محمد علی نے کیا ہے۔ ہندوستان کے مسائل سے متعلق بپن چندر پال کی تحریروں اور تقریروں سے محمد علی پہلے سے ہی واقف تھے ۔ محمد علی کم مشہور نہیں تھے۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے سلسلے میں ان کی شہرت ملک گیر حیثیت اختیار کر چکی تھی ۔ چنانچہ بپن چندر پال نے ان کا "انتہائی گرمجوشی" سے استقبال کیا۔ اجلاس کے دوران ان کے درمیان مکمل اتحاد کار تھا۔ دونوں نے مل کر مہاتما گاندھی اور تلک اور دیش بندھو کے درمیان مفاہمت کی راہ ہموار کی۔ دونوں ہی نے اصلاحات کے غیر تسلی بخش ہونے کے سلسلے کی تجویز میں ترمیم پیش کی ۔ اس تجویز میں جو مسئلہ زیر بحث تھا وہ یہ تھا کہ برطانوی حکومت کی مجوزہ اصلاحات کے سلسلے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے ۔ ان پر عملدرآمد میں نوکر شاہی سے تعاون کیا جائے یا عدم تعاون ۔

اس موقع پر مولانا محمد علی نے بپن چندر پال سے پوچھا کہ آخر انھیں اسلام کے نظریہ قومیت سے اس قدر اختلاف کیوں ہے جب کہ یہ نظریہ، قومیت کے محدود مغربی تصور سے کہیں آگے کی بات ہے انھیں اس بات پر حیرت تھی کہ مغرب کا اتنا وسیع تجربہ رکھنے کے باوجود انھوں نے اسلامی نظریۂ قومیت کے سلسلے میں کم و بیش وہی رویہ اختیار کیا جو مغربی سامراج پسندوں نے اختیار کر رکھا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران بپن چندر پال اپنی "اسلام دشمن" تحریروں پر اس تبصرے سے کچھ پریشان سے ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنے خیالات کا دفاع کرنے کے بجائے معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا اور مسکرا کر مولانا محمد علی سے کہا کہ یہ سب کچھ "غلط فہمی" کا نتیجہ تھا اور انھیں اس سلسلے میں "پریشان" ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ محمد علی اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئے پھر بھی چونکہ امرتسر اجلاس میں مکمل یگانگت کی فضا تھی، انھوں نے اس بحث میں الجھنا مناسب نہیں سمجھا۔ لہٰذا انھوں نے بات کو طول نہیں دیا ۔

امرتسر اجلاس کے ایک ماہ کے اندر ہی مولانا محمد علی نے ترکی کے سلسلے میں برطانوی طرز عمل میں تبدیلی

پیدا کرنے کے مقصد سے ہندوستانی خلافت وفد کی قیادت کی اور یورپ کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ انھوں نے اس مقصد کے پیش نظر لائڈ جارج کو ایک عرض داشت بھی پیش کی۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے خصوصی اجلاس کے اختتام کے بعد وہ ہندوستان واپس لوٹے۔ اس اجلاس میں عدم تعاون کی تجویز پاس کی گئی۔ اس تجویز کا مسودہ مہاتما گاندھی نے مولانا شوکت علی اور دوسرے خلافتی کارکنوں کے مشورے سے تیار کیا تھا۔ اس تجویز کی مخالفت لالہ لاجپت رائے، سی آر داس، بپن چندر پال، اینی بیسنٹ، پنڈت مالویہ اور محمد علی جناح نے کی۔ اس اجلاس کے دوران پہلی بار مسلمانوں نے انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ جماعتی حیثیت سے کانگریس کی مکمل ہم نوائی کی۔

۱۹۲۰ء میں عدم تعاون کی تجویز ناگ پور کے اجلاس میں توثیق کے لئے پیش کی گئی۔ اس تجویز سے اختلاف رکھنے والے بہت سے افراد یہاں جمع ہوئے تھے مگر چونکہ سی آر داس نے اپنی رائے بدل دی تھی اور گاندھی جی کی حمایت کا فیصلہ کر لیا تھا، یہ تجویز بآسانی سے پاس ہو گئی۔ گاندھی جی اور سی آر داس کو قریب لانے میں مولانا محمد علی نے ایک اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۲۰ سے ۱۹۲۵ء کے دوران بپن چندر پال نے ہندوستانی سیاست میں سی آر داس کی سرگرمیوں پر کئی تنقیدی مضامین لکھے۔ ناگ پور اجلاس کے بعد سے داس اور پال دو الگ راہوں پر گامزن ہو گئے۔

بپن پال کے گاندھی جی اور علی برادران کے خلاف بھی مضامین انگلش مین میں شائع ہوئے۔ ان میں بپن پال کے سیاسی افکار واضح طور پر موجود ہیں۔ ۱۶ر جون ۱۹۲۵ء کو سی آر داس کے انتقال کے بعد پال نے کچھ ایسے تبصرے کئے جو مولانا محمد علی اور ان کے درمیان نزاع اور تلخی کا سبب بنے۔ گاندھی جی نے سی، آر، داس کو خراج عقیدت پیش کیا اور انھیں "سیکڑوں جنگوں کا سورما" اور "انسانوں میں دیو پیکر" قرار دیا۔ بپن چندر پال نے ایک طویل مضمون لکھا جس میں گاندھی جی اور سی، آر، داس کے رول پر بحث کی گئی تھی۔ انھوں نے گاندھی جی پر شدید حملہ کیا اور ان پر الزام عائد کیا کہ وہ سوراج پارٹی کا براہ راست چارج لینا چاہتے ہیں اور دیش بندھو کی موت نے جو خلا پیدا کیا ہے اسے پُر کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ملک کے کسی اور حصے میں تو قیادت کر سکتے ہیں مگر ان کا "سرد سنتوں" کا سا انداز جذباتی بنگالیوں کے لئے کشش سے محروم رہے گا۔ ان کی رائے تھی کہ عدم تشدد کا مسلک بنگال کی اکثریت کے لئے اجنبی ہے۔ بنگالی سیاسی اور مذہبی دونوں لحاظ سے مطلق عدم مزاحمت کے تصور کو قبول نہیں کر سکتے۔ اگر گاندھی جی دیش بندھو کی گدی پر قبضہ جما لیتے ہیں تو اس کے نتائج تباہ کن

ہیں گے۔ چنانچہ انھوں نے بنگالیوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اپنی سیاست میں اس "بیرونی حملے" کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ یہاں "بیرونی حملے" سے بپن چندر پال کی مراد بنگال میں گاندھی جی کی سیاسی سرگرمیوں سے ہے۔

اسی زمانے میں بپن چندر پال نے ایک اور مضمون لکھا جس کا عنوان تھا:

"The Problem and the Situation : Extra territorial Patriotism."

جو ۲ جولائی ۱۹۲۵ کے "انگلش مین" میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں اور بہت سے معاملات کے علاوہ انھوں نے "علی برادران" کے سیاسی رول کو بھی تنقید کا ہدف بنایا۔ پال نے لکھا کہ موجودہ قومی سیاست کی سب سے بڑی لعنت "ابہام اور پریشان ذہنی ہے۔" "گزشتہ پانچ سال میں شعوری طور پر غور و فکر کی صلاحیت کو ختم کیا گیا ہے۔" ۱۹۲۰ء میں کانگریس نے ایک نئے مسلک اور ایک نئے دستور کو قبول کیا۔ قومی تحریک کا مقصد 'سوراج' کے حصول کو قرار دیا گیا۔ گاندھی جی نے نہ تو خود اور نہ ہی کسی اور کو اس بات کی اجازت دی کہ وہ 'سوراج' کے تصور کی وضاحت کر سکے۔ اس عدم وضاحت کی وجہ بپن چندر پال کو مولانا محمد علی نے عدم تعاون تحریک کے دورِ شباب میں بتائی تھی اور اس گفتگو کی روشنی میں بپن چندر پال نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ 'سوراج' کی وضاحت اس لیے نہیں کی جاتی کہ جس لمحے یہ کام ہوگا کانگریس کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔

بپن چندر پال کی رائے ہے کہ قومی تحریک کے مقاصد کو جان بوجھ کر مبہم رکھا گیا تھا۔ ان کے خیال میں علی برادران جیسے ہوشیار سیاست داں عدم تعاون کی تحریک کے زمانے میں اس ابہام سے ضرور واقف رہے ہوں گے مگر اسے وہ کیوں دور کرتے۔ ان کا مقصد تو "صرف موجودہ حکومت" کو تباہی سے ہمکنار کرنا تھا۔ باقی معاملات کو وہ مستقبل پر چھوڑ دینا چاہتے تھے۔ علی برادران نے اپنے "حقیقی مقاصد پر کبھی پردہ بھی نہیں ڈالا۔" پال نے لکھا ہے کہ "علی برادران کے مقاصد ایمان داری سے سیاسی نہیں بلکہ مذہبی رہے ہیں۔" علی برادران نے کبھی اس بات کا دعویٰ بھی نہیں کیا کہ وہ ان معنوں میں قوم پرست ہیں جن معنوں میں یہ لفظ دنیا بھر میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لفظ کے جو معنی ہندوستان کے قومی افکار کے خالقوں کے ذہن میں رہے ہیں، ان سے علی برادران کو کوئی علاقہ نہیں ہے۔" وہ "مسلمان پہلے اور ہندوستانی بعد میں ہیں"۔ ان کی "وطن دوستی علاقائی نہیں غیر علاقائی ہے۔" پال نے یہ بات بہت زور دے کر کہی کہ "قوم پرستی اور غیر علاقائی وطن پرستی کا ساتھ نہیں ہو سکتا۔" غیر علاقائی وطن دوستی کو "پان اسلام ازم" کا نام دیا گیا تھا۔ اس تحریک کا مقصد بقول پال "صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کی عظیم سلطنت میں سے جو کچھ ان کے پاس رہ گیا ہے اسے غیروں کے

غاصبانہ عزائم سے بچایا جائے۔" یہ مقصد مسلم ریاستوں کے ایک وفاق کی تشکیل کے ذریعہ ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ علی برادران کی غیر علاقائی وطن دوستی کا مرکز و محور یہی مقصد تھا۔ بقول پال "غیر علاقائی وطن دوستی کی یہ منطق صریحاً قوم دشمن ہے" پان اسلام ازم کے ہندوستانی علم برداروں کو "اس بات سے حقیقی دلچسپی نہیں تھی کہ ملک کی سیاسی بے چینی کا جلد کوئی پُرامن حل نکلے اور برطانوی شاہ کے زیر سایہ ایک ذمہ دار حکومت کا قیام عمل میں آئے۔ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ خلفشار کو طول دیا جائے تاکہ براعظم میں ایک انقلاب رونما ہو اور وہ اس انقلاب کے سہارے ہندوستان پر غلبہ حاصل کرلیں اور ہندوستان کے وسائل تین براعظموں میں نئی خلافت کے قیام کے خواب پورے کرنے پر صرف کریں"

بپن چندر پال کو شبہ تھا کہ غیر علاقائی وطن دوستی کی تحریک ملک کے لئے مہلک ثابت ہوگی۔ ان کی رائے میں یہی عناصر حقیقی سوراج کے تصور کی وضاحت کی راہ میں دشواریاں پیدا کر رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ لفظ سوراج کی وضاحت کی جائے اور اس سے مراد ایک ایسی حکومت ہو جو عوام کی ہو، عوام کے لئے ہو اور عوام کے ذریعہ ہو۔ صرف اسی صورت میں عوام ہندوستانی بورژوا استحصال سے بچ سکیں گے۔ پان اسلامی استحصال سے بھی محفوظ رہیں گے اور ان طبقات سے بھی باخبر رہیں گے جن کے زخم خوردہ عزائم نئی سیاسی بیداری نے تازہ کر دئے ہیں اور جو یہ خواب دیکھ رہے ہیں کہ 'سوراج' انھیں ایک ایسا موقع فراہم کرے گا کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی سلطنتوں کی بازیابی میں کامیاب ہو سکیں"

بپن چندر پال کے سیاسی افکار اس نزاع سے بھی ظاہر ہوتے ہیں جو سوراج کی وضاحت کے سلسلے میں مختلف موقعوں پر رونما ہوئی۔ ان کا سیاسی آدرش "حقیقی ذمہ دارانہ حکومت" کا قیام تھا —— ایک ایسی حکومت جو برطانوی سلطنت کے حدود میں ہو۔ ان کا خیال تھا کہ فی الحال ہندوستانی عوام حکومت سنبھالنے کی ذمہ داری کے اہل نہیں ہیں اس لئے، ان کے خیال میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستان کے گاؤں میں، عوام کی تربیت کی خاطر عام بالغ رائے دہندگی کے اصولوں پر مبنی اداروں کا قیام عمل میں آئے۔ اس تربیت اور تجربے کے بعد ہی سوراج کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے، اس سے پہلے نہیں۔ انھیں خوف تھا کہ پان اسلام ازم کے نام لیوا سیاسی انتشار اور ابہام سے فائدہ اٹھاکر، برصغیر پر تسلط جمالیں گے اور خلافت کا پرچم لہرا دیں گے۔ یہ بات واضح ہے کہ بپن چندر پال برطانوی سلطنت کی بقا کے اس وجہ سے حامی تھے کہ یہ سلطنت ہی پان اسلامی خطرے سے ملک کو محفوظ رکھ سکتی تھی۔

مہاتما گاندھی کے خلاف الزام تراشیوں اور بپن پال کی مسلم دشمنی سے مولانا محمد علی کو سخت تکلیف پہنچی اور خصوصاً بپن پال کے خلاف قلمی جہاد کا فیصلہ کر لیا جس کے نتیجہ میں وہ نزاع سامنے آئی جس میں محمد علی نے کھل کر طنز و تضحیک کے نشتر استعمال کئے۔

بپن چندر پال کے ۳ر جولائی کے مضمون کی اطلاع انھیں امرت سر میں منعقد ہونے والی آل انڈیا مسلم پارٹیز کانفرنس سے واپسی پر ملی۔ چونکہ مولانا محمد علی خلافت کمیٹی کی میٹنگ کی وجہ سے خاصے تھکے ہوئے تھے، انھوں نے اپنے سکریٹری حفیظ الرحمن کو ہدایت کی کہ وہ بپن چندر پال کو خط لکھیں اور ان سے گزارش کریں کہ وہ اپنے مضمون کی ایک کاپی انھیں بھیج دیں۔ یہ خط ۲۲ر جولائی ۱۹۲۵ء کو لکھا گیا۔ بپن پال کے بیٹے جنجن پال نے ۲۵ر جولائی کو جواب لکھا کہ ۲۲ر جولائی کا ان کا خط ضروری کارروائی کے لئے انگلش مین کے منیجر کو بھیجا جا رہا ہے جنجن پال نے خط میں یہ بھی لکھا کہ ان کے والد کو اس بات کی بڑی تکلیف ہے کہ محمد علی نے بغیر کسی قسم کی تحقیق کے کامریڈ میں ان کے والد کے بارے میں یہ بہتان تراشی کی کہ انھوں نے سی آر داس کے وکالت ترک کرنے کے فوراً بعد اپنی خدمات انگلش مین کی خدمت میں پیش کر دیں۔ اس "کریہہ جھوٹ" کی تصدیق انگلش مین کی فائلوں کے مطالعہ سے کی جا سکتی ہے۔ پاری سال کی صوبائی کانفرنس میں سوراجیوں اور عدم تعاون کے حامیوں نے بپن پال کے صدارتی خطبہ میں پیش کی جانے والی پالیسیوں اور اصولوں کی مخالفت کی۔ اس کانفرنس کے چند مہینوں بعد یہ صورت پیدا ہوئی کہ انگلش مین نے اپنے صفحات آزادانہ رائے کے اظہار کے لئے پیش کئے۔ یہ پیش کش انھوں نے اس وجہ سے قبول کر لی کہ کلکتہ کے وہ اخبارات جو کبھی بے تابی سے ان کے مضامین کے منتظر رہتے تھے، انھیں اب یہ موقع نہیں دے رہے تھے"۔ بپن پال اگرچہ مولانا محمد علی کے بعض خیالات سے اختلاف رکھتے ہیں، مگر پھر بھی وہ کبھی یہ نہیں سوچ سکتے کہ وہ ان کے شخصی کردار پر اس قسم کا رکیک حملہ کریں گے۔ اس خط سے بپن پال کی آزردگی نمایاں ہے۔

مولانا محمد علی نے کامریڈ کی ۲۶ر جون کی اشاعت میں جو مضمون لکھا تھا، وہی بقول محمد علی بپن پال کے مضمون کا محرک بنا۔ اس مضمون میں پال نے سوراج، قوم پرستی اور اسلام کے سلسلہ میں ان کے خیالات "بالکل غلط انداز" میں پیش کئے ہیں۔ مولانا محمد علی نے خاص طور پر غیر علاقائی وطن دوستی کے سلسلے میں اپنے خیالات پر تنقید کا ذکر کیا ہے۔ بپن پال کے مضمون سے جو انگلش مین کی ۳ر جولائی ۱۹۲۵ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا اپنے احساسات پیش کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے انتہائی تند و تیز جواب لکھا اور تمام الزامات کی مدلل تردید کی۔ یہ جواب ایک مضمون کی شکل میں ہے جس کا عنوان ہے: "ایک ناخوش گوار خط و کتابت" اور جو ۳ر ستمبر

کے کامریڈ میں شائع ہوا تھا۔ مولانا محمد علی نے لکھا کہ " غیر علاقائی وطن دوستی " کی ترکیب ان کی اپنی وضع کی ہوئی نہیں ہے۔ یہ ترکیب مسٹر مانٹیگو نے بحیثیت انڈر سکریٹری برائے ہند، برطانوی دار العوام میں ہندوستانی بجٹ پر یا مورلے منٹو اصلاحات پر تقریر کرتے ہوئے استعمال کی تھی اور کہا تھا کہ " ہندوستانی مسلمانوں کو اپنی غیر علاقائی وطن دوستی میں شمہ برابر کمی نہیں کرنی چاہیے۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ اس میں کچھ عناصر علاقائی وطن دوستی کے بھی شامل کر لیں۔" اس کے علاوہ بپن پال نے پان اسلام ازم پر مولانا محمد علی کے خیالات کی غلط تعبیر کی ہے۔ مولانا محمد علی لکھتے ہیں کہ انھیں نہیں معلوم کہ بپن پال نے اس سلسلہ میں کس کا اقتباس پیش کیا ہے۔ انھوں نے یہ لکھا کہ پان اسلام ازم ان کی نظر میں اسلامی اخوت ہے یا خود اسلام ہے۔ انھوں نے یہ بات بھی کہی کہ " وہ عوام کی سرکار، عوام کے ذریعے اور عوام کے لئے چاہتے ہیں۔ وہ ایک ایسی حکومت نہیں چاہتے جس میں یا تو ہندوستانی بورژوا طبقہ جس کے فرد خود پال ہیں، یا پان اسلام ازم کے علم بردار جن میں وہ شامل ہیں ہندوستان کا استحصال کر سکیں۔ اس حکومت کے ذریعہ وہ ان لوگوں کے "دن سپنوں" کی تکمیل نہیں چاہتے خواہ وہ ہندو ہوں، مسلمان ہوں یا سکھ ہوں جو اپنے شکست خوردہ عزائم کے ساتھ صرف ایسے موقعوں کی فکر میں رہیں کہ وہ کس طرح اپنی کھوئی ہوئی سلطنتوں کو دوبارہ تعمیر کر سکتے ہیں؟

مولانا محمد علی "سفید نوکر شاہی" کے غیر ضروری تسلسل کے حق میں نہیں ہیں، وہ یہ چاہتے تھے کہ یہ لعنت جلد ختم ہو جائے۔ ان کے اپنے جمہوری سوراج میں سفید نوکر شاہی کے لئے گنجائش نہیں ہے۔ بپن پال " جمہوری سوراج انگلش مین کے کالموں کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ اس طرح صرف بورژوا نظام قائم کر سکتے ہیں۔ ان میں اس بات کی صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ عوام کو حکومت سنبھالنے کی تربیت دے سکیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بپن پال ایک مرتبہ جیل گئے، اس کے بعد وہ جیل جانے کے تصور سے اسی طرح گھبرانے لگے جیسے چارلس دوم ایک بار سفر پہ گیا اور پھر دوبارہ سفر پہ جانے کی ہمت ہی کھو بیٹھا۔ اسی وجہ سے بپن پال نے HARF STREET یا چورنگی کے دفتر میں پناہ لے لی جہاں دوسرے ہندوستانیوں کے خلاف ان کی تلخ گفتاری کی داد ملتی ہے، جہاں سے وہ حکومت کی اسی طرح مدد کرتے ہیں جیسے لبرل اور ٹوڈی حکومت نوازی کرتے ہیں، جہاں ان کے ' آناتانہ نقطۂ نظر ' سے حکومت برہم و برافروختہ نہیں ہوتی۔ وہ ان کے ' بھونکنے ' کو صرف یہی نہیں کہ برداشت کرتی ہے، بلکہ اسے پسند بھی کرتی ہے اس لئے کہ اسے معلوم ہے کہ ان میں ' کاٹنے ' کی سکت نہیں ہے۔"

اس کے بعد مولانا محمد علی نے کہا کہ اگرچہ بپن پال نے ' جمہوری سوراج ' کے معنی بالغ رائے دہندگی کے

لئے ہیں۔ پھر بھی ان کا خیال ہے کہ ابھی ملک میں اس اصول کو رائج نہیں کیا جا سکتا جب کہ "غریب یان اسلامی محمد علی سے تا اپنی غیر علاقائی وطن دوستی کے باوجود کھل کر کل جماعتی کانفرنس اور اینی بیسنٹ کے کامن ویلتھ آف انڈیا بل پر بحث کے دوران بالغ رائے دہندگی کا مطالبہ کیا۔" بپن پال "موجودہ نوکر شاہی کے ہاتھوں سے اقتدار چھیننے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے اس لئے کہ وہ اس کوشش کے نتائج سے ڈرتے ہیں۔"

۳۰ جولائی ۱۹۲۵ء کے انگلش مین میں بپن پال کے مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے لکھا کہ بپن پال اسلام اور ہندوستان پران کے خیالات سے بالکل واقف نہیں ہیں اور ان کا پورا مضمون غلط بیانیوں کا ایک انبار ہے۔ انھوں نے محمد علی کی ایک سطر کا بھی حوالہ نہیں دیا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ایک مرتبہ پال نے مولانا محمد علی سے یہ گذارش کی تھی کہ وہ 'بنگالی' کے لئے ایک مضمون اسلامی تصور ریاست اور ہندوستانی قومیت کے موضوع پر لکھیں۔ اس وقت مولانا نے اپنی مصروفیات کے پیش نظر ان سے معذرت کر لی تھی۔ اس کے بعد بپن پال دہلی تشریف لائے۔ اگر وہ اس موضوع پر ان کے خیالات سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ایسے ہی مشتاق تھے تو وہ مولانا محمد علی سے مل کر یہ سب کچھ جان سکتے تھے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ "قومیت اور خدائی حاکمیت کے تصور" پر لکھتے ہوئے مولانا نے کہا: "خدائی حاکمیت کا تصور تقریباً ہر مذہب میں ملتا ہے۔ ہاں، ان مذاہب میں نہیں ملتا جو صرف چند فرسودہ رسوم اور عبادات کا انبار بن کر رہ گئے ہیں۔ قوم پرستی کی اصلاح کے لئے اگر عالمی اخوت کا وسیع تر تصور موجود نہ ہو اور اس کا مطلب صرف یہ ہو کہ "میرا ملک، خواہ صحیح ہو یا غلط"، تو پھر یہ نظریہ انسانیت کے لئے ایک لعنت بن جاتا ہے۔ گزشتہ جنگ نے یہ بات بخوبی واضح کر دی ہے۔ بقول محمد علی انھیں معنوں میں یہ بات کہی گئی ہے کہ "خدا نے انسانیت بنائی اور شیطان نے قوم۔" وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ غیر مسلم ہندوستانی ان کے مذہبی عقائد و اعمال کے سلسلے میں رواداری برتیں اور مسلمان یکساں طور پر غیر مسلموں کے عقائد و اعمال کو گوارا کریں۔" محمد علی اس بات کے خواہش مند نہیں تھے کہ وہ غیر مسلموں پر وہ ذمہ داریاں عائد کریں جو ایک مسلمان کی حیثیت سے اسلام ان پر عائد کرتا ہے۔" اسی طرح وہ کسی ایسی پابندی کو برداشت کرنے سے انکار کرتے ہیں جو ایک غیر مسلم مسلمانوں پر عائد کرنے کی کوشش کرے۔" وہ ان لوگوں سے اختلاف کرتے ہیں جو 'ہندو' 'ہندوستانی' اور مسلم ہندوستانی کی اصطلاحات میں گفتگو کرتے ہیں۔ اسلام سے اپنی واقفیت کی بنیاد پر وہ لکھتے ہیں کہ یہ بات کسی طرح بھی ایک مسلمان پر لازم نہیں آتی کہ وہ غیر مسلم رعایا پر مسلم حاکم کی مرضی کو مسلط کر دے۔ اسی طرح ایک غیر مسلم حکمراں کی حکومت کو ایک مسلمان اس وقت تک درہم برہم کرنے کی کوشش نہیں کرے گا جب تک کہ اسے اپنے خدا کے احکامات بجا لانے کی آزادی

حاصل رہے گی۔ ۹

مولانا محمد علی "سوراج"، "سودھرم" میں کوئی تضاد نہیں دیکھتے۔ وہ "سودھرم" کی بنیاد پر "سوراج" حکومت کا قیام چاہتے ہیں جو تمام مذاہب کو مکمل آزادی کی ضمانت دے سکے انھیں اس بات کا یقین ہے کہ "خدائی حاکمیت" اور مسیحی اور ہندو نظریۂ حاکمیت میں عدم مطابقت نہیں ہے۔ انھوں نے بات بھی کہی کہ "ایک ایسے ملک میں جہاں سوراج حکومت "سودھرم" کی ضمانت دے، ایک مسلمان کے لئے حکومت سے وفاداری میں کوئی مشکل نہیں پیش آنی چاہئے خواہ حکومت مسلمان ہو یا غیر مسلم۔"

اس ساری تاریخ کے پس پشت قومی جدوجہد کے مسائل رہے ہیں۔ خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کے زمانے میں گاندھی جی، قوم پرستوں اور خلافت کے علم برداروں کے سامنے صرف ایک مسئلہ رہا ہے وہ یہ کہ کس طرح ایک ایسی مشترکہ قومیت وجود میں آئے جس میں ہر طرح کے مذہبی گروہوں کو اپنا انفرادی تشخص برقرار رکھنے کی آزادی ہو۔ اسی مقصد کے پیش نظر مولانا محمد علی نے "پان اسلام ازم"، ہندوستانی قومیت اور سوراج کے تصور کا تجزیہ کیا، اسلام کے بنیادی اصولوں کو محفوظ رکھتے ہوئے، انھوں نے ایک ایسے نئے ہندوستان کی بات کہی جس میں مختلف مذاہب کے تمام لوگ گروہ سکون اور خوش آہنگی کی فضا میں زندگی گزار سکیں۔ ان کی رائے میں ہندوستان جیسے ملکوں میں جہاں بہت سے مذہبی گروہ آباد ہیں، نجات کی صرف یہی صورت ہے کہ یہاں سوراج حکومت قائم کی جائے جو سب کو "سودھرم" کی ضمانت دے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ یہ چاہتے تھے کہ سب سے پہلے ہندوستان آزاد ہو۔ بپن پال جیسے لوگ یہ چاہتے تھے کہ دور غلامی میں ہی آئندہ کے آزاد ملک کے دستور پر اتفاق رائے ہو جائے۔ مولانا محمد علی کو اس بات سے اختلاف تھا۔ وہ آزادی سے پہلے دستور سازی کے عمل کو فعل عبث سمجھتے تھے۔ بپن پال کو علی برادران کی قیادت پر بھروسہ نہیں تھا۔ وہ ان کی نیت کے سلسلے میں مشکوک تھے۔ اس زمانے کے سیاست دانوں کے سامنے جو اہم مسائل تھے، وہ یہ تھے: کثیر المذہب ہندوستان میں جہاں سیاسی مسائل مذہبی مسائل سے اس طرح پیوست ہوں، سیاسی مسائل کس طور پر حل کئے جائیں؟ کیا ایک مسلمان کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کو ترک کرکے ہندوستانی قومیت کے اصولوں سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرلے، ہندوستانی مسلمانوں کو تحریک آزادی کے بنیادی دھارے میں کس طرح شامل کیا جائے؟ ان مسائل کے سلسلے میں بپن پال خاموش رہے اس بات میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ مولانا محمد علی نے ان مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد کی۔ انھیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ملک کے سامنے ایک ایسے سیاسی نظام کی تشکیل کا مسئلہ تھا جس میں تمام مذاہب کو

برگ وبار لانے کی حمایت حاصل ہو۔ اگر ہم مولانا محمد علی اور بپن پال کے سیاسی افکار کا موازنہ کریں تو معلوم ہوگا کہ محمد علی کے افکار بپن پال کے افکار سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ بپن پال نے جو باتیں کہی ہیں یا مولانا محمد علی نے جس طرح اپنے خیالات کی وضاحت کی ہے اس سے کسی طرح بھی یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا محمد علی "فرقہ پرست" تھے یا اُن کے یہاں اسلامی افکار "قومیت دشمن" تھے۔ اس بات کو تسلیم کرنا ہوگا کہ بپن پال نے مولانا محمد علی کے مضامین کا سنجیدگی سے مطالعہ کئے بغیر ان پر الزامات عائد کر دیے۔ جو کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔

ان سب باتوں کے علاوہ مولانا محمد علی کے سیاسی افکار میں بعض کوتاہیاں بھی تھیں جن کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے سامراج کے خلاف جنگ صرف اس وجہ سے لڑی کہ وہ خلافت اور مقامات مقدسہ کے لئے ایک خطرہ تھا۔ تحریک کا سارا زور انھوں نے مذہبی بنیادوں پر دیا۔ سامراج کے اقتصادی اور سیاسی نتائج کو سمجھنے اور ان کی روشنی میں اس کی مخالفت کی سنجیدہ کوشش مولانا محمد علی کے یہاں نظر نہیں آتی۔ ایک مخصوص تاریخی تناظر میں اگرچہ انھوں نے سامراج دشمن اور قوم پرست رجحان کو فروغ دیا پھر بھی ان کا یہ رویّہ آگے چل کر خطرناک ثابت ہوا۔ اس رویّہ کی وجہ سے مسلمانوں میں سیاسی مسائل کو مذہبی رنگ میں دیکھنے اور برتنے کا رجحان راسخ ہوا۔ اس کے علاوہ عوام میں جدید، سیکولر، ذہن پیدا نہیں کر سکے۔ یہ رویہ "سوراج" اور "سودھرم" کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے انتہائی ضروری تھا۔ اگر محمد علی جیسا رہنما یہ کام انجام دیتا تو اس بات کی امید کی جا سکتی تھی کہ ایک نیا ہندوستان جنم لے گا ——— ایک ایسا نیا ہندوستان جس کی تعمیر کے لئے مولانا محمد علی نے جدوجہد کی اور دکھ جھیلے۔

محمد دستگیر خاں

مُسافرِ حیات

انسان! کائنات میں زندگی کا مسافر ہے۔ اور عالم کائنات زندگی کے سفر کا میدان اور منزلِ گاہ، آخرت کا مقام، علم و عمل، ایقان و ایمان، کتاب زندگی کے اوراق، نشیب و فراز، رنج و غم، خوشی و انبساط، دکھ سکھ، کتاب زندگی کے صفحات، چنانچہ خالقِ کائنات نے مکتب خانہ عالم میں انسان کو طالب علم کی حیثیت سے علم لدنی کی صلاحیت کے ساتھ "معلم الملکوت" کا مسجود بنایا اور انبیائے مرسلین کو "معلم المخلوق" ٹھہرایا۔ مقاصد کو نصابِ تعلیم کا درجہ دیا۔ قرآن پاک کو مکمل ضابطۂ حیات اور کائنات کا حتمی دستور بنا کر نازل فرمایا اور مبلغ قرآن کو خاتم المرسلین کا منصب عطا کیا، جب سے یہ مسافر مسافرت میں آیا ہے۔ اس کی زندگی کو کسی طرح سکون و قرار نہیں کیونکہ یہ اس کی فطرت نہیں، حرکت اس کی زندگی کی علامت، سکون و قرار موت کا نشان، جوں ہی یہ وجود پاتا ہے تو سفر پر رواں دواں ہو جاتا ہے کائنات اس کے عقب میں آخرت آگے ہوتی ہے، رفتہ رفتہ یہ پیدائش سے دور موت و قبر سے قریب ہوتا جاتا ہے، دنیا کے بازار سے گزرتا، آخرت کے میلے کی طرف بڑھتا جاتا ہے، گو اس کے جسم و جان کو بظاہر سکون و قرار دکھائی دیتا ہے مگر سفر زندگی کے سلسلۂ پیہم کو کسی طور سکون و قرار نہیں، یہ چلتا ہے تو وہ چلتی ہے یہ سوتا ہے تو وہ چلتی ہے، بیٹھتا بولتا ہے تو چلتی ہے۔ غرضکہ چلنا اس کا کام ہے کوئی راہ گیر و مسافر ایسا نہیں جو کہیں نہ ٹھہرتا اور نہ دم لیتا ہو، لیکن حیاتِ انسانی کا

جناب ابو الاختر محمد دستگیر خاں، یوسف زئی، داراب منزل، نیما ہیڑہ (راجستھان)

یہ مسافر وہ راہ رو اور راہ گیر ہے جو منزلِ مقصود (موت) ہی پر پہونچ کر تھمتا اور دم
لیتا ہے۔ اور زندگی کی تمام مشکلات کو برداشت کرتے ہوئے مصروفِ سفر رہتا ہے۔
ایک بار ٹھہر کر اس کی زندگی چلنا نہیں جانتی اور اپنے خالق سے جلد ملنا چاہتی، جیسا کہ
ارشاد ہے۔ یٰاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۚ پ۳۰
اے انسان تو دنیا کی راہ میں محنت و مشقت سے گذرتا ہوا اپنے پروردگار کی جانب چلا
جا رہا ہے۔ پس تو اس سے جا ملے گا۔ اسی لئے آخرت کو "دار القرار" کہا جاتا ہے۔
انسان کا بچپن، جوانی، بڑھاپا، زندگی کی منزلیں اور راہِ سفر کی علامات، دن
رات کا چکر، ماہ و سال کا شمار گو سفرِ زندگی کی نشاندہی کراتی ہیں مگر قرآن کی تدریس
سے زندگی کا ہر سانس باعثِ زندگی ہے۔ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ۚ پ۱۶ مریم۔
کہ ہم ان کے سانس گن رہے ہیں۔ حقیقت میں سانس ہی مدارِ زندگی ہے اور اس کی آمد
شد پر یہ قائم دائم ہوتی ہے۔ انسان تو سمجھتا ہے کہ اس نے زندگی کا ایک دن گذارا۔ مگر
خالق فرماتا ہے کہ اس نے زندگی کے کتنے ہی سانس لے ڈالے پھر جو نہیں سانس رکا
اور زندگی کے سفر کا خاتمہ ہوا اور وہ دوسرے ہی عالم میں قدم رکھتا ہے۔ ابھی یہاں
تھا، ابھی وہاں ہوتا ہے۔ جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ اور سانس کی حقیقت تارِ
عنکبوت سے زیادہ نہیں، پھر بھی انسان نہیں سوچتا اور غور و فکر سے کام نہیں لیتا۔
کہ خالقِ کائنات کے حضور اس سفر کا کیا توشہ لے کر جا رہا ہے۔ اے دنیا کے
مسافر! جہاں تیرا یہ سفر اختتام کو پہونچے گا اور اپنے پروردگار کے حضور دم لے گا
اور تجھ کو ابدی قرار نصیب ہوگا تو تو نے وہاں کے لئے کچھ اسباب راحت اور سامان
مسرت بھی جمع کیا کہ نہیں۔ اے غفلت میں سونے والے انسان! یہ تیری زندگی
عاقبت کی کھیتی ہے، اس کو سینچ لے، یہیں سے عقبیٰ کے لئے سامانِ راحت و اطمینان
ساتھ لے چل، ورنہ سخت پشیمان ہوگا۔ اور وہاں تیرا بھی تیرے کوئی کام نہ آئے گا۔
اپنے بھی پرائے بن جائیں گے۔ منہ پھیر لیں گے، آہ! بے کسی کا وہ دن ہوگا۔ کہ
کسی نے اس سے پہلے نہ دیکھا ہوگا۔ ہر ایک کو اپنی پڑی ہوگی، نفسی نفسی کا عالم ہوگا

عزیز عزیز کا ساتھی نہ ہوگا، دوست دوست کا مددگار و غمخوار نہ رہے گا۔ بھائی بھائی کو دغا دے گا۔ اولاد ماں باپ سے پھر جائے گی۔ خاوند اپنی بیوی اور اپنی اولاد تک سے بیزار ہوگا۔ یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ (پ۳۰ سورہ عبس) اور یہ بیزاری بھی اس کی اپنی بے بسی اور لاچاری کے باعث ہوگی۔ یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا (پ۳۰) ہائے قیامت کا ایسا ہولناک دن ہوگا کہ تمام رشتے ناتے ختم ہو جائیں گے، اپنے پرائے کا فرق مٹ جائے گا، شیرازہ بکھر جائے گا۔

اے زندگی کے امتحان میں ڈالے ہوئے مسافر! اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے فرمان پر قَالُوْا بَلٰی پکارنے والے انسان، ہوش و خرد سے کام لے اور اس آنے والے وقت کا کچھ انتظام کر جب قبریں کھولی جائیں گی، مردے نکالے جا دیں گے تو ہر شخص جان لے گا کہ اس نے آخرت کے لئے کیا بھیجا اور کیا چھوڑا، کیا بنایا اور کیا کھویا۔ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ، عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ پ۳۰ حتیٰ کہ دلوں کے بھید تک جانچے اور پرکھے جائیں گے جبکہ پاس کچھ نہ ہوگا نہ کوئی ہمدرد ہی ہوگا۔ یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ پ۳۰ سورہ طارق) پھر وہ دن ایسا دن ہوگا کہ دل ڈر سے دھڑکتے ہوں گے۔ نگاہیں جھکی ہوں گی۔ یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ، قُلُوْبٌ یَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ پ۳۰ سورہ النازعات) اور یہ وہ دن ہوگا کہ ہر شئے کی حقیقت سامنے ہوگی۔ پھر یہیں سے کچھ کیوں نہ لے چلے۔ فنا سے بقا کا راستہ کیوں نہ بنائے آخرت کے چین کی راہیں کیوں نہ نکالے، یہاں سب کچھ ہو سکتا ہے وہاں کچھ نہ ہو سکیگا سوائے مسافرِ حیات! اس سفر کو غفلت سے نہ گزار، دیدہ و دانستہ نابینا نہ بن۔ آنکھ کھول، حقیقت کو سمجھ، راہ کو راہ، منزل کو منزل۔۔،،

کیا تو یہاں رہنے کے جو خواب دیکھ رہا ہے۔ یہاں کوئی رہا ہے جو تو رہے گا یہ کیوں نہیں سوچتا کہ تیرے اس راستے پر کتنے ہی راہ رو، اور راہگیر گذر چکے ہیں جن کو آج یہاں نہیں پاتا۔ مکان ہیں، مکین نہیں، گھر ہیں گھر والے نہیں، کیونکہ وہ راہ رو تھے راہ طے کر چکے، تو ابھی راہ میں ہے وہ گزر چکے تو ابھی گزرگاہ میں ہے

وہ کھو چکے یا بنا چکے تو امتحان میں ہے، خدارا خود کو راہ گیری خیال کر، راہ کی تکالیف
سے دل برداشتہ اور سراسیمہ نہ ہو۔ راحت کی تلاش میں سرگرداں نہ رہ، اور کسی ابتلا میں
سرگراں نہ بن، کیونکہ یہاں کا دکھ وہاں کا سکھ ہے، یہاں کا سکھ وہاں کا دکھ ہے
جبکہ تیرا خمیر لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ کے ساتھ مقدر ہے۔ یاد رکھ تیری
تخلیق بے مقصد نہیں ہے۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّکُمْ اِلَیْنَا
لَا تُرْجَعُوْنَ پ۱۸ سورہ النور پس مستقبل کو بنا۔ راہ کو سنوار، تو اس سفر میں اقامت
کا دھوکہ نہ کھا۔ تو دو عدموں میں گھرا ہوا ہے۔ عدم سے آیا ہے۔ عدم ہی کی طرف
چل رہا ہے۔ یہ سفر چند روزہ ہے۔ جو تیز روی سے گزر رہا ہے گو تو راہ کو چھوڑ جائے
گا مگر اس راہ کا عمل تجھ کو نہیں چھوڑے گا۔ جیسا عمل ہو گا، ویسا پھل ملے گا۔ اور کسی
پر کوئی ظلم نہ ہو گا۔ فَالْیَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْئًا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ
پ۲۳ ادھر سفر ختم ہوا، ادھر اعمال سامنے ہوں گے۔ اچھا عمل ہو گا تو اچھا اجر و
ثواب ملے گا۔ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ (سورہ مزمل)
اور ذرہ ذرہ کا ناپ تول اور حساب و کتاب کی جانچ پڑتال ہو گی فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ
ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ، اگر یہ سفر غفلت سے گذرا
اور صرف کھایا پیا اور یوں ہی آخرت کو سدھارا تو پچھتائے گا، دنیا کی زندگی
جس کی محبت میں تو کھو یا ہے، آخرت کو نہ کھو، سعادتِ ابدی کو فنا کے گھاٹ
نہ اتار، فانی کو فنا ہونے دے۔ باقی کی درستی میں لگ، دنیا ہاتھ سے چھن کے
رہے گی، یہ زندگی تیری اصل پونجی ہے جس کے نفع میں تجھے آخرت کمانا ہے
وہاں کے لئے کچھ بنانا ہے۔ اگر تو نے دنیا کو برتا، آخرت کو بھلایا تو اصل پونجی
کو کھایا، پھر نفع کیسا؟ دنیا کا مال تجھ کو جان سے زیادہ عزیز ہے جس کی محبت
میں تو نے اپنے پروردگار کو بھلا رکھا ہے اور بار بار اس کو گنتا رہتا ہے الَّذِیْ
جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ پ۳۰ سورہ ہمزہ سو اپنی آمدنی کی صورتوں اور ان کی راہوں کو
جانچ اور اس کے خرچ کے راستوں کو بھی دیکھ، کہاں سے لایا، کہاں اٹھایا،

کس سے لیا ؟ کس کو دیا، حلال کی فکر کر، جائز کی تمیز رکھ، حرام پر ہاتھ نہ ڈال، ناجائز پر نظر نہ رکھ، وہ مال جو تو نے بے سوچے سمجھے کمایا بے فکری سے اٹھایا وہ مال نہیں جی کا جنجال ہے وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ ، اور جو مال بخل کر کے جمع کئے جاتے ہیں اور راہِ خدا میں خرچ نہیں کئے جاتے وہ سانپ بنا کر طوق بنائے جائیں گے۔ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (سورہ آلِ عمران)

اے دنیا کے مسافر! تو اس سفر میں آزاد نہیں، اپنی مرضی کا خود مختار نہیں، تیرے خالق نے تیری بھلائی اور رہنمائی کے لئے دین مقدس بھیجا ہے جس کی رو سے تجھے چلنا ہے۔ ایک ایک قدم پھونک پھونک کے رکھنا ہے اور ہر سانس وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ پر لینا ہے اور اس طرح عمل پیرا ہونا ہے کہ

پاسدار انفاس اے اہلِ خرد

ترجمہ — اے عقلمند اپنی سانسوں کا لحاظ رکھ

تا ترا ایں قافلہ منزل برد

ترجمہ — تاکہ تجھکو یہ قافلہ منزل تک پہنچا دے

ہوش در دم دار اے مردِ خدا

ترجمہ — اے مردِ خدا اپنے سانس کی خبر رکھ

یک نفس، یک دم مباش حق جدا

ترجمہ — ایک لمحہ ایک سانس بھی خدا کی یاد سے بے خبر نہ ہو

اگر تو پاسدار انفاس

ترجمہ — اگر تو نے سانسوں کا لحاظ اور پاس رکھا

سلطانے رسانندت ازیں پاس

ترجمہ — تو تجھے اللہ رب العزت تک پہنچا دے گا

تراپند بس در هر دو عالم

ترجمہ: تجھکو دنیا میں صرف یہ نصیحت ماننا کافی ہے

زجانت بر نیاید بے خدا دم

ترجمہ: تیری جان سے ایک سانس بھی یاد خدا سے نہ نکلے

دنیا کے ایک ایک لمحہ کی قیمت جان، ایک ایک منٹ کی قدر پہچان۔ اگر تو دنیا کی زندگی سے آخرت بنائے گا۔ اور دنیا دے کر آخرت خریدے گا۔ تو یہ دنیا کی گھڑیاں، موتیوں کی لڑیاں بن جائیں گی، اس کا ایک ایک پل انمول موتی بن جائے جس کی قدر و قیمت یہاں نہیں وہاں کے بازار میں ہوگی۔ اگر اس دنیا کے لمحات کی قدر کرلی تو یہاں کا ہر لمحہ دوسرے عالم میں لاکھوں بلکہ بے شمار برسوں کی راحت میں تبدیل ہوگا قطرہ سمندر بن جائے گا۔ ذرہ پہاڑ کی طرح سامنے ہوگا۔ کَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْبُلَةٍ پھر اس سستے سودے اور نفع بخش تجارت سے کیوں کتراتا اور پیچھے ہٹتا ہے اور اپنی ناسمجھی اور بے عقلی کا ثبوت خود کیوں بنتا ہے۔ دنیا کی ہوس کبھی پوری نہیں ہوسکتی، کتنا بھی مل جائے تب بھی هَلْ مِنْ مَزِیْدٍ کا نعرہ رہتا ہے اور قبر کی ہی مٹی اس کو پورا کرتی ہے۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ الخ سورہ تکاثر لیکن آخرت میں تو اجر و ثواب کا بھوکا ہوگا۔ بہت کر بھی تھوڑا جانے گا اور تھوڑا کچھ نہ ہوگا، اجر و ثواب کے ذرہ ذرہ کو ترستا ہوگا، اس حیات کا حریص مت بن، آخرت کا حریص بن، دنیا میں تھوڑے پر اکتفا کر آخرت کے لئے تھوڑے پر قناعت نہ کر، دنیا میں تو جانے کے لئے آیا ہے آخرت میں رہنے کے لئے جائے گا۔ جانے والی چیز کو جانے دے۔ باقی رہنے والی چیز کی فکر ہر دم پیش نظر رکھ اور حضور شارع علیہ السلام صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان حرزِ جاں بنا کہ

،، قیامت کے دن انسان کے قدم اس وقت تک جنبش میں نہ آئیں گے جب تک کہ اس سے پانچ باتوں کی نسبت دریافت نہ کرلیا جائیگا کہ اس نے اپنی عمر کس کام میں صرف کی، جوانی کس کام میں بتائی

مال کہاں سے لایا اور کمایا اور کہاں خرچ کیا جو علم حاصل کیا تھا اس پر
کیا عمل کیا۔ (ترمذی شریف)

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ

جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو اس کے پہلو میں دو فرشتے ہیں جو مخلوق کو پکارتے ہیں کہ لوگو اپنے پروردگار کی طرف چلے آؤ۔ اور اس بات کو جان لو، کہ مال کم ہو اور کافی ہو وہ اس مال سے بہتر ہے جو زیادہ ہو اور لہو ولعب میں ڈالے اور خدا کی عبادت سے روکے،، (ابونعیم)

گویا ہر روز فرشتے دنیا کے راہ گیروں کو جگاتے اور خواب غفلت سے بیدار کر کے قدم قدم پر آخرت کی یاد دلاتے ہیں۔ پس ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر گھڑی موت کے سفر کی تیاری میں مصروف رہے، نہ معلوم کوچ کا بگل کس وقت اور کس حالت میں بج جائے اور مہلت نہ پائے۔ گو بظاہر حالات زندگی کتنے ہی خوش کن اور کیسے ہی پر مسرت و ساز گار کیوں نہ ہوں۔ پھر زندگی کے اندر قدم رکھنے کا تو صرف ایک ہی راستہ ہے۔ مگر جانے کے ہزاروں راستے ہیں دنیا کی زندگی موت پر موقوف ہے جب تک ہی دنیا، دنیا ہے کہ ایک آتا ہے دوسرا جاتا ہے اور ایک دوسرا ایک دوسرے کی جگہ لیتا ہے: تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ الخ اگر انسان موت کو بھول بھی جائے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ موت بھی اس کو بھول جائے ـــــ جبکہ اس کا وقت معین ومقرر ہے۔ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ پ ۲۲ یہ وقت ٹل نہیں سکتا اور کوئی شخص اس کے چنگل سے نہ بچ سکتا جبکہ ہر ایک کو اس کا ذائقہ چکھنا ہو گا۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔

ڈاکٹر سلیم قدوائی

محمد علی اور جواہر لال نہرو

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر اور پنڈت جواہر لال نہرو کا شمار بجا طور پر ماضی قریب کے ان عظیم قائدوں اور مشاہیر میں کیا جاتا ہے جنہوں نے اپنے فکر و عمل سے زمانے کے دھارے کا رخ موڑا۔ دونوں عظیم محبانِ وطن میں سے تھے، دونوں اپنے اپنے دور میں اپنے ہم وطنوں کی آنکھ کا تارا اور بے تاج بادشاہ رہ چکے تھے۔ دونوں کٹر سامراج دشمن تھے، دونوں قومی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ عالمی مدبرین میں گنے جاتے تھے۔ دونوں نے انگلستان کی دو مشہور درسگاہوں میں تعلیم کے اعلیٰ مدارج طے کئے تھے، دونوں کو انگریزی زبان پر غیر معمولی عبور حاصل تھا، دونوں مہاتما گاندھی سے متاثر اور ان کی قیادت کے قائل تھے، دونوں اہلِ سیاست کے ساتھ ساتھ بلند پایہ مفکر اور دانشور بھی تھے، دونوں اعلیٰ درجے کے مقرر اور انشا پرداز تھے۔ تحریک آزادی کے دوران ایک بلند مقصد کے لئے مشترکہ جدوجہد مادرِ ہند کے ان دو مایہ ناز فرزندوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لائی تھی اور ان کے درمیان دوستی اور یگانگت کا مضبوط اور اٹوٹ رشتہ قائم کیا تھا۔ آج جب محمد علی کی صد سالہ برسی منائی جا رہی ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دو عظیم المرتبت اور عہد آفرین شخصیتوں کے باہمی تعلقات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

جواہر لال نہرو جب اپنی تعلیم مکمل کر کے ہندوستان واپس آئے تو محمد علی ہندوستان کے مطلع سیاست پر چھائے ہوئے تھے اور ان کے دوستانہ مراسم پنڈت موتی لال نہرو کے ساتھ قائم ہو چکے تھے۔ جب جواہر لال نے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تو ان کو محمد علی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ محمد علی ایک مردم شناس شخص تھے۔ انہوں نے ایک ماہر جوہری کی طرح جواہر لال میں

ڈاکٹر سلیم قدوائی۔ شعبۂ سیاسیات۔ کشمیر یونیورسٹی۔ سری نگر 190006

پوشیدہ ہیرے کو تلاش کر لیا اور اس کی تراش خراش میں لگ گئے۔ انھوں نے اس نوعمر میلا نوجوان کو زبردستی اپنے دور صدارت میں پہلی بار انڈین نیشنل کانگریس کا جنرل سکریٹری بناکر سرگرم سیاست میں حرکت پذیر کیا جس سے جواہر لال نہرو کو محمد علی کے دوش بدوش کام کرنے کا موقع ملا اور ان کا ربط و ضبط بڑھتا گیا اس رفاقت نے دونوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد دی اور دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے گہری انسیت اور لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اس کی شہادت ایک دوسرے کے بارے میں دونوں کی متعدد تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد علی کا تعلق جواہر لال سے محبت اور شفقت کا رہا جبکہ جواہر لال محمد علی کی ہمیشہ عزت و احترام کرتے رہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ رہی ہوگی کہ عمر میں محمد علی جواہر لال سے کم و بیش۔ ایم س بڑے تھے، سیاست میں سینئر تھے اور جواہر لال سے پہلے ان کے تعلقات موتی لال سے استوار ہو چکے تھے۔ اس چیز کا دونوں ہی نے ہمیشہ لحوظ خاطر رکھا۔

جواہر لال نے محمد علی کا ذکر اپنی آپ بیتی میں نہایت تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ اس کتاب کے ایک باب کا عنوان ہی "محمد علی اور کوکوناڈا کانگریس" ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ جواہر لال کی نظروں میں محمد علی کی کس قدر اہمیت تھی۔ وہ کیا وجہ تھی جس نے جواہر لال کو محمد علی کی طرف کھینچا اور ان کو محمد علی کا گرویدہ بنا دیا ؟ خود جواہر لال کے الفاظ میں اس کی وجہ تھی " ان کی (محمد علی کی) اخلاص مندی، زبردست قوت عمل اور انتہائی ذکاوت " جواہر لال کو اس بات پر فخر تھا کہ ان کا شمار محمد علی کے پسندیدہ لوگوں میں تھا جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے:

"میری خوش قسمتی تھی کہ میرا شمار محمد علی کے محبوبوں میں تھا۔ ہم میں الفت و محبت کے تعلقات تھے اور ہم ایک دوسرے کی بہت قدر کرتے تھے" محمد علی کی بات جواہر لال کے لئے حکم کا درجہ رکھتی تھی جیسا کہ جواہر لال کے اس اعتراف سے ظاہر ہوتا ہے: "محمد علی نے میری مرضی کے خلاف مجھے مجبور کیا کہ ان کی صدارت کے دوران میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جنرل سکریٹری ہو جاؤں: ایسی حالت میں کہ ملک کے آئندہ پروگرام کے متعلق کوئی بات صاف طور پر میرے ذہن میں نہیں تھی، میں کوئی انتظامی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا لیکن محمد علی کے اصرار پر غالب نہ آسکا" محمد علی کے ساتھ جواہر لال کی کس قدر نظریاتی ہم آہنگی تھی اس کا

ثبوت جواہر لال کے اس اعتراف سے ملتا ہے "ہم دونوں اس نتیجے پر پہونچے کہ اگر کوئی دوسرا شخص سکریٹری مقرر ہوا تو شاید وہ نئے صدر کے ساتھ ایسی ہم آہنگی سے کام نہ کر سکے جس طرح میں کر سکتا تھا" دونوں میں کس طرح نبھی اس کا ذکر کرتے ہوئے جواہر لال نے لکھا ہے: "پورے سال خوب نباہ ہوتا رہا۔ گو چھوٹے چھوٹے اختلافات بھی پیش آتے رہے۔" جواہر لال کو محمد علی کے احساسات و جذبات کا کس قدر احترام تھا، اس کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے: "میں محمد علی سے مذہبی بحث و مباحثہ کو ٹال ہی جاتا تھا، اس لئے کہ میں خوب جانتا تھا کہ اس سے فریقین کو بس غصہ ہی آ کر رہے گا اور ممکن ہے کہ میری کسی بات سے انھیں دکھ پہنچ جائے"

آپ بیتی میں جواہر لال نے محمد علی کے ساتھ اپنے ذاتی روابط پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ محمد علی کی خدمات اور کارناموں کو بھی بھرپور خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ مثلاً مسلمانوں میں احساسِ قومی اور تحریک آزادی کے ارتقا کے سلسلے میں تحریر کرتے ہوئے جواہر لال نے لکھا ہے: "مسلمانوں کے طبقۂ اعلیٰ کا رجحان اب وطنیت کی جانب ناگزیر ہو چکا تھا۔۔۔۔ جنگ عظیم نے اس تحریک کی رفتار تیز کر دی۔۔۔۔ علی گڑھ کالج تک کو اپنا رنگ بدلنا پڑا اور نئے لیڈروں میں سب سے زیادہ طاقت والے علی برادران ہی تھے جو دونوں علیگ تھے" محمد علی جب کانگریس میں شریک ہوئے اور ان کی شرکت سے ملکی سیاست میں جو انقلاب آیا اس کا ذکر کرتے ہوئے جواہر لال رقمطراز ہیں: "امرتسر کانگریس گویا پہلی گاندھی کانگریس تھی۔۔۔ علی برادران اسی زمانے میں نظر بندی سے رہا ہوئے اور فوراً کانگریس کی شرکت کے لئے امرتسر پہنچ گئے۔ اب قومی تحریک نے ایک نئی صورت اور نئی حیثیت اختیار کرنا شروع کر دی۔" محمد علی کے مشہور مقدمۂ کراچی کا ذکر کرتے ہوئے جواہر لال نے لکھا: "علی برادران کو طویل سزا اس جرم میں ملی کہ انھوں نے فوج میں بغاوت پھیلانے کی کوشش کی تھی۔ جن الفاظ کی بنا پر ان پر مقدمہ چلایا گیا، ہندوستان کے سیکڑوں جلسوں میں ہزاروں اشخاص نے ان ہی الفاظ کو دہرایا۔" محمد علی کے خطبۂ صدارت کا تذکرہ کرتے ہوئے جواہر لال نے لکھا: "دسمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس کوکوناڈا (دکن) میں ہوا۔ مولانا محمد علی صدر تھے۔ حسب عادت انھوں نے ایک بے حد طویل خطبۂ صدارت پڑھا لیکن تھا وہ دلچسپ۔" ہندو مسلم نزاعات اور فرقہ وارانہ کشمکش

کے ضمن میں محمد علی کی کوششوں کا اعتراف کرتے ہوئے جواہر لال نے اعتراف کیا: "صدی کی دوسری
دہائی کے وسط میں بارہا کوشش اس کی ہوئی کہ گفت وشنید اور بحث ومباحثہ کے ذریعہ کوئی
صورت مفاہمت کی پیدا ہو۔ ان جلسوں کا نام اتحاد کانفرنس ہوا کرتا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ
معرکتہ الآرا کانفرنس وہ تھی جو ۱۹۲۴ء میں مولانا محمد علی صدر کانگریس کی دعوت پر دہلی میں ہوئی"
محمد علی کو آخر میں کانگریس کے لیڈروں سے سخت اختلاف پیدا ہو گیا تھا جس کا جواہر لال کو دلی افسوس
تھا جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے: "اپنے زمانہ صدارت کے بعد محمد علی رفتہ رفتہ کانگریس سے
ہونے لگے یا شاید ان کے الفاظ میں کانگریس ان سے دور ہونے لگی۔ اس میں غالباً کسی فرد یا افراد کا
قصور نہیں تھا، بلکہ ان حالات کا جو ملک میں رونما ہوئے، یہ لازمی نتیجہ تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن اس افسوسناک
نتیجے سے ہم میں سے بہتوں کو رنج ہوا۔ اس لئے کہ فرقہ وارانہ مسائل پر خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ
ہو سیاسی معاملے میں بہت کم اختلاف تھا۔ محمد علی آزادئ ہند کے دل سے شیدائی تھے اور جب
یہ سیاسی مطمح نظر مشترک تھا تو پھر فرقہ وارانہ مسئلے میں بھی ان سے سمجھوتہ کی گنجائش تھی۔ سیاسی حیثیت
سے وہ ان رجعت پسندوں سے جو فرقہ وارانہ مفاد کے علمبردار بنتے ہیں، کوسوں دور تھے۔" گول میز
کانفرنس میں محمد علی کی شرکت کا ذکر کرتے ہوئے جواہر لال نے لکھا: "مجھے ان کی شرکت سے دکھ ہوا
میرے خیال میں وہ خود بھی اس سے خوش نہ تھے چنانچہ انھوں نے لندن میں جو کچھ بھی کہا اس
سے صاف یہی ظاہر ہوتا ہے۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی اصل جگہ ہندوستان کا میدان
جنگ ہے نہ کہ اس بے نتیجہ کانفرنس کے اجلاس میں جو لندن میں ہو رہا تھا۔" جواہر لال کو یقین
تھا کہ: "اگر وہ اپنے ملک کو واپس آ گئے ہوتے تو ضرور اس جنگ میں شریک ہو جاتے۔ ان کی
صحت جواب دے چکی تھی۔ اور کئی سال سے ان کی حالت بگڑتی جاتی تھی۔ لندن پہنچ کر انھیں یہ فکر
چین لینے نہیں دیتی تھی کہ کچھ حاصل کرنا چاہئے اور کوئی معقول کام کرنا چاہئے، حالانکہ اس وقت
انھیں علاج اور آرام کی سخت ضرورت تھی، اسی فکر نے ان کی زندگی کا چراغ بہت جلد بجھا دیا"
محمد علی کی وفات کی خبر جواہر لال کو جیل میں ملی، اس وقت ان پر کیا گزری اس کا اندازہ اس
جملے سے ہوتا ہے: "محمد علی کی موت کی خبر نینی جیل میں پاکر میں دھک سے رہ گیا۔" محمد علی سے
اپنی آخری ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے جواہر لال نے لکھا: "میری محمد علی سے آخری ملاقات دسمبر

لاہور کانگریس میں ہوئی تھی۔ میرے خطبۂ صدارت کے بعض حصے انھیں پسند نہیں آئے تھے۔ انھوں
ڑی تلخی سے ان حصوں پر تنقید کی۔۔۔ انھوں نے خاص طور پر مجھے نصیحت فرمائی کہ دیکھو جواہرلال
یں تنبیہ کئے دیتا ہوں کہ یہ جو آج تمہارے ساتھی بنے ہوئے ہیں، تمہارا ساتھ نہیں دینے کے،
پڑنے پر یہ سب تم سے غداری کریں گے، تمہیں پھانسی پر چڑھانے والے تمہارے ہی کانگریسی
ہوں گے۔ ایک ہولناک پیشین گوئی۔

آپ بیتی کے علاوہ دوسری متعدد تحریروں میں بھی جواہرلال نے محمد علی کے بارے میں اپنے
لات وجذبات کا اظہار کیا ہے، مثلاً اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ڈسکوری آف انڈیا میں جواہرلال
محمد علی کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے: "کامریڈ کا اجراء الہلال سے چند ماہ قبل ہوا تھا۔
نے خاص طور پر مسلم طبقہ کے انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو متاثر کیا۔ اس کے ایڈیٹر مولانا محمد علی
.... وہ ابتدا میں علی گڑھ روایات کے پیرو اور رجارحیت کے مخالف تھے لیکن رفتہ رفتہ
رطانیہ مخالف بنتے گئے۔ ایک مشہور اور طویل مضمون "چوائس آف دی ٹرکس" لکھنے کی پاداش
کامریڈ کو حکومت نے بند کر دیا اور محمد علی کو دوران جنگ کے لئے نظر بند کر دیا گیا۔ وہ ۱۹۱۹ء
رہا ہوئے اور فوراً ہی انھوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی۔ علی برادران نے خلافت تحریک
انگریس کی سیاست میں نمایاں حصہ لیا اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ محمد علی نے
ریس کے ایک اجلاس کی صدارت کی اور سالہا سال تک اس کی مجلس عاملہ کے رکن رہے"
"کچھ پرانے خطوط" میں جو جواہرلال کے نام موصولہ خطوط کا مجموعہ ہے اور جس میں محمد علی کے بھی
ط شامل ہیں۔ محمد علی کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے: "مولانا محمد علی ان دو مشہور علی
ران میں سے ایک تھے جو ہندوستان کی تحریک خلافت کے رہنما تھے اور جنہوں نے ۱۹۲۰ء سے
نک قومی تحریک اور تحریک ترک موالات میں بڑا نمایاں حصہ لیا تھا۔"

جامعہ ملیہ کی سلور جوبلی کے موقع پر اپنے پیغام میں جواہرلال نے محمد علی کا ذکر اس پیرایہ میں
: "میرا دھیان ترک موالات کے ابتدائی زمانہ ۱۹۲۰ء کی طرف لوٹ رہا ہے، میں خاص طور پر
دیکھنے علی گڑھ گیا جو مولانا محمد علی کی قیادت میں اس وقت نئی نئی قائم ہوئی تھی۔ تعلیم کی سچی
کھنے والے نوجوان علی گڑھ یونیورسٹی چھوڑ کر جامعہ میں شامل ہو گئے تھے تاکہ ترک موالات

خلافت اور آزادی کی تحریکوں کو تقویت پہونچا سکیں، مولانا محمد علی جیسی مؤثر شخصیت کی قیادت میں نئی جامعہ میں بڑا جوش وخروش تھا۔"

غرض اس طرح محمد علی کی شخصیت کا، اخلاص مندی کا، قوت عمل اور حب الوطنی کا اعتراف جواہرلال کے حقیقت نگار قلم سے موجود ہے اور محمد علی کے سوانح نگار اور قریبی دوست مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے الفاظ میں "جوہر کی قدر جوہری نہ سہی جواہر کے یہاں تو پوری طرح موجود ہے۔" جواہرلال کی تحریروں سے محمد علی کی شخصیت کا جو نقش ذہن میں ابھرتا ہے وہ ایک مخلص، حق پسند، نڈر، انسانیت دوست، پرجوش اور عظیم محب وطن لیکن کٹر مذہبی، جذباتی انسان کا نقش ہے۔

جواہرلال کی طرح محمد علی نے اپنی کوئی یادداشت نہیں چھوڑی جس سے معلوم ہوتا کہ ان سے جواہرلال سے کیسی رفاقت رہی، تاہم خطوط اور دوسرے ذرائع سے اتنا تو معلوم ہی ہو جاتا ہے کہ ان کو جواہرلال کے ساتھ تعلق خاطر تھا۔ وہ انہیں ملک کے سیاسی اسٹیج پر آگے بڑھانا چاہتے تھے اور اسے قوم کے لئے مفید اور ضروری سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے دور صدارت میں جواہرلال کو انڈین نیشنل کانگریس کا جنرل سکریٹری بننے پر مجبور کیا۔ سیاسی زندگی کے نشیب وفراز میں جہاں محمد علی اور جواہرلال ہم قدم اور ہم زبان رہے وہاں اختلاف بھی ہوا لیکن یہ ذاتی تعلقات پر اثر انداز نہیں ہوا۔ اور محمد علی کے سوانح نگار اور قریبی دوست مولانا عبدالماجد دریابادی کے بقول: "محمد علی گنتی کے جن دوچار کانگریسی لیڈروں سے آخر دم تک خوش رہے ان میں سے ایک جواہرلال نہرو بھی تھے۔"

ویریندر پرشاد سکسینہ

پنڈت بشن نرائن در آبر لکھنوی

پنڈت بشن نرائن در آبر لکھنوی[۵]، پنڈت کشن نرائن در کے خلفِ اکبر ہیں۔ بارہ بنکی میں ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر ہی سے ذکاوت و ذہانت کے آثار چہرے سے ظاہر تھے۔ آٹھ نو برس کی عمر میں اردو فارسی کی تعلیم سے بسم اللہ ہوئی انٹرنس پاس کرنے کے بعد کننگ کالج لکھنؤ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخل ہو گئے لیکن ریاضی نے قدم آگے نہ بڑھنے دیا۔ اس کے بعد ولایت تشریف لے گئے، یہ بڑی جرأت کا کام تھا کیونکہ بقول حضرت چکبست یہ آخرت کے سفر سے کم دشوار نہیں سمجھا جاتا تھا۔ حضرت جگر بریلوی "زمانہ" مارچ و اپریل ۱۹۲۹ء میں آپ کے متعلق لکھتے ہیں۔

"ولایت پہنچ کر آپ نے اپنے وقت کا ایک لمحہ بھی نہ تو لہو و لعب میں گنوایا نہ چمنستانِ حسن کی گل چینیوں میں بلکہ سرسوتی کے سچے پجاری کی طرح ہمہ تن تحصیل علم و حکمت میں مشغول ہو گئے۔ ذریعۂ معاش کے خیال سے بیرسٹری پاس کی لیکن دل و دماغ کو مغربی حکما و مفکرین کی تصنیفات کے مطالعہ سے نورانی کرتے رہے۔ تاریخ، فلسفہ، سیاسیات اور معاشیات پر خاص طور سے عبور

جناب ویریندر پرشاد سکسینہ بدایوں کے مردم خیز علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اردو کے معروف ادیب ہیں۔

۵ جناب لالہ سری رام نے لکھنوی کے بجائے کشمیری لکھا ہے (خمخانۂ جاوید حصہ ا صفحہ ۱۲۴) مدیر معاون

حاصل تھا۔ غرض ولایت سے جب واپس ہوئے تو علومِ مغربی کے ایسے متبحّر عالم ہو کر جن کی تحریر پر اہلِ زبان کی تحریر کا دھوکا ہوتا ہے لیکن آفرین صد آفرین کہ ولایت کی کفر انگیز و توبہ شکن فضا اور علومِ مغربی کی لذّت یابی آپ کے اخلاق و تہذیب میں جو ہندوستانی معاشرت کا نمونہ تھے کوئی تغیر نہ پیدا کر سکی تواضع، خلوص، محبت، نیک نفسی، تحمل و استقلال کے اعتبار سے ان کی فضیلت کی مثال بن کر رہے بلکہ بقول چکبست قدرت نے توکل و استغنا کے پتلے میں کسی بزرگ کی روح پھونک دی تھی۔"

ولایت سے واپس آکر لکھنؤ میں آپ نے وکالت شروع کی ۱۸۸۶ء میں کانگریس میں شرکت کی اور قومی خدمت کو اپنا شعار بنایا۔ آپ کی صاف دلی، بے غرضی، اور حب وطنی ہمیشہ یادگار رہے گی۔ دسمبر ۱۹۱۱ء میں کانگریس کے صدر منتخب ہوئے آپ کا خطبۂ صدارت انگریزی زبان و بیان کا ایک اچھا نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ آپ کی انگریزی زبان اتنی اچھی تھی کہ اہلِ زبان اس کی بے حد تعریف کرتے تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا ایک مراسلہ حضرت ابر کے بارے میں ۱۵ مئی ۱۹۵۹ء کے "ہماری زبان" میں شائع ہوا ہے۔ جس میں موصوف نے لکھا ہے کہ۔

"پنڈت جی بیرسٹری میں تو کچھ جی نہ لگاتے تھے۔ البتہ سیاسیات کے فاضل تھے اور گوکھلے کی لبرل پارٹی کے لئے باعثِ فخر، دسمبر ۱۹۱۱ء میں کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور ایک فاضلانہ خطبۂ صدارت سنایا۔ برطانیہ کے سیاسی مفکروں اور فلسفیوں بنتھم، کبہاٹ، جیمس مل، جان مل، مکالے، مارلے وغیرہ کے اقوال نوکِ زبان تھے اور انگریزی ادب پر تو اتنا عبور تھا کہ ہندوستانیوں میں بھی چند ہی ان کی ٹکر کے کہے جا سکتے تھے۔"

سر تیج بہادر سپرو، پنڈت منوہر لال زتشی جیسے فاضل اجل اور روشن دماغ عالموں نے آپ سے فیض حاصل کیا اور آپ کو اپنا استاد بنایا اور حضرت چکبست نے بھی آپ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ چکبست نے پنڈت جی کی یاد میں "نذرانۂ روح"

جیسی شاہکار نظم لکھی۔ چکبست نے کیا خوب فرمایا ہے

مجھ سے یارانِ عدم نے یہ آکر فرمایا
حسرت آبادِ جہاں سے تجھے کیا ہاتھ آیا
میں کہوں گا کہ بس اک رہبرِ کامل پایا
زندگی کی یہی دولت ہے یہی سرمایا
لے کے دنیا سے یہی مہر و وفا آیا ہوں
اپنے محسن کی غلامی کی سند لایا ہوں

سیاسی جد و جہد میں دن رات مشغول رہتے تھے۔ جس کی وجہ سے صحت خراب ہوگئی۔ اور تپ دق کا مہلک مرض لاحق ہو گیا۔ گرمی اور برسات کا زمانہ کسی پہاڑی مقام پر گزارتے تھے اور جاڑے کے زمانے میں لکھنؤ چلے آتے تھے اور گولہ گنج میں پنڈت اقبال نرائن کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ منشی دیانرائن نگم کے ایک عزیز ڈاکٹر مادھو سرن نگم بھی اسی مرض میں مبتلا تھے۔ ان کی ملاقات آپ مرحوم سے ہوئی۔ نگم مرحوم نے رسالہ "زمانہ" کے جوبلی نمبر میں جو فروری ۱۹۴۲ء کو شائع ہوا ہے ایک مضمون "یادِ رفتگاں" کے نام سے لکھا ہے۔ اس میں اس ملاقات کا ذکر یوں کرتے ہیں:

"پنڈت بشن نرائن در اُردو کے اچھے شاعر انگریزی کے بلند پایہ ادیب نامور نقادِ سخن اور ملک کے مشہور رہنما تھے یوں تو شروع ہی سے آپ "زمانہ" کے سرپرست رہے لیکن جب آپ بہ سلسلۂ علالت الموڑہ تشریف لے گئے تو آپ کی ملاقات ایڈیٹر "زمانہ" کے ایک دلی دوست اور قومی عزیز ڈاکٹر مادھو سرن صاحب نگم (مرحوم) سے ہوگئی جو خود بھی اسی نامراد مرض میں مبتلا تھے جس کے پنڈت صاحب عرصہ سے شکار تھے۔ فرشتہ خصلت مادھو سرن نے شروع ہی سے "زمانہ" کی اعانت و امداد کو اپنا فرض سمجھ رکھا تھا چنانچہ جب الموڑہ میں ان کا اور پنڈت صاحب کا ارتباط بڑھا تو انھوں نے "زمانہ" کے لئے پنڈت صاحب سے ایک اچھا خاصہ ڈیلان

حاصل کر لیا۔ ابر صاحب نے اس مجموعہ کی سب غزلیں عزیزی مادھوسرن جی کے تفنن طبع کے لئے کہی تھیں اور ان پر انہیں اختیار کامل دے دیا تھا کہ جو چاہیں کریں چنانچہ یہ مجموعہ ان دونوں اصحاب کی باہمی محبت کی یادگار آج بھی ہمارے پاس محفوظ ہے اس کی غزلیں مختلف موقعوں پر مادھوسرن جی مرحوم نے خود اپنے قلم سے نہایت خوشخط لکھی ہیں جناب ابر نے اس کی نظر ثانی کر دی ہے۔ جس کاپی پر یہ کلام نقل کیا گیا ہے وہ اسکول کی ایکسرسائز بک ہے جس میں نام کی جگہ ڈاکٹر مادھوسرن نے اپنا نام کلاس کی جگہ مجبوری اسکول کے نام کے سامنے عالم فانی اور سبجکٹ کے خانے میں "دق" لکھا ہے

آج یہ دونوں دوست عالم بالا میں ہیں لیکن ان کی محبت کی نشانی اب تک اسی طرح محفوظ ہے اور شاید کسی وقت دنیا کے روبرو پیش ہو۔ ابر صاحب نے مادھوسرن جی کی وفات (سنہ ۱۹۱۱ء) کے بعد "زمانہ" پر خاص نظر عنایت مبذول فرمائی چنانچہ اس بیاض میں خاص خاص مقامات پر پنسل سے نشانات بنا کر بہت سے اشعار خود انتخاب فرمائے ہیں اس غزل کے آخر میں جس کا پہلا شعر یہ ہے:

دنیا میں درد کے لئے گر آفریدہ ہوں
یا رب کسی یتیم کا اشک چکیدہ ہوں

آپ نے "زمانہ" کے دفتر میں تشریف لا کر حسب ذیل دو اشعار کا پنسل سے اضافہ فرمایا ہے:

میں کیا خراب محفل رنداں میں ہوگا شیخ
ایماں کسی کا ہوں نہ کسی کا عقیدہ ہوں

خاموشی کا اشارہ یہ ہے گوش عقل سے
مجھ کو بھی سن کہ میں سخن ناشنیدہ ہوں

تپ دق کے مرض میں ۱۹ ر نومبر سنہ ۱۹۱۶ء کو قبل از وقت پیام اجل آ گیا۔ سارے ہندوستان میں آپ کی وفات پر کہرام مچ گیا۔ چکبست اور منشی نوبت رائے نظر کے

نوحے آپ کی وفات پر اچھے ہی نہیں بلکہ بہت اچھے ہیں۔ چکبست کے نوحے کے دو بند ملاحظہ فرمایئے ؎

صدمۂ عام ہے، ہے قوم کا پیاسا نہ رہا
بے زبانوں کی زبان، دل کا سہارا نہ رہا
گلشنِ علم و ادب کا چمن آرا نہ رہا
مطلعِ دانش و بینش کا ستارا نہ رہا

سب یہ غم ایک طرف، ایک طرف غم اپنا
جس سے دنیا نہیں واقف وہ ہے ماتم اپنا

ہم نے دیکھے ہیں ترے اشکِ محبت اکثر
جن پہ صدقے ہیں زبان اور قلم کے جوہر
دو نگینے تھے محبت کے ترے قلب و جگر
ہوئی غیروں کو نہ اس پاک خزانے کی خبر

ظاہری حسنِ لیاقت کے یہ دیوانے ہیں
شمع دیکھی نہیں فانوس کے پروانے ہیں

ابر مرحوم اردو کے ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ آپ کا شمار لکھنؤ کے اہلِ زبان میں ہوتا ہے۔ آپ کی زبان دانی اور قابلیت مسلم تھی۔ اردو کے اساتذہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اور آتش و انیس و غالب کے کلام کے شیدائی تھے۔ رحمت اللہ حکیم خلف الرشید حضرت اسیر مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔ رسالہ "زمانہ" اور رسالہ "ادیب" الٰہ آباد کی پرانی فائلوں ہی میں آپ کا کلام بکھرا پڑا ہے "بہارِ گلشنِ کشمیر" جلد اول میں بھی آپ کے کلام کا کچھ حصہ مل سکتا ہے۔ مضامینِ چکبست میں حضرت چکبست لکھتے ہیں۔

"پہلی غزل جو حضرت ابر نے تصنیف فرمائی تھی اس کا ایک شعر مجھے اس وقت یاد آگیا ہے وہ شعر یہ ہے ؎

حبیب ملک ہیں اپنے وطن سے ہم کو الفت ہے
تمنائے ولایت کیا کریں ہندوستاں ہو کر

حضرت ابر کے کلام کے متعلق جگر بریلوی مرحوم نے "زمانہ" مارچ و اپریل ۱۹۴۹ء میں لکھا ہے:-

"مجموعۂ کلام بہت نہیں پھر بھی جو ہے خوب ہے۔ نظمیں بھی ہیں غزلیں بھی خیالات میں مذاقِ جدید کی تازگی اور حکیمانہ نکات کی روشنی ہے۔ حسن و عشق کے پامال و فرسودہ خیالات سے اجتناب کیا گیا ہے لوازم شاعری میں لغات پرانے وہی گل و خار، شمع و پروانہ، سرو قمری وغیرہ ہیں لیکن پاکیزگیٔ خیال کے لئے باریک ریشمی پردوں کا کام دے رہے ہیں طرز ادا میں صفائی، روانی، نرمی، ہمواری اور شگفتگی ہے۔"

چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :-

نہ ٹپکا آنکھ سے جو اشکِ غم لہو ہو کر
وہ میرے دل میں رہا خونِ آرزو ہو کر

کہیں آثار بربادی ہوں یاں صدمہ گزرتا ہے
میں روتا ہوں اگر دیوار میں پانی بھی مرتا ہے

کیسی میخانے میں یہ تفرقہ پردازی ہے
خم سے شیشہ ہے جدا شیشے سے پیمانہ جدا

نظر آتے ہیں جو چشمِ بلبل کو بھی گلشن میں
نگاہِ شوق چن لیتی ہے ان پھولوں کو دامن میں

جب نہ سوجھی راہِ حق گم گشتگانِ دہر کو
شیخ کوئی ہو گیا، کوئی برہمن ہو گیا

تڑپ کر جیسے شمعِ بزم پر پروانہ آتا ہے
یوں ہی آتا ہے جس پر یہ دلِ دیوانہ آتا ہے

گو جنونِ عشق سے دنیا میں شور و شر اٹھا
یہ شرارت کس کی تھی جو فتنۂ محشر اٹھا

پنڈت بشن نرائن در آبر اور پنڈت رتن ناتھ سرشار نے کشمیری سوشل کانفرنس میں جو سنہ ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں ہوئی تھی اپنے اپنے قصیدے پڑھے تھے۔ دونوں کے قصیدے ایک ہی زمین میں تھے۔ لیکن ابر مرحوم کے قصیدے کا انداز مختلف تھا۔ جناب ابر اپنے قصیدے میں شیو نرائن بہار کی نسبت فرماتے ہیں:-

یہ وہ ہے جس نے نکالا رسالۂ کشمیر
اس سے آج ہے سرسبز قوم کا گلزار

ہمارے واسطے صدہا مصیبتیں جھیلیں
اٹھائے سارے زمانے کے سینکڑوں آزار

ہٹے نہ پاؤں مگر راہِ خیر سے اس کے
وطن کے نام پہ کی جان تک بھی اپنی نثار

اسی نے قوم کے پاؤں کی بیڑیاں کاٹیں
اسی نے سب کو سکھائی زمانے کی رفتار

ذرا کسی سے نہ تھا یہ ریفارمر ایسا
کچھ نہ لوگوں کے غصہ سے یہ ہوا ناچار

عیوب بچوں کی شادی کے پوست کندہ لکھے
کئے نقائصِ تعلیم بے خطر اظہار

جمایا نقش اسی نے یہ قوم کے دل پر
شجر لگایا جو اس نے وہ آج لایا ہے بہار

چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیے۔

اناث بھی تھیں شریکِ مباحثہ اس جا
تھی گوش گوش سے سننے کی انکی سب گفتار

ہر اک تھا علم سے آئینۂ فہم کا روشن
عفیفہ ایسی کہ مریم ہزار جاں سے نثار

یہ حسن صورت و معنی کہ جس سے ہوتا تھا
صفائے رُخ سے صفائے قلوب کا اظہار

ہر اک کا فخر تھا لڑکوں کو تربیت دینا
ہوں مائیں ایسی تو لڑکے ہوں کیوں نہ برخوردار

"تاریخ" پر ایک مسدس لکھا ہے اس کے دو بند ملاحظہ فرمائیے:-

تاریخ ہے معلّمِ با ہوش و باخبر
ہو اس کے مدرسے میں اگر ایکدم گزر

مضمون ملیں وہ جن سے ہو روشن دلِ بشر
عالم جہاں کا اور ہی آنے لگے نظر

اٹھے نقاب دیدہ وہم و خیال سے
ماضی زیادہ صاف نظر آئے حال سے

تاریخ عقدہائے سلف کی کلید ہے — رشتہ یہی میان قریب و بعید ہے
جن کو کہ ہم سمجھتے ہیں وضع جدید ہے — اس کے لباس کہنہ سے قطع و برید ہے

تاریخ حال اہل سلف کی گواہ ہے
غافل کے واسطے سبق انتباہ ہے

یہ مضمون جناب آبر کے ایک خط پر ختم کرتا ہوں جو حامد علی خاں بیرسٹر کے نام ہے اور جس کی نقل حضرت صفی مرحوم سے مجھے ملی تھی۔ اس خط سے اندازہ ہوگا کہ حضرت آبر کی اردو شاعری پر کس قدر گہری نظر تھی۔

الموڑہ - ۸ مئی سنہ ۱۹۱۲ء

مائی ڈیر حامد۔ التسلیم - آپ کے تین خط مجھے ملے۔ محض سستی کے سبب سے اتنی دیر جواب لکھنے میں ہوئی۔ میں نے نہایت شوق سے آپ کی غزلیں پڑھیں۔ "گلشن میں" والی غزل خوب کہی ہے۔ آپ کا ایک رنگ خاص ہو گیا ہے جس کا درد مجھے پسند ہے اور اس رنگ سے کوئی غزل خالی نہیں ہوتی ہے۔ "سحر بھی" "نظر بھی" والی غزل میں آپ نے زیادہ فکر نہیں کی ہے اور جب برابر شاعرے ہوں تو بیجا فکر ہو بھی نہیں سکتی۔ میں نے آپ کا مضمون "ڈس وز با ببلیس والا لیڈر" میں پڑھا خوب لکھا ہے۔ عجیب کیفیت کے ساتھ معمولی تجربات کو بیان کیا ہے۔ خواجہ آتش کو آپ اس میں بھی لے ہی آئے۔ گو میں کہتا تو بہت کم ہوں اور جو کچھ کہتا ہوں اس کی بساط ظاہر ہے لیکن اردو شعراء کے کلام اکثر پڑھا کرتا ہوں اور سلیقے سے اور بغور پڑھتا ہوں، میرا یہ خیال روز بروز مضبوط ہوتا جاتا ہے کہ غزل میں خواجہ صاحب کا جواب بجز میر کے اور کوئی لکھنؤ میں نہیں ہوا۔ محض غزل میں سودا کو بھی ان پر ترجیح نہیں دیتا، گو سودا اور مصحفی سخن پر قادر تھے اور آتش سے بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح ناسخ کو لوگ آتش پر ترجیح دیتے تھے۔ مجھے دونوں میں بڑا فرق معلوم ہوتا ہے بلکہ مختصر یہ ہے کہ آتش شاعر تھے اور ناسخ کے فطری شاعر ہونے میں مجھے کلام ہے۔ یہ رائے میری آپ ہی کے واسطے ہے کیونکہ بہت لوگ اس کو لغو سمجھیں گے اور یہ خیال ان کا بالکل بیجا بھی نہیں ہوگا کیونکہ مجھ میں وہ استعداد نہیں ہے جو ایسی تنقید کے واسطے ہونی چاہیئے اور میری بات اہل سخن کے قابل لحاظ نہیں ہو سکتی ہے۔ باقی خیریت ہے۔ زیادہ نیاز :- بندہ کشن نرائن در۔

تعارف و تبصرہ

مسعود حسن ادیب — فرد اور فنکار (مجموعۂ مضامین)

مرتب و محشی: سبط محمد نقوی

سائز ۲۲×۱۸/۸ حجم ۳۴۴ صفحات۔ مجلد مع گرد پوش، قیمت: ۷۵ روپے۔ سنہ اشاعت ۱۹۸۰ء

تقسیم کار: واجد علی شاہ اکاڈمی۔ ۵۶ کچا احاطہ، امین آباد۔ لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۱

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب اردو کے ان چند مشاہیر میں سے ہیں جنھوں نے اردو زبان و ادب کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے، ان کے حالات زندگی اور تصنیف و تالیف پر نظر ڈالی جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے جب قلم اٹھایا تو تا دم حیات وہ چلتا ہی رہا اور اس شان سے کہ کبھی تھکنے کا نام نہیں لیا، ان کی علمی و ادبی خدمات کی کیفیت یہ رہی ہے کہ جب تنقید نگاری کی طرف توجہ کی تو اس کا حق ادا کر دیا اور جب تحقیق و تفتیش کی طرف متوجہ ہوئے تو اس سے اس طرح عہدہ برآ ہوئے کہ اس کا کوئی گوشہ تشنہ و نامکمل نہیں چھوڑا۔ زبان کا کیا کہنا وہ تو گویا گھر کی لونڈی تھی۔ زیر تبصرہ کتاب ان ہی بزرگ کے بارے میں ہے جو ۲۹ جولائی ۱۸۹۳ء کو یوپی کے ایک چھوٹے سے شہر بہرائچ میں پیدا ہوئے اور ۲۹ نومبر ۱۹۷۵ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا، جہاں انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ بسر کیا تھا۔

پیش نظر کتاب کے مرتب، جناب سبط محمد نقوی صاحب اردو کے معروف ادیب اور مصنف ہیں کہنے کو تو یہ کتاب مختلف ادیبوں کے مضامین کا مجموعہ ہے، مگر فاضل مرتب کی کوشش سے اتنے اور ایسے مضامین جمع ہو گئے ہیں جن سے مرحوم کی سیرت و شخصیت اور علمی و ادبی خدمات پر پوری روشنی پڑتی ہے اور اس مجموعے میں تالیف کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ اس مجموعے کی سب سے اہم اور قابل تعریف خصوصیت اس کی حاشیہ نگاری ہے، اس کی وجہ سے اس مجموعے کی حیثیت اور افادیت میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ اردو کے مصنفین اپنی تحریروں میں تاریخوں کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں، اگر

بہت کم افراد نے سنہ دیا، گویا ان کے نزدیک جنوری اور دسمبر میں کوئی زمانی بُعد سرے سے ہے ہی نہیں۔ جناب سید محمد نقوی صاحب نے اپنے حاشیوں میں ہر اہم واقعہ کی مکمل تاریخ دینے کی کوشش کی ہے۔ تاریخوں میں ایک اہم مسئلہ ہجری کا آتا ہے۔ قدیم تحریروں میں زیادہ تر ہجری کی تاریخیں اور سنہ لکھے جاتے تھے اور کبھی کبھی ہجری اور عیسوی دونوں تاریخیں یا سنہ دیئے جاتے تھے۔ آج کل عام طور پر لوگ ہجری تاریخوں سے بالکل ناواقف ہیں۔ اس لئے عیسوی تاریخوں کے بغیر بات نہیں بنتی اس کتاب میں عام طور پر عیسوی تاریخیں یا دونوں ساتھ ساتھ دی گئی ہیں، مگر کہیں کہیں صرف ہجری تاریخیں یا سنہ ہی پر اکتفا کیا گیا ہے، اگر کسی مستند تقدیم کی مدد سے عیسوی تاریخیں یا سنہ بھی دیئے گئے ہوتے تو اچھا تھا۔

تاریخوں کے سلسلے میں ایک اور اہم مسئلے سے دوچار ہونا پڑتا ہے، وہ ہے اختلافات کا مسئلہ۔ میرے خیال میں ایسے مواقع پر تمام اختلافات کو نقل کر دینا چاہیئے جیسا کہ فاضل حاشیہ نگار نے صفحہ ۲ پر مرزا محمد ہادی لکھنوی کی تاریخ ولادت کے سلسلے میں عمل کیا ہے اور اگر خود حاشیہ نگار کی کوئی تحقیق ہو تو اسے ثبوت کے ساتھ پیش کر دینا چاہیئے۔

خوشی کی بات ہے کہ فاضل مرتب نے حاشیوں میں مشاہیر کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں درج کی ہیں۔ اس سلسلے میں کس قدر محنت کرنی پڑتی اور کن کن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنہیں اس کا کچھ تجربہ ہو۔ ضرورت ہے کہ مشہور ادیبوں اور مصنفوں کی کم از کم تاریخ پیدائش اور وفات تحقیق کر کے مرتب کر دی جائے۔ جب تک یہ کام نہیں ہوتا اس طرح کے اندراجات اور حوالوں سے ذہنی انتشار اور الجھن میں اور زیادہ اضافہ ہوگا۔ میں نے سنا ہے کہ ترقی اردو بورڈ کے پروگراموں میں یہ کام بھی شامل ہے، اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔

مسعود حسن ادیب پر اور بھی کتابیں شائع ہوئی ہیں، زیر تبصرہ کتاب کی اشاعت سے اس میں ایک مفید اضافہ ہوا ہے، امید ہے کہ علمی و ادبی حلقوں میں اسے پسند کیا جائے گا اور فاضل مرتب کی مخلصانہ اور کامیاب کوششوں کی مناسب داد ملے گی۔

سہ ماہی اردو - اقبال نمبر ایڈیٹر خلیق انجم

سائز ۱۸×۲۲، حجم ۱۹۲ صفحات، قیمت سالانہ : بیس روپے - اس شمارے کی قیمت دس روپے
سنہ اشاعت ۱۹۷۹ء - ناشر : انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، راؤز ایونیو نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

آزادی سے پہلے انجمن ترقی کے سہ ماہی رسالے کا نام "اردو" تھا، جو بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی ادارت میں نکلتا تھا۔ آزادی کے بعد ہندوستان کی انجمن ترقی اردو کے رسالے کا نام "اردو ادب" رکھا گیا اور اس کے مدیر پروفیسر آل احمد سرور مقرر ہو گئے اور ایک طویل عرصے تک بڑی خوبی اور کامیابی کے ساتھ نکالتے رہے۔ جب انجمن کا دفتر علی گڑھ سے دہلی منتقل ہوا اور اس کے سکریٹری سرور صاحب کی جگہ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب مقرر ہوئے تو ایک مدت تک یہ رسالہ بند رہا۔ اب پھر سے خلیق انجم صاحب کی ادارت میں شائع ہونے لگا ہے، پچھلے سال کے دو شمارے (نمبر ۲ و ۳) کا مشترکہ شمارہ اقبال کی یاد میں شائع کیا گیا ہے جس میں حسب ذیل مضامین شامل ہیں :

(۱) کیا اقبال کشمیری پنڈت تھے؟ از محمد عظیم فیروزآبادی (۲) پیام اقبال از قاضی عبدالغفار مرحوم (سابق سکریٹری انجمن ترقی اردو) (۳) اقبال اور گوئٹے از شیخ حبیب اللہ (۴) کاش اقبال ڈرامہ نگار ہوتا از ابراہیم اشک (۵) اقبال کی تاریخ گوئی - از : ڈاکٹر عبدالغفار شکیل (۶) اقبال کی شاعری میں اختلافی پہلو از : پروفیسر جگن ناتھ آزاد (۷) اردو نظم کا پیش رو، از ڈاکٹر وزیر آغا (۸) ہندوستان میں اقبالیات، از عبدالقوی دسنوی (۹) تبصرے (۱) اقبال جامعہ کے مصنفین کی نظر میں از ایم۔ حبیب خاں (۲) حافظ اور اقبال از : ضیاء الدین انصاری۔

ان مضامین کے بارے میں فاضل مدیر نے لکھا ہے کہ : یہ "مضامین اس لئے اہم ہیں کہ وہ اقبال کے فن پر نئے پہلوؤں سے روشنی ڈالتے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ ہماری یہ حقیر کوشش اقبال کے فن اور ان کی شخصیت کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگی۔" اگرچہ تمام مضامین نہیں تو ان میں سے متعدد پہلے شائع ہو چکے ہیں، ان میں سے پہلا مضمون اور اس کے جواب میں تین موقر خواتین، انیس قدوائی، صالحہ عابد حسین اور قرۃ العین حیدر کا مختصر مراسلہ اور جواب الجواب مراسلہ، یہ تینوں اس سے قبل انجمن کے ہفتہ وار اخبار "ہماری زبان" میں شائع ہو چکے ہیں، اسی زمانے میں

ان کی اشاعت پر بعض لوگوں نے ناگواری کا اظہار کیا تھا جس کا نمایاں اثر مذکورہ خواتین کے مراسلے میں بھی موجود ہے، مگر معلوم نہیں کس مصلحت سے اس خصوصی شمارے میں انھیں دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ عبدالقوی دسنوی صاحب کا مضمون "ہندوستان میں اقبالیات" غالباً آج سے چار سال پہلے لکھا گیا تھا اور جولائی ۷۶ء میں یہ کتابی صورت میں لاہور سے اقبال اکادمی کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ اس وقت بھی اس میں بہت سی خامیاں تھیں اور اب ۱۹۷۹ء میں جب دوبارہ شائع کیا گیا ہے تو اس لحاظ سے اس کی خامیوں میں اور اضافہ ہو گیا ہے کہ پچھلے تین چار سال کی کتابیں اور مضامین اس میں شامل نہیں ہیں۔ اگر کسی وجہ سے اسے شائع ہی کرنا تھا تو نظرثانی کے بعد شائع کرنا چاہئے تھا۔

بہرحال ان خامیوں کے باوجود، اقبالیات سے دلچسپی اور تعلق رکھنے والوں کے لیے مفید اور اقبالیات میں ایک اضافہ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اسے شوق اور دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

اقبال — کچھ مضامین

سائز ۱۸×۲۲/۸ حجم ۱۷۶ صفحات، مجلد قیمت پندرہ روپے۔ تاریخ اشاعت: دسمبر ۱۹۷۹ء

ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

اس کتاب سے پہلے "سہ ماہی اردو ادب" کے جس اقبال نمبر پر تبصرہ کیا گیا ہے، اسی کو بجنسہٖ کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے، صرف آخر کے ۱۶ صفحات، جن میں تبصرے شامل تھے، الگ کر دئے گئے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس پر مرتب کی حیثیت سے کسی کا نام درج نہیں ہے۔ "اردو ادب" کے اقبال نمبر پر ایڈیٹر کی حیثیت سے ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کا نام شائع ہوا ہے اور دونوں کے "حرف آغاز" میں ایم۔ حبیب خاں صاحب لائبریرین انجمن ترقی اردو (ہند) کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ: "انھوں نے اس کی ترتیب و تدوین میں اپنا بھرپور تعاون دیا" اگر کوئی خاص مصلحت مانع نہ رہی ہو تو یہی دونوں نام مرتب کی حیثیت سے درج کر دینے چاہئے تھے۔ بہرحال غالباً یہ پہلا مجموعۂ مضامین ہے جس کا کوئی مرتب نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم اقبال نمبر کے تبصرے میں عرض کر چکے ہیں اور اب دوبارہ عرض کرتے ہیں کہ یہ

مجموعۂ مضامین اقبالیات میں ایک مفید اضافہ ہے اور توقع ہے کہ اقبالیات کے حلقے میں قدر و عزت کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

گلشن

ترتیب و عمل: عبدالاحد ازہری محمد حنیف ملی

سائز ۳۰×۲۰/۸، حجم ۲۴۶ صفحات، سنہ اشاعت ۱۳۹۹ھ (۷۹ - ۱۹۷۸) قیمت درج نہیں۔ ناشر: معہد ملت، رسول پورہ، مالیگاؤں - ۴۲۳۲۰۳۔

ریاست مہاراشٹر کے ضلع ناسک میں ایک علاقہ مالیگاؤں ہے جو اپنے جغرافیائی حدود کے لحاظ سے چھوٹا ہے، مگر صنعتی و تجارتی لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اور پارچہ بافی کا بہت بڑا مرکز ہے۔ یہاں پر بہت بڑی تعداد میں یوپی کے مشرقی اضلاع خصوصاً اعظم گڈھ اور الٰہ آباد کے مسلمان ۶۰ - ۷۰ سال سے آباد ہیں جو بقول مدیر گلشن "(مولانا محمد حنیف صاحب ملی): "شروع ہی سے علم دوست، دین دار اور اسلامی روایات سے وابستہ تھے۔" ان ہی میں سے ایک مولانا عبدالحمید نعمانی صاحب ہیں جن کی اس وقت عمر تقریباً ۸۰ سال ہے (سنہ پیدائش ۱۸۹۲ء) اور جن کا شمار ہندوستان کے ان چند نامور علماء میں ہوتا ہے جو عربی زبان و ادب کے مسلم الثبوت ادیب ہیں۔" چنانچہ ایک عرصے تک وہ آل انڈیا ریڈیو دہلی کے عربی شعبہ نشریات میں کام کرچکے ہیں اور حکومت ہند کے عربی رسالہ "ثقافۃ الہند" کے معاون مدیر رہ چکے ہیں۔

مولانا عبدالحمید نعمانی بڑا درد مند دل اور ملت اسلامیہ کی خدمت کا پرخلوص جذبہ رکھتے ہیں، چنانچہ انھوں نے ملت کی علمی و مذہبی خدمت کے لیے ۱۹۵۲ء میں مالیگاؤں میں ایک اسلامی درسگاہ کی بنیاد رکھی جس کا نام معہد ملت ہے اور اپنی پوری عمر اس درسگاہ کی خدمت کے لیے وقف کردی۔ باوجود اس کے کہ اب بہت ضعیف ہوگئے ہیں مگر پھر بھی مدرسے کی نگرانی و رہنمائی کا فرض حسب معمول انجام دے رہے ہیں۔ زیر تبصرہ مجلہ "گلشن" معہد ملت کے اساتذہ، فارغ التحصیل طلبہ اور موجودہ طلبہ کے ذہنی کاوشوں اور علمی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مدرسے کے بانی مولانا نعمانی کا سایہ قائم رکھے اور

اسے صحت عطا فرمائے تاکہ "محسن ملت" موصوف کی رہنمائی سے تادیر مستفید ہو سکے۔

دیا بجھ گیا (ریڈیو ڈراما)

از: کرتار سنگھ دگل

سائز: ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۹۹ صفحات، مجلد، قیمت: چھ روپے
پہلا ایڈیشن: دسمبر ۱۹۵۲ء، دوسرا ایڈیشن: فروری ۱۹۸۰ء

یہ ایک مختصر سا ریڈیو ڈراما ہے، جس کا تعلق ریاست کشمیر کے اس المناک واقعہ سے ہے جب قبائلیوں نے اس پر حملہ کیا تھا۔ کرتار سنگھ دگل ایک اچھے اور منجھے ہوئے ڈرامہ نگار ہیں اور اس مختصر ڈرامے میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ان کی خصوصیات ہیں زبان، بیان اور مکالمہ نگاری میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں اور خود واقعہ یا موضوع میں ایسی جان ہے جس کی وجہ سے اسے غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ شروع میں ڈاکٹر اخلاق اثر کا ایک طویل تعارف ہے، جس میں تفصیل سے ڈرامے کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس تعارف میں ڈرامے کی خوبیوں پر بڑی اچھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مگر ذرا طویل ہو گیا ہے۔ تعارف یا پیش لفظ ایسا ہونا چاہئے کہ اس کو پڑھ کر اصل کتاب پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہو، نہ کہ اس کو پڑھنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

بہر حال یہ ڈراما اپنے اسلوب اور موضوع کے لحاظ سے اتنا اچھا اور مقصد کے لحاظ سے اتنا پاکیزہ ہے کہ اسے ہر شخص کو پڑھنا چاہئے اور ہر گھر اور ہر لائبریری میں اسے موجود ہونا چاہئے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵۔

ریڈیو ڈرامے کی اصناف

از: ڈاکٹر اخلاق اثر

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۱۹۱ صفحات، مجلد، قیمت: ۲۰ روپے۔ تاریخ اشاعت: مارچ ۱۹۸۰ء۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

پیش نظر کتاب پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے، جسے آج سے دس سال پہلے ۱۹۷۰ء میں لکھا گیا تھا۔ دیباچے کے علاوہ اس کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

(۱) ریڈیو ڈرامے کی اصناف (۲) ریڈیو ڈراما روپ (۳) ریڈیو ڈراما مونولاگ (۴) ریڈیو فیچر (۵) ریڈیو ڈاکومنٹری (۶) مزاحیے، نیوز ریل، رپورتاژ۔

اخلاق اثر صاحب ڈرامے کے فن سے بخوبی واقف ہیں اور اردو ڈراموں پر ان کی اچھی نظر ہے۔ اس سے پہلے اسی سلسلے کی ان کی دو کتابیں چھپ چکی ہیں: ریڈیو ڈرامے کی تاریخ اور اردو ڈرامے کا مطالعہ۔ جن لوگوں کو ڈرامے سے عموماً اور ریڈیو ڈرامے سے خصوصاً دلچسپی ہے اور اس کے فن کو سمجھنا چاہتے ہیں، ان کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے۔

میں واپس آؤں گا (ناول) مصنف: ہاورڈ فاسٹ مترجم: پروفیسر محمد انس

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۵۳۲ صفحات، مجلد مع گرد پوش قیمت ۲۵ روپے۔ تاریخ اشاعت: فروری ۱۹۸۰ء۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ــ ۱۱۰۰۲۵

زیر تبصرہ کتاب ہاورڈ فاسٹ کے مشہور انگریزی ناول "اسپارٹےکس" کا اردو ترجمہ ہے اور اس کے مترجم پروفیسر محمد انس صاحب کا مضمون اگرچہ جغرافیہ ہے، مگر انھیں تقریباً سبھی علمی موضوعات سے دلچسپی ہے اور ان کے لکھنے کا انداز شگفتہ اور دلکش ہے، اس لیے امید ہے کہ یہ طویل ناول دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ اس ناول کے تعارف میں، فاضل مترجم نے صرف چند الفاظ لکھے ہیں، فرماتے ہیں: "یہ ایک دلچسپ اور جاندار نیم تاریخی ناول ہے اور ایک بہت وسیع کینوس کا حامل ہے۔" بہتر ہوتا اگر موصوف ذرا تفصیل سے اس ناول کے پس منظر اور اس کے موضوع سے اردو داں طبقہ کو متعارف کرانے کی زحمت فرماتے۔ دراصل یہ ناول تاریخ کے اس دور سے تعلق رکھتا ہے جب روم میں غلاموں کا رواج تھا۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ اس کی وجہ سے وہاں کے سماج کو کن کن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ اور اس سے کیسی کیسی خرابیاں پیدا ہوتی تھیں۔ یہ ترجمہ "ناولستان جامعہ نگر" سے شائع ہوا ہے۔

بے پر کی (زعفران زار ناول) از: آوارہ

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۴۴ صفحات، مجلد، قیمت ۱۰ روپے۔ دوسرا ایڈیشن: مارچ ۱۹۸۰ء

ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - جامعہ نگر - نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵

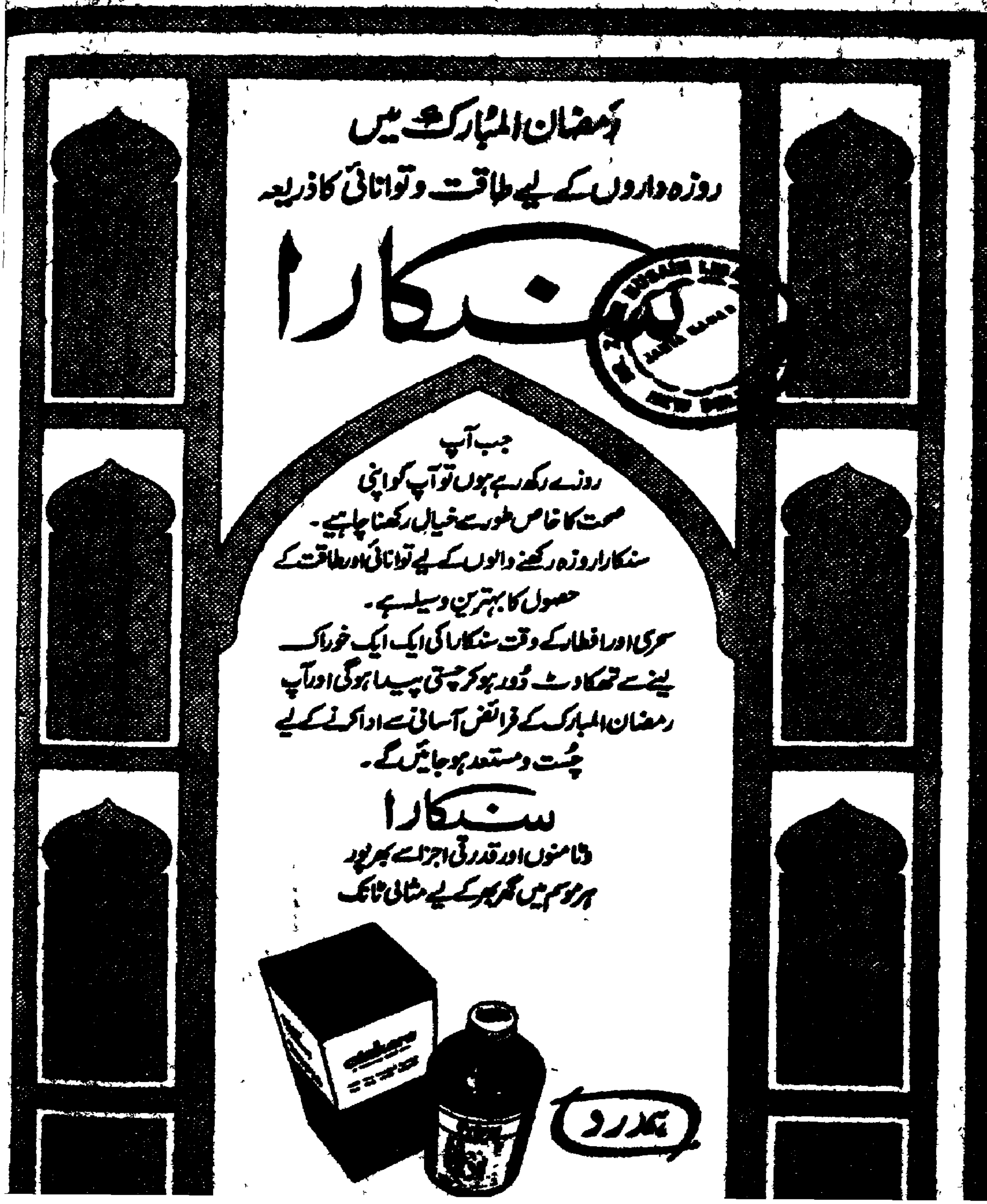
جن لوگوں نے حضرت آوارہ کی چیزیں پڑھی ہیں، وہ جانتے ہیں کہ طنز و مزاح میں انھیں کتنا اونچا مقام حاصل ہے۔ اس کتاب میں اردو کے ممتاز طنز نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کا مقدمہ شامل ہے جس میں انھوں نے "بے پر کی" کے بارے میں لکھا ہے کہ "سید صاحب (یعنی حضرت آوارہ) نے سب سے پہلے "علی گڑھ میگزین" کے لیے "بے پر کی" لکھی تھی۔ اس طرح کی چیز لکھنے والے پہلے بھی گزرے ہیں اور اب بھی نظر آتے ہیں، لیکن زبان کا لطف، زبان پر قدرت اور پتے کی بات کہہ جانے کا جو ملکہ سید صاحب کو ہے وہ دوسرے کو نہیں۔" آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: سید صاحب کی ظرافت ہلکی، سادہ اور تفریحی ہے، وہ کسی ایچ پیچ کو دخل نہیں دیتے۔ اس اعتبار سے "بے پر کی" ان کے رنگ کا سب سے اچھا ترجمان ہے۔" اس کتاب کا دلچسپ اور انوکھا انتساب ملاحظہ ہو: " ٹوٹا برتن شمشیر کے سر، یہ دفتر بے معنی اردو کی نذر ہے "!!

بلا شبہ اس کتاب کی اشاعت سے اردو کے مزاحیہ ادب میں ایک مفید اضافہ ہے۔

ماہنامہ جامعہ کی قیمت میں اضافے کی تجویز

نومبر ۱۹۶۰ء میں جب "جامعہ" کو دوبارہ جاری کیا گیا تھا تو اس کی سالانہ قیمت صرف چھ روپے مقرر کی گئی، مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کے خریدار ہوں اور زیادہ سے زیادہ پڑھا جائے۔ یہ قیمت اس وقت بھی بہت کم تھی، مگر پچھلے دس بیس برسوں میں قیمتوں میں جو اضافہ ہوا، اس قیمت کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں رہی، مگر پھر بھی ہم نے اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا، حالانکہ دوسرے معاصر رسالوں کی قیمتیں کہیں سے کہیں پہنچ گئیں۔ مگر اب کاغذ، کتابت اور طباعت میں اسقدر اضافہ ہو گیا کہ اس قیمت کو جو محض برائے نام ہے باقی رکھنا مشکل ہے۔ اس لئے جامعہ ملّیہ کے ذمہ دار حضرات اب اس پر غور کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں اور غالباً موجودہ قیمت میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور ہو گا۔ اس کے بارے میں ان شاء اللہ ہم اگلے شمارے میں اعلان کریں گے۔ (ادارہ)

Regd. No. D-(S.E.)-106 Vol. 77 No. 7 JULY, 1980
THE MONTHLY JAMIA, Jamia Nagar, New Delhi-110025



جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

جامعہ

سالانہ چندہ | قیمت فی پرچہ
... روپے | پچاس پیسے

جلد ۷۷ | بابت ماہ اگست ۱۹۸۰ء | شمارہ ۸

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ:

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

The Monthly Jamia
Jamia Millia Islamia, New Delhi-110025

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی • مطبوعہ: جمال پریس دہلی ۶ • ٹائٹل: قاسمی پریس دہلی

شذرات

آج ہم مسلم معاشرہ کا جائزہ لیں تو دیکھیں گے کہ ہمارا معاشرہ اخلاقی برائیوں کے سبب خستہ جان اور اخلاق و اخلاص کے فقدان کی وجہ سے ویران ہے۔ علماء، فقہاء، عباد و زہاد اور امراء و صوفیاء، جو سوسائٹی کا نمک ہوتے ہیں، سب کسی نہ کسی اخلاقی کمزوری میں مبتلا ہیں اور علماء میں ہم آج کل کے تعلیم یافتہ حضرات کو بھی شامل کرتے ہیں جو اپنے آپ کو دانشور کہتے ہیں، علم اور دانشوری نے طبقۂ علماء میں اور عبادت اور زہد نے طبقۂ صوفیاء میں عجز و انکساری، محبت و رافت، سخاوت و فیاضی، حلم و مروت کے بجائے تفاخر، حسد، رشک و حد، جاہ پرستی، حُب مال، فضول گوئی اور قساوت قلبی جیسے اخلاقی امراض پیدا کر دئے ہیں اور ان کی اس حالت کا اثر پورے معاشرے پر پڑتا ہے۔ ان میں سے ہر شخص یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ وہ دینی کام انجام دے رہا ہے لیکن اپنی زبان اور اپنے قلم کے زور سے زیادہ سے زیادہ دنیا کما لینا چاہتا ہے۔ حاکمان وقت اور امرائے زمانہ کی وظیفہ خواری کے لئے علماء اور صوفیہ ایک دوسرے کی دستار اچھال رہے ہیں۔ عجیب معاملہ ہے کہ اس دور میں غرور، جاہ پرستی، حُب مال اور ریاکاری جیسے عیوب نفسانی سب سے زیادہ علماء و صوفیاء کے طبقہ میں پائے جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں مسلم معاشرہ کی اصلاح و ترقی کی کیا امید کی جا سکتی ہے۔

امام غزالی نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ تکبر زیادہ تر علم کی وجہ سے آتا ہے۔ عالم یا کچھ جاننے والا بہت جلد اپنے آپ کو عام انسانوں سے بڑا سمجھنے لگتا ہے، وہ عوام سے اپنی عزت اور عقیدت کی توقع اور ان سے ہر قسم کی خدمت کی امید رکھتا ہے، حالانکہ علم کا تقاضا ہے کہ آدمی اپنے علاوہ سب کو بہتر سمجھے اور ہر ایک کے ساتھ تواضع اور اخلاص سے پیش آئے۔ دوسری چیز جس سے تکبر پیدا ہوتا ہے وہ انسان کا نیک عمل اور عبادت ہے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ اس بات کا زیادہ خوف ہے کہ کمبل پوش میں تکبر پایا جائے اور حریر پوش محفوظ رہے۔ امام موصوف نے ریاکاری کی مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ کوئی نیک اور بھلا کام دکھاوے کے لئے نہیں کرنا چاہئے۔ نیک کام کا کرنا خود ایک انعام ہے۔ اس کو لوگوں کی

خوشنودی کے لئے کرنا یا لوگوں کے خوف سے چھوڑ دینا نہایت کم عقلی کی بات ہے۔ ریا کاری عموماً پانچ چیزوں پر ہوسکتی ہے، جسم، ہیئت، قول، عمل، دوست اور خارجی اسباب و سامان ــــ چہرے پر زردی ظاہر کرنا بدن کو کمزور کرنا، آنکھ اور پیٹ کو اندر دھنسائے رکھنا، یہ سب جسمانی ریاکاری ہے گویا جسم خوف خدا سے کمزور اور پیلا پڑ رہا ہے۔ اسی میں بال بکھرائے رکھنا، گردن ڈالے رکھنا، یہ ہیئت کی ریاکاری ہے۔ اسی میں آہستہ آہستہ چلنا، بدن پر کمبل کی عبا ڈالے رکھنا، کپڑے گندے پھٹے اور بوسیدہ رکھنا، پیوند پر پیوند لگانا، صوفیوں والا انگرکھا ڈھیلا ڈھالا لباس پہننا، سب شامل ہے۔ اور لفاظی اور اشعار وغیرہ کے ساتھ وعظ کہنا، لوگوں کے سامنے ہونٹ ہلاتے رہنا کہ ہر دم اللہ اللہ کرتا رہتا ہے۔ بے موقع اور بے محل سختی سے نیک باتوں کا حکم دینا یا برائی سے روکنا، یہ سب اقوال کی ریاکاری ہے۔ اس بات کا خواہشمند ہونا کہ زیادہ لوگ مجھ سے ملنے آئیں تاکہ میں مرجع خاص و عام سمجھا جاؤں۔ دوستوں میں بڑے بڑے شہروں کا اور اپنی خاطر مدارات کا ذکر کرنا، بڑے لوگوں سے اپنی نسبت جوڑنا، یہ سب ریاکاری ہے۔ بعض لوگ عوام کے دل میں اپنی قدر و منزلت بڑھانے کے لئے صومعہ یا معبد میں جا بیٹھتے ہیں ــــ حقیقت یہ ہے کہ ریا کا سمجھنا بہت دشوار معاملہ ہے۔ اس لئے انسان کو چاہئے کہ ہمہ وقت اپنے عمل اور اپنی نیت کا احتساب کرتا رہے۔

۷۰۸ھ کی بات ہے۔ تاریخ چھبیسویں رجب تھی اور دن سنیچر کا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی مجلس میں خواجہ حسن سجزی حاضر ہوئے اور پابوسی کی سعادت حاصل کی۔ اس دن اس مبارک مجلس میں سلطان الاولیاءؒ نے ایک شخص کا ذکر فرمایا جو دمشق کی جامع مسجد میں شب بیداری کرتا تھا اور ساری رات نماز میں کھڑا رہتا تھا اس امید میں کہ لوگ اس کی عبادت سے متاثر ہو کر اسے شیخ الاسلامی کا مرتبہ دے دیں گے۔ بات کرتے کرتے حضرت محبوب الٰہیؒ کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ ایک خاص کیفیت طاری ہوئی اور آپ کی زبان مبارک پر یہ گونجتے ہوئے الفاظ جاری ہوئے "بسوز اول شیخ الاسلامی را و پس خانقاہ را و بعد از آں خود را"۔ یعنی پہلے شیخ الاسلامی کو جلا ڈالو، پھر خانقاہ کو اور اس کے بعد اپنے آپ کو۔ اس کے بعد فرمایا کہ نیت نیک ہونی چاہئے اس لئے کہ دنیا کی نظر عمل پر ہوتی ہے لیکن خدا نیت کو دیکھتا ہے۔ اگر نیت خدا کی رضا جوئی کے لئے ہوگی

تو معمولی عمل بھی اس کے نزدیک پسندیدہ اور مقبول ہوگا۔

اسی سلسلے میں حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ حکایت بیان کی کہ دمشق کی جامع مسجد کا وقف بہت بڑا ہے اور اس کا متولی اتنا با اثر اور ایسا صاحب ثروت ہے گویا ایک لحاظ سے حکمران ثانی ہے یہاں تک کہ اگر بادشاہ کو مال کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ اس متولی سے قرض لیتا ہے۔ بہر حال ایک درویش نے اس وقف کے لالچ میں اس مسجد میں عبادت و ریاضت کرنی شروع کی کہ شاید اس کی عبادت و طاعت کی شہرت ہو جائے اور پھر لوگ اسے خدا رسیدہ سمجھ کر وقف کی تولیت اس کے سپرد کر دیں۔ ایک عرصہ تک وہ اسی طرح عبادت و ریاضت میں مشغول رہا لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی اور کسی کے دل میں اسے متولی بنانے کا خیال بھی نہیں گذرا، یہاں تک کہ ایک دن اس درویش کو خود اپنی اس ریا کارانہ عبادت و ریاضت پر ندامت محسوس ہوئی، دل ہی دل میں بہت پشیمان ہوا اور اسی عالم میں اللہ تعالیٰ سے عہد کیا کہ اب میں وقف کا متولی بننے کی غرض سے نہیں بلکہ صرف تیری رضا جوئی کے لئے تیری عبادت کروں گا، اس نے یہ عہد کیا اور پھر اپنی عبادت میں کوئی کمی کئے بغیر، کمال نیک نیتی سے اسی طرح مشغول رہا۔ چند ہی روز بعد لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور سب نے متفقہ طور پر اسے متولی بنانا چاہا۔ لیکن اس درویش نے کہا کہ "نہیں، اب مجھے اس کی آرزو نہیں، میں نے اس خیال کو ترک کر دیا ہے۔ ایک مدت تک میں اس عہدہ کا آرزومند رہا لیکن اب جبکہ میں نے اس خواہش سے منہ پھیر لیا ہے تو لوگ مجھے یہ عہدہ بخش رہے ہیں۔" غرض کہ وہ درویش اسی طرح رضائے الٰہی کی آرزو میں اپنی عبادت میں مشغول رہا اور پھر اس نے کبھی اپنے دامن کو شغل تولیت کے تصور سے آلودہ نہیں کیا۔

۷۱۵ھ کی بات ہے۔ گیارہویں محرم کو جمعرات کے دن خواجہ حسن سجزی سلطان الاولیاءؒ کی مجلس میں پابوسی کی سعادت سے مشرف تھے۔ موضوع سخن یہ تھا کہ کون سی چیز دنیا ہے اور کون سی چیز دنیا نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ایک صورت اور معنی دونوں لحاظ سے دنیا ہے اور ایک صورت اور معنی دونوں لحاظ سے دنیا نہیں ہے۔ ایک چیز وہ ہے جو صورتاً دنیا نہیں ہے لیکن

معنًا دنیا ہے اور ایک وہ ہے جو ظاہری طور پر تو دنیا ہے لیکن حقیقت میں دنیا نہیں ہے۔ پھر یہ تشریح فرمائی کہ جو چیز کفاف سے زیادہ ہو وہ صورت اور معنی دونوں لحاظ سے دنیا ہے، اور جو چیز صورت اور معنی دونوں لحاظ سے دنیا نہیں ہے وہ اخلاص کے ساتھ طاعت و عبادت ہے۔ وہ جو صورتًا دنیا نہیں ہے اور معنًا دنیا ہے، وہ عبادت ہے جو ریاکاری سے اس غرض سے کی جاتی ہے کہ اس سے دنیوی منفعت حاصل ہو اور جو بظاہر دنیا ہے لیکن حقیقت میں دنیا نہیں ہے وہ اپنے بیوی بچوں کا حق ادا کرنا ہے اس نیت سے کہ واقعی ان کا حق ادا کرنا مقصود ہو۔

اسی سال دوشنبہ کے دن ستائیسویں صفر کی مجلس میں ان ریاکار عابدوں کا ذکر ہوا کہ ریاضت تو بہت کرتے ہیں لیکن دل اس شغل سے معمور نہیں ہوتے۔ فرمایا کہ دنیا میں چار قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ بعض تو وہ ہیں جن کا ظاہر آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے لیکن باطن خراب ہوتا ہے۔ بعض وہ ہیں جن کا باطن آراستہ ہوتا ہے لیکن ظاہر خراب۔ بعضوں کا ظاہر و باطن دونوں خراب ہوتا ہے اور بعض لوگوں کا ظاہر و باطن دونوں آراستہ و پیراستہ۔ وہ جماعت جس کا ظاہر آراستہ اور باطن خراب ہوتا ہے، ان ریاکار عبادت گزاروں کی جماعت ہے جو عبادت بہت کرتے ہیں لیکن ان کا دل دنیا میں اٹکا رہتا ہے۔ وہ جماعت جس کا باطن آباد اور ظاہر خراب رہتا ہے، وہ دیوانے ہیں جو اپنے دل کی دنیا کو یادِ حق سے آباد اور دنیا کے سر و سامان کی طرف سے اپنی آنکھیں بند رکھتے ہیں اور عوام ہیں کہ ان کا ظاہر و باطن دونوں خراب ہوتا ہے، البتہ وہ جماعت سچے مشائخ کی جماعت ہے جس کا ظاہر بھی آراستہ ہوتا ہے اور باطن بھی۔

سیّد اطہر رضا بلگرامی

ترقی پذیر ممالک کی دفاعی سرگرمیاں

ایک اقتصادی جائزہ

ملک کا دفاع حکومت کا بنیادی فرض ہے ۔ ملک کی سیاسی و معاشی آزادی، ترقی و خوشحالی، امن و آسودگی سب کچھ اس بات پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک پیداوار کے مادّی، انسانی و سرمائی وسائل اور ان کی صلاحیتوں کا تحفظ کرتا ہے اور ایک پُرامن ماحول قائم رکھتے ہوئے ترقیاتی کاموں کو سرگرم عمل بناتا ہے ۔ اس طرح ملک کا دفاع اس کے حال و مستقبل کے تمام قدرتی، مادّی، سرمائی، اور انسانی سرمائے کی حفاظت کی ضامن ہے ۔ اس اہمیت کا احساس ہر ملک کو ہے اور اسی لیے آج تمام ممالک خواہ وہ ترقی یافتہ ہوں یا ترقی پذیر دفاعی سرگرمیوں میں متواتر ترقی و توسیع کرتے جا رہے ہیں اور قومی آمدنی کا ایک نمایاں حصہ مسلسل بڑھتے ہوئے رجحان کے ساتھ دفاعی میدان میں خرچ کرتے جا رہے ہیں ۔ اسی لیے کسی ملک کی دفاعی صنعتوں کا شمار اہم اور چوٹی کی صنعتوں میں ہوتا ہے جو بڑے پیمانہ پر روزگار، انسانی محنت و صلاحیت، سرمایہ، زرِ مبادلہ، خام مال اور جدید سائنسی و ٹکنیکی معیاروں کو بروئے کار لاکر پوری معیشت پر گہرا اور بھرپور اثر ڈالتی ہیں، لیکن معاشیات کے دائرے میں دفاعی سرگرمیوں پر بڑھتے ہوئے اخراجات کو معاشی افادیت کے نقطۂ نظر سے مشکوک سمجھا جاتا ہے ۔ معاشیات کے ماہرین کے درمیان یہ موضوع ہمیشہ زیرِ بحث رہا ہے کہ ایسے مصارف بالخصوص ترقی پذیر ممالک میں کس حد تک معاشی فلاح بہبود اور افادیت میں اضافے کا ذریعہ بنتے ہیں اور پیداآور ہوتے ہیں، نیز دوسرے اہم مسائل کے مقابل

ڈاکٹر سید اطہر رضا بلگرامی، لکچرر شعبۂ معاشیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

کس حد تک مناسب یا جائز اور ضروری ہوتے ہیں۔ یہاں اسی نقطہ نظر کے چند اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان مصارف کے اقتصادی رخ کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مضمون میں ترقی پذیر ممالک میں ہندوستان کو ہی چنا گیا ہے اور اس طرح جن نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے اس کا تعلق صرف ہندوستان سے ہے۔

ہندوستان کے دفاعی اخراجات کا جائزہ

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ ہندوستان کے دفاعی اخراجات دیگر تمام ممالک کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ یہاں تک کہ یہ کہنا بھی درست معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مجموعی دفاعی مصارف یہاں کے شادی بیاہ پر ہونے والے مجموعی مصارف سے بھی کم ہیں۔ اس سے اگر دفاعی مصارف کو معاشی طور سے غیر افادی تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے کہیں زیادہ شادی بیاہ اور دیگر سماجی و مذہبی رسم و رواج پر ہونے والے اخراجات کو کہیں زیادہ غیر افادی تسلیم کرنا پڑے گا۔ ہندوستان کے گذشتہ ۱۵ سال کے دفاعی اخراجات کا جائزہ ذیل کے نقشہ سے بخوبی ہو جاتا ہے جس میں کل اخراجات، کل دفاعی اخراجات، کل پیداوار اور پھر کل دفاعی اخراجات کا حکومت کے کل اخراجات اور ملک کی کل پیداوار سے رشتہ واضح کیا گیا ہے۔

ہندوستان کے دفاعی اخراجات ۶۱-۱۹۶۰ تا ۷۷-۱۹۷۶

(رقم کروڑ روپیے میں)

سال	حکومت کے کل اخراجات	کل دفاعی اخراجات	دفاعی اخراجات کل اخراجات کی فی صد کی شکل میں	کل قومی پیداوار	دفاعی اخراجات قومی پیداوار کی فی صد کی شکل میں
۱۹۶۰-۶۱	۱۸۵۶	۲۸۱	۱۵٫۱ فی صد	۱۳,۲۹۴	۲٫۱ فی صد
۱۹۶۵-۶۶	۲۷۲۰	۸۸۵	۳۲٫۵ "	۲۱,۸۵۶	۴٫۰ "
۱۹۷۰-۷۱	۴۱۲۰	۱۱۹۹	۲۹٫۱ "	۳۶,۴۵۴	۳٫۳ "
۱۹۷۶-۷۷	۱۰۲۹۱	۲۵۶۳	۲۳٫۸۹ "	۶۹,۰۴۷	۳٫۷ "
	۱۸۹۸۶	۴۹۲۸		۱,۴۰,۸۵۱	

("انڈیا" ۱۹۷۰ء ۱۹۷۹)

ان اعداد وشمار سے ہندوستان کے دفاعی اخراجات کی چند اہم خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں۔ اوّل یہ کہ ۱۹۶۰-۶۱ تا ۱۹۷۶-۷۷ کے دوران حکومت کے کل اخراجات، کل دفاعی اخراجات اور کل قومی پیداوار میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو ۱۹۶۵-۶۶ سے اخراجات میں دفاعی اخراجات کا حصہ مسلسل گھٹتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۶۰-۶۱ میں کل اخراجات میں دفاعی اخراجات کا حصہ ۱۵٫۱ فی صدی تھا جو ۱۹۶۵-۶۶ میں ۲۲٫۵ ہو گیا لیکن ۱۹۷۰-۷۱ میں ۱۹٫۱ فی صدی اور ۱۹۷۶-۷۷ میں صرف ۹٫۴۲ فی صدی رہ گیا۔ تقریباً یہی صورتِ حال کل قومی پیداوار کے رخ سے بھی رونما ہوتی ہے۔ کل قومی پیداوار میں اخراجات کا حصہ ۱۹۶۰-۶۱ میں ۲٫۱ فی صدی تھا۔ ۱۹۶۵-۶۶ میں بڑھ کر ۳٫۲ فیصد کا ہو گیا لیکن ۱۹۷۰-۷۱ میں صرف ۲٫۸۲ فی صدی تھا اور ۱۹۷۶-۷۷ میں معمولی اضافے کے ساتھ ۳٫۷ فی صدی ہو گیا۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ کل اخراجات اور کل قومی پیداوار میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے۔ دونوں کے باہمی رشتے ایک ہی نوعیت کے ہیں لیکن دفاعی اخراجات ۱۹۶۵-۶۶ کے بعد مسلسل گھٹتے نظر آتے ہیں۔ اس طرح دفاعی اخراجات اور حکومت کے کل اخراجات اور کل قومی آمدنی کے درمیان ۱۹۶۵-۶۶ کے بعد ایک منفی نسبت قائم ہے۔

ہندوستان میں دفاعی پیداوار کی پالیسی اور اس کی ترقی و توسیع "ڈیفنس پروڈکشن بورڈ" طے کرتا ہے۔ اس وقت شعبہ ڈیفنس پروڈکشن بورڈ کے ماتحت ۳۱ آرڈیننس فیکٹریاں مختلف نوعیتوں کی دفاعی پیداوار میں سرگرم عمل ہیں جن میں ٹینکس، اعلیٰ معیار و کارکردگی کی بندوقیں، رائفلیں، مشین گنیں، توپیں، راکٹ، بم، آتش گیر مادے، کارتوس، گولے اور بارود، جٹ ہوائی جہاز، سپرسانک جہاز، جٹ اسلحہ بردار گاڑیاں، ساز وسامان ڈھونے والی گاڑیاں، ہیلی کوپٹر، مگ ۲۱-ایم اور میزائل خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ ۱۹۴۷ تک ایسی تمام اشیاء کی مجموعی پیداوار ۱۵ کروڑ روپیہ تھی جو ۱۹۷۶-۷۷ تک بڑھ کر ۲۸۰ کروڑ روپیہ ہو گئی۔ موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ اس طرح کے بہت سے کارخانے خود کفیل ہو گئے ہیں جن کی پیداوار میں بیرونی ساز وسامان صرف ۱۰ فی صدی استعمال ہو رہا ہے۔ گاڑیاں، ساز وسامان ڈھونے والی گاڑیاں، ہیلی کوپٹر، میگ ۲۱-ایم و میزائل خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ۱۹۴۷ تک ایسی تمام اشیاء کی مجموعی پیداوار ۱۵ کروڑ روپیہ کی تھی جو ۱۹۷۶-۷۷ تک بڑھ کر ۲۸۰ کروڑ روپیہ ہو گئی۔ موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ اس طرح کے بہت سے کارخانے خود کفیل ہو چکے ہیں اور

ان کی پیداوار میں صرف ۱۰ فی صدی درآمدی اشیاء لگتی ہیں۔

دفاعی پیداوار کے میدان میں پبلک سیکٹر کی صنعتوں نے بھی ایک اہم اور موثر رول ادا کیا ہے۔ اس وقت پبلک سیکٹر میں ۹ کارخانے کام کر رہے ہیں۔ ایچ۔ اے۔ ایل (ہندوستان ایرونوٹکس لمیٹڈ) بی۔ ای۔ ایل (بھارت الیکٹرونک لمیٹڈ)، بھارت ارتھ موورس لمیٹڈ، مزگاؤں ڈاک اور گارڈن ریسرچ ورکشاپ، یہ چار اہم مرکزی کارخانے ہیں جو اس سیکٹر میں دفاعی ضروریات کو پورا کر رہے ہیں۔ ایک تخمینے کے مطابق ۳۱ مارچ ۱۹۷۷ تک ۹۲ ہزار افراد ان صنعتوں میں کام کر رہے تھے اور ان کی مجموعی پیداوار ۵۰ تا ۶۰ لاکھ روپیہ سالانہ کی در سے بڑھ رہی تھی ان کارخانوں کی پیداوار کے ذریعہ ۷۸-۱۹۷۷ میں ۳۶٫۰۵ کروڑ روپیہ کا زرمبادلہ حاصل کیا گیا۔

دفاعی پیداوار اور اس پر ہونے والے مصارف کا یہ مختصر سا خاکہ اس کی معاشی اہمیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ کارخانے مجموعی طور پر کروڑوں روپیہ کا سرمایہ، لاکھوں انسانوں کی روزی کا ذریعہ، کروڑوں روپیہ کے زرمبادلہ اور پیداوار کے ضامن ہیں۔ اس طرح یہ اخراجات ہر پہلو سے معیشت پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔

معاشیات کے دائرہ میں دفاعی اخراجات کا تجزیہ

دفاعی اخراجات پر ایک اہم اعتراض یہ ہے کہ یہ مصارف غیر پیداآوری اور سماجی فلاح کے نقطۂ نظر سے غیر افادی ہیں، اس لیے یہ جس قدر بڑھتے ہیں، معیشت پر بوجھ بنتے ہیں اور معاشی فلاح کے موثر ذریعے کے بجائے افراط زر، اشیائے صارفین کی قلت، قیمتوں کے بڑھتے ہوئے رجحان اور نتیجتاً عوام، بالخصوص درمیانی اور پچھڑے طبقے کے پست معیار زندگی اور معاشی ناآسودگی کا سبب بنتے ہیں۔ اس کی وضاحت اس طرح کی جاتی ہے کہ بڑھتے ہوئے دفاعی اخراجات روزگار کے دائرے کو وسیع کر کے عوام کی جیبوں میں بشکل مزدوری، تنخواہ، خام مال کی قیمت، سرمائے کے سود اور کرایے کا روپیہ تو پہونچا دیتے ہیں اور ان کی قوت خرید میں اضافہ کر کے طلب کو تو بڑھا دیتے ہیں لیکن اس اضافی قوت خرید کے مقابلہ جو سامان پیدا کرتے ہیں ان کا تعلق کسی لحاظ سے بھی بنیادی اور اہم ضرورتوں سے نہیں ہوتا۔ اس طرح یہ بڑھتے ہوئے مصارف صرف ایک رخی عمل انجام دیتے ہیں

اور وہ طلب کو بڑھاتا۔ دوسرا اہم پہلو جس کا تعلق بڑھی ہوئی طلب کو پورا کرنے سے ہے۔ یہ مصارف روزمرہ کی ضروریات کو کسی حالت میں بھی پورا نہیں کرسکتے۔ یہ صورت حال ترقی پذیر ملک کے لیے زیادہ تشویش ناک ہوتی ہے کیونکہ اس کے بیشتر عوام کی آمدنی میں اگر کوئی اضافہ ہوتا ہے تو اس کا بیشتر حصہ بنیادی اور اہم اشیائے صرف پر ہی خرچ ہوتا ہے۔ اس طرح تمام ترقی پذیر ممالک کی آمدنی میں اگر کچھ اضافہ ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے بنیادی اشیائے صرف کی طلب میں بھی اضافہ ہوتا ہے جس کو فوری طور پر پورا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ آج ہندوستان میں بھی معاشی ترقی کے لیے مجموعی سرمایہ کا بیشتر حصہ سرمائی اشیاء کی پیداوار میں اضافے کا باعث ہے۔ ترقیاتی منصوبوں میں جہاں ہر صورت میں خودکفالت بنیادی مقاصد میں شامل ہو، وہاں بھی ابتدا ہی سے اشیائے صرف کو طلب کے مطابق پیدا کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ تو کسی ملک کی انتہائی ترقی کا ثبوت ہے کہ وہ عوام کی طلب کے بموجب اپنی تمام اشیاء فراہم کرسکے۔ ترقی پذیر ممالک اس منزل سے ابھی بہت دور ہیں۔ اس منزل پر پہنچنے کے لیے ان کو منصوبہ بند طور پر آگے بڑھنا ہوگا۔ اس کی پہلی منزل یہ ہے کہ سرمائی اور صنعتی ڈھانچے کو مستحکم کیا جائے تاکہ مستقبل میں یہی ڈھانچہ تمام اشیائے صرف کو وافر مقدار میں پیدا کرنے میں معاون ثابت ہو۔ آج معیشت کے گوشے گوشے میں فولادی بھٹیوں، ڈیزل، بجلی گھروں، مختلف نوعیتوں کے کل پرزوں، بھاری مشین سازی، ڈیم، ریلوں، سڑکوں پر بڑے پیمانے پر سرمایہ لگایا گیا ہے ان سب کا مقصد مستقبل قریب میں بنیادی اور اہم اشیائے صرف کو ہی پیدا کرنا ہے تاکہ عوام کا معیار صرف بلند ہو اور عوام زیادہ پُرسکون اور خوشحال زندگی گذار سکیں۔ اگر حکومت سرمایے کے اضافے کے رجحان کی حوصلہ افزائی کرتی رہے تو اس سے سماج کی خوشحالی اور آسودگی کی ضمانت دی جاسکتی ہے، حکومت کی ایسی ہی ترقیاتی سرگرمیاں معاشی اعتبار سے اہمیت اور افادیت کی حامل ہوتی ہیں، لیکن دفاعی اخراجات نہ تو حال میں کسی معاشی بہبودی اور آسودگی کا باعث ہوتے ہیں اور نہ مستقبل میں کسی معاشی بہتری کی ضمانت دیتے ہیں۔ معاشی لحاظ سے ان کا عمل ایک طرفہ ہوتا ہے، وہ محض روزگار فراہم کرتے ہیں، آمدنی میں اضافہ کرتے ہیں اور قوتِ خرید بڑھاتے ہیں، یعنی مجموعی حیثیت سے طلب کو بڑھانے کا کام انجام دیتے ہیں، لیکن روز بروز کی بڑھتی ہوئی ضرورت اور طلب کو پورا کرنے کے لیے جس طرح کی اشیاء کی ضرورت ہوگی اس کو فراہم کرنے سے قطعی قاصر ہیں اس کی

ذمہ داری بہ طور دوسرے شعبہ جات جیسے زراعت، صنعت، رسل و رسائل اور تجارت وغیرہ پر عائد ہوگی۔ اس طرح دفاعی اخراجات اضافۂ طلب کے ایک طرفہ عمل کے ذریعہ دوسرے شعبہ جات کو مستقل طور پر مزید زیر بار کرتے رہتے ہیں۔ اگر یہ شعبہ جات اس اضافی بوجھ کو خوش اسلوبی سے برداشت کرتے رہیں گے تو معیشت میں عدم توازن کی کوئی خطرناک کیفیت رونما نہ ہو سکے گی۔ ترقی یافتہ ممالک میں یہی صورت حال ہے، وہاں کے دیگر شعبہ جات اتنے مستحکم ہو چکے ہیں کہ دفاعی اخراجات کا غیر پیدا آور معاشی بوجھ آسانی سے برداشت کر لیتے ہیں، لیکن اگر یہ شعبہ جات خود ہی کمزور ہوئے یا ترقی کی ابتدائی منزلوں سے گزر رہے ہو ں جیسے ہندوستان کی زراعت اور دوسری اشیائے صرف کی صنعتوں مثلاً تجارت اور رسل و رسائل سے ثابت ہوتا ہے تو پھر یہی بڑھتے ہوئے دفاعی مصارف قیمتوں اور لاگتوں میں اضافے، اشیائے صرف کی قلت اور ان سے پیدا شدہ تمام غیر سماجی سرگرمیوں کو جنم دینے میں مددگار ہوں گے۔ ایسی صورت میں دفاعی اخراجات معیشت پر بوجھ ثابت ہوں گے۔ اس صورت حال میں زیادہ سرمایہ والے دفاعی اور غیر دفاعی اخراجات کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ دفاعی اخراجات کی طرح زیادہ سرمایہ والے ترقیاتی مصارف بھی قیمتوں کو بڑھاتے ہیں، بنیادی اشیاء کی رسد کو طلب کے بموجب بڑھانے سے قاصر رہتے ہیں، آمدنی بڑھاتے ہیں اور قوتِ خرید کو بڑھا کر طلب میں اضافہ کرتے ہیں اور چونکہ اس طرح کے تمام مصارف بھی فوری طور پر مطلوبہ اشیاء کی پیداوار کو نہیں بڑھا سکتے اس لیے نتیجتاً یہاں بھی قیمتیں بڑھتی ہیں، افراطِ زر کا دباؤ بڑھتا ہے اور تنخواہ دار و مزدور طبقہ معاشی ناآسودگی کا شکار ہوتا ہے۔ اس لیے خواہ وہ دفاعی اخراجات ہوں یا حکومت کے زیادہ سرمایہ والے ترقیاتی اخراجات نتیجہ دونوں کا یکساں رہے۔ لیکن ان دونوں اخراجات کا فرق قلیل و طویل مدت میں واضح ہو جاتا ہے۔

قلیل مدت کے رو سے دفاعی و دیگر سرمایہ کی مد والے اخراجات معیشت پر ایک ہی انداز کا اثر ڈالتے ہیں یعنی دونوں اخراجات روزگار فراہم کرتے ہیں، آمدنی میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں قوتِ خرید بڑھاتے ہیں اور اس طرح مجموعی حیثیت سے طلب کو فروغ دیتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس اس بڑھی ہوئی طلب کی تسکین کے لئے اشیائے صرف فراہم نہیں کرتے۔ نتیجتاً دونوں اخراجات قیمتوں کو بڑھانے، اشیائے صرف کی قلت اور تنخواہ دار و پست طبقہ کے معیارِ زندگی کو مزید پست کرنے کا

ذریعہ بھی بن جاتے ہیں۔ زیادہ سرمایہ والے وہ پروجیکٹ جن کو، مثال کے طور پر، بیس برس قبل شروع کیا گیا تھا وہ اب مختلف اقسام کی اشیائے صرف کی پیداوار کو بڑھانے میں معاون ہوں گے اور اس طرح ان اخراجات کے اثرات طویل مدت میں دوہرے ہو جائیں گے۔ وہ طلب کے ساتھ ساتھ رسد کو بڑھا کر طویل مدت میں معاشی عدم توازن کو درست کر لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں جبکہ دفاعی اخراجات اس صلاحیت سے محروم نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک کارخانہ جو ٹینک، جنگی بندوقیں، رائفلیں، بم و بارود بنا رہا ہے وہ قلیل و طویل دونوں مدتوں میں ملک کو یہی سامان فراہم کرتا رہے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ممکن ہو گا کہ یہ سامان زیادہ تعداد میں، کم سے کم لاگت پر، اعلیٰ کارکردگی کے ساتھ، زیادہ طاقتور اور زیادہ بہتر ہو جائے۔ لیکن جو سامان بھی پیدا ہو گا عمل و استعمال کے اعتبار سے یکساں رہے گا۔ دوسری طرف ایک دوسرا کارخانہ جو خام لوہا گلا کر بہتر لوہا تیار کر رہا ہے۔ وہ لوہا مختلف مشینوں، کل پرزوں، رسل و رسائل میں استعمال ہو رہا ہے اور اس سے مختلف طرز کی مختلف عمل کی مشینیں بنائی جا رہی ہیں، طویل مدت میں یہ مشینیں ٹریکٹر، صنعتی مشینری، رسل و رسائل کے ذرائع وغیرہ پیدا کرنے کا کام انجام دیں گی جو کہ پیدا آوری کا عمل کرتے ہیں اس طرح لوہے کے اس استعمال سے کل سماجی پیداوار میں اضافہ ہو گا۔ اب اگر یہی لوہا دفاعی کارخانوں میں پہونچ جائے تو بندوقوں، گولیوں، توپوں، ٹینکوں کی شکل میں ڈھل کر عوام کی کسی ضرورت کی تسکین کا ذریعہ نہیں بن سکتے خواہ مدت کتنی ہی لمبی کیوں نہ تصور کر لی جائے۔ یہاں ان اخراجات کے اثرات یکساں رہیں گے۔ بالفاظ دیگر دفاعی اخراجات غیر پیدا آور ہوتے ہیں اور سرمایہ کی مد میں کئے جانے والے دوسرے اخراجات پیدا آور ہوتے ہیں۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ دفاعی اخراجات اپنے عمل اور مقصد کے اعتبار سے محدود اور ان کے اثرات یکطرفہ ہوتے ہیں جبکہ سرمایہ کی مد میں ہونے والے دیگر اخراجات کثیر المقاصد، وسیع دائرہ عمل کے سبب زیادہ پیدا آور ہوتے ہیں۔

امریکہ و روس جیسے ترقی یافتہ ممالک اگر اپنے دفاعی اخراجات کو مسلسل تیز رفتاری کے ساتھ بڑھا رہے ہیں تو وہ یہ قدم ایک مستحکم معیشت کے بل پر اٹھا رہے ہیں۔ جہاں ان کے تمام شعبہ جات ترقی کی اس منزل پر پہونچ چکے ہیں کہ وہ تیز رفتاری سے بڑھتے ہوئے دفاعی اخراجات کے تمام تر مضر معاشی اثرات کو با آسانی جھیل لے جائیں گے۔ ان ممالک میں، زراعت، صنعت، تجارت، سائنس ٹکنالوجی،

ریسرچ رسل و رسائل اتنے مستحکم و پائدار بن چکے ہیں کہ دفاعی اخراجات کے ذریعہ بڑھی ہوئی طلب کو باآسانی برداشت کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر ترقی پذیر ممالک ان کی تقلید کرتے ہیں یہ لحاظ کئے بغیر کہ دیگر شعبہ جات کی ترقی و پائیداری کا معیار کیا ہے تو یقیناً یہ غیر صحت مند تقلید ہوگی۔

دفاعی اخراجات پر یہ اعتراضات کہ وہ معاشی اعتبار سے غیر پیداآور ہیں، عوام کی معاشی آسودگی و معیارِ زندگی کو کسی بلند سطح تک اٹھانے سے قاصر ہیں، ایک طرفہ معاشی عمل انجام دیتے ہیں جہاں محض طلب میں توسیع ہوتی ہے وغیرہ۔ جس قدر درست و مدلل نظر آتے ہیں اسی قدر کمزور بھی ہیں۔ کیونکہ یہ دفاعی اخراجات کے ایک اہم مثبت رُخ کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔

وہ مثبت رُخ یہ ہے کہ سرمایہ خواہ کہیں بھی لگایا جا رہا ہو ہمیشہ تحفظ چاہتا ہے۔ وہ تحفظ امن و امان و سکون کے درمیان پروان چڑھتا ہے، بڑھتا ہے، اور پھلتا پھولتا ہے۔ یہ تحفظ مقامی ملکی و بین الاقوامی نوعیتوں کا ہو سکتا ہے۔ اور یہ حکومت کی ہی قوت ہے، اسی کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایک وسیع انتظامیہ اور "نیٹ ورک" کے ذریعہ امن و آشتی کے ماحول کو بنائے رکھے اور تحفظ کا احساس قائم رکھے۔ یہ ہم سب کے تجربہ کی بات ہے کہ جہاں کہیں مسلسل طور پر سیاسی، قدرتی یا دیگر وجوہات کی بنا پر امن و امان کو خطرہ لاحق ہوا، تحفظ مشکوک بنا۔ ایسے مقامات پر کوئی سرمایہ دار اپنا سرمایہ پھنسانا نہیں چاہتا کیونکہ اس کو اپنے سرمایہ کے ڈوب جانے کا ڈر لگا رہے گا۔ وہاں صنعت تجارت، منڈیاں، اسکول، زراعت ترقی نہیں کرتے اور نتیجتاً دھیرے دھیرے ایسے مقامات ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح جب ایک ملک دوسرے ملک پر حملہ آور ہوتا ہے تو سب سے زیادہ نقصان معیشت کو پہونچتا ہے۔ کارخانے، صنعتیں، زراعتی فارم، گودام، رسل و رسائل، تعلیمی و تجرباتی ادارے، منڈیاں، بازار، اور انسانی طاقت کے ساتھ ساتھ بہترین انسانی دماغ و صلاحیتیں سب تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک ایسا معاشی نقصان ہوتا ہے جس کی تلافی جلد ممکن نہیں ہوتی۔ اسی طرح کوئی اندرونی یا بیرونی ہنگامہ ایک غیر محفوظ ماحول پیدا کر دیتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں معاشی ترقی میں نہ صرف جمود آ جاتا ہے بلکہ وہ تنزل کی طرف بڑھنے لگتی ہے۔ دفاعی سرگرمیاں اور ان پر بڑھتے ہوئے اخراجات دراصل ایک حفاظتی اقدام ہے، ایک محفوظ ماحول، اور امن و امان کے احساس کو قائم رکھنے پر سرمایہ لگاتا ہے تاکہ پوری معیشت مکمل تحفظ کے ماحول

ہیں ترقی کر سکے۔ اس طرح دفاعی سرگرمیاں نہ صرف ملکی سرمایہ کی حفاظت کرتی ہیں بلکہ جو سرمایہ لگایا جا چکا ہے، جو مادّی ترقی حاصل کی جا چکی ہے، جو معاشی معیار عوام کو دیا جا چکا ہے، جو معاشی آسودگی عوام حاصل کر رہے ہیں ان سب کو محفوظ رکھنے کی ضامن بھی ہیں۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دفاعی اخراجات مطلق غیر پیدا آور ہیں۔ تحفظ، امن و امان کا احساس پیدا کرنا جس سے دیگر تمام ترقیاتی سرگرمیاں جاری رہ سکیں، فروغ پاتی رہیں اور بہتر نتائج دیتی رہیں بذاتِ خود ایک اِفادی و پیدا آور عمل ہے۔

بقیہ: تعارف و تبصرہ بہ سلسلہ صفحہ ۴۰۷

جلتی سانسیں تپتے چہرے ساکت ہونٹ سلگتے دل   اُس محفل میں چپ رہ کر بھی کہتے ہیں افسانے لوگ
سب کو ہنسنے کی اجازت ہے کہاں گلشن میں   چند کلیوں سے بہاروں کی شناسائی ہے

ہمارے شاعروں نے اکثر رہبر کو رہزن یا راہبر کو راہ زن کہا ہے، مگر اس کو جس خوبی یا جس انداز سے جناب شاعر نے کہا ہے اس کی مثالیں کم ملیں گی۔ چند شعر پیشِ خدمت ہیں:

جس شخص کا راہبر سے ملا تجربہ ہمیں   محسوس یہ ہوا کہ وہی راہزن میں تھی
لٹ گیا قافلہ کیا کہیے کہ لوٹا کس نے   راہ میں کوئی نہ تھا راہ نما سے پہلے
ملا ہے راہبروں سے ہمیں شعور اتنا   کہ کم سے کم نگہِ راہزن سمجھتے ہیں
راہزنوں کی راہ زنی کا ذکر تھا اتنا یاد تو ہے   جانے پھر کیوں بڑھتے بڑھتے راہنما تک بات گئی

عربی ادب میں "مہجری ادب" کے نام سے ایک مستقل صنفِ شاعری کی بنیاد پڑ گئی ہے، اگر پاکستان اور ہندوستان کے مہاجر شعراء کے کلام کا اس نقطۂ نظر سے انتخاب کیا جائے تو اردو ادب میں بھی "مہجری ادب" کی مضبوط بنیاد ڈالی جا سکتی ہے۔ جناب شاعر غالباً کافی صبر و ضبط کے آدمی ہیں، مگر ان کے یہاں بھی ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، ایک ہی غزل کے تین شعر سنئے:

جھکا کے سر بھی ترے آستاں پہ دیکھ لیا   جبیں کو کچھ نہ ملا شرمِ بندگی کے سوا
ہزار ساغر و مینا چھلک گئے لیکن   ملا ہے کیا ہمیں ساقی سے تشنگی کے سوا
رخِ حیات کو ہم نے ہی تازگی بخشی   ہمیں کو کچھ نہ ملا، زخمِ زندگی کے سوا

کبھی صورتِ حال ایسی بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ وطنِ ثانی کو آدمی پردیس کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے:

چھٹ گیا ہے کبھی پردیس میں جب ذکرِ وفا   یاد آئی ہیں بہت اہلِ وطن کی باتیں

اور کبھی یہ کیفیت بھی ہوتی ہے کہ خود اپنے گھر میں آدمی اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا ہے:

تمام شب مجھے تکتے رہے دیوار و در   اک اجنبی کی طرح میں خود اپنے گھر میں رہا

حضرت شاعر کے کلام میں جو خوبیاں ہیں، ان کا خیال ہے یہ سب لطافتِ غزل کا فیض ہے:

یہ سب غزل کی لطافت کا فیض ہے شاعرؔ
نئے نئے جو ہمیں سوچنے کے ڈھنگ ملے

مجیب رضوی

تلسی داس

تلسی داس کے کارناموں کو تو ہم جانتے ہیں لیکن بیشتر صوفی سنتوں کی طرح ان کے حالات زندگی سے ناواقف ہیں۔ ان کی جائے پیدائش سوراؤں ہے یا راجہ پور، ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ ان کی پیدائش اور موت کا سال بھی پورے یقین سے نہیں بتایا جا سکتا۔ ہماری ساری معلومات کا انحصار اندازوں پر ہے اور اندازوں کے بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔ اب تک یہی اندازہ لگایا جا سکا ہے کہ تلسی داس ۱۵۲۳ء سے ۱۵۳۲ء کے درمیان پیدا ہوئے ہوں گے اور ۱۶۲۳ء کے قریب ان کا انتقال ہوا ہوگا۔ سچائی جو بھی ہو لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انھوں نے شہنشاہ اکبر کے جاہ و جلال کو دیکھا تھا۔ جہانگیر کے عہد میں وہ زندہ تھے۔ وہ تلسی سے گوسوامی تلسی داس ہو چکے تھے اور ان کی شہرت عبدالرحیم خان خانان جیسے منصب دار اور شاعر تک پہونچ چکی تھی۔ ان کے کلام سے ہمیں اس بات کا علم ضرور ہوتا ہے کہ وہ بچپن میں ہی باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا سے محروم ہو چکے تھے۔ بے سہارا اور دانے دانے کو محتاج تھے۔ پیٹ آگ سے اسی لئے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"آگ بڑواگ تین بڑی ہے آگ پیٹ کی"

یعنی جنگل کی آگ سے بھی پیٹ کی آگ بڑی ہے۔ افلاس اور بھوک کا بیان انھوں نے بار بار کیا ہے۔ طرح طرح سے انھیں اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ایک جگہ عام آدمی کی حالت زار کا نقشہ کھینچتے ہوئے وہ کہتے ہیں: "نہیں پٹ کٹی نہیں پیٹ اگھا ہیں" یعنی نہ تو لوگوں کے تن پر کپڑا ہے اور نہ ہی ان کے پیٹ میں روٹی ہے۔ غالباً اپنے ذاتی تجربے کی وجہ سے ہی وہ غریب عوام کے ہمدرد رہے ہیں اور رام کے اوصاف کو اپنی شاعری کا واحد موضوع بناتے ہوئے بھی انھوں نے مفلسوں کے دکھ درد کی عکاسی سے کبھی پرہیز

جناب مجیب رضوی، ریڈر و صدر شعبۂ ہندی، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی -- ۱۱۰۰۲۵

نہیں کیا۔ انھوں نے رام کا ذکر ایک ساحر کی حیثیت سے کیا ہے لیکن ان کی غریب نوازی کی برابر زور دیتے رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ بادشاہ یقیناً دوزخ کا ایندھن بنے گا جس کے راج میں اس کی رعایا دکھی ہو گی :

جاسُو راج پریہ پرجا دکھاری سو نرپ اَوَسی نرک ادھیکاری

صوفی سنت خود تارک الدنیا رہے ہیں لیکن دنیا والوں کی بہبود کا خیال انھیں ہر قدم پر رہا ہے۔ تلسی داس نے بھی اسی نقطۂ نظر سے اخلاقیات کا درس دیا ہے۔ سماج کو خوشحال بنانے کے لئے کچھ اصول بنائے ہیں۔ راجہ اور پرجا کے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے، حقوق و فرائض کو واضح کیا ہے۔ ان کا یہی ابی تصور رام راج ہے۔ گاندھی جی کے تصورِ حیات کو رام راج اور ہریجن کی اصطلاحات تلسی داس سے ہی ملی ہیں۔ تلسی داس کے رام راج میں ہر ایک پیار و محبت کے رشتے میں بندھا ہوا ہے۔ "سب نر کرہیں پرسپر پریتی" اور ہر ایک بغیر کسی تفریق کے نجات پانے کا مستحق ہے۔ "سکل پرم گتی کے ادھیکاری"۔

تلسی داس کا رام راج ایسا سماج ہے جس میں نہ کوئی مفلس ہے، نہ دکھی اور نہ بے سہارا۔ اس میں نہ کوئی جاہل ہے اور نہ ہی گنوں سے عاری۔

"نہیں درِدر کو دُکھی نہ دینا نہیں کوؤ اَبُدھ نہ لچھن ہینا"

تلسی کے اس سماج میں سب لوگ باہنر، پنڈت اور عالم ہیں، سب کو احساس کا پاس ہے اور کپٹ اور چالاکی سے وہ پاک ہیں :

سب گُن گیہ پنڈت سب گیانی سب کرتگیہ نہیں کپٹ سیانی

تلسی داس مہاتما تھے۔ رام کے بھگت تھے۔ لیکن اپنی زمین سے جڑے ہوئے تھے۔ اپنے عہد کی سماجی حقیقت کو جانتے تھے۔ پاکھنڈ اور خوشامد اس عہد کے لوگوں کا شیوہ تھا۔

"تے ای جوگی تے ای سِدھ نر پوجیہ تے کل جگ ماہیں۔"

یعنی کلجگ میں وہی لوگ جوگی اور سدھ کہلاتے ہیں جو کسی با اثر انسان کی خوشامد میں لگے رہتے ہیں۔ اعلیٰ اقدار کی فکر اس سماج کو نہیں تھی۔ پیٹ پالنا ہی اس کا دین و مذہب تھا۔

"سنگتی ساد۔ هن بھئی اُودر بھرن"

بغض، گھمنڈ، لالچ اس عہد کے انسان کا طرۂ امتیاز تھا۔ ماں باپ اولاد کو نیکی سکھانے کے بجائے وہ طور طریقے سکھاتے تھے جس سے دولت حاصل ہو سکے۔ تلسی داس رامائن میں کہتے ہیں :

ماتو پتا بالکنہہ بلاوہیں اُودر بھرے سوئی دھرم سکھاوہیں

یعنی ماں باپ اپنے بچوں کو بلا کر ایک ہی فرض کی تلقین کرتے ہیں اور وہ ہے پیٹ بھرنے کی ترکیب

تلسی داس زندگی میں روٹی روزی کی اہمیت سے منکر نہیں ہیں۔ وہ ریاضت اور عبادت کے لیے بھی معاش کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں خالی پیٹ اور کمزور جسم کوئی فریضہ ادا نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ اکلِ حلال کے قائل ہیں۔ دولت کی ہوس کو وہ پاپ سمجھتے ہیں۔

آج کل ہمارے سماج میں بھی طرح طرح کے یوگی اور مہارشی نظر آتے ہیں۔ تلسی داس کے عہد میں بھی حالت کچھ ایسی ہی تھی۔ اپنی نیکی، حلم اور علم سے سادھوؤں کی شہرت نہیں تھی۔ وہ مشہور تھے اپنی جٹاؤں سے، بڑھے ناخونوں سے، اپنے چولوں سے۔

جاکے نکھ اَرُ جٹا وِسالا سوئی تاپس پرسدھ کلی کالا

یعنی جس کے ناخون اور جٹائیں بڑھی ہوئی ہوں، وہی شخص اس کلجگ میں تپسیا کرنے والا مشہور ہو جاتا ہے۔

کلجگ کی جو عکاسی تلسی داس نے کی ہے وہ ہمارے عہد کی بھی حقیقت ہے۔ ان کے عہد کے بھومی چور یعنی زمیندار اور بھومی ہار آج بھی موجود ہیں۔ وہ راجہ نہیں ہیں، لیکن نیتا بن گئے ہیں۔ اسی لئے آج بھی تلسی داس غریب کسان کی زبان ہیں، اور ان کے کلام سے وہ اپنے عہد کی حقیقت کو سمجھتا ہے۔

تلسی داس پر الزام ہے کہ انھوں نے برہمنی مت کو شمالی ہندوستان میں نئی زندگی بخشی۔ انھوں نے اُس عہد کے ہندو سماج کو ایک نئی راہ دکھائی۔ ان پر یہ بھی الزام ہے کہ انھوں نے چھوا چھوت کو بڑھایا۔ جات پات کے بندھن کو مضبوط کیا اور عورتوں کو کم درجے کی مخلوق سمجھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تلسی داس ان باتوں سے بہت اوپر تھے۔ وہ انسان دوست تھے، کسی فرقے یا متھ کا وہ پرچار نہیں کرتے تھے وہ اصل میں ان تمام تفرقوں کو مٹانا چاہتے تھے۔ سبھی کو رام کے گرد اکٹھا کرنا چاہتے تھے۔

تلسی داس نے لاکھوں اشعار قلمبند کئے ہیں اور کہیں بھی ہندو یا ترک لفظ کا استعمال نہیں کیا۔ وہ ذات پات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ خود اپنے بارے میں کہتے ہیں :

"دھوت کہو اودھوت کہو رجپوت کہو جولہا کہو کوؤ"

وہ جولاہا بھی کہلانے کو تیار ہیں کیونکہ ان کے مطابق غلام کا خاندان وہی ہوتا ہے جو شاہ کا ہوتا ہے۔ وہ رام کے غلام ہیں اس لئے ان کا خاندان بھی وہی ہے جو رام کا ہے۔ اسی لئے وہ فخر سے کہتے ہیں:

"تلسی سرنام گلام ہے رام کو، جاکو رُچے سو کہے کچھو کوؤ" یعنی تلسی تو صرف رام کا مشہور و معروف غلام ہے، جسے جو اچھا لگے اُسے کہہ لے۔ وہ ذات پات سے بے نیاز ہیں، مذہبی دیواروں کو آڑے نہیں آنے دیتے۔ وہ مانگ کر کھا لیتے ہیں، مسجد میں سو رہتے ہیں اور کسی سے واسطہ نہیں رکھتے۔ اس کا اعلان انھوں نے اپنی مشہور کتاب کوتیاولی میں کیا ہے:

"مانگ کے کھیبو، مسیت کو سوئبو، لے بو کو ایکو نہ دے بے کو دوؤ"

یہ اعلان وہی شخص کر سکتا ہے جو سچا خدا پرست ہو اور جو انسان اور انسان کے درمیان تفریق نہ کرتا ہو۔ لیکن تلسی داس کا المیہ یہ ہے کہ انھیں ہندو احیاء پرست قرار دے دیا گیا ہے۔ انھیں ذات پات کو مضبوط کرنے کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اس انسان دوست بھگت اور شاعر کو ایک فرقے سے جوڑنے کا سہرا بھی ہمارے حکمراں انگریزوں کو ہے ۱۸۳۱ء میں سب سے پہلے ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل کے ۸ اویں نمبر میں "ریلیجس سیکٹ آف ہندوز" کے عنوان سے جناب ولسن کا مضمون شائع ہوا۔ اسی میں تلسی داس کو بحیثیت ہندو شاعر سراہا گیا اور رامائن کو ہندوؤں کی بائبل بتایا گیا ہے۔ اسی وقت سے تلسی داس کا یہ المیہ شروع ہوتا ہے۔ پھر تو یورپ کے کئی عالموں اور محققوں میں تلسی داس کو اسی رنگ میں پیش کرنے کی دوڑ سی لگ گئی۔ نتیجے کے طور پر رامائن کی ایک مذہبی حیثیت ہو گئی۔ انگریزی سیاست نے اس انسان دوست شاعر کے کلام کو اپنا آلۂ کار بنایا۔ رامائن تلسی داس کا شاہکار ہے لیکن ونے پتریکا اور کوتیاولی ان کی ایسی تخلیقات ہیں جو رامائن سے کم اہم نہیں ہیں۔ ان کتابوں میں زیادہ تر تلازمے عوامی زندگی سے لئے گئے ہیں، ان کی زبان اور بیان زیادہ حقیقت پسندانہ ہے۔ ان کا موضوع بھی رام بھگتی ہی ہے لیکن نجات کے لئے ان کا پاٹھ کوئی نہیں کرتا۔ ان سے صرف ان کی شاعرانہ عظمت کی نشاندہی ہوتی ہے۔

تلسی داس موحد تھے وہ 'ذات' کو ہر ذرہ میں موجود پاتے ہیں۔ ان کے رام ہر جگہ موجود ہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ ظاہر میں راجہ رام بشر ہیں لیکن باطن میں وہ قادر مطلق ہیں خالق اور رب ہیں۔ والمیک کے آشرم میں جا کر رام چندر جی ٹھہرنے کے لئے جگہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مہارشی والمیک ان کے

باطن کو جانتے ہیں۔ وہ ان کے ظاہر سے دھوکا کھانے والے نہیں تھے۔ انھوں نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا؛

پوچھیو موہی کہ رہوں کہہ ، میں پوچھت سکوچاؤں
جہہ نہ ہوہو تہہ دیہو کہہ تمہیں دکھا دوں... ٹھاؤں

یعنی تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ کہاں رہوں؟ تم سے پوچھنے میں مجھے تکلف ہو رہا ہے۔ تم جہاں موجود نہ ہو وہ جگہ بتا دو وہی مقام تمھارے ٹھہرنے کے لئے میں بتا دوں۔

اس کے بعد والمیک نے انھیں وہ جگہیں بتائی ہیں جہاں رام کا مسکن ہو سکتا ہے۔ ان میں مندر کا ذکر ہے نہ برہمن کا، صرف پاک طینت اور پاک باطن لوگوں کا دل ہی رام کا صحیح مسکن ہے۔ جو دوسروں کی مسرت پر خوش ہوتے ہیں اور دوسروں کی تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ انھیں کے دل میں رام رہتے ہیں۔ ظاہری پاٹھ اور دکھاوے کی عبادت سے وہ نہیں ملتے۔ والمیک کے منہ سے تلسی داس نے یہی پیغام دنیا کو دیا ہے؛

جو ہر شہیں پر سمپتی دیکھی   دکھت ہو ہیں پر بپتی وسیکھی

تصوف کی اصطلاحوں کو تلسی داس نے جس طرح اور جس روانی سے استعمال کیا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ مذہبی اور لسانی تعصب سے پاک تھے۔ رام کی رجائی (رضائے الٰہی) صاحب دین دُنی (مالک دین و دنیا) دین (آخرت) غنی، کرامات، منشائے الٰہی، جماعت، خلق، حرام، رحم، قہر، مقام، اطاعت، قسم، باغبان، بخشش، بخشا، سزا، دائی دیا دریا (دریائے سخاوت و کرم)، گناہ ایسے الفاظ ہیں جو بول چال کی زبان سے تعلق نہیں ہیں۔ تلسی داس نے ان کے علاوہ اصطلاحی معنی کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنا پیغام مسلمانوں تک بھی پہونچانا چاہتے تھے اور اسی لئے ان کی اصطلاحات میں ہی انھوں نے ان سے باتیں کی ہیں۔ دوسروں سے انھوں نے ان کی اصطلاح میں بات کی ہے۔ تلسی داس ایک بھگت تھے، عظیم شاعر تھے۔ انھوں نے اپنے کلام سے یہ ثابت کر دیا کہ صرف ایک موضوع کو لے کر بھی عظیم شاعری کی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس کی صلاحیت ہو۔ انھوں نے بیانیہ شاعری بھی کی ہے اور دوسرے اصناف سخن پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ لیکن سب کا موضوع رام ہیں۔ وہ اودھی اور برج دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے لیکن اودھی میں انھوں نے صرف رامائن کی تخلیق کی ہے اور اس کے بعد اس زبان میں ایک سطر نہیں لکھی۔ اس کے اسباب معلوم کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

تلسی داس کی شاعری جس قدر انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ گاؤں کے گونگوں کو زبان دینے میں وہ جس قدر کامیاب ہے۔ اس کی مثال ذرا مشکل سے ہی ملے گی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ باطن کے ظاہر سے پردہ ہٹاتے تھے اور حق کے پیغامبر تھے۔

فرہاد آبادانی
ترجمہ : ڈاکٹر شعیب اعظمی

ایرانی ادبیات کی خدمت میں

پارسیانِ ہند کا حصّہ

بنام خداوند بخشندۂ مہرباں

"ز ساسانیاں واژگون گشت تخت
زایرانیاں نیز برگشت بخت

زکین وز بیداد تازی سپاہ..
کسی را بکشور نماندہ ..... پناہ

گروہی پراگندہ شد..... کوہسار
دل افسردہ از دشمن نابکار

در آں کوہ سرہم پناہش نماند
بناچار بر مرز پدرود..... خواند

فرو شد زکوہ وبدریا شتافت
بہر مرز رواں گشت و آرام یافت

دو چشمان پُر اشک ولب افسوس گوئی
سرودی چنیں موبد نیک خوئی

توای کشور پاک ایران ... ما
توای سرزمین نیاکان .... ما

مہنج از تو گر روی بر ـــ تافتیم
سوئے کشور ہند بشتافتیم

سپاس و درود تو داریم پاس
ترا نیک خواہیم وہور و شناس

بیاید تو یک شعلہ روشن..... کینم
بنام تو یک گوشہ گلشن .... کینم

درود فراواں زما بر تو.... باد
ہمارہ اہورات یاری کناد ملا

مندرجہ بالا اشعار مرحوم ومغفور استاد پور داؤد کے ہیں جنھوں نے تیرہ سو سال قبل ایرانیوں کی ـ

ڈاکٹر شعیب اعظمی، ریڈر شعبۂ اسلامک عرب ایرینین اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ ـ نئی دہلی ـ ۲۵-۰۰۱۱

ہندوستان میں ہجرت اور سکونت اختیار کر لینے کی صورت میں، نظم کئے تھے۔

عربوں کے ایران پر غلبے کے بعد جب ساتویں صدی میں ساسانی خاندان کا زوال ہوا تو ایرانی حسب ذیل گروہوں میں تقسیم ہو گئے:

۱۔ ایک گروہ اسلام لے آیا لیکن اس صورت میں بھی انھوں نے وطن کی زبان اور ادب کی خدمت انجام دی۔

۲۔ دوسرا گروہ جزیہ کی رقم ادا کر کے اپنے آبائی دین پر قائم رہا اور ہر حال میں وہاں مقیم رہا اور ملک نہ چھوڑا۔ اسی گروہ کے باقی ماندہ وہ ایرانی ہیں جو آج وہاں زرتشتی کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ یہ زرتشتی ایرانیوں میں اپنی سچائی، راستبازی اور امانت کے لئے مشہور رہیں۔

۳۔ تیسرا گروہ جو اس مضمون کا موضوع ہے، پارسیوں کے نام سے مشہور ہے۔ یہ لوگ جن کی اکثریت برصغیر ہند و پاک میں بستی ہے، اولین طبقے کا ایک جزو ہے اور ایرانی شہزادوں میں شمار ہوتی ہے۔ ان کی سکونت کا اصل علاقہ خراسان تھا اور پارتھی قبیلے کے بزرگوں میں سرفہرست تھے، اسی بنا پر انھوں نے اپنا نام پارسی رکھا۔ یہ گروہ آوارہ اور بے خانماں ہو کر بندرگاہ ہرمز کے راستے ہندوستان کی جانب روانہ ہوا اور جیسے کہ پارسیوں کی روایت میں ان کی مخصوص کتاب "قصۂ سنجان"[۱۱] سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں سکونت اختیار کرنے کے لئے ان پر چند شرائط کی پابندی لگائی گئی، پھر بھی ان اُجڑے ہوئے لوگوں کے لئے ہندوستان سے زیادہ مناسب کوئی اور جگہ نہ تھی کیونکہ وہ اپنے بھائیوں کی طرف جا رہے تھے اور اس تہذیب و معاشرت سے ہمکنار ہو رہے تھے جو ان کے ماضی کا بیشتر ثقافتی عنصر رکھتی ہے۔ ان دونوں سرزمین کے باسی قدیم ترین زمانے سے زبان، مذہب، آداب اور اخلاق میں مشترک تھے اور علیحدہ ہو جانے کے بعد بھی ان کی جائے سکونت ایک دوسرے سے زیادہ دور نہیں رہی ہے۔ یورپین محقق راگوزین کے بقول[۱۲] "اس بات کا پتا چلانا مشکل ہے کہ آریائی ہیں دوسری شاخ کے تمدن اور تاریخ کی طرف متوجہ کر سکیں۔"

ہجرت کی اس داستان کو سنجان کے رہنے والے ایک شخص بہمن پور کیقباد پور ہرمزدیار نے جو ایک پارسی موبد بھی تھا، ۱۶۹ یزدگردی / ۸۰۰ ہجری / ۱۴۰۰ عیسوی میں قصۂ سنجان کے عنوان سے نظم کیا۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی میں، زرتشتی مردوں، عورتوں اور

ں کا ایک گروہ تین کشتیوں میں خلیج فارس سے ہندوستان کی جانب روانہ ہوا۔ ادھر اُدھر کی دریا نوردی ، بعد یہ لوگ گجرات کے ساحل پر لنگر انداز ہوئے۔ وہاں کے فرمانروا راجا جادی رانا نے جب ان کے عجیبی لباس ے اور ساز و سامان دیکھے تو اپنی سلطنت کی طرف سے فکرمند ہو گیا۔ آنے والوں کا دین و آئین معلوم کیا اور ، یہ اطمینان حاصل کر لیا کہ ان سے کوئی نقصان نہیں پہونچے گا تو چند شرائط پر ان کو سکونت کی اجازت ، دی۔ ان لوگوں کا ایک بڑا قطعہ زمین دیا گیا جو سرتاپا جنگل، ویرانہ اور سنسان تھا۔ تو وارد ایرانیوں نے آباد کیا اور اسے بنام "سنجان" یاد کیا۔ یہ نام ایک ایرانی نام کی یاد دلاتا ہے۔ یاقوت نے اپنی معروف ب "معجم البلدان" میں چار سنجانوں کا ذکر کیا ہے جو خراسان عظیم میں واقع تھے پہلا ایک قلعہ ہے جو کے دروازہ پر ہے جسے وزشگان کے نام سے پکارتے ہیں اور دوسرا نشاپور میں کوئی مقام ہے ، اگر پارسیوں نے اپنی اولین قیام گاہ کا نام سنجان رکھا تو وہ ایک ایسے علاقہ سے شدید تعلق کی تھا جو ان کے آبا و اجداد کے وطن کے مانند تھا۔ بہمن پور کیقباد "قصۂ سنجان" کے نظم کرنے والے بقول:

مرادورا نام سنجان کرده دستور — بسان ملک ایران گشته معمور

ے سنجان نام سے پکارے جانے کا حکم دیا — اور وہ ملک ایران کی مانند پر رونق اور آباد ہوا

یہ شدید تعلق اس بنا پر بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سنجان میں کچھ دنوں قیام کر لینے کے بعد اُن کا پیشوا راجا پاس گیا اور ایک پرستشگاہ تعمیر کرنے کی خواہش ظاہر کی اور اجازت حاصل کر لینے کے بعد جو پرستش گاہ بنائی، ملک ایران اور اس کے بادشاہ کی یاد میں اس کا نام "ایرانشاہ" رکھا۔

امریکن پروفسر جیکسن لکھتے ہیں کہ "زرتشتی ۷۱۶ عیسوی یعنی یزدگرد سوم کے قتل کے ۶۵ سال سنجان میں وارد ہوئے اور دوسرا گروہ ۷۷۵ عیسوی میں آکر شامل ہو گیا۔"

انھیں دنوں جبکہ ایرانیوں کا ایک گروہ ہندوستان میں پناہ گزین ہوا، ایک گروہ چین بھی روانہ مسعودی، اپنی کتاب میں چین میں زرتشتیوں کے وجود کا ذکر کرتا ہے۔ شاید وہی لوگ ہیں جو یزدگرد سوم کے لڑکے کے ساتھ چین گئے۔ ایک اور گروہ ہندوستان کے ساحلی شہر ناگ منڈل میں تھا جس کا نام بدل کر نوساری رکھ دیا گیا تھا۔ یہ شہر بڑودہ ضلع میں واقع ہے اور یہاں سے بہت دانشمند پارسیوں نے جنم لیا ہے۔

یہاں ہم ایک قدیم مخطوطہ سے، جو دستور مہرجی رانا خاندان کے قبضہ میں ہے اور نوساری شہر کی "مہرجی رانا لائبریری" میں محفوظ ہے، ایک اقتباس نقل کریں گے: "بہ مدد دین کے روز یزدگردی سال کے ۵۱۱/ ۱۱۴۲ عیسوی کے پروردین کے مہینے میں ہم پارسی لوگ شہر ناگ منڈل میں وارد ہوئے اور اس شہر میں سکونت اختیار کی۔ جب اس شہر کی آب و ہوا کو ہر لحاظ سے شمالی ایران کے شہر "ساری" کی مانند پایا تو پھر اس کے نام کو ناگ منڈل سے "نوساری" یعنی "نیا ساری" میں بدل دیا۔"

پارسیانِ ہند سولھویں صدی عیسوی اور دسویں یزدگردی صدی سے پہلے تک گجرات کے مختلف شہروں سورت، نوساری، بھڑوچ، انکلیشور، سنجان اور بلسار وغیرہ میں پھیلے ہوئے تھے اور کھیتی، کشتی سازی، بڑا ہی گیری اور دوسری فنی صنعتوں میں مشغول تھے۔

ہندوستانی پارسی گجرات میں اِدھر اُدھر منتشر رہے اور اسی انتشار کی بنا پر آہستہ آہستہ اوستا اور پہلوی کو بھولنے لگے۔ مختلف علاقوں کے موبد، دینی مسائل اور آداب و سنن برتنے میں ایک دوسرے سے اختلاف کرنے لگے۔ اور جب ان مسائل کو حل کرنے میں ناکام ہوئے تو اپنے دینی بھائی ایرانیوں کی طرف رجوع کیا۔ یہ رابطہ تقریباً برابر جاری رہا اور کرمان و یزد کے زرتشتی جو ہندوستان کے زرتشتیوں کی برادری اور ان کے کارناموں سے کم باخبر تھے، انتہائی فراخدلی کے ساتھ ان مسافر پارسیوں کو خوش آمدید کہتے تھے۔ ۸۴۷ یزدگردی سال میں بہت سی مشکلات اور مسائل حل کرنے کے لئے ایک مخصوص دستہ یزد کے لئے روانہ ہوا، ایرانی موبدوں نے ان لوگوں کے سوالوں کے جواب کے علاوہ، ان کے ساتھ مذہبی کتابوں کے نسخے بھی بھیجے۔ یہ سوال و جواب روایات کے نام سے دو جلدوں میں ہندوستان میں مانک جی اون والا کے ذریعہ ۱۹۲۲ عیسوی میں شائع ہو گئے ہیں۔

اس ترتیب سے پندرہویں عیسوی سے سترہویں صدی تک ہندوستانی پارسی، مذہبی مسائل میں ایرانی زرتشتیوں کے شاگرد شمار ہوتے تھے اور برادرانہ محبت کے جذبہ سے ایرانی ان کی رہنمائی کرتے تھے۔ انھیں دنوں یعنی ۱۰۸۹ یزدگردی مطابق اٹھارہویں صدی میں جاماسپ ولایتی نام کا موبد ہندوستانی زرتشتیوں کو اوستا اور پہلوی کی تعلیم دینے کے لئے کرمان شہر سے سورت آیا اور اوستا اور پہلوی کی تدریس پر کمر کس لی۔ اوستا پہلوی اور فارسی کے تقریباً تمام نسخے مذکورہ بالا موبد جاماسپ کی آمد سے قبل ہرکاروں کے ذریعہ ہندوستان بھیجے جا چکے تھے یہ نسخے انتہائی احتیاط کے

ساتھ مشرقیات کے اداروں، کتابخانوں، خورشید جی کاما، ملا فیروز، بمبئی میں، کتابخانہ مہرجی رانا نوساری اور سورت میں محفوظ ہیں۔

دینکرت کا نسخہ بھی ۱۰۰۰ شمسی میں ہندوستان لے جایا گیا۔ یہ وہی کتابیں ہیں جو آخرہ یورپین اور ہندوستانی فضلا کے لئے ایرانشناسی کے استفادے کا ذریعہ بنیں۔ بارہویں عیسوی کے آخر میں سنجان میں زندگی بسر کرنے والے ایک شخص دستور نیریوسنگ دھاول نے اوستائی زبان کو سنسکرت زبان میں منتقل کرنے میں کامیابی حاصل کی آگے چل کر یہ ترجمہ یورپین محققین کی توجہ کا مرکز بنا اور جس سے یورپی زبانوں میں اوستا کا ترجمہ فراہم کرنے میں بڑی مدد ملی۔

یہ سولہویں صدی کا آخر تھا جب گجرات، مغل بادشاہ اکبر کی سلطنت میں شامل ہو گیا اور سورت کی بندرگاہ ایک اہم اور مضبوط بندرگاہ بن گئی، جہاں مغرب سے آنے والوں سے تعارف بھی ہوا۔ پارسیوں نے تجارت اور لین دین کی خاطر وہاں قائم کرنا شروع کیا اور یہ اسی بندرگاہ کا وجود تھا جہاں سترہویں صدی میں یورپین لوگوں نے پارسیوں سے ربط ضبط قائم کیا۔ مغل بادشاہ اکبر مختلف مذاہب کی معلومات حاصل کرنے کا شوقین تھا۔ اس نے پارسیوں کے مشہور موبد اور مذکورہ بالا فرد مہرجی رانا کو شاہی دربار میں مدعو کیا اور مراحم خسروانہ سے نوازا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب دین الٰہی وجود میں آیا اور مزدیسنا مذہب کے ماننے والوں کا ایک گروہ دین الٰہی میں شامل ہو گیا۔ ہم مغل بادشاہوں کے ہندوستانی دربار کو ایک فرہنگستان سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ بے شبہ مغل عہد ہندوستان کا زریں دور تھا۔ ہمایوں بادشاہ کتابوں کا عاشق تھا اور اپنا بیش بہا کتابخانہ ہمیشہ سفر میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس کے جانشین بیٹے اکبر نے باپ پر سبقت پائی۔ وہ خود فارسی کے صوفیانہ اشعار کا عاشق تھا اور زندگی کے ہر مرحلے میں اپنے محبوب (کتابوں) کے ساتھ رہتا تھا۔ پارسیوں نے بھی فارسی زبان و ادب کی امکانی خدمت کی۔ بہتوں نے اوستا اور پہلوی کی کتابوں کا ترجمہ کیا اور مذہبی آداب و رسوم تک کی چند کتابوں کو نظم بھی کیا۔ یہاں یہ بات اضافی طور پر قابل ذکر ہے کہ ہندوستانی پارسی اپنی آمد کے دن سے لے کر آج تک کسی وقت بھی فارسی زبان اور اس کی آمد سے غافل نہیں ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کی زبان آہستہ آہستہ گجراتی ہو گئی لیکن وہ فارسی زبان سے کبھی بے تعلق نہیں ہوئے۔ آج بھی ہر پارسی کے گھر میں شاہنامۂ فردوسی اور دیوان حافظ کی ایک ایک جلد موجود رہتی ہے۔ سترہویں صدی میں

جب بمبئی انگریزی سرکار کی عملداری میں آیا تو پارسی وہاں آ بسے اور شہر کی ترقی میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ دو صدی بعد بمبئی متعدد آتشکدوں کی بنا پر دنیا بھر کے پارسیوں کا مرکز بن گیا لیکن نوساری اور اودواڑا دونوں ہی شہر مذہبی مرکز کی حیثیت سے باقی رہے۔ انیسویں صدی میں یورپی لوگوں نے ہندوستانی پارسیوں سے گہرا ربط ضبط قائم کر لیا۔ ایک تو تجارتی نقطۂ نظر اور دوسرے ان کی مذہبی کتابوں کے مطالعہ کی بنا پر پارسیوں نے بھی اپنے تئیں امکانی حد تک اہل یورپ کی علمی کاوشوں سے استفادہ کیا اور اپنے دینی نوشتوں اور مذہبی ادبیات کو محفوظ رکھنے میں سرگرم ہو گئے جن کا مفصل ذکر اگلے صفحات پر ہوگا۔ اسی دوران بمبئی اور نوساری میں تحقیقاتی ادارے اور کتابخانے قائم ہوئے جن کا مقصد اوستا، پہلوی اور پژوہش کے مخطوطات کی حفاظت اور گجراتی اور انگریزی زبان میں ان کے تراجم فراہم کرنا تھا۔

وہ پہلا یورپی جو ایران قدیم کی زبان پڑھنے ہندوستان آیا انکتیل دو پرون (ANKUTIL DUE PERON) تھا۔ یہ فرانسیسی ۷ فروری ۱۷۵۵ء میں فرانس سے جہاز کے ذریعہ ہندوستان آیا، چھ ماہ کی طویل مدت مسافرت کے بعد اسی سال ۱۰ اگست کو پانڈیچری پہونچا اور ۱۷۵۸ء میں سورت آیا، ۱۷۶۱ء تک وہاں مقیم رہا اور سہ سالہ دوران قیام میں دستور جاماسپ کے ایک شاگرد دستور داراب سے فارسی پڑھی اور اوستا کا ترجمہ کیا اور اپنے وطن فرانس لوٹ کر اس ترجمہ پر اور محنت کی اور دس سال بعد ۱۷۷۱ء میں اسے شائع کیا اس کی اشاعت کے بعد یورپ میں اوستا شناسی کا فن شروع ہوا۔ تمام یورپی ممالک کے فضلا اس علم کی طرف متوجہ ہوئے جو فرانسیسیوں نے شروع کیا اور جرمنوں نے حد کمال کو پہونچایا۔

دو پرون فرانسوی کے ورود کے سال ہی میں ہندوستان کے بھڑوچ شہر میں ایک لڑکا پیدا ہوا جس نے آگے چل کر فارسی شعر و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ یہ نوزاد طفل مُلّا فیروز تھا جو ۱۱۲۷ یزدگردی سال میں پیدا ہوا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں اپنے خاندان والوں کے ساتھ ترک ایران اور یزد جا کر وہاں تین سال تک ایرانی موبدوں سے علوم دینی اوستا پہلوی اور فارسی زبان پڑھتے رہے، وہاں سے اصفہان گئے اور علمائے معاصر کے حلقہ درس میں شریک ہو کر حکمت، فلسفہ، منطق الہیات اور عربی زبان تحصیل کی۔ ہندوستان لوٹ کر بلا فیروز درس و تدریس میں مشغول ہو گئے

موصوف کی تالیفات بہت زیادہ ہیں جس میں سفرنامہ، خرد دین اور پندنامہ قابل ذکر ہیں لیکن سب میں اہم جاماسپ نامہ ہے جو تین جلدوں میں چالیس ہزار ابیات بحر متقارب پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب چھپ گئی ہے۔ ان کی زیادہ تر تصنیفات شرقشناسی کے مرکزی کتابخانہ کاما، بمبئی میں مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہے۔

ملا فیروز قلمی کتابوں کی فراہمی کے بھی شائق تھے اور فارسی، پہلوی اور اوستا کی تقریباً دو ہزار قلمی کتابیں اکٹھا کر لیں جو فی الحال کتابخانہ کاما کے ایک سکشن میں انہی کے نام سے محفوظ ہیں۔

۸۶۴ یزدگردی سال میں رستم پور اسفندیار نامی ایک شخص نے "بہمن یشت" کو "پازند" کے ایک قلمی نسخہ سے فارسی میں منتقل کیا۔ اس ترجمہ میں صرف تین فی صدی عربی کے الفاظ مستعمل ہیں۔ ہیربد بہمن جی دھابر نے قلمی مخطوطات کی فہرست میں اس کا ذکر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ رستم پور اسفندیار نے پہلوی کتاب "سددر" کو بھی فارسی میں منظوم کیا ہے۔ اب "بہمن یشت" کا قلمی نسخہ بمبئی لائبریری میں محفوظ ہے لیکن کتاب "سددر" جو فارسی میں ہے وہ مہرجی رانا جی کے کتابخانہ میں محفوظ ہے۔

سولہویں اور اٹھارہویں صدی کے درمیانی سالوں میں اوستا کے تراجم فارسی میں ہو رہے تھے لیکن ۱۸۱۸ء میں صرف پانچ مہینے کے وقفہ کے ساتھ اوستا کے چند جزو کے دو ترجمے گجراتی زبان میں ہوئے۔ ایک دستور فرامجی سہراب جی نوساری والا کے ذریعہ ہوا اور دوسرا دستور عادل جی داراب جی سنجانا نے کیا۔

ہیربد فرامجی اسفندیار جی رباری نے "وندیداد" کو ۱۸۴۲ء میں گجراتی زبان میں شائع کیا۔ ان کے بیٹے اسفندیار جی رباری نے بھی "یسنا" کا ترجمہ گجراتی میں کیا اور ۱۸۴۹ء میں شائع کیا۔ اوپر کے دونوں ترجمے براہ راست پہلوی زبان سے ہوئے کیونکہ "اوستا" کے معنی پارسی علما کے لئے درست طور پر قابل فہم نہ تھے۔ ممکن تھا کہ "اوستا" کے بعض کلمات کی تشریح میں اختلاف پیش آجائے اس لئے وہ اسے مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ یہ مندرجہ بالا ترجمے آج کے لئے بطور استفادہ اہم نہیں کیونکہ مغربی تحقیقات کی روشنی میں اور دوسرے مستند تراجم آگئے ہیں جیسا کہ عرض کیا گیا اس سے قبل کہ پارسیان ہند اوستا کو گجراتی زبان میں ترجمہ کرنے کا ارادہ کریں، اپنی مذہبی کتابوں کو فارسی میں ہی منتقل کرتے تھے۔ دو صدیوں کے دوران پارسیوں نے "اوستا" کو فارسی میں منتقل کر لیا لیکن یوروپین طرز تحقیق اور یوروپین زبانوں سے واقف ہو جانے کے بعد مغربی طرز پر تحقیق میں مشغول ہو گئے اور پارسیوں میں بہت سے فضلا

اپنی گراں قدر ادبی تالیفات کے لئے مشہور ہوتے۔ ان کا طویل ذکر نفس مضمون سے تجاوز کر جائے گا۔ صرف ان چند افراد کا نام لیا جائے گا جو اس میدان میں غیر معمولی خدمت اور شہرت کے حامل ہیں۔

فرانسیسی محقق دوپیران کے "اوستا" کے ترجمہ کی اشاعت کے بعد یورپین فضلا بڑی تیزی اور ذوق و شوق کے ساتھ ایرانشناسی کے علم کی طرف متوجہ ہوگئے۔ تمام چیزوں سے پہلے "اوستا" کے ایک مستند اور تنقیدی متن کی اشاعت میں مصروف ہوتے پھر اس کے ترجمے اور زبان نویسی کی طرف توجہ دی۔

خورشید جی رستم جی کاما (۱۸۳۱ - ۱۹۰۹) پہلے پارسی ہیں جنھوں نے اوستا کی زبان کو یورپ میں پروفیسر شپگل کی استادی میں پڑھا۔ یورپ سے واپسی پر بمبئی میں اپنے خرچ پر ایک مدرسہ قائم کیا اور اس تازہ علم کو مفت فراہم کرنا شروع کیا۔ ان کے شاگردوں میں تقریباً تین ہزار شاگرد بہت مشہور اور معروف ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک ہیربد کاؤس جی کانگا اور دوسرے ہیربد شہریار جی بھروچہ، تیسرے تھمورس انکلساریا ہیں۔ اسی زمانے میں پارسی اوستا کے صحیح اور درست ترجمے سے بہرہ ور ہوتے۔ خورشید جی کاما کے پروردۂ خاص ہیربد کاؤس جی کانگا، یسنا، یسپرد، یشت ها، وندیداد اور اوستا کے جزووں کی شرح اور تفسیریں لکھنے میں کامیاب ہوئے اور پانچ جلدوں میں گجراتی زبان میں بھی ترجمہ کیا، جس کا پارسی حلقہ نے بے مثال استقبال کیا۔ اس علم کی تالیفات اب تک بار بار شائع ہو چکی ہیں۔ انھوں نے اوستا کی انگریزی اور انگریزی سے اوستا میں لغت لکھی۔ آج بھی اس علم کے شیدائیوں کے لئے اوستا کی قواعد باعث استفادہ ہے۔ شہریار جی بھروچہ نے زیادہ توجہ پہلوی زبان کی قواعد اور اوستا کے ان نسخوں کی تیاری پر دی جو طالب علموں اور مدارس کے معیار کے قابل تھیں۔ انھوں نے بھی اوستا، انگریزی اور انگریزی اوستا کی ایک چھوٹی لغت تیار کی جو خصوصاً بچوں اور اسکولوں کے لئے مفید تھی۔ اسی زمانہ میں اوستا، پہلوی اور فارسی تینوں زبانیں بمبئی یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہوئیں اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ طالب علم بی۔اے، ام۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کے کورس ان قدیم زبانوں میں لے سکتے ہیں۔

خورشید جی کاما کے تیسرے شاگرد تھمورس دینشاہ انکلساریا ان معروف اشخاص میں ہیں جو زیادہ تر پہلوی کے متن اور عکسی نسخوں پر کام کر چکے ہیں۔ ان کے لڑکوں میں بہرام گور تھمورس انکلساریا جو

پچاس سال قبل فوت ہو چکے ہیں۔ ان مشہور دانشمندوں میں ہیں کہ جن کی تصنیفات سے کوئی مستشرق بے نیاز نہیں ہے۔ یہ دانشمند متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جو ان کی وفات کے بعد ان کی بیٹی کی مساعی جمیلہ سے شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سے کا تھا، وندیداد، ژند، حومن اور لینا وغیرہ یادگار ہیں۔ ایرانی فاضل صادق ہدایت نے بھی اس استاد سے استفادہ کیا اور اپنے چند تراجم بہرام گور کی نگرانی ہی میں کئے۔ ساتھ ہی پارسیان ہند ایران قدیم کی زبان پر کام کرنے کے علاوہ فارسی زبان وادبیات کی طرف سے غافل نہ تھے۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں کوتار نامی دو بھائیوں کی کوشش سے شاہنامہ کا ترجمہ گجراتی میں ہوا۔ اس ترجمہ کا استقبال اتنے پُرجوش طریقہ پر ہوا کہ یہ بار بار شائع ہوا اور آج پارسیوں کے علاوہ ہندی اور گجراتی جاننے والے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ فارسی سے گجراتی اور گجراتی سے فارسی لغت بھی تیار کی جا رہی ہے۔

شاہنامہ شناسی اور شاہنامہ خوانی بھی پارسیانِ ہند کے یہاں مروج رہی ہے جن میں پروفیسر واچھ اور سرکویاجی کو بھی یاد کیا جا سکتا ہے۔ سر رستم مسانی جو خود ایک زمانہ تک بمبئی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے ہیں۔ عطار کی منطق الطیر کا ایک بہت خوبصورت ترجمہ انگریزی زبان میں کر چکے ہیں اور جس کے متن پر ایک شاندار مقدمہ بھی ہے۔ چند سالوں تک یہ کتاب بمبئی یونیورسی کے نصاب درس میں بھی داخل رہی ہے۔ فارسی ادبیات کے بہت سے شاہکار پارسیانِ ہند کے توسط سے گجراتی اور انگریزی زبان میں چھپ چکے ہیں جن میں زیادہ تر مدرسوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ بمبئی یونیورسٹی کے فارسی استادوں میں سے ایک معروف استاد مہرجی بائی انوشیروان جی کوکا نے ۱۹۴۳ء میں لطائف و ظرائف اور خوش مزگیہا نام کی کتاب فارسی میں شائع کی جسے ہندوستان اور یورپ میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور بار بار شائع کی گئی لیکن افسوس کہ ایرانی زبان کے استاد اس پُرارزش مجموعہ سے بیگانہ ہیں۔

اسی زمانہ میں بمبئی، کلکتہ اور مدراس کی یونیورسٹیوں کی تاسیس کے ساتھ فضلا و محققین مغربی فلسفہ فکر کی تلاش میں گروہ در گروہ مغرب کی جانب روانہ ہو رہے تھے۔ اس گروہ میں پارسی جوان بھی تھے اور ان کی ایک بڑی تعداد قبل از اسلام کے ایرانی ادب اور زبان کی تعلیم حاصل کرنے گئی تھی جو علم کبھی انھوں نے خود یورپین فضلا کو فراہم کیا تھا اب اسے سیکھنے کے لئے خود محتاج تھے۔

یورپ اور امریکہ کے ان سفر کرنے والوں میں کچھ لوگ ایرانشناسی کے میدان میں علم و فضل کے

اعلیٰ مقام پر پہونچے اور متعدد کتابوں کے مصنف بنے۔ ان سب میں سے ایک نام ڈاکٹر جمشید مانک جی اون والا کا ہے۔ وہ نہ صرف ایک ممتاز زباں داں تھے اور متعدد پہلوی کتابوں کے مترجم تھے بلکہ سکہ شناسی اور آثار قدیمہ کے ماہر بھی تھے۔ ان کی کتاب "سکہ ہائی طبرستان" سکہ شناسی کے فن میں مستند مانی گئی ہے۔ وہ جرمن مستشرق بارتولد کے شاگرد تھے۔ ڈاکٹر ایرچ جہانگیر تاراپور والا بھی ایک دوسرے فاضل ہیں، جنھوں نے مغرب زمین کا سفر کیا اور جرمن، فرانسیسی استادوں سے استفادہ کیا۔ وہ بھی پروفیسر بارتولد کے شاگرد تھے۔ "نغمہ ہائی آسمانی زرتشت" یا ترجمہ گاتھا نامی انگریزی کتاب بھی انھیں کی گرانقدر تصنیف ہے جو تقریباً تیس سال سے زائد ہی مدت کی تحقیقات کا ثمرہ ہے۔ یہ فاضل کئی سال تک مدراس یونیورسٹی میں سنسکرت زبان کے استاد تھے۔ خیال کیا جانا چاہئے کہ ایک پارسی برہمنوں کو سنسکرت پڑھاتا تھا۔ اگر ہم یورپ اور امریکہ جانے والوں کے تمام ناموں کا ذکر کرنا چاہیں تو ایک طویل فہرست درکار ہوگی۔ لیکن ایک اہم نام لئے جانے کے قابل ہے اور وہ ڈاکٹر دستور مانک جی نوشیروان جی والا کا ہے جو کراچی کے مشاہیر میں سے تھے۔ وہ امریکی پروفیسر جیکسن کے شاگرد تھے۔ مختلف شعبوں میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ وہ مغربی محققین میں ایرانی فضلا سے کہیں زیادہ مشہور ہیں۔ ایرانی ادبیات اور تمدن کے میدان میں کام کرنے والوں میں بمبئی یونیورسٹی کے فضلا کی تعداد زیادہ ہے جن میں سے کسی ایک کا نام لیا جاسکتا ہے۔

دستور پشوتن بہرام سنجانا اور ان کے بیٹے ڈاکٹر داراب پشوتن سنجانا جنھوں نے "دینکرد" کو ۱۹ ضخیم جلدوں میں ۱۸۷۴ء اور ۱۹۱۹ء کے درمیان انگریزی اور گجراتی میں مع تشریح فرہنگ شائع کیا۔ ڈاکٹر داراب سنجانا نے فرانسیسی زبان سے علم ہونے کی بنا پر بہت سے یورپی فضلا کی کتابوں کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا۔ یہ باپ بیٹے دونوں ہی مغربی فضلا کے حلقہ میں بحیثیت مستشرق مشہور ہیں۔ ڈاکٹر دیوان جی جمشید جی مودی عظیم پارسی دانشمندوں میں سے ہیں جن کی تالیفات پچاس سے بھی زائد ہیں اور یہ ضخیم اور حجیم دونوں ہی طرح کی ہیں۔ ان کی معروف کتابوں میں "آداب و رسوم زرتشتیاں"، "جاماسپ نامہ" اور "پارسیان در دربار اکبر شاہ" اور پہلوی متن کے چند تنقیدی کتابچے شامل ہیں۔ ان کے علمی مقالے بھی بکثرت چھپے ہیں اور زیادہ تر معتبر علمی جریدوں ایشیاٹک سوسائٹی لندن، بمبئی، بنگال اور مشرقیات کے کاما انسٹی ٹیوٹ کے مجلّوں کی زینت بنے ہیں۔

دوسرے پارسی فاضل جو بی۔اے کرنے کے بعد جرمنی گئے اور آخر عمر تک وہیں رہے۔ وہ ڈاکٹر جہانگیر تاوادیا ہیں۔ وہ پہلوی کی مشکل ترین کتابوں "شایست نشایست" اور "تاریخ زبان پہلوی" وغیرہ کے مصنف ہیں۔

ایک اور طالب علم جو کبھی بمبئی سے باہر نہ گئے لیکن جرمن اور فرانسیسی زبانوں سے کلی طور پر واقف تھے، وہ بہمن جی نوشیرواں جی دھابر تھے۔ انھوں نے اگرچہ کوئی مستقل اور دقیق کام نہیں کیا ہے لیکن جو کام کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ ان کے معروف کاموں میں انگریزی زبان میں روایات، "منوچہر نامہ" پر تنقیدی نوٹ اور "رسینا" اور "بھسپرد" پر شرح مع ان کے فرہنگ مود اپنی جگہ قابل ذکر ہیں۔ ایک اور پارسی دانشمند سہراب بیسارا کی کتابیں "داتستان دینیک" "ماتیکان ہزار داتستان" اور "پیمپر تپستا" پہلوی سے انگریزی میں منتقل ہوئی ہیں۔ بے شبہ یہ شخصیت اپنے عہد کے پہلوی دانوں میں منفرد رہی ہے۔ اور اُس وقت سے لے کر اب تک ان کی تالیفات معتبر اور مستند مانی جاتی رہی ہیں۔

وہ ایک زمانہ تک مشہور رسالہ "ایران لیگ" کے مدیر رہے ہیں۔ جاماسپ خاندان اور سنجانا خانواد سے متعدد معروف دانشمند پیدا ہوئے ہیں اور بقول سعدی شیرازی ان دونوں خاندانوں کے افراد زیادہ تر عالمان دینی ہوتے ہیں۔

دستور جاماسپ خاندان کے دانشمندوں میں منوچہر جاماسپ آسانا ایک مشہور عالم ہیں جنھوں نے لغات پہلوی کی تیاری میں ایک نئے طرز کی بناڈالی۔ ان فاضل کی یادداشتیں ۱۸۷۶ سے ۱۸۷۷ عیسوی کے درمیان چار جلدوں میں تقریباً ہزار صفحات سے زیادہ کی ضخامت میں شائع ہوگئی ہیں لیکن ابھی صرف پہلوی حروف تہجی کے پہلے لفظ الف کی جو چھ آوازوں کا نمائندہ ہے تکمیل ہوئی ہے۔

گرشاسپ انتیا، خورشید کاما کے دوسرے تربیت یافتہ فاضل ہیں، جنھوں نے پاژند اشیتھا اور خردہ اوستا کے تصحیح شدہ اور مطبوعہ متن پر تنقیدی مقالے لکھے ہیں۔ پہلوی اور دوسرے متون کی تدوین و اشاعت کا کام بھی کیا ہے۔ جن میں گرانقدر تصنیف "کارنامۂ اردشیر بابکان" ہے۔ لیکن اسی زمانہ میں جبکہ ہندوستانی پارسی خوشحالی اور آسودگی کی زندگی گزار رہے تھے اور ساتھ ہی علم پروری میں مشغول تھے۔ ایران میں مقیم پارسیوں سے متعلق کچھ بری خبریں آرہی تھیں۔ چنانچہ یہ لوگ ایرانی پارسیوں کی خدمت میں لگ گئے۔ پارسی رہنماؤں اور سربرآوردہ حضرات نے "انجمن بہبودی حال زرتشتیان" کے تحت "پرژفند" نامی انجمن کی

بنگالدی اور ۱۸۵۴ء میں پہلے نمائندہ کی حیثیت سے مانک جی لیمجی ہاتریا کو ایران روانہ کیا۔ موصوف نے تہران، یزد اور کرمان میں رفاہ عام کے لئے بہت سے مدرسوں اور مرکزوں کی بنیاد ڈالی۔ ان کی اہم ترین انجام دی ہوئی خدمت وہاں کی حکومت سے جزیہ کی رسم کا ختم کرانا تھا۔ انھوں نے ایران کے ۳۷ سالہ دوران قیام میں عمدہ فارسی زبان سیکھی اور چند ایک کتابیں اور یادداشتیں شائع کیں۔ وہ ۱۸۹۰ء میں شہر تہران میں عالم بقا کو سدھارے۔

پارسیوں کے دوسرے نمائندہ اردشیر جی رپورٹر تھے۔ وہ بہت فاضل اور عالم تھے اور ۱۹۱۶ء تک زرتشتیوں کی خدمت میں لگے رہے اور انھیں دنوں وہ بھی تہران میں فوت ہوئے۔ اسی زمانہ یعنی ۱۲۸۶ شمسی میں تہران کے زرتشتیوں کی انجمن کی بنا پڑی لیکن شہر یزد میں چند سال قبل زرتشتیوں کی ایک انجمن بنام "انجمن ناصری زرتشتیان یزد" ۱۲۷۱ شمسی میں قائم ہو چکی تھی۔ انجمن ناصری نام اس لئے رکھا گیا کیونکہ ناصرالدین شاہ قاچار کے عہد میں اس کی بنیاد پڑی تھی۔

۱۹۱۸ء میں دین شاہ ایرانی اور پشوتن جی مارکر جیسے زرتشتی رہنماؤں کی سرپرستی میں انجمن زرتشتیان ایرانی بمبئی بھی قائم ہوئی۔ وہ خدمات جو یزد اور اس کے نواحی علاقوں میں ثقافتی مرکزوں کے قائم کرنے کے علاوہ، اس انجمن نے انجام دی ہیں، ان میں مرحوم استاد پورداؤد ابراہیم کو جو اس زمانہ میں برلن میں ایران قدیم سے متعلق تحقیق و تلاش میں مصروف تھے۔ ہندوستان میں دعوت دینا اور استاد پور داؤد کو انجمن زرتشتیان ایرانی، بمبئی اور ایران لیگ کے تعاون سے یشت، یسنا اور گاتھا کی تالیف کروانا اور انھیں ایرانی علماء اور فضلاء کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کرنے کی خدمت بھی شامل ہے۔ مرحوم پور داؤد کی تالیفات کی اشاعت کے ساتھ اسی زمانہ میں عدلیہ کے بیرسٹروں اور فضلا میں شمار کئے جانے والے نامور بیرسٹر دین شاہ ایرانی نے دو کتابیں "اخلاق ایران باستان" اور "فلسفہ ایران باستان" کے عنوان سے لکھیں، جنھیں مرحوم عبدالحسین سپنتا نے فارسی میں منتقل کیا۔ اور شائع کی گئیں۔ مرحوم دین شاہ ایرانی، فارسی ادبیات کے میدان میں دوسری تصنیفات کے بھی مالک ہیں جس میں "سخنوران دوران پہلوی" یاد کرنے کے لائق ہے۔ جسے انھوں نے اپنے باوفا ہمکار عبدالحسین سپنتا کی مدد سے مرتب کیا۔ یہ بھی زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔

دین شاہ ایرانی نے حافظ کی پچاس غزلوں کو منتخب کر کے "پنجاہ غزل حافظ" کے نام سے

مع شرح اور تفسیر انگریزی میں ترجمہ کر دیا ہے۔ بمبئی یونیورسٹی کے فارسی طلبا کے یہ کتاب ہمیشہ استفادہ کا ذریعہ بنی ہے اور آج بھی انگریزی داں حلقوں میں حافظ شناسی سے متعلق اہم چیز ہے۔ عارف کے منتخب اشعار بھی دین شاہ ایرانی کے ترجمہ کے ساتھ شائع ہو گئے ہیں۔ استاد پور داؤد کی تصنیفات کی طباعت کے ساتھ ہی انجمن ایران لیگ نے (سر کاؤس جی جہانگیر، سر دینشاہ ہرمزد جی وادیا اور جی کے نریمان اور دوسروں کی کوشش سے ۱۹۲۲ء میں بمبئی میں قائم کی گئی) ایک اہم اور قیمتی کتاب "پارسیان اہل کتابند" کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر طاہر رضوی اور پروفیسر راشدی کے فارسی ترجمہ کے ساتھ شائع کی۔ پور داؤد کی کتابوں کی اشاعت اور ایرانیوں کا اپنے ماضی اور قدیم تمدن کی طرف توجہ دینے کی بنا پر تہران یونیورسٹی میں بھی ایران قدیم کی زبان کا شعبہ قائم ہو گیا۔ استاد پور داؤد سے درخواست کی گئی کہ وہ مذکورہ بالا موضوع کے مواد کی تعلیم کا عہدہ سنبھالیں۔ استاد نے ۱۳۱۶ شمسی سے جب سے وہ ایران لوٹے ۱۳۴۶ شمسی تک یعنی عالم بقا کو سدھارنے کے وقت تک، قدیم ایرانی زبانوں کی تدریس کا منصب باقی رکھا۔ دسیوں شوقین طالب علموں کو بڑھایا، ان کی رہنمائی کی جن میں مرحوم ڈاکٹر معین کا نام لیا جا سکتا ہے۔

گشتاسپ نریمان بھی جو خود ایران لیگ کے بانیوں میں سے تھے بڑے معروف عالموں میں تھے۔ جرمن، فرانسیسی زبان کے علاوہ روسی زبان سے بھی آشنا تھے۔ یورپین فضلا کی بہت سی تصانیف جو ایران کے علم و تمدن سے متعلق ہیں، انگریزی زبان میں منتقل کیا۔ یہ تمام کی تمام بار بار شائع کی جا چکی ہیں۔ وہ پہلا شخص جس نے روسی مستشرق کو ہندوستانی پارسیوں سے واقف کرایا، گشتاسپ نریمان ہیں۔ ان کے مضامین جو ان کی حیات ہی میں مختلف مجلوں میں چھپ چکے تھے۔ ان کی وفات کے بعد دو بڑی جلدوں میں "مقالات تحقیقی گشتاسپ نریمان" کے عنوان سے بمبئی میں چھپ چکے ہیں یہ تحریریں ایرانی علوم و تمدن کے بارہ میں اہم اطلاعات فراہم کرتی ہیں۔ اور آج بھی ان کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے۔ انجمن دو اور اہم مجلوں کی تیاری میں معروف ہے۔ ایک تو "ایران لیگ" کے نام سے جو کچھ دنوں قبل تک مرحوم کے خسرو فیتر کی سرپرستی اور ادارت میں تھا اور سال میں ایک یا دو شمارہ اب بھی شائع ہوتا ہے۔ ان رسائل کے مضامین ایران کے تمدن اور علوم و زبان سے متعلق ہوتے ہیں۔ دوسرا مجلہ بنگاہ خاور شناسی خورشید جی رستم جی کاما بمبئی کے انتشارات میں ہے۔ اور سال ہا

دو سال میں ایک شمارہ شائع ہوتا ہے، اس کے مقالات کا موضوع بھی ایران کے علم و تمدن اور ہند و ایرانی زبانیں ہیں۔ مثال کے طور پر اس مجلّہ کا ایک شمارہ جو چار سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ گاتھا کے بہت خاص اور علمی ترجمے سے متعلق ہے اور ایک فاضل محقق موبد پونگر نے کیا ہے، یہ شمارہ کئی بار الگ الگ بھی شائع کیا جا چکا ہے۔

دنیا کے پارسیوں کی آبادی ایک لاکھ اسی ہزار کی تعداد سے دو لاکھ تک ہے۔ جن کا بڑا حصہ ہندوستان میں اور خاص طور سے بمبئی شہر میں علم تجارت کے شعبہ میں مصروف ہے۔ یہ گروہ تقریباً بارہ سو برس قبل اپنے وطن سے دور ہو جانے کے بعد بھی اپنی وطنی محبت کے رشتہ کو توڑ نہیں سکا ہے اور روزانہ پنجوقتہ نماز میں ایران پر درود بھیجتا ہے۔ اپنی زندگی میں اپنے خاندان کی خدمت کے علاوہ ہر پارسی کی آرزو ایران کی مٹی اور خصوصاً کوروش اور داریوش کی زادگاہ پارس کی زیارت کرنا ہے۔ آج بھی گجراتی زبان میں جب کبھی "مادر وطن" کا کلمہ استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب مملکت ایران ہی ہے۔

ابھی چند سال قبل ہی اس وفادار گروہ کو ایران جانے کے لئے ذرائع میسّر آئے ہیں۔ اور کچھ لوگ مادر وطن کی خدمت کے لئے ایران چلے گئے ہیں۔ یہ واپسی اس بنا پر ہے کہ وہاں کا ماحول سازگار ہے۔ اگر ایک زمانے میں کوئی ایرانی کسب معاش اور روزگار کی تلاش میں ایران سے ہندوستان آتا تھا تو آج تیل کی دولت سے مالا مال ایران اپنوں اور پرایوں، سبھی کو اپنی طرف بلا رہا ہے۔

(بشکریہ ہنر و مردم ، ایران)

ویریندر پرشاد سکسینہ

منشی درگا سہائے سرور جہاں آبادی

(۱۸۷۳ — ۱۹۱۰)

یوپی کے ضلع پیلی بھیت میں قصبہ جہاں آباد بڑا مردم خیز خطہ رہا ہے۔ یہاں کے ارباب علم و فضل میں جو لوگ اپنی شعری اور ادبی خدمات کے اعتبار سے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، ان میں منشی درگا سہائے سرور جہاں آبادی کا نام سرفہرست ہے۔ سرور جہان آبادی منشی پیارے لال کے بیٹے تھے، جو قصبہ جہاں آباد کے کائستھ رؤسا میں سے تھے۔ انھوں نے ساری زندگی کائستھوں کے اصول کے مطابق سرکاری ملازمت نہیں کی۔ موصوف کے بارے میں پرتاب چندر آزاد کا ایک مضمون "نیا دور" (لکھنؤ) کے ستمبر ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ایک جگہ درج ہے کہ، "ان کے والد پیارے لال صاحب سرکار کے محکمۂ مال میں نوکر تھے۔" میرے خیال میں فاضل مضمون نگار کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔

سرور جہاں آبادی پوس سمت ۱۹۲۹ (مطابق ۱۸۷۳ء) میں جہاں آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اردو فارسی کی تعلیم جہاں آباد میں ہی حاصل کی۔ اس کے بعد اردو مڈل ورناکیولر کا امتحان پاس کر کے سید کرامت حسین بہار سے فارسی اور اردو کی تعلیم کی تکمیل کی۔ بہار مرحوم ہی کی صحبت میں آپ کو شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا اور اپنے قصبے کے پوسٹ ماسٹر منشی شب سہائے سے جو انگریزی زبان کے ایک اچھے اسکالر تھے، انگریزی پڑھی۔

سرور نے قدیم و جدید ادبی سرمایہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ جدید شعرا میں حضرت بیان یزدانی میرٹھی

جناب ویریندر پرشاد سکسینہ بدایوں کے رہنے والے ہیں اور اردو کے معروف ادیبوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

کا کلام انہیں بہت پسند تھا۔ اس لئے اپنے آپ کو ان کا شاگرد مشہور کر دیا۔ پہلے وحشت تخلص اختیار کیا پھر سرور تخلص فرمانے لگے۔ "انیس ہند" میرٹھ میں ان کا کلام شائع ہوتا تھا۔ انہیں دنوں پنڈت لیکھ رام کے قتل کا افسوسناک واقعہ پیش آیا، اس پر انھوں نے ایک مسدس "خون ناحق" لکھا اور اس کے ٹائٹل پر اپنے آپکو بیان یزدانی میرٹھی کا شاگرد ظاہر کیا۔ یہ مطبوعہ مسدس بیان یزدانی کے کچھ شاگرد یزدانی صاحب کے پاس لے گئے اور دریافت کیا کہ یہ آپ کے شاگرد ہیں؟ بیان یزدانی نے اس سے انکار کیا بلکہ یہ بھی کہا کہ وہ ان سے سرے واقف ہی نہیں ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "یہ شاعر کسی روز آفتاب بن کر چمکے گا۔"

بہر حال حضرت سرور کی یہ کتاب شائع ہوئی تو ان کی شہرت میں اور اضافہ ہوا اور پورے ہندوستان میں ان کے کلام کو بڑی قدر و عزت کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ بالآخر مطبع "انیس ہند" میرٹھ کے مالک بابو رام چندر مرحوم نے انھیں اپنے مطبع کا منیجر مقرر کر دیا۔ اس مطبع سے سرور کی پانچ کتابیں شائع ہوئیں لیکن اب ان میں سے سوائے "خون ناحق" کے کوئی کتاب کہیں دیکھنے میں نہیں آتی ہے۔ دو سال تک وہ اس مطبع کے منیجر رہے۔ پھر مالک مطبع سے اختلاف ہو جانے کی وجہ سے استعفا دے دیا۔ اور اپنے وطن جہاں آباد واپس آ گئے۔ جہان آباد میں قیام کو ابھی چھ سات مہینے ہی ہوئے تھے کہ منشی ڈول چند رئیس ہلدور ضلع بجنور نے انہیں دو سو روپیہ ماہوار پر بطور شاعر ملازم رکھ لیا۔ کچھ دنوں بعد سرور ریاست ٹینٹور میں طلب کئے گئے اور وہاں چلے گئے۔ وہیں انھوں نے اپنی بیوی کی بیماری کی خبر سنی اور وطن واپس آکر ان کے علاج معالجے میں لگ گئے۔ لیکن کوئی کوشش کارگر نہیں ہوئی اور آخر کار راہی ملک عدم ہوئیں۔ سرور کو اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی اس لئے انھوں نے عہد کیا کہ اب ساری زندگی دوسری شادی نہیں کریں گے۔ ان کی بیوی نے دو سال کا ایک بچہ اپنی یادگار چھوڑا تھا مگر سات سال کی عمر میں وہ بھی داغ مفارقت دے گیا۔ اس حادثے سے سرور کا کلیجہ پاش پاش ہو گیا۔ اس کے آخری رسوم ادا کر کے وہ واپس آ رہے تھے تو راستے میں اپنے دوست منشی عبداللہ خاں کے مکان پر بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر میں ایک مختصر نظم "دل بیقرار سوجا" کے عنوان سے لکھی جو پورے ملک میں بہت مقبول ہوئی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

کسی مست خواب کا ہے عبث انتظار سوجا | کہ گزر گئی شب آدھی دل بیقرار سوجا

یہ نیم ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا کے سرد جھونکے　　تجھے دے رہے ہیں لوری میرے غمگسار سو جا
یہ تری صدائے نالہ مجھے متہم نہ کر دے　　میرے پردہ دار سو جا میرے راز دار سو جا
ابھی وہ صفات پائی ہی تو نہیں عاشقی کے قابل　　یہ تڑپ کا آہ شیوہ نہ کر اختیار سو جا
مجھے خوں رلا رہا ہے ترا دم بہ دم تڑپنا　　ترے غم میں آہ کب سے ہوں میں اشکبار سو جا
نہ تڑپ نہیں یہ ظالم کہ تجھے گود میں اٹھا لوں　　تجھے سینے سے لگا لوں! تجھے کر لوں پیار سو جا
تجھے جن کا ہے تصور ارے مست جام الفت　　انھیں انکھڑیوں کے صدقے میرے بادہ خوار سو جا
تجھے پہلا سابقہ ہے شب غم بڑی بلا ہے　　کہیں مر مٹے نہ ظالم دل بے قرار سو جا

اپنے لخت جگر کی وفات کے بعد غم غلط کرنے کے لئے آپ نے شراب کا سہارا لیا۔ لیکن جب منشی دیانرائن نگم مرحوم کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے فوراً رسالہ "زمانہ" کی منیجری کے لئے انھیں کانپور بلا لیا، جہاں تین سال تک کام کیا۔ دیانرائن نگم نے بڑی کوشش کی کہ ان کی شراب کی لعنت چھوٹ جائے، مگر وہ چھپ چھپ کر پیتے رہے۔ آخر ظالم شراب نے ان کی تندرستی خراب کر دی اور "زمانہ" کی ملازمت چھوڑ کر اپنے وطن جہان آباد چلے آئے لیکن منشی دیانرائن نگم کی ملاقات کے لئے سال میں دو ایک مرتبہ کانپور ضرور جاتے تھے۔

"زمانہ" سے الگ ہونے کے بعد سرور نے دنیا کے تمام کاموں سے بے تعلقی اختیار کر لی اور صرف شاعری اور شراب کے ہو کر رہ گئے۔ ۲۴ نومبر ۱۹۱۰ء کو جہان آباد سے اپنے بھائی مصری لال ورما کے یہاں پیلی بھیت چلے گئے۔ رسالہ "ادیب" الہ آباد کے دفتر میں ان کی نظموں کا مجموعہ "جام سرور" زیر طبع تھا۔ ورما صاحب کے یہاں سے پروف دیکھنے کے لئے الہ آباد جانے والے ہی تھے کہ انھیں بخار اور درد سینہ کی شکایت پیدا ہوئی جس نے ایک مہلک مرض کی صورت اختیار کر لی۔ ڈاکٹر نے شراب کی قطعاً ممانعت کر دی تھی، مگر چھوڑنا تو درکنار وہ کم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے، ایک روز یہ سمجھ کر کہ بے حال ہیں، شاید پانی اور شراب کا فرق نہ کر سکیں، انھیں پانی کا گلاس دے دیا گیا، اس پر فوراً یہ شعر کہا:

سمجھ لیا میرے ساقی نے بدحواس مجھے　　بجائے مے دیا پانی کا ایک گلاس مجھے

مصری لال ورما جہاں آبادی کا ایک مختصر مضمون "حضرت سرور مرحوم" کے عنوان سے رسالہ "زمانہ" جنوری ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا ہے۔ جس میں ان کی عمر کے آخری زمانے کا ذکر حسب ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے:

اس وقت آپ کو شراب کی حد سے زیادہ خواہش پیدا ہو گئی تھی اور بخار اور درد سینہ پیدا ہو کر عارضہ ذات الجنب پیدا ہو گیا جس نے دو تین دن ہی میں نہایت کمزور کر دیا۔ جب آپ کو شراب دینا قطعی بند کر دیا گیا تو آپ کہتے تھے "ارے بھائی! مریض را دم آخر چہ جائے پرہیز است۔" آپ سب آرزوؤں سے مایوس ہو کر وفات کے ایک یوم پہلے اپنے بھائیوں اور دیگر عزیزوں کو حسرت سے مایوس ہوکر کہنے لگے کہ "اب ہم الہ آباد نہیں جا سکیں گے اور نہ احباب سے نیاز حاصل ہو سکے گا۔" مرض لحظہ بہ لحظہ ترقی پر تھا آپ فرمانے لگے کہ "میری آخری آرزو یہ ہے کہ میرا مجموعۂ کلام شائع ہو جائے اس کے لئے منشی دیا نرائن نگم صاحب اور منشی نوبت رائے نظر صاحب سے التجا کی جائے کہ وہ بہ لحاظ میری خدمات سابقہ جو ہر دو پرچہ جات کے ساتھ تھیں، میرا کلام شائع ہونے میں کوشش بلیغ فرمائیں۔"

سرور ۳۰ نومبر ۱۹۱۰ء کو مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور ۳ دسمبر ۱۹۱۰ء کو بوقت ۹ بجے اپنے بھائیوں اور دوستوں سے بولتے چالتے ان کی روح قالب عنصری سے پرواز کر گئی۔ وفات کے وقت وہ بار بار ان اشعار کو پڑھتے تھے:

اپنی مٹی ہے کہاں کی کیا خبر باد صبا ہو پریشاں دیکھیے کس کس طرح مشت غبار

نہ دل میں پہلو نشیں رہے گی نہ اجڑے گھر میں مکیں رہے گی

ہماری حسرت کہیں پھرے گی ہماری غربت کہیں اڑے گی

شروع میں میں نے جو سنہ پیدائش لکھا ہے۔ اس کے مطابق سرور مرحوم کی عمر ۳۷ سال کی تھی۔ مگر پرتاب چندر آزاد نے لکھا ہے کہ "وفات کے وقت ان کی عمر صرف تیس سال کی تھی۔" مگر یہ درست نہیں ہے بلکہ اردو کے بعض مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے دوسری غلطیاں کی ہیں، مثلاً سدرشن نے گلدستۂ سخن میں لکھا ہے کہ "۱۲ دسمبر ۱۹۱۰ء کو آپ کے انتقال پر قدردانانِ شاعری نے رنج و غم کے آنسو بہا کر آپ کے زندۂ جاوید کلام کی داد دی۔" حالانکہ سرور کی وفات ۳ دسمبر ۱۹۱۰ء کو ہوئی ہے۔ سرور کی وفات پر جو نوحے اور وفات کی تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں سے کچھ میرے پاس موجود ہیں۔ حضرت محشر لکھنوی کی تاریخ بہت خوب ہے:

خم کر محشر بس اتنا کہہ کے رسم تعزیت
اب ملے گی مشکلوں سے مرنے والے کی مثال

بعض نقادوں نے لکھا ہے کہ سرور کے صرف دو مجموعے شائع ہوئے ہیں، "ایک جام سرور" اور دوسرا "خم خانہ سرور"۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ دس کتابوں کے مصنف تھے۔ ان میں سے حسب ذیل پانچ کتابیں تو میری لائبریری میں موجود ہیں:

(۱) "خون ناحق" یہ مرحوم کی پہلی کتاب ہے۔ اور جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں، مسدس کے طرز پر ہے۔ مطبع انیس ہند "میرٹھ" سے شائع ہوئی تھی۔ ملک نے اس کتاب کی بہت قدر کی۔ اس مسدس کی ادبی حیثیت اردو کے دوسرے مشہور مسدسوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

(۲) "جام سرور" معروف بہ یادگار سرور" اس مجموعے کو انڈین پریس الٰہ آباد نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس مجموعے کی اشاعت کے سلسلے میں سرور مرحوم نے اپنی زندگی ہی میں معاملات طے کر لئے تھے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ اسی مجموعے کے پروف کی تصحیح کے لئے وہ پہلی بعیت سے الٰہ آباد جانے والے تھے کہ اچانک شدید بیمار ہو گئے اور بالآخر پیام اجل آگیا۔ اس مجموعے میں منشی نوبت رائے نظر کا دیباچہ شامل ہے۔

(۳) "خمخانۂ سرور" یہ منشی درگا سہائے سرور کی بہترین نظموں کا مجموعہ ہے۔ جو زمانہ پریس کانپور سے ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کے مرتب منشی دیا نرائن نگم ہیں۔ یہ مجموعہ اس سچی بے لوث اور لازوال محبت کی یادگار ہے جو سرور مرحوم کو منشی دیا نرائن نگم کے ساتھ تھی۔ اس مجموعے میں صرف وہی نظمیں شامل ہیں جو رسالہ زمانہ میں شائع ہوئی تھیں۔

(۴) "خم کدۂ سرور" یہ بھی سرور جہاں آبادی کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جس کے مرتب قاضی محمد غوث فضا حیدرآبادی ہیں۔ اس میں ان کی تقریباً سبھی نظمیں شامل ہیں۔ اس مجموعہ میں ایک نایاب مضمون "زندہ جاوید پھول" بھی شامل ہے۔ یہ مجموعہ سید عبدالقادر مرحوم تاجر کتب نے اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد سے طبع کرا کے شائع کیا ہے۔ رسالہ "نگار" بابت جولائی ۱۹۳۶ء میں مولانا نیاز فتح پوری نے صفحہ ۷۰ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"خمکدۂ سرور" سرور جہاں آبادی کا مجموعہ ہے، جسے قاضی محمد غوث صاحب فضا حیدرآبادی

نے شائع کیا ہے۔ سرور ان شعرا میں سے تھے جنھوں نے موجودہ اردو شاعری کی طرح ڈالنے میں حصہ لیا تھا اور جن کی خدمات کو اردو زبان کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اس کے قبل ان کے مجموعۂ کلام "جام سرور" اور "خمخانۂ سرور" کے نام سے زمانہ پریس کان پور اور انڈین پریس الٰہ آباد سے شائع ہو چکے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ سرور ایسے شاعر کا ذکر بار بار نہ کیا جائے۔ سرور کے کلام کی مستی ایک ایسی چیز ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گی اور دنیا کو کوئی حق نہیں کہ اسے فراموش کر دے۔"

(۵) "اکسیر سخن" یہ دراصل سرور کی تصنیف ہے جو پیارے لال شاکر میرٹھی مرحوم نے ان سے معاوضہ دے کر لکھوائی تھی اور اپنے نام سے شائع کی تھی۔ رسالہ "زمانہ" بابت ماہ فروری ۱۹۱۵ء میں سرور اور شاکر کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں خود شاکر مرحوم کے خطوط سے ثابت کیا گیا ہے کہ "اکسیر سخن" اور بعض دوسری نظمیں جو ان کے نام سے شائع ہوئیں وہ سرور کی تصنیف تھیں حضرت جگر بریلوی یادِ رفتگاں میں لکھتے ہیں:

"آپ کی بہت سی نظمیں اور بے شمار رباعیاں مسٹر پیارے لال شاکر میرٹھی کے نام سے شائع ہوئیں۔ انھیں نظموں میں ایک مجموعۂ "اکسیر سخن" ہے جو کالی داس کے "رتو سنگھار" کا منظوم ترجمہ ہے اور نیچرل شاعری کا بے نظیر نمونہ"

البتہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن سرور مرحوم کے نام سے شائع ہوا ہے۔

سرور جہاں آبادی کی باقی پانچ کتابوں کے نام یہ ہیں:

(۱) "درِ مال" یہ ایک ناول ہے۔

(۲) "مثنوی سوز جگر" یہ ایک مختصر مثنوی ہے جس میں دو سو سے زیادہ اشعار ہیں۔

(۳) "نشتر ماتم" یہ ایک مختصر مسدس ہے۔

(۴) "پیشین" یہ ایک منظوم ڈرامہ ہے۔

(۵) "نالۂ خونچکاں" یہ بھی مسدس ہے۔

یہ تمام کتابیں مطبع ودیا درپن میرٹھ سے شائع ہوئی تھیں اور بنارسی داس کاشف میرٹھی شاگرد حضرت جگر بریلوی کی ذاتی لائبریری میں ان تمام کتابوں کا مطبوعہ نسخہ موجود ہے۔

جدید اردو ادب میں سرور جہاں آبادی ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کے قالب مردہ میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ان کا کلام درد و تاثیر سے مملو ہے۔ ان کا کلام ان کی زبان سے سننے کے لئے مولانا حالی، ڈاکٹر اقبال اور منشی مینڈولال زار لکھنوی ان کے دولت کدہ پر جہاں آباد تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر اقبال ان کی نظمیں سن کر رونے لگے تھے۔ مولانا حالی نے جب ان کی نظمیں سنیں تو ان پر وجد کا عالم طاری ہوگیا تھا۔ مولانا حسرت موہانی سرور کی وفات پر لکھتے ہیں:

"سرور جہاں آبادی اردو زبان کے ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ ہماری نظر سے ان کی کوئی ایسی نظم نہیں گذری جس کے پڑھنے کے بعد بے اختیار تحسین و آفریں کی صدا بلند نہ ہوئی ہو۔ نسیم لکھنوی کے مرگ بے ہنگام کے بعد یہ دوسرا سانحہ ہے جس کا ماتم دنیائے ادب کے ہر گوشے میں ہوگا۔ اگر سرور کی زندگی وفا کرتی تو خدا جانے ان کی شاعری کا مرتبہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔ اس عرصے میں جو کچھ خدمت وہ ادب اردو کی کرگئے وہ بقائے دوام کی سند حاصل کرنے کو کافی ہے۔"

جوش ملیح آبادی لکھتے ہیں:

"منشی درگا سہائے سرور جہاں آبادی کے مجموعۂ کلام کو میں نے جستہ جستہ پڑھا جس کا میرے دل پر خاص اثر ہوا۔ مرحوم اپنے سینے میں ایک حساس اور درد مند دل رکھتے تھے۔ جھوٹی اور مہمل شاعری کو جو آج کل اردو دنیا میں ہر طرف غالب نظر آرہی ہے۔ سرور نے کبھی منہ نہیں لگایا، وہ جو چیز محسوس کرتے تھے اس کو نظم کرتے تھے اور اس طرح نظم کرتے تھے کہ اشعار کے اندر ان کا دل دھڑکتا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ بالکل درست ہے کہ سرور جیسے شاعر کم پیدا ہوا کرتے ہیں۔"

حضرت جگر بریلوی "یادِ رفتگان" میں رقم طراز ہیں:

"سرور آنجہانی کا وجود ادبی دنیا کے لئے ایک خاص برکت تھا۔ ان کے سوز و گداز نے اردو شاعری کو ایک مقدس چیز بنادیا۔ ان کی فکر رسا نے عروس سحر کو وہ رنگینی و آرائش بخشی جو بالکل انوکھی چیز ہے اور جس کی آب و تاب نے تمام پرانے زیوروں کو ماند کر دیا۔ ان کی سحر کاری کے نقش و نگار اردو سے مٹ نہیں سکتے۔ شاعری کے پردے

میں سرور نے ایسی چیز پیش کی ہے جو عشق حقیقی کی لذت اور تڑپ کا سرچشمہ ہے بلند خیالی کا آسمان ہے اور رنگینی و لطافت کا چمن بے نظیر۔"

اردو شاعری پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اردو شاعری کا قالب اور روح ایرانی ہے لیکن اعتراض کرنے والے صرف سرور جہاں آبادی ہی کے کلام کا مطالعہ کر لیں تو ان کے اس اعتراض کا جواب مل جائے گا۔ یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ لکشمی جی پر سرور کی نظم دیوالی کے موقع پر پوجا کے وقت اب بھی گائی جاتی ہے۔ نظم لکشمی جی کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

منبع صورت تھی عجب اور عجب سج تھی لگن
کہ جب آکاش سے اترا تھا ترا سنگھاسن

نظر آئی تری صورت میں عجب حسن کی جوت
تو نے دیوی ہمیں اپنے جو دکھائے درشن

اک چھٹکا چاند کا عالم دم نظارہ تھا
گورا گورا تن نازک تھا سراپا کندن

شعلۂ حسن دل افروز بھڑک اٹھتا تھا
رخ روشن پہ جو پڑ جاتی تھی سورج کی کرن

تھی چمک آہ ترے چاند سے رخساروں کی
کسی مندر میں تھے یا گھی کے دیئے دو روشن

ترچھی بانکی وہ کمانیں تھیں کڑی دونوں بھویں
لئے پھرتے تھے کبھی بن میں جنہیں رام و لچھمن

دل کو چھینے لئے جاتی دم نظارہ تھی
پیاری پیاری تھی عجب چاند سے مکھڑے کی پھبن

تیرے ماتھے پہ تھا چندن کا لگایا ٹیکا
اپسراؤں نے کیا تھا ترے رخ پر اُبٹن

رخ تاباں پہ برستا تھا ترے نور ازل
بن کے ساون کی جھڑی اور کبھی بھادوں کی بھرن

بھولی بھولی سی وہ صورت وہ ادائیں پیاری
نیچی نیچی وہ نگاہیں وہ انوکھی چتون

کوکلا سی وہ تری ہائے سریلی آواز
میٹھے میٹھے ترے ڈوبے ہوئے امرت میں بچن

گوری گوری تھی جبیں صبح کی مندر کوئی تھا
زلف تھی یا کوئی متھرا کی سکھی شیام برن

خوشنما کانوں میں کنڈل تھے تو ہاتھوں میں کنول
اوڑھنی ہلکی سی ریشم کی تھی اک زیب بدن

تو اس انداز و ادا سے جو زمیں پر اتری
دیکھنے والوں نے جھک جھک کے لئے تیرے چرن

مچ گئی دھوم تری جلوہ گری کی پھر تو
پھوٹ نکلی تری شہرت کی زمانے میں کرن

اہل نظارہ سے تصویر تری بول اٹھی
لکشمی ہوں تمہیں دینے کو ہوں آئی درشن

مہارانی پدمنی پر ہندی زبان میں کئی نظمیں شائع ہو چکی ہیں۔ سرور جہاں آبادی نے بھی پدمنی

پردو شاہکار نظمیں لکھی ہیں یہ دونوں نظمیں جب میں نے ہندی کے ممتاز شاعر جناب نرالا مرحوم کو سنائیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ ان کا ترجمہ ہندی زبان میں شائع ہونا چاہیے، اس سے ہندی ادب میں ایک اچھا اضافہ ہوگا۔ نظم "پدمنی" کے دو بند پیش ہیں:

عندلیبوں کو ملی آہ و بکا کی تعلیم　　　اور پروانوں کو دی سوز وفا کی تعلیم
جب ہر اک چیز کو قدرت نے عطا کی تعلیم　　　آئی حصے میں ترے ذوق فنا کی تعلیم

نرم و نازک تجھے اعضا دیئے جلنے کے لئے
دل دیا آگ کے شعلوں پہ پگھلنے کے لئے

رنگ تصویر کے پردے میں جو چمکا تیرا　　　خود بخود لوٹ گیا جلوۂ رعنا تیرا
ڈھال کر کالبد نور میں پتلا تیرا　　　ید قسمت نے بنایا جو سراپا تیرا

بھر دیا کوٹ کے سوزِ غم شوہر دل میں
رکھ دیا چیر کے اک شعلۂ مضطر دل میں

"پدمنی کی چتا" میں کیا خوب فرماتے ہیں:

ہیں قفس میں کچھ ہمارے بال و پر باقی ابھی　　　پھر بھی کرنا ایک دن تکلیف برق و شعلہ بار
رہ گئی اب کے برس بھی حسرت دیدار گل　　　کٹ گئے کنج قفس میں آہ ایام بہار
ابر تربت دل جلوں کی خاک سے ہٹ کر برس　　　تیر باراں سے ہیں بڑھ کر تیری چھڑیاں ناگوار
جل سکے لپٹوں تجھ سے اے شعلۂ جاں سوز غم　　　ہو گئی تذر اجل اک لعبت سیمیں عذار

سرور کے کلام میں تشبیہوں اور استعاروں کی بڑی فراوانی ہے، مثال کے طور پر ان کی نظم "میر بہوٹی" کے تین بند پیش کئے جاتے ہیں:

کچھ عجب عالم ہے تیرے حسن کے انداز کا　　　سرخ ڈورا ہے کسی چشم فسوں پرواز کا
قطرۂ مضطر ہے خون کشتگان ناز کا　　　قلب خوں گشتہ ہے حرماں پر کسی جانباز کا

یا شفق کا کوئی ٹکڑا ہے زمیں پر جلوہ گر
جام زریں میں ہے یا صہبائے احمر جلوہ گر

گل بداماں ہے شفق میں شعلۂ تنویر حسن　　　خون عاشق یا زمیں پر ہے گریباں گیر حسن

یا عقیق سرخ کی چھوٹی سی ہے تعبیر حسن　　　نقش نیرنگ فسوں ہے یا کوئی تصویر حسن

جلوۂ گل ہے نغمات وادیٔ پرخار میں

سر بہ خم ہے قبائے سبزۂ کہسار میں

وادیٔ پرخار میں اک مجمر سوزاں ہے تو　　　دامن کہسار میں اک شعلۂ عریاں ہے تو

کشت زار حسن میں ایک دانۂ مرجاں ہے تو　　　کسی گلگوں قبا کا گوشۂ داماں ہے تو

ناز ہے صحرا کو تیری شوخیٔ رفتار پر

دو ٹپکا ہے خوں کا قطرہ سبزۂ کہسار پر

سرورؔ نے جہاں مرلی والے کی یاد میں گن گائے ہیں وہاں اسی عقیدت سے محبوب خدا کا ذکر کرتے ہیں۔ یہاں نیز دانی میرٹھی کی نعت پر تضمین کے دو بند درج ذیل ہیں :

دل بیتاب کو سینے سے لگا لے آجا　　　کہ سنبھلتا نہیں کمبخت سنبھالے آجا

پاؤں ہیں طول شب غم نے نکالے آجا　　　خواب میں زلف کو مکھڑے سے ہٹا لے آجا

بے نقاب آج تو او گیسوؤں والے آجا

نہیں خورشید کو ملتا ترے سایہ کا پتہ　　　کہ بنا نور ازل سے ہے سراپا تیرا

اللہ اللہ ترے چاند سے مکھڑے کی ضیا　　　کون ہے ماہ عرب کون ہے محبوب خدا

اے دو عالم کے حسینوں سے نرالے آجا

سرورؔ بڑے وطن پرور تھے، ان کے دل میں حب وطن کے جذبات نے ہیجان پیدا کر دیا تھا اور ان کی رگ رگ میں قومی درد بھرا ہوا تھا، ان کی تمنا تھی کہ کسی طرح ہندوستان آزاد ہو جائے۔ ان کا ایمان تھا کہ ماں کے دودھ کا حق جب ہی ادا ہو سکتا ہے جب تمام ہندوستانی مل کر وطن کی آزادی کے لئے لڑیں۔ سرورؔ دراصل اردو اور ہندی کے سب سے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے کلام سے قومی اور سیاسی جذبات بیدار کئے۔ 'عروس حب وطن' میں وہ کہتے ہیں :

ٹوٹیں وہ پاؤں جن کو نہ تیری تلاش ہو　　　پھوٹے وہ آنکھ جس کو نہ ہو جستجو تری

وہ گھر ہو بے چراغ جہاں تیری ضو نہ ہو　　　وہ دل ہو داغ جس میں نہ ہو آرزو تری

دنیا و آخرت میں نہ انجام ہو بہ خیر　　　تیرے سوا جو غیر کی ہو مجھ کو جستجو

ان کا کلام ہندوستانیوں میں جوش اور ہمت کی روح پھونک دیتا ہے۔

ارض و سما ہیں نور کے سانچے میں ڈھل گئے　　سو کر اٹھو کہ غیر ہیں آگے نکل گئے
چار آئینہ حریف پہن کر سنبھل گئے　　شیروں کے رزم گاہ میں تیور بدل گئے

تم بھی دکھاؤ جوہر پیکار رزم میں
مردانہ وار بڑھ کے کرو وار رزم میں

لشکر کشوں کی صف میں تمہارا ہے انتظار　　سینہ سپر ہو بڑھ کے کہ ہے وقت کارزار
میدان کے دھنی ہو جوانو! ہو ہوشیار　　آگے تمہارے کس کو ہے دعوائے گیرودار

سو کر اٹھو کہ قافلے والے نکل گئے
آگے بہت ہیں تم سے رسالے نکل گئے

شہر آشوب کے دو بند ملاحظہ فرمائیے:

گیا بہار کا موسم خزاں کا دور آیا　　شکست رنگ و گل و ارغواں کا دور آیا
پکارتی ہے صبا امتحاں کا دور آیا　　سکوت نالہ و ضبط فغاں کا دور آیا

کرے نہ شکوۂ صیاد بلبل دلگیر
نہیں اجازت نامہ نہ ہو بلند صفیر

ہوائے دہر کی بگڑی ہے کچھ عجب تاثیر　　ریاض قوم ہے اب انقلاب کی تصویر
وہ طائران چمن زاد تھے جو خوش تقریر　　ترانہ سنجی کے باعث ہوئے قفس میں اسیر

غریب قید میں شام و سحر تڑپتے ہیں
قفس میں بند ہیں بے بال و پر تڑپتے ہیں

لارڈ کرزن نے اپنے عہد میں بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا، سارے ملک میں اس تقسیم کے خلاف احتجاج ہوا، سرورؔ نے بھی "نصیب بنگالہ" کے عنوان سے اپنے تاثرات پیش کئے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

آہ اے بنگال آلام و مصائب کے شکار　　آہ اے کرزن کی پالیسی کے صید بیقرار
آہ اے نخچیر ناوک خوردۂ دست اجل　　آہ اے خونیں جگر خونی کفن خونی مزار

اُٹھ رہی ہے آہ اب تیرے سیہ خانہ میں خاک | شام ماتم سے مبدل ہے تیری صبح بہار
تیرے پھولوں میں ہے عالم زخم دامن دار کا | خوں رلاتی ہے نگاہ شوق کو تیری بہار
اب نہ وہ پھولوں کا تختہ ہے نہ کنج خوشنما | ہیں بچھے ہیں کچھ خس و خاشاک عبرت یادگار
کرزن بیدار خواہل پولیس حکام وقت | تو ہوا اُف اُف نہ کس کس کی جفاؤں کا شکار

سرور نے کوئل، پپیہا، کنول ، اور بھونرے پر لاجواب نظمیں لکھی ہیں۔ بھونرے کی بیقراری پر ان کی جو نظم ہے اس کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے؛

نہ وہ کیتکی کی پھبن رہی | نہ وہ موتیا کی ادا رہی
نہ وہ نسترن نہ سمن رہی | نہ وہ گل رہے نہ فضا رہی

نہ گلوں کے اب ہیں وہ قہقہے | نہ وہ بلبلوں کے ہیں چہچہے
نہ غزل سرا وہ کوئی رہے | نہ وہ قمریوں کی صدا رہی

نہ وہ سرو ہے نہ وہ آب جو | نہ وہ ہم صفیر ہیں خوش گلو
نہ بنفشہ ہے نہ وہ تازہ بو | نہ وہ جعفری نہ حنا رہی

نہ وہ صبح کی ہیں تجلیاں | نہ شفق کی آہ وہ جھلکیاں
نہ وہ اودی اودی ہیں بدلیاں | نہ وہ بھینی بھینی ہوا رہی

نہ امنگیں ہیں وہ شباب کی | نہ وہ پتیاں ہیں گلاب کی
نہ ہوا میں بو ہے شراب کی | مجھے مست تھی جو بنا رہی

وہ کنول غضب کے تھے دلربا | جہاں اُڑتے تھے میرے ہم نوا
مگر اب نشان کی ہے وہ ادا | نہ وہ بو رہی نہ صفا رہی

آخر میں مسز محمد جہاں آبادی کی چند غزلوں کے اشعار ملاحظہ فرمائیے ان میں غزل کا عطر کھنچ آیا ہے ۔ کتنی نرم ، دلکش اور شیریں زبان ہے ؛

کس کو سناؤں قصے اپنے غم نہاں کے ۔۔۔ اک جان ناتوان ہے سو ظلم آسماں کے

سر پٹکتی ہے بے کسی دل کی ۔۔۔ تو نے ظالم خبر نہ لی دل کی

ٹوٹ پڑتا ہے فلک سر پہ شب فرقت میں ۔۔۔ شکوۂ چرخ ستم گار بُرا ہوتا ہے

خطا ہو گئی ہے گنہگار ہوں ۔۔۔ جو چاہو سزا دو سزاوار ہوں

ترے سکوت میں بھی اک ادا نکلتی ہے ۔۔۔ کہ ہے چھپی ہوئی پردے میں گفتگو تیری
نہ چاک کر دل بے تاب کو مرے ظالم ۔۔۔ نکل کے ہو کہیں رسوا نہ آرزو تیری

تعارف و تبصرہ

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

چند پاکستانی مطبوعات

ہندوستان اور پاکستان میں کتابوں اور اخبارات و رسائل کی آزادانہ آمد و رفت نہ ہونے کی وجہ سے دونوں ملکوں کے تصنیف و تالیف اور تعلیم و تعلم کے کام کرنے والوں میں بڑا ذہنی بعد پیدا ہوگیا ہے اور دونوں جگہ کے ادیب ایک دوسرے کے علمی و تحقیقی کاموں سے بہت کم واقف ہوتے ہیں۔ اس لئے جب کبھی پاکستان کی کتابیں ہمیں ملتی ہیں یا ہمارے یہاں کی کتابیں پاکستانی ادیبوں کو ملتی ہیں تو دونوں کو بے حد خوشی ہوتی ہے۔ پچھلے چند مہینوں میں ہمیں پاکستان کی جو کتابیں موصول ہوئی ہیں، ذیل میں ان کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے:

اقبال مصنف: مولوی احمد دین مرتب: مشفق خواجہ

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۵۲۷ صفحات، سال طباعت: ۱۹۷۹ء۔ قیمت ۴۰ روپے۔

ناشر، انجمن ترقی اردو پاکستان۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

یہ پہلی کتاب ہے جو علامہ اقبال کی شخصیت اور فکر و فن پر لکھی گئی ہے یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی تھی اور اس وقت تک اقبال کا جس قدر کلام فاضل مصنف کو مل سکا سب شامل کرلیا تھا، اسی زمانے میں اقبال اپنے کلام کو مرتب فرمارہے تھے، ایسے موقع پر جب یہ کتاب شائع ہوئی تو قدرتی طور پر انھیں یہ بات پسند نہ آئی، اس کے مصنف مولوی احمد دین، اقبال کے دوستوں اور عقیدت مندوں میں سے تھے، اس لئے انھوں نے پورا ذخیرہ تلف کردیا، اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں مولوی احمد دین نے

اس کتاب کو دوبارہ لکھ کر شائع کیا مگر ایک طویل عرصے سے یہ کتاب بھی نایاب تھی ۔ خواجہ صاحب نے دونوں طبعوں کے نسخے کسی طرح حاصل کر کے پیش نظر کتاب مرتب کی ہے ۔ فاضل مرتب نے دونوں ایڈیشن کا تجزیہ کرنے کے بعد موجودہ ایڈیشن کے بارے میں لکھا ہے کہ: "طبع اول اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے اگر دوبارہ شائع ہونے کی مستحق ہے تو طبع دوم بھی اس لائق ہے کہ اسے منظر عام پر لایا جائے ۔ طبع اول کا خاصا بڑا حصہ طبع دوم میں شامل ہے اور طبع دوم میں متعدد نئے مباحث کا اضافہ کیا گیا ہے ، اس لئے جب تک دونوں طباعتوں کے متن سامنے نہ آئیں اس وقت تک یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ ان میں کیا فرق ہے لیکن اس مقصد کے لئے دونوں طباعتوں کو شائع کرنا اس وجہ سے مناسب نہیں ہے کہ دونوں میں مشترک مباحث خاصی تعداد میں ہیں ۔ کافی غور و فکر کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کتاب کا ایک ایسا متن تیار کیا جائے جو دونوں طباعتوں کے مباحث پر مشتمل ہو لیکن اس میں مباحث کی تکرار نہ ہو ۔ زیر نظر طباعت اسی خیال کی عملی تشکیل ہے ۔ میں نے طبع دوم کے متن کو اس کی اصلی صورت میں رکھا ہے اور طبع اول کی زائد عبارتوں کو اختلاف نسخے کے تحت اکٹھا کر دیا ہے ۔" (صفحہ ۱۷)

اس میں شبہ نہیں کہ زیر تبصرہ کتاب اقبالیات میں ایک مفید اضافہ ہے اور اقبال پر کام کرنے والوں کے لئے بے حد ضروری ہے ۔

رئیس الاحرار مولانا محمد علی — سوانح حیات

مرتبین : ابو سلمان شاہجہانپوری ۔ پروفیسر ڈاکٹر انصار زاہد ، پروفیسر فصیح الدین ۔

سائز : $\frac{22 \times 18}{8}$ ۔ حجم ۲۰۸ صفحات ۔ قیمت درج نہیں ۔ ناشر : گورنمنٹ نیشنل کالج ۔ شہید ملت روڈ کراچی نمبر ۵

"علم و آگہی" ، گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی کا مجلہ ہے ، جس نے مولانا محمد علی پر ایک خصوصی شمارہ شائع کیا ہے جسے کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا ہے ۔ یہ کتاب حسب ذیل سات ابواب پر مشتمل ہے :

(۱) خاندان ، اس میں پانچ مضمون ہیں ، (۲) سیرت و سوانح ، اس کے تحت ۸ مضامین شامل ہیں (۳) صحافت ، اس میں سات مضمون ہیں (۴) شاعری ، اس میں صرف دو مضمون ہیں (۵) تاریخ و نوادر ، اس میں

تین مضمون ہیں (۶) خراج عقیدت، اس کے تحت تین مضمون ہیں (۷) معاصر، اس میں صرف ایک مضمون "مولانا محمد علی اور علامہ اقبال" ہے حالانکہ اس کے تحت کئی مضامین ہو سکتے تھے۔ مثلاً، مولانا محمد علی اور ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی اور ان کے پیر و مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی، وغیرہ۔ بہرحال مولانا محمد علی پر ابھی حال میں جو چیزیں شائع ہوئی ہیں، ان میں ایک اچھا اضافہ ہے، خاص طور پر مولانا محمد علی جوہر کا خاندان مفید اور معلوماتی ہے۔

تحریک پاکستان ـــ افکار و مسائل

مرتبین : پروفیسر ڈاکٹر انصار زاہد، پروفیسر فصیح الدین صدیقی، ابوسلمان شاہجہانپوری۔
سائز ۲۲×۱۸/۸، حجم ۱۴۲ صفحات، ناشر: گورنمنٹ کالج۔ کراچی ۵

یہ کتاب بھی مجلہ "علم و آگہی" کے خصوصی شمارے کی حیثیت سے شائع ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں ایک سوال نامہ جاری کیا گیا تھا اور اس کے جواب میں جو تحریریں موصول ہوئی تھیں، انھیں شائع کر دیا گیا ہے، یہ جوابات عام طور پر بہت ہی مختصر ہیں، اس کے علاوہ چند انٹرویو بھی ہیں۔ قدرتی طور پر ان سب میں پاکستانی نقطۂ نظر غالب ہے۔ پہلے سوال نامے کے جواب میں سب سے پہلے جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری کا جواب شائع ہوا ہے۔ ان کے چند جوابات ملاحظہ ہوں: "میں یا جو بھی مسلمان ہندوؤں کے معاشرے میں رہ چکا ہے اگر ایمان دار ہے تو وہ ان امور کا شاہد عادل ہے کہ ہندو مسلمانوں سے کتنی نفرت کرتا ہے" یا "پاکستان کو کسی بھی غیر مسلم قوم پر اعتماد واجب نہیں، ہندوستان کے ہندو جھوٹ کے استاد ہیں۔" یا "ہندو کسی وقت بھی مسلمان کا خیر طلب نہیں ہو سکتا دوستی کا لفظ ہرگز اس سلسلے میں اختیار نہ کیا جائے۔ یہود اور ہندو سے بڑا متعصب دنیا میں شاید اور کوئی نہ ملے گا۔" تعجب اس پر نہیں ہے کہ انھوں نے ایسی بات کیوں کہیں، تعجب اس پر ہے کہ وہ جب کبھی ہندوستان آتے ہیں تو وہ ہندوؤں کے یہاں ہی ٹھہرتے ہیں، ایک ہندو خاتون کے بارے میں فخریہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ان کی منھ بولی لڑکی ہیں۔ کیا انفرادی زندگی میں اور قومی زندگی میں اتنا فرق ہے ؟! اور کیا قول اور عمل میں اتنا صریح اور واضح تضاد ممکن ہے ؟! یہ بات میری سمجھ میں قطعاً نہ آسکی۔

تذکرہ (پٹھانوں کی اصلیت اور ان کی تاریخ) مصنف: روشن خاں

سائز ۲۲×۱۸/۱۶، حجم ۳۴۴ صفحات، مجلد، قیمت ۲۰ روپے، تاریخ اشاعت: یکم جنوری ۱۹۸۰ء
ملنے کا پتہ: روشن خاں اینڈ کمپنی تمباکو ڈیلرز۔ بھولو چوک، جونا مارکیٹ۔ کراچی نمبر ۲

زیرتبصرہ کتاب کی تالیف کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ بقول فاضل مؤلف: "پٹھانوں کے متعلق بہت سی تاریخیں لکھی گئی ہیں، ان میں پٹھان مصنفوں کی لکھی ہوئی بھی ہیں اور غیر پٹھان اہل علم کی لکھی ہوئی بھی ہیں، لیکن ایسی کوئی کتاب نہیں ہے جس میں پٹھانوں کی تاریخ اپنی اصلی شکل میں آئی ہو۔ یہ خامی دونوں قسم کے اہل قلم کی کتابوں میں موجود ہے۔" اس کی وجہ سے فاضل مؤلف کے خیال میں: "پٹھانوں کو شدید نقصان پہنچا، ان کے بارے میں شدید غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔۔۔ یہ غلط بیانیاں تاریخ کے کسی ایک واقعہ یا سیرت کے کسی ایک پہلو تک محدود نہ تھیں، بلکہ پٹھانوں کی اصل ونسل، ان کی تاریخ، ان کی روایات، ان کے اسلاف کے تذکروں، ان کی خدمات کے بیان اور اقوام عالم میں ان کے تاریخ ساز کردار، غرض کہ ان کی قومی زندگی کے ہر گوشے اور ہر پہلو تک پھیلی ہوئی تھیں۔" (صفحہ ۱۱)
اس کے مقدمے میں ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری لکھتے ہیں: "اس قوم کی مظلومیت کا اندازہ کون کر سکتا ہے جس کی سادگی کو خست، سادہ لوحی کو بے وقوفی، کم علمی کو بدتہذیبی، جس کی اصلاح کی کوششوں کو گمراہی، جس کی دین داری کو ضلالت، جس کی غیرت کو جہالت، جس کے فکر وعقیدے کی پختگی کو ہٹ دھرمی اور جس کی عزیمت و استقامت کو ضد، جس کی حق گوئی کو شرارت، جس کی حریت طلبی کو بغاوت، غرض کہ جس کے ہر سفید کو سیاہ اور جس کے ہر خوب کو ناخوب بنا کر پیش کیا گیا ہو۔" (صفحہ ۲۰)

روشن خاں صاحب کا خیال ہے کہ پٹھانوں کا سلسلۂ نسب بنی اسرائیل سے ملتا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل ایک معزز اور حکمراں قبیلہ بنی بخت تھا۔ "وزارت عظمیٰ اور فوجوں کی کمان انھیں کے ہاتھوں میں ہوتی تھی اور حضرت سلیمان کے عہد حکومت میں بھی ان ہی کا زیادہ اثر تھا۔۔۔ جب یہ قبیلہ مشرق اردن میں سے سنحریب اسوری کے ہاتھوں قیدی بن کر جلاوطن کیا گیا اور مشرق میں اسے اسرائیلیہ کے پہلے جلاوطنوں کے ساتھ جو ان کے ہم نسل تھے، بسایا گیا تو بنی بخت کی نامی گرامی شہرت کے سبب سارے جلاوطنوں کا قومی نام پختون ہوا۔" (صفحہ ۶۱) مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پختون اور افغان کے لئے پٹھان کے لفظ کا استعمال بھی عام ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ افغان جس وقت ہندوستان پر قابض ہوئے توان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو بٹنی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور جو افغانوں کا دوسرا بڑا قبیلہ ہے، ان میں لودی، سوری اور سروانی و خلجی وغیرہ اسی قبیلے سے متعلق ہیں جو صوبہ یاتھار دن کے مشرق میں بشاور کے علاقے میں واقع تھا اور پتھانیاں سے موسوم تھا۔ اس نسبت سے وہ یہاں مشرق میں اکثر بٹنی کہلانے لگے، ہندوستان میں ان کو پٹھان سے موسوم کیا گیا اور وقت گزرنے پر اس قبیلے کو ہی نہیں بلکہ عام افغان کو پٹھان کا نام دیا گیا جو امتیازی حیثیت سے ان کا قومی نام قرار پایا۔" (صفحہ ۶۲)

اس کتاب میں برصغیر پر پٹھانوں کی حکومت، ان کے کارنامے اور ان کے زوال کے اسباب پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، اس لئے دلچسپ بھی ہے اور معلوماتی بھی۔ کتاب میں بہت سے نقشے بھی شامل ہیں۔ اگرچہ کتاب موضوع اور مباحث کے اعتبار سے متحدہ ہندوستان سے متعلق ہے، اس لئے نقشے بھی اسی زمانے تک محدود ہونے چاہیئے تھے، مگر پاکستان کا نقشہ بھی دیا گیا ہے اور ریاست جموں وکشمیر کو پاکستان کا حصہ دکھلایا گیا ہے۔ کتاب علمی تھی اور اسے علمی رہنا چاہیئے تھا، اس نقشے کو شامل کر کے خواہ مخواہ کے لئے سیاست کا ایک نزاعی مسئلہ چھیڑ دیا گیا ہے۔ کتاب بہر حال قابل مطالعہ ہے اور پٹھانوں کے بارے میں غالباً اس سے بہتر کتاب اردو میں نہ ہو گی۔

عزم نو ـــــ اسلامی نظام تعلیم نمبر

مدیر: منظور احمد جاوید

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۲۰۲ صفحات، قیمت: ۳۰ روپے،

ملنے کا پتہ: اسلامی کتب خانہ۔ علامہ یوسف بنوری ٹاؤن۔ کراچی نمبر ۵

یہ خصوصی شمارہ پچھلے سال شائع ہوا ہے اور اس میں اسلامی نظام تعلیم اور موجودہ ضرورت کے پیش نظر اس میں تبدیلی اور جدید مغربی تعلیم کے نقائص اور مضر اثرات پر مضامین شامل ہیں۔ اس کو زیادہ سے زیادہ مفید اور جامع بنانے کے لئے بہت سے قدیم اور مطبوعہ مضامین بھی شائع کئے گئے ہیں، مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد کے دو مضمون: "مسلمانانِ ہند اور گورنمنٹ کی تعلیمی حکمتِ عملی اور علمی نصاب تعلیم میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت"، مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم کا

مضمون "مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" ، مولانا حالی مرحوم کے دو مضمون "اسلامی مدارس کا نصاب تعلیم" اور "عصری تعلیم" اور مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا مسلمانوں کی آئندہ تعلیم وغیرہ۔ شروع میں فاضل مدیر کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ بھی ہے جس میں پورے صفحے میں جامعہ ملیہ کا بھی ذکر ہے۔ مسلمانوں کی تعلیم میں جامعہ کی خدمات کا بہت بڑا اور شاندار حصہ ہے، ضرورت تھی کہ اس پر ایک مفصل مضمون شائع کیا جاتا۔ مقالات سے پہلے ڈاکٹر ریاض الرحمان خاں شیروانی (ریڈر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ) اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے انٹرویو شامل ہیں۔ شیروانی صاحب کے انٹرویو سے کسی حد تک ہندوستان کی تعلیمی حالت اور بڑی حد تک مسلم یونیورسٹی کی تعلیمی کیفیت پر روشنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کا پاکستان کے ماہرین تعلیم میں شمار ہوتا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں کہ ہماری روز افزوں تعلیمی پسماندگی کے کیا اسباب ہیں؟ انھوں نے فرمایا: "اگر یہ امر پیش نظر رکھا جائے کہ ہمارے بچے اور نوجوان ذہانت میں کسی قوم کے بچوں اور نوجوانوں سے کم نہیں ہیں تو روز افزوں تعلیمی پسماندگی کے اسباب ہمیں اس نظام کی خرابیوں میں تلاش کرنے پڑیں گے جو اس ملک میں ایک عرصے سے رائج ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہر بچے کی تعلیم کی ابتدا اس کی مادری زبان سے ہونی چاہیے اور بعد میں اسے قومی زبان سے آشنا کرانا چاہیے..." ڈاکٹر صاحب نے جو وجہ بتلائی ہے صرف وہی نہیں ہو سکتی، کیونکہ ہم نے اس کا تجزیہ کر کے دیکھ لیا ہے۔ اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت ہے۔ آجکل عربی مدارس کے نصاب تعلیم کی اصلاح پر بہت زور دیا جا رہا ہے، اس سلسلے میں "عزم نو" کا یہ خصوصی شمارہ ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

سہ ماہی مجلہ تحقیق

مدیر: ڈاکٹر وحید قریشی

سالانہ چندہ: ۳۰ روپے۔ قیمت فی شمارہ: ۱۵ روپے

ناشر: کلیہ علوم اسلامیہ و ادبیات شرقیہ، پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور

جامعہ کے کسی شمارے میں ہم سہ ماہی مجلہ تحقیق کا تعارف کرا چکے ہیں۔ ابھی حال میں اس کے دو شمارے (جلد: ۲ شمارہ: ۳ و ۴) موصول ہوئے ہیں۔ حسب سابق ان میں ایسے تحقیقی مضامین

شامل ہیں جو محنت سے لکھے گئے ہیں اور تحقیق کا حق ادا کیا گیا ہے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

شمارہ ۳: (۱) ثاقب لکھنوی کی بیاضیں (قسط اول) از مشفق خواجہ (۲) اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت کتابیات (غیر ملکی زبانوں میں کلام اقبال کے تراجم، علامہ اقبال کی شخصیت اور فکر و فن پر کتب، مقالات، تقاریر) از ڈاکٹر سلیم اختر (۳) سراج الاخبار (قسط سوم) [اس قسط میں اخبار کی ۳۰ مارچ ۱۸۸۵ء سے ۲۱ جنوری ۱۹۰۹ء تک سے مختلف مشاہیر کی وفیات درج ہیں۔ ابھی یہ سلسلہ جاری ہے] از فضل حق قریشی (۴) الخصائص الصغریٰ (علامہ جلال الدین سیوطی) [یہ مضمون عربی میں ہے] مقدمہ و متن از ڈاکٹر ظہور احمد اظہر۔

شمارہ ۴: (۱) انشا کے خاندان کے بارے میں کچھ نئی معلومات از ڈاکٹر عابد پشاوری (۲) شمس العلماء سید میر حسن سیالکوٹی از ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین (۳) بال جبریل کا متروک کلام از رفیع الدین ہاشمی (۴) ثاقب لکھنوی کی بیاضیں (قسط دوم) [ابھی یہ سلسلہ جاری ہے] از مشفق خواجہ (۵) سراج الاخبار (آخری قسط) [اس میں ادب و تاریخ سے متعلق خبریں ہیں اور اخبار کی ۹ نومبر ۱۸۸۵ء سے ۱۸ مئی ۱۹۰۹ء تک سے خبریں دی گئی ہیں] از فضل حق قریشی۔

تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے یہ رسالہ بے حد مفید ہے۔

زخم ہنر

از شاعر لکھنوی

سائز $\frac{18\times22}{8}$، حجم ۲۵۶ صفحات، مجلد، کتابت و طباعت و کاغذ عمدہ، قیمت ۲۵ روپے۔

سنہ اشاعت: ۱۹۷۹ء۔ ناشر: شاعر لکھنوی، $\frac{1}{9}$/۱۱ دستگیر سوسائٹی۔ کراچی۔ ۳۸

جناب شاعر لکھنوی، ان مہاجر شعراء میں سے ہیں جنھوں نے پاکستان میں نام پیدا کیا ہے اور اپنی انفرادی اور امتیازی حیثیت قائم کر لی ہے۔ ایک طویل عرصے سے میں ان کے نام سے واقف ہوں، مختلف رسالوں میں ان کا کلام پڑھتا رہا ہوں۔ مگر نہ تو ان کا پورا نام معلوم ہے، نہ عمر معلوم ہے اور نہ یہ علوم کہ اس وقت وہ کیا کرتے ہیں۔ اور پاکستان کب گئے۔ اس مجموعۂ کلام میں تین تحریریں شامل ہیں: ایک خود حضرت شاعر کے قلم سے دو سطروں کی، دوسری ماہنامہ "نگار" (کراچی) کے ایڈیٹر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی اور تیسری مسعود احمد برکاتی صاحب کی جن میں موصوف کی شاعری اور اس کی خصوصیات پر روشنی

ڈالی گئی ہے، مگر خود شاعر کی ذات اور شخصیت کے بارے میں اس سے زیادہ نہیں ہے کہ: ایک عرصے تک ہمدرد کے شعبۂ طباعت کے افسر انچارج رہے ہیں، بے نیازی، کم آمیزی، کم گوئی ان کی مزاجی کیفیت ہے، بقول فرمان صاحب: "وہ کسی محفل میں ہوں اور کسی کے سامنے ہوں، اپنی آن بان اور اپنی انا کو بے سبب مجروح کرنے پر رضامند نہیں ہوتے، وہ ملتے ہیں لیکن ذرا فاصلے سے، قریب آتے ہیں مگر آہستہ آہستہ کھلتے ہیں مگر کم کم، ملتے سب سے ہیں لیکن اپنے وجود کے احساس کے ساتھ۔" نیز یہ معلوم ہوا کہ ۱۹۳۲ء سے باقاعدہ شعر کہہ رہے ہیں، "مگر زخم ہنر" ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔

خود جناب شاعر نے اپنی شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ: "میں نے ۱۹۳۲ء سے باقاعدہ شعرگوئی کا آغاز کیا تھا اور اس وقت سے لے کر اب تک اردو غزل کے بہت سے موڑ میری نظر سے گزرے، ان ادوار میں غزل کی بہت سی صلاحیتوں نے مجھے متاثر کیا، غزل میری محبوب صنف ہے، اگرچہ میں نے ہر صنف میں کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہے، لیکن میرے احساسات کی صحیح ترجمان غزل اور صرف غزل رہی۔" عام طور پر کہا جاتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ غزل میں دنیا بھر کے تمام مسائل پر اظہار کیا جاسکتا ہے، مگر اس انداز سے کہنا کہ غزل غزل رہے اور اس کی کوئی خصوصیت مجروح نہ ہو، آسان کام نہیں ہے۔ جناب شاعر اپنے آپ کو لکھنوی لکھتے ہیں، لیکن فرمان صاحب نے لکھا ہے کہ وہ لکھنو کے ہوتے ہوئے بھی غیر لکھنوی ہیں، وہ لکھتے ہیں: "وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے اور وہیں ان کے ذوقِ شعری کی تربیت ہوئی لیکن کتنی حیرت کی بات ہے کہ شاعری اور زندگی کے مسائل کے باب میں ان کا طرز احساس اور ان کے سوچنے کا انداز ہمیشہ غیر لکھنوی رہا۔" میں نے زیر نظر مجموعے کی غزلیں غور سے پڑھی ہیں، میرا احساس ہے کہ واقعی یہ دونوں خصوصیات ان میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ لکھنوی شاعری کی جو خصوصیات بتلائی جاتی ہیں، ان کا ان غزلوں میں شائبہ تک نہیں اور جب وہ عصری مسائل پر اظہار خیال کرتے ہیں تو غزل کے حد میں رہتے ہیں اور اس کی خصوصیات اور جمالیات کو ٹھیس پہنچائے بغیر۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

یقین دلایا گیا تھا ہم کو کہ ہو گئی ہے سحر نمایاں
مگر یہ راہوں میں کیوں اندھیرے یہ منزل تک غبار کیوں ہے

یہ کیا بہار کہ گنتی کے چند پھول ہنسیں
بہار وہ ہے جو سارے چمن کے کام آئے

لہو بہانے کے بعد ہوتی ہے حاصل اک سرخیٔ فسانہ
خزاں کے جھونکوں سے ڈرنے والے چمن کی تعمیر کیا کریں گے

(باقی صفحہ ۳۶۷ پر ملاحظہ ہو)

سہ ماہی اسلام اور عصر جدید

مدیر: ضیاء الحسن فاروقی

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ادارہ، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز سے یہ سہ ماہی رسالہ پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، جس میں اسلامی موضوعات اور مسلمانوں بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کے علمی، تعلیمی و دینی مسائل پر علمائے اسلام اور دانشوروں کے تحقیقی اور علمی مضامین شائع ہوتے ہیں۔

زیر کتابت شمارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک طویل اور مبسوط غیر مطبوعہ مضمون "البیرونی اور جغرافیۂ عالم" شائع ہو رہا ہے اور اسی کے ساتھ جناب مدیر کے قلم سے البیرونی پر ایک جامع مضمون بھی بطور مقدمے کے شامل ہے۔ اگرچہ اس شمارے کی ضخامت معمول کے شماروں سے کافی زیادہ ہے اور آفسیٹ میں چھپ رہا ہے، مگر پھر بھی یہ شمارہ سالانہ چندے میں بغیر کسی زائد رقم کے ملے گا۔ یہ مضمون کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ ہے، مگر اس کی قیمت رسالے کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوگی۔ اس لئے جو حضرات کم قیمت پر یہ شمارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، جلد سے جلد سالانہ چندہ بھیج کر اس کے خریدار بن جائیں۔ رسالے کی قیمت کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

ہندوستان کے لئے:	سالانہ چندہ پندرہ روپے،	فی پرچہ چار روپے
پاکستان کے لئے:	〃 بیس روپے،	〃 پانچ روپے
دوسرے ملکوں کے لئے:	پانچ امریکی ڈالر یا اس کے مساوی رقم	

پتہ: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

Regd. No. D-(S.E.)-108 Vol. 77 No. 8 AUGUST, [illegible]

THE MONTHLY JAMIA, Jamia Nagar, New Delhi-110025

Subscription Rates

India	Rs. 6-00
Pakistan	Rs. 26-00
Foreign	$ 4 (US) or £1.50

Advertisement Rates

Cover IV	Full page Rs. 200/-	Half page Rs. 100/-
Cover III & II	Full page Rs. 150/-	Half page Rs. 75/-
Ordinary	Full page Rs. 100/-	Half page Rs. 50/-

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۷۷	بابت ماہ ستمبر ۱۹۸۰ء	شمارہ ۹

فہرست مضامین

مدیر
ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون
عبداللطیف اعظمی

خط وکتابت کا پتہ :

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع وناشر : عبداللطیف اعظمی • مطبوعہ : جمال پریس دہلی ۶ • ٹائٹل : فائن پریس دہلی ۶

شذرات

اس وقت دنیا کا حال ابتر اور بین الاقوامی صورتِ حال تشویشناک ہے، یہاں تک کہ چین کے ایک اہم رہنما نے ابھی چند روز پہلے یہ کہا ہے کہ تیسری عالمی جنگ ناگزیر ہے اور اس کا امکان ہے کہ یہ عالمی جنگ آئندہ دس برسوں ہی میں ہو جائے۔ ہم اس چینی رہنما کی بات کو مبالغہ تصور کرتے ہیں، لیکن اس سے اتنا تو ضرور پتہ چلتا ہے کہ اس وقت دنیا میں سیاست کا جو رخ ہے وہ امنِ عالم کے لئے قطعی سازگار نہیں ہے۔ بسا اوقات یہ بالکل پتہ نہیں چلتا کہ دنیا کی دو بڑی طاقتیں جن کے مابین خوشگوار تعلقات پر دنیا کی امن و سلامتی کا بہت کچھ دارومدار ہے، کس وقت کیا کر بیٹھیں اور اس کے نتائج کیا ہوں۔ اخباروں میں جو خبریں چھپتی ہیں، جانبدارانہ پروپیگنڈہ کے اس دور میں ان کی روشنی میں صحیح صحیح کسی نتیجہ پر پہونچنا دشوار ہو گیا ہے اور ملکوں کے امورِ خارجہ اور دفاع کے محکموں میں خفیہ اور رازدارانہ طور پر جو فیصلے ہوتے ہیں، ان کی ہوا دوسروں کو نہ پہلے کبھی لگی ہے اور نہ اب لگ سکتی ہے۔ اس لئے ہم خبروں کی بنا پر، جس نوعیت کی بھی وہ ہیں، محض قیاس آرائی کر سکتے ہیں۔

پچھلے کئی مہینوں سے جنوب مشرقی ایشیا، بحرِ ہند اور مغربی ایشیا میں بین الاقوامی کشاکش نے جو رنگ اختیار کیا ہے اس سے امنِ عالم کی بقا کے امکانات پر دھند چھا گئی ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا میں کمپوچیا ایک ملک ہے۔ وہاں انقلاب ہوا اور انقلاب کے بعد جو حکومت بنی ہے اسے ویٹ نام کی حمایت حاصل ہے۔ چین اس نئی حکومت کا حامی نہیں ہے۔ چین کی ہمت افزائی پر کمپوچیا کی پہلی حکومت کے ہمنوا تھائی لینڈ کے سرزمین سے امریکی امداد کے سہارے کمپوچیا میں گھستے اور گڑبڑ مچاتے ہیں۔ ویٹ نام کو روس کی حمایت شروع ہی سے حاصل رہی ہے اور چین اسے پسند نہیں کرتا۔ وہ کمپوچیا میں ایسی حکومت دیکھنا چاہتا ہے جو ویٹ نام کی سخت مخالف ہو۔ مقصد یہ ہے

کہ اس طرح شمال اور جنوب سے دباؤ ڈال کر ویٹ نام کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ روس کی دوستی اور رہنمائی سے دستبردار ہو جائے۔ امریکہ ویٹ نام میں اپنی شکست و ذلت کو بھولا نہیں ہے۔ وہ چین سے مل کر کمپوچیا کے توسط سے ویٹ نام کو کمزور کرنا اور اسے روسی کیمپ سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ اس کشاکش میں ظاہر ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا میں عالمی طاقتوں کے مفادات کا تصادم ہوگا اور کم از کم علاقائی جنگ کے شعلوں کے بھڑکنے کے امکانات موجود رہیں گے۔ خطرات سے بھری پڑی ایسی صورت حال میں کسی بڑی طاقت کا کوئی ناعاقبت اندیشانہ فیصلہ بڑی جنگ کا پیش خیمہ بھی بن سکتا ہے۔

دنیا کی بڑی طاقتوں کی تناتنی کی اس فضا میں بحر ہند میں امریکہ اور روس کی بحری افواج کے اجتماع میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اور ہمارے اپنے ملک کے سمندروں میں امریکہ اور روس کے بحری جنگی جہاز اور نیوکلیائی آب دوز کشتیاں نظر آنے لگی ہیں۔ مغربی ایشیا میں تیل والے ملکوں پر سبھی کی نظر ہے اور ان کے قریب کے ملکوں اور جزیروں میں امریکہ اور روس دونوں کو بحری اڈوں کی تلاش رہتی ہے، اور ان کے کئی اڈے موجود بھی ہیں۔ ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد جس میں امریکہ نے اسرائیل کی طرف سے مداخلت کر کے جنگ رکوادی تھی، پہلے جنیوا کانفرنس ہوئی اور پھر کیمپ ڈیوڈ معاہدہ ہوا۔ ان دونوں موقعوں پر امریکہ مجموعی طور پر اس میں کامیاب رہا کہ روس کو مغربی ایشیا کے معاملات سے دور رکھا جائے۔ لیکن روس عراق، شام اور لیبیا کے ساتھ اپنے دوستانہ تعلقات کے ساتھ پھر بھی اس علاقے میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا۔ مغربی ایشیا میں امریکہ اور روس کی کشاکش سے عرب ملک ہراساں اور پریشان ہیں۔ امریکہ کا یہ ارادہ اب کچھ ڈھکا چھپا نہیں رہا کہ اگر تیل والے عرب ملک مغربی دنیا کو، کسی سبب سے، تیل دینا بند کر دیں گے تو امریکہ ان کے خلاف فوجی کارروائی کرے گا، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایسی صورت میں روس کا خاموش رہنا ممکن نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں امن عالم کے لئے کتنا بڑا خطرہ ہوگا۔

اس موقع پر ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ایران میں ایک بڑا انقلاب ہوا ہے اور اسی سلسلے میں امریکی سفارت خانے کے پچاس افراد کو یرغمال بنالئے جانے کا وہ مسئلہ ابھی باقی ہے

جسے بہانہ بناکر امریکہ ایران میں فوجی مداخلت کرسکتا ہے۔ افغانستان میں روسی افواج کی موجودگی کے سبب امریکہ کی پوری کوشش یہ ہے کہ ایران میں روس کا کوئی اثر نہ رہے۔ لیکن امریکہ سے ایران کو جو خطرہ لاحق ہے اس میں بہت کمی ہوجائے اگر افغانستان کے مسئلہ کا کوئی سیاسی حل نکل آئے اور روسی فوجیں وہاں سے واپس چلی جائیں۔ ہمارا خیال ہے کہ روس کو خود اس سلسلے میں کوئی مثبت اقدام کرنا چاہئے۔ امریکہ اور چین کے عزائم کا جن کے نتائج امن عالم کے لئے بھیانک ہوسکتے ہیں، مقابلہ اسی مثبت اقدام سے کیا جاسکتا ہے۔ ورنہ خود روس پر بھی امن عالم کو تباہ کرنے کی ذمہ داری ہوگی۔

مغربی ایشیا میں ایک اور ملک بھی ہے جو اگرچہ چھوٹا ہے، لیکن امریکہ اور مغربی یورپ کے بعض ممالک کی حمایت کے سبب، وہ انتہاپسندی اور فتنہ پرور ہے کہ کسی وقت بھی مغربی ایشیا جنگ کا میدان بن سکتا ہے۔ ۱۹۷۳ء کے بعد اُردن کے مغربی کنارے اور غزہ پٹی کو ملا کر ایک آزاد فلسطینی حکومت کے قیام کی تائید تمام عرب ملکوں نے کی تھی اور پوری قوت سے کی تھی، لیکن امریکہ اور اسرائیل کی طرف سے اس سلسلے میں ٹال مٹول کا رویہ اختیار کیا گیا۔ صدر سادات بار بار اعلان کرتے رہے کہ کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے میں فلسطینیوں کے حقوق و مطالبات کی بات شامل ہے لیکن اسرائیل پہلے تو گول مول باتیں کرتا رہا اور اب اس نے صاف صاف انکار کرنا شروع کر دیا ہے کہ یہ اسرائیل کی زندگی اور موت کا سوال ہے اور وہ اُردن کے مغربی کنارے پر فلسطینیوں کی آزاد مملکت کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کرسکتا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے تمام دنیا کی رائے عامہ کو ٹھکرا کر مشرقی یروشلم کو لے کر پورے یروشلم کو اپنی راجدھانی بنالی ہے اس اعلان کے ساتھ کہ یروشلم یہودیوں کا ہے اور اب وہ ہمیشہ ہمیشہ وہاں جمے رہیں گے۔ دوسری طرف جنوبی لبنان میں فلسطینیوں کے خلاف اسرائیل کی جنگ جاری ہے۔ لبنانی حکومت بے دست و پا ہے، انجمن اقوام متحدہ بے بس ہے اور اسرائیل اور شام کے طیاروں کی جھڑپیں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ شام کے داخلی حالات بھی تشویشناک ہیں۔ وہاں حافظ اسد کی حکومت کے خلاف اسلام پسندوں کی الگ ایک جنگ جاری ہے، اور یہ بات دلچسپ بھی ہے اور باعث حیرت بھی کہ بقول کسے ایران کی اسلامی حکومت حافظ اسد

کی تائید میں ہے ــــ الغرض اس وقت مغربی ایشیا کے سیاسی حالات اتنے الجھے ہوتے ہیں کہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کس وقت کیا ہو جائے۔

القدس کا مسئلہ دنیا کے سارے مسلمانوں کا مسئلہ ہے، یہ اُن غیر مسلم ملکوں کا بھی مسئلہ ہے جو عالمی سیاست میں حق و انصاف کے ہمنوا رہے ہیں۔ سعودی عرب کے شہزادہ فہد نے جن کی آواز سعودی حکومت کی آواز ہوتی ہے، القدس کے مسئلہ پر جہاد کا اعلان کیا ہے۔ اگر عرب اور دوسرے مسلم ملک اس سلسلے میں سعودی حکومت کی قیادت تسلیم کریں اور القدس کو اسرائیل سے آزاد کرائے اور فلسطینیوں کی آزاد مملکت کے قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ باطل کے مقابلہ میں حق کی فتح ہوگی، ظلم کے خلاف انصاف اور صداقت کی جیت ہوگی۔ ہندوستان کی حکومت نے مشرقی یروشلم پر اسرائیل کے قبضے اور اسے مغربی یروشلم سے ملاکر پورے شہر کو اسرائیل کی دائمی راجدھانی بنانے کی سخت مذمت کی ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ حکومتِ ہند عرب اسرائیل کشاکش میں اضافہ کرنا چاہتی ہے بلکہ اس لئے کہ اس کشاکش میں اس نے ہمیشہ حق و انصاف کا ساتھ دیا ہے اور شروع ہی سے وہ عربوں اور بالخصوص فلسطینیوں پر اسرائیل کی زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھاتی رہی ہے۔ دوسرے اور اسباب کے علاوہ، ایک وجہ یہ بھی ہے کہ امریکہ نے جو اسرائیل کی جارحیت کے پس پردہ اپنی مقصد برآری کے لئے مسلسل ریشہ دوانیاں کرتا رہا ہے، نہ تو کبھی پنڈت جواہر لال نہرو کی خارجہ پالیسی کو پسند کیا اور نہ اندرا حکومت کے موقف کو۔ اور یہی سبب ہے کہ اس کی کوشش اور خواہش ہمیشہ یہی رہی کہ ہندوستان سیاسی و معاشی اعتبار سے کبھی مستحکم اور مضبوط نہ ہو۔

ضیاء الحسن فاروقی

انیسویں صدی میں ہندوستانی مسلمان

اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو پتہ چلا کہ یہ آخری مغل اعظم کا سیاسی تدبر، اولوالعزمی، ہمت اور قوت تھی جس نے انحطاط و زوال اور انتشار و افتراق کی تخریبی قوتوں کے سیلاب کو روک رکھا تھا۔ یہ بند ٹوٹا تو پورا ملک باغیانہ مہم جوئیوں اور طوائف الملوکی کی زد میں تھا۔ اٹھارہویں صدی کا ہندوستان سیاسی انتشار کا ہندوستان تھا۔ مرہٹے، سکھ، جاٹ، روہیلے، ہندو مسلم زمیندار، ایرانی و تورانی امرا اور ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر، سبھی کی تگ و تاز کا ہندوستان تھا۔ سماجی اور اقتصادی اعتبار سے تمام ہندوستانیوں کی حالت ابتر تھی، لیکن مسلمانوں کی حالت خاص طور پر ناگفتہ بہ تھی۔ گویا حکومت اور سیاسی قوت ایک ایسی چادر تھی جس نے ان کی تمام کمزوریوں کو چھپا رکھا تھا، جیسے ہی یہ چادر ہٹی مسلمانوں کی اخلاقی، سماجی اور معاشی کمزوریاں ابھر کر سامنے آگئیں۔ شاہ ولی اللہ دہلوی اور شاہ فخرالدین دہلوی کی تحریروں میں ہمیں اس دور کے حالات و ان کے اسباب سے متعلق بہت کچھ ملتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے اپنے طور پر اس بات کی بہت کوشش کی کہ مسلمانوں کی سیاسی طاقت ایک بار پھر مستحکم ہو جائے۔ اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ کی کاوشیں اور تدبیریں بھی ہماری تاریخ کا حصہ بن گئی ہیں، لیکن ساری کوششیں ناکام رہیں، مسلمانوں کے زوال اور انتشار کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی، جو نئی سیاسی طاقتیں ابھریں ان کی توجہ زیادہ تر لوٹ مار پر تھی۔ ان میں جہانگیری و جہانبانی کی صلاحیت بھی نہ تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف جنوبی اور مشرقی ہندوستان بلکہ اٹھارہویں صدی

نوٹ: یہ مضمون وہ توسیعی خطبہ ہے جو ۸ ارفروری ۱۹۸۴ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں پڑھا گیا۔

کے ختم ہوتے ہوتے شمالی ہندوستان بھی انگریزوں کے اثر میں آگیا۔ دہلی کے تخت پر اگرچہ مغل حکمراں متمکن تھا لیکن اس کی حکومت دہلی سے پالم ہی تک تھی اور وہ بھی برائے نام۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اگرچہ ملک کے ہر حصہ میں اس وقت علمی و تہذیبی مراکز تھے، مدرسے اور خانقاہیں تھیں، علماء بھی تھے اور صلحاء بھی۔ لیکن اس بحرانی دور میں شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے نے جس صلاحیت و عزیمت کے ساتھ مسلمانوں کی علمی و تہذیبی عظمت کو برقرار رکھا وہ کسی اور شخصیت اور خانوادے کا مقدر نہ بن سکی۔ یہ موقع اس بات کو تفصیل سے بیان کرنے کا نہیں ہے۔ اہل علم اور اہل نظر اس سے واقف ہیں۔ جو بھی طالب علم ہیں وہ مطالعہ کرکے اس سے واقف ہو سکتے ہیں، یہاں میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ اٹھارویں صدی مسلمانوں کے لیے بڑی آزمائش کی صدی تھی، اس آزمائش میں مسلمانوں نے اپنی سیاسی قوت کھو دی اور اس عظیم خطرہ سے دوچار ہوتے کہ ملّی اور جماعتی اعتبار سے بھی ان کا شیرازہ منتشر اور ان کی انفرادیت بکھر جائے، سیاسی قوت تو وہ دوبارہ نہ حاصل کرسکے لیکن شاہ صاحب اور ان کے جلیل القدر فرزندوں کی محنت، ان کی بصیرت، ان کے دنوں کی تپش اور ان کی شبوں کے گداز نے مسلمانوں کی ملّی شخصیت کو پارہ پارہ ہونے سے بچا لیا، شاہ صاحب کے افکار و خیالات کی جامعیت ہی، ایک ملّت کی حیثیت سے مسلمانوں کی بیداری کا نقطۂ آغاز تھی۔ آگے چل کر مسلمانوں میں جتنی بھی سیاسی، علمی، مذہبی اور اصلاحی تحریکیں ابھریں، غور سے دیکھئے تو وہ سب اسی مرد حق آگاہ کی جامعیت کی خوشہ چیں تھیں۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

ابھی ابھی کہا گیا ہے کہ اٹھارویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے شمالی ہندوستان پر بھی انگریزوں کا اقتدار قائم ہوگیا تھا۔ اس سلسلے میں ۱۸۰۳ء میں دہلی کے قریب جو لڑائیاں ہوئیں ان میں گوالیار کے مرہٹہ حکمراں سندھیا کی شکست اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس کے نتیجہ میں دہلی کا شکستہ وخستہ ضعیف اور نابینا مغل حکمراں شاہ عالم پورے طور پر انگریزوں کی محافظت میں آگیا۔ انگریزوں کی فوج دہلی میں داخل ہوگئی اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کرکے یہ ثابت کردیا کہ اب کلکتہ سے دہلی تک انھیں کی حکمرانی ہے۔ انھیں حالات میں شاہ عبدالعزیز نے ۱۸۰۳ء میں فتویٰ دیا کہ ہندوستان اب دارالاسلام

نہیں رہا۔ اس کے بعد بعض دوسرے علماء نے بھی ہندوستان کو دارالحرب کہنا شروع کیا، شاہ عبدالعزیز اور یہ علماء اس وقت ملت اسلامیہ ہند کا ضمیر تھے جو انگریزوں کے اقتدار کی تیز رفتار توسیع سے حیران اور پریشان تھی۔ ۳۱ ملت نے یہ محسوس کیا کہ زمین اس کے پاؤں سے نیچے سرک رہی ہے اور مذہبی رہنماؤں کے سوا اب کوئی نہیں جس کی طرف یہ دیکھے اور جس سے اسے سہارا ملے۔

یہ بات اہل علم کی توجہ کی طالب ہے کہ ۱۸۰۳ — ۱۷۸۲ کی درمیانی مدت میں جب کہ دہلی پر مرہٹوں کی بالادستی قائم تھی اور مغل بادشاہ جو محض نام کا بادشاہ تھا، پورے طور پر ان کے اثر میں تھا، کہیں سے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ نہیں جاری ہوا۔ شاہ صاحب دہلی ہی میں تھے اور ان کی آنکھوں کے سامنے دہلی اور اس کے نواح میں مرہٹے پُرامن باشندوں پر ظلم توڑ رہے تھے لیکن انھوں نے یہ اعلان نہیں کیا کہ اب ہندوستان دارالاسلام نہیں رہا۔ میرے اپنے خیال میں اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ باوجود اس کے کہ مرہٹے ہر طرف لوٹ مار کر رہے تھے، پُرامن شہریوں سے ظالمانہ طور پر چوتھ وصول کرتے تھے اور کوئی کسی وقت بھی ان کی حرص و ہوس کی زد میں آسکتا تھا، شاہ صاحب ابھی اس نتیجہ پر نہیں پہونچے تھے کہ مسلمانوں کا اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔ غالبًا انھوں نے مرہٹوں کے عروج کو ایک عارضی واقعہ تصور کیا اور اسے بغاوت سمجھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ یہ صورت حال جلد ختم ہو جائے گی۔ اپنے فتوے میں انھوں نے 'ذمیّ' کی اصطلاح استعمال کی تھی، ہندو یا غیر مسلم نہیں کہا تھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ابھی ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت باقی تھی۔ بلاشبہ مرہٹوں نے اسے بہت کمزور کر دیا تھا لیکن انھوں نے نہ تو کوئی نیا سیاسی نظام قائم کیا اور نہ اس طرح کی کسی خواہش یا خیال کا اظہار کیا؛ اور غالبًا وہ کسی نظام کے قائم کرنے کے اہل بھی نہیں تھے، لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے سیاسی عروج اور دہلی پر اس کے اقتدار میں انھیں مسلم معاشرہ کے مکمل انتشار اور مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کی پوری تباہی نظر آئی۔ شاہ صاحب ارباب بصیرت میں تھے، ان کے قلب پر آئندہ کے خطرات اور انگریزی اقتدار کے مضرات روشن تھے۔ میسور، بنگال، اودھ اور روہیلوں کے علاقے میں انگریزوں نے جو کچھ کیا تھا اور اب جو کچھ وہ کر رہے تھے، اس سے وہ پوری طرح واقف تھے، اسی لئے انھوں نے یہ فتویٰ دیا۔ ایک لحاظ سے یہ گویا اعلان تھا کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف اُٹھ کھڑا ہونا چاہیئے۔

قبل اس کے کہ ایک بیرونی طاقت آئے اور سارے ہندوستان پر چھا جائے سلطنت مغلیہ

عملاً ختم ہو چکی تھی اور اس کا خمیازہ سب سے زیادہ مسلمانوں کو بھگتنا پڑا تھا۔ یہ ایک دکھ بھری داستان ہے کوئی کیا سناتے اور کہاں سے سنتے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی ابھرتی ہوئی طاقت ایک ایسے تمدن اور ایسی تہذیب کی نمائندہ تھی جو جدید علوم کی ترقی اور صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لینے والی تھی۔ ادھر ہندوستان میں جو سیاسی و سماجی و معاشی نظام تھا جامد، غیر متحرک جاگیرداری نظام تھا، یورپ میں صنعتی انقلاب کی کامیابی نے جس سرمایہ داری نظام کو جنم دیا تھا اس نے خود یورپ میں جاگیردارانہ سسٹم کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا تھا، ہندوستان اس کی یلغار کی تاب کتنے دنوں لا سکتا تھا، پھر ایک ایسی بدیسی طاقت کو جو نئی توانائیوں کے ساتھ آئی تھی، جسے اپنی تہذیبی برتری کا زعم تھا اور جس کے ایک ترکیبی عنصر، عیسائیت، کا یہ خیال تھا کہ ساری دنیا کافر ہے اور اس کا یہ فرض ہے کہ وہ سب کو عیسائی بنا کر مہذب اور KINGDOM OF GOD کا شہری بنا دے، ہندوستان کے عوام سے بھلا کیا ہمدردی ہو سکتی تھی، خاص طور پر اسلام اور مسلمانوں کو وہ اپنی راہ کی بڑی رکاوٹ اور اپنا سب سے بڑا مخالف تصور کرتی تھی، عیسائی دنیا صلیبی جنگوں کو اب تک فراموش نہ کر سکی تھی، ایسی صورت میں برطانیہ کا سرمایہ داری نظام جس کا مزاج ہی استحصال EXPLOITATION تھا کسی طرح ہندوستانی معیشت کی تباہی و بربادی سے اپنے آپ کو باز رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ اس دور سے متعلق جو ریکارڈ اور دستاویزات محفوظ ہیں ان سے ان الم ناک مصائب و مظالم کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے جو ہندوستان کے کسانوں اور دستکاروں پر توڑے گئے۔ برطانیہ کے سرمایہ داروں کو ایسے بازار کی ضرورت تھی جو انھیں کچا مال فراہم کرے اور ان کے کارخانوں کی مصنوعات کو خرید کر استعمال کرے اور یہ ضرورت مستقل اور مسلسل تھی، اور مختلف قوانین اور چارٹر کے ذریعہ ہندوستان کو اپنی صنعت و زراعت کی قیمت ادا کر کے ان کی یہ ضرورت پوری کرنی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی پارچہ سازی کی صنعت برباد ہو گئی اور کروڑوں کی تعداد میں جنکر اور اہل حرفہ بیکاری اور فاقہ کشی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیئے گئے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں لکھا ہے کہ

"سوال یہ تھا کہ اب یہ (جنکر اور اہل حرفہ) کہاں جاتے؟ اپنے قدیم پیشے کے دروازے وہ بند پاتے تھے کسی دوسرے پیشے کے دروازے بھی ان کے لئے نہیں کھلے تھے۔ ہاں اب وہ مر سکتے تھے۔ . . . . اور ہوا بھی یہی کہ لاکھوں کی تعداد میں یہ موت کی آغوش میں سو گئے۔" ۴۲

میں گورنر جنرل لارڈ بنٹنک نے رپورٹ بھیجی کہ تجارت کی تاریخ میں اس مصیبت اور بے چارگی کی کوئی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ بنکاروں کی ہڈیاں ہندوستان کے میدانوں میں بکھری پڑی ہیں۔"

سرمایہ داری نظام کی سختیوں اور ظالمانہ تقاضوں کا تجربہ پہلے جنوب کو ہوا، پھر بنگال، بہار، اڑیسہ، شمالی ہندوستان، وسطی اور مغربی ہندوستان اس کی لپیٹ میں آگئے۔ لوٹ کھسوٹ اور تباہی و بربادی کی یہ فضا تعلیم و تہذیب سبھی کے لئے سم قاتل تھی۔ پرانا نظام تعلیم بکھر رہا تھا اور ابھی کوئی نیا نظام آیا نہیں تھا، یہاں تک کہ ۱۸۲۳ء تک کوشش یہ تھی کہ تعلیم کے پھیلاؤ کو روکا جائے۔

بنگال میں 'معافی' کی زمینیں بہت تھیں اور ان میں زیادہ تر تعلیمی اداروں کے اوقاف کی صورت میں تھیں، خاص طور پر مکتب اور مدرسے انہیں اوقاف سے چلتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جلد سے جلد دولت سمیٹنے کے لئے بے چین تھی تاکہ وہ انگلینڈ میں اپنے شیئر ہولڈرز کو پابندی سے منافع کی رقم ادا کرتی رہے۔ لہٰذا معافی کی زمینوں کو ضبط کرنے کی اسکیم چلائی گئی، اول اول جب یہ معافیاں دی گئی تھیں، اس وقت کی سندوں کا مطالبہ کیا گیا لیکن وہ سندیں اب کہاں، وہ یا تو کھو گئی تھیں یا دیمک کی نذر ہو گئی تھیں، اس طرح معافیاں ختم ہو گئیں اور ان کے مالک ان سے محروم کر دیئے گئے اور مکتبوں اور مدرسوں کے اوقاف بھی ہاتھ سے نکل گئے۔ ایسے محرومین کی تعداد خاصی بڑی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ بے شمار خاندان تباہ و برباد ہو گئے، مکتب اور مدرسے بند ہوئے اور استاد اور متعلقہ افراد لاکھوں کی تعداد میں بے روزگار ہو کر رہ گئے۔ ان مصیبت زدگان میں مسلمان سرفہرست تھے۔ معاشی انتشار اور افلاس و کسمپرسی کے ساتھ انہیں اس خطرہ کا بھی شدید احساس ہوا کہ انگریزوں کی حکومت میں ان کے تعلیمی ادارے صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے۔

ادھر مسلم نظام تعلیم کے منتشر ہو جانے سے جو خلا پیدا ہوا وہ بدیسیوں کے خلاف غم و غصہ اور نئی طرز کے اسکولوں سے بیزاری اور دور رہنے کے جذبے سے بھر گیا کیونکہ یہ اسکول کسی اور مقصد سے قائم کئے جا رہے تھے۔ اس صورت حال نے بے روزگاری کے مسئلہ کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا، اسی کے ساتھ مسلمانوں میں نئے حکمرانوں کی طرف سے بے اعتمادی بھی بڑھتی رہی۔ مشنری عیسائیوں کی سرگرمیوں نے زخم پر نمک چھڑکا اور مسلمانوں نے یہ محسوس کیا کہ دنیا تو ہاتھ سے گئی ہی تھی، اب دین بھی خطرہ میں ہے۔ ہندوؤں نے، مسلمانوں کے اس ردعمل کے برخلاف، نئی تبدیلیوں کا استقبال کیا اور وہ بدلتے ہوئے

حالات سے فائدہ اٹھانے اور ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے میں مصروف ہوتے۔ انگریز حکمراں بھی ان کی ہمت افزائی کے لئے تیار تھے، چنانچہ انھوں نے تجارت، تعلیم اور نئے پیشوں میں پیش قدمی کر کے اپنے لئے ایک روشن مستقبل کی تعمیر شروع کر دی۔ کمپنی کی حکومت نے جان بوجھ کر ایک خاص پالیسی کے تحت، برطانیہ کے نظام زمینداری کا پودا ہندوستان کی زمین میں لگایا اور اس سے ہندو تاجروں اور سرمایہ داروں کے طبقہ نے پورا پورا فائدہ اٹھا کر مسلم زمینداروں اور جاگیرداروں کی جگہ زمیندار بن کر خود ایک حیثیت حاصل کر لی۔ اس سے صورت حال اور پیچیدہ ہو گئی اور بقول پنڈت جواہر لال نہرو "اس ہی وجہ سے نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوتے اور ممکن ہے کہ نئی طرز کے ہندو مسلم مسئلہ کا آغاز اسی سے ہوا ہو.... بنگال میں ہندو زمینداروں کی تعداد مسلم زمینداروں سے زیادہ ہو گئی اور ان کی رعیت میں اگرچہ ہندو مسلمان دونوں تھے، لیکن بڑی تعداد مسلمانوں ہی کی تھی۔"

مسلمانوں میں جو بے چینی تھی اس کے کئی اسباب تھے۔ اس دور میں جان بوجھ کر مستقل طور پر انھیں سرکاری ملازمتوں اور حیثیت اور وقار کی جگہوں سے الگ رکھا جاتا تھا۔ بہانہ یہ ڈھونڈا گیا تھا کہ مسلمان خود اس کے ذمہ دار ہیں کہ وہ نئے اسکولوں میں نہیں جاتے اور پرانی طرز تعلیم پر اڑے ہوئے ہیں، میرے خیال میں یہ الزام بے بنیاد تھا۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے اسے مان بھی لیں تو سوال یہ ہے کہ جب انھوں نے انگریزی پڑھنی شروع کی تو ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ ان کی خواہش تھی کہ انھیں بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمتیں ملیں، لیکن ان کے ساتھ ہر موقع پر امتیاز برتا جاتا تھا، رفتہ رفتہ کمپنی کی ملازمتوں میں ان کی تعداد بہت کم ہو گئی اور اس سے ان کی معاشی حالت بری طرح متاثر ہوئی۔ بنگال بہار، اڑیسہ اور بعد میں صوبجات متحدہ (یوپی)، غرض ہر جگہ مسلمانوں کو نظر انداز کر کے انھیں پیچھے رکھا جاتا۔ خود ہنٹر نے اپنی کتاب دی انڈین مسلمانس میں انیسویں صدی کے وسط میں مسلمانوں کی معاشی زبوں حالی کا تذکرہ کیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ گذشتہ برسوں میں انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف غیر منصفانہ اور امتیازی سلوک کیا اور مسلسل کیا۔

مسلمانوں کی عام بے چینی اور معاشی پریشانیوں کے دو اہم نتائج سامنے آئے۔ ان میں سے ایک تو یہ تھا کہ ہمیں انیسویں صدی میں مسلمانوں میں کوئی متوسط طبقہ ابھرتا ہوا نہیں ملتا، جبکہ ہندوؤں میں ایک متوسط طبقہ رفتہ رفتہ ابھر رہا تھا اور اس کی ایک شکل بنتی جا رہی تھی، آئندہ اس برصغیر میں جو

سیاسی اور معاشی مسائل اور واقعات پیش آنے والے تھے ان کے پیچھے، بڑی حد تک، ان دو بڑی ملتوں کے مابین یہی معاشی اور سماجی عدم توازن ہی تھا۔

دوسرا اہم نتیجہ یہ تھا کہ عمومی اعتبار سے مسلمانوں میں مزاحمتی رجحان تقویت پاتا تھا۔ ۱۸۰۶ء میں ویلور میں ہندوستانی سپاہیوں کی جو بغاوت ہوئی اسے جنرل برگز نے جنوب میں انگریزوں سے اقتدار کو ختم کرنے کے لئے غیر مطمئن اور بے چین مسلمانوں کی پہلی کوشش سے تعبیر کیا۔ اس سے پہلے ۱۸۰۴ء میں بنگال میں مولوی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک کی جو مذہبی اصلاح کی تحریک تھی، بنیاد پڑ چکی تھی، لیکن یہ بنگال کے کسانوں اور دستکاروں کی معاشی اور سماجی بے چینیوں کی ترجمان بھی تھی۔ یہ یاد رہے کہ یہ تحریک ۱۷۹۳ء کے بندوبست استمراری اور کمپنی بہادر کی استحصال اور لوٹ کھسوٹ کی سرگرمیوں کے بعد شروع ہوئی جس کے نتیجہ میں بنگال کے کسان اور دستکار ناقابل بیان حد تک افلاس اور فاقہ کشی میں مبتلا ہو گئے تھے بنگال کے زمینداروں کے ظلم و جبر کے خلاف بھی یہ ایک پُر زور احتجاج تھا اور اس کے پیچھے یہ جذبہ بھی کارفرما تھا کہ بدیسی حکمرانوں کو نکال کر مسلمانوں کا اقتدار دوبارہ قائم کیا جائے۔ مولوی شریعت اللہ کے بیٹے اور جانشین دُدو میاں کی رہنمائی میں ۱۸۳۸ء، ۱۸۴۱ء، ۱۸۴۴ء اور ۱۸۴۶ء میں کسانوں کی جو بغاوتیں ہوتیں وہ ہندو مسلم زمینداروں، انگریزوں اور ان تمام غاصبوں کے خلاف تھیں جنھوں نے غریب عوام پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ دُدو میاں نے سید احمد شہید کے مجاہدین کے ساتھ مل کر بھی کام کیا۔ ۱۸۵۷ء میں جب دہلی میں انگریزوں سے جنگ کی خبر پہونچی تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔

میرے خیال میں سید احمد شہید کی تحریک انیسویں صدی کے نصف اوّل میں اس اصلاحی تحریک کا نقطۂ عروج تھا جس کی بنیاد شاہ ولی اللہ کے افکار و خیالات پر رکھی گئی تھی اور جو ان کے جلیل القدر فرزندوں، خاص طور پر شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کی رہنمائی میں دور دور تک علماء کے حلقوں اور علمی مراکز میں پھیل گئی تھی۔ یہ اس مزاحمتی رجحان کا بھی، اپنی بھرپور ایمان پرور توانائیوں کے ساتھ، نقطۂ عروج تھا جس کا آغاز شاہ ولی اللہ کی عملی سرگرمیوں سے ہوا تھا اور جو رفتہ رفتہ مسلمانوں پر کمپنی بہادر کی زیادتیوں اور ملک کی بعض غیر مسلم طاقتوں کے ظلم و جبر کے سبب مضبوط اور مستحکم ہوتا چلا رہا تھا۔ اس دارالعلوم میں جہاں حضرت مولانا علی میاں صاحب زید مجدہٗ کی سیرت سید احمد شہید

بار بار پڑھی گئی ہوگی، اس مرد غیور، اس امام المجاہدین، اس امیر المومنین، اس بطل حریت، اس صاحبِ نسبت وبصیرت، اس عاشقِ رسول، اس مبلغ توحید، اس قاطعِ شرک وبدعت، اور اس داعیِ اقامتِ دین کی عظیم شخصیت اور تاریخ ساز کارناموں سے متعلق کچھ کہنا وقت کو ضائع کرنا ہے۔ بالاکوٹ میں سید احمد شہید اور ان کے سیکڑوں فدائیوں کی شہادت درحقیقت اس بات کی شہادت تھی کہ زندگی کو سود و زیاں کے پیمانے سے نہیں ناپا جاسکتا۔ ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی۔

بالاکوٹ کے شہیدوں نے اپنے خون سے اس ملک میں اسلام کی کھیتی کی آبیاری کی، اس جنگ کے بعد مجاہدین کی ایک جماعت برابر سرگرم اور بدیسی حکومت کے لئے خطرہ بنی رہی، یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان کے مجاہدانہ کارنامے اور ان کی قربانیاں ہماری تاریخ کا سنہری باب بن گئیں۔

بالاکوٹ کے حادثۂ فاجعہ کے بعد شاہ عبدالعزیز کے نواسے مولانا شاہ محمد اسحٰق نے سید احمد شہید کی تحریک کو زندہ رکھا، اس کی از سر نو تنظیم کی اور اسے نجدی اور یمنی اثرات سے پاک کیا۔ ان کے پروگرام کے دو خاص اصول تھے: (۱) حنفی مذہب کی سختی سے پابندی اور (۲) سلطان ترکی سے رابطہ۔ ۱۸۴۱ء میں وہ مکہ معظمہ تشریف لے گئے، ان کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی مولانا محمد یعقوب بھی تھے، مقصد یہ تھا کہ اپنے نصب العین اور پروگرام کے لئے سلطنت عثمانیہ کا اشتراک وتعاون حاصل کیا جائے۔ اپنی روانگی سے پہلے انھوں نے اپنی عدم موجودگی میں اپنا کام جاری رکھنے کے لئے ایک بورڈ بنا دیا تھا جس کے صدر مولانا مملوک علی تھے اور مولانا قطب الدین دہلوی، مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور مولانا عبدالغنی دہلوی اس بورڈ کے رکن تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے اکابرین، خاص طور سے مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے، ان بزرگوں میں شاہ محمد اسحٰق کی اسپرٹ بھری ہوئی تھی اور وہ ولی اللہی مکتب خیال اور اس کی روایات کے سچے ترجمان تھے۔

اس موقع پر اس بات کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اوّل میں شاہ محمد اسحٰق نے سلطنت عثمانیہ سے ربط ضبط قائم کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ برابر قائم رہا۔ ۱۸۷۸ء میں روس اور ترکی کی جنگ کے موقع پر ہندوستانی مسلمانوں میں ترکی کے لئے جو جوش وخروش پیدا ہوا اور جس طرح انھوں نے فنڈ اکٹھا کیا، اس سے اس وقت کا وائسرائے لارڈ لٹن

بہت زیادہ متوحش ہوا اور سرسید احمد خاں جو انگریزوں کے دوست اور حامی تھے انھیں کھل کر مسلمانوں کی ترکِ دوستی کی مخالفت کرنی پڑی۔ یہ جو ہمیں بیسویں صدی میں جنگ بلقان و طرابلس، شیخ الہندؒ کی ریشمی رومال کی تحریک، پہلی جنگ عظیم اور تحریک خلافت میں ترکوں سے ہندوستانی مسلمانوں کی بے پناہ محبت کا جذبہ ملتا ہے، اس میں اخوت اسلامی کے جذبے کے ساتھ ترکوں کے ساتھ ربط تعلق کی اس روایت کو بھی دخل تھا جس کی بنیاد شاہ محمد اسحٰقؒ نے رکھی تھی۔

اس زمانے میں علماء کی دینی رہنمائی میں راسخ العقیدہ مسلمانوں کی اصلاحی، معاشرتی اور سیاسی کوششوں کے ساتھ ساتھ ہمیں تعلیم اور طرز زندگی میں تبدیلیاں بھی ملتی ہیں جو زندگی کی ضرورتوں اور بعض تاریخی عوامل کے سبب ناگزیر تھیں۔ ۱۸۳۱ء میں مجلس تعلیمات عامہ کی ایک رپورٹ شائع ہوئی تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف انگریزی تعلیم کی مانگ تھی۔ اس مانگ میں مسلمان اگرچہ پیچھے تھے لیکن ان میں ایک طبقہ ضرور ایسا تھا جو دیکھ رہا تھا کہ مشرقی تعلیم سے اب اتنا دنیوی فائدہ نہیں ہے جتنا کہ انگریزی تعلیم سے ہے اور وہ انگریزی پڑھنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ عبدالعزیزؒ سے جب استفتا کیا گیا تو انھوں نے یہ فتویٰ دیا کہ انگریزی پڑھنا جائز ہے کہ اسلام میں علوم و السنہ کے سیکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے بشرطیکہ وہ اس نیت سے نہ سیکھے جائیں کہ اسلام کی تعلیمات پر اعتراض مقصود ہو۔ صورت یہ تھی کہ بعض علاقوں میں مشرقی تعلیم کے لئے طلباء کو لالچ اور وظائف کے ذریعہ سے اس تعلیم کے حاصل کرنے کے لئے آمادہ کرنا پڑتا تھا، چنانچہ ۱۸۳۵ء میں جب یہ فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ سرکاری روپیہ صرف انگریزی تعلیم پر خرچ کیا جائے تو مشرقی تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت کم رہ گئی۔ اس سے قبل اٹھارویں صدی کے اواخر میں وارن ہیسٹنگز نے جب کلکتہ مدرسہ قائم کیا تھا تو ہگلی کے ایک متمول مسلمان تاجر حاجی محسن نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک کروڑ روپیہ ۵ فیصدی سود پر قرض تھا کہ اس رقم کے منافع سے بنگال کے مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور ان طلبا کو وظیفے دئے جائیں جو انگریزی پڑھنا چاہتے ہیں۔ کلکتہ کا یہ مدرسہ جو مدرسہ عالیہ کہلاتا ہے آج بھی حاجی محسن فنڈ کی آمدنی سے چل رہا ہے، مسلمانوں کے دو بڑے مشہور اسکالر اور قانون داں سر امیر علی اور سر عبدالرحیم نے اسی وظیفے سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس دور میں

حاجی محسن کا یہ اقدام خالص قومی نقطۂ نظر سے تھا اور ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیئے۔ ۱۷۹۱ء میں غازی الدین حیدر کی مالی امداد سے مشرقی تعلیم کے لئے دہلی میں جو مدرسہ قائم ہوا تھا وہ ۱۸۲۴ء میں دہلی کالج بن گیا جس میں ایک شعبہ مشرقی تعلیم کا تھا جہاں اردو زبان ذریعہ تعلیم تھی اور ایک شعبہ جدید علوم کا جہاں انگریزی کے ذریعے تعلیم دی جاتی تھی، آپ کو سُن کر یہ تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ جب ۱۸۳۵ء کا یہ فیصلہ سامنے آیا کہ آئندہ سرکاری روپیہ مشرقی تعلیم پر خرچ نہ ہوگا تو دہلی کالج کے مشرقی تعلیم کے شعبہ میں طلباء کی تعداد کافی کم ہوگئی کہ اب وظیفہ نہیں مل سکتا تھا۔ یہی وہ دہلی کالج ہے جہاں مولانا مملوک علی جن کا ذکر ابھی ہو چکا ہے، استاد تھے اور یہیں سے مولوی ذکاءاللہ اور ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ نکلے جنھوں نے مسلمانوں میں اس جماعت کی نمائندگی کی جو ان خیالات اور رسم و رواج اور عادات کے بعض پہلوؤں کا از سر نو جائزہ لینا چاہتی تھی، جو مسلمانوں کو ورثے میں ملے تھے۔ اردو زبان کی ترقی میں بھی، خاص طور پر بحیثیت علمی زبان کے اردو کے ارتقا میں فورٹ ولیم کالج سے کہیں زیادہ دہلی کالج کا حصہ ہے جہاں جدید علوم اور سائنس کی کتابوں کے اردو میں ترجمے کئے گئے اور جن کے ذریعے مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ اس دور میں مغرب کے افکار وعقائد سے متعارف ہوا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے مسلمانوں میں دو رجحانات موجود تھے۔ ایک کی ترجمانی طبقہ علماء اور مجاہدین کر رہے تھے اور دوسرے کے ترجمان وہ مسلمان تھے جو انگریزی زبان سیکھ کر کمپنی کی ملازمتیں چاہتے تھے، جو مغربی تہذیب سے قریب آکر کوئی ایسا سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے جس سے اگر ایک طرف ان کے دینی عقاید محفوظ رہیں تو دوسری طرف وہ نئے حکمرانوں کی نظر میں مقہور نہ ہوں۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ جب فرو ہوا تو پتہ چلا کہ مسلمان بُری طرح تباہ و برباد ہو گئے ہیں، جس پیمانے پر ان کا جانی اور مالی نقصان ہوا اور جس شدت کے ساتھ، ملّی حیثیت سے انگریزوں نے ان پر ظلم توڑے اور من حیث القوم جس طرح انھیں رسوا اور ذلیل کیا گیا، اس کا صحیح صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ایک ایسی تباہی و بربادی جس کے بعد کسی قوم میں جینے کا حوصلہ نہیں باقی رہ سکتا لیکن جس قوم نے بغداد کی تباہی (۱۲۵۸ء) کو جھیل لیا تھا وہ اس برصغیر میں ۱۸۵۷ء کی تباہی کو بھی جھیل لے سکتی تھی۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء میں

دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی جس کے پیچھے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے شاملی کے مجاہدانہ کارناموں، وہ مفقار نیم تشیبی کی شکل میں اللہ کا ہاتھ تھا اور جیسے حاجی امداد اللہ کی دعائیں حاصل تھیں کہ وہ مستجاب الدعوات تھے۔ ان بزرگوں کے توسط سے اس عظیم مقصد کا سلسلہ جو دارالعلوم دیوبند کے قیام کا تھا، مولانا مملوک علی، شاہ محمد اسحٰق، سید احمد بریلوی، شاہ عبدالعزیز سے گزر کر شاہ ولی اللہ تک پہونچ جاتا ہے۔ اب تک شمشیر و سناں سے کام لیا گیا تھا، اب زبان و قلم سے کام لیا جانے والا تھا۔ اب تک مسلمانوں کی سیاسی و مذہبی آزادی کے لئے افراد موت کے گھاٹ اترتے تھے، اب اسی مقصد کے لئے افراد پیدا کئے جانے والے تھے۔ مسلمانوں میں مذہبی شعور بیدار کرنے اور ان میں اسلام اور قرآن کی صحیح سمجھ پیدا کرنے کے لئے شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادوں نے فارسی اور اردو میں قرآن کے ترجمے کئے اور ان زبانوں میں اسلامی تعلیمات کی تشریحیں بھی کیں۔ دیوبند میں اسی مقصد کو توسیع دے کر ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی کہ مسلمان قرآن، حدیث، فقہ اور متعلقہ علوم آلیہ کو ایک ہی احاطہ میں حاصل کریں اور پھر یہاں سے نکل کر اس ملک میں ملت اسلامیہ کی عزت و آبرو کی ضمانت بن جائیں۔

دوسرے رجحان کی ترجمانی ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید نے کی جب ان کی تعلیمی و تہذیبی کوششیں محدود طور پر متشکل ہو کر ۱۸۷۵ء میں اس اسکول کی صورت میں ابھریں جس نے جلد ہی ایم اے او کالج بن کر مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔

لیکن قبل اس کے کہ سرسید اور ان کے مکتب خیال کے بارے میں اظہار خیال کیا جائے، مناسب ہوگا کہ مولوی کرامت علی جونپوری کا کچھ ذکر ہو جائے کہ ہندوستانی مسلمانوں، خاص طور سے مشرقی بنگال کے مسلمانوں میں ان کے کام کی بہت اہمیت ہے۔ مولوی کرامت علی سید احمد بریلوی کے مرید تھے۔ ان کا انتقال ۱۸۷۳ء میں ہوا۔ انھوں نے زیادہ کام اردو میں کیا۔ ان کا اسلوب نگارش موثر اور پُرزور تھا باوجود اس کے کہ وہ عام بول چال کی زبان میں لکھتے تھے۔ ان کی تبلیغی سرگرمیوں سے مشرقی بنگال کے مسلمانوں میں عام بیداری کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اسلامی بنگال کی تمدنی ترقی میں ان کے تبلیغی کام کا بڑا حصہ ہے۔ میرے خیال میں ان کے کام کا یہ طریقہ بہت مفید ثابت ہوا کہ انھوں نے اصلاحی رجحانات کو انتہا پسندی سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اصلاحی تحریکیں جب انتہا پسندی کا انداز اختیار کر لیتی ہیں تو ان مقاصد کو شدید نقصان پہونچتا ہے جو ان کا نصب العین

ہوتے ہیں۔ مولوی کرامت علی کو دو محاذوں پر لڑنا پڑا۔ ایک طرف تو انھوں نے ان غلط عقیدوں کو دور کرنے کی کوشش کی جو مسلمانوں کے شعائر میں داخل ہوگئے تھے اور انھوں نے مسلمانوں میں ان عناصر کے خلاف بھی تحریری جنگ لڑی جو راسخ العقیدگی سے ہٹتے جارہے تھے۔ انھیں ان دونوں محاذوں پر خاص کامیابی حاصل ہوئی۔ دوسری طرف انھوں نے ان انتہا پسندوں کے کٹرپن کے خلاف بھی آواز اٹھائی جو ایسے تمام لوگوں کو جو ان سے متفق نہیں تھے، مشرک اور کافر کہتے تھے اور ان کے مردوں کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ فرائضیوں کا کہنا تھا کہ چونکہ ہندوستان دارالحرب ہے، اس لئے یہاں جمعہ اور عیدین کی نمازیں نہیں ہوسکتیں، مولوی کرامت علی نے اس نظریے کی مخالفت کی۔ ان کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اعتدال کی راہ اختیار کرکے مسلمانوں کو اس تعصب اور کٹرپن سے دور رکھنے کی کوشش کی جس سے ملت اسلامیہ کا اتحاد پارہ پارہ ہو رہا تھا۔

تجدد پسندوں کے حلقے میں سرسید اپنے مذہبی اور تہذیبی خیالات میں انتہا پسند تھے۔ یہی ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی اور اس اعتبار سے مجموعی طور پر وہ اپنی کوششوں میں ناکام رہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں سرسید جیسی کوئی اور طاقت ور شخصیت نہیں تھی۔ ان کے خلوص، محنت، لگن اور ایثار و قربانی کے جذبے سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا، ان کی تعلیمی کوششوں کے کچھ ٹھوس نتائج بھی نکلے جن کی کارفرمائی بیسوی صدی کے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی، معاشی، سماجی، ثقافتی اور مذہبی زندگی میں صاف نظر آتی ہے۔ انیسویں صدی کے ہندوستان میں خاص طور پر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے تہذیب و تمدن اور افکار و عقائد کے میدانوں میں جو چیلنج تھا اس کا جواب سرسید اور ان کے ساتھی دے سکتے تھے کیونکہ ان میں کردار کی بلندی بھی تھی اور وہ تڑپ بھی جو حالات کے مقابلے کے لئے افراد کو متحرک بناتی ہے۔ یہ ہو جاتا تو علی گڑھ سے مسلمانوں کی ایسی نسلیں نکلتی رہتیں جن کے فکر و عمل میں لذت کردار بھی ہوتی اور جرأت اندیشہ بھی۔ لیکن افسوس کہ یہ نہ ہوسکا۔ فکری و تہذیبی سطح پر کسی قوم کی نجات کے ضامن وہی تعلیمی ادارے اور یونیورسٹیاں ہوتی ہیں جن کی جڑیں اس قوم کی تہذیب و تمدن میں پیوست ہوتی ہیں۔ علی گڑھ کالج کا پودا جس زمین میں لگایا گیا وہ ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کی وہ زمین نہ تھی جو صدیوں کے نشیب و فراز سے گذر کر بنی تھی۔ اس کالج میں مغرب کے تعلیمی نظام کو مغربی تمدن، اس کی روح و مزاج،

اس کے ماحول و روایات کے ساتھ اپنایا گیا۔ اور آگے چل کر بھی اس کی سب سے بڑی کمزوری ثابت ہوئی۔ انگلستان جانے سے پہلے سرسید انگریزوں سے مرعوبیت کی حد تک متاثر تھے، انگلستان جا کر انھوں نے جو کچھ دیکھا اس نے انھیں مغربی تہذیب کا اس حد تک گرویدہ بنا دیا کہ جب وہ واپس آئے تو انھوں نے اپنی تمام صلاحیتیں اور اپنی ساری توانائیاں مغربی تہذیب کے اقدار اور اصولوں کی تبلیغ کے لئے صرف کر دیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے قرآن مجید کی تفسیر بھی انیسویں صدی کی عقلیت پسندی کی روشنی میں کرنے کا بیڑا اٹھایا، جس کے شمولات و مضمرات سے اور جس کے پورے لٹریچر سے جو یورپ کی دوسری زبانوں میں تھا، وہ براہ راست اور پورے طور پر واقف بھی نہ تھے اور اس سلسلے میں انھوں نے عربی زبان و لغت کے مسلمہ اصول و قواعد اور اجماع و تواتر کے خلاف لکھنے اور کہنے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ حیرت ہوتی ہے کہ سرسید جیسا ذہین شخص یورپی علوم اور تمدن سے اس درجہ متاثر ہو گیا کہ انھیں اس تمدن کی خامیاں اور خرابیاں نظر نہ آئیں اور سائنس اور علمی افکار و عقائد کی ترقی کے جلو میں جس تمدن نے جنم لیا تھا، اس کی تابناکی میں وہ یہ فراموش کر بیٹھے کہ آسمانی مذاہب میں یہ جو ایک سِرّیت اور مابعد الطبیعی عنصر ہوتا ہے اور جس سے روحانی اور مثالی اقدار کے چشمے پھوٹتے ہیں وہ حواس اور انسانی عقل کی گرفت میں نہیں آسکتا اور ایمان بالغیب ہی سے قلب پر اس کے اسرار منکشف ہوتے ہیں۔ سرسید نے روایت سے بغاوت کی، روایت کے تسلسل کو باقی رکھنے کی کوشش نہیں کی، اس لئے وہ اس سطح پر ناکام رہے، لیکن ان کی یہ ناکام کوشش ایک خاص حلقے کے لئے فکری انتشار اور بے راہ روی کا سبب بن گئی اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

لیکن اس سب کے باوجود اس برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی میں علی گڑھ کی اہمیت اور اس کے تاریخی رول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، سرسید نے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کا جو خواب دیکھا تھا علی گڑھ اس کی ادھوری تعبیر ہے۔ پھر انھیں بھی حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑا، ان کے مذہبی خیالات کا کوئی اثر علی گڑھ پر نہیں پڑا، لیکن ان کے تہذیبی خیالات سے ایک حد تک علی گڑھ ضرور متاثر ہوا، اور اس کا نتیجہ یہ دیکھنے میں آیا کہ رفتہ رفتہ مسلم معاشرہ دو حصوں میں بٹ گیا، اور اس سلسلے میں بالکل وہی صورت حال سامنے آئی جو دوسرے مسلم ممالک میں رونما ہوئی تھی۔ دیوبند اور علی گڑھ کو اگر

قدیم اور جدید کی دو علامتیں مان لیں تو انیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے ہمیں مسلم معاشرہ میں دو قسم کے تعلیم یافتہ حضرات ملتے ہیں، شہروں میں بھی اور قصبوں اور گاؤں میں بھی۔ ایک طبقہ وہ تھا جس نے عربی مدارس میں تعلیم حاصل کی تھی اور دوسرا وہ جو سیکولر اسکولوں اور کالجوں سے پڑھ کر نکلا تھا۔ فکری اعتبار سے یہ دونوں طبقے ایک دوسرے سے دور تھے۔ دونوں کے اظہار خیال کی زبان، محاورے اور اصطلاحات ایک دوسرے سے مختلف تھیں، دونوں کے مفاد متخالف اور بعض صورتوں میں متصادم تھے، ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے جہاں وہ اقلیت میں تھے یہ صورت حال تباہ کن ثابت ہوئی۔

۱۸۸۵ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی۔ سر سید اور ایم۔ اے۔ او کالج کے انگریز پرنسپلوں نے کوشش کی کہ مسلمان کانگریس سے دور رہیں، اس کے برخلاف مولانا رشید احمد گنگوہی نے برادران وطن کے ساتھ اشتراک و تعاون کا اعلان کیا۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی توجہ کی طالب ہے کہ کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت کے سوال پر شمالی ہندوستان کے مسلمانوں اور جنوبی، مشرقی اور مغربی ہندوستان کے رویوں میں خاصا فرق ملتا ہے۔ بدرالدین طیب جی، رحمت اللہ سیانی اور سید محمد، بمبئی، کلکتہ اور مدراس سے تعلق رکھتے تھے اور مسلمانوں کے تاجر طبقہ کے مفادات کے نمائندے تھے۔ اس وقت کی کانگریس ہندوستانیوں کے سیاسی و تجارتی حقوق کے لئے آواز اٹھا رہی تھی اور برٹش امپائر کے سرمایہ داری نظام کے جلو میں جنوبی، مشرقی اور مغربی ہندوستان میں تاجروں کا جو طبقہ ابھرا تھا، اس میں ان علاقوں کے مسلمان تاجر بھی شامل تھے۔ شمالی ہندوستان میں اس طرح کا کوئی طبقہ نہیں تھا، پھر یہاں علی گڑھ کالج میں زمینداروں اور طبقہ اشراف کے وہ نوجوان تعلیم حاصل کر رہے تھے جن کا مقصد سرکاری ملازمتوں کے ذریعہ انگریزوں کے قریب رہ کر اپنے آپ کو حکومت کی نگاہ میں معتبر اور قابل اعتماد بنانا تھا، شمال اور جنوب کے مسلمانوں کے مفاد اور مقاصد مختلف تھے۔ اس لئے کانگریس سے متعلق مجموعی طور پر ان کے رویوں میں اختلاف رہا۔

لیکن یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ کی پہلی ہی نسل میں نوجوانوں کا ایک طبقہ ایسا پیدا ہو چلا تھا جو اپنی مادر درسگاہ کی سیاسی پالیسی سے مطمئن نہیں تھا۔ جدید افکار و خیالات نے ان میں بے چینی پیدا کر دی تھی، پھر دنیائے اسلام میں جو واقعات رونما ہو رہے تھے ان سے بھی وہ متاثر تھے۔ اس زمانے میں اسلام اور پیغمبرؐ اسلام سے متعلق مغرب میں ایسی کتابیں لکھی جا رہی تھیں

جن سے انگریزی داں مسلمانوں کے دل میں حمیت اور غیرت کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، خاص طور پر علی گڑھ کی نوجوان نسل اس صورت حال سے بہت متاثر تھی۔ ۱۸۸۱ء میں مصر میں اعرابی پاشا کی بغاوت اور پھر ۱۸۹۷ء میں ترکوں اور یونانیوں کی جنگ کے موقع پر سر سید نے جن خیالات کا اظہار کیا اور جس طرح انھوں نے ترکوں اور قوم پرور مصریوں کی مخالفت کی، اس سے علی گڑھ کی پہلی ہی نسل کے افراد پر یہ واضح ہو گیا کہ سر سید اور علی گڑھ کی انگریز دوستی کی پالیسی مسلم کاز کے لئے مضر ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ اب تک علی گڑھ نے اسلام کی عظمت اور مسلمانوں کی عام فلاح کے لئے کچھ نہیں کیا ہے۔ سید امیر علی اور خدا بخش نے جو علی گڑھ کے گریجویٹ نہ تھے، انفرادی طور پر اسلامی تاریخ اور مسلم ثقافت کی جو خدمات انجام دی تھیں، علی گڑھ ایک ادارہ کی حیثیت سے اتنا بھی نہ کر سکا تھا۔ غیروں کی نظر میں اعتبار اور وقار اسی جماعت کو حاصل ہوتا ہے جسے خود اپنی ہی روحانی میراث اور اخلاقی وسائل پر اعتماد ہوتا ہے۔ ان کا ماضی شاندار تھا، انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی میں ان کے اجداد کا نمایاں حصہ تھا، لیکن ان کا موجودہ انفعالی رویہ ان کی مہتم بالشان تمدنی میراث کا بوجھ اٹھانے کا اہل نہ تھا۔ علی گڑھ کی پہلی نسل میں جس شخص نے اس احساس اور شعور کو بیدار کیا اس کا نام شبلی نعمانی تھا۔ الطاف حسین حالی نے مدوجزر اسلام ضرور لکھی تھی اور اس نظم کا خاطر خواہ اثر بھی ہوا تھا، لیکن یہ درحقیقت اسلام کے شاندار ماضی کی طرف مسلمانوں کی توجہ منعطف کرنے کی ایک کوشش تھی، اور اس لحاظ سے مسدس نہایت کامیاب رہی۔

شبلی نے انعطاف توجہ ہی پر قناعت نہیں کی بلکہ انھوں نے اسلام کی عظمت رفتہ کو اس کے تمام خدوخال کے ساتھ نگاہوں کے سامنے لانے کا ایک پروگرام بنایا۔ انھوں نے تاریخ اسلام کی عظیم شخصیتوں اور ان کے عہد کو از سر نو زندہ کیا اور ان کے کمالات اور کارنامے بڑی خوبی سے پیش کئے۔

سر سید انھیں علی گڑھ کھینچ لائے تھے، وہاں وہ تقریباً سولہ برس رہے۔ وہ عربی اور فارسی کے استاد تھے لیکن کالج کے عام طلبہ پر ان کا خاصا اثر تھا۔ مولانا محمد علی نے جو علی گڑھ کی سیاسی و مذہبی زندگی سے اوائل روز ہی سے غیر مطمئن تھے، اپنی خودنوشت سوانح MY LIFE : A FRAGMENT میں لکھا ہے کہ "اس عام گھپ اندھیرے میں علی گڑھ میں ایک روشن نشان بھی تھا اور وہ شبلی نعمانی کی ذات گرامی تھی جو غیر معمولی خوبیوں اور بالکل نئے ادبی نقطۂ نظر کے حامل تھے اور جنھیں شاعری اور تاریخ اسلام سے بے پناہ شغف تھا"۔

شبلی سرسید کے سیاسی و مذہبی خیالات سے خوش نہ تھے۔ سیاست اور مذہب سے متعلق ان کے اپنے خیالات تھے۔ وہ کانگریس کے حامی تھے اور سرسید سے وہ اس سلسلے میں بحث کرتے رہتے تھے لیکن عملی سیاست سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ ان کی علمی و عملی کاوشوں کا میدان مذہب، تاریخ، ادب اور مسلمانوں کی دینی تعلیم تھی۔ میرا خیال ہے کہ دینیات اور کلامی مباحث میں نہ تو وہ انتہا پسند تھے اور نہ عقلیت پسند، ہاں انھوں نے کلاسیکی اسلامی دینیات کے استدلالی طریق بحث کو زندہ کرنے کی کوشش ضرور کی۔ سرسید کے کلامی مباحث منفی تھے۔ شبلی نے آگے بڑھ کر ایک مثبت رویہ اختیار کیا۔ انھوں نے تواتر اور تسلسل کی ضرورت اور ماہیت کا خیال رکھا اور سرسید کی طرح روایت سے بغاوت نہیں کی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں علم اور سائنس کا جو تصور کائنات تھا اسے انھوں نے اس کی اپنی ہی جگہ پر رکھا، پھر بھی علماء کے ایک حلقے نے انھیں آزاد خیال کہا۔

انیسویں صدی میں اردو نثر و نظم دونوں میں بڑی دلویز شخصیتیں ملتی ہیں ذوق، مومن، اور غالب نے اردو غزل کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا، میر انیس و میر دبیر نے مرثیے کی شاعری کا مرتبہ بہت بلند کردیا۔ میر اور نظیر اور پھر بعد کے آزاد اور حالی کو بھی اگر ہم شامل کرلیں تو کہہ سکتے ہیں کہ انیسویں صدی میں اردو شاعری کا کینوس نہایت وسیع اور وقیع ہوگیا اور ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انیسویں صدی میں اردو شاعری میں کیا نظم اور کیا غزل، دونوں اصناف میں جو معیار قائم ہوا، بیسویں صدی میں جو کئی لحاظ سے انیسویں صدی سے زیادہ ترقی یافتہ صدی ہے، علامہ اقبال کو چھوڑ کر، شاعری کا وہ معیار کہیں اور نہیں ملتا۔ اقبال کی عظیم شاعری کئی لحاظ سے غالب کی شاعرانہ عظمت کی نہایت معتبر اور پُروقار توسیع ہے اور اپنی آفاقیت کے اعتبار سے دنیا کی عظیم شاعری کے طویل سلسلے کی ایک نہایت ہی مضبوط اور گراں قدر کڑی، لیکن اقبال آج کے لکچر کے موضوع میں نہیں آتے، اس لئے بس اتنے ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اردو نثر کی ابتداء فورٹ ولیم کالج سے ضرور ہوئی لیکن اس کی اصل بنیاد علمی و ادبی اغراض کے تحت اس وقت پڑی جب ۱۸۳۹ء میں فارسی جو قانون، ملکی انتظام، ہندوستانی درباروں سے خط وکتابت اور مقامی دفتروں کی ضروریات کے لئے استعمال کی جاتی تھی، اپنی اس حیثیت سے معزول کردی گئی، اگرچہ حیدرآباد اور دیگر ریاستوں میں فارسی اس کے بعد بھی عرصے تک

سرکاری زبان بنی۔ اس دور میں طباعت، عام تعلیم، اخبار نویسی، لیتھو پریس کی ترقی اور عام زندگی کے باہمی ردعمل کے اجتماعی نتیجے کے طور پر جدید اردو نثر کی نشو و نما ہوئی۔ سرسید احمد خاں جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد اردو نثر کو ایک نیا علمی اسلوب دیا، ۱۸۴۷ء تک جب وہ آثار الصنادید لکھ رہے تھے پرانے طرز تحریر کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ لیکن موضوع کے اعتبار سے آثار الصنادید اردو ادبیات میں نمایاں ترقی کی شاہد ہے۔ غالب کی مکتوب نویسی سے بھی اس طرز تحریر کو تقویت ملی جو اردو نثر کے عناصر اربعہ کی بہت بڑی دین تھی۔ مولوی ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد، آزاد، حالی، سرسید اور شبلی، ان سب نے مل کر اردو نثر میں تاریخی تحقیق، ادبی تنقید اور علمی و ادبی مباحث کی ایسی روایت ڈالی اور ایسے طرز تحریر سے اس روایت کو سنوارا کہ اردو ملک کی ایک ترقی یافتہ علمی و ادبی زبان بن گئی۔ نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر کے ناولوں اور داستانوں سے بھی اردو زبان کا دامن مالا مال ہوا۔ اردو ایک مشترک تہذیب و ثقافت کی زبان ہے۔ یہ ہندو اور مسلمانوں دونوں کی زبان ہے، لیکن یہاں میں نے خاص طور پر اس کا ذکر اس لئے بھی کیا ہے کہ یہ ہندوستان میں عام مسلمانوں کی مذہبی زبان بھی ہے۔ یقیناً ہم مسلمانوں کی مذہبی اور ثقافتی زندگی میں اس زبان اور اس زبان کے موجودہ رسم خط کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ انیسویں صدی میں بھی ہم مسلمانوں کی علمی و فکری اور ادبی و تہذیبی زندگی کے مطالعے میں اس زبان کی نشو و نما اور اس کے رول کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کسی قوم کی زبان اور اس کا ادب، اس قوم کی زندگی، اس کی امنگوں اور آرزوؤں اور اس کے اجتماعی سوز و ساز کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کا اردو زبان و ادب سے کچھ اسی طرح کا رشتہ ہے۔

کچھ دیر پہلے ابھی ہم نے مسلمانوں میں ان دو رجحانات کا ذکر کیا تھا جو ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی سے مسلمانوں میں موجود تھے۔ یہ دونوں رجحان ۱۸۵۷ء کے بعد، خاص طور پر دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کالج کے قیام کے بعد، گوناگوں اسباب کی بنا پر، اپنی اپنی جگہ پر مضبوط سے مضبوط تر ہوتے گئے۔ ہم ان رجحانات کو ٹھیٹھ اور سادہ انداز میں دین اور دنیا سے تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن درحقیقت صورت حال ایسی سادہ نہ تھی، علمی و تمدنی اصطلاح میں ہم اسے قدیم اور جدید کہتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخری دہے میں ندوۃ العلماء کی تحریک اس بات کی ایک کوشش تھی کہ

وہ قدیم وجدید کی عصری کشمکش سے بلند و بالا ہو کر ایک ایسا متوازن فکر پیش کرے جو قدیم وجدید دونوں کی خوبیوں اور توانائیوں کا جامع ہو۔ اس تحریک کے بانی مولانا محمد علی مونگیریؒ تھے، ان کے بعد اس کی رہنمائی شبلیؔ اور ان کے رفقاء نے کی۔ یہ نکتہ قابل ذکر اور قابل غور ہے کہ اس تحریک کی بنا ڈالنے والے وہ راسخ العقیدہ علماء تھے جو اپنے عقیدے، اصول اور مقاصد میں سخت اور بے لوچ تھے لیکن وقت کے تمدنی و فکری مسائل سے متعلق جن کی حیثیت ان کے نزدیک فروع کی تھی، ان میں وسیع النظری اور ذہنی کشادگی تھی۔ وہ دین کو بھی خوب سمجھتے تھے اور علم کو بھی خوب جانتے تھے اور مسلمانوں کی زندگی میں دونوں کی اہمیت سے وہ کماحقہ واقف تھے۔ دین کی ماہیت ان کے نزدیک یہ تھی کہ وہ ایک ابدی حقیقت ہے جس کا رشتہ منشائے الٰہی سے جڑا ہوا ہے۔ اس زمان و مکان میں، تاریخ انسانی کی سطح پر، جو کچھ ہوتا رہا ہے اور آئندہ جو کچھ ظہور پذیر ہوگا اسے موجودہ زمانے کی اصطلاح میں GOD IN HISTORY اور MAN IN HISTORY کے دائمی رشتے کا اظہار کہا جاتا ہے اور یہی رشتہ درحقیقت دین ہے جس کے بغیر اللہ سے بندہ کے اس گہرے تعلق کا ادراک نہیں کیا جاسکتا جس کی توضیح و تشریح کے لئے انسانوں کی بستی میں نبی و رسولؐ بھیجے گئے جنھوں نے وحی الٰہی کے ذریعے انسانوں کو منشائے الٰہی اور قانون الٰہی کے مطابق زندگی گذارنے اور اس زندگی کے بعد آخرت کی زندگی میں ابدی جنّت و حقیقی مسرت کے لئے اپنے آپ کو مستحق بنانے کا سیدھا راستہ دکھایا۔ تحریک ندوۃ العلماء کے بانیوں کے نزدیک اس ابدی حقیقت میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن علم ایک نامی اور تغیر پذیر حقیقت ہے جو ہمہ وقت حالات اور عصری تقاضوں کے دباؤ سے بدلتی اور نئی نئی شکلیں اختیار کرتی رہتی ہے۔ اللہ کے نزدیک اسلام ایک دین ہے اور دین کا جیسا کہ ابھی اس کی وضاحت کی گئی، یہ رول ہے کہ وہ علم کی ہر آن اور ہر لمحہ بدلتی ہوئی پیچیدگیوں میں انسان کی رہنمائی کرے۔ بس ندوۃ العلماء کی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ وہ دین اسلام کی روح اور مقاصد اور دینی علوم کی حفاظت کے ساتھ ایک ایسے نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کو رواج دے جس سے قدیم اور جدید دونوں کے تقاضے پورے ہوتے رہیں۔ یہ دار العلوم جہاں آج ہم اور آپ سب جمع ہیں اسی مقصد کے حصول کے لئے قائم کیا گیا تھا اور اس میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم کو یک رُخی نہ ہونے دے اور اپنے احاطے سے ایسے علماء

نکالے جب یہ عالم پیدا تو دو گھمن پہاڑیں اور نہ آئین نو سے ڈریں۔ کیسا معتدل اور متوازن تخیل تھا یہ، لیکن بد قسمتی سے قدیم اور جدید دونوں طبقوں کا وہ موثر اور پُر جوش تعاون اسے حاصل نہ ہو سکا جس کے بغیر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ کہانی بڑی دردناک اور دلخراش ہے۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں اور آپ میں سے زیادہ تر لوگ تو بہرحال اس سے واقف ہوں گے۔ اس تخیل کی ضرورت آج بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ کل تھی اور اس میں وہ صلاحیت اور قوت ہے جو مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا کر سکتی ہے، کاش اس تخیل کو ایسے اہل فکر اور اہل دعوت مل جائیں جو قدیم اور جدید دونوں کو خوب سمجھتے ہوں۔ میرے نزدیک یہ سارا قصۂ قدیم و جدید محض ایک فریب ہے، یا یوں کہئے کہ یہ ہماری تن آسانی، تساہل یا ایک بے معنی خوف ہے جو ہمیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ ورنہ زندگی تو ایک کُل ہے اور اسلام ایک جاوداں زندگی ہے جو اس زندگی پر محیط ہے، کیا دین اسلام کی صحیح تفہیم زندگی کے ان ظاہری تضادات کو دور نہیں کر سکتی۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے آپ کا کافی وقت لیا، اس کے لئے معذرت خواہ ہوں اور آپ کا شکر گزار کہ آپ نے کمال صبر و تحمل کے ساتھ، ایک ایسے موضوع پر جو کئی لکچروں کا متقاضی ہے، میرے خیالات سُنے۔

محمد شرف الدین ساحل

حافظ محمد ولایت اللہ حافظ

ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل (مومن پورہ، ناگپور) کا یہ مضمون کچھ عرصہ پہلے ملا تھا۔ اسی اثناء میں محترمت مآب جناب محمد ہدایت صاحب، نائب صدر جمہوریۂ ہند کی کتاب، جو حافظ صاحب مرحوم کے بیٹوں میں سب سے چھوٹے ہیں، MY OWN BOSWELL (MEMOIRS) شائع ہوگئی۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے اجداد، خاندان اور والدین کے حالات تفصیل سے بڑے دلنشیں انداز میں لکھے ہیں۔ اپنے والد کے شاعرانہ کمالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "شاعری میں میرے والد کو ہندوستان گیر شہرت حاصل تھی۔ شروع میں تو وہ فارسی میں لکھتے تھے، لیکن بعد میں انھوں نے اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ ان کا انداز اکبر الٰہ آبادی جیسا تھا اور اسی لئے انھیں اکبرِ ثانی کہا جاتا تھا۔ ان کی طنزیہ اور ظریفانہ نظموں کا مجموعہ بمبئی کے کتب پبلشرز لمیٹیڈ نے سوز و گداز کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ ان کی وفات سے کچھ ہی پہلے ان کی سنجیدہ فلسفیانہ طویل نظم تعمیرِ حیات کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ یہ نظم عربی، فارسی، اور اردو میں ان کی علمی ولسانی فضیلیت و قابلیت کے سبب ایک یادگار نظم ہے۔ اس کا معلمانہ اور ناصحانہ انداز کہیں کہیں حد سے تجاوز کر جاتا ہے، لیکن اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو حالیؔ کی مسدس اور اقبالؔ کے شکوہ کے بعد جو خود اپنے ناصحانہ طرز کے لئے معروف و مشہور ہیں، شاید ہی کوئی دوسری نظم اس پایے کی ہو۔ حالیؔ میرے والد کے استاد تھے اور جب وہ طالب علم تھے تو حالیؔ مرحوم سے اپنی نظموں پر اصلاح لیتے تھے۔ بعد میں، وہ سائلؔ دہلوی سے جو اس صدی کے ربع اول کے ممتاز شاعر تھے، اصلاح لینے لگے۔ ۔۔۔ ان کے کلام کا تیسرا مجموعہ تیار تھا، وہ اس پر نظر ثانی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن افسوس کہ

انھیں اس کا موقع نہیں ملا۔ خیال ہے کہ اب اسے شائع کرا دیا جائے گا۔ ہمارے قارئین میں سے جو حضرات جناب محمد ہدایت اللہ صاحب کے اجداد اور والدین کے حالات و کمالات سے متعلق زیادہ تفصیل سے واقف ہونا چاہتے ہیں، وہ ان کی کتاب کا مطالعہ کریں۔

—— مدیر

خان بہادر حافظ محمد ولایت اللہ حافظ کے تعارف کے لئے صرف یہی ایک جملہ کافی ہے کہ موصوف عالی جناب محمد ہدایت اللہ صاحب، نائب صدر جمہوریہ ہند، ریٹائرڈ چیف جسٹس سپریم کورٹ آف انڈیا اور موجودہ چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، کے والد بزرگوار ہیں۔ وقت کی یہ کتنی عظیم الشان تبدیلی ہے کہ آج حافظ صاحب کو متعارف کرانے کے لئے یہ الفاظ لکھنے پڑ رہے ہیں، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ مرحوم اپنے زمانے کے ایک باوقار انسان، کامیاب شاعر اور اعلیٰ درجے کے سماجی کارکن تھے۔

حافظ صاحب جس خاندان کے چشم و چراغ تھے وہ ہمیشہ سے علم و فضل اور شعر و ادب کا گہوارا رہا ہے۔ ان کے پردادا شیخ محمد فرمان اللہ فرمان ابن شیخ فیض احمد اللہ فیض (مصنف رسالہ نجوم) ایک جید عالم گذرے ہیں۔ انھیں تصنیف و تالیف سے کافی شغف تھا۔ رسالہ در قول حکما المعروف بہ گلدستۂ فرمان ان کی یادگار کتاب ہے۔ حافظ صاحب کے جد امجد کا نام شیخ محمد باب اللہ تھا، جو ایک اعلیٰ درجے کے عالم، نہایت ہی تیز فہم اور قوی الحافظہ تھے۔ اس کا ثبوت ان کی تصنیف "باب الانوار" سے فراہم ہوتا ہے۔ ان کے چار بیٹے تھے: شیخ محمد کریم اللہ عرف غوث محمد غوث (مصنف فسانۂ غوث اور سکندر نامۂ غوث) شیخ محمد قدرت اللہ قدرت، شیخ محمد برکت اللہ برکت اور شیخ محمد رحمت اللہ رحمت (مصنف اسرار رحمت اور گفتار رحمت) یہ چاروں بھائی علم و ادب اور شعر و سخن کے اتنے شیدائی تھے کہ زندگی کے آخری ایام تک اسی کی خدمت کرتے رہے۔ ان میں ثانی الذکر یعنی شیخ محمد قدرت اللہ قدرت، حافظ صاحب کے والد بزرگوار تھے۔

جناب قدرت کی پیدائش ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۹ء میں بنارس میں ہوئی تھی۔ اپنے اسلاف کی طرح یہ بھی انتہائی نیک، شریف النفس، با اخلاق اور متقی و پرہیزگار تھے۔ بنارس میں منشی کی مسجد انھیں کی تعمیر کی ہوئی ہے۔ اپنے وقت کے رئیسوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انھیں ۱۸۵۷ء کے تاریخی انقلاب کے بعد چند وجوہات کے باعث نقل مکانی پر مجبور ہونا پڑا۔ چنانچہ بنارس چھوڑ کر مالوہ چلے آئے اور

راج گڑھ میں وکیل ریاست کے عہدے پر فائز ہوئے۔

راج گڑھ میں کچھ عرصے تک ملازمت کرنے کے بعد قدرت ریاست بھوپال سے وابستہ ہو گئے جہاں وہ پہلے پولیٹیکل ایجنٹ سیہور کے دفتر میں عہدۂ جلیلہ پر فائز کیے گئے۔ پھر نواب سکندر بیگم صاحبہ (۱۸۴۴ء تا ۱۸۶۸ء) نے انھیں سپرنٹنڈنٹ اسٹامپس بنا دیا اور نواب شاہجہاں بیگم (ف ۱۹۰۱ء) کے عہد میں سپرنٹنڈنٹ لال کوٹھی اور یورپین گیسٹ ہاؤس مقرر ہوئے۔ [2]

انھوں نے اپنی زندگی میں علمی و ادبی لحاظ سے بہت مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ "تحفۃ القدرت" اور "قاموس المشاہیر" (جلد دوم) کے مصنفین نے اپنی تصانیف میں ممتاز شعرا کے ساتھ ان کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ شیخ قدرت علی قدرت مؤلف "تحفۃ القدرت" میں لکھتے ہیں[3]:

"منشی قدرت اللہ قدرت ابن شیخ باب اللہ، رئیسانِ بنارس سے ہیں، بہت طباع اور کثیر التصانیف ہیں، نغز گوئی اور بذلہ سنجی میں استاد یگانہ ہیں۔ تاریخ گوئی میں بھی کامل مہارت رکھتے ہیں۔"

قدرت مومن اسکول کے شاعر تھے۔ ان کے کلام میں مضمون آفرینی اور رعایت لفظی کے ساتھ ساتھ جذبات کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے۔ وہ شاعر ہونے کے علاوہ ایک اعلیٰ درجے کے نثر نگار بھی تھے۔ انھیں تصنیف و تالیف کا بھی بے انتہا شوق تھا۔ اپنے دیوان کے دیباچے میں انھوں نے اپنی تصانیف کی تعداد گیارہ بتائی ہے۔ عبدالحلیم نے اپنے مضمون "حافظ محمد ولایت اللہ حافظ" (مطبوعہ آج کل مارچ ۱۹۷۸ء) میں قدرت کی سات کتابوں کے نام تحریر کیے ہیں۔ اور ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے ان دس کتابوں کی نشاندہی کی ہے:
دیوانِ قدرت (غزلیات و قصائد کا مجموعہ)، انتخابِ قدرت (غزل تا قصاید کا مجموعہ) گلزارِ قدرت (مثنوی)، اظہارِ قدرت (مثنوی)، تاریخِ مالکم (منظوم تاریخ)، کیمیائے قدرت (نثر)، تجربات قدرت (نثر)، انشائے قدرت (نثر) اور حکایاتِ قدرت (نثر) عجائباتِ قدرت (نثر)

محمد عبدالحلیم نے جن سات تصانیف کے نام دیے ہیں وہ یہ ہیں: دیوانِ قدرت، تماشائے قدرت، گلزارِ قدرت، اظہارِ قدرت، ماجرائے قدرت، قیصر شاہ اودھ اور اسٹامپ مینول آف بھوپال۔ ان دونوں فہرستوں میں دیوانِ قدرت، گلزارِ قدرت اور اظہارِ قدرت کے نام مشترک ہیں اس طرح تصانیف کی کل تعداد چودہ (۱۴) ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے قدرت کی وفات کا سنہ

...مسعود بتایا ہے ... نے لکھا ہے کہ ۱۹۱۰ء میں ۸۱ برس کی عمر میں بھوپال میں انتقال فرمایا۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی صاحب ان کے چند اشعار نمونے کے طور پر نقل کرتے ہیں، انھیں یہاں بھی درج کیا جاتا ہے تاکہ ان کی شاعرانہ صلاحیت کا اندازہ ہو جائے:

نہ ہوتا نور احمد دفتر عالم میں گر پیدا   نہ دن ہوتا، نہ شب ہوتی، نہ یہ شام و سحر پیدا
شعاع روئے دلبر، دیکھ اے قدرت بچشم دل   اسی کے دم کا جلوہ ہے، جدھر دیکھو ادھر پیدا
شب کو وہ شوخ بے حجاب آیا   میں یہ سمجھا کہ آفتاب آیا
بارگاہِ خدا سے اے قدرت   شاعری کا تجھے خطاب آیا
زندگانی کا تجھے اپنی میں حاصل سمجھا   یہ غلط مایۂ ایمان بھی کامل سمجھا
تیغ ابرو سے اڑا دے تو مرے سر کو ابھی   چشم جادو سے نہ کچھ تو مجھے قابل سمجھا
بہر تعظیم چلے آئے شتاباں آہو   ہم نے جس وقت قدم دشت کی منزل میں رکھا

آئینے میں نہ دیکھ منھ اپنا   آگ پانی میں کیوں لگاتا ہے

چشم تھی، جادو تھا، یا ایک سحر، یا پیغام موت   اک نظر میں کام اپنا آہ سارا ہو گیا

منشی قدرت اللہ قدرت کے چار صاحبزادے تھے: منشی محمد عظمت اللہ، محمد حبیب اللہ، محمد اسد اللہ عرف امانت اللہ، اور حافظ محمد ولایت اللہ حافظ، جو ۴ ستمبر ۱۸۷۳ء کو سیہور میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ قرآن مجید کا ناظرہ ختم کرنے کے بعد اس کا حفظ شروع کیا جسے نو سال کی عمر میں درجۂ تکمیل کو پہونچا دیا۔ اس کے بعد مغربی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس سلسلے میں سیہور، بھوپال اور جبل پور کے مدارس سے نمبر اوّل میں کامیاب ہونے کے بعد محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ وہاں سے تیاری کرنے کے بعد ۱۸۹۵ء میں فلسفہ، انگریزی اور فارسی ادبیات میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ کا امتحان پاس کیا اور تمام طلبا میں اوّل آئے۔ علی گڑھ میں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، مولوی عبدالحق اور مولانا شوکت علی ان کے ہم جلیسوں میں تھے۔ ان کی ذہانت اور فطانت کو دیکھ کر حکومتِ وقت نے انھیں آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں شریک ہونے کے لئے

انگلینڈ جانے کی دعوت دی، لیکن انکار کر دیا اور بھوپال لوٹ آئے۔ وہاں ابتدا میں کچھ عرصے تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ بعد ازاں ۱۸۹۱ء میں سی۔پی گورنمنٹ میں سرکاری ملازمت مل گئی، جہاں وہ مختلف علاقوں میں اعلیٰ منصب پر مامور رہے۔ اور ۱۹۲۹ء میں ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر رہ کر ریٹائر ہوئے۔ اس وقت ناگپور سی۔پی اور برار کا مرکز تھا لہٰذا اس سے ان کا بہت ہی قریبی تعلق ہو گیا تھا۔ اپنے محکمے کے کام سے وہ یہاں اکثر آیا کرتے تھے۔ آخر کار یہ جگہ انہیں اتنی پسند آئی کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد یہاں ایک عالیشان کوٹھی تعمیر کروا کر مستقل سکونت اختیار کر لی اور اپنی بقیہ زندگی ملک و ملت کی فلاح و بہبود میں صرف کر دی۔ اسی کے صلے میں وہ ۱۹۳۱ء سے لے کر ۱۹۳۳ء تک سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر رہے اور گورنمنٹ سے خان بہادر، آئی۔ ایس۔ او، اور قیصر ہند جیسے خطابات کے تمغے حاصل کئے انہوں نے ۲۰ محرم الحرام ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۲ نومبر ۱۹۴۹ء کو ناگپور میں رحلت فرمائی اور زنی پیٹھ کا مسلم قبرستان میں اپنی اہلیہ (ف ۲۲ جمادی الاوّل ۱۳۶۵ھ مطابق ۲۱ جولائی ۱۹۴۶ء) کے پہلو میں دفن ہوئے۔ لوحِ مزار پر جو کتبہ نصب ہے، اس پر یہ عبارت کندہ ہے :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یغفر اللہ

۱۳۶۹ھ

تاریخ وفات ۲۰ محرم الحرام ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۲ نومبر ۱۹۴۹ء

ہے مرگِ حضرتِ حافظ گراں بار — ادب کی محفلیں تھیں ان کے دم سے
ہوئے بے چین سب اپنے پرائے — جدائی ہے بزرگِ محترم سے
بزرگوں کی گئی آخر نشانی — جہاں خالی ہوا اہلِ قلم سے
دعا عابدؔ کی ہے یہ بہرِ تاریخ — الٰہی بخش دے ان کو کرم سے
۱۳۶۹ھ

اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رٰجِعُون

حافظ صاحب خاندانی وجاہت و حیثیت، شکل و شباہت اور علم و فضل کے لحاظ سے صاحبِ کمال

تھے۔ اس کے معنوی ثمرات ان کے صاحبزادوں پر بھی پڑے چنانچہ ان کے تینوں صاحبزادوں نے علمی دنیا میں کافی عزت و شہرت حاصل کی اور اپنے اسلاف کے ناموں کو زندہ و تابندہ بنا دیا۔ ان کے سب سے بڑے صاحبزادے محمد اکرام اللہ (ف ۲۷ ستمبر ۱۹۶۳ء) آئی۔سی۔ایس تھے۔ وہ آزادی سے پہلے حکومت برطانیہ کے اعلیٰ منصب پر مامور رہے لیکن جب ملک تقسیم ہوا تو پاکستان چلے گئے جہاں حکومت و وزارت خارجہ میں ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ اردن کے شہزادہ حسن بن طلال کی اہلیہ بیگم "ثروت" انھیں کی صاحبزادی ہیں۔ ان سے چھوٹے محمد احمد اللہ، بیرسٹر اس وقت بمبئی میں سکونت پذیر ہیں۔ جناب محمد ہدایت اللہ صاحب اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے ہیں اور اس وقت نائب صدر یہ جمہوریہ کے معزز عہدے پر فائز ہیں۔

حافظ صاحب نے انتہائی صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی گذاری۔ وہ نہایت ہی منکسر المزاج اور خوش اخلاق تھے۔ مذہبی معاملات میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ صوم و صلوٰۃ کے بے حد پابند تھے۔ مغربی تہذیب کی آغوش میں رہتے ہوئے بھی انھوں نے اسلامی روایات کی پوری طرح حفاظت کی اگرچہ مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے تھے لیکن شعر سنانے کا انداز نہایت ہی موثر اور پرکیف تھا خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں :

> "حافظ صاحب پرانے زمانے اور پرانے تمدن کی ایک بولتی ہوئی صورت ہیں۔ لمبا قد ہے، مضبوط جسم ہے، سفید داڑھی ہے، آواز بلند اور شیریں ہے، اور پڑھنے کا انداز ایسا دل آویز اور موثر ہے کہ بہت کم شعرا ایسی عمدگی سے اپنا کلام سناتے ہیں، کیونکہ عموماً شاعر لوگ یا تو گاتے ہیں اور یا تو مرثیوں کے تحت اللفظ کی طرح بن کر پڑھتے ہیں مگر حافظ صاحب روزمرہ کی سادہ بول چال کی طرح اپنے اشعار پڑھتے ہیں "

انھیں شاعری کا شوق ورثے میں ملا تھا۔ ان کے مجموعۂ کلام سے اس بات کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ انھوں نے طالب علمی کے ابتدائی زمانے ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس پر مزید جلا، علی گڑھ کی محفلوں میں ہوئی تھی، جہاں سر سید احمد خاں، محسن الملک اور مولانا شبلی نعمانی جیسی یگانۂ عصر شخصیتیں موجود تھیں۔ حافظ صاحب علی گڑھ کالج کی ادبی تقاریب میں شریک رہتے تھے چنانچہ ان بزرگوں کی موجودگی میں انھیں اپنا کلام سنانے کا شرف حاصل تھا۔ علی گڑھ میں ان کے دوستوں میں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، مولانا شوکت علی

اعجاز احمد دہلوی عبدالحق جیسے ہونہار اور باذوق طلبہ تھے۔ اس ماحول نے بھی ان کے ادبی ذوق کو کافی نکھارا ہوگا۔ پھر جب وہ ۱۹۱۷ء میں چھندواڑہ میں ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے تو اس وقت علی برادران وہیں نظر بند تھے۔ اس وقت بھی ان کے ساتھ علمی و ادبی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ ان کے کلام میں گہرائی ان کے "تبحرِ علمی" اور بیدار مغزی سے پیدا ہوئی تھی۔ ان کے دو مجموعۂ کلام سوز و گداز اور تعمیرِ حیات شائع ہو چکے ہیں۔ سوز و گداز ۱۹۴۱ء میں محبوب المطابع دہلی سے چھپا تھا۔ یہ ۳۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں "گذارش" کے بعد حافظ صاحب کی طالب علمی کے زمانے کی ۲ نظمیں، ۳ قصاید، ۵ تخیلات، ۴۴ غزلیں، ۳۰ قومی و اخلاقی نظمیں، ۵۰ مزاحیہ اور سیاسی نظمیں، ۸۰ قطعات، ۴۴ تضمینات، ۱۴ مثنویات اور متعدد متفرق اشعار شامل ہیں۔ کتاب کے اختتام پر نواب سراج الدین خاں سائل دہلوی کی تقریظ اور خواجہ حسن نظامی کے تاثرات ہیں۔ تعمیرِ حیات دراصل ۹۱۰ اشعار کی ایک طویل نظم ہے، جس میں انھوں نے ایشیا کی مختلف قوموں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے اخلاقی، تہذیبی اور معاشرتی زوال کے صحیح اسباب بتا کر انھیں عروج و ترقی کی طرف بڑھنے کی ترغیب دی ہے۔ ۱۴۲ صفحات کی یہ کتاب اگست ۱۹۴۹ء میں قادری پریس بمبئی سے شائع ہوئی ہے۔

حافظ صاحب کو سی پی اور برار کے تمام علاقوں میں رہنے کا اتفاق ہوا تھا، جہاں انھوں نے زندگی کو افلاس، تاریکی اور جہالت کی گود میں دیکھا تھا۔ دراصل یہی ان کی شاعری کا پس منظر ہے۔ ان کے کلام میں شاعرانہ تخیل کی بلند پروازیاں، سلاست و سادگی کے ساتھ ملتی ہیں۔ اسلوبِ بیان پر بھی انھیں زبردست قدرت حاصل ہے۔ ان کی شاعری حسن و عشق کے معاملات اور کیفیات کی شاعری نہیں ہے بلکہ ان مسائل پر سنجیدگی سے تبصرہ کرتی ہے جو ایک زوال یافتہ قوم کے لئے سوالیہ نشان بنے رہتے ہیں۔ انھوں نے قوم کے ایک ایک مرض کی نشاندہی کی ہے۔ اس کی خرابیاں چن چن کر گنائی ہیں اور پھر وہ راستہ بھی دکھایا ہے جو قوموں کو رفعت و بلندی تک لے جاتا ہے۔ حافظ صاحب تہذیبِ جدید کے شدید مخالف ہیں۔ وہ اس تہذیب کو روحانی خرابیوں کا اصل سبب سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے کلام میں جگہ جگہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے[۵۶]:

"ان کے اشعار میں زبان کی خوبیاں ہیں۔ شاعری کے کمالات ہیں۔ اور سب سے بڑی

بات یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی اور ہندوستان کی پرانی تہذیب کی پوری تصویر ہیں اور نئی تہذیب کی آمیزش سے جو عجیب و غریب تبدیلیاں یا خرابیاں پرانی تہذیب میں پیدا ہو رہی ہے، ان کا ہو بہو نقشہ حافظ صاحب کے کلام میں پایا جاتا ہے "

سائل دہلوی لکھتے ہیں؎:

" ان کے کلام کی سادگی اور پُر اثر سادگی، مذاقیہ نصیحتیں، نہایت دل پسند ہیں جس کے مطالعے میں ان کا کلام ہوگا اس کا وقت خوش گذرے گا صنائع بدائع اور فلسفیانہ تخیل سے حافظ صاحب کے کلام کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کے کلام کا صحیح امتیاز اُن کی صاف گوئی اور مدعا نگاری ہے۔ جس جادہ پر قلم اٹھایا ہے، اس سے ثابت ہے کہ یہ ان کی جولانگاہ سے بچا ہوا نہیں تھا "

حافظ صاحب کی غزلوں میں سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ جن اشعار میں تغزل کا رنگ ہے وہ انتہائی صاف ستھرے، پاکیزہ اور لطیف ہیں۔ قصاید پر زور الفاظ، چست تراکیب اور نادر و حسین قوافی سے آراستہ ہیں۔ مذاحیہ اور طنزیہ نظموں میں ہنسی مذاق کے ساتھ ساتھ وہ نشتر بھی موجود ہیں جو حساس طبیعت رکھنے والوں کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اصل میں طنز و ظرافت ہی ان کا خاص میدان ہے جس کی وجہ سے وہ اس علاقے میں " اکبر ثانی " کے لقب سے مشہور ہیں۔ شاکر اورنگ آبادی ان کی شاعری کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں؎ :

" یوں تو حافظ صاحب کے ضخیم کلیات میں قصاید، غزلیات، قطعات اور رباعیات سبھی کچھ موجود ہیں، لیکن طبیعت زیادہ تر نظم کی طرف مائل ہے۔ مخصوص رنگِ سخن طنز نگاری ہے جس سے اصلاح اور تعمیر مقصود ہے۔ مذاق مذاق میں جس خوبی کے ساتھ حافظ صاحب کلام کی باتیں کہہ جاتے ہیں وہ اکبر اللہ آبادی مرحوم کے بعد کسی اور کے ہاں نظر نہیں آتیں لہذا ہم بجا طور پر آپ کو " اکبر ثانی " کے نام سے یاد کر سکتے ہیں ۔
حافظ صاحب کا کلام مربوط اور زبان و بیان کی غلطیوں سے مبرا ہوتا ہے چست محاورے، مزے دار تشبیہیں اور فصاحت و سلاست آپ کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں "

اب کلام کے کچھ نمونے "سوز و گداز" سے نقل کئے جاتے ہیں تاکہ حافظ صاحب کے رنگِ سخن اور معیارِ کلام سے قارئین واقف ہو جائیں۔ ان کی غزلوں کے کچھ منتخب اشعار دیکھئے:

یہ تو کہیے آپ نے کس کس سے کل وعدے کیے
کیا غرض اس سے کہ میں اس بزم میں تھا، یا نہ تھا

ہو گئے حافظ خفا وہ اک ذرا سی بات پر
اس لیے میں رازِ دل ان سے کبھی کہتا نہ تھا

اپنا پیمانۂ غم رکھ دوں اگر خُم کے قریب
نشہ اُتر جائے کوئی مست نہ ہو پی کے شراب

آپ کو آرائشِ گیسو سے فرصت ہی نہیں
کب نظر ہوگی مرے حالِ پریشاں کی طرف

شکوے تمام بھول گئے اس کو دیکھ کر
ٹھہرے قصور وار خود اپنی زباں سے ہم

ڈرتا ہوں عرضِ حال سے دھوکا نہ ہو کہیں
وہ روٹھ جائیں اور بھی ایسا نہ ہو کہیں

قرار و صبر و سکوں دل سے ہو گئے غائب
ہوا شباب کچھ ایسا بلائے جاں مجھ کو

ترقی پہ اِدھر ہے بے قراری
تغافل کا اُدھر عالم زیادہ

گلہ دل کا نکلتا تھا زباں سے شکریہ بن کر
ملے جب وہ نہ آیا یاد، کیا ان سے شکایت تھی

مجھے معلوم ہوتا تھا قیامت آگئی شاید
بیانِ حضرتِ واعظ میں کچھ ایسی طوالت تھی

بہار آئی ہے ہر اک شادماں ہے
خدا جانے ہمارا دل کہاں ہے

نہ پوچھو حال کچھ بیمارِ غم کا
جو حالت ہے وہ صورت سے عیاں ہے

شبِ فرقت نہ ہوگی ختم یارب
اجل کو کیا ہوا ہے، وہ کہاں ہے

ہائے آغازِ محبت تھا نہایت دلکش
کیا خبر تھی مجھے پڑ جائیں گے جاں کے لالے

کٹ ہی جاتی ہیں کسی طرح ہماری راتیں
غم سلامت رہے، وہ مونسِ تنہائی ہے

ترے کرم سے رہے آج پھر بھی ہم محروم
بچھائیں شوق سے آنکھیں ترے قدم کے لئے

فلسفۂ رنج و غم

دل میں رہ رہ کر مرے آتا تھا اکثر یہ خیال
کیا سبب ہے کوئی خوش ہے اور کوئی افسردہ حال

آج جو خوش ہیں وہ کل ہیں مبتلائے رنج و غم
بیش و کم ہر ایک ہے اک دن گرفتارِ الم

دیکھتا تھا گرد اپنے جب غم و سوز و گداز — مضطرب ہو کر مرا دل ڈھونڈتا تھا اس کا راز
عقل کے باہر ہیں لیکن یہ رموزِ کردگار — عرض کرتا ہوں فقط اتنا بہ عجز و انکسار
ہے یہ منظورِ خدا ، انساں کو رتبے ملیں — تا ملائک اس کی نسبت پھر کبھی طعنے نہ دیں
اس نے غم خواری بھی پیدا کی ہے رنج و غم کے ساتھ — دل میں ہمدردی کا جذبہ بھی دیا ہے دم کے ساتھ
دیکھ کر رنجور کو انساں ہوا جب دردمند — درد نے رتبہ کیا اس کا ملائک سے بلند
بے قراری دیکھ کر ہوتا ہے انساں بے قرار — گر نہ ہوتا غم تو پھر بنتا وہ کس کا غم گسار
سوز و الفت سے رہے جب تک کوئی نا آشنا — عیش و عشرت کا اسے ملتا نہیں پورا مزا
درد میں ایک خاص لذت ہے جو راحت میں نہیں — جو مزا ملتا ہے غم میں عیش و عشرت میں نہیں
زندگی بے لطف ہے جب تک نہ ہو دل داغدار — غم زدہ انساں ہی ہوتا ہے اچھا غم گسار
بعد اس دنیا کے ہے اک اور عالم بالیقیں — صرف انساں کے لئے معمور ہے خلدِ بریں

اُس جہاں میں درد اور غم کا نہیں کوئی نشاں
عیش و عشرت سے رہیں گے لوگ ہر دم شادماں

اشاعت اسلام بذریعہ ریڈیو

صبح کا وقت یوم جمعہ کا تھا — میں جب اپنے مکان سے نکلا
جا رہا تھا قدم بڑھاتے ہوئے — بالکل اپنے خیال میں ڈوبا
ہوا داخل جو شہر کے اندر — "رام مندر" کے پاس سے گزرا
آئی کانوں میں ناگہاں آواز — کوئی قرآن پاک پڑھتا تھا
میری حیرت بیاں کے باہر ہے — جب سنی دیر سے حرم کی صدا
"اپریل" پر نظر پڑی جو مری — ہوا معلوم ماجرا کیا تھا
درسِ قرآں بہ قرأت شیریں — ریڈیو اِس جگہ سناتا تھا
بُت بھی سننے لگے قرآن شریف — بُت پرستوں کو بھی یہ درس دیا
ریڈیو کو خدا ترقی دے — کیوں کہا عالموں نے اس کو بُرا

ہے یہ بھی اشاعت قرآں   بعد قرأت کے ترجمہ بھی سُنا
ریڈیو نے وہ کر دکھایا کام   جو کبھی عالموں سے ہو نہ سکا
ہندو مسلم خدا کے بندے ہیں   ہے فضول ان کا باہمی جھگڑا
یونٹی کی اشد ضرورت ہے
ریڈیو اِن کو ایک کر دے گا

پدرم سلطان بود

اے مسلماں کبھی غور سے دیکھ اپنا وجود   روز ہے اک نئی آفت ترے سر پر موجود
تیرا کہنا ہے زمانہ ہے بہت نامسعود   یہ گلہ بھی ہے مخالف ہے ترا چرخ کبود
تیرے اوصاف تھے دنیا کے لیے مشعل راہ   خوبیاں آج وہ ساری ہیں یکایک مفقود
مشت خاشاک ہے اس دور میں تیری ہستی   اور غضب ہے کہ ترے چار طرف ہے بارود
مرنے جینے کے تماشے کو سمجھتا ہے حیات   تجھ کو معلوم نہیں زیست کا ہے کیا مقصود
تیرے سر میں وہی اک بات بھری ہے ابتک   غزنوی کا ہوا اس جا، کبھی غوری کا ورود
فتح و نصرت کے وہ ایام ہیں سب خواب و خیال   اب نہ اس ملک میں آئے گا دوبارہ محمود
تجھ کو ہر چند نظر آتی ہے یہ دنیا تنگ   شکر کی جا ہے، نہیں راہِ ترقی مسدود
چاہئے فکر کہ بہتر ہو ترا مستقبل   پچھلی باتوں کا اعادہ ہے سراسر بے سود
سچ تو یہ ہے نہیں اسلاف سے نسبت تجھ کو   اُن میں تھا جوشِ عمل تو ہے گرفتار جمود
بن گیا قلب ترا بغض و حسد کا مخزن   اُن کا ہر وقت تھا ایثار و کرم لامحدود
خدمتِ خلق وہ کرتے تھے خدا کی خاطر   نہ انھیں شوقِ نمائش، نہ انھیں فکر نمود
تجھ میں جب ایک صفت بھی نہیں ان کی باقی
ہے عبث فخر یہ تیرا "پدرم سلطاں بود"

تلقین رواداری

قدر ہوگی صرف ان کی جن کے ہیں اعمال نیک   روبرو خالق کے ہندو اور مسلماں سب ہیں ایک

اس کی رحمت سے یہاں سب کے لئے ایٹ ہوم ہے — کھاتا ہے کوئی حلوا اور کوئی کھاتا ہے کیک
روز ہوتا ہے یہاں شیخ و برہمن میں نزاع — یہ لڑتے مرتے ہیں باہم اور خدا سب کا ہے ایک
ان کے آپس میں تصادم کا کبھی موقع نہ آتے — گر ذرا اپنی زبانوں پہ لگا لیں یہ بریک
بات ان کے درمیاں بڑھنے نہ پائے پھر کبھی — اپنا دستور العمل کر لیں اگر گو اینڈ ٹیک
چاہئے انساں کو نیکی کرے انساں کے ساتھ — کام آئے گا خدا کے سامنے برتاؤ نیک

یہ سودیشی اور بدیشی کے ہیں سب جھگڑے یہیں
جنس اصلی چاہئے فارن ہو وہ یا ہوم میک

مسلمان طلبہ اور تعلیمی جدّ وجہد

ہمارے لڑکوں کو کتنا بھی کوئی سمجھائے — ہزار زور لگائے کہ راہ پہ لائے
برادرانِ وطن کی مثال دے دے کر — ہزار پند و نصیحت سے ان کو شرمائے
انہیں پسند نہیں یہ طریقۂ تعلیم — کہ جو اٹھائے مشقت وہی سند پائے
تلاش ہوتی ہے آسانیاں ملیں گی کہاں — جو مدرسہ میں کوئی جاکے نام لکھوائے
کہیں یہ عذر ہے پنجاب میں پڑھیں گے ہم — کسی کے جی میں ہے بنگال کی طرف جائے
کتاب سال میں اک دن نہ کھول کر دیکھی — قریب آگیا جب امتحاں تو گھبرائے
یہ آرزو ہے مہیا ہو ایسی آسانی — کوئی پڑھے نہ لکھے اور پاس ہو جائے

حصولِ علم کی ایسی کوئی بنا دے مشین
اکنّی ڈال دیں اور اک سند نکل آئے

مسلم خواتین اور پردہ

ایک دن وہ تھا کہ ہر جانب یہ ہوتی تھی پکار — بیبیاں پردے میں ہو جائیں کہ مرد آتے ہیں یاں
پھر یہ دیکھا لوگ کہتے تھے بہ آواز بلند — مرد کرلیں اس طرف منہ آرہی ہیں بیبیاں
پارسل بن کر کبھی نکلی جو تانگہ میں کہیں — اس کے اندر سے نظر آتی تھیں خالی انگلیاں

جھانکنے کا راستے میں اک عجیب انداز تھا　　کھلتی تھیں اور بند ہو جاتی تھیں فوراً کھڑکیاں
رفتہ رفتہ ہو گیا غائب وہ گھونگھٹ کا رواج　　برقع اور پردہ کہیں حائل نہیں ہے درمیاں
ریل گاڑی میں بھی اب وہ پردہ چادر نہیں　　جب سے رائج ہو گئیں یہ خوبصورت ساڑیاں
رنگ بدلا ہے زمانے نے بڑی تیزی کے ساتھ　　آج جلسوں اور تماشوں میں نہیں وہ سختیاں
مولوی اب رہتے ہیں پیچھے بیبیاں ہیں پیش پیش　　اور سب ان کے لئے کرتے ہیں خالی کرسیاں

عام جلسوں میں صفِ اوّل میں ہے ان کی نشست
بیوی لکچر دیتی ہیں، خاموش بیٹھے ہیں میاں

حوالہ جات :

۱۔ منصور حلاج کی زندگی سے متعلق ہے۔
۲۔ اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ از ڈاکٹر سلیم حامد رضوی (جنوری ۱۹۶۵ء) ص ۱۲۶
۳۔ تحفۃ القدرت، مطبوعہ مطبع رحیمی قنوج (۱۸۷۰ء) ص ۲۰
۴۔ ماہنامہ خیال (کامٹی) جولائی ۱۹۵۹ء ص ۲۰ (مضمون : ایک شاعر، تہذیبی ارتقا کا ضامن از محمد حفظ الکبیر) زرنگار (سوونیر بتقریب جشن طلائی محمڈن مسلم لائبریری، ناگپور) مطبوعہ ۱۹۷۵ء ص ۳۲ (مضمون - حافظ محمد ولایت اللہ حافظ اور ان کی شاعری از سید محمد عبدالرحیم)
ماہنامہ آج کل - مارچ ۱۹۷۸ء
۵۔ سوز و گداز (۱۹۴۱ء) ص ۳۲۷
۶۔ ایضاً - ص ۳۲۷
۷۔ ایضاً۔ ص ۳۲۵ - ۳۲۶
۸۔ سخن زار مرتبہ شاکر اورنگ آبادی (جون ۱۹۴۵ء) ص ۱۸

کاظم علی خاں

غالب اور معروف دہلوی

غالب کے خسر نواب الہی بخش خاں معروف دہلوی نواب عارف جان کے فرزند[1] اور فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر والیِ فیروز پور جھرکہ کے چھوٹے بھائی تھے[2]۔ معروف دہلوی شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد تھے[3]۔ تاریخ جدید[4] اور آب حیات[5] میں معروف کو ذوق کا بھی شاگرد قرار دیا گیا ہے لیکن حکیم عبدالحی[6]، نواب مرزا سعید الدین احمد خاں طالب[7] اور سائل دہلوی[8] وغیرہ ذوق سے معروف کے تلمذ کے منکر ہیں۔ معروف نے دنیوی علائق سے کنارہ کش ہو کر تصوف کے دامن میں پناہ لی تھی[9]۔ تصوف سے غالب کی گہری دلچسپی میں معروف کے اثرات کی کارفرمائی پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

گلشن بے خار[10]، سخن شعرا[11]، تاریخ لطیف[12] اور دیوان معروف[13] وغیرہ کے اندراج کے بموجب معروف کا سنہ وفات ۱۲۴۲ھ ہے۔ جناب قاضی عبدالودود نے ماخذ کی نشاندہی فرمائے بغیر معروف کا سنہ وفات ۱۲۴۳ھ لکھا ہے[14] جو میرے نزدیک تصدیق طلب ہے۔ پاکستانی صاحبِ قلم عبدالرؤف عروج[15] نے معروف کا سنہ وفات [غالباً بہ حوالہ طبقات شعرائے ہند از کریم الدین پانی پتی] ۱۲۴۴ھ رقم کیا ہے جو نظر ثانی کا محتاج ہے۔ عروج نے بزم غالب (ص ۱۷۹) میں الہی بخش معروف کا سنہ وفات ۱۸۲۶ء بھی لکھا ہے جو ازروئے تقویم ۱۲۴۴ھ کے بجائے ۴۲-۱۲۴۱ھ کے مطابق ہے۔ عروج کے بیان کے مطابق معروف نے ۱۸۲۶ء [۴۲-۱۲۴۱ھ] میں وفات پائی لہذا ۱۲۴۴ھ میں معروف کا دوبارہ وفات پانا خارج از امکان ہے۔ مالک رام[16]، مولانا غلام رسول مہر[17]، ڈاکٹر عبدالرزاق[18] اور ڈاکٹر اکبر حیدری[19] نے معروف کا سنہ وفات ۱۲۴۲ھ ہی مانا ہے۔

غالب نے اپنے خسر نواب الہی بخش خاں معروف کا ذکر اپنے کئی مکاتیب میں کیا ہے۔ قدر بلگرامی کے نام اپنے ایک خط میں غالب کا بیان ہے:

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الٰہی بخش خاں معروف لکھتے ہیں: ع

نگینِ[۲۰] دل سودا کھو دے تو گھر نیلام ہو جائے "[۲۱]

علائی کو اپنے ایک خط میں غالب نے لکھا ہے:

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہائے الٰہی بخش خاں مغفور کا کیا مصرع ہے:

آہ[۲۲] جی جاؤں نکل جائے اگر جان کہیں "[۲۳]

مکتوب غالب بنام علائی کا یہ اقتباس بھی دیکھئے:

"پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین[۲۴] نکالی۔ میں نے حسب الحکم غزل لکھی

بیت الغزل یہ ہے

پلادے[۲۵] اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے

پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے "[۲۶]

دیوانِ معروف اور دیوانِ غالب سے معروف و غالب کی ہم زمین غزلیں ملاحظہ ہوں:

غزل معروف دہلوی

(۱) جواب خط نہیں دیتا نہ دے جواب تو دے — کہ قاصد آ کے جو کچھ دے خبر شتاب تو دے

(۲) دیت نہ دے تو رہا کر نہ میرے قاتل کو — یہی کہو کہ بھلا اپنے ہاتوں داب تو دے

(۳) جو کھل کے بات نہ کی توڑ مت دلا اس سے — وہ شرمگیں ہے ابھی ٹوٹنے حجاب تو دے

(۴) کہا جو قتل سے اس شہسوار کے باز آ — کہا کہ ہوں میں ابھی ڈھ دہنے رکاب تو دے

(۵) یہ آئینے ہی کی چھاتی ہے ورنہ کیا منہ ہے — کسی کے منہ پہ کوئی صاف یوں جواب تو دے

(۶) ہزار بوسے مرے تجھ پہ ہیں حساب کی رو — جو سب کے سب نہیں دیتا علی الحساب کو دے

(۷) الٰہی اور نہیں دے نہ دے خوشی تیری — پر ایک سوزِ دل و دیدۂ پُر آب تو دے

(۸) شراب تیرے سے تو پی کے اہلِ بزم کو دیکھ — جو قصدِ قتل ہے تیغِ نگہ کو آب تو دے

(۹) خراب ہیں دلِ گم گشتہ کی تلاش میں ہم — جو تیرے پاس ہے اے خانماخراب تو دے

(۱۰) امان دے کوئی دم، اے اجل نہ کر جلدی — اُٹھانے یار کو منہ سے ذرا نقاب تو دے

(۱۱) ترے کلام کے مشتاق ہیں بہت معروف
جو کلیات نہیں اپنا انتخاب تو دے

[دیوان معروف ص ۱۴۰]

غزل غالب دہلوی

(۱) وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے — ولے مجھے تپش دل مجال خواب تو دے
(۲) کرے ہے قتل، لگاوٹ میں تیرا رو دینا — تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے
(۳) دکھاکے جنبش لب ہی، تمام کر ہم کو — نہ دے جو بوسہ، تو منہ سے کہیں جواب تو دے
(۴) پلادے اوک سے ساقی! جو ہم سے نفرت ہے — پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے شراب تو دے
(۵) یہ کون کہوے ہے آباد کر ہمیں لیکن — کبھی زمانہ مراد دل خراب تو دے[۲۷]

(۶) اسد! خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے
کہا جو اس نے "ذرا میرے پانو داب تو دے"[۲۸]

غالب کی یہ غزل معروف کی تحریک پر معرض وجود میں آئی تھی اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے ادبی آثار اور ادبی شعور کو کسی نہ کسی حد تک ان کے خسر معروف نے بھی متاثر کیا ہے۔ غالب اور معروف نے ایک دوسرے کے کلام سے کیا اثر لیا؟ یہ سوال مفصل تحقیق کا طالب ہے۔ دیوان معروف غالب کے اثر سے خالی نہیں۔ غالب کی دو غزلوں کو معروف نے بھی مخمس کیا ہے[۲۹]۔ مخمس کی جانے والی غالب کی ان غزلوں کے مطلعے یہ ہیں: —

(۱) اپنا احوال دل زار کہوں یا نہ کہوں — ہے حیا مانع اظہار کہوں یا نہ کہوں[۳۰]
(۲) آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک[۳۱]

دیوان معروف سے غالب کی غزلوں پر کہے جانے والے دونوں مخمس مع عنوان پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ مخمس کلام معروف پر غالب کے اثرات کے غماز ہیں اور ان کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

(۱) مخمس بر غزل اسد اللہ خاں المتخلص بہ اسد

شورش سوز دل افگار کہوں یا نہ کہوں — ہے مجھے رخصت گفتار کہوں یا نہ کہوں

کچھ تو کہہ اے بت اظہار کہوں یا نہ کہوں — اپنا احوال دل زار کہوں یا نہ کہوں
ہے حیا مانع اظہار کہوں یا نہ کہوں

آپ سے ہے دل وحشت زدہ کب سے باہر — تس پہ بھی میں نہیں انداز کے ڈھب سے باہر
حرف بے جا نہیں آتا مرے لب سے باہر — نہیں کرنے کا میں تقریر ادب سے باہر
میں بھی ہوں محرم اسرار کہوں یا نہ کہوں

باب پنجم کے گلستاں کی حکایت سمجھو — مرثیے کی اسے یا کوئی روایت سمجھو
غیر جو سمجھو سو سمجھو یہ نہایت سمجھو — شکر سمجھو اسے یا کوئی شکایت سمجھو
اپنی ہستی سے ہوں بیزار کہوں یا نہ کہوں

دیکھ کر بے کسی عاشق و بے یاریِ دل — ہے سویدا ابھی سیہ پوش عزاداریِ دل
ٹکڑے ہوتا ہے جگر دیکھ کے لاچاریِ دل — اپنے دل ہی سے میں احوالِ گرفتاریِ دل
جب نہ پاؤں کوئی غم خوار کہوں یا نہ کہوں

کوئی کرتا ہے گلا بھی جو کسو اپنے کا — لوگ باور نہیں کرتے ہیں پھر اس کو اصلا
ہے یہ مشکل کہ نہیں اور سے مجھ کو شکوا — دل کے ہاتھوں سے کہ ہے دشمن جانی میرا
ہوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں

پہلے تو عاشق غم کش کی زباں ہے غماز — اشک و بے تابی و فریاد و فغاں ہے غماز
یعنی ہر پردے میں یک ڈھب کا بیاں ہے غماز — میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں ہے غماز
گوش ہے در پس دیوار کہوں یا نہ کہوں

ہے سخن واشد دل کی مجھے معروف مدد — ہوں بہ زندانِ سخن صورت قفلِ ابجد
دل میں باتیں ہوں بھری جب کہ زیادہ از حد — آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو اسد
حسب حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں

(۲) مخمس بر غزل اسد اللہ خاں ممدوح

جی سے گزریں گے ترے در پہ گزر ہونے تک — مر ہی جاویں گے ترے کوچے میں گھر ہونے تک

[illegible] عمر بھر ہونے تک　　　آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

پوچھ مت حالتِ محبت کے نہ مجھ سے نیرنگ　　　ہے حباب اور ہوا صورتِ رلیا سروسنگ
کیا کرے اس میں شنا کوئی غواص آہنگ　　　دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ایک مدت سے جو حیران و پریشاں تم بن　　　کاٹتا ہوں شبِ ہجراں کو میں تارے گن گن
جذبۂ عشق تمھیں لائے گا یاں تک اک دن　　　ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

غور سے دیکھ بلندی ہے نہ پستی غافل　　　صاف ڈھٹ بندی ہے دنیا کی یہ پستی غافل
کس بھروسے پہ ہے اتنی تجھے مستی غافل　　　یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

دل کڑھانے کا تو معروف نہیں اپنا مزاج　　　پر اُسے اپنی نصیحت کا جو دیکھا محتاج
جی میں آتا ہے کہ اک وضع سے سمجھائیے آج　　　غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہے جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

مخمس ہونے والی غزلوں میں اسدؔ تخلص ان غزلوں کی قدامت پر دال ہے۔ مرزا غالبؔ کی ابتدائی غزلیں اسدؔ تخلص کی ہی حامل ہیں۔ مرزا صاحب نے ۱۲۳۱ھ میں (دوشنبہ ۱۴ رجب کے بعد) اسدؔ کے بجائے غالبؔ تخلص اختیار کیا تھا[۴] تقویم دوشنبہ ۱۴ رجب ۱۲۳۱ھ کو ۱۱ جون ۱۸۱۶ء کے مطابق بتاتی ہے۔

حواشی :

۱ سخن شعرا : نساخ ـ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء ص ۴۴۹
۲ گلستان بے خزاں : قطب الدین باطن ـ مطبع نول کشور، لکھنؤ طبع جون ۱۸۷۵ء ص ۲۲۰
۳ رک، (۱) سراپا سخن، میر محسن علی محسن ـ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع ۱۸۶۱ء ص ۲۶

(۲) تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا : مولفہ سعادت خاں ناصر۔ مرتبہ ڈاکٹر شمیم انہونوی۔ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ طبع جولائی ۱۹۷۱ء ص ص ۱۴۶ تا ۱۴۷

(۳) بزمِ سخن : علی حسن خاں سلیم۔ مطبع مفیدِ عام، آگرہ۔ طبع ۱۸۸۱ء ص ۱۰۶

(۴) تذکرۂ طورِ کلیم : سید نورالحسن خاں کلیم۔ مطبع مفیدِ عام آگرہ۔ طبع ۱۲۹۸ھ ص ۹۳

[۴] تاریخ عہد رکیہ ص ۱۴۴ بہ حوالہ آثارِ غالب : مرتبہ قاضی عبدالودود ص ۴۶ (مشمولہ علی گڑھ میگزین (غالب نمبر) بابت ۴۹ - ۱۹۴۸ء)

[۵] آبِ حیات : محمد حسین آزاد۔ کوہ نور پرنٹنگ ورکس، الٰہ آباد طبع ۱۹۶۲ء ص ص ۴۴۴ تا ۴۴۵

[۶] گلِ رعنا : حکیم عبدالحیٔ۔ مطبع معارف، اعظم گڑھ طبع ۱۳۷۰ھ ص ۲۸۸ (حاشیہ نمبر ۱)

[۷] دیوانِ معروف : مرتبہ شاہ عبدالحامد قادری۔ نظامی پریس، بدایوں طبع ۱۹۳۵ء ص ۲۲۵

[۸] ایضاً ص ۲۴۲

[۹] ایضاً (مقدمہ صفحہ د)

[۱۰] گلشنِ بے خار : شیفتہ۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء ص ۱۸۴

[۱۱] سخنِ شعرا طبع اکتوبر ۱۸۷۴ ص ۴۴۹

[۱۲] بہ حوالہ تلخیص تاریخ لطیف : مولفہ مہدی علی خاں ممتاز رام پوری (تلخیص کار اکبر علی خاں عرشی زادہ) مشمولہ نگار رام پور مارچ ۱۹۶۳ء ص ۴۵

[۱۳] رک : (۱) دیوانِ معروف (مقدمہ صفحہ و نیز صفحہ ک)

(۲) بزمِ سخن طبع ۱۸۸۱ء ص ۱۰۶

(۳) طورِ کلیم طبع ۱۲۹۸ھ ص ۹۳

[۱۴] آثارِ غالب : مرتبہ قاضی عبدالودود ص ۴۶

[۱۵] بزمِ غالب : عبدالرؤف عروج۔ ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی طبع مارچ ۱۹۶۹ء ص ۳۰۴

[۱۶] ذکرِ غالب : مالک رام ۔ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی طبع فروری ۱۹۷۶ء ص ۵۲

[۱۷] غالب : غلام رسول مہر ۔ لاہور پریس دہلی ص ۴۵

[۱۸] رسالہ غالب نامہ، دہلی جنوری - اپریل ۱۹۷۶ء ص ص ۱۳۱ تا ۱۳۲

[۱۹] دیوانِ ناسخ : مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری۔ الواعظ صفدر پریس، لکھنؤ طبع ۱۹۷۲ء ص ۸۶ (حاشیہ ۲)

[۲۰] دیوانِ معروف طبع ۱۹۳۵ء میں تلاش کے باوجود مجھے یہ مصرع نہیں ملا۔

[۲۱] اردوے معلّی صدی ایڈیشن حصہ سوم : غالب ۔ مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل۔ مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور

۱۹ اپریل ۱۹۷۰ء ص ۱۰۴۹

۴۲ دیوانِ معروف طبع ۱۹۳۵ء (ص ص ۸۹ تا ۹۰) میں آٹھ اشعار پر مشتمل معروف کی ایک غزل کے مندرجہ ذیل مقطع میں یہ مصرع موجود ہے: ؎

چین پڑتا نہیں اس بن مجھے اک آن کہیں — آہ جی جاؤں نکل جائے اگر جان کہیں

۴۳ اردوئے معلیٰ (حصہ اول): غالب۔ اکمل المطابع، دہلی (طبع اول) مطبوعہ مارچ ۱۸۶۹ء ص ۳۲۳

۴۴ اس زمین میں معروف کی غزل دیوانِ معروف طبع ۱۹۳۵ء (ص ۱۴۰) میں موجود ہے۔

۴۵ غالب کا متداول دیوان اس غزل سے خالی ہے۔

۴۶ اردوئے معلیٰ (حصہ اول) طبع مارچ ۱۸۶۹ء ص ۳۴۲

۴۷ اس شعر کا اضافہ غالب کا منسوخ دیوان: مرتبہ مسلم ضیائی۔ ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی۔ طبع مارچ ۱۹۶۹ء (ص ۲۲۰) سے کیا گیا ہے۔

۴۸ دیوانِ غالب: مرتبہ مالک رام۔ آزاد کتاب گھر، دلّی طبع ۱۹۵۷ء ص ۲۰۹

۴۹ رک دیوانِ معروف طبع ۱۹۳۵ء ص ص ۱۶۱ تا ۱۶۲

۵۰ غالب کی اس غزل کی ردیف "کہوں یا نہ کہوں" ہے مگر جناب قاضی عبدالودود نے اس کی ردیف خلافِ واقعہ "کروں یا نہ کروں" درج فرمائی ہے۔ (آثارِ غالب: مرتبہ قاضی عبدالودود ص ۷۴ (شمولہ علی گڑھ میگزین۔ غالب نمبر بابت ۴۹-۱۹۴۸ء) غالب کا متداول دیوان اس غزل سے بھی محروم ہے۔ یہ غزل دیوانِ معروف ہی کے حوالے سے غالب کا منسوخ دیوان، مرتبہ مسلم ضیائی (ص ص ۲۴ تا ۲۵) میں شامل ہے۔

۵۱ یہ غزل دیوانِ غالب مطبع صدر مجلس، لکھنؤ طبع اپریل ۱۸۸۲ء (ص ص ۲۸ تا ۲۹) میں موجود ہے مگر وہاں اس کی ردیف "ہونے تک" کے بجائے "ہوتے تک" ملتی ہے لیکن مخمس معروف میں اس غزل کی ردیف کسی وجہ سے "ہونے تک" ہی درج ہوئی ہے [دیوانِ معروف ص ص ۱۶۲ تا ۱۶۳]۔ یہاں میں نے دیوانِ معروف ہی کی بنیاد پر ردیف "ہونے تک" لکھی ہے۔ دیوانِ غالب مطبع قیومی، کانپور طبع اگست ۱۹۱۴ء (ص ص ۳۲ تا ۳۳) میں بھی یہ غزل ردیف "ہونے تک" کی حامل ہے۔

۵۲ بہ حوالہ سہ ماہی اردو، کراچی جنوری تا مارچ ۱۹۷۰ء ص ص ۹۴ تا ۹۹ (مضمون اکبر علی خاں عرشی زادہ)

مضمون کے شروع میں، کتابت کی غلطی سے فاضل مضمون نگار کا تعارف رہ گیا ہے، اس لیے آخر میں دیا جا رہا ہے:

جناب کاظم علی خاں، لکچرر شعبۂ اردو، شیعہ انٹر کالج۔ لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۳

کوائف جامعہ

ایک افسوسناک حادثہ

جامعہ کے ایک نوجوان استاد، ڈاکٹر شمس الحسن صاحب نے پچھلے ماہ عید کے تیسرے روز اپنے مکان میں خودکشی کرلی۔ اِنَّا لِلّٰہ و اِنَّا اِلَیہ راجعون ۔ یہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے جامعہ میں پہلا حادثہ ہے اور ہر لحاظ سے انتہائی افسوسناک اور رنج دہ ہے۔

مرحوم کی تاریخ پیدائش ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۴ء ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۶۶ء میں انھوں نے فزکس میں ایم ایس سی اور پھر ۱۹۷۰ء میں پی ایچ ڈی کیا۔ دوسرے سال ۱۹۷۱ء میں جامعہ کالج میں بحیثیت لکچرر کے آپ کا تقرر ہوا، اور ۲۴ دسمبر سے کام شروع کیا۔

اس حادثے کی اطلاع ملتے ہی جامعہ میں فوری طور پر چھٹی کر دی گئی۔ ۲۰ اگست کو جامعہ ٹیچرس ایسوسی ایشن کا ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت ایسوسی ایشن کے صدر جناب عبداللہ ولی بخش قادری صاحب نے کی اور نظامت کے فرائض ایسوسی ایشن کے سکریٹری، سیّد اسد علی صاحب نے انجام دیئے۔ جامعہ کے اساتذہ، کارکنوں اور طالب علموں کے علاوہ شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی، قائم مقام مسجل جامعہ جناب سید شریف الحسن نقوی، خازن جامعہ جناب رضی الحسن چشتی صاحب اور دونوں فیکلٹی کے ڈین جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب اور جناب عبدالحی صاحب نے شرکت کی۔

جلسے کی کارروائی سے قبل قاری سلیمان صاحب، امام مسجد جامعہ نے قرآن پاک کی تلاوت فرمائی اور شعبۂ تاریخ کے ایک لکچرر جناب سید جمال الدین صاحب نے ایک تاثراتی تقریر کی اور آخر میں صدر جلسہ جناب قادری صاحب نے مرحوم کے بارے میں حسب ذیل مضمون پڑھ کر سنایا۔

پچھلا ایک ہمارا ساتھی پندرہ سولہ اگست کی درمیانی شب میں زندگی سے روٹھ کر چلا گیا۔ وہ ہم میں سے کچھ کا رفیق کار تھا کچھ کا نہایت عزیز دوست اور مجھ جیسوں کے لیے اس کی حیثیت ایک نوجوان بھائی کی سی تھی۔ گذشتہ سنیچر کو دن کے دس گیارہ بجے یہ منحوس خبر ایک کان میں پڑی کہ ڈاکٹر شمس الحسن نے خودکشی کر لی۔ اس خبر نے اپنوں اور غیروں سب کے دلوں کو ہلا دیا اور آن کی آن میں کٹلا ہاؤس میں واقع ان کی رہائش گاہ پر لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ اس ساری بستی کو اس حادثے نے جس طرح متاثر کیا اس میں جان کو جان آفریں کے سپرد کرنے والے کی جوان موت اور مرگ ناگہاں کو تو دخل ہے ہی لیکن اس اسباب سے بڑھ کر ان صفات کا حصہ ہے جو اس ذات میں پائی جاتی تھیں۔

انھوں نے ایک مہذب اور شریف گھرانے میں آنکھ کھولی۔ تعلیم کے اعلیٰ مدارج حاصل کیے اور ہمیشہ نمایاں طور پر کامیاب ہوتے رہے۔ حُسنِ صورت اور حسنِ سیرت دونوں سے مالا مال تھے۔ جامعہ میں آتے ہی بہت جلد وہ ایک لائق اور ہمدرد استاد کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے اور جلد ہی ان کی شخصیت کے دوسرے جوہر بھی نمایاں ہو گئے۔ ان کا سماجی شعور نہایت بیدار تھا۔ انھوں نے یہاں کی زندگی میں بھرپور حصہ لیا۔ آج جس جگہ ہم ان کی یاد میں اس وقت جمع ہیں، اگر اس جگہ کو بھی قوتِ گویائی کا یارا ہوتا تو وہ بھی گواہی دے دیتی کہ ادھر چند برسوں میں جب جب یہاں کوئی اجتماع ہوا ہے، خواہ وہ شفیق الرحمٰن اسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام ہوا ہو یا انتظامی اسٹاف کی طرف سے یا انجمنِ اساتذہ کے اعلان پر، اس نے اس جواں مرد کو یہاں ضرور پایا ہے بلکہ ہمیشہ سرگرم پایا ہے۔ ان کے یہاں سماجی ذمہ داری کا محض احساس ہی نہیں تھا بلکہ وہ خلوص کا بھی بدرجۂ اتم رکھتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ جذبے کی لو بھی نہایت تیز تھی۔ لہٰذا ان کی شرکت برائے نام کبھی نہ ہوتی بلکہ ہمیشہ برائے کام ہی رہتی۔ وہ جو بھی کرتے، ڈوب کر اور ٹوٹ کر ہی کرتے۔ انجمنِ اساتذہ کے کاموں میں جتنا انھوں نے اپنا اسکوٹر دوڑایا، جتنا اپنا وقت صرف کیا، جتنی دوڑ بھاگ کی، جتنی اپنی جان جلائی اور جتنا اپنی جیب سے خرچ کیا میرے علم کے مطابق ہم میں سے کسی نے بھی اب تک اتنا نہیں کیا ہے۔ ان کی صدق دلی نے انھیں حق گو بنا دیا تھا۔ اور ان کی گفتار میں بے باکی آ گئی تھی۔ وہ آئینِ جواں مرداں کے پاسدار تھے اور 'روباہی' سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔ ان کی اس افتادِ طبع نے انھیں مصلحتِ وقت کے تقاضوں سے بے اعتنائی برتنے کا حوصلہ عطا کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ اکثر مجھ جیسے سست گام اور اندیشہ ہائے دور دراز میں گرفتار

احباب سے اس بے خطر کود پڑنے کی تڑپ رکھنے والے سے اختلاف رہتا۔ خواہ گفتگو ان کے گھر پر ہی ہو رہی ہو یا انجمن اساتذہ کی مجلس عاملہ کی میٹنگ ہو یا جلسۂ عام، ایسا کم ہی ہوا ہے کہ وہ احباب کی رائے یا فیصلے سے پورے طور پر مطمئن نظر آتے ہوں۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان کی تعمیل کے وقت میدان عمل میں وہ پیش پیش نہ رہے ہوں۔ جب سے انھوں نے ہم سے منھ موڑا ہے، ان کی یہی ادائیں بار بار یاد آرہی ہیں۔ وہ مطلب پرستی، موقع پرستی، اور جاہ پرستی کی آلائشوں سے قطعی پاک تھے لیکن لیکن پاس وضع اور خاطر احباب میں سر تسلیم خم کرتے میں نہ کبھی تکلف ہوتا اور نہ دکھ بلکہ جب بھی کوئی ایسا موقع آتا تو میں نے محسوس کیا کہ ان کی طبیعت کا نکھار کچھ اور بڑھ گیا اور وہ پہلے سے کچھ زیادہ ہی خلوص کا پیکر بن گئے۔ میں اپنی بات کو ایک بہت معمولی واقعے سے واضح کرتا ہوں۔ پچھلے سال کا قصہ ہے۔ میرے یہاں بیٹھے ہوئے انجمن اساتذہ کے معاملات پر گفتگو کر رہے تھے۔ میرے منھ سے نکل گیا کہ "انجمن دو آدمیوں کی تو ہے نہیں"۔ اتفاق سے اس وقت ہم صرف تین تھے۔ لہذا انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ میرا روئے سخن ان کی طرف بھی ہے اگرچہ میں نے 'دو' کا لفظ محاورتاً برتا تھا اور یہ بھی محسوس نہیں کیا تھا کہ کوئی سخت بات کہی ہے لیکن ان کے نازک شیشۂ دل پر چوٹ پڑ گئی۔ دل کا رنگ چہرے پر آگیا اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ میری سمجھ میں ہی نہ آیا کہ ماجرا کیا ہے۔ کئی بار کی منت سماجت کے بعد بتایا کہ "مجھے اس بات سے دکھ ہوا"۔ میں نے اظہار ندامت کیا تو کچھ خجل ہوئے اور میری خواہش کے احترام میں ہنسنے بھی لگے۔ اس واقعے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ان کے برادرانہ احترام میں کچھ اور اضافہ ہوگیا۔ وہ سریع الحس یقیناً تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ نیک نفس بھی ضرور تھے۔ انھوں نے موسم گرما کی تعطیل سے کچھ دن قبل، انجمن اساتذہ کی مجلس عاملہ سے استعفیٰ پیش کر دیا۔ ایک دوست نے اسی وقت اسے پھاڑ کر پھینک دیا۔ انھوں نے کچھ داد خواہی کے انداز میں میری طرف دیکھا اور بے التفاتی محسوس کر کے خاموش ہو گئے لیکن دوسرے روز میرے پاس پیون بک پر چڑھا کر اپنا استعفیٰ بھیج دیا۔ پھر بھی جب میرے کان پر جوں نہیں رینگی تو کچھ دن کے بعد بذریعہ ڈاک رجسٹری شدہ استعفیٰ ارسال کر دیا۔ میں چند روز کے بعد ان کے گھر گیا۔ انھوں نے حسب معمول مجھ جیسے احباب کی بزدلی اور بے عملی کا گلہ شروع کر دیا۔ میرے پاس اپنی کوتاہیوں کا تو کوئی جواب تھا نہیں۔ بلکہ ان کی دوست نوازی پر ہی تکیہ کر سکتا تھا۔ لہذا یہ کہہ کر چلنے لگا کہ آپ کا کہنا بالکل بجا ہے لیکن ہم سب کا متفقہ فیصلہ

یہ ہے کہ آپ کا استعفےٰ نامنظور کیا جاتا ہے" جواب تو کچھ نہیں دیا لیکن شدت جذبات سے چہرہ سرخ ہوگیا۔ آنکھیں نم ہو گئیں اور زبان نہ کھول سکے، صرف اشارے میں سلام کرلیا۔ پھر اس بات کا ذکر کبھی نہیں آیا اور چھٹیوں کے بعد وہ اسی جوش و خروش کے ساتھ انجمن کے کام میں شریک ہونے لگے۔
ابھی رمضان کے آخر میں آل انڈیا ٹیچرس فیڈریشن کے مظاہرے کے سلسلے میں بھی ان کا وہی اپنا مخصوص انداز رہا۔ اولاً فیڈریشن کی کارگزاری سے بے اطمینانی ظاہر کی اور مظاہرے میں شرکت کو فضول بتایا۔ لیکن توقع کے مطابق روانگی کے وقت اس طور جامعہ بس اسٹاپ پر آکر ہمارے پاس کھڑے ہو گئے کہ یونہی اتفاقاً ادھر آنکلے ہیں۔ پھر ہم چند دوستوں کے ساتھ روانہ ہوئے اور ایکسپریس بلڈنگ کے پاس اجتماع گاہ میں پہنچنے کے بعد وہ رضاکارانہ انداز میں جھنڈا پکڑے ہوئے کھڑے تھے! مجھے تو یہ مشورہ دیا کہ روزے میں تکلیف ہوگی۔ لہٰذا اتنی ہی شرکت کافی ہے لیکن خود بھی روزہ دار تھے اور ہم سب احباب کے متعدد بار منع کرنے کے باوجود ظفر مارگ سے لے کر بوٹ کلب تک سارے راستے بدی خوانی کرتے ہوئے آئے۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن ان سے ہی ان کے کردار کی پختگی اور ان کے اندر اپنے احباب کی دل داری اور مروت اور محبت کے جذبے کی غمازی بھی ہوتی ہے۔

یہ غم ہمارا اپنا ہے۔ اس لیے کس سے اظہار ہمدردی کریں۔ البتہ ان کے بزرگ والدین، بھائی بہن، اور دوسرے عزیزوں کو جو صدمہ پہنچا ہے، اسے ہم محسوس ضرور کرتے ہیں اور اگر ان کا یہ دکھ بانٹ لینے کی چیز ہوتا تو یقیناً ہم سب ان کے دوست احباب اسے بانٹ بھی لیتے۔ خدا اُن سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

جب جب جامعہ میں جمہوری اقدار کو فروغ دینے والی خوشگوار تبدیلیاں رونما ہوں گی، اور سائنس کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہوگا، اس وقت ہمیں اپنے اس ترک طرح دار کی یاد کچھ اور ستائے گی اور یوں بھی یاروں کی محفلوں میں اس کی کمی محسوس ہوتی رہے گی، نہ جانے کب تک۔
حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا۔

مضمون کے بعد جناب اسد علی صاحب نے حسب ذیل تعزیتی تجویز پیش کی جسے دعاؤں کے ساتھ منظور کیا گیا :

"جامعہ کے اساتذہ، کارکنان اور طلبہ کا یہ جلسۂ عام اپنے عزیز ساتھی ڈاکٹر شمس الحسن کی ناگہانی موت پر اپنے انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ وہ ایک جواں عمر اور جواں حوصلہ انسان تھے۔ ہمدردی اور خدمت کا جذبہ رکھتے تھے۔ نیز ایک ذہین اور اچھے استاد کی جملہ صفات کے حامل تھے۔ انھوں نے جامعہ براداری کی زندگی میں بھرپور حصہ لیا اور ہر نیک کام میں انھیں بہر طور ہمیشہ شریک پایا گیا۔ انھوں نے پینتیس ۳۵ سال کی مختصر عمر پائی اور اپنی زندگی کے آخری نو سال جامعہ میں بحیثیت لکچرر طبعیات (فزکس) گزارے۔ لیکن اس قلیل مدت میں ہی اپنی شخصی صفات کی بنا پر وہ جامعہ کی ایک مقبول شخصیت قرار پاگئے۔ ہم سب ان کے بزرگ والدین، بہن بھائی اور دیگر اعزا کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور بارگاہ ایزدی میں دست بہ دعا ہیں کہ خدا انھیں صبر جمیل عطا فرمائے اور ہمارے مرحوم ساتھی کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا کرے۔

اسلامی نظامِ تعلیم پر پروفیسر خسرو کی تقریر

شعبۂ اسلامک و عرب ایرانین اسٹڈیز کے حلقۂ مطالعہ کی دعوت پر مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور مغربی جرمنی میں ہندوستان کے نامزد سفیر پروفیسر علی محمد خسرو نے ۳۰ راگست کو اسلامی نظام تعلیم پر ایک فکر انگیز تقریر کی۔ جلسے کی صدارت متعلقہ فیکلٹی کے ڈین اور کالج کے پرنسپل جناب ضیاء الحسن فاروقی نے کی اور ناظم کے فرائض شعبے کے صدر اور پروفیسر ڈاکٹر مشیر الحق نے انجام دیئے۔

پروفیسر خسرو نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ مسلمانوں کے زمانۂ عروج اور زمانۂ اقتدار میں جو نظام تعلیم رائج تھا، اس میں دینی اور دنیاوی علوم کی مساوی حیثیت دی گئی تھی، اس کا مقصد جہاں یہ تھا کہ ایسے علما تیار کئے جائیں جو مذہبی علوم پر مکمل طور پر حاوی ہوں، وہاں اس کا بھی لحاظ رکھا گیا تھا کہ وہ دنیاوی علوم سے بھی پوری طرح واقف ہوں۔ اس نظام تعلیم ہی کی یہ خوبی تھی کہ اسلام کے عہد زریں میں جہاں مفسرین قرآن، ماہرین احادیث، اور مفکرین اسلام پیدا ہوئے، وہاں مشہور مورخ، ریاضی اور جغرافیہ کے ماہر اور سائنس داں بھی پیدا ہوئے۔ مگر آج جو نظام تعلیم رائج ہے وہ دینی علوم کے لئے الگ ہے اور دنیاوی علوم کے لئے الگ ہے، اس ثنویت کی وجہ سے کوئی ایسا شخص پیدا نہیں ہوتا جو دینی اور دنیاوی علوم دونوں پر حاوی ہو۔ آج عملاً اجتہاد کا دروازہ بند ہے تو اس کی وجہ یہی ہے

کہ ایسے اشخاص ناپید ہیں جو بیک وقت علوم اسلامی پر بھی عبور رکھتے ہوں اور جدید علوم پر بھی اور جہاں قرآن و حدیث اور فقہ پر ان کی گہری اور وسیع نظر ہو، وہاں وہ ضروریات زمانہ اور جدید تقاضوں کو اچھی طرح سمجھتے ہوں۔

موصوف نے مزید فرمایا کہ تعلیمی نظام کے پیچھے ایک نظام اقدار ہوتا ہے۔ یہی صورت اسلامی نظام تعلیم کی بھی ہوگی۔ ہر متحرک اور فعال نظام تعلیم کی طرح اسلامی طرزِ تعلیم میں بھی دو بنیادی خصوصیات ہونی چاہئیں (الف) اس میں چند ایسے بنیادی اوصاف ہونے چاہئیں جو کہ ناقابلِ تغیر ہوں اور اس کو دوسرے نظاموں سے ممتاز کرتے ہوں۔ اگر یہ اوصاف بھی بدل جائیں تو پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ (ب) اس میں ایسی لچک بھی ہو جو کہ زندگی کی تغیر پذیری کا ساتھ دے سکے۔ چونکہ تبدیلی زندگی کا اٹل قانون ہے اور وہ نظام تباہ ہو جائے گا جو کہ زمان و مکان کی ناگزیر تغیر پذیری کا ساتھ نہ دے سکے۔ چونکہ اسلام بجا طور پر آفاقیت کا دعویدار ہے اس لئے وہ ہر زمان و مکان میں اثر پذیری اور نفاذ کی صلاحیت رکھتا ہے"۔

فاضل مقرر نے مزید کہا کہ: "یہ حقیقت بڑی واضح ہے کہ جدید علوم و فنون کا غالب اور معتدبہ حصہ اسلامی نظریات و تصورات کا حریف نہیں ہے بلکہ مسلمانوں نے قرنِ اوّل میں دانشوری اور زمانے سے ہم آہنگی کا بھرپور مظاہرہ بھی کیا تھا۔ انھوں نے یونانی علوم کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا اور اس "تشکیک" کو جنم دیا جو صالح تحقیق کے لئے نہ صرف ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ یہ اسی اندازِ فکر و عمل کا فیضان تھا جس نے سائنسی انکشافات سے دنیا کو بہرہ ور کیا اور یہی وہ علمی و معروضی اندازِ فکر و نظر تھا جسے مسلمان اپنے ساتھ اسپین اور دیگر مقامات تک لے گئے اور جہاں سے یہ پندرھویں صدی اور سولھویں صدی میں یورپ میں پہونچے اور وہاں نشاۃ ثانیہ کا سبب بنے۔ اب یہ ضروری ہے کہ اسلامی طریقِ تعلیم پھر اسی علمی و معروضی اندازِ فکر و نظر کو دنیوی معاملات میں اپنائے جس کو خود مسلمانوں نے ہی جنم دیا تھا اور اب وہ خود ہی اس کے لئے اجنبی بن کر رہ گئے ہیں۔ اس لئے ایک بہتر اسلامی طرزِ تعلیم کی ضرورت ہے تاکہ دنیوی علوم کے تعلیم یافتہ طبقے کے لئے قرآن و حدیث کی تعلیم و تفہیم کا اگر دروازہ کھل سکے تو دوسری طرف مذہبی علماء کے لئے دنیوی علوم سے استفادہ کا بھی معقول انتظام ہو سکے۔"

تقریر کے بعد حاضرین جلسہ میں سے متعدد حضرات نے مختلف قسم کے سوالات کئے یا زیرِ بحث مسئلے کے بارے میں اپنے خیالات یا تقریر کے بارے میں اپنے تأثرات کا اظہار کیا۔ آخر میں صدر جلسہ

جناب ضیاء الحسن فاروقی نے اپنی مختصر تقریر میں فرمایا کہ پروفیسر خسرو نے جس اہم مسئلے پر روشنی ڈالی ہے، اس کا احساس تو سب کو ہے، مگر اصل دقت یہ ہے کہ کسی کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس کام کو انجام کیونکر دیا جائے۔ دینی اور دنیاوی علوم کو ایک ساتھ پڑھانے کے کچھ تجربے بھی کئے گئے ہیں لیکن ان میں کامیابی نہیں ہوئی یا وہ نتیجہ نہیں نکلا جو مقصود تھا۔ ضرورت اس کی ہے کہ کچھ لوگ آگے بڑھیں اور اس نہج پر کام کریں، جس کی طرف فاضل مقرر نے اپنی تقریر میں اشارات کئے ہیں۔

تقریر سے قبل صدر شعبہ پروفیسر مشیر الحق نے فاضل مقرر کا خیر مقدم کرتے ہوئے موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالی، اور صدر جلسہ کی تقریر کے بعد اسٹڈی سرکل کے کنوینر اور فارسی زبان وادب کے ریڈر ڈاکٹر شعیب اعظمی نے فاضل مقرر اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

شعبۂ تاریخ میں ایک سیمینار

ہندوستان کی جنگ آزادی کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں قومی تحریک کی تعبیر وتشریح اور اس کے رجحانات کے بارے میں کافی اختلافات ہیں، اسی طرح ممتاز قومی رہنماؤں کے خیالات ورجحانات اور سیاسی اور سماجی مسائل کے متعلق ان کے رویے اور طریق کار کے بارے میں مؤرخوں اور دانشوروں کی رائیں مختلف ہیں، اس لئے ان کے بارے میں مختلف مکتب فکر کے دانشوروں کی رائیں سننے اور ان پر بحث وگفتگو کرنے کے لئے یہ سیمینار منعقد کیا گیا تھا جس میں شرکت کے لئے چار حضرات کو مدعو کیا گیا، مگر ایک صاحب کسی وجہ سے تشریف نہ لا سکے، حسب ذیل تین حضرات نے شرکت فرمائی:

۱۔ جناب بی۔ ٹی رندیوے (سی پی ایم پولٹ بیورو کے رکن)

۲۔ پروفیسر سمت سرکار (مصنف، بنگال کی سودیشی تحریک اور پروفیسر شعبۂ تاریخ دہلی یونیورسٹی)

۳۔ پروفیسر روندر کمار (ڈائرکٹر نہرو میموریل میوزیم ولائبریری)

شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی کی صدارت میں ۳۰ اگست کو صبح ۱۰ بجے کونسل روم میں یہ سیمینار منعقد ہوا۔ شعبے کے صدر اور سیمینار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر مشیر الحسن صاحب نے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے، سیمینار کی ضرورت واہمیت اور موضوع بحث کی وضاحت میں ایک مختصر مقالہ پڑھا، اس کے بعد مہمان مقالہ نگاروں اور مقرروں نے تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کیا، سوالات

کے بعد جناب شیخ الجامعہ صاحب نے صدارتی تقریر فرمائی جس میں زیر بحث موضوع کے بارے میں مختصراً اپنے خیالات کا اظہار بھی فرمایا اور تقریروں کے متعلق اپنی رائے بھی دی۔

ان تقریروں میں مسلم مجاہدین میں سے کسی کا کوئی ذکر نہیں آیا تھا، صرف آخری مقرر جناب رندیوے نے ضمناً ایک موقع پر مولانا محمد علی کا ذکر کیا تھا۔ جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب جو بہ حیثیت ڈین کے صدر اور مقررین کے ساتھ تشریف رکھتے تھے، شاید اس کا احساس تھا، اس لئے انھوں نے رندیوے صاحب سے مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی اور قومی خدمات کے بارے میں سوال کیا اور موصوف نے اس کے جواب میں مولانا کی مخلصانہ اور شاندار خدمات کا اعتراف کیا۔

شعبۂ اردو میں نئے طلباء کا خیر مقدم

حسب روایت، ایم اے (اردو) سال دوم کے طلباء کی طرف سے سال اوّل کے طالب علموں کے خیر مقدم کے لئے شعبۂ اردو میں ۱۱ ستمبر کو صدر شعبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں اساتذۂ اردو کے علاوہ ریسرچ اسکالروں اور طالب علموں نے شرکت کی۔ اگرچہ یہ جلسہ بنیادی طور پر نئے طلباء کے خیر مقدم کے لئے منعقد کیا گیا تھا مگر آخر میں اس نے ایک ادبی صحبت کی صورت اختیار کر لی۔ کچھ طلباء اور طالبات نے ترنم کے ساتھ یا تحت اللفظ مگر اچھے انداز میں دوسروں کی نظمیں اور غزلیں سنائیں، کچھ طلباء نے خود اپنا کلام سنایا۔ اسی طرح چند ریسرچ اسکالروں اور بعض اساتذہ نے بھی اپنا کلام سنایا۔ آخر میں صدر شعبہ پروفیسر نارنگ صاحب نے نئے طالب علموں کا خیر مقدم کرتے ہوئے شعبے کے تمام طالب علموں کو نصیحتیں کیں اور شعبے کی کارگزاریوں کا ذکر کیا۔ امسال پچھلے سال کے مقابلے میں شعبے میں داخلے زیادہ ہوئے ہیں۔ اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ اصل چیز تعداد نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ جن طالب علموں نے اردو کو اپنے خصوصی مضمون کی حیثیت سے منتخب کیا ہے، انھوں نے اسی کے ساتھ انصاف بھی کیا ہے یا نہیں؟ آپ نے اردو کو اپنے مضمون کی حیثیت سے اختیار کیا تو اس سے یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ اردو زبان و ادب سے آپ کو دلچسپی ہے، محبت ہے، مگر اسی قدر کافی نہیں ہے، ضرورت ہے کہ آپ اچھے نمبر بھی حاصل کریں اور اس کی خدمت بھی کریں۔ امید ہے کہ آپ اردو کے مسائل سے کسی قدر

واقف ہوں گے اور اس سے بھی واقف ہوں گے کہ جامعہ ملیہ نے اردو کی گراں قدر خدمت کی ہے۔ آپ کے اساتذہ کو سچی خوشی اس وقت ہوگی جب آپ اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے کے بعد ایسے کام کریں جس سے آپ کی مادر علمی کا نام بھی روشن ہو اور اردو کی خدمت بھی انجام پائے۔

کھیل سنسار (بچوں کے لئے نظموں کا مجموعہ) از سطوت رسول

جناب سطوت رسول، جامعہ ملیہ کے مرکزی کتب خانہ، ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری میں کارکن ہیں، طبیعت اور مزاج کے لحاظ سے مرنجا مرنج ہیں اور شاعر ہیں اس لئے کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں، معلوم ایسا ہوتا ہے گویا کسی فکر میں غرق ہیں۔ خود انھوں نے اپنی شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ: "جب میں اپنے وطن قصبہ ردولی (بارہ بنکی) میں ابتدائی کلاسوں کا طالب علم تھا تو اس وقت کے بچوں کے شاعر اسمٰعیل میرٹھی، سرور جہان آبادی، تلوک چند محروم، حامد اللہ افسر، شفیع الدین نیر، اور بہت سے دوسرے شاعروں کی نظمیں پڑھتا تھا۔ ان نظموں کو پڑھنے میں مجھے ایک گونہ لطف اور انتہائی سکون ملتا تھا —— یہی سکون بعد میں میری نظموں کے قالب میں ڈھل گیا، جو آپ کے سامنے ہے۔" (صفحہ ۱۰)

اس کتاب میں ڈاکٹر شمیم حنفی صاحب کا، جو شعبۂ اردو میں ریڈر ہیں، ایک مختصر تعارف شامل ہے، اس میں موصوف نے ایک جگہ لکھا ہے: "یہاں نہ صرف یہ کہ جامعہ کے بزرگوں، متعلقین اور کارکنوں میں شعر و ادب کا ایک ستھرا اور پاکیزہ ذوق عام ہے۔ اسکول کی سطح کے طلبہ اور طالبات میں اردو زبان و ادب سے واقفیت کا معیار بھی غالباً دوسرے اداروں کے طلبہ کی بہ نسبت بہتر ہے۔ جامعہ کے بعض بزرگوں نے بچوں کے ادب کی اشاعت اور فروغ میں جو قابل قدر خدمات انجام دی ہیں انھیں بھی جامعہ کی ادبی روایت اور تعلیمی سرگرمی ہی کا حصہ سمجھنا چاہیے۔ سطوت رسول صاحب اس روایت کے امین بھی ہیں اور اسے آگے بڑھانے کے جتن بھی کر رہے ہیں۔" (صفحہ ۸)

اس مختصر مجموعے میں ۴۷ نظمیں شامل ہیں، جن میں گیت، پہیلیاں اور لوریاں بھی شامل ہیں، نمونے کے طور پر ایک چھوٹی سی نظم "خلائی سیارہ" پیش خدمت ہے جو ۱۹۵۷ء میں

کہی گئی تھی جب روس کا خلائی راکٹ "اسپوتنگ" چھوڑا گیا تھا :

دیکھو دیکھو راکٹ جاتا دور گگن کے اور
ہم دھرتی کے سارے باسی کرتے ہیں یہ شور
دیکھ نہ پائیں تو شرمائیں جوں شرمائے مور

پربت پربت گھوم رہا ہے کیسا چکر کھاتا
جنگل جنگل، بستی بستی، ساگر پر سے ہے جاتا
ٹوٹ رہا ہے چاند نگر سے بُڑھیا کا اب ناتا

طوفانوں سے لڑتے ہیں یہ محنت کش مزدور
بچّے راکٹ دیکھ رہے ہیں، کتنے ہیں مسرور
ایٹم کے اس دور میں بچو! کل ہے کتنی دور

اپنا راکٹ ہم بھی چھوڑیں اور گگن کو جائیں
ٹم ٹم کرتے ننھے مُنّے تارے توڑ کے لائیں
آنے والے یُگ میں کتنی آشائیں مسکائیں

کتابت طباعت عمدہ، قیمت ساڑھے چار روپے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۲۵

(کوائف نگار)

[illegible] Vol. [illegible] No. [illegible] [illegible]

THE MONTHLY JAMIA, Jamia Nagar, New Delhi-110025

Subscription Rates

India	Rs. 6.00
Pakistan	Rs. 26.00
Foreign	$ 4 (US) or £ 1.50

Advertisement Rates

Cover IV	Full page	200/-	Half page	Rs.	100/-
Cover II & III	Full page	150/-	Half page	Rs.	75/-
Ordinary	Full page	100/-	Half page	Rs.	50/-

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ چھ روپے
قیمت فی پرچہ پچاس پیسے

جلد ۷۷	بابت ماہ اکتوبر ۱۹۸۰ء	شمارہ ۱۰

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی، مطبوعہ: جمال پریس دہلی ۰ ٹائیٹل: فائن پریس دہلی

شذرات

ماہ ستمبر کے شذرات میں ہم نے لکھا تھا کہ " اس وقت مغربی ایشیا کے حالات اتنے الجھے ہوئے ہیں کہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کس وقت کیا ہو جائے " عجیب اتفاق ہے کہ چند روز کے اندر ہی یہ خبر موصول ہوئی کہ عراق اور ایران میں جنگ چھڑ گئی ہے۔ یہ جنگ ابھی جاری ہے اور دونوں ملک اگرچہ تھک چکے ہیں، لیکن ایک دوسرے کا زخم جگر دیکھنے پر بعند ہیں۔ اس جنگ کی ذمہ داری جتنی عراق پر ہے اتنی ہی ایران پر بھی ہے، لیکن عراق چونکہ حملہ آور ہے، اس لئے جنگ شروع کرنے کی مزید ذمہ داری عراق ہی کے سر رہے گی۔ اس جنگ سے یہ بات تو صاف ہو گئی ہے کہ عرب ہو یا عجم، اسلامی اخوت کا تصور محض ایک تصور ہے، قومیت اور قومی مفاد کی اولیت کا نظریہ ہی ابھی ذہنوں پر حکمراں ہے، اور اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ اس جنگ میں "فرقہ وارانہ تخرب و تعصب" کی جھلکیاں بھی دیکھنے کو ملی ہیں۔ مغربی خبر رساں ایجنسیوں نے اسے اور ہوا دی ہے اور اس سے دور دراز علاقوں کے مسلمان بھی متاثر ہوتے ہیں۔ ملت اسلامیہ کی اس زبوں حالی پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

ایران میں شاہی نظام ختم ہوا اور اس کی جگہ ایک اسلامی جمہوریہ قائم ہوئی۔ شخصی حکومت کا خاتمہ جو ظالم اور مستبد تھی، بذات خود ایک خوش آیند واقعہ تھا اور اس کا استقبال دنیا کے تمام سچے جمہوریت پسندوں کی طرف سے ہوا۔ ایران کے اس انقلاب کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ اسے اسلام کے نام سے برپا کیا گیا اور اسلامی انقلاب کہا گیا، دنیا کے تمام مسلمانوں نے اس حیثیت سے بھی اس کا خیر مقدم کیا۔ لیکن جب

اس اسلامی انقلاب کے کچھ خدوخال ظاہر ہوئے تو مسلمانانِ عالم کے ایک بڑے طبقہ میں مایوسی پیدا ہو چلی۔ ایران کی مشکلات بہت تھیں، شاہی نظام کی چمک دمک کے پیچھے جو معاشی اور سماجی کمزوریاں چھپی ہوئی تھیں وہ سب ابھر کر سامنے آگئیں۔ پرانے نظام کے حامی بھی بہت تھے، ان سے الگ نبٹنا تھا، دنیا کی بڑی طاقتوں کی سازشوں سے بھی اپنے آپ کو محفوظ رکھنا تھا، پھر انقلاب کے اس جوش و خروش کو جو اکثر اندھا اور غیر محتاط ہوتا ہے اور جو حقائق اور ان کے مضمرات کو نہ تو دیکھ سکتا ہے اور نہ سمجھ سکتا ہے، قابو میں بھی رکھنا تھا، انقلاب کے ساتھ جو اتھل پتھل ہوتی ہے اور جس طرح کی ایک نراج کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اس میں تعمیر و استحکام کے پہلو کو مقدم رکھنے کے لیے قائدانہ بصیرت کی ضرورت تھی، افسوس کہ مجموعی طور پر ایران ان امور میں ناکام رہا اور غالباً اسی ناکامی کے احساس نے میں کے قائدین اور مجتہدین کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اس اسلامی انقلاب کو دوسرے مسلم ممالک کو برآمد کریں اور اس طرح ایرانی قوم کی توجہ ایک ایسی مہم پر مرکوز کر دیں کہ ان کے اپنے مسائل پس پشت پڑ جائیں، درحقیقت یہ ان کی بڑی بھول تھی، ایران کی موجودہ مشکلات کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے۔

ایران اور عراق کے اختلافات نئے نہیں ہیں۔ اِدھر ماضی قریب میں ان میں براہِ راست تو کوئی تصادم نہیں ہوا تھا، لیکن بالواسطہ ان میں کسی نہ کسی شکل میں تصادم کی کیفیت موجود تھی اور اس کی وجہ سے کسی حد تک دونوں ملکوں کا جانی و مالی نقصان ہوا تھا۔ کردوں کا معاملہ کبھی حل نہ ہو سکا اور وہ آج بھی باقی ہے۔ عراق کے کردوں کو ایران سے برابر مدد ملتی تھی اور عراق ایران کی ان ریشہ دوانیوں سے واقف تھا۔ مرحوم شاہ نے خلیج اور بحیرۂ عرب میں ایران کی بالادستی کا جو نقشہ بنایا تھا اس میں عراق کا وجود ایک کمزور اور بے بس وجود تھا، شاہ کو امریکہ کی پوری حمایت حاصل تھی، اسی بات نے عراق کو مجبور کیا تھا کہ وہ روس سے، اگرچہ وہ بھی عراق کے کردوں کی مدد کرتا تھا، اپنے تعلقات بہتر اور روسی اسلحے سے اپنی افواج کو مسلح رکھے۔

اسی طرح ایرانی فوج امریکی ہتھیاروں سے لیس تھی۔ اور عراقی فوج روسی اسلحوں سے۔ دنیا کی دونوں بڑی طاقتوں کا سیاسی و فوجی کھیل اس صورت حال سے بالکل واضح ہوجاتا ہے اور یہ دونوں طاقتیں مانتی بھی ہیں کہ وہ یہ کھیل اپنے قومی مفاد کے تحفظ کے لیے کھیلنے پر مجبور ہیں۔ یہی وہ صورتحال تھی جس کے دباؤ میں آکر عراق نے ۱۹۷۵ء میں الجیرز میں اوپیک کانفرنس کے موقع پر ایران سے مصالحت کرلی تھی۔ ایران نے وعدہ کیا تھا کہ وہ عراق کے کردوں کی مدد نہیں کرے گا۔ اور اس وعدہ کی قیمت عراق کو اپنا کچھ علاقہ دے کر اور شط العرب میں ایران کے حق جہازرانی کو تسلیم کر کے ادا کرنی پڑی تھی۔

ہمارا خیال ہے کہ اس ذلت آمیز مصالحت کو عراق بھولا نہیں تھا۔ لیکن دونوں ملکوں کے مابین، عارضی طور پر ہی سہی، ایران میں انقلاب کے آغاز تک حالات و معاملات پُرسکون رہے۔ لیکن بعد میں جب ایران کے انقلاب نے جارحانہ رویہ اختیار کیا اور امریکہ کو اس کی طرف سے مایوسی ہوگئی تو نہ معلوم اندر اندر کیا صورت حال پیش آئی کہ ایک دن معلوم ہوا کہ عراق ۱۹۷۵ء کے معاہدہ پر نظر ثانی چاہتا ہے اور پھر تھوڑے ہی عرصے بعد جبکہ ایرانی حکومت معاہدہ پر نظر ثانی کے لیے آمادہ نہ ہوئی عراق نے ایران پر حملہ کردیا اور اب دونوں ملک جنگ کی تباہ کاریوں کا شکار ہیں۔ یہ جنگ مکمل جنگ کے انداز پر لڑی جارہی ہے۔ دونوں ملک ایک دوسرے کی معاشیات کو نذر آتش کر رہے ہیں۔ صنعتی تنصیبات اور شہری آبادیوں پر حملے کرتے ہیں اور بندرگاہوں کو تباہ کرتے ہیں۔ اندازہ ہے کہ اب تک اربوں ڈالر کا نقصان ہوچکا ہے اور نہ معلوم ابھی کیا کیا ان ملکوں کے عوام کے مقدر میں ہے۔ نتیجہ، جیسا کہ نظر آرہا ہے یہ نکلے گا کہ مغربی ایشیا میں مجموعی طور پر امریکہ کی پوزیشن بہت مستحکم ہوجائے گی، ہمیں کچھ ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ امریکہ نے افغانستان میں روس کے حق اثر و اقتدار کو تسلیم کرلیا ہے۔ بس اب وہ یہ چاہتا ہے کہ ایران کا اتحاد پارہ پارہ نہ ہو اور وہاں اس کا اثر پھر سے قائم ہوجائے۔ ادھر چند روز سے صدر کارٹر جو دوبارہ امریکہ کے صدر رہنے کے خواہاں ہیں، ایران سے اپنی ہمدردی کا اظہار کرنے لگے ہیں اور ایران کا رویہ بھی امریکی یرغمالیوں سے متعلق کافی

تو ممکن ہے لیکن محدود مطالعے کے ساتھ کوئی حتمی فیصلہ دینا کسی طرح جائز نہیں۔ تنقید میں نظریاتی تفہیم اور تجرباتی طریقِ فکر کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن تاویل و تعبیر اور محض شخصی اندازِ نظر سے اس کا TEXTURE تیار کیا جائے یہ کسی صورت مناسب نہیں۔

مطالعاتی سطح پر ادبی حقائق کی بازیافت فنی معائب و محاسن کی علمی تفہیم، تخلیقی جوہر کی کارفرمائی، تخیل کی رنگ آمیزی اور احساس کی زیریں لہروں کو سمجھے بغیر کسی ادب یا ادب پارے کے ساتھ انصاف ممکن نہیں لیکن کسی مصنف کے گہرے مطالعے اور کسی ادب پارے کے پس منظر میں جھلکتے ہوئے شعور و شخصیت سے تاثر کے باوجود ناقد اور مصنف کے مابین حدِ فاصل کا باقی رکھنا یا باقی رہنا ضروری ہے تاکہ عقیدت اور تفاخر و تعصب دونوں سے بچتے ہوئے وہ اپنی رائے پیش کر سکے۔ تنقید میں جذباتی رویے کا کسی بھی سطح پر دخل اسے معروضی تنقید کے دائرے سے نکال کر موضوعی تنقید کی حدود میں لے آتا ہے جس کا تنقید کے تحقیقی رویے اور علمی طریقِ رسائی سے کوئی واسطہ نہیں۔

جس طرح کسی ادب پارے یا ادیب کو "بے چہرگی" کا شکار نہ ہونا چاہیے، اسی طرح کسی تنقید کو بے مقصدیت کی بھول بھلیوں سے بچنا چاہیے۔ منزل اور سمتِ سفر کے تعین کے بغیر جس سے بچنا بہت مشکل ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ تنقید کا مقصد محض PATENT FACTS کی دریافت نہیں ہوتی LATENT FACTS کی بھی اس میں بڑی قدر و قیمت ہوتی ہے لیکن حقائق کی بازیافت کے عمل کو حقائق کی دریافت یعنی تعین و تصدیق سے بے نیاز نہیں گذرنا چاہیے۔ بعض اوقات تنقیدی فکر فرمائی کے نتیجے میں جو امور سامنے آتے ہیں جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے مستند متن اور تحقیقی سوانح سے اس کا کوئی تعلق نہیں تو عجیب مضحکہ خیز صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

تحقیقی تنقید کے مقتضیات کی پاس داری میں سب سے پہلا مرحلہ موضوع کے اساسی مطالعے کو قرار دیا جانا چاہیے جس سے مراد بیشتر حالتوں میں مصنف اصل اور مستند متن تک رسائی اور اس کا سنجیدہ مطالعہ ہے۔ اس مطالعہ میں بطورِ خاص اس کا لحاظ رکھا جائے کہ ان کی ارتقائی پہنچ کیا رہی ہے اور زمانی و مکانی طور پر ان میں تقدیم و تاخیر یا قربت و بُعد کا کیا رشتہ ہے اور

اس کا تعین کن خطوط پر ہوتا ہے ۔ اس پر نظر ڈالے بغیر یہ بالکل ممکن ہے کہ ہم مصنف کے کسی نقطۂ نظر یا شخصی اسلوب کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہو جائیں اور خشت اوّل کی کجی کی وجہ سے ساری فکری تعمیر کج نظر آنے لگے ۔

اساسی مطالعے ہی کی طرح تقابلی مطالعہ بھی تحقیقی تنقید میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہوتا ہے ۔ اسے دو شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ اولاً جس حد تک علمی مطالعہ اور تحقیقی چھان بین کے وسیلے سے ممکن ہو یہ معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کی جائے کہ کسی مصنف نے اپنے علمی یا تخلیقی کام کی انجام دہی میں کن ماخذ یا ذرائع سے بالواسطہ یا بلا واسطہ استفادہ کیا ہے یا اس کے تخلیقی جوہر کی نمود کے سرچشمے کیا ہیں اور وہ ان سے اپنے حالات یا صلاحیتوں کے مطابق کس حد تک مستفید یا مستفیض ہو سکا ہے ۔

دوسری شق میں صاحب تصنیف یا تخلیق کار کے معاصرین اور قریب العہد عالموں، ادیبوں اور صاحب فکر و نظر افراد کی تحریروں کے مطالعے کے ذریعے یہ پتہ چلایا جائے کہ مصنف اور اس کے معاصرین کی فکر فرمائیوں میں کتنا حصّہ مشترک اور مماثل ہے اور اس اشتراک یا مماثلت کی نوعیت اکتسابی سطح پر کیا ہو سکتی ہے، کیا ایسے شواہد خارجی یا داخلی طور پر موجود ہیں جن سے تاثر یا تشابہ کے وجوہ کا پتہ لگایا جا سکے اور اس کے بارے میں کسی فیصلے پر پہنچا جا سکے کہ دونوں کے یہاں " عصری تناظر " کے اعتبار سے قدر و معیار کی صورت کیا ہے، ایک نے دوسرے سے یا پھر اپنے زمانے اور شعور سے کیا اخذ کیا ہے، کس کے یہاں کس پہلو سے کوئی اضافہ یا پہلو داری سامنے آئی ہے اور کتنی باتیں صرف طرفگی اور تازگی اسلوب سے تعلق رکھتی ہیں ۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ THOUGHT CONTENT میں کوئی بڑا اختلاف نہ ہو، مسائل و مباحث ایک ہی ہوں لیکن زاویۂ نگاہ میں بنیادی اختلاف ہو یا پھر ایک نے بعض روایتوں یا علامتوں کو بالکل تقلیدی انداز میں برتا ہو اور دوسروں کے یہاں وہی پیش پا افتادہ اور عامتہ الورود تشبیہیں اور استعارے بالکل نئے انداز میں استعمال ہوئے ہوں، ایسے کسی تقابلی مطالعے کے بغیر اکثر تنقیدی نتائج سے باوثوق سطح پر کوئی کام نہیں

یا جا سکتا۔

"تقابلی مطالعے یا موازنے سے مختلف ایک طریق رسائی ہے۔ موازنے میں مقصدیت یا مسابقت پسندانہ ذہنی رویوں کی کارفرمائی ملتی ہے جو تحقیقی نقطۂ نظر، ہمدردانہ تفہیم اور منصفانہ تنقید کی راہ میں بڑی رکاوٹ بنتی ہے۔ تقابلی مطالعے میں غور و فکر ایک گونہ سائنسی زاویۂ نگاہ کے تابع ہوتا ہے۔

نیز تقابلی مطالعے کی حدیں توسیعی مطالعہ سے جا کر مل جاتی ہیں۔ توسیعی مطالعے کے ذریعے یہ جانا جاتا ہے کہ کسی خاص موضوع یا کس پہلو پر اب تک کس نہج اور کن حدود کے ساتھ کوئی کام ہوا ہے اور ہو ابھی ہے یا نہیں۔ اس شکل یا ایسی صورت میں اس موضوع پر قلم اٹھانے کی کوئی ضرورت بھی ہے یا نہیں۔ توسیعی مطالعے کے ضمن میں ایک ضروری بات یہ بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ وسعت کو موضوع کی اپنی مرکزیت اور انتقادی معنویت سے وابستہ رہنی چاہیے تاکہ یہ مطالعہ حقائق کی جستجو اور قوت فیصلہ کی رہنمائی میں کام آئے۔

مطالعہ کی وسعت جہاں فکر کو نئی جہتوں سے آشنا کرتی ہے اور ادبی صداقتوں کی بازیافت میں کام آتی ہے، وہاں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ موضوع زیر بحث اور توسیعی مطالعہ کے مابین واقعاتی رشتہ بہت کمزور پڑ جاتا ہے اور حقیقت سے ہٹ کر اس کی اساس مزعومات پر قائم ہو جاتی ہے، جس سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ تحقیقی تنقید اپنے مقصد سے ناقابل انکار طور پر وابستہ رہے اور معروضی طریق رسائی کو شروع سے آخیر تک پیش نظر رکھا جائے۔ تخیئلی نقش آرائی یا تخلیقی فکر فرمائی کے لیے تحقیقی تنقید میں کوئی گنجائش مشکل سے ہی نکل سکتی ہے۔

تحقیقی تنقید کی ایک اور شرط متن یا موضوع کی تحقیقی بندی سے تعلق رکھتی ہے جس کے تحت یہ پیش نظر رکھنا ہوتا ہے کہ مصنف یا ادیب کا کتنا حصہ کس فکری اسلوب یا طرز اظہار کا پابند ہے۔ نیز یہ کہ جن اشعار، خیالات، یا ذہنی رویوں کو اس سے نسبت دی جاتی ہے وہ اس کے اپنے ہیں بھی یا نہیں اور اگر ہیں تو ان اجزائے فکر کا تعلق اس کے کسی خاص دور زندگی سے ہے یا اس کے یہاں یہ رجحان ایک مستقل قدر کے طور پر ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اس لیے کہ بعض خیالات اور افکار کسی خاص زمانۂ زندگی میں آتے اور پھر پرچھائیوں کی طرح گذر جاتے ہیں، کسی شاعر

کے فن میں ان کے اثر و نفوذ کے دائرے کو بھی اسی نسبت سے محدود ہونا چاہیے۔
اور اگر زمانے کے اقتضا یا اپنے مخصوص میلانِ طبع کے زیر اثر اس کی فکری نہج شروع سے آخیر تک وہی رہی ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا غالب رجحان وہی ہے اور اس کی میزان قدر میں انہیں افکار یا ادبی اسالیب کو اولیت کا درجہ حاصل تھا۔ تحقیقی تنقید میں ان کی یہی حیثیت نمایاں رہے گی اور ان کے مقابلے میں دوسرے پہلو ثانوی یا اس سے فروتر درجات سے متعلق ہوں گے۔ اب کون رنگ یا کون سا آہنگ عصری تنقید کی نگاہ میں کیا رتبہ رکھتا ہے اس سے کسی تحقیقی نقاد کو زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی۔ معیار کی اپنی اہمیت اور زاویۂ نگاہ کی معنویت کے باوصف مقدار سے صرف نظر کرنا تحقیقی تنقید میں جائز نہیں کیونکہ اس کا بہرحال مصنف کی علمی یا تخلیقی فکر سے ناقابل شکست ایک رشتہ ہے اور وہ اسی "جزو" کا ایک "کل" ہے۔
جس طرح شخصیت کے مطالعے میں انسانی کمزوریاں نظر انداز نہیں کی جا سکتیں کہ وہ بھی شخصیت کا لازمی جز ہوتی ہیں اور ان سے انسانی شعور کی پہلو داریوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، اسی طرح فنی کمزوریاں یا خامیاں بھی فنی شخصیت کا حصّہ ہوتی ہیں۔ ایسے تصنیفی حصّوں یا ادب پاروں کے "نشتروں" کے مقابلے میں "تبرکات" کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو کچھ ہے اور جس طرح علمی مطالعے اور تحقیقی تنقید میں اس سے صرف نظر کرنے کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں۔
کسی اچھے فقرے پر کوئی مصنف اپنی کتاب یا کسی عمدہ شعر پر کوئی بڑا شاعر اپنا دیوان دینے کو تیار ہو جائے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا لیکن کسی تحقیقی نقّاد کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ محض کسی ایک اچھے فقرے یا اچھے شعر پر اپنی تنقید کی بنیاد رکھے، اس کے لیے ضروری ہے کہ کتاب میں جو کچھ ہے اس کا سنجیدہ مطالعہ کرے اور اس کے بعد کوئی رائے قائم کرے۔ ہمارے متعدد شعرا کے بارے میں جو تنقیدی رائے قائم کی گئی ہے وہ کچھ شعروں کی حد تک تو صحیح ہے مگر ان کی پوری شاعری کی حد تک صحیح نہیں بلکہ گمراہ کن ہے۔
بعض معروف مصنفوں اور شاعروں کے اقوال یا ادعائی جملے اکثر تنقیدی نقطۂ نظر کو

متاثر کر دیتے ہیں، کسی ایسے قول یا دعوے کو تسلیم کرنے سے پہلے اسے حقائق کی کسوٹی پر پرکھا جانا چاہیے۔ بعض مشہور نقادوں کے "قول محال" کی قسم کے جملے تنقیدی غلط فہمیوں کو عام کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔

تنقید میں زبان کے مسئلے اور لسانی مطالعے کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے، بالخصوص جہاں قدیم متون زیر نظر ہوں وہاں لسانیاتی انداز نظر غیر معمولی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ الفاظ و اسالیب اور ان کے ذیل میں لفظوں کی ترتیب دہی اور فقرات کی استخواں بندی عمل تلفظ و طریق املا، غرضیکہ کسی تصنیف کا لسانیاتی ڈھانچہ اور اس عہد کے ذہنی اور معاشرتی رشتوں کی کھوج میں بڑی مدد دیتا ہے اور متعلقہ تصانیف کے محرکات کو سمجھنے میں بھی۔

تحقیقی تنقید میں متوازن طریق فکر اور محتاط اسلوب اظہار جزو لاینفک کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان میں سب سے پہلی بات لب و لہجہ کا اعتدال ہے اور اس قطعیت سے گریز جسے انگریزی میں SWEEPING REMARKS سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ادب میں ریاضیات کے اصول کارفرما نہیں ہو سکتے، یہاں جو کچھ ہے اس کی نوعیت اضافی ہے اور یہی اضافی نوعیت احتیاط و انضباط کا تقاضا کرتی ہے، اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ کسی بات کو کہنے میں جچا تلا انداز اختیار نہ کیا جائے۔ تنقید میں "تذبذب فی الرائے" دوسری بات ہے اور انتقادی فیصلوں میں ادعائی روش اس سے مختلف ایک صورت ہے۔ تنقیدی تحقیق میں جو بات بھی نقاد کی زبان و قلم پر آئے اس تحقیق کے ساتھ آئے کہ خود زیر بحث متن یا معاصر ادب کے حقائق کے خلاف نہ ہو۔

ڈاکٹر سید محمد عزیز الدین حسین

بدھ دھرم — ایک تاریخی جائزہ

آریوں کے مذہبی عقیدے کی ابتدا قدرت کے مظاہر کی پرستش سے رفتہ رفتہ اس عقیدے کے ماننے والوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ جب وہ پنجاب سے بڑھ کر جمنا کے دائیں کنارے تک آگئے تو کورو دیش (موجودہ ہریانہ) میں یگیہ کا زور ہوا، جس کی ابتدائی شکل یہ تھی کہ گھر میں جلنے والی آگ میں اناج، گھی، اور سوم ڈال کر گھر والے "ہون" کیا کرتے تھے اور گھر کا بزرگ منتر پڑھا کرتا تھا۔ مگر سیاسی اور تہذیبی اثر کے پھیلاؤ اور ترقی، نیز مخالفوں اور دشمنوں کی شکست نے دیوتاؤں کو خوش کرنے کی لگن پیدا کی۔ یہ جذبہ اتنا بڑھا کہ ہر کام کرنے سے پہلے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے یگیہ کئے جانے لگے اور دیوتاؤں کو خوش کرنے اور یگیہ کے کاموں کو انجام دینے کی ذمہ داری جس گروہ نے سنبھالی وہ برہمن کہلانے لگے۔ ملک گیری، تہذیب کا فروغ اور دشمنوں کی سرکوبی کی ذمہ داری جن پر آئی وہ چھتری یا شتری کہلائے۔

آریوں نے کورو دیش سے بڑھ کر جمنا کو پار کر کے دوآبے میں قدم رکھا تو ایسا لگتا ہے جیسے فتح ان کے قدم چوم رہی ہو۔ اس علاقے میں انھیں پھیلنے میں دیر نہ لگی۔ دوآبے کا علاقہ اودھ کی موجودہ حد تک پانچال دیش کہلایا، اور آریا بنارس تک پہونچ گئے۔ پنجاب سے لے کر موجودہ یو۔پی میں جمنا کے شمال کا علاقہ بنارس تک آریوں کے اثر میں آگیا۔ یہ آریوں کا علاقہ تھا، باقی ملک میں مقامی باشندے ابھی تک ڈٹے ہوئے تھے۔

پانچال دیش میں یگیوں کا بڑا زور تھا۔ کسی نے تو اس شدت کو ظاہر کرنے کے لئے یہاں تک

ڈاکٹر سید محمد عزیز الدین حسین، لکچرر شعبۂ تاریخ و تمدن۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

کہا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یگیوں کے دھوئیں سے سارا ملک گھٹ رہا ہو یگیہ اب سیدھی سادی رسم نہیں تھی، اس کا نام "کرم کانڈ" پڑا، پھر اس تقریب کے الجھاؤ کو سلجھانے کے لئے رگ وید جو اصل میں بنیادی وید ہے دو وید اور تصنیف کئے گئے یعنی "سام وید" اور "یجر وید"۔ سام وید نغموں کا وید ہے جو خاص کر سوم یگیہ کی تقریب میں کام آتا تھا اور ان پجاریوں اور پروہتوں کے لئے تھا جو یگیہ میں منتر پڑھتے تھے۔ برہمنوں نے یگیہ سے متعلق سارا مواد جمع کر دیا۔ یگیوں کا زور بڑھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ آریوں کا سیاسی زور گھٹتا نظر آتا ہے۔ مگدھ یعنی جنوبی بہار تک پہنچتے پہنچتے، معلوم ہوتا ہے کہ آریوں میں کمزوری پیدا ہوگئی اور وہ اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس کے برعکس مگدھ کے ان مقامی باشندوں میں نہایت مضبوط اتحاد پیدا ہو گیا جو اپنے آپ کو آریوں کی سیاست اور تہذیب سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

مگدھ کی سرحد پر دو تہذیبیں نظر آتی ہیں، ایک جدید آریائی ویدک تہذیب اور دوسری قدیم مقامی سرمن تہذیب۔ جدید آریائی یا ویدک تہذیب کی پہچان یگیہ سے ہوتی تھی جس کی صورت اب یہ ہوگئی تھی کہ ایک وسیع اور کشادہ مقام پر ایک کے بجائے تین آتش خانے بنائے جاتے۔ قربانی کے لئے قربان گاہیں مخصوص رسموں اور قاعدوں کے مطابق بنائی جاتی تھیں۔ پروہتوں کی بہت بڑی تعداد کو چار ٹولیوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ ہر ٹولی کا ایک صدر ہوتا اور پھر ان سب کا ایک صدر۔ اس کے نیچے سارے پروہت اور پجاری کام کرتے، اس کی ذمہ داری تھی کہ یگیہ کے سارے کام اور رسمیں ٹھیک ٹھیک انجام پائیں۔

ٹولیوں کے صدروں کی ذمہ داری اور کام جدا جدا تھے: ایک "ہوتری" کہلاتا تھا، یہ دیوتاؤں کی تعریف کرتا، قربانی کے لیے لوگوں کو تیار کرتا، سوم یگیہ کی ہر رسم کے لئے اصول مرتب کرتا، رگ وید میں سے اس کے لئے منتر تلاش کرتا اور انھیں پڑھتا۔ دوسرا "اودگاتری" یعنی نغمہ خواں کہلاتا تھا۔ یہ سوم یگیہ کے مختلف موقعوں اور منزلوں پر شروع سے آخر تک نغمے گاتا۔ تیسرا "ادھوریو" کہلاتا تھا۔ یگیہ کے سارے کام یہی کرتا، برابر تھتا اور یگیہ کے فارمولوں کو آہستہ آہستہ پڑھتا رہتا۔ چوتھا برہمن یا اعلیٰ پروہت، عام نگرانی رکھتا اور اس کا خیال رکھتا تھا کہ پجاریوں سے کسی قسم کی کوئی غلطی نہ ہو اور اگر کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو وہ فوراً درست

کر دیتا تھا۔

یگیہ میں سیکڑوں بچھڑے، بیل اور دوسرے جانور قربانی کئے جاتے تھے۔ یگیہ مہینوں اور برسوں چلتا تھا۔ سب سے بڑا یگیہ اشومیدھ (گھوڑے کا) تھا، پھر سوم اور اس کے بعد دوسروں کا نمبر تھا۔ کہتے ہیں کہ یگیہ میں انسان کی قربانی بھی ہوتی تھی، مگر بعد میں یہ رسم ترک کر دی گئی۔

یگیہ کی اہمیت، اور برہمنوں اور پروہتوں کے اقتدار کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یگیہ کے ذریعے پروہت دیوتاؤں کو مجبور کر سکتا تھا کہ وہ اس کی منشا کے مطابق عمل کریں، نیز ان میں دانستہ غلطی کر کے وہ یگیہ کرانے والے کی بربادی کا باعث ہو سکتے تھے۔ یگیہ میں منتروں کے لفظوں سے زیادہ اہم ان کا تلفظ تھا، پروہت چاہتا تو غلط تلفظ کر کے یگیہ کرانے والے کو تباہ کر سکتا تھا۔ یگیہ آریائی تہذیب کا مظہر اور ویدک دھرم کی علامت تھا اور اس تہذیب یا دھرم کا تعلق صرف آریہ نسل سے تھا، اس لئے دوسری نسل سے تعلق رکھنے والوں کے لئے یہ ممنوع تھا، اس کے علاوہ اس کے مصارف اتنے زیادہ تھے کہ ہر کس و ناکس اسے کر بھی نہیں سکتا تھا۔

آریائی تہذیب اور ویدک دھرم سے بالکل مختلف تہذیب شرمنوں کی تھی جو زیادہ تر مگدھ یعنی جنوبی بہار میں آباد تھے۔ سادھوؤں اور سنیاسیوں کے جھنڈ کے جھنڈ لگے رہتے تھے یہ یگیہ کے خلاف اور جانوروں کی قربانی کے خلاف تھے۔ وہ اس کے بھی خلاف تھے کہ جانوروں کو کسی قسم کی تکلیف دی جائے۔ یہ زیادہ تر جنگلوں میں رہتے تھے۔ اور اپنا وقت عبادت اور ریاضت میں گزارتے تھے۔ وہ لوگوں کو کبھی کبھی اپدیش بھی دیا کرتے تھے۔ عوام میں ان کی بڑی عزت تھی۔

کہتے ہیں کہ مہاتما بدھ کے زمانے میں ان شرمنوں کے گروہ تو بہت تھے مگر چھ فرقوں کا ذکر خاص طور سے ملتا ہے یہ (۱) اکریاوادی، (۲) شدھی یا نیتی وادی، (۳) اچھید وادی، (۴) ریتو تیئے وادی، (۵) چتر یام سنور وادی (جین) اور (۶) وک شیپ وادی کہلاتے تھے ان میں پانچویں فرقے یعنی جینیوں کے پہلے گرو "پارشو" منی تھے جنھوں نے جینی دھرم کی ابتدا کی اور اس کے لئے سنگھ (جماعت) بنائی۔

پارشو منی وارانسی (بنارس) میں اشوسین زمیندار کے "واما" نامی بیوی سے پیدا ہوئے

اس وقت زمیندار صرف زمین ہی کا نہیں، ہر چیز کا مالک ہوتا تھا۔ اسے راجا کہتے تھے۔ یارشو منی نے آریا تہذیب اور ویدک دھرم سے بالکل مختلف تہذیب اور دھرم یعنی شرمن تہذیب اور دھرم کو مستحکم کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ تشدد (ہنسا) جھوٹ، چوری اور خواہشوں کے ترک کرنے سے آدمی موکش (وصل) حاصل کر سکتا ہے۔ یارشو منی مہاتما بدھ سے تقریباً ڈھائی سو برس پہلے ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مگدھ اور اس کے آس پاس کا علاقہ ذہنی اور جذباتی طور پر شرمن تہذیب اور دھرم کے لئے تیار ہو چکا تھا جس کی تکمیل گوتم بدھ نے کی۔

جو شرمن فرقے گوتم بدھ کے زمانے میں تھے۔ ان کے عقیدے اور نظریے مندرجہ ذیل تھے:

(۱) اکریاواد: اس سنگھ کا نیتا آچاریہ پورن کشیپ تھا اس کا کہنا تھا کہ کسی نے کچھ کیا یا کرایا، کاٹا یا کٹوایا، تکلیف دی یا دلائی۔ غم کیا یا غم سہا، دکھ دیا یا دکھ برداشت کیا، خود ڈرایا دوسرے کو ڈرایا، جاندار کو مارا، چوری کی، کسی کی عزت لوٹی، جھوٹ بولا، پھر بھی کوئی گناہ نہیں۔ تیز دھار کے ہتھیار سے مار کر کسی کو ہلاک کر دے پھر بھی کوئی گناہ نہیں .... گنگا کے شمالی کنارے پر جا کر بھی کوئی خیرات کرے یا کرائے، یگیہ کرے یا کروائے تو بھی ثواب نہیں، خیرات کرنے، عبادت کرنے یا دوسرے قسم کے نیک کام کرنے سے کوئی ثواب حاصل نہیں ہوتا۔

(۲) سنسار شدھی یا (نیتی واد): ۔ اس فرقے کا نیتا آچاریہ مکھلی گوسال تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر کسی انسان میں کوئی خامی یا عیب ہو تو اس کا کوئی خاص مقصد یا سبب نہیں ہوتا۔ یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ انسان میں اپنی ذاتی کوئی طاقت ہوتی ہے یا برائیوں سے بچنا اس کے اختیار میں ہے، انسان میں تمام تبدیلیاں حالات اور ماحول کی وجہ سے آتی ہیں۔ عقل مند اور بیوقوف، سب ہی کے دکھوں کا خاتمہ اسی لاکھ کے مہاکلپوں کے پھیر میں ہو کر گزرنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔

(۳) اچھیدواد: اس سنگھ کا نیتا کیس کمبلی تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ خیرات، یگیہ، ہوم یہ سب بے کار ہیں۔ بھلے برے کرموں کا پھل کچھ نہیں ملتا نہ لوک ہے نہ پرلوک۔ انسان چار عناصر خاک، پانی، آگ اور ہوا سے بنا ہے، جب وہ مرتا ہے تو خاک، خاک میں، پانی، پانی میں، آگ، آگ میں، اور ہوا، ہوا میں مل جاتی ہے۔ خیرات کا پاگل پن احمقوں نے پیدا کیا ہے۔

جو خدا پرستی کی بات کرتے ہیں وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ عقل مندوں کی ذہانت اور بے وقوفوں کی بے عقلی دونوں مرنے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ اور کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔

(۴) انیو پیئے واد: اس کا بیتا یکدھ کاتیان تھا۔ اس کا قول تھا کہ زندگی نام ہے سات چیزوں کا: خاک، پانی، آگ، ہوا، سکھ، دکھ اور جان۔ یہ خود بخود وجود میں آئی ہیں، ان کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں ہے۔ یہ مستقل ہیں اور ستون کی طرح بے حرکت ہیں۔ وہ ہلتی نہیں، بدلتی نہیں، آپس میں ٹکراتی نہیں، ایک دوسرے کو سکھ اور دکھ پہنچانے کے لائق نہیں۔ ان میں مارنے والا، سننے والا، کہنے والا، جاننے والا، جتانے والا، کوئی نہیں۔ جو ہتھیار سے دوسروں کا سر کاٹتا ہے وہ خون نہیں کرتا۔

(۵) چتر یام سنور واد: (جین فرقہ) اس کا بیتا نگنتھ ناتھ پت تھا۔ وہ تشدد، جھوٹ، چوری اور ذخیرہ اندوزی کے ترک کرنے کی تعلیم دیتا تھا۔

(۶) وک شیپ واد: اس سنگھ کا بیتا سنجے بیلٹھ پت تھا، اس کا کہنا تھا کہ نہ میں یہ کہتا ہوں کہ پرلوک ہے اور نہ یہ کہتا ہوں کہ پرلوک نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ برے کرموں کا پھل ملتا ہے، نہ یہ معلوم کہ نہیں ملتا ہے۔ اسی طرح تتھاگت مرنے کے بعد رہتا ہے یا نہیں، یہ میں نہیں جانتا، وہ رہتا ہے یہ بھی نہیں۔ وہ نہیں رہتا ہے، یہ بھی نہیں۔

کورو، پانچال دیش میں آریا حکمراں " پرکشت " اور " جن جیے " آریا تہذیب اور ویدک دھرم کو فروغ دے رہے تھے۔ اسی وقت پارشومنی مگدھ کے علاقے میں شرمن تہذیب اور شرمن دھرم کا جھنڈا بلند کر رہے تھے جس نے آریا تہذیب اور ویدک دھرم کی توسیع کو روک دیا۔

گوتم بدھ، شاکیہ چھتریوں کے خاندان میں پیدا ہوئے جن کی زمینداری کوسل علاقے کے شمال میں تھی، ان کے باپ شدودھن کو اس وقت کے رواج کے مطابق راجا کہتے تھے۔ کپل وستو اُن کی راجدھانی تھی مگر گوتم بدھ لمبنی میں پیدا ہوئے۔ ہوا یہ کہ ان کی ماں مایا دیوی اس زمانے کے رواج کے مطابق زچگی کے لیے اپنے میکے جا رہی تھیں اور ابھی کپل وستو سے چودہ پندرہ میل کے فاصلے پر تھیں کہ ولادت ہو گئی۔ سنہ ولادت میں اختلاف ہے مگر ۵۶۳ قبل مسیح

عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کا نام گوتم رکھا گیا۔ کہتے ہیں ان کا نام سدھارتھ بھی تھا۔ گوتم کی پیدائش کے ایک ہفتہ بعد ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور ان کی پرورش پرجاپتی گوتمی نے کی جو اُن کی خالہ بھی تھیں اور سوتیلی ماں بھی۔

گوتم کی پرورش ناز و نعم میں ہوئی لیکن یہ ناز و نعم اس دور کے مطابق اور والدین کی حیثیت کے مواقف تھا۔ شدودھن خود بھی ہل چلاتے تھے اور اکثر گوتم کو ساتھ لے جاتے تھے مگر عام طور پر کتابوں میں ان کے لڑکپن کے قصے اور پرورش کی داستانیں مبالغہ آمیز اور جذبات عقیدت سے پُر ہیں۔ ان کا انداز کچھ اس قسم کا ہے:

"مہاتما بدھ، بھکشوؤں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ: میں بہت نازک تھا، میری تفریح کے لیے میرے والد نے تالاب کھدوا کر مختلف قسم کے کنول لگائے تھے۔ میرا لباس ریشمی ہوتا تھا، میں جب باہر نکلتا تھا تو ملازم میرے اوپر چھتر سایہ کرتے تھے کہ مجھے گرمی یا سردی سے تکلیف نہ ہو۔ سردی، گرمی اور برسات کے لیے میرے الگ الگ تین محل تھے، جب میں برسات کے محل میں قیام کرتا تو چار مہینے باہر نہ نکلتا اور عورتوں کے گانے بجانے میں وقت گزارتا۔ دوسروں کے ہاں نوکروں اور غلاموں کو گھٹیا کھانا دیا جاتا تھا مگر میرے ہاں نوکروں اور غلاموں کو گوشت اور اچھی غذا دی جاتی تھی (انگتر نکائے)

گوتم کی زندگی عیش و آرام میں بسر ہوتی رہی، مگدھ کی فضا شرمن تہذیب سے رچی ہوئی تھی شاید اسی لیے گوتم جب اپنے والدین کے ساتھ کھیت پر جاتے تو اکثر پیڑ کے نیچے پہلا سمادھی لگاتے تھے۔ جس طرح ان کے رہن سہن کے متعلق داستانیں لکھی گئیں، اسی طرح ان کے سنیاس لینے کے متعلق کہانیاں تیار ہوئیں جن میں بڑھاپا، بیماری اور موت کا ذکر ہے۔ ان کی مشہور کہانی جب وہ بیوی اور بیٹے کو سوتا چھوڑ کر راتوں رات گھر سے نکل گئے تھے کچھ اس طرح ہے: گوتم رتھ میں بیٹھ کر تفریح کو جا رہے تھے کہ انھیں راستے میں ایک بوڑھا ملا، جسے دیکھ کر انھیں خیال ہوا کہ زندگی کے ساتھ بڑھاپا تو آتا ہی ہے جس سے سب انسانوں کو واسطہ پڑتا ہے اور خود انھیں بھی پڑے گا، اس خیال سے وہ بہت مغموم ہوئے اور گھر لوٹ آئے۔ یہ واقعہ تین بار پیش آیا، پہلی مرتبہ ایک بوڑھا ملا، اس کے بعد ایک بیمار تیسری بار ایک مردہ۔ ان واقعات نے گوتم کے

دل پر اثر کیا اور دنیا انھیں ہیچ نظر آنے لگی۔ آخری مرتبہ وہ تفریح کے لیے نکلے تو ایک سنیاسی نظر پڑا، اسے دیکھ کر سنیاس کا خیال آیا اور انھوں نے سنیاس لے لیا۔

پنڈت دھرمانند کوسمبی، بودھ ادب اور دھرم کے مانتے ہوئے عالم تھے انھوں نے "ہن یان" فرقے کے ادب سے مہاتما بدھ کی زندگی اور بودھ دھرم کے متعلق بڑی تحقیق اور تلاش سے حقیقت تک پہونچنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "اس میں شبہ نہیں کہ بڑھاپا بیماری اور موت کا خیال بودھی ستو کے دل میں بار بار آتا تھا مگر وہ ان کے بیراگ کی خاص وجہ نہ تھی۔ بیراگ کا شدید احساس انھیں یہ دیکھ کر ہوا کہ بڑھاپے، بیماری اور موت میں پھنسے ہوئے لوگ ایک دوسرے پر عیب لگا کر آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں۔"

دوسری جگہ گوتم کی اس وقت کے حالات سے بے اطمینانی اور بیزاری کو یوں بیان کیا گیا ہے: "بھکشو ان کہتے ہیں کہ جس طرح بغیر پانی کے مچھلیاں تڑپتی ہیں اسی طرح دوسروں کی مخالفت کر کے بے چین ہونے والے عوام کو دیکھ کر میرے دل میں خوف پیدا ہوا، دنیا لغو معلوم ہونے لگی اور یہ دیکھ کر کہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف ہیں میرا دل تڑپ گیا۔"

اس بیان میں گوتم کے ذہن اور جذبات کی اس کیفیت کی عکاسی ہے جو ماحول اور سماج کے حالات کی بنا پر اس وقت ان پر طاری تھی یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اس وقت بہت سے چھتری بھی گھر چھوڑ کر سنیاسی بن رہے تھے۔ وردھمن مہاویر، پارشومنی، آڈار کالام اور اُدرک راج پتر چھتری ہی تھے جن سے گوتم نے معرفت کی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔

بہرحال گوتم کے مشاہدے اور مراقبے نے انھیں انسانی سماج کے دکھوں، دقتوں، تکلیفوں کو دور کرنے کی راہ پر لگایا۔ زندگی مصائب سے بھری ہوئی ہے اور انسان انھیں دور کرنے اور ان سے نجات حاصل کرنے کے بجائے ان میں اضافہ کرتا ہے اور دوسروں سے لڑ جھگڑ کر انھیں بڑھاتا ہے۔ گوتم کے ماحول میں شاکیوں اور کولیوں میں چشمے کے پانی پر آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ گوتم کی حساس طبیعت انھیں ان مسائل کو حل کرنے پر اکساتی رہتی تھی۔ ان کی شادی ہوئی۔ اس کے بعد ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام "راہل" رکھا گیا۔ لیکن جو چبھن ان کے دل میں پیدا ہو چکی تھی وہ بدستور باقی رہی۔ اس سے آخرکار

مجبور ہو کر گھر بار چھوڑ دیا۔ اس کی بھی بہت سی داستانیں لکھی گئی ہیں۔ بدھ متیوں کی ایک پرانی کتاب کے مطابق خود گوتم بدھ نے اپنے بچپن کے بارے میں کچھ باتیں بتائی ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

"بھکشوؤ! میں بڑے پیار سے، بڑی محبت سے، بے انتہا محبت سے پالا گیا۔ میرے والد کے گھر میں میرے لیے کنول کے پھول تالابوں میں لگائے گئے، ایک تالاب میں نیلے پھول ہوتے، ایک تالاب میں سفید، ایک تالاب میں گلابی پھول، ان سب کا کھلنا میرے لیے تھا۔ اور بھکشو! میرے لیے خوشبو کی چیزیں خاص طور پر بنارس سے منگوائی جاتیں، میری پوشاک کے تینوں حصے بنارسی کپڑے کے ہوتے۔ سردی گرمی، گرد و غبار اور خس و خاشاک کی تکلیف سے بچانے کے لیے میرے اوپر ہر وقت ایک سفید چھتری لگی رہتی۔ میرے رہنے کے لیے تین محل تھے، ایک جاڑوں میں رہنے کے لیے، ایک گرمیوں اور ایک برسات کے لیے۔ برسات کے محل میں چار مہینے تک گانے والی عورتیں مجھے گھیرے رہتیں اور میں محل کے باہر نکلتا ہی نہ تھا۔ بھکشوؤ! دوسرے گھرانے میں نوکروں اور غلاموں کو لال چاول اور لال چاول کی پیچ کھانے کو دی جاتی تھی، میرے یہاں نوکروں اور غلاموں کو چاول ہی نہیں بلکہ چاول اور گوشت کھانے کو ملتا تھا۔"[۳۵]

گوتم کے زمانے میں تناسخ (آواگون) پر عام طور پر لوگوں کا عقیدہ تھا، اسی عقیدے کو گوتم نے بھی اختیار کیا۔ اور نروان کی تلاش میں لگ گئے۔ جب انھوں نے گھر چھوڑا تو اُن کی عمر ۲۹ سال کی تھی۔ سنیاس لے کر وہ ویشالی گئے اور آڈار کالام کے چیلے بن کر "یوک مارگ" کی مشق شروع کر دی۔ دل کو تسلی نہ ہوئی تو "ادرک رام پتر" کے پاس پہنچے مگر زیادہ دن یہاں بھی نہ رک سکے۔ راج گرڈھ کے مشہور شرمن گروسے کچھ حاصل کرنے کا فیصلہ کیا لیکن ذہن جس چیز کو ڈھونڈ رہا تھا اور طبیعت جس کی متلاشی تھی وہ انھیں سادھوؤں اور شرمنوں میں نہ ملی۔

گوتم نے اب کسی اور کی رہنمائی کے بغیر خود اپنے طور پر حق کی تلاش کا فیصلہ کیا اور "اروویلا"

میں ریاضت اور عبادت میں لگ گئے۔ اور تپسیا اور نفس کشی کی مثال قائم کردی، ان کے اس جوش اور خلوص کو دیکھ کر اور اس سے متأثر ہو کر پانچ راہب ان کے چیلے بن گئے، لیکن کچھ عرصے کے بعد گوتم اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ تپسیا اور ریاضت بھی محض ایک ذریعہ ہے، منزل مقصود نہیں تو انھوں نے یہ بات اپنے چیلوں سے بھی کہہ دی۔ ان کے چیلوں نے یہ سمجھ کر اپنے گرو کا ساتھ چھوڑ دیا کہ وہ نفس کشی اور تپسیا سے گھبرا کر اصل راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ ان چیلوں کے الگ ہو جانے کی وجہ سے گوتم کو بہت افسوس ہوا اور بقول پروفیسر محمد مجیب: "مایوسی کے عالم میں بھٹکتے ہوئے وہ اُرو ویلا پہنچے اور یہاں وہ ایک درخت کے نیچے مراقبے میں بیٹھے تھے جب ان پر وہ کیفیت طاری ہوئی جس کے بعد انھوں نے کہا کہ میں بدھ ہو گیا ہوں اور اس کا ارادہ کیا: "اس دنیا کی تاریکی میں ابدی حقیقت کا ڈنکا بجاؤں گا۔"؎

مہاتما بدھ کو جو گیان حاصل ہوا تھا اسے چار صداقتوں یا حقیقتوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

" دکھ کا سبب، دکھ کا استیصال، دکھ کے استیصال کا طریقہ پیدا ہونا دکھ ہے، جن چیزوں سے ہمیں محبت ہو ان کا موجود نہ ہونا دکھ ہے، جو کچھ ہم اپنے لیے چاہتے ہوں اس کا نہ ملنا دکھ ہے۔ گویا پہلی حقیقت (صداقت) جسے انسان کو ذہن نشین کر لینا چاہیے وہ یہ ہے کہ زندگی سراسر دکھ ہے۔ اگر اس میں اتنی توفیق ہے کہ وہ آپ بیتی اور جگ بیتی سے یہ سبق حاصل کر سکے تو پھر وہ سوچے گا کہ دکھ کا سبب کیا ہے۔ گوتم بدھ نے بتایا کہ دکھ کا سبب وہ خواہشیں اور میلانات ہیں جو انسان کو بار بار گھسیٹ کر اس دنیا میں لے آتے ہیں جو اسے لطف اندوزی کی فکر میں سرگرداں رکھتے ہیں اور زندہ رہنے اور بہتر سے بہتر زندگی گزارنے کے غیر شعوری ارادے کو پختہ کرتے رہتے ہیں۔ ہر برائی کی جڑ نا واقفیت ہے۔ انسان کو دکھ کی ہمہ گیر حقیقت کا علم نہیں ہوتا، اس لیے کہ اس کے اندر زندگی کی تشکیل کرنے والے میلانات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ان کی وجہ سے وہ بار بار جنم لیتا ہے اور رنج، زوال اور موت کے پھندے میں پھنسا رہتا ہے۔ دکھ کا استیصال ہو سکتا ہے۔ اگر انسان

کو اس حقیقت کا علم ہو جائے کہ زندگی ایک حالت پر قائم نہیں رہتی، یہ نام ہے بننے، بن کر مٹ جانے اور پھر بننے کے ایک عمل کا جو معلوم نہیں کب اور کیسے شروع ہوا اور کب ختم ہوگا۔ یہ عمل جاری ہے اور انسان خود بھی اسے جاری رکھتا ہے، اس لیے خود ہی اپنے دکھ درد کا سامان پیدا کرتا ہے۔ لیکن وہ دکھ کا استیصال کر سکتا ہے اگر وہ اپنے دل سے ان میلانات کو نکال دے جو اس کے وجود کے سلسلے کی پہلی کڑیاں ہیں اور ان کڑیوں کو توڑ کر اپنے اندر سکون اور بے تعلقی کی ایسی کیفیت پیدا کرلے کہ وجود کو قائم رکھنے والی قوتوں میں سے کوئی بھی عمل میں نہ آسکے یہ مقصد آٹھ اصولوں پر عمل کرنے سے حاصل ہوگا۔ جو دکھ کے استیصال کا ذریعہ ہیں اور یہ صحیح طریقے پر برتے گئے تو انسان کو نروان نصیب ہوگا۔ یہ اصول ہیں: خیالات کا صحیح ہونا، قول کا صحیح ہونا، عمل کا صحیح ہونا، ذریعۂ معاش کا صحیح ہونا، جد و جہد کا صحیح ہونا، ذہن کا صحیح ہونا، ذہن کا صحیح باتوں میں مشغول اور منہمک رہنا اور دھیان کا صحیح ہونا۔" ۵ھ

دو حدوں کی انتہا تک نہ جانا، یعنی محض عیش و عشرت، اور محض تپسیا اور فاقہ کشی کے درمیان راہ پیدا کرنا۔ یہ مہاتما بدھ کا "مدھیم مارگ" ہے۔ جب مہاتما بدھ نے اپنے نظریے کی تبلیغ کا فیصلہ کیا تو اس کے لیے انھوں نے اپنے پہلے ان پانچ ساتھیوں کو ہمنوا بنانے کا ارادہ کیا جو انھیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ گیان حاصل ہونے کے تقریباً دو مہینے کے بعد اساڑھ کی پورنماشی سے پہلے مہاتما بدھ وارانسی پہونچے۔ یہ اس زمانے میں سنیاسیوں اور شرمنوں کا مرکز تھا۔ وہاں پہنچ کر مہاتما بدھ نے ایک تقریر کی جس میں انھوں نے کہا: غم پہلی بنیادی صداقت ہے کہ پیدائش غم کا باعث ہے، بیماری غم کا باعث ہے، بڑھاپا غم کا باعث ہے، موت غم کا باعث ہے، عزیزوں کی جدائی اور غیروں کی محبت غم کا باعث ہے، پسندیدہ چیز کے نہ ملنے سے بھی غم ہوتا ہے، یہ پانچ ایسی باتیں ہیں جو غم کا سبب بنتی ہیں۔

دھرم کا چکر پرورتن کے وعظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تتھاگت کے وقت میں ایک طرف "کرم کانڈ" یعنی یگیوں کا سماج تھا جس میں یگیہ کرانے کے بعد آدمی کو پوری چھوٹ

تھی کہ من مانی کرتا ہے۔ یہی گروہ عیش پرست تھا۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو بدن کو اس لیے اذیت پہنچاتے تھے کہ وہ عیش وعشرت کا خواہش مند ہے۔ ان کے درمیان تتھاگت نے انتہا سے بچ کر راہ نکالی جس سے انسانی غموں کا انسداد ہو سکتا تھا۔ اس میں آرام کو بھی جگہ دی گئی تھی اور ریاضت و صفائی کو بھی۔ اس وقت زندگی میں توازن پیدا ہونا ایک بڑی بات تھی۔

ان پانچ بھکشوؤں کو لے کر گوتم بدھ نے اپنا سنگھ بنایا جو مقبول بھی ہوا۔ جس چیز نے اسے مقبول بنایا وہ اس کا توازن تھا، نہ بالکل دنیا داری نہ بالکل دنیا سے بیزاری، نہ کڑی تپسیا اور فاقہ، نہ محض عیش وعشرت۔ اس نے لوگوں کے دلوں پر اثر کیا۔ وہ شرمنوں کی طرح محض روح اور خالق کی تلاش میں نہ تھے، ان کے سامنے انسان اور سماج کے مسائل تھے، انھیں کو حل کرنے کی انھوں نے کوشش کی۔ اگر کسی نے ان کے متعلق سوال کیا بھی تو انھوں نے یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ روح اور خالق مطلق ہے یا نہیں ان کے وجود اور عدم سے اصل مسئلے پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس لیے بہتر یہ ہے کہ انسان اصل مسئلے کو حل کرنے کی کوشش میں لگ جائے اور یوں تتھاگت نے ذہنی موشگافیوں اور عقلی قلابازیوں سے آدمی کو بچا کر عمل کی راہ پر لگا دیا۔ "کرم" ان کے نظریے کی جان تھا اور ان کے خیال میں زندگی عمل سے بنتی اور بگڑتی تھی، اس میں جنت اور دوزخ کی جگہ نہ تھی اس زمانے کو دیکھتے ہوئے مہاتما بدھ کا بہت بڑا انقلابی قدم یہ بھی تھا کہ اللہ کے دھرم کے معاملے کسی پر کسی لحاظ سے بند نہ تھے۔

جب بودھ سنگھ قائم ہوا تو اس میں چھوٹے، بڑے، امیر، غریب، پڑھے، بے پڑھے، سب آگئے۔ آریا تہذیب یا ویدک دھرم کی بنیاد ایک مخصوص نسل پر تھی اس لیے یہ سب کے لیے نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا غیر نسلوں کو اس میں جگہ نہیں مل سکتی تھی۔ تتھاگت کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے اپنی تہذیب اور دھرم کو عالمی اور آفاقی بنانے کے لیے اس کے دروازے سب کے لیے کھول دیئے۔ چنانچہ اس وقت اس میں برہمن، چھتری اور ویش آئے تو شودروں کو بھی داخلہ ملا۔ یہ اس وقت کا بہت بڑا انقلاب تھا جو اس ملک میں ہوا۔ شودروں نے اس دھرم میں آکر ایسا نام پیدا کیا اور وہ عزت حاصل کی جو کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ "اپالی" کو بودھ "ونئے" (ہدایات) میں سب سے اونچا اور ممتاز مقام حاصل تھا۔ اس طرح "سونیتا" کا مرتبہ بھی بہت بلند تھا۔

اور دونوں شودر تھے۔

گوتم بدھ نے سماج کی اصلاح اور انسانوں کی فلاح کی کوشش کی تھی، انھوں نے نہ کسی الوہی فلسفے کی بنیاد ڈالی اور نہ عبادت اور پوجا پاٹ کی طرف توجہ دی، ان کا زور عمل اور دھیان سمادھی پر تھا۔ ایک بات ضرور تھی کہ نروان صرف سنیاس لینے والوں کو ہی حاصل ہو سکتا تھا۔

تتھاگت نے اپنے چیلوں کو ہدایت کی کہ وہ عوام کی فلاح اور بہبود کے لیے دنیا کے کونے کونے میں پھیل جائیں۔ فلاح عام اور مفاد عوام کی یہ آواز دنیا نے پہلی بار سنی جو بھارت سے اٹھی تھی۔ بھکشوؤں کے لیے ایسے اخلاقی اصول مرتب کیے گئے تھے جن پر عوام بھی بغیر سنیاس لیے عمل کر کے اپنی فلاح کی کوشش کر سکتے تھے۔ ان اصولوں کو "پاتی موکھ" کہا گیا ہے۔ یہ کھانے پینے، رہن سہن، اور ایک دوسرے سے میل ملاپ، بات چیت میں احتیاط سے متعلق تھی۔ بدھ شرمنوں (بھکشوؤں) کو سادہ زندگی بسر کرنے کی تلقین کی گئی تھی۔ عام طور پر ان کے پاس پہننے کے تین لبادے، کشکول، چھوٹی کلہاڑی، سوئی، کمربند اور پانی چھاننے کا کپڑا ہوتے تھے۔ چیزوں کے استعمال میں بھکشوؤں کو بار بار یاد دلایا گیا ہے کہ وہ ہر چیز کی افادیت کو ذہن میں رکھیں۔ چنانچہ جب وہ لبادہ پہنتے تھے یا کھانا کھاتے تھے یا کوئی دوا استعمال کرتے تھے تو انھیں یہ کہنا پڑتا تھا کہ میں یہ چیزیں اس لیے استعمال میں لا رہا ہوں تاکہ ان سے ستر پوشی ہو یا جسم تندرست رہے یا گرمی، سردی، مچھر، مکھی، ٹھنڈی ہوا، سخت دھوپ اور سانپ وغیرہ سے میں محفوظ رہوں۔

بدھ مت کو، مردوں کی طرح عورتوں نے بھی بہت بڑی تعداد میں قبول کیا تھا مگر شروع شروع میں ان کو بدھ سنگھ میں داخل نہیں کیا گیا تھا اور نہ گھر بار چھوڑ کر، مردوں کی طرح، بھکشو بننے کی اجازت دی گئی تھی۔ بعض لوگوں کو یہ صورت حال عجیب معلوم ہوتی تھی، وہ سوچتے تھے کہ عورتوں کو بھی اپنی نجات کے لیے اور سنگھ میں ممتاز مقام حاصل کرنے کے لیے، وہ سب کچھ کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے جو مردوں کو حاصل ہے۔ ممکن ہے کہ اس احساس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ جین سنگھ میں عورتوں کو بھکشو بننے اور جینی تعلیمات کو پھیلانے اور

جین مذہب کی تبلیغ کی اسی طرح اجازت تھی جس طرح مردوں کو حاصل تھی ۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس مسئلے پر مہاتما بدھ اور ان کے ممتاز چیلے آنند کے درمیان ایک مکالمہ ہوا، اور اس کے بعد مہاتما بدھ نے عورتوں کے لیے ایک الگ سنگھ بنانے کی اجازت دے دی، اس کی تفصیل پروفیسر محمد مجیب کی زبانی سنئے :

" معلوم ہوتا ہے گوتم بدھ کے زمانے میں عورتوں پر کسی قسم کی پابندیاں نہیں تھیں اور وہ زندگی کے تمام مشاغل میں شریک ہو سکتی تھیں۔ بعد کو بدھ متیوں میں بھی عورت ذات کے متعلق حقارت آمیز باتیں کہی جانے لگیں، وہ بھی عورت کی "دو انگل چوڑی عقل" اور اس کی گہری چالوں کی شکایت کرنے لگے لیکن گوتم بدھ کا اپنا رویہ سراسر معقولیت پر منحصر تھا۔ عورتیں ان کے دھرم کو بڑی تعداد میں قبول کرتی تھیں، مگر کسی کو گھر بار چھوڑ کر بھگشنی بننے کی دعوت نہیں دی گئی۔ جب گوتم بدھ سے پہلی مرتبہ عورتوں کا سنگھ قائم کرنے کی درخواست کی گئی تو انھوں نے انکار کیا، لیکن آخر کو ان کے چیلے آنند نے اصولی بحث چھیڑی اور پوچھا کہ آپ کے خیال میں عورتیں اس قابل نہیں ہیں کہ راہبوں کی زندگی بسر کر سکیں، کیا تہذیب نفس اور نروان اُن کے لیے ممکن نہیں، تو وہ مجبور ہو گئے اور اپنی سوتیلی ماں مہا پجا پتی کو، جنھوں نے یہ سوال اٹھایا تھا، عورتوں کا سنگھ قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے لیے قواعد زیادہ سخت تھے اور ان کی حیثیت ہر لحاظ سے کم قرار دی گئی، انھیں انفرادی طور پر دورہ کرنے یا اکیلے رہنے کی اجازت نہیں تھی، وہ بستیوں کے اندر ہی رہ سکتی تھیں، میل جول پر بھی بڑی پابندیاں تھیں لیکن یہ پابندیاں عورتوں ہی کے لیے نہیں تھیں۔ گوتم بدھ سے ان کے چیلے آنند کا یہ دلچسپ مکالمہ ہوا:

" حضور، ہمیں عورتوں کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے ؟"

" اس طرح آنند ! کہ جیسے تم انھیں دیکھتے ہی نہیں "

" اور اگر ہم انھیں دیکھ لیں تو کیا کرنا چاہیے ؟ "

"ان سے باتیں نہ کرو۔"

"لیکن حضور، وہ خود ہی ہم سے باتیں کریں تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"

"تب آنند! ہوشیار رہو۔"[۶]

بدھ مذہب کی تعلیمات کا نچوڑ دس احکامات کی شکل میں ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہیں:

(۱) کسی جاندار کو نہ مارو (۲) چوری نہ کرو (۳) زنا نہ کرو (۴) جھوٹ نہ بولو (۵) کسی کو بُرا نہ کہو (۶) قسم نہ کھاؤ (۷) فضول گفتگو نہ کرو (۸) کسی پر غصہ نہ کرو (۹) نشہ کی کوئی چیز استعمال نہ کرو (۱۰) توہمات سے بچو یعنی بھوت پریت اور دیوی دیوتا کو نہ مانو۔

مہاتما بدھ نے پانچ پیشوں کو اختیار کرنے سے سختی سے منع کیا تھا:- (۱) ہتھیار بیچنا (۲) لونڈی غلام بیچنا (۳) گوشت بیچنا (۴) زہر بیچنا[۷]

بدھ مذہب کی یہ وہ تعلیمات اور اخلاقی اصول ہیں جن کی حیثیت عالمگیر ہے اور تمام مذاہب میں ان کی اہمیت کو یکساں طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔

(باقی آئندہ)

حواشی اور حوالہ جات:

(۱) تلاش معرفت کے زمانے میں گوتم کو اسی نام سے یاد کیا جاتا تھا، مگر بعد میں یہ لفظ ہر اس شخص کے لئے استعمال کیا جانے لگا جو ریاضت کے بعد بدھ کا مرتبہ حاصل کرنے کا آرزومند ہو۔

(۲) بھکشو، فقیر الفاظ اور جملوں کی تکرار بدھ مت کی کتابوں کی خصوصیت ہے (پروفیسر محمد مجیب: تاریخ تمدن ہند، اگست ۱۹۷۲ء، صفحہ ۸۵

(۳) ایضاً، ص ۸۶

(۴) ایضاً، ″ ۸۷

(۵) ایضاً، ″ ۸۸

(۶) ایضاً ″ ۹۵

(۷) منشی امیر احمد علوی: گوتم بدھ، اگست ۱۹۳۴ء، ص ۲۷

شوکت نہال

مرزا محمد خان قزوینی

(ایک تعارف)

انسانی تہذیب وتمدن کے مطالعہ کے وقت سیکڑوں افراد کے نام ایسے ملیں گے جنہوں نے انسانی زندگی کے کسی نہ کسی شعبے میں شہرت حاصل کی اور اپنی شخصیت اور ذاتی قابلیت کی بنا پر اپنا نام ہمیشہ کے لیے جریدۂ عالم پر ثبت کر دیا۔ ایسی ہی اہم شخصیتوں میں مرزا محمد خان بن عبدالوہاب قزوینی کا شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی کدوکاوش سے تحقیق کی دنیا میں شاندار کامیابی اور شہرت حاصل کی۔ مرزا محمد ان فاضلوں میں سے ہیں جن کی تمام تحریروں کو مستند اور معیاری قرار دیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی ہمہ گیر تحقیق سے ان عقدوں کو حل کیا جن کو دوسرے حل کرنے سے قاصر تھے۔ اسی سبب سے تاریخ ادب میں وہ ایک بڑے نقاد اور عظیم محقق کی حیثیت مشہور ہوئے، ان کا کام زیادہ تر تحقیق زبان اور تحقیق واقعات سے متعلق ہے۔ مرزا کو عربی اور فارسی پر عبور حاصل تھا۔ انھوں نے جس کتاب کی تصحیح کا ذمہ لیا یا جس مسئلے کی تحقیق کا کام شروع کیا اس کو بڑی محنت اور جانفشانی سے سرانجام دیا۔ پروفیسر ایڈورڈ براؤن کا خیال ہے کہ شروع شروع میں جتنی تحقیق ہو سکے اس کو شائع کر دیا جائے اور مزید اصلاح وتصحیح کا کام مستقبل کے محقق کے لیے چھوڑ دیا جائے، لیکن مرزا محمد نے اس کے برخلاف یہ کوشش کی کہ جب تک خود اپنے آپ کو اطمینان نہ ہو جائے، کسی مقالے یا کتاب کو شائع کرنا مناسب نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تحقیقی مضامین کا معیار بہت بلند ہے۔

محترمہ شوکت نہال، ریسرچ اسکالر فارسی، شعبۂ اسلامک اینڈ عرب ایرانین اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

مرزا محمد خاں کی زندگی کا بیشتر حصہ ایران سے باہر یورپ میں گزرا اور وہیں پر یورپین طرز تحقیق کا انھوں نے غایر مطالعہ کیا اور بعد میں اسے اپنا لیا۔ ان کے تحقیقی کام پر نظر ڈالنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ان کے حالات زندگی پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

مرزا محمد قزوینی ۱۲۹۴ ہجری قمری مطابق ۱۸۷۷ء میں تہران میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرزا عبد الوہاب قزوینی جو خود اپنے زمانے کے فاضل علما میں شمار کیے جاتے تھے، مدرسہ دوست علی خاں معیر الممالک میں استاد تھے۔ نامۂ دانشوران کی تالیف میں انھوں نے کافی حصہ لیا اور ادب، لغت، صرف ونحو اور فقہ کے علماء وغیرہ کے حالات زندگی کتاب میں شامل کئے۔ مرزا محمد نے ابتدائی تعلیم تہران ہی میں اپنے والد عبد الوہاب قزوینی اور مرحوم آقای حاجی سیّد مصطفی کی خدمت میں حاصل کی۔ ۱۳۰۴ ہجری قمری مطابق ۱۸۸۶ء میں والد کی وفات کے بعد شمس العلماء شیخ محمد مہدی اور دیگر علماء کی سرپرستی میں کسب فیض کیا۔ مرزا نے اپنی ذاتی استعداد و محنت کی بنا پر جوانی ہی میں علوم قدیمہ اور خاص طور پر لغت وادب اور اشعار عرب پر کافی دستگاہ حاصل کر لی ساتھ ہی ساتھ شیخ ہادی نجم آبادی، سعید احمد ادیب پیشاوری، مرزا محمد حسین ذکاء الملک، حاجی شیخ فضل اللہ نوری، جیسی متبحر شخصیتوں سے فیض حاصل کر کے اپنے مطالعہ اور ذوق تحقیق میں اضافہ کیا۔ مرزا محمد قزوینی کے اخراجات کا واحد ذریعہ وہ وظیفہ تھا جو اُن کے والد کو ناصر شاہ کے زمانے سے دار التالیف اور دار الترجمہ کے خدمات کی وجہ سے ملتا تھا، ساتھ ہی کچھ طالب علموں کو عربی بھی پڑھاتے تھے، نیز روزنامہ "تربیت" کے لیے عربی زبان سے ترجمہ بھی کرتے تھے۔

۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء میں مرزا محمد اپنے بھائی احمد خان قزوینی کی خواہش پر لندن گئے جہاں علم وتحقیق کا وسیع میدان تھا۔ لندن میں دو سال رہے اور اس عرصے میں بہت سے مستشرقین سے ملاقات کی ان میں پروفیسر بوان BEVAN، مسٹر MR. A. G. ELLIS، مسٹر آمدروز H. F. AMEDROZ اور پروفیسر براؤن EDWARD G. BROWN خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خصوصاً پروفیسر براؤن کی صحبت میں مرزا محمد کا زیادہ وقت گزرا جو مشرقی زبانوں کے بڑے اسکالر تھے اور جنھوں نے ایرانی تاریخ

اورتحقیق کی بڑی خدمت انجام دی تھی اور علمی مباحث میں مرزا محمد اُن کے شریک کار رہتے تھے خود مرزا نے بھی مستشرقین کا طریقۂ کار اور رنگ ڈھنگ دیکھا تھا لہذا پروفیسر براؤن کی وساطت سے جہان گشای جوینی (تصنیف عطا ملک جوینی) کی تصحیح و اشاعت کا کام سپرد ہوا چونکہ اس کتاب کا صحیح ترین نسخہ کتاب خانۂ ملی پیرس میں تھا اس لیے مرزا ۱۳۲۴ھ میں لندن سے پیرس آگئے اور ۱۳۳۲ھ تک وہاں مقیم رہے۔ پیرس میں بھی انھوں نے کئی مستشرقین سے تعلقات پیدا کیے اور ان سے مستفید ہوتے، ان میں ہرٹویگ درنبورگ HARTWIG DEREN BOURG مسٹر اے میلٹ MR A.MEILLET باربیہ دمنار BARBIER DE MEYARD کلیمنٹ ہوارٹ CLEMENT HUART

قابل ذکر ہیں۔ قیام پیرس کے دوران مرزا نے اپنے ہم وطن علی اکبر دھخدا سے جو "استبداد صغیر" کے دوران میں قومی مہاجر کی حیثیت سے پیرس آئے ہوئے تھے ملاقات کی۔ حاجی سید نصراللہ جن کا شمار عصر جدید کے علماء و شعرا میں ہوتا تھا ان سے مرزا کی علمی دوستی تھی اور تصحیح مرزبان نامہ (تصنیف سعدالدین وراوینی) کے لیے ان سے ان کا تصحیح کردہ نسخہ منگوایا تھا۔

مرزا محمد ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں پہلی جنگ عظیم کے دوران آقای حسین قلی خان کے ہمراہ برلن چلے گئے اور تقریباً ۱۳۳۸ھ (۱۹۱۹ء) تک وہاں قیام کیا۔ یہاں بھی تقی زادہ اور مکتبۂ ایران کے لیے روزنامہ "کاوہ" میں لکھتے رہے۔ ساتھ ہی برلن کے کتاب خانوں میں عربی فارسی کے قدیم نسخوں کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔ برلن میں متعدد ہم وطنوں سے ملاقات ہوئی جو علمی اور تحقیقی میدان میں بڑی شہرت کے مالک تھے، مثلاً سید محمد جمال زادہ جن کی کتاب "روابط روس و ایران" تنقید کا ایک بہترین نمونہ ہے اور "یکی بود و یکی نبود"، فارسی کے خالص و سہل اور شیریں انشا کی ایک بے مثل کتاب ہے۔ مرزا محمد خان غنی زادہ، مرزا محمد علی خاں، مرزا حسین خان کاظم زادہ مدیر مجلۂ ایرانشہر، اور ایک قدیم دوست مرزا ابراہیم پور داؤد وغیرہ ان کی معیت میں مرزا کی علمی شخصیت کو کافی جلا ملی۔ مرزا نے ساتھ ہی ساتھ جرمن مستشرقین سے بھی تعلقات بڑھائے اور ان کی علمی ذخائر سے استفادہ کیا، ان میں پروفیسر PROF.MARQUART پروفیسر زخاؤ PROF.EDUARD SACHAU ڈاکٹر موریتز DR.B.MORTIZ

پروفیسر ہارٹمن PROF. MARTIN HARTMAN پروفیسر مان OSKAR MANN.
پروفیسر میتووخ EUGEN MITTWOCH پروفیسر فرانک FRANK وسباسٹیان بک MR. SEBASTIAN BECK وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام اشخاص فارسی و عربی کے قابل قدر محقق اور اسکالر ہیں۔ ان کے قیمتی کتاب خانوں اور ان کے تحقیقی کاموں کو دیکھ کر مرزا کو مستشرقین کی خدمات کا صحیح اندازہ ہوا۔

۱۹۲۰ء میں مرحوم محمد علی فروغی کی وساطت سے پھر پیرس واپس آگئے اور تاریخ جہانگشای کے ادھورے کام کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ یہیں پر انھوں نے فرانس کے مستشرقین کی دو اہم شخصیتوں سے ملاقات کی ان میں ایک سیو کازانوا MR. PAUL CASANOVA اور دوسرے گابریل فران MR. GABRIEL FERNAND تھے۔

پیرس کے دوران قیام میں مرزا نے ڈاکٹر عباس اقبال خان آشتیانی سے، جو اُس وقت تہران میں مقیم تھے، علمی دوستی اور تعلقات بڑھائے، عباس اقبال چونکہ طریقۂ انتقادی مشرقی کے متبحر اشخاص میں سے تھے اس لیے مرزا کو اُن سے تنقید و تحقیق میں کافی مدد ملی، انھوں نے مرزا محمد کی تصحیح شدہ کتابوں کو شائع کرانے میں کافی حصہ لیا۔

مرزا محمد نے یورپ کے دوران قیام میں نہ صرف یہ کہ انگلستان، فرانس اور جرمنی کے مستشرقین کی زندگی سے بہت کچھ حاصل کیا بلکہ ان کے قیمتی کتب خانوں سے بھی کافی استفادہ کیا۔ اسی زمانے میں لندن، پیرس، اور لینن گراڈ کے کتب خانوں سے عربی اور فارسی کی نادر کتابوں کے اٹھارہ نسخے حاصل کئے اور ترتیب و تصحیح کے لیے ایران کی حکومت سے انھیں ایک لاکھ فرانک کی گرانٹ ملی۔ مرزا محمد نے ان کتابوں پر مقدمہ اور تحشیہ لکھ کر دس سال کے عرصے میں ان کو تہران بھیجا، ان میں زیادہ تر کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور جو کسی وجہ سے اب تک شائع نہ ہو سکی ہیں، وہ کتاب خانۂ ملی اور کتاب خانۂ دانشکدۂ ادبیات میں موجود ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے شروع ہونے کے بعد مرزا محمد ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۹ء میں تہران واپس آگئے اور جنگ کے اختتام پر اپنا نفیس کتاب خانہ لانے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ مرزا محمد چونکہ یورپ ہی میں کتابوں کی تصحیح و اشاعت کا ذمہ لے چکے تھے لہذا

زیادہ تر کتابوں کی تصحیح تو وہیں کر لی تھی لیکن ایران آنے کے بعد اپنی عمر کے آخری دنوں تک قدیم نسخوں کی تصحیح میں مشغول رہے۔ اسی حالت میں بیماری نے آگھیرا اور تقریباً ڈیڑھ سال بیمار رہ کر ۱۳۶۸ھ مطابق ۱۹۴۹ء میں اس جہان فانی سے رحلت فرماگئے۔ مرزا محمد کی موت دراصل فن تحقیق کی موت تھی۔

دنیائے علم وادب میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جسے مرزا محمد خان قزوینی کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کی گوناگوں صلاحیتوں کا اعتراف نہ ہو، نہ صرف ایران اور مشرق کے دوسرے ممالک میں بلکہ امریکہ اور یورپ میں آج بھی انھیں احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ مرزا محمد کو اپنی ذاتی صفات اور منفرد خصوصیات کی بنا پر علم وادب کے حلقوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ حقیقی معنوں میں علم کے حامل تھے، ان کی معلومات گہری اور وسیع تھیں اور ان کا مطالعہ عمیق تھا۔ انھوں نے اپنی ساری عمر علم وتحقیق کی خدمت میں گزار دی۔

مرزا محمد نہ صرف ایک عظیم محقق تھے بلکہ تاریخ ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ اس کی بہترین مثال تصحیح چہار مقالہ سے ملتی ہے۔ اکثر وہ تاریخی غلطیاں جو مؤلف نظامی عروضی سمرقندی کے قلم سے سرزد ہوئی تھیں وہ مرزا کی نظروں سے نہ بچ سکیں، انھوں نے جس طرح اس کتاب کی تاریخوں کی غلطیوں کی نشاندہی اور تصحیح کی ہے وہ ان کی دقت نظر اور وسعت مطالعہ کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

عربی وفارسی کی اہم کتابیں، چاہے وہ علم وادب سے متعلق ہوں یا تاریخ سے یا مذہب سے، مرزا محمد کے مطالعہ میں رہ چکی تھیں ان کا مطالعہ صرف مطبوعہ کتابوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ اسلام اور ادب کے سیکڑوں مخطوطات بھی ان کے زیر مطالعہ رہ چکے تھے۔ اس کی بنا پر علوم اسلامی اور علوم ادبی کا مشکل سے کوئی گوشہ ایسا ہوگا جس پر اُن کی نظر نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جن کتابوں کی انھوں نے تصحیح کی ہے ان کے مقدمے اور ان کی تعلیقات بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں چہار مقالہ جیسی مختصر کتاب پر، جس کا متن ۸۹ صفحہ پر مشتمل ہے، مرزا محمد کے حواشی تقریباً سوا دو سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں اور ان کا ہر صفحہ ان کے دقیق مطالعہ اور گہری بصیرت کا مظہر ہے۔

مرزا محمد کے حواشی دراصل کتاب کی جان ہوتے ہیں، متعلقہ کتاب یا متعلقہ موضوع کے تمام اہم نکتوں پر، جن کا تعلق خواہ مذہب سے ہو یا تاریخ سے یا ادب و زبان سے تفصیل سے بحث کرتے ہیں اور ان تمام گوشوں پر، جو مصنف کی نگاہ سے اوجھل رہے ہیں، بڑی خوبی کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ حواشی دراصل زیر بحث موضوع پر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مرزا کی عمر کا بیشتر حصہ یورپ میں گزرا ہے، اس لیے ان کا زیادہ تر تحقیقی کام وہیں سرانجام پایا۔ اگرچہ اُن کی اپنی طبع زاد کوئی تصنیف نہیں ہے لیکن حواشی کتب، رسالے، مقالات اور مقدمات کی صورت میں جو یادداشتیں چھوڑی ہیں اگر انھیں موضوع کے لحاظ سے مرتب کیا جائے تو کئی کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ ان کی تصحیح شدہ کتابوں اور تحقیقی مقالات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ تصحیح مرزبان نامہ سعد الدین وراوینی جو ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں ہالینڈ کے شہر لیدن سے چھپ چکی ہے۔

۲۔ المعجم فی معاییر اشعار العجم تالیف شمس الدین محمد بن قیس رازی جو ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں پروفیسر ایڈورڈ براون کی کوشش و وساطت سے اور مصارف اوقاف گیب سے بیروت سے شائع ہوئی۔

۳۔ چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی۔ یہ کتاب بھی اسی سال لیدن سے اوقاف گیب کی امداد سے شائع ہوئی۔

۴۔ لباب الالباب عوفی کی جلد اوّل مقدمہ و حواشی کے ساتھ پروفیسر براؤن کے توسط سے شائع ہوئی۔ جلد دوم پروفیسر براؤن پہلے شائع کرا چکے تھے۔

۵۔ تاریخ جہانگشائی جوینی تالیف عطا ملک جوینی کی تین جلدیں پروفیسر براؤن اور اوقاف گیب کی مدد سے ۱۳۲۹ھ سے ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۱۱ء اور ۱۹۲۵ء کے درمیان شائع ہوئیں۔

۶۔ دیوان خواجہ حافظ شیرازی۔ اس کی تصحیح کا کام ڈاکٹر قاسم غنی کی معیت اور اشتراک میں انجام دیا گیا ہے۔ اس کا عکس وزارت فرہنگ کی جانب سے ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا ہے۔

۷۔ شد الازار در مزارات شیراز تالیف معین الدین جنید شیرازی عباس اقبال

آشتیانی کی معیت میں مفصل حواشی کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ہفت اقلیم ابن احمد رازی۔ مجمل التواریخ فصیح خوانی اور عتبۃ الکتبہ اتابک منتجب الملک جوینی۔ ان کتابوں کی تصحیح کا کام عباس اقبال کی معیت اور اشتراک میں کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ مرزا محمد نے تذکرۃ الاولیاء عطار پر، جسے پروفیسر نکلسن نے شائع کروایا ہے اور نقطۃ الکاف مرزا جانی کاشانی پر، جسے پروفیسر براؤن نے چھپوایا ہے۔ محققانہ مقدمے لکھے۔

علاوہ ازیں مرزا محمد کے تنقیدی مقالات کی ۲ جلدیں "بیست مقالہ قزوینی" کے نام سے مرزا ابراہیم پورداؤد اور عباس اقبال آشتیانی کے ذریعہ شائع ہوئی ہیں۔ مرزا محمد کے ان تنقیدی مقالات کے علاوہ جو مجلد کتاب کی شکل میں موجود ہیں۔ ان کے سیکڑوں مقالات جو تاریخ اور تنقید سے متعلق ہیں، مجلۂ دانش کدۂ ادبیات، مجلۂ یادگار جیسے وقیع مجلوں میں چھپ چکے ہیں۔ یہ سارے مقالات مرزا محمد کی علمی تاریخی اور تنقیدی صلاحیت کے مظہر ہیں۔ اسی بنا پر مرزا محمد کا نام تاریخ کے اوراق پر ایک عالم، نقاد، محقق اور مصحح کی حیثیت سے زندہ جاوید رہے گا۔

او گرچہ برفت نام نیکش
در لوح جہاں بود مخلد

ویریندر پرشاد سکسینہ

منشی مہاراج بہادر برقؔ دہلوی

مہاراج بہادر برقؔ کے بزرگوں کا وطن سیکٹ ضلع ایٹہ تھا لیکن کئی پشتوں سے ان کے آبا و اجداد دہلی میں متوطن تھے۔ ان کے دادا منشی خوب چند مغلیہ حکومت کے آخری دور میں شاہی وکیل تھے۔ برقؔ کے والد منشی ہر نرائن داس حسرتؔ دہلی میں ڈاک خانے میں کلرک تھے، رفتہ رفتہ ترقی کرکے گوڑگاؤں میں پوسٹ ماسٹر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ برقؔ اپنے پانچ چھ بھائیوں اور ایک بہن کی وفات کے بعد فروری ۱۸۸۴ء میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے اس لیے ان کے خاندان کے لوگ ان سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ اقبال ورما سحرؔ ہنگامی مرحوم کو برقؔ نے ایک قطعہ میں لکھا ہے: ”بچپن کا زمانہ جیسے ناز و نعم میں گزرا، وہ اطمینان قلب عمر کے کسی حصّے میں مجھے پھر نصیب نہ ہو سکا“

برقؔ نے ۱۹۰۲ء میں انٹرنس پاس کیا۔ اس کے بعد حالات ایسے ہو گئے کہ تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ فروری ۱۹۰۵ء میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور برقؔ کو مجبوراً تعلیم ترک کرکے ڈاک خانے کے محکمے میں ملازمت کرنا پڑی۔ انھوں نے ۱۹۱۸ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا، پھر پنجاب یونیورسٹی سے پرائیوٹ طور پر ایف اے اور بی اے کے امتحانات پاس کیے اور اس کے بعد ۱۹۲۱ء میں اپنے محکمے کے سب اکاؤنٹ سروس کا امتحان بھی پاس کیا اور سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر مامور ہو گئے۔

بچپن سے ہی برقؔ کو شعر و شاعری کا شوق تھا۔ ان کے ددھیال اور ننھیال دونوں

جناب ویریندر پرشاد سکسینہ، اردو کے معروف ادیب اور بدایوں (یوپی) کے رہنے والے ہیں۔

ہی میں اردو کے بلند پایہ شاعر گزرے ہیں۔ برق کے والد منشی ہرنرائن داس حسرت اردو کے ایک کہنہ مشق شاعر تھے، ان کی غزلیں اردو کے پرانے گلدستوں میں جو دہلی سے شائع ہوتے تھے دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ ان کے نانا منشی دولت رام عبرت کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے، وہ ذوق دہلوی سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے۔ ان کے حالات اور کلام متعدد تذکروں میں محفوظ ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

سخت جانی تو نے شرمندہ کیا قاتل سے ہائے — وقت کشتن پھر گیا منہ یار کی تلوار کا

ہر دم صبا سے ہے طلب بوئے زلف یار — لڑتے ہیں بات بات پہ اب تو ہوا سے ہم

کون سا ہے وہ پری رو کہ جسے تم عبرت — دے کے دل ایسے بنے پھرتے ہو دیوانے سے

برق پہلے مرزا داغ دہلوی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے، اس کے بعد مرزا کے حکم سے ان کے شاگرد آغا شاعر دہلوی کے شاگرد ہو گئے لیکن یہ تعلق زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ برق منشی اقبال ورما سحر ہتگامی کو ۲۵ر جولائی ۱۹۳۲ء کے خط میں اپنے تلمذ کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"حضرت داغ دہلوی سے ۱۹۰۴ء میں معدودے چند غزلوں پر اصلاح لی تھی۔ جو پہلی غزل انھیں ارسال کی تھی اس کا ایک مطلع اور ایک شعر یاد ہے جو حسب ذیل ہے:

ہمارے خون کی مہندی لگا لو دست خنجر میں — قسم ہے ایک ہو گے تم ہی تم نکلو گے محشر میں

سوال بوسہ پر وہ جھنجھلا کر کہا اس نے — کوئی تلوار کا بھی نام لیتا ہے بھرے گھر میں

جناب داغ نے میرے ابتدائی کلام کی بہت حوصلہ افزائی فرمائی لیکن چوں کہ خط و کتابت میں تاخیر ہوتی تھی، میں نئے نئے شوق کی وجہ سے جلد اصلاح کا تقاضا کرتا تھا اس لیے انھوں نے بہ خیال سہولت مجھے افسر الشعرا حضرت آغا شاعر سے مشورہ کا حکم دیا۔"

اپنے عزیز شاگرد ڈنگن چندر روشن پانی پتی کے اصرار سے ان کی لڑکی کی شادی میں شرکت کے لیے اہل و عیال کے ساتھ ۹ر فروری ۱۹۳۶ء کو پانی پت تشریف لے گئے۔ ۱۳ر فروری کو

صبح کے وقت دہلی واپس ہونے والے تھے کہ اچانک ۱۲ر فروری کو رات کو ۱۱ بجے کچھ بے چینی محسوس ہوئی۔ اور تھوڑی دیر میں قلب کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے ان کی ناگہانی وفات ہوگئی۔ ان کی وفات سے جدید اردو شاعری کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔ برق کی یاد میں بیسیوں حضرات نے نوحے اور تاریخ وفات لکھی ہیں۔ منوّر لکھنوی کی نظم "احترام برقؔ" ملاحظہ ہو:

رخصت ہوئی ہے قالب دہلی سے روح شعر — اک سخت حادثہ ہے فراق دوام برقؔ
پائیں گے بزم شعر میں اب اہل دل کہاں — وہ سحر آفریں و لطف کلام برقؔ
ہو خاک کیف، پاشی صہبائے حسن و عشق — اب محفل سخن میں نہیں دور جام برقؔ
اے سرزمین حالیؔ مرحوم آہ آہ — تو نے سپرد خاک کیا کیوں نظام برقؔ
دیکھو تو آج حلقۂ ماتم کی وسعتیں — کتنا نگاہ خلق میں ہے احترام برقؔ

حسن کلام ہے جو متعدد دلوں پہ نقش
صدیوں رہے گا عالم امکاں میں نام برقؔ

برقؔ کے شاگردوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ ان کے شاگردوں میں بیتابؔ بریلوی، روشنؔ پانی پتی اور طالبؔ دہلوی کے نام نمایاں ہیں۔

اردو اور ہندی کے بعض نقادوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ صرف "مطلع انوار" برقؔ مرحوم کی یادگار ہے، برقؔ کی تصانیف کی مکمل فہرست ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) "مطلع انوار" یہ برقؔ دہلوی کی ادبی، اخلاقی، تاریخی اور نیچرل نظموں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۱۹ء میں محبوب المطابع برقی پریس دہلی سے شائع ہو کر ادبی دنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اس مجموعے میں وہ تمام نظمیں شامل ہیں جو ۱۹۳۹ء تک لکھی گئی تھیں۔ عرشؔ ملسیانی برقؔ دہلوی پر اپنے مضمون میں جو رسالہ "آج کل" نئی دہلی، کی اشاعت ۱۵ر جون ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا "مطلع انوار" کے سلسلے میں لکھتے ہیں: "مطلع انوار حقیقت میں مطلع انوار ہے، جس کی ضیا پاشیوں سے فضائے شعر اس قدر پُر نور ہوگئی کہ باید و شاید۔"

(۲) "کرشن درپن" برقؔ دہلوی کی سب سے پہلی تصنیف ہے جو ۱۹۲۷ء میں تیج "

پریس دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ اس مجموعے میں آٹھ نظمیں شامل ہیں جو کرشن بھگتی کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ یہ مجموعہ اس قابل ہے کہ دوبارہ شائع کیا جائے جس سے اہل ذوق کو معلوم ہوگا کہ اردو میں کرشن بھگتی پر کئی بلند پایہ نظمیں موجود ہیں۔ منشی سورج نرائن مہر دہلوی اس مجموعے کے بارے میں فرماتے ہیں :-

"یہ ایک گلدستہ ہے جس میں پریم اور بھگتی کے پھول یکجا کر کے آنند کند بھگوان کرشن کے چرنوں میں صدق عقیدت سے چڑھائے گئے ہیں۔ جناب برق نے گیتا کو اپنا رہبر و رہنما بنا دیا ہے اور اپنی پُر زور دلکش نظموں میں کہیں کرم اور گیان کے فلسفے کی توضیح کی ہے اور کہیں بھگتی اس کے آنند کا سمندر بہایا ہے۔ یہ پیاری نظمیں ہر طرح کی نظم کی سیاؤں کی نظر میں پیاری محسوس ہوں گی اور سب لطف لے لے کر پڑھیں گے"

(۳) "حرف ناتمام" یہ برق دہلوی کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے جو ان کی وفات کے بعد ان کے عقیدت مند شاگرد طالب دہلوی نے شائع کیا ہے۔ اس مجموعے میں وہ کلام شامل ہے جو اِدھر اُدھر رسالوں میں بکھرا ہوا تھا۔ یہ مجموعہ ۱۹۴۱ء میں دیال پرنٹنگ پریس دہلی سے طبع ہوا تھا۔ اس میں چھیاسٹھ نظمیں چند غزلیات اور منتخب اشعار شامل ہیں۔

(۴) "تجلیات برق" برق دہلوی کی غزلیات کا مجموعہ ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے اور ان کی اہلیہ کے پاس محفوظ ہے۔ برق کا ذوق غزل گوئی پاکیزہ تھا اس لیے اس کا متمنی ہے کہ ان کا یہ مجموعہ طبع ہو کر دنیائے ادب کے سامنے آئے۔

ان کے علاوہ "یادگار برق" کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں برق دہلوی کا غیر مطبوعہ اور ایسا کلام شامل ہے جس تک لوگوں کی رسائی اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس میں وہ تمام تنقیدی مضامین اور ہر وہ چیز جو برق مرحوم سے متعلق تھی شامل کر دی گئی ہے۔ برق کی شاعرانہ عظمت کے تعین میں اس سے بڑی مدد مل سکتی ہے، اس کی ضخامت تقریباً پانچ سو صفحات ہے۔ یہ کتاب دیال پرنٹنگ پریس دہلی سے ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی ہے۔

مہاراج بہادر برق جدید اردو ادب کی تعمیر میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ سرور جہان آبادی چکبست اور ان کے بعد برق نے نظم نگاری میں ایک ممتاز درجہ حاصل کیا اور اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے باعث صف اوّل کے شعرا میں شمار کیے جانے لگے۔

"کارِ خیر" برق کی سب سے پہلی نظم ہے جو ۱۹۰۸ء میں رسالہ "زبان" دہلی میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم ان کی شہرت کا بنیادی پتھر ہے، اس سے پہلے ان کی شاعری غزل تک محدود تھی۔ نظم نہایت دل کش اور سبق آموز ہونے کے علاوہ پاکیزہ خیالات سے مملو ہے۔ پہلے ہی مصرع میں شاعر پوچھتا ہے:

بتا اے خاک کے پتلے کہ دنیا میں کیا کیا ہے

سوالات کا یہ سلسلہ نظم میں دور تک چلا جاتا ہے۔ اور ہر سوال ایک سبق آموز جواب رکھتا ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں:

شریک دردِ دل ہو کر کسی کا دکھ بٹایا ہے — مصیبت میں کسی آفت زدہ کے کام آیا ہے
پرائی آگ میں پڑ کر کبھی دل بھی جلایا ہے — کسی بیکس کی خاطر جان پر صدمہ اٹھایا ہے
کبھی آنسو بہائے ہیں کسی کی بدنصیبی پر
کبھی دل تیرا بھر آیا ہے مفلس کی غریبی پر

کبھی امداد دی تو نے کسی بیکس بچارے کو — سخی بن کر دیا کچھ تو نے مفلس کے گزارے کو
تسلّی دی کبھی تو نے کسی آفت کے مارے کو — کبھی تو نے سہارا بھی دیا ہے بے سہارے کو
کبھی فریاد رس بن کر خبر لی بے نواؤں کی
لگی ہے چوٹ بھی دل پر صدا سن کر گداؤں کی

اردو شعرا نے اچھوت اُدّھار کے سلسلے میں اتنا منظوم لٹریچر ہماری زبان کو دیا ہے کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی مشکل ہی سے مل سکے گا۔ برق نے بھی اچھوتوں کی اصلاح و ترقی کے سلسلے میں "پریم کا تحفہ" یا "بھیلنی کے بیر" اور "اچھوتوں سے نفرت فضول ہے" دو شاہکار نظمیں لکھی ہیں۔ شری رام چندر جی اچھوت شبری کے جھونپڑے میں پہنچتے ہیں اور شبری عقیدت کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ اس واقعہ کو شاعر نے اس طرح نظم کیا ہے:-

بھگوان نے اخلاص و مدارات کو دیکھا　　وارفتۂ دیدار کے جذبات کو دیکھا
کچھ ذات کو دیکھا نہ کچھ اوقات کو دیکھا　　دیکھا تو فقط پریم کی سوغات کو دیکھا
ڈوبے ہوئے تھے بیر محبت کے جو رس میں
خود پریم کے ساگر بھی ہوتے پریم کے بس میں

ہے رسم محبت کی زمانے سے نرالی　　بھگتی کبھی تاثیر سے رہتی نہیں خالی
منظور کیا رام نے یہ تحفۂ عالی　　بنیاد جہاں میں تپت اُودھار کی ڈالی
اے کاش! اچھوتوں کو گلے ہم بھی لگائیں
اس پریم کے افسانے کو آدرش بنائیں

ان کی دوسری نظم "اچھوتوں سے نفرت فضول ہے" کا ایک بند اور چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔ اس میں جو روانی اور زور بیان ہے اس سے برقؔ کی شاعرانہ قدرت کا اندازہ ہوتا ہے:

سب کے لیے ہے یکساں قدرت کا فیض جاری　　مفلس ہو یا تونگر راجہ ہو یا بھکاری
ٹوٹی سی جھونپڑی ہو یا قصر کا مگاری　　دونوں پہ مہر انور کرتا ہے جلوہ باری
ہیں خاک بوس کرنیں مہتاب ضو فشاں کی
ہر گھر میں روشنی ہے قندیل آسماں کی

تفریق جو ہے قائم یہ غیر قدرتی ہے　　اسفل بھی آدمی ہے افضل بھی آدمی ہے
زیبا نہیں کسی سے بیجا سلوک کرنا　　منہ سے اچھوت کہنا نفرت سے نام دھرنا
تذلیل دوسروں کی تحقیر ہے خود اپنی　　اپنوں کو غیر کہنا تشہیر ہے خود اپنی
اس خاک کے ہیں پتلے بھارت سپوت ہیں سب　　گر یہ اچھوت ہیں تو ہم بھی اچھوت ہیں سب

کرشن بھگتی اور رام بھگتی کے سلسلے میں اردو کا منظوم لٹریچر خاص اہمیت رکھتا ہے لیکن ہمارے ادبی مورخوں اور نقادوں نے اس سلسلے میں کچھ نہیں لکھا۔ برقؔ کرشن بھگت تھے اس لیے انھوں نے "کرشن درپن" جیسی شاہکار نظموں کا مجموعہ شائع کرایا۔ برقؔ کی کرشن بھگتی پر نظمیں کرشن بھگتی کے موضوع پر اعلیٰ نظموں کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرورؔ اپنے ایک مضمون "برقؔ کی یاد" میں لکھتے ہیں :-

"کرشن جی پر برقؔ کی جو نظمیں ہیں وہ اردو شاعری میں ایک بلند مقام رکھتی ہیں۔ نظیرؔ سے لے کر اس دور تک کرشن جی پر بے شمار نظمیں کہی گئی ہیں مگر مجھے ایک تو برقؔ کی نظموں نے متاثر کیا اور دوسرے سیمابؔ کی ایک نظم نے۔ لطف یہ ہے کہ سیمابؔ کی نظم پر برقؔ کا اثر صاف محسوس ہوتا ہے۔ اوّل تو وہ برقؔ کی نظموں کے بعد کہی گئی تھے، دوسرے اس میں برقؔ کے اسلوب کا تتبع بھی ہے"

"کرشن اوتار" نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

مٹا نے ظلمتِ ہستی کو جلوہ بار آیا — زمیں پہ حسنِ ازل ہو کے بے قرار آیا
نظر کو نور، دلوں کو سرور دینے کو — سحابِ لطف و کرم برق در کنار آیا

تجلی پاش تھا جھرمٹ میں گوپیوں کے وہی — تھا ایک چاند کا جلوہ ہزار ہالوں میں
سرورِ عشق سے تھا ساقیٔ ازل مسرور — مے طہور کا تھا دور حسن والوں میں

بقدرِ ذوق دیا سب کو لطفِ جلوۂ دید — نظر نوازئی تنویرِ روئے تاباں سے
جہانِ تیرہ کو گیتا سے جلوہ زار کیا — مٹائی تیرگیٔ جہل بزمِ امکاں سے

دورِ جدید کے فطرت نگار شعرا میں سرورؔ جہان آبادی، جگرؔ بریلوی اور برقؔ کی ادبی و شعری خدمات کا اعتراف ناگزیر ہے۔ برقؔ نے مناظرِ فطرت اور مظاہرِ قدرت پر نہایت دل کش نظمیں لکھی ہیں۔ "کرمکِ شب تاب" "شفق" "تاروں بھری رات" "برسات کی شام" "برسات اور مناظرِ کوہ" اور "بسنت رت" ان کی معرکتہ آلارا نظموں میں شمار کی جاتی ہیں۔ جگنو پر اقبالؔ کی بڑی مشہور نظم ہے۔ برقؔ نے بھی "کرمکِ شب تاب" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے۔ اس میں خیال کی رعنائی اور تشبیہات و استعارات کی ندرت نے ایک نیا لطف پیدا کر دیا ہے۔ اس سے شاعر کی قوتِ مشاہدہ

ادبقادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

خندۂ جام بلوریں ہے ہوا میں پرّاں	گرم پرواز ہے یا پرتو شاخ مرجاں
محو پرواز یہ لعل یمنی ہے شاید	اڑتی پھرتی کوئی ہیرے کی کنی ہے شاید
شمع رخسار گل تر کا جو دیوانہ ہے	پیرہن نور کا پہنے ہوئے پروانہ ہے
کسی ناشاد کی آہوں کا شرار تو نہیں؟	آسماں سے کوئی ٹوٹا ہوا تارا تو نہیں؟
لیلی شب کا چراغ تہہ دامن ہے تو	یا کہ چھوٹی سی کوئی مشعل روشن ہے تو
شوخیوں میں ہیں تری برق نظر کے انداز	تیری پرواز میں ہیں رقص شرر کے انداز

بسنت رُت پر برقؔ نے چھ نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں مختلف مناظر کو جس دل کش انداز سے پیش کیا گیا ہے اس سے برقؔ کی قوت مشاہدہ کا پتہ چلتا ہے۔ ذیل کا شعر ملاحظہ ہوں، اس میں صبح کی کیفیت کتنی عمدہ پیش کی گئی ہے :

کھلی ہے خوابیدہ چشم نرگس روش پہ سبزہ سنبھل چکا ہے
قبائے غنچہ ہے چاک خوردہ کلی کا دامن نکل چکا ہے

سرسوں کے کھیت کی دل فریبی اور دل کشی کو برقؔ نے کس خوبی سے اُجاگر کیا ہے :

سماں یہ سرسوں کے کھیت کا ہے کہ زعفراں زار کھل رہا ہے
فضا میں کندن دمک رہا ہے سرور آنکھوں کو مل رہا ہے

اسی خیال کو ایک دوسری نظم میں یوں ظاہر کیا ہے :

سرسوں کے کھیت کیا ہیں کیسر کی کیاریاں ہیں
قدرت کی خاک پر یہ زیبا نگاریاں ہیں

یا

پھولی ہوئی سرسوں ہے تابندہ شرارے ہیں
یا خاک کے دامن میں چھٹکے ہوئے تارے ہیں

بسنت رُت میں قدرت کی شگفتہ کاری کے ظہور کا بیان ملاحظہ ہو ؎

شگوفہ کاریٔ فطرت کا ہر طرف ہے ظہور   شگفتگی سے چمن زار دہر ہے معمور

وفودِ جلوۂ گل سے برس رہا ہے نور ۔۔۔ نگاہیں کیف میں ڈوبی ہیں دل ہیں مستِ جنوں
کلی کلی گہرِ رنگ و بو سے ہے گلشن میں ۔۔۔ بسنت رُت میں یہ شان نمو ہے گلشن میں

برق کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی تھی اور اگرچہ آگے چل کر ایک نظم گو کی حیثیت سے انھوں نے شہرت پائی لیکن غزلیہ شاعری میں بھی ان کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کی غزلوں میں ہر جگہ ان کی انفرادیت نمایاں ہے۔ برق کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بقول آل احمد سرور: "غزلوں کی جانی پہچانی آواز میں اپنے دور کے دل کی دھڑکن کو اس طرح شامل کر دیا کہ وہ کائنات کے دل کی دھڑکن معلوم ہونے لگی۔ برق کا رنگ تغزل داغ اور مومن کے رنگ اور آتش کی غزلوں کی آب و تاب کا ایک حسین امتزاج ہے۔ ان کی غزلیں درد و اثر اور پاکیزہ جذبات سے بھرپور ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں فلسفے اور حکمت کے خشک مضامین بھی بیان کیے ہیں مگر اس طرح کہ شعریت مجروح نہیں ہونے پائی ہے "حضرت جگر بریلوی" یادِ رفتگاں" میں ان کی غزل گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"برق نے غزل میں بھی عارفانہ خیالات کی شمع روشن کی ہے۔ غزل کے عامیانہ رنگ سے بچ کر کلیتاً اسے حکیمانہ خلعت سے آراستہ کر دینا آسان کام نہ تھا۔ برق نے یہ مشکل راہ اختیار کی اور یہ ان کی غزل کا مابہ الامتیاز ہو گیا ۔۔۔۔۔ وحدت و کثرت، بقا و فنا، حیات و ممات، تخلیق عالم، مدعائے آفرینش، مکافاتِ عمل وغیرہ وغیرہ کے اسرار آپ نے غزل میں کھولے ہیں۔ اپنی قادر الکلامی سے ہر شعر کو چست مضبوط اور رواں بنا دیا ہے اور دلّی کی زبان کا مٹھاس اس میں بھر دیا ہے"

پروفیسر آل احمد سرور رسالہ "شعلہ و شبنم" بابت مئی ۱۹۵۴ء میں برق کی غزل گوئی کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

"برق کو غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت ہے۔ غزل بڑی آسان صنفِ سخن ہے مگر بڑی کافر بھی ہے۔ اس میں ہموار بلکہ دل کش شعر نکالنا چنداں مشکل نہیں ہے مگر اس میں انفرادیت پیدا کرنا، اس میں نقاب کے باوجود جلوے

سموتا اور نقاب کو بھی رنگین رکھنا عشق بزدِ پیشہ کی طرح طلب گار مرد ہے۔ برقؔ کی غزلوں پر نظر ڈالنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مشاعروں کی طرحوں پر انھوں نے بہت کچھ دادِ سخن دی ہے۔ اور زمین، ردیف و قافیے کی پابندی نے ان کو بھی خاصا پابند کیا ہے۔ مگر ان کے یہاں جو چنگاری تھی وہ بھی روشن رہی ہے اور اس کی وجہ سے ان کی غزلوں میں ایک آب و تاب اور رعنائی بھی آگئی جو عام شعرا کے بس کی بات نہیں ہے۔ غزل میں نئی بات کہنا مشکل نہیں ہے اور پرانی باتوں کو دہرانا تو بہت ہی آسان ہے مگر غزل کی مانوس زبان میں بقول حالی خاموش تغیر پیدا کر دینا اور اس کی جانی پہچانی آوازیں اپنے دور کے دل کی دھڑکن اس طرح شامل کر دینا کہ وہ کائنات کے دل کی دھڑکن معلوم ہو بڑا کام ہے۔ برقؔ کے بہت سے اشعار میں یہ دھڑکن سنائی دیتی ہے"

مختلف غزلوں کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

اُڑاتی پھرتی ہے بادِ صبا غبار میرا — نہ میں زمیں کے لیے ہوں نہ آسماں کے لیے

نگاہِ شوق بھی ہفت آسماں تک رخنہ گر ہو گی — مبارک حسن کو ہو سات پردوں میں نہاں ہونا

ہمیں راہِ طلب میں خاک ہو جانے سے مطلب ہے — قدم پہنچے نہ پہنچے منزلِ مقصود پر اپنا

اشاروں میں ہوا کرتی ہیں حسن و عشق کی گھاتیں — نگاہوں کو نگاہیں اور دل کو دل سمجھتے ہیں

یہی دو چار تنکے کائنات آشیاں کیا ہے — جلانے کے لیے بیتاب ہے برقِ طپاں پھر بھی

جھپکے پلک نہ مہرِ درخشاں کے سامنے — رہ جائے بات جلوۂ جاناں کے سامنے

برقؔ حسنِ یار اتنی کس لیے ہے بے قرار — یہ میری آنکھوں میں ٹھہرے یہ مرے دل میں رہے

مشکلات دہر نے بدلی وہ شکلِ زندگی — موت نے میری نہ پہچانا بہ آسانی مجھے

کھل کے مرجھا بھی گیا آنکھ کسی کی نہ پڑی — میں چمن زادِ جہاں میں گلِ صحرائی تھا

بہارِ خندۂ گل دیدنی ہے باغِ عالم میں — تماشا ہو گیا غنچہ کا شیرازہ بکھر جانا

رہے گا کس کا حصہ بیشتر میرے مٹانے میں — یہ باہم فیصلہ پہلے زمین و آسماں کر لیں

کوائف جامعہ

سیکولر ہندوستان میں مذہبی تعلیم

شعبۂ اسلامک اینڈ عرب ایرانیین اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ، ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، حیدرآباد اور ڈائیلاگ کمیشن سی۔بی سی۔آئی، نئی دہلی کے اشتراک اور تعاون سے، مذکورہ بالا عنوان پر، ایک سہ روزہ سیمینار، ۱۷ سے ۱۹ اکتوبر تک جامعہ ملیہ میں منعقد ہوا، مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان بہتر مفاہمت پیدا کرنے کے لیے یہ پانچواں سیمینار تھا جو ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی کوششوں سے منعقد ہوا۔ اس سیمینار کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ یہ ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر منعقد ہوا اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اس کے لیے جامعہ ملیہ کا انتخاب کیا گیا۔ مشہور ماہر تعلیم اور جودھ پور یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر وی وی جان۔ نے افتتاحی اجلاس کی صدارت کی اور شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی نے افتتاح فرمایا اور جامعہ ملیہ کے شعبۂ اسلامیات کے صدر اور پروفیسر، ڈاکٹر مشیر الحق نے ناظم کے فرائض انجام دئے۔ شیخ الجامعہ صاحب نے سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ: عیسائیوں اور مسلمانوں میں عالمی سطح پر بہت اچھے تعلقات رہے ہیں اور اس سے نہ صرف یہ کہ دونوں قوموں کے درمیان مفاہمت کا رشتہ مضبوط ہوا بلکہ بعض عالمی مسائل کو حل کرنے میں آسانیاں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے فرمایا کہ مساوات کا اصول دونوں قوموں میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے، عیسائیت کا کہنا ہے کہ تمام انسان خدا کے بیٹے ہیں اور اسلام کہتا ہے کہ تمام بنی نوع انسان خدا کے بندے ہیں۔ اگر ان دونوں عظیم قوموں میں کبھی کوئی اختلاف پیدا ہوا تو اس کے اسباب سیاسی تھے نہ کہ مذہبی۔ موجودہ دور میں، جبکہ دنیا طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہے،

دونوں مذاہب زندہ اور متحرک قوت کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں اس کی پوری گنجائش اور صلاحیت ہے کہ موجودہ مسائل کو مذہبی احکام اور تعلیمات کی روشنی میں حل کرسکیں۔ جنوبی افریقہ کے حبشیوں اور سفید فام اقوام دونوں کی عیسائیت نے خدمت کی ہے اور دونوں میں یکساں مقبول رہی ہے، ابھی حال میں ایران میں سامراجیت اور شہنشائیت کے خلاف اسلام کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی اور وہاں کی زندگی اور نظام حکومت میں انقلاب کا باعث ہوا، یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس وقت وہاں ایک ایسی صورت پیدا ہوگئی ہے جو نہ تو ایران کے لیے مفید ہے اور دنیا کے امن وامان کے لیے۔ اپنی افتتاحی تقریر کے آخر میں شیخ الجامعہ صاحب نے اس سیمینار کا خیرمقدم کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے قوی امید ہے کہ عیسائی اور مسلمان علماء اور اسکالروں کا یہ اجتماع مفید ثابت ہوگا اور ان کی باہمی مفاہمت سے مفید نتائج پیدا ہوں گے۔

ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز (حیدرآباد) کے ڈائرکٹر ایس بھجن نے سیمینار کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ کی تاریخ اور خدمات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے فرمایا کہ ۱۹۳۰ء میں لاہور میں اس کی بنیاد رکھی گئی تھی، اس کا بنیادی مقصد اسلام اور عیسائی مسلم تعلقات کا مطالعہ ہے اور یہ کہ دونوں قوموں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان مستحکم تعلقات قائم کئے جائیں اور دونوں میں افہام وتفہیم کی خوشگوار فضا پیدا ہو۔ ملک کی تقسیم کے بعد اس ادارے کو ہندوستان میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ کچھ عرصے تک علی گڑھ میں رہا اور آخر میں حیدرآباد میں منتقل کردیا گیا۔ موصوف نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ اس ادارے کے قیام پر پچاس سال گزر چکے اور اس کے منتظمین نے اس کی سلور جوبلی منانے کا فیصلہ کیا تو اس کے جلسے کے لیے انھیں مناسب جگہ کی تلاش تھی۔ مختلف لوگوں سے مشورے کے بعد بالآخر جامعہ ملیہ اسلامیہ کا انتخاب عمل میں آیا۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ فیصلہ ہر لحاظ سے بہت ہی موزوں اور مناسب تھا، جامعہ ملیہ نہ صرف یہ کہ ایک مشہور یونیورسٹی ہے، بلکہ یہاں اسلامی علوم کے مطالعہ کے لیے ایک انسٹی ٹیوٹ

بھی ہے، جس کے ڈائرکٹر ضیاء الحسن فاروقی صاحب ہیں اور اسلامیات و عرب ایرینین اسٹڈیز کا ایک شعبہ بھی ہے جس کے صدر ڈاکٹر مشیر الحق ہیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ ان کے اور جامعہ کے دوسرے اساتذہ اور فضلا کے تعاون سے یہ سیمینار کامیاب ہوگا۔ آخر میں آپ نے جامعہ کے تمام اساتذہ، کارکنوں اور طالب علموں کو عید کی پیشگی مبارکباد دی۔

ڈاکٹر بھجن کی تقریر کے بعد، جناب ضیاء الحسن فاروقی، ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز اور ڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ کی سلور جوبلی پر ڈاکٹر بھجن اور ان کے رفقاء کو مبارکباد دی۔ اپنی طرف سے، جامعہ ملیہ کی طرف سے اور تمام اساتذہ کی طرف سے۔ انھوں نے ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ: اس کے مقاصد جامعہ کے مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اور ہمیں بے حد خوشی ہے کہ اس کی مخلصانہ کوششوں سے اسلامی مطالعہ کا کام اطمینان بخش طور پر انجام پا رہا ہے اور مسلمانوں اور عیسائیوں میں، باہمی بحث و مباحثہ اور گفت و شنید کے ذریعے، مفاہمت کے لیے خوشگوار فضا پیدا ہوتی ہے۔ سیمینار کے موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ: ہندوستان میں مذہب اور ضمیر کو پوری طرح آزادی حاصل ہے اور تمام فرقوں اور قوموں کے تہذیبی اور مذہبی حقوق دستوری طور پر محفوظ ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ ہندوستان کی مذہبی اقلیتیں ایک طرف اپنی تہذیبی تشخص کی بقا کے لیے کوشش کریں اور دوسری طرف آزاد ہندوستان کی تعمیر میں جی جان سے لگ جائیں۔

آخر میں پروفیسر وی وی جان نے اپنی صدارتی تقریر میں دستور ہند کی ان دفعات کا ذکر فرمایا جس میں تمام فرقوں اور قوموں کو اپنے مذہب اور قومی روایات کے مطابق تعلیم دینے اور اس کا انتظام کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ موصوف اقلیتی کمیشن کے رکن اور کچھ عرصے کے لیے اس کے صدر بھی رہے ہیں، اس لیے اپنے تجربے کی بنا پر بھی حاضرین جلسہ کو یقین دلایا کہ دستوری طور پر سیکولر ہندوستان میں نہ صرف یہ کہ مذہبی تعلیم کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، بلکہ وہ تمام آسانیاں

حاصل ہیں جو شاید کسی مذہبی نظام حکومت میں تمام قوموں کو یکساں طور پر حاصل نہ ہوئیں۔

موصوف نے جامعہ ملیہ کی تعلیمی خدمات کی بھی تعریف کی، خاص طور پر مذہبی تعلیم کے سلسلے میں اس نے جو انجام دی ہیں۔ صدر جلسے کی تقریر کے بعد پروفیسر منیر الحق نے، جنھوں نے سہ روزہ سیمنار کے ناظم کے فرائض انجام دیئے، مہمانوں، مقالہ نگاروں اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

اس افتتاحی اجلاس کے بعد، اس سہ روزہ سیمینار میں حسب ذیل مقالے پڑھے گئے:۔

۱۔	ڈاکٹر سالم شریف فری چرچ، نئی دہلی	عیسائیوں میں مذہبی تعلیم کی روایات
۲۔	ڈاکٹر محمد اقبال انصاری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	مسلمانوں میں مذہبی تعلیم کی روایات
۳۔	فادر ٹی۔ وی۔ کنن کل سینٹ زیویرس ہائی اسکول دہلی	موجودہ نظام تعلیم میں مذہبی تعلیم
۴۔	جناب عبد اللہ ولی بخش قادری جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی	" " "
۵۔	ریویرنڈ پی۔ ڈی۔ شام راؤ کرسچین ریٹریٹ اینڈ اسٹڈی۔ دہرادون	مذہبی تعلیم میں نئے امکانات، مواد اور طریقے
۶۔	ڈاکٹر عابد الحسن آزاد فاروقی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	" " " "

حسب ذیل حضرات نے افتتاحی اجلاس کے علاوہ دوسرے اجلاسوں کی صدارت کی:

پہلا اجلاس :	جناب اے۔ سی۔ دھرم راج (نئی دہلی)
دوسرا " :	جناب عبد اللہ ولی بخش قادری (جامعہ ملیہ)
تیسرا " :	ڈاکٹر ایس۔ وی۔ بھجن (حیدرآباد)
چوتھا " :	ڈاکٹر محمود الحق (مسلم یونیورسٹی)
پانچواں " :	ڈاکٹر سی۔ ڈبلو۔ ٹرال (دہلی)

چھٹا اجلاس (اختتامی) : ڈاکٹر محمد اقبال انصاری (مسلم یونیورسٹی)

اختتامی اجلاس کے سکریٹری کی حیثیت سے ڈاکٹر ٹرال نے سیمینار کے مباحث کا خلاصہ بیان کیا اور سیمینار کی سفارشات پیش کیں جو مختصر گفتگو اور کچھ اضافے کے ساتھ منظور کی گئیں۔ اس سے پہلے ڈاکٹر ماجد علی خان صاحب نے اختتامی اجلاس کی مختصر رپورٹ پیش کی۔ آخر میں مندوبین کی طرف سے ڈاکٹر محمود الحق نے اور ہنری مارٹن انسٹی کی طرف سے اس کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر بیجن نے سیمینار کے منتظمین کا شکریہ ادا کیا اور جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں کو عید کی مبارک باد دی۔ سب سے آخر میں سیمینار کے ناظم پروفیسر مشیر الحق صاحب نے مندوبین کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ اگر انھیں کسی قسم کی کوئی تکلیف ہوئی ہو تو اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔

دوپہر کے کھانے کے بعد، ڈاکٹر بیجن نے مطبخ اور سیمینار کے ملازمین کو ان کی مخلصانہ خدمات پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور عید کی مبارک باد کے ساتھ انھیں عیدی عنایت کی۔ انتہائی خوشگوار فضا میں سیمینار ختم ہوا اور مہمان رخصت ہوئے۔

ایک ہردلعزیز استاد کی وفات

ہمیں بہت افسوس ہے کہ جامعہ کے ایک جوان اور ہردلعزیز استاد جناب جنید انصاری صاحب کا عین عید کے دن، ۲۰ اکتوبر کو تقریباً ۱۲ بجے ہولی فیملی ہسپتال میں اچانک انتقال ہوگیا۔ اِنّا للّٰہ واِنّا اِلیہ راجعون۔ موصوف معروف نواسی نام سے جو شروع میں لکھا گیا ہے، مگر آپ کا پورا نام ابوالقاسم محمد جنید انصاری تھا۔

موصوف عرصے سے دل کے مریض تھے، دل کا پہلا دورہ ۱۹۷۶ء میں اٹھا تھا اور ۵ ستمبر کو آپ ہولی فیملی ہسپتال میں داخل ہوئے تھے، علاج معالجے سے آپ اچھے ہوگئے اور کچھ عرصے کے بعد حسب معمول تعلیمی فرائض انجام دینے لگے، مگر اس دورے سے پہلے جیسی آپ کی صحت تھی وہ پھر کبھی واپس نہ آسکی، مگر بذلہ سنجی جو مرحوم کی طبیعت اور مزاج کا ایک لازمی جزو تھی، وہ ہمیشہ برقرار رہی اور وہ جس توجہ سے کلاس میں

پڑھاتے تھے اور اپنے طالب علموں کے تعلیمی کاموں میں جو شخصی دلچسپی لیتے تھے، اس میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا، ان کی یہی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے ان کا جامعہ کے ہر دلعزیز اساتذہ میں شمار ہوتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ جب ان کے اچانک انتقال کی خبر مشہور ہوئی تو ان کے اعزا، رفقائے کار اور جامعہ برادری کے علاوہ ان کے طالب علم بھی بے حد متاثر ہوئے۔

عید والی رات میں ان کے دل میں کچھ تکلیف ہوئی تو مرحوم نے اسے ریاحی درد سمجھ کر اپنے طور پر کچھ تدابیر کیں اور بالآخر نیند آگئی۔ دیر میں سوئے تھے اس لیے دیر میں آنکھ کھلی، ناشتہ کیا تو پھر کچھ تکلیف محسوس کی، اسی وقت ہولی فیملی گئے، ڈاکٹر نے دل کا دورہ بتلایا اور اسی لحاظ سے علاج شروع ہوا، مگر چند گھنٹوں میں، تقریباً ساڑھے بارہ بجے دن کو اپنے معبودِ حقیقی کے پاس پہنچ گئے۔

مرحوم فرنگی محل لکھنؤ کے علماء کے مشہور خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۲ر جولائی ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوئے اور ۱۶ر اگست ۱۹۵۹ء کو جامعہ ملیہ کے ادارہ، اورل انسٹی ٹیوٹ میں لکچرر کی حیثیت سے کام شروع کیا، سوشیالوجی (سماجیات)، آپ کا خصوصی مضمون تھا، لیکن آپ کا مطالعہ بہت وسیع تھا، اپنے مضمون کے علاوہ دوسرے علمی اور تعلیمی مسائل پر بھی گہری نظر تھی۔ افسوس کہ تقریباً ۴۶ سال کی عمر میں ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئے۔ ۲۰ر اور ۲۱ر کو جامعہ میں عید الاضحیٰ کی چھٹیاں تھیں، ۲۲ر کو جامعہ کھلی تو مرحوم کے سوگ میں چھٹی کا اعلان کر دیا گیا۔

ایک مخلص کارکن کی وفات

رسالہ تیار تھا اور کاپیاں پریس بھیجی جارہی تھیں کہ جامعہ کے ایک کارکن جناب عبدالعزیز کی اچانک وفات کی اطلاع ملی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔

موصوف شعبۂ تعمیرات میں الکٹریشین تھے، بچپن ہی سے تقریباً ۳۰۔۳۲ سال سے جامعہ میں کام کر رہے تھے۔ طبعاً خاموش پسند تھے، زیادہ تر اپنے کام سے کام رکھتے تھے

اور خلوص اور ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرتے تھے۔

۲۴ر اکتوبر کو بعد نماز جمعہ، کوئی دو ڈھائی بجے موصوف کے سینے میں درد اٹھا، جامعہ کے ہسپتال میں دکھلایا گیا تو دل کا دورہ تشخیص کیا گیا، فوراً ہی دلی کے ایک سرکاری ہسپتال صفدر جنگ میں داخل کیا گیا، تقریباً ۴ بجے دوسرا دورہ پڑا، مگر کچھ دیر بعد طبیعت سنبھل گئی، ڈاکٹر کے علاوہ خود مریض نے بھی اطمینان دلایا کہ اب ان کو آرام ہے، گھبرانے کی چنداں ضرورت نہیں، اس لیے ایک صاحب کے علاوہ باقی عزیز و اقارب گھر واپس آ گئے، مگر آج ۲۵ر اکتوبر کو صبح سویرے اطلاع ملی کہ پونے پانچ بجے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مرحوم کی عمر تقریباً ۴۶، ۴۷ سال تھی۔ جامعہ میں فوراً ہی چھٹی کا اعلان کر دیا گیا اور تمام شعبے بند ہو گئے۔

شمس الحسن مرحوم کا سنہ پیدائش

پچھلے شمارے میں ڈاکٹر شمس الحسن صاحب کی وفات پر کوائف جامعہ میں جو نوٹ شائع ہوا تھا، اس میں کتابت کی غلطی سے سنہ غلط چھپ گیا ہے، ۱۹۴۵ء کے بجائے ۱۹۱۴ء شائع ہوا ہے، براہ کرم قارئین تصحیح فرمالیں۔ تاریخ وہی ہے جو شائع ہوئی ہے یعنی: ۲۰ر اکتوبر ۱۹۴۵ء۔

(کوائف نگار)

تعارف وتبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجے جائیں)

از : ڈاکٹر عابد پیشاوری

انشاء کے حریف و حلیف سائز : ۱۸×۲۲، حجم ۲۰۴ صفحات، مجلد مع گرد پوش،

قیمت : ۳۰ روپے۔ سنہ طباعت : ۱۹۷۹ء

ناشر : اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد۔

ڈاکٹر عابد پیشاوری اردو کے خوشگو شاعر اور ایک اچھے اسکالر ہیں، فارسی زبان پر اچھی قدرت ہے اور اردو کا مطالعہ وسیع ہے۔ اس لیے وہ اردو کے قدیم اساتذہ اور نثر نگاروں اور اردو ادب کے جس پہلو یا موضوع پر بھی تنقیدی یا تحقیقی کوئی چیز لکھیں گے، یقیناً وہ خاصے کی چیز ہوگی، اسی لحاظ سے زیر تبصرہ کتاب، "انشاء کے حریف و حلیف" بھی اردو ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

موصوف نے انشاء پر تحقیقی کام کیا ہے، انھوں نے اس کام کا آغاز ۱۹۶۲ء میں کیا تھا، کوئی ۱۳ سال کی محنت و تحقیق کے بعد اواخر ۱۹۷۵ء میں مکمل کر کے جموں یونیورسٹی کے حوالہ کیا اور دوسرے سال، فروری ۱۹۷۶ء میں اس پر پی ایچ ڈی کی سند عطا ہوئی، مگر افسوس کہ اب تک یہ مقالہ شائع نہیں ہو سکا ہے۔ آج کل اردو مطبوعات کی کساد بازاری اور کس مپرسی کا جو حال ہے، وہ سب کو معلوم ہے، کوئی "بازاری" یا ہلکی پھلکی چیز ہو تو اس کے پبلشر آسانی سے مل جاتے ہیں لیکن اگر کوئی علمی اور معیاری

کتاب ہو اور ذرا ضخیم بھی تو اس کو چھاپنے کے لیے کوئی ناشر تیار نہیں ہوتا۔ چنانچہ بقول مصنف "بہت سے تحقیقی مقالے یونیورسٹیوں کے کتب خانوں میں پڑے سڑا کرتے ہیں، اس کا فائدہ یہ ہے کہ بہت سے کھوٹے سکے ٹٹ پونجیوں کی ساکھ کی ضمانت بن جاتے ہیں اور نقصان یہ کہ کئی کھرے سکے بھی دفینوں کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔" (صفحہ ۱۰) وہ ناشر بھی جو علمی ادبی معیاری کتابوں کی اشاعت کا دعویٰ کرتے ہیں، عام طور پر وہ کتابیں شائع کرتے ہیں جو آسانی سے اور جلد فروخت ہو جائیں یا جن پر مصنف کو کچھ دینا نہ پڑے اور اگر مصنف سے مسودے کے علاوہ کچھ مالی امداد بھی مل سکے تو کیا کہنا ہے۔ غرض یہ کہ طباعت و اشاعت کی دقتوں کی وجہ سے عابد پشاوری صاحب کا یہ تحقیقی مقالہ اب تک شائع نہ ہو سکا۔ بعض ناشر اس کا کوئی مخصوص حصہ شائع کرنا چاہتے تھے، مگر یہ بات فاضل مصنف کو پسند نہیں تھی، وہ لکھتے ہیں:

"کاروباری یا دیگر مصالح کے پیش نظر پبلشر دست کش ہو گئے، کچھ نے اپنی پسند کے یا منافع بخش اجزا شائع کرنے کی پیش کش کی، جسے میں نے منظور نہ کیا، خیال تھا پورا مقالہ دو جلدوں میں بہ یک وقت شائع ہو گا، ایک جلد حیات اور شخصیت پر مشتمل ہو گی اور دوسری تصانیف اور اس کے جائزے پر، لیکن: اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔" (صفحہ ۹)

بہرحال طباعت و اشاعت کی ان ہی دقتوں کی وجہ سے اب مجبور ہو کر فاضلِ مصنف نے اس مقالے کا ایک حصہ پیش نظر نام کے ساتھ شائع کیا ہے، جس کے عنوانات، اعتذار اور تمہید کے علاوہ، حسب ذیل ہیں:

(۱) انشا اور عظیم (۲) انشا اور مصحفی (۳) انشا اور فائق (۴) انشا اور قتیل (۵) انشا اور محمد حسین آزاد۔

انشا کی خصوصیات میں ایک اہم خصوصیت ان کی ادبی معرکہ آرائی ہے۔ اردو کے قدیم ادب میں معاصرانہ چشمک اور باہمی ادبی معرکہ آرائی کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ ویسے تو فاضل مصنف کا خیال ہے کہ: "حال میں بھی کبھی کبھی ان کی جھلک دیکھنے کو مل جاتی ہے" (صفحہ ۱۲) اور اس

سلسلے میں کچھ قابلِ ذکر کچھ ناقابلِ ذکر شعرا اور نقادوں کا ذکر کیا ہے، جس کی تفصیلات صفحات ۱۴ اور ۱۵ پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ مگر میرے خیال میں یہ اختلافات نہ تو معاصرانہ چشمک کی وجہ سے تھے اور نہ ان کو ادبی معرکہ آرائی سے موسوم کیا جاسکتا ہے، ان کی حیثیت یا تو اختلافِ رائے کی ہے یا زیادہ سے زیادہ ذاتی مخاصمت یا مخالفت کہا جاسکتا ہے۔ بہرحال جہاں تک انشاؔ کا تعلق ہے، ان کی ادبی معرکہ آرائی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور بقول شخصے:

" انشاؔ کی شخصیت اور سیرت کو سمجھنے کے لیے ان کے ادبی معرکوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے، کیونکہ یہ معرکے ساری زندگی انشاؔ کے ساتھ لگے رہے ہیں۔ انشاؔ جہاں جہاں بھی گئے، یہ معرکے سائے کی طرح ان کے ساتھ لگے رہے۔ کیونکہ انشاؔ زیادہ تر دہلی یا لکھنؤ میں رہے، اس لیے دہلی یا لکھنؤ میں ان کے جو معرکے ہوئے وہ اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیں گے" ۱؎ ان ادبی معرکوں پر بہت تفصیل کے ساتھ زیرِ تبصرہ کتاب میں بحث و گفتگو کی گئی ہے اور تنقید و تحقیق کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔

اس کتاب کا نام ہے: " انشاؔ کے حریف و حلیف "۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فاضل مصنف نے لکھا ہے: " انشاؔ کے حریفوں کے باب میں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں لیکن ان کے حلیفوں میں کوئی نام نظر نہیں آتا، اگرچہ دوستوں کی کمی نہیں، تاہم مولانا محمد حسین آزاد مرحوم پر انشاؔ کی صریح طرف داری کی تہمت رکھی جاتی ہے، چنانچہ انھیں انشاؔ کے حلیفوں میں مان کر ان کی " طرف داری " کو پرکھا گیا ہے " (صفحہ ۱۱) اس اقتباس میں خط کشیدہ لفظ قابلِ توجہ ہے اور وہ لفظ بھی جو واوین میں ہے اور یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ واوین خود مصنف کے ہیں۔ اس بحث کو پڑھنے کے بعد میرا تاثر کچھ اس قسم کا ہے کہ مولانا آزاد بھی " حلیف " سے زیادہ حریف نظر آتے ہیں۔

انشاؔ کی تاریخِ ولادت میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ اس پر فاضل مصنف نے اصل کتاب میں بحث کی ہوگی، زیرِ تبصرہ کتاب میں اس کا کوئی موقع نہیں تھا، مگر ایک جگہ

۱؎ ڈاکٹر اسلم پرویز: انشاء اللہ خان انشاؔ عہد اور فن، مطبوعہ ۱۔ جولائی ۱۹۷۱ء، دہلی صفحہ ۱۱۳

ضمناً اس کا ذکر آگیا ہے۔ موصوف نے لکھا ہے: "۱۲۰۵ھ میں انشاء کی عمر تقریباً ۴۹ برس کی تھی" (ص ۱۷۹) اسی صفحہ پر حاشیے میں ہے: "ترکی روزنامچے میں ص ۴۰ پر جملہ آیا ہے: کیا خوب، ادھر دیکھیے، سبحان اللہ چہ خوش، آپ پچاس برس کے ہیں۔ یہ ذکر پنجشنبہ ۱۴ جمادی الثانی ۱۲۲۳ھ کا ہے۔ یہ قطعی عمر نہیں ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انشاء پچاس برس کے ہو چکے تھے۔ ہمارے حساب سے اس وقت انشاء کی عمر ۵۳ برس تھی۔"

اب حساب کیا جائے تو دونوں بیانات کے لحاظ سے الگ الگ سنہ ولادت طے پاتا ہے۔ پہلے بیان کے مطابق سنہ ولادت ۱۱۷۹ھ ہوتا ہے اور دوسرے بیان کے خط کشیدہ جملے کے لحاظ سے ۱۱۷۰ھ ہے۔ پہلے سنہ ہجری کا عیسوی سنہ ۱۷۶۵ء اور دوسرے سنہ ہجری کا ۱۷۵۶ء ہے۔ ڈاکٹر زور نے اردو شاعری کے انتخاب میں انشاء کا سال ولادت ۱۷۵۶ء لکھا ہے۔ مقبول احمد داؤدی نے لکھا ہے کہ: "ستر سال کی عمر میں ۱۸۱۷ء میں وفات پائی" اسی لحاظ سے سال ولادت ۱۷۴۷ء ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے لکھا ہے: "نواب سراج الدولہ کا عہد اپریل ۱۷۵۶ء تا جون ۱۷۵۷ء مطابق رجب ۱۱۶۹ھ تا شوال ۱۱۷۰ھ ہے۔ اسی اثنا میں ان کی ولادت ہوئی۔" (انشاء اللہ خاں صفحہ ۲۱)

ایک اور مسئلہ انشاء کے املا کا ہے، بعض لوگ ہمزہ کے ساتھ لکھتے ہیں اور کچھ لوگ بغیر ہمزہ کے۔ زیر تبصرہ کتاب میں دونوں طرح لکھا ہے، ڈسٹ کور، جلد اور پہلے ٹائٹل پر ہمزہ کے ساتھ ہے، دوسرے ٹائٹل اور فہرست مضامین میں بغیر ہمزہ کے ہے۔ کتاب کے اندر پابندی سے بغیر ہمزہ کے لکھا گیا ہے، زیادہ بہتر ہوتا کہ ہر جگہ یکساں املا استعمال کیا گیا ہوتا۔ غالباً اس اختلاف کی ذمہ داری مصنف کے بجائے ناشر پر ہے، کیونکہ اگر مصنف نے ہمزہ کے ساتھ لکھا ہوتا تو کتاب کے اندر بھی اسی طرح لکھا ہوتا۔

کتاب بہر حال ہر لحاظ سے قابل مطالعہ ہے اور اردو میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ خدا کرے اصل مقالہ جلد شائع ہو کر تشنگانِ علم و ادب کی پیاس بجھانے کا باعث ہو۔

(عبد اللطیف اعظمی)


کیا
آپ کی روزانہ کی خوراک سے
آپ کے بدن کو پوری قوت اور
پورا فائدہ ملتا ہے؟
سنکارا
کے لیے بے مثال ٹانک

جامعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

جامعہ

سالانہ چندہ
[illegible] روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۷۷	بابت ماہ نومبر ۱۹۸۰ء	شمارہ ۱۱

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبداللطیف اعظمی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی، مطبوعہ: جمال پریس دہلی، ٹائیٹل: فائن پریس دہلی

شذرات

کچھ عرصہ سے ہمارے ملک کی جو حالت ہے اس سے کبھی کبھی یہ ڈر سا محسوس ہوتا ہے کہ یہ عظیم ملک تخریب و انتشار کی طاقتوں کے ہاتھوں بکھر کر نہ رہ جائے۔ آسام، فرقہ وارانہ فسادات، روز افزوں گرانی، ہیئت معاشی و اجتماعی کی بحرانی کیفیت، کسانوں کے ایجی ٹیشن، اور مزدوروں اور سرکاری ملازمین کی اسٹرائکیں ——— غرض ہر طرف ایک انتشار کی صورت ہے اور تخریبی طاقتیں ابھر کر سامنے آرہی ہیں۔ ان تمام مسائل میں سردست کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کے حل کی کوئی صورت دکھائی دیتی ہو۔ ملک کی سیاسی جماعتیں مثبت انداز میں کسی ذمہ داری کا مظاہرہ نہیں کررہی ہیں اور مرکزی حکومت پر چہار طرف سے تخریبی رجحانات اور انتشار پسند طاقتوں کا ایسا دباؤ ہے کہ اس کے اعصاب کی توانائی بھی ڈھیلی پڑتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ صورتِ حال ہر اس شخص کے لئے جو سوچتا اور محسوس کرتا ہے، خطرات سے پُر ہے اور ہم سب کا یہ فرض ہے کہ اس سے نپٹنے کے لئے پوری جدوجہد کریں۔

اس وقت سب سے بڑا خطرہ ملک کی سالمیت اور قوم کے اتحاد کو لاحق ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قومی یک جہتی کونسل کی از سر نو تشکیل کی گئی ہے۔ اس کونسل کی میٹنگ، نئی تشکیل کے ساتھ، ۱۴ نومبر کو نئی دہلی میں منعقد ہوئی ۔ اس طویل وقفہ سے خود یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہم کتنے عرصہ بعد خواب غفلت سے بیدار ہوئے ہیں، آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ جن خطرات کی طرف سے ہم مطمئن ہو کر سو گئے تھے، وہ اب زیادہ بھیانک روپ میں

ہمارے سر پر موجود ہیں۔

یک لحظہ غافل بودم وصد سالہ راہم دور شد

کونسل کا اجلاس کوئی آٹھ گھنٹے جاری رہا اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی اتحاد کے لئے مسلسل کام کرتے رہنے کے پختہ عزم کے ساتھ ختم ہو گیا۔ کونسل نے تین قائمہ کمیٹیاں بنادی ہیں۔ ایک کمیٹی کونسل کی کوششوں میں تال میل پیدا کرے گی، دوسری مختلف فرقوں کے درمیان میل جول کو فروغ دے گی اور تیسری قومی اتحاد کی ضرورت کے بارے میں لوگوں کو تعلیم و تربیت دینے کے پروگراموں کو عمل میں لائے گی۔

کونسل میں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی جو تقریر ہوئی اس سے جہاں ایک طرف ان کے جذبۂ درد مندی کا اظہار ہوتا ہے، وہیں اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر وسیع، دل فراخ اور دماغ کشادہ ہے۔ ان کی تقریر سے اس کا پتہ بھی چلتا ہے کہ انھوں نے مرض کی صحیح تشخیص کی ہے، بس اب سب کا اشتراک و تعاون حاصل ہو اور ہمت کے ساتھ اگر اس نسخہ کا استعمال ہو جو تجویز کیا گیا ہے، تو جلد ہی ہماری قوم شفایاب ہو کر ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتی ہے۔ اس کام میں جہاں حکومت کی ذمہ داری ہے وہاں ملک کے ہر طبقہ کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ قومی ایکتا اور ملکی مفاد کے لئے اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیں۔ وزیر اعظم نے کہا کہ ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہم کس قسم کا ہندوستان آنے والی نسلوں کے لئے ورثہ میں چھوڑیں گے —— ایک مضبوط، متحد اور اپنے آپ پر اعتماد کرنے والا ہندوستان یا لڑکھڑاتا، کمزور اور مریض ہندوستان؟ —— انھوں نے بڑے پُر اعتماد لہجہ میں کہا کہ ہمارے ملک کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ کوئی ذات، برادری یا گروپ سارے ملک پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ مسز گاندھی کی یہ بات بڑی فکر انگیز ہے اور ملک کی تاریخ شاہد ہے کہ جب کسی ذات، برادری یا گروپ نے اس کی کوشش کی تو قوم کی اس خصوصیت نے اس کی تمام کوشش کو ناکام کر دیا۔ ملک کی فسطائی طاقتوں کو ملک کی اس خصوصیت اور قوم کے اس مزاج کو خوب سمجھ لینا چاہئے۔ جب ماضی میں جبکہ تعلیم، قومی شعور اور مواصلات کے ذرائع کی بہت کمی تھی، کبھی ایسا نہیں ہوا تو آج اس عہد جدید میں یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی گروپ خواہ وہ کتنا ہی منظم

کیوں نہ ہو سارے ملک پر غلبہ حاصل کرلے ۔

فرقہ وارانہ تشدد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وزیر اعظم نے اس بات پر زور دیا کہ اس مسئلے سے نپٹنے کے لئے اب ایک نیا رُخ اپنانے کی ضرورت ہے ۔ مراد آباد ہو یا تری پورا ، واقعات اب تیزی سے رونما ہوتے ہیں اور فساد اور بلوے اب زیادہ مہلک اور بربریت کے ہوتے جارہے ہیں ۔ ہندوستان میں جس طرح مذاہب پھلے پھولے ، وہ رواداری ، بقائے باہم اور میل جول کی ایک قابل ذکر کہانی ہے ، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کے ساتھ ہم سماجی ناانصافیوں کو گوارا کرنے اور انھیں برقرار رکھنے کے قصور وار رہیں ۔ چھوت چھات کی پرانی لعنت ایک مکروہ جرم ہے ۔ گاندھی جی کے فیض سے جو پُر امن انقلاب آیا اس نے سماجی تبدیلی میں مدد دی ۔ ہمارا خیال تھا کہ تعلیم ، معاشی ترقی اور مکمل جمہوریت کے سہارے ہم مساوات کے ایک نئے دور میں داخل ہو سکیں گے لیکن تعلیم اور معاشی ترقی نے ملازمتوں کے لئے (اور کاروبار میں بھی) مقابلہ شدید تر کر دیا ہے ۔ اقلیتیں اور کمزور طبقے محسوس کرتے ہیں کہ وہ قومی زندگی کے اصل دھارے میں پورے طور پر نہیں آئے ہیں (وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ بعض طبقے جو ملک کی معاشیات پر قابض ہیں اور سیاست و حکومت میں غلبہ رکھتے ہیں ان کے قومی دھارے میں آنے کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں) ۔ ان کا خیال ہے کہ معاشی ترقی کے فوائد ، روزگار کے مواقع اور سیاسی اقتدار کی ساجھے داری میں ان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے ۔ جیسے جیسے بیداری بڑھتی ہے ، ان فرقوں کے نوجوان معاشی ترقی میں زیادہ حصہ مانگتے ہیں اور اس کے نتیجے میں زیادہ کشیدگی پیدا ہوتی ہے ۔ لیکن میرے خیال میں یہ گذر جانے والا دور ہے ۔ اس کا علاج زیادہ ترقی ، زیادہ تعلیم اور زیادہ مواقع ہیں ۔

آسام کے موجودہ مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے وزیر اعظم نے کہا کہ حکومت نے گفت و شنید ، مفاہمت اور ہمدردی کا راستہ اختیار کیا ہے ۔ وہاں کے طلبہ اور سرکاری ملازموں کو چاہئے کہ اس مسئلہ کو وسیع تر نقطۂ نظر ، قومی مفاد ، بین الاقوامی پس منظر ، قومی ذمہ داری اور انسانی بنیادوں پر دیکھیں ۔ یہ صحیح ہے کہ آسام کو نقصان نہ پہونچے لیکن ہندوستان کو بھی نقصان نہیں پہونچنا چاہئے ۔ وزیر اعظم

کی یہ بات بھی صحیح ہے کہ فرقہ وارانہ فساد کے مسئلہ کو اب تک لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ سمجھا جاتا رہا ہے لیکن اب اسے ایک وسیع تر تناظر میں دیکھنا چاہئے کیونکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس کے پیچھے تعلیم، روزگار اور معاشی مقابلے اور مسابقت کے عناصر بھی کارفرما ہیں، اب ہم انھیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ وزیر اعظم کا تجزیہ مرض کی صحیح صحیح تشخیص ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ مرکزی اور ریاستی حکومتیں اپنے چھٹے منصوبے میں کیا ترجیحات مقرر کرتی ہیں اور ان کو عمل میں لانے کی جو مشینری ہے اس کے کل پرزے کہاں تک ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ خیالات کی ہمارے یہاں کمی نہیں، ہمارے دانشور اور فنی ماہرین اچھی سے اچھی اسکیم تیار کر سکتے ہیں، بڑے مفید مشورے دے سکتے ہیں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا قومی شعور کتنا بیدار ہے، ہم کہاں تک ذات برادری، رنگ و مذہب، طبقہ واریت اور علاقائیت سے اوپر اٹھ سکتے ہیں۔ جمہوری اور سیکولر انداز نظر کا ہمیں کتنا پاس ہے، ہم جو حکومت میں ہیں اور ہم جو حکومت میں نہیں ہیں، ہم سب کتنے محب وطن ہیں کہ قومی مفاد کو بہر صورت ترجیح دیں ہم جو خود غرض ہیں، اپنی ذات، اپنے خاندان، اپنے طبقے اور اپنی برادری کے مفاد کو عمومی مفاد پر جس میں خود اپنا بھی فائدہ ہے، کہاں تک قربان کر سکتے ہیں، ہم جو فرض ناشناس ہیں اور قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کرتے ہیں، کتنی دور تک صحیح معنوں میں اپنا فرض پورا کرنے کے لئے جا سکتے ہیں، ہم جو کام نہیں کرتے، محنت نہیں کرتے اور اپنی اپنی جگہ مگن ہیں، ملک و قوم کے کام میں اپنے تساہل اور اپنی کاہلی کو کہاں تک قربان کر سکتے ہیں ——— یہ وہ سوال ہیں جن کا جواب آج ہمیں کمال دیانت داری سے عملی طور پر دینا ہے اگر ہمیں اپنی قوم اور اپنا ملک عزیز ہے۔ سیاست داں ہوں یا دانشور، کارخانوں میں کام کرنے والے ہوں یا کھیتوں میں، سرکاری ملازمین ہوں یا کاروبار کرنے والے، سبھی کو ان سوالوں کا جواب دینا ہے، اگر ہم نے کروٹ نہ لی اور اٹھ کھڑے ہونے اور عمل کی راہ پر چلنے کا عزم نہ کیا، اگر ہم نے خدا ترسی کے سہارے اپنا اخلاق درست نہ کیا اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنی اپنی جگہ اپنا فرض پورا نہ کیا تو ملک بکھر کر رہ جائے گا اور ہم سب لوگ اندھیری راہوں میں مارے جائیں گے۔

ضیاء الحسن فاروقی

تاریخِ دعوت وعزیمت

(حصّہ چہارم)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تصانیف میں تاریخ دعوت وعزیمت کے سلسلے کی کتابوں کو بلند مقام حاصل ہے۔ اس سلسلے کا پہلا حصّہ پہلی بار غالباً ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا، دوسرا حصّہ ۱۹۵۷ء میں، تیسرا حصّہ ۱۹۶۲ء میں اور چوتھا حصّہ اب ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا ہے۔ پہلے حصّے میں درج ذیل ابواب ہیں:-

۱- پہلی صدی کی اصلاحی کوششیں اور حضرت عمرؓ بن عبد العزیز
۲- دوسری صدی کی اصلاحی کوششیں اور حضرت حسن بصریؒ
۳- خلافتِ عبّاسیہ اور دینی دعوت وتذکیر
۴- تدوینِ حدیث وفقہ
۵- فتنۂ خلقِ قرآن اور امام احمدؒ بن حنبل
۶- فتنۂ اعتزال اور ابوالحسن اشعری اور ان کے پیرو
۷- علم کلام کا انحطاط، فلسفہ اور باطنیت کا فروغ اور ایک نئے متکلم کی ضرورت
۸- امام غزالیؒ
۹- حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ
۱۰- علامہ ابن جوزیؒ
۱۱- نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبیؒ

۱۲۔ شیخ الاسلام عزالدینؒ بن عبدالسلام
۱۳۔ فتنۂ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش
۱۴۔ مولانا جلال الدین رومیؒ اور مثنوی معنوی اور اس کا علمی اور اصلاحی مقام و پیغام۔

دوسرا حصّہ آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالم و مصلح شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کے سوانح حیات، ان کے صفات و کمالات، ان کی علمی و تصنیفی خصوصیات، ان کا تجدیدی و اصلاحی کام اور مقام اور ان کی اہم تصنیفات کا مفصل تعارف، اور ان کے ممتاز تلامذہ اور منتسبین کے حالات پر مشتمل ہے۔

تیسرے حصّہ میں جو ابواب ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ ہندوستان میں چشتی سلسلہ اور اس کے اکابر شیوخ۔ (۲) سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیؒ کے حالات و کمالات (۳)۔ (حضرت خواجہؒ کے) اخلاق و صفات (۴) اذواق و کیفیات (۵) افادات و تحقیقات (۶) فیوض و برکات (۷) حضرت خواجہؒ کی تعلیم و تربیت کے اثرات (۸) مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ (سوانح، ولادت سے بیعت تک) (۹) ہندوستان میں سلسلۂ فردوسیہ اور اس کے مشائخ کبار (۱۰) مجاہدہ و خلوت، قیام و سکونت اور ارشاد و تربیت (۱۱) صفات و خصوصیات (۱۲) وفات (۱۳) مکتوبات (۱۴) مقام کبریا (۱۵) مرتبۂ انسانیت (۱۶) تحقیقات و علوم عالیہ (۱۷) حفاظتِ دین و حمایتِ شریعت۔

چوتھے حصّہ میں جو اس مطالعہ کا موضوع ہے، مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ (۹۷۱ — ۱۰۳۴ھ) کے مفصل سوانح حیات، ان کا عہد اور ماحول، ان کے عظیم تجدیدی و انقلابی کارنامے کی اصل نوعیت کا بیان اور ان کا اور ان کے سلسلے کے مشائخ کا اپنی اور بعد کی صدیوں پر گہرے اثر اور ان کی اصلاحی و تربیتی خدمات کا ذکر ہے۔ چودھویں صدی ہجری کے اختتام پر، جو گذشتہ دو برس سے ان گنت سیمیناروں، کانفرنسوں، تقریبوں اور گوناگوں تصنیفی و تالیفی سرگرمیوں کا موضوع بنی ہوئی ہے، اپنے انگریزی اور عربی ایڈیشن کے ساتھ، مولانا علی میاں کی یہ گراں قدر اور ایمان پرور تصنیف ایک ایسا مہتم بالشان تحفہ

ہے جو انھیں جیسا عالم ربانی نہ صرف ملت اسلامیہ ہند کو بلکہ پوری ملت اسلامیہ عالم کو دے سکتا تھا۔ میں مولانائے موصوف کی خدمت میں اس کے لیے اپنا جذبۂ منت گزاری اور پُرخلوص مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ایک حرف کی تبدیلی کے ساتھ علّامہ اقبال کا یہ شعر مصنف اور اس کی اس تصنیف دونوں پر صادق آتا ہے:

سپاہ تازہ برانگیزد[1] از ولایتِ عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد ہست

ایک طرف تو یہ حقیقت ہے کہ زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے اور دوسری طرف قرآن کا یہ اعلان کہ اسلام خدا کا آخری پیغام ہے اور کامل اور مکمل طور پر دنیا کے سامنے آچکا ہے۔ مصنف کے الفاظ میں اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

"اس رواں دواں اور سدا جواں زندگی کا ساتھ دینے اور اس کی رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے آخری طور پر جس دین کو بھیجا ہے، اس کی بنیاد اگرچہ ابدی عقائد و حقائق پر ہے، مگر وہ زندگی سے پُر ہے اور حرکت اس کی رگ و پے میں بھری ہوئی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ہر حال میں دنیا کی رہنمائی کر سکے اور ہر منزل میں تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دے سکے۔ وہ کسی خاص عہد کی تہذیب یا کسی خاص دور کا فنِ تعمیر نہیں ہے جو اس دور کی یادگاروں کے اندر محفوظ ہو اور اپنی زندگی کھو چکا ہو، بلکہ ایک زندہ دین ہے جو علیم و حکیم صانع کی صنعت کا بہترین نمونہ ہے ...... یہ دین چونکہ آخری اور عالمگیر دین ہے اور یہ امت آخری اور عالمگیر امت ہے، اس لیے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ دنیا کے مختلف انسانوں اور مختلف زمانوں سے اس امت کا واسطہ رہے گا اور ایسی کشمکش کا اس کو مقابلہ کرنا ہوگا جو کسی دوسری امت کو دنیا کی تاریخ میں پیش نہیں آئی، اس امت کو جو زمانہ دیا گیا ہے وہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات

---

[1] 'برانگیزم' کی بجائے 'برانگیزد' کر دیا گیا ہے۔

اور پُر از انقلابات ہے اور اس کے حالات میں جتنا تنوع ہے وہ تاریخ کے کسی گذشتہ دور میں نظر نہیں آتا۔" (تاریخ دعوت و عزیمت، حصہ اوّل صفحات ۱۷-۱۵)

جب ہر لمحہ بدلتی دنیا میں دین اسلام کا یہ مقام ٹھہرا تو پھر اس کا یہ مطلب ہے کہ اس کی گود میں ایسی شخصیتیں پروان چڑھتی رہیں جو ایسے وقت میں کہ جب اس کے وجود کے لیے کوئی خطرہ پیدا ہوا اور بدعات و مکروہات کے گرد و غبار اس کے چہرے پر چھا جائیں، تو وہ شخصیتیں اس کی نکھری ہوئی شکل میں اسے پیش کرکے اس کی تجدید کر دیں اور دنیا کو یہ بتا دیں کہ اصل دینِ اسلام یہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ راہ دعوت و عزیمت کی راہ ہوگی جو آزمائشوں سے گھری ہوئی ہوگی، ایسی شخصیتیں ان آزمائشوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر اپنی دعوت کے کام کی اشاعت کرتی ہیں۔ اپنے اس کام میں وہ دار و گیر، قید و بند اور سب و شتم غرض ہر صورت حال کے استقبال کے لیے تیار رہتی ہیں اور اپنی پوری ایمانی قوت، اخلاقی صلاحیت اور علمی و عملی استعداد اس راہ میں کھپا دیتی ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت شیخ احمدؒ سرہندی (۱۰۳۴-۹۷۱ھ) کی تھی جس نے ایک گوشہ عزلت میں بیٹھ کر وہ عظیم الشان کام انجام دیا جو بڑے سے بڑا حکمراں بھی انجام نہیں دے سکتا تھا۔ اس شخصیت نے "روحانی تزکیہ و تربیت کا وہ کام انجام دیا جس کے نتیجہ میں وہ مردان کار تیار ہوئے جنھوں نے ہندوستان کے مختلف مرکزی مقامات میں بیٹھ کر اور پھر افغانستان، ترکستان اور پھر عراق و شام و ترکی و حجاز میں پھیل کر یا دِ خدا کی سرگرمی، اعلاءِ کلمۃ اللہ کی کوشش، مردہ سنتوں کے احیاء، حمایتِ شریعت و اماتتِ بدعت کا عظیم الشان کام انجام دیا، وحدۃ الوجود کے غالی داعیوں اور آزاد مشرب صوفیوں کے اثرات کا ازالہ کیا، اور مختصر اُخدا طلبی اور احترامِ شریعت کا صور پھونک دیا اور کم سے کم تین صدیوں تک اس کام کو اس قوت و عزیمت اور اس انہاک و مصروفیت کے ساتھ جاری رکھا کہ پورے عالمِ اسلام میں ہر جگہ وہی نظر آتے ہیں، اور یہ تین صدیاں انھیں کی روحانی و علمی قیادت کی صدیاں کہلانے کی مستحق ہیں۔" (تاریخ دعوت و عزیمت، حصہ چہارم، صفحہ ۲۰)

شیخ احمدؒ سرہندی پر پچھلے پچیس تیس سال کے عرصہ میں اس ملک میں اور اس ملک کے باہر

جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا بیشتر حصّہ یا تو کسی سیاسی مقصد کے پیش نظر لکھا گیا ہے، یا کسی مخصوص نظریہ تاریخ کے آئینہ میں شیخ کی دینی شخصیت اور ان کے اصلاحی کاموں کو دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے بعض اہل قلم ایسے بھی ہیں جنھوں نے شیخ احمدؒ کی تمام تحریروں کو پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی، بعض نے ثانوی حیثیت کے مآخذ کے جستہ جستہ ٹکڑوں کو دیکھ کر ایک رائے قائم کرلی۔ بعض ایسے بھی ہیں جو ان علوم ومعارف سے براہ راست واقفیت نہیں رکھتے تھے جن کے سیاق وسباق میں یا جن سے متعلق شیخؒ نے اپنی تحریروں میں مختلف مباحث پر اظہار خیال کیا ہے۔ ہاں، اور ایسے لکھنے والے بھی ہیں جنھوں نے محض عقیدت سے شیخؒ کی شخصیت کو دیکھا اور علمی ومعروضی نقطۂ نظر سے اُن کے مجددانہ کارناموں کا مطالعہ نہیں کیا۔

ہمارا خیال ہے کہ مولانا علی میاں کی اس تصنیف میں اس قسم کی افراط وتفریط سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ شیخ احمدؒ سرہندی سے مصنف کو گہری عقیدت ہے، لیکن بجائے خود یہ کوئی ایسی معیوب بات نہیں، اگر اُن پر لکھنے والا خالص علمی نقطۂ نظر سے ان کے سوانح اور کارناموں کا جائزہ لے۔ مصنف علام نے "عرض مدعا" کے تحت کتاب کے شروع میں (صفحات ۲۰-۲۱) اس پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس سلسلے میں دو اور پہلو بھی قابل لحاظ تھے، ایک تو یہ کہ حضرت مجدد صاحب کے عہد کی تصویر کشی اور دورِ اکبری کا نقشہ پیش کرنے کے سلسلے میں مُلّا عبدالقادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" اور ان تاریخی ماخذ پر انحصار نہ رکھا جائے جو خاص دینی جذبات یا ایک خاص نقطۂ نظر کے حامل اور عہد اکبری کی تاریک سے تاریک تصویر پیش کرنے کے عادی ہیں، اس سلسلے میں ان غیر جانبدار مصنفین یا دربارِ اکبری کے ان اہل قلم کی تحریر وبیانات سے مواد حاصل کیا جائے جو نہ صرف یہ کہ اکبر کے مخالف نہ تھے بلکہ اس کے وکیل وتقیب اور اس کے خیالات ومقاصد کے ترجمان اور اس کے آئین سلطنت اور اس کے خداداد کمالات کے معترف تھے۔ اسی طرح ان تبدیلیوں کا بھی مورخانہ ومبصرانہ جائزہ لیا جائے جو جہانگیر کے دور سے شروع ہوکر عالمگیر کے عہد سلطنت پر جاکر مکمل ہوئیں اور اس

سلسلے میں بھی خاندان مجددیہ کے مصنفین کے بیانات اور خوش اعتقاد مؤرخوں کی شہادتوں کے بجائے غیر جانبدار مورخین ہندوستان کی کتابوں سے مواد اخذ کیا جائے ......

" نیز اس کی بھی ضرورت تھی کہ اس ربع صدی میں ہندوستان سے باہر اُردو اور انگریزی میں مجدد صاحب اور ان کے دور پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں بہت سے مشہورات و مسلمات کو چیلنج کیا گیا ہے۔ نئے سوالات اٹھائے گئے ہیں اور واقعات و معلومات یا اپنے اخذ کردہ نتائج کی مدد سے بالکل ایک نئی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے (جو اس تابناک اور درخشاں تصویر سے بہت مختلف ہے، جو ابھی تک پیش کی جاتی رہی ہے) ان کو بھی سامنے رکھا جائے ...."

زیر نظر کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے: (۱) عالم اسلام دسویں صدی (ہجری) میں (۲) اکبری عہد حکومت اور اس کے دو متضاد دور (۳) حضرت مجدد الف ثانیؒ ــــ حالات زندگی از ولادت تا خلافت (۴) اہم واقعات و حالات، ارشاد و تربیت کی سرگرمی، وفات (۵) حضرت مجدد کے دائرۂ "تجدید" کا مرکزی نقطہ، نبوت محمدی پر ایمان و اعتماد کی تجدید (۶) وحدت الوجود یا وحدت الشہود؟ (۷) اکبر سے جہانگیر تک، سلطنت کو راہ پر لانے کے لیے آپ کی خاموش جدوجہد (۸) حضرت مجدد کے دو خلفائے کبار اور ان کے منتسبین کے ذریعہ آپ کے تجدیدی کام کی توسیع و تکمیل۔ پوری کتاب مع مفصل اشاریہ ۴۳۶ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ طباعت و کتابت عمدہ آفسٹ کی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، اس کی ناشر اور قیمت تینتیس ۳۳ روپے ہے۔

کتاب میں حضرت مجدد کی شخصیت اور ان کے تجدیدی و اصلاحی کام کو دسویں صدی ہجری کے عالم اسلام کی سیاسی، علمی، مذہبی اور روحانی حالت، اس صدی کی عام ذہنی بے چینی اور اعتقادی انتشار خیال اور اس کے اسباب کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ بات صحیح ہے کہ اگر اس پس منظر کو سامنے نہ رکھا جائے اور اس کا تجزیہ شیخ سرہندیؒ کے کام کی

اہمیت کو سمجھنے کے لیے نہ کیا جاتے تو ہمیں ان کی تجدیدی و اصلاحی سرگرمیوں کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ہمارا خیال ہے کہ اس دور میں ان کی زندگی اور ان کے کام کا مطالعہ کرنے والے بعض جدید تعلیم یافتہ اہلِ قلم اور محققین نے اس راہ میں اِسی وجہ سے ٹھوکر کھائی ہے کہ ان کی نظر دسویں صدی ہجری کے عالم اسلام کی، علمی، مذہبی اور روحانی و اخلاقی حالت پر گہری نہ تھی اور انھوں نے اس صدی کے تاریخی و تحقیقی مطالعہ کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔ ہماری رائے میں مصنف کی علمی بصیرت نے ان کی اس کمی اور کمزوری کو صحیح صحیح سمجھا ہے اور اس کتاب کا باب اوّل لکھ کر مولانا نے شیخ سرہندی کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک متوازن اور ہموار لائحہ فکر فراہم کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس جائزہ میں ہم کو اس تاریخی حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا کہ ایک عہد کی دنیا اور انسانی معاشرہ ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح ہوتا ہے، جس کی ہر موج دوسری موج سے مربوط و متصل ہوتی ہے اس لیے کوئی ملک خواہ وہ باقی دنیا سے کتنا ہی کٹا ہوا اور الگ تھلگ زندگی گذار رہا ہو، گرد و پیش کی دنیا میں پیش آنے والے اہم واقعات، انقلابات، باہم نبرد آزما طاقتوں اور طاقتور تحریکوں سے یکسر غیر متاثر اور غیر متعلق نہیں رہ سکتا خاص طور پر جب یہ واقعات و انقلابات اس کے ہم جنس، ہم مسلک اور ہم عقیدہ پڑوسی ممالک میں پیش آرہے ہوں۔ اس بنا پر اس تاریخی جائزہ میں ہندوستان کے اندر محدود رہنا درست نہیں ہوگا۔ ہم کو دسویں صدی ہجری کی پوری دنیائے اسلام اور خاص طور پر گرد و پیش کے مسلم ممالک پر بھی نظر ڈالنی ہوگی جن سے اگرچہ ہندوستان کے سیاسی روابط نہ تھے، لیکن دینی، تہذیبی اور علمی روابط تھے، اور وہاں جو سرد و گرم ہوائیں چلتی تھیں ان کے جھونکے بُعدِ مسافت کے باوجود ہندوستان تک بھی پہونچ جاتے تھے۔ (صفحہ ۴۴)

شیخ سرہندیؒ کے وہ ناقدین جو مذہب سے بیگانہ نہیں یا مذہب کو فرد کا ایک ایسا نجی معاملہ سمجھتے ہیں کہ جیسے چاہے اپنی صوابدید سے اسے برتے اور اپنی سماجی زندگی پر اپنے

مذاہبی معتقدات کا کوئی اثر نہ پڑنے دے، درحقیقت دین اسلام کے مزاج سے واقف نہیں ہیں اور اس کے خدائی تقاضوں کی اہمیت کا احساس نہیں رکھتے۔ یہ لوگ دراصل تاریخ اسلام کی اس دینی روایت کے تسلسل سے بے خبر یا اس کے مخالف ہیں جو کتاب و سنت کو زندہ و تابندہ رکھنے کی سعی مسلسل سے عبارت ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی تنقید و تبصرہ کا فریم ورک ہی دوسرا ہوگا اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سلسلے میں ان کی رائے کی کوئی علمی اساس نہیں اور اس موضوع پر ان کی تاریخ نویسی کی کوشش بھی محض سطحی اور غیر معتبر ہے۔ یہ بات ہم اس لئے بھی کہہ رہے ہیں کہ عام طور پر ناقدین کے اس طبقہ کے پیش نظر صرف چند ایسے مآخذ رہے ہیں جو مشہور و معروف ہیں اور کتب خانوں میں آسانی سے مل جاتے ہیں۔ بعضوں کے یہاں تو یہ صورت بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ ان سے پہلے اپنی فہم اور اپنے محدود وسائل کی بنیاد پر کسی نے ایک رائے کا اظہار کیا اور انھوں نے اسی کو آمنا و صدقنا کہہ کر دہرا دیا۔ اس کی بھی زحمت نہیں کی گئی کہ اُن مآخذ و وسائل کو از سر نو جانچ لیا جائے جن کی بنیاد پر پہلی رائے قائم کی گئی تھی۔ ایسی تحریریں جو اصطلاحی معنوں میں تاریخی مآخذ کے خانے میں نہیں رکھی جاتیں، قابلِ اعتنا نہیں سمجھی گئیں، حالانکہ علمی و تاریخی لحاظ سے اُن کی اہمیت و افادیت مسلم ہے۔ دوسری طرف حضرت مہدی کے وہ ناقدین ہیں جو بدعات و مکروہات اور تحریفات و تاویلات کے بوجھ تلے دبے رہے ہیں اور اس معاملہ میں بھی وہ تقلید کو جزو ایمان تصور کرتے ہیں۔ شریعت و طریقت، دونوں حلقوں میں ایسے لوگ ملتے ہیں، یہ لوگ تاریخ اسلام میں اس رجحان اور روایت کی ترجمانی اور نمایندگی کرتے ہیں جو ارباب رخصت کے موقف اور مطمح نظر سے عبارت رہی ہے۔ جبکہ ارباب عزیمت کی راہ ان سے ہمیشہ مختلف و متضاد رہی ہے۔ یہ ارباب دعوت و عزیمت، جہاں تک کہ اسلام کا تعلق ہے، تائید غیبی کے ساتھ اس کی تاریخ کے ہر نازک مرحلے پر سامنے آتے اور انھوں نے دین کو تازہ اور امت مسلمہ کو سرگرم عمل رکھا۔

علی میاں صاحب نے اس کتاب میں 'دسویں صدی کا فتنۂ کبریٰ' کے عنوان کے تحت (صفحات ۶۹ ـــ ۶۱) جو کچھ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس صدی میں بعض طباع اور طالع آزما اشخاص نے دنیائے اسلام کے ایک بڑے حصّہ کو اس مغالطہ میں مبتلا کر دیا تھا

کہ "الف ثانی" سے ایک نئے نظام کا آغاز ہوگا۔" ظہور اسلام کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ایک ہزار سال پورے ہو رہے تھے اور دوسرا ہزار شروع ہونے کو جا رہا تھا، ہر صدی کے سرے پر مجدد کا ظاہر ہونا، حدیث سے ثابت ہوتا ہے اور تاریخ بھی اس کا ثبوت فراہم کرتی ہے، اس لیے بعض ذہین لوگ دوسرے ہزار سال کے شروع ہونے پر مجدد سے زیادہ دین جدید کے موسس اور عالم کے نئے دور کے فاتح کے ظہور کے خواب دیکھنے لگے تھے اور ان میں بہت سے منچلے لوگوں نے اپنا نام اس منصب کے امیدواروں کی فہرست میں لکھانے کی کوشش بھی شروع کر دی تھی۔ ۔ ۔ اگر دسویں صدی کے عالم اسلام کی کوئی فکری تاریخ ہوتی تو ہمیں صاف نظر آتا کہ الف ثانی کے قرب نے کتنے دلوں میں تمنائے خام کے چراغ روشن کر دئے تھے، اور انھوں نے ایک نئی مسند پیشوائی اور ایک نئی سیادت و قیادت کا خیمہ نصب کرنے کے لیے چوب اور طنابیں مہیا کرنی شروع کر دی تھیں۔" مصنف نے اس عبارت کے لکھنے کے بعد ایران کی فکری حالت کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا ہے اور پھر لکھا ہے کہ "ایسی حالت میں نویں اور دسویں صدی کے ایران میں انتشار انگیز تحریکوں اور اسلام کے خلاف عقلی و فلسفی سازشوں کا پیدا ہونا خلاف قیاس اور خلاف توقع نہیں، جس کی سب سے ترقی یافتہ مثال نویں صدی کے اخیر اور دسویں صدی کے ابتدا کی نقطوی تحریک ہے، جو ایران کی اس بے چین روح کا بہترین مظہر ہے جس نے کبھی مزدک کی شکل میں، کبھی مانی کے روپ میں، اور کبھی حسن بن صباح کے لباس میں ظہور کیا تھا، اور جو خالص ایک ملحدانہ تحریک ہے۔"

اس سلسلے میں مصنف نے جن کتابوں اور تحریروں کے حوالے دئے ہیں، وہ عام طور پر حضرت مجدد کے ناقدین کے سامنے نہیں رہے یا پھر انھوں نے ان کتابوں اور تحریروں کو جانبدارانہ تاریخ نگاری کے حق میں مُضر سمجھا اور جان بوجھ کر ان سے صرف نظر کر گئے۔ مصنف نے کتاب کے اس حصّہ کے لیے جن کتابوں اور تحریروں سے استفادہ کیا ہے، ان میں تاریخ عالم آرائے عباسی (مصنفہ اسکندر منشی)، ماثر الامراء، دبستان مذاہب، نقطویان یا پسیخوانیان (مصنفہ دکتر صادق کیا)، تاریخی و ادبی مطالعے (مصنفہ ڈاکٹر نذیر احمد) اور مبلغ الرجال (مصنفہ خواجہ عبید اللہ معروف بہ خواجہ کلاں، نسخہ قلمی، مولانا آزاد لائبریری

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ، بھی شامل ہیں، اور ان میں بعض کتابیں ایسی ہیں جن سے ہمارے خیال میں حضرت مجدد کے اکثر ناقدین نے استفادہ نہیں کیا ہوگا۔ تاریخ عالم آرائے عباسی اور مبلغ الرجال کا حوالہ دیتے ہوتے مصنف نے لکھا ہے کہ "ابو الفضل علّامی کے متعلق بعض معاصر تاریخ نویسوں کا بیان ہے کہ وہ نقطوی تحریک سے متاثر تھا، شاہ عباس صفوی نے نصر آباد کاشان میں ممتاز ترین نقطوی داعی اور ذمّہ دار میر سیّد احمد کاشی کو جب قتل کیا تو اس کے کاغذات کے ذخیرے میں جن نقطویوں کے خطوط ملے، ان میں ابو الفضل کا بھی ایک خط تھا، معاصر تاریخ نویس اسکندر منشی " تاریخ عالم آرائے عباسی " میں لکھتا ہے : "ہندوستان سے آنے جانے والوں سے معلوم ہوا کہ ابو الفضل پسر شیخ مبارک بھی ۔۔۔۔۔ اسی مذہب کا پیرو ہے، اس نے اکبر بادشاہ کو وسیع المشرب بنا کر جادہ شریعت سے منحرف کر دیا ہے، اس کا خط جو میر احمد کاشی کے نام لکھا گیا تھا اور جو میر مذکور کے کاغذات میں دستیاب ہوا، ابو الفضل کے نقطوی ہونے پر دلالت کرتا ہے"۔ خواجہ کلاں اپنی کتاب " مبلغ الرجال " میں محمود بسیخوانی کا ذکر کرتے ہوتے لکھتے ہیں : "شیخ ابو الفضل ناگوری بساط آں آئین خسارت قرین را در مملکت ہندوستان گسترد"۔ ان تاریخی شہادتوں کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ نقطوی فرقہ یا تحریک کے داعیوں اور علمبرداروں نے ہندوستان اکبر الف ثانی کے لئے نئے دور، نئے دین اور نئے آئین کے لئے کس طرح ایک تخت اور مسند تیار کر رکھی تھی، جس پر مسند آرا ہونے کے لئے ایک با اختیار و طاقتور موزوں شخصیت درکار تھی، اور اس کے لیے ان کی نظر میں اکبر سے زیادہ کوئی اہل نہ تھا"۔ حضرت مجدد کا اصل تجدیدی کارنامہ کیا تھا ؟ اس کو بھرپور طور پر سمجھنے اور تاریخِ اسلام کی دسویں۔ گیارہویں صدی کے بعد آنے والے دور میں اس کی قدر و قیمت کا صحیح صحیح اندازہ کرنے کے لئے، یہ ضروری ہے کہ اس چوکھٹے میں اس کے خد و خال کا مطالعہ کیا جائے ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علماء سو اور زاہدان دنیا دار نے اسلام کے چہرے کو جس طرح مسخ کر دیا تھا اور چہار طرف سے جیسی یلغار اسلام پر تھی اور اگر اکبر بادشاہ کی طرح (اس کی زندگی کے دوسرے دور میں) اس کے جانشین بھی حمیت دینی سے عاری ہوتے، اور اس صورت حال کو بدل دینے کا عزم لے کر کوئی شخصیت کھڑی نہ ہوتی تو

اس کا قوی امکان تھا کہ اسلام کا حشر ہندوستان میں وہی ہوتا جو اس سے قبل اسپین میں ہو چکا تھا۔

حضرت مجدد کا کام تاریخ ساز اور عہد آفریں تھا، غیرت دینی سے سرشار مسلمان اس حقیقت کو مثبت انداز سے دیکھتے ہیں، اور وہ جو اسلام کو کتاب و سنّت کے بجائے اپنے اپنے ضمیر کی روشنی میں دیکھتے اور اس سلسلے میں تاویلات وتحریفات سے کام لیتے ہیں یا وہ جو ہندوستان میں اسلام کی تاریخ کو خالص قومی اور سیکولر نقطۂ نظر سے لکھنا اور پڑھنا چاہتے ہیں اور اس لئے وہ ہندوستان میں اسلام کو عمومی و عالمی تاریخ اسلام سے الگ سمجھتے ہیں وہ اور اس فکر کے دوسرے لوگ، اس حقیقت کو منفی انداز سے دیکھتے ہیں، لیکن یہ دونوں گروہ، بہر حال، ان کے تجدیدی کام کی تاریخ سازی و عہد آفرینی سے انکار نہیں کر سکتے۔ کتاب کے مصنف نے بڑی خوش سلیقگی سے، اپنے گہرے اور تجزیاتی مطالعے کے ساتھ، اس تاریخ ساز شخصیت کے تجدیدی کام اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور پھر اس کے گہرے اثرات کا جو آنے والی صدیوں پر پڑے، ذکر کیا ہے۔ نبوت محمدی پر ایمان و اعتماد، غیبی و مابعد الطبیعی حقائق کے سلسلے میں عقل و کشف کا عجز، نبوت کا ضورا ور اس کا منصب، حکمت الاشراق کی کمزوریاں اور درماندگیاں، ولی اور نبی کا فرق، سنّت کا احیاء اور "بدعت حسنہ" کی تردید، وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے نظریوں کی باریکیاں اور ان کے مضمرات و اثرات، توحید وجودی کی نفی اور توحید شہودی کا اثبات، سلطنت و امارت کے فکر و عمل کو ایک نیا رُخ دینے اور راہ راست پر لانے کی جدوجہد، وقت کی مخصوص صورت حال میں تجدیدی کام کا صحیح طریقہ، ——— یہ تمام بحثیں اپنے پورے سیاق و سباق کے ساتھ اس کتاب میں موجود ہیں، ہمارا خیال ہے کہ حضرت مجددؒ کی شخصیت، ان کے افکار، ان کے موقف اور تجدیدی کام اور اس کے طریقہ کار پر ابھی تک اس سے بہتر اور کوئی اسٹڈی نہیں کی گئی ہے۔

کتاب میں طباعت کی غلطیاں برائے نام ہیں۔ اس میں ایک فرو گذاشت یہ ہو گئی ہے کہ مآثر الامراء کے مصنف شاہنواز خاں کے ساتھ کہیں خافی خاں اور کہیں خوافی خاں

لکھ دیا گیا ہے، شاہنواز خاں اور خافی خاں دو الگ شخصیتیں ہیں، یہ شاید اُن کے کسی اسسٹنٹ کی فروگذاشت ہے ۔ہم نے مصنف کی توجہ اس طرف دلائی اور انھوں نے اس پر حیرت اور افسوس کا اظہار کیا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، کتاب کا اشاریہ بہت اچھی طرح اور تفصیل سے ترتیب دیا گیا ہے اور اس سے کتاب کے مطالعہ کرنے والوں کو بہت مدد ملے گی ۔

آخر میں ہم مصنف علام کو ایک بار پھر ان کی اس تصنیف پر مبارکباد پیش کرتے ہیں ۔ بلاشبہ ان کی یہ کتاب چودھویں صدی کے اختتام پر مسلمانان ہند ہی کے لیے نہیں بلکہ پورے عالمِ اسلام کے لیے ایک گراں قدر تحفہ اور ایک حیات آفریں پیغام ہے اور یہی ایک بوریہ نشیں لیکن قلب و نظر کی متاع بے بہا رکھنے والے صاحبِ قلم کی طرف سے پیش کیا جا سکتا تھا۔

سیّد محمد کمال الدین حسین ہمدانی

اقبال اور سیّد علی ہمدانی

علامہ اقبال اُن مفکرین میں ہیں جنھوں نے یورپ میں تحصیل علوم کے بعد مشرقی علوم کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور یورپی مفکرین، فلاسفہ اور شعرار کی تعریفیں کیں تو اسلامی علمار، عرفار فلاسفہ اور صوفیا کی مدح سرائی میں گہرہائے آبدار نچھاور کیے۔

علامہ اقبال کے کلام کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ وہ تصوف کے دلدادہ تھے اور صوفیائے کرام سے عقیدت رکھتے تھے، لیکن ان کے نزدیک تصوف کا معیار بہت بلند اور نہایت پاکیزہ تھا۔ انھوں نے جس طرح صوفیائے حق کی مدح سرائی فرمائی اسی طرح صوفیائے سو کی ردّ و قدح بھی کی۔

درحقیقت علامہ اقبال ان صوفیا میں شامل ہیں جو مجدد تصوف تھے۔ انھوں نے اپنے نظریۂ تصوف کو اسرار خودی اور رموز بے خودی میں واضح طور سے پیش کیا ہے۔ جناب میکش اکبرآبادی نے "نقد اقبال" میں علامہ اقبال کے نظریۂ تصوف کو نہایت خوبی کے ساتھ واضح فرمایا ہے۔

علامہ اقبال نے جن صوفیار کی مدح فرمائی ہے ان میں حضرت میر سیّد علی ہمدانی علیہ الرحمہ سرفہرست ہیں۔ علامہ اقبال نے آپ کی مدح و ثنا میں جو اشعار لکھے ہیں وہ جاوید نامہ میں شامل ہیں [1]

---

[1] بعنوان "زیارت امیر کبیر حضرت سیّد علی ہمدانی و ملّا طاہر غنی کشمیری" اور "در حضور شاہ ہمدان"

میر سید علی ہمدانی علیہ الرحمہ ان ممتاز عارفین اور مبلغین اسلام میں سے ہیں جنھوں نے کشمیر میں دین اسلام کی تبلیغ فرمائی۔ آپ کے تذکرے جو مورخین کشمیر نے لکھے ہیں، شاہد ہیں کہ آپ نے سات سو سادات عظام کے ساتھ ہمدان (ایران) سے امیر تیمور کے عہد میں ہجرت فرمائی اور کشمیر کے تین تبلیغی دورے فرمائے۔ پہلا دورہ ۷۶۲ھ میں دوسرا دورہ ۷۸۱ھ میں اور تیسرا دورہ ۷۸۵ھ میں فرمایا اور آخر کار پکھلی (ہزارہ۔ پنجاب) میں ۷۸۶ھ میں وفات پائی۔ آپ کا دفن آپ کے آبائی قبرستان واقع ختلان معروف بہ کولان میں واقع ہوا جو دور حاضر میں روس میں شامل ہے اور تاجکستان میں استالن آباد[1] کے نام سے موسوم ہے۔ آپ کے تینوں تبلیغی دورے کامیاب ہوئے اور سینتیس ہزار (۳۷،۰۰۰) لوگ آپ کے دست حق پرست پر اسلام لائے اور سلاطین وقت سلطان شہاب الدین کشمیری اور سلطان قطب الدین بھی دل سے آپ کے معتقد ہوئے۔

حضرت میر سید علی ہمدانی کی وفات کے بعد آپ کے فرزند ارجمند میر سید محمد ہمدانی بارہ سال کی عمر میں ۷۸۶ھ میں کشمیر میں تین سو سادات عظام کے ساتھ تشریف لائے۔ سلطان وقت سکندر آپ کا معتقد ہوا اور آپ کے ایما پر سرینگر اور ترال وغیرہ مقامات پر عالیشان خانقاہیں تعمیر ہوئیں جو مراکز تصوف و عرفان حق تعالیٰ کی حیثیت سے آج بھی مرجع عوام و خواص ہیں۔

حضرت میر سید علی ہمدانی علیہ الرحمہ کا شمار اس عہد کے اعلیٰ مصنفین و مفکرین میں ہوتا ہے۔ وہ اعلیٰ پایہ کے شاعر بھی تھے، اکثر کتابیں تصوف و عرفان پر آپ نے تصنیف فرمائی ہیں۔ آپ کی کتابیں، مودۃ القربیٰ، ذخیرۃ الملوک، چہل اسرار اور اوراد فتحیہ بہت مشہور ہیں اور شائع ہو چکی ہیں۔ آپ کی اکثر تصانیف کشمیر میں قدیم کتب خانوں میں قلمی صورت میں محفوظ ہیں جو علم و عرفان کا گراں بہا خزانہ ہیں۔

علامہ اقبال جب کشمیر جنت نظیر کی سیر و سیاحت کو تشریف لے گئے تو وہاں حضرت

---

[1] استالن آباد کو اب دوشنبے کہتے ہیں۔

شاہ ہمدان، میر سید علی ہمدانی علیہ الرحمہ کی یادگار خانقاہ مُعلّیٰ کی زیارت سے بھی مشرف ہوتے جو سرینگر میں فتح کدل کے نزدیک واقع ہے اور بعد تحقیق بسیار حضرت شاہ ہمدان کے علم وفضل اور عرفانی و تبلیغی کارناموں سے نہایت متاثر ہوتے اور آپ کے معتقد ہوتے۔ جناب جگن ناتھ آزاد کا ایک مضمون بعنوان "شاہ ہمدان کے حضور میں" "شیرازہ" اقبال نمبر میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں جناب آزاد نے بیان کیا ہے کہ علامہ اقبال نے بعض الجھے ہوئے مسائل میں شاہ ہمدان سے ان کی تصانیف کے ذریعہ استفادہ کیا حتیٰ کہ ان کے قلب کا اضطراب سکون میں تبدیل ہوگیا اور علامہ اقبال کو وہ روشنی ملی کہ جس سے آپ کے نغمے میں ایک نئی کیفیت اور روح میں نئی تب وتاب پیدا ہوئی اور شاہ ہمدان کی عظمت وجلال سے آپ اس درجہ متاثر ہوئے کہ آپکی زبان سے شاہ ہمدان کی شان میں قصائد جاری ہوتے جو جاویدنامہ میں شائع ہوتے۔

علامہ اقبال کو حضرت میر سید علی ہمدانی علیہ الرحمہ سے جو عقیدت ہوئی وہ آپ کے کلام بانظام سے ہر مقام پر ظاہر ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

سیّد السّادات سالارِ عجم　　　　دست او معمارِ تقدیرِ اُمم

اس شعر میں شاہ ہمدان حضرت میر سید علی ہمدانی علیہ الرحمہ کو علامہ اقبال نے سیّد السّادات کے لقب سے ملقب فرمایا ہے جو حقیقت ہے، اس لئے کہ کشمیر میں جن سادات نے تبلیغی کارنامے انجام دیئے ان میں حضرت میر سید علی ہمدانی علیہ الرحمہ افضل و اعلیٰ ہیں۔ اور سالار عجم کے لقب سے اس بنا پر یاد کیا کہ آپ کی تبلیغ کا مرکز ابتداءً عجم رہا اور بعدہٗ کشمیر بنا۔

دوسرے مصرعہ "دست او معمار تقدیر امم" کی تشریح میں یہ لکھنا کافی ہے کہ آپ نے مختلف اقوام کو گمراہی سے نجات دلاکر ابدی فلاح اور دائمی سعادت سے سرفراز فرمایا۔ از ہمدان (ایران) تا کشمیر (ہندوستان) مختلف اقوام کو اسلام کی حقانیت سے مشرف فرمایا اور ان کی تقدیر کو بدل ڈالا اور کفر وضلالت کی تاریکیوں سے ان کے قلوب کو پاک کرکے دین حق کے نور سے منور فرمایا۔ حقیقتاً حضرت میر سید علی ہمدانی علیہ الرحمہ کا دست حق پرست، معمار تقدیر امم تھا جس کی تصدیق شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں فرمائی ہے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں :

تا غزالی درس اللہ ہو گرفت ذکر و فکر از دودمان او گرفت

شاہ ہمدان نے علم و عرفان، عارف و صوفی غزالی کی طرح، خاندان نبوگی سے حاصل فرمایا۔ شاہ ہمدان حضرت میر سید علی ہمدانی نجیب الطرفین سادات عظام سے تھے۔ اور حضرت امام حسن رضی اللہ و حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطے سے حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سیدۃ النساء حضرت فاطمہ زہرہ صلوٰۃ اللہ علیہا بنت حضرت رسول خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے تھے اور انہی ذوات مطہرہ کے انوار سے روحانی توسل حاصل تھا جس سے آپ کو سلسلہ بہ سلسلہ یہ روحانی طاقت حاصل ہوئی کہ جس کی تاثیر سے کشمیر میں اسلام نے فروغ پایا۔

حضرت میر سید علی ہمدانی علیہ الرحمہ ساجد و عابد، معتکف اور اوراد خوان ہی نہ تھے بلکہ آپ نے وادی کشمیر کو درحقیقت جنت نظیر بنایا اور سلاطین و امراء سے لے کر عارفین و فقراء تک سب ہی کو فلاح و نجات کی حقیقی عرفانی راہ دکھائی، آپ ایک طرف رموز و نکات عرفانیہ سے آگاہ تھے تو دوسری طرف سیاست اور ملک رانی پر بھی آپ کو بصیرت کامل حاصل تھی۔ چنانچہ آپ نے بادشاہوں اور امیروں کو حکم رانی کے ساتھ عدل گستری کا درس بھی دیا جیسا کہ آپ کی کتاب ذخیرۃ الملوک سے واضح ہے۔ علامہ اقبال نے آپ کے انہی صفات حسنہ کو حسب ذیل شعر میں بیان فرمایا ہے :

مرشد آں کشور مینو نظیر میر و درویش و سلاطیں را مشیر

حضرت میر سید علی ہمدانی علیہ الرحمہ نے خطۂ کشمیر میں علم، دین اور تہذیب و تمدن کے وہ چشمے جاری فرمائے کہ جن سے خطۂ کشمیر کے اقوام کی حالت سدھر گئی اور قابل رشک بن گئی۔ انہی حقائق سے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے حضرت کی تعریف میں یہ اشعار ارشاد فرمائے :

خطہ را آں شاہ دریا آستیں داد علم و صنعت و تہذیب و دیں

آفرید آں مرد ایران صغیر با ہنرہائے غریب و دلپذیر

شاہ دریا آستین کا لقب شاہ ہمدان کے لئے حقیقتاً زیبا ہے اس لئے کہ آپ کی ذات اقدس وہ موجزن دریائے حقیقت ہے کہ جس سے خطۂ کشمیر میں علم و دین اور تہذیب و

تمدن کے سبے بہا چشمے جاری ہوتے ہیں۔ اور حضرت کے مجاہدانہ کردار اور باطل کو توت کی تعریف میں حسب ذیل مصرعہ علامہ نے ارشاد فرمایا:

یک نگاہ او کشاید صد گرہ

علامہ اقبال حضرت میر سید علی ہمدانی کی حیات اور تبلیغی کارناموں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہمارے موجودہ دینی، تمدنی اور سیاسی مشکلات کا واحد حل حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کی صحیح پیروی اور حقیقی تقلید ہے۔ اور اسی نظریہ کے مطابق آپ نے قوم کو ہدایت فرمائی کہ: "خیز و تیرش را بدل را ہے بدہ"

یعنی کتنا مبارک ہے وہ سینہ اور کس قدر خوش قسمت ہے وہ مرد خود آگاہ کہ جس نے حضرت میر سید علی ہمدانی کے تیر کو اپنے دل میں جگہ دے کر اپنے کو اسی صیاد حق پرست کا صید بنایا

غرضیکہ علامہ اقبال نے حضرت میر سید علی ہمدانی علیہ الرحمہ کی مدح و ثنا جس معنی خیز عرفانی طریق پر کی ہے دوسرے کلام میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ علامہ اقبال کے اشعار تذکرۂ حضرت میر سید علی ہمدانی علیہ الرحمہ کے لئے ان ستاروں کی مثل ہیں جو رونق آسمان ہوتے ہیں اور ان پھولوں کے مانند ہیں جو جان چمن ہوتے ہیں ——— علامہ اقبال کے جس قصیدے کے اشعار پر سطور بالا میں تبصرہ کیا گیا ہے اس کے چند اشعار جاوید نامہ سے ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں

گفت رومی" آنچہ می آید نگر — دل مدہ با آنچہ بگذشت اے پسر!
شاعر رنگیں نوا طاہر غنی — فقر او باطن غنی ظاہر غنی
نغمہ می خواند آں مست مدام — در حضور سید والا مقام
سید السادات سالار عجم — دست او معمار تقدیر امم
تا غزالی درس اللہ ھو گرفت — ذکر و فکر از دودمان او گرفت
مرشد آں کشور مینو نظیر — میر و درویش و سلاطیں را مشیر
خطہ را آں شاہ دریا آستیں — داد علم و صنعت و تہذیب و دیں
آفرید آں مرد ایران صغیر — با ہنر ہائے غریب و دلپذیر

یک نگاہ او کشاید صد گرہ
خیز و تیرش را بدل را ہے بدہ"

مجیب رضوی

ہندوستانی فکر

بہوجن ہتائے، بہوجن سکھائے

بہوجن ہتائے، بہوجن سکھائے یعنی بیشتر لوگوں کا مفاد، بیشتر لوگوں کا سکھ چین۔ یہ تصور بھی مغرب سے آکر دبے پاؤں ہندوستانی فکر میں داخل ہوگیا ہے۔ اسی لئے قدیم ہندوستانی نظامِ فکر میں اس کی نشاندہی ممکن نہیں ہے۔ اس تصور کا تعلق دنیاوی اور مادّی زندگی سے ہے اور ہمارے رشی منی مادی زندگی کو موہ مایا سمجھ کر قابلِ احتراز سمجھتے تھے۔ ان کی آنکھیں اور ان کا ذہن آسمان کی طرف لگا تھا، وہ زمین پر رونما ہونے والے واقعات اور اپنے ماحول کی کیفیات پر کم ہی دھیان دیتے تھے۔ ان کے لئے مادی اور سماجی زندگی ایک ناگزیر حقیقت تھی اور اس کے چاروں حصّوں کی انھوں نے توضیح و توسیع بھی کی ہے۔ اَرتھ (معاشی زندگی)، کام (سماجی زندگی)، دھرم (فرائض)، موکش (نجات) پر بحثیں اٹھائی گئی ہیں لیکن معاشی، سماجی اور فرائض سے متعلق مسائل کو اخلاقیات کے بندھن میں جکڑ کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ جب تک لوگ ان اخلاقی اصول پر کاربند رہے اور ذاتیں اور افراد اپنے فرائض کو احکام خداوندی سمجھ کر پورا کرتے رہے تب تک ادھر توجہ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، دنیا سے اس طرح فرصت پاکر ہمارے مفکّرین نجات کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ نتیجے کے طور پر مذہبی سلسلوں میں اضافہ ہوتا گیا اور طرح طرح کی طرزِ عبادت وجود میں آتی گئیں۔ ہندوستانی فکر دین سنوارتا رہا اور دنیا بگڑتی گئی۔

بہتو بھی ہوتا ہے کا تعلق اصل میں ملکیت سے ہے۔ مغرب میں اس پر غور وفکر زمانہ قبل مسیح سے شروع ہو گیا تھا۔ اہل مغرب کی نظریں دنیا سنوارنے کی طرف زیادہ تھیں۔ افلاطون نے ایک آدرش ریاست کا خواب دیکھا لیکن وہ نجی ملکیت سے کچھ اتنا متنفر ہوا کہ زن وشو کے رشتے کو ہی ختم کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ نہ کوئی کسی کی بیوی ہوگی اور نہ ہی کوئی کسی کی اولاد۔ لوگ بیوی بچوں کے لئے ہی دولت جمع کرتے ہیں۔ اس نے اسی لئے اپنی سمجھ میں نجی ملکیت کی بنیادی وجہ کو ختم کر کے اس مسئلے سے نجات پانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد متواتر مغربی فکر میں نجی ملکیت کا مسئلہ زیر غور رہا ہے۔ میکیاولی نے کہا کہ سماج کے نشوونما میں حرکت پیدا کرنے والی طاقت انسان کی موروثی خودغرضی ہے اور نجی ملکیت اس کا اعلیٰ مظہر ہے۔ ریاست اور سماج کے رشتوں پر غور وفکر کرنے والوں کے ذہنوں پر بہت دنوں تک میکیاولی حاوی رہا۔ دوسری طرف کیمپینے لا نے ایک ایسے سماج کا نقشہ پیش کیا جس میں نہ دولت ہے اور نہ ملکیت۔ لیکن اس کی کتاب "سورج کا شہر" صرف چند باذوق اشخاص کو ہی متاثر کر سکی۔

روسو کی فطری انسان کے متلاشی کی حیثیت سے شہرت زیادہ ہے۔ لیکن اس نے بھی ملکیت کے مسئلے پر اپنی رائے دی ہے۔ اُسے ایسا سماج قابل قبول ہے جس میں نہ دولت کی افراط ہو اور نہ ہی غربت کی انتہا ہو۔ افراط اور انتہا کا تعین بعد میں اس کے پیروکار کرتے رہے، طرح طرح کی تاویلیں دیتے رہے۔ ایک دوسرے فرانسیسی مفکر فوریر نے ملکیت کو ہی تمام برائیوں کی جڑ قرار دیا۔ لیکن فرانس میں ہی ایسے فیز سماج کا تصور اُبھرا جس کے مطابق نجی ملکیت کی پوری آزادی ہونی چاہئے اور جائداد اور دولت کمانے پر کسی طرح کی پابندی عائد نہیں ہونی چاہئے۔ انگلینڈ میں سینٹ سمان نے نجی ملکیت کی وجہ سے انسان کے ہاتھوں انسان کی استعماریت کے خلاف آواز بلند کی۔ غرضیکہ ملکیت نجی ہو یا سماجی ایک ایسا مسئلہ رہا ہے جس کا مغربی نظام فکر میں ایک خاص مقام ہے۔ صدیوں سے اس کا تذکرہ ہوتا آیا ہے، اس پر تبصرہ ہوتا رہا ہے اور اس فکر سے سماج برابر متاثر ہوتا رہا ہے۔ لیکن انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں

فیبین اشتراکیوں کا دور دورہ تھا۔ انگلینڈ سے بہت پہلے فرانس میں یہ نظریہ جڑ پکڑ چکا تھا۔ سرمایہ داری کی لوٹ کھسوٹ عریاں ہوکر سامنے آچکی تھی۔ مارکس کی سائنسی اشتراکیت مقبول عام ہو رہی تھی۔

اسی دوران انگلینڈ کے مفکر بنتھیم نے اس سلسلے میں اپنا نظریۂ افادیت[1] پیش کیا۔" بہوجن ہتائے" میں بینتھم کے اسی خیال کی بھرپور عکاسی ہے۔ بینتھم کے شاگرد جان اسٹورٹ مل نے اس خیال کی توضیح کی اور سرمایہ داری اور اشتراکیت میں تال میل بیٹھانے کی کوشش کی۔ سیاسیات میں اسی نظریہ کو فلاحی ریاست کا نام دیا گیا ہے۔ سیدھی سادی زبان میں اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ نجی ملکیت قائم رہے اور دولت کا فائدہ ریاست کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ عوام کو پہونچے۔ انگلینڈ میں فلاحی ریاست کا نظریہ جب مقبول عام ہو رہا تھا تبھی ہندوستان سے کافی تعداد میں طالب علم انگلینڈ بغرض اعلیٰ تعلیم گئے تھے۔ ان کے ذہنوں پر اس کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ ہمارے ملک میں بہت سی معاشی اور سیاسی اصطلاحات کو سکہ رائج الوقت بنانے میں پنڈت جواہر لال نہرو کا ہاتھ رہا ہے۔ ان کے ذہن پر فلاحی ریاست کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ اس لئے ان کی قیادت میں تشکیل پانے والے ہمارے دستور العمل اور ہماری ریاست کے بنیادی اصولوں پر اس نظریہ کی پوری پوری چھاپ ہے۔ ہمارے ملک میں نجی ملکیت اور قومی ملکیت کے درمیان تال میل بیٹھانے کی کوشش نظر آتی ہے۔ ہماری ریاست کا یقین اشتراکیت میں نہیں بلکہ اشتراکی سماج میں ہے۔ چونکہ اشتراکیت میں نجی ملکیت اور ذرائع پیداوار پر کچھ لوگوں کا اختیار قابل قبول نہیں ہے اور ہم لوگوں کو ایک طرف یہ اختیار دیتے ہیں اور دوسری طرف اس سے پیدا ہونے والی استعماریت کا سدباب کرنے کے لئے ریاستی طاقت کو ذریعہ بناتے ہیں، اسی لئے ہم اس نئے تجربہ کی بنا پر اپنی کوششوں کو اشتراکی سماج کہتے ہیں۔ بہوجن ہتائے کی ہندوستانی فکر میں یہی تعبیر ہے۔ دولت اکٹھا کرنے کی اجازت ہے لیکن بہت سی بندشوں کے ساتھ، تجارت کرنے کی چھوٹ ہے لیکن بہت سے ضابطوں کی پابندی کے ساتھ، کارخانے چلانے کا ہمارے شہریوں کو حق ہے، اس میں کام

---

[1] 'GREATEST GOOD OF THE GREATEST NUMBER' کا نظریہ

کرنے والے مزدوروں کی محنت سے فائدہ اٹھانے کا بھرپور اختیار ہے، لیکن کارخانے من مانی کرنے کے لئے آزاد نہیں ہیں۔ مزدور کی اجرت، بونس، پراوی ڈنٹ فنڈ، تعطیلات، کام کے اوقات اور مزدوروں کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں ریاستی ضابطوں پر کاربند ہونا نہایت ضروری۔ دولت کی اجارہ داری کے خلاف ہماری ریاست برابر متوجہ رہتی ہے اور دولت کی منصفانہ تقسیم پر نظر رکھتی ہے۔ یہی ہمارا اپنوہن بتاتے ہیں۔

ریاست اور فرد کے عمل سے بیشتر لوگوں کو فائدہ پہونچے، یہ خیال جتنا خوش کن ہے اس کی راہ اتنی ہی پُرپیچ ہے۔ "بیشتر لوگوں" کی گنتی آسان نہیں ہے۔ ووٹوں کے لئے سروں کی گنتی یا سیاست داں کرتے ہیں اور یا اس کی ضرورت محکمہ مردم شماری کے عملے کو پڑتی ہے۔ ہم نے اپنی آسانی کے لئے اس کا مترادف عوام گھڑ لیا ہے۔ چنانچہ ہر شخص ہر میدان میں عوام کی دہائی دیتا سُنائی پڑتا ہے۔ اس عوام کی کوئی تعریف مشکل ہے۔ زمینداروں سے زمین لے کر اگر کسانوں میں تقسیم کر دی جائے تو صرف ایک گروہ کو زمین کا حق ملکیت حاصل ہو جائے گا۔ زمیندارانہ حقوق کے مبلغ کہتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے قطعات آراضی میں پیداوار کی لاگت زیادہ آئے گی اور غلّے کی پیداوار بھی کم ہو گی۔ اس طرح عوام کو غلّے کی قلت کا سامنا کرنا پڑے گا گویا صرف اس عمل سے عوام کے ایک حصّے کو فائدہ پہونچے گا، لیکن مجموعی طور پر عوام کو اس کا نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ اس طرح بہوجن ہتائے کا راستہ دشوار گذار ہو جاتا ہے۔ جو لوگ طبقات کی بہبود کو مدّنظر رکھتے ہیں ان کے لئے یہ مسئلہ آسان ہو جاتا ہے، لیکن جو اس سے گریز کرتے ہیں ان کے لئے عوام اور عوام کے درمیان حد فاصل کھینچنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے بہوجن ہتائے کا اطلاق اسی حد تک ممکن ہے کہ دولت مندوں سے دولت حاصل کر کے عام فلاح و بہبود کے کاموں پر خرچ کی جائے جن سے ہر کس و ناکس فائدہ اٹھا سکے۔

بہوجن ہتائے انگلینڈ کے افادیت پسندوں کی دین ہے۔ سوداگر ہی ہر چیز کو نفع نقصان کے ترازو میں تولتا ہے۔ سوداگرانہ مزاج رکھنے والے ہی اس طرح کا نظریہ پیش کر سکتے تھے۔ انھیں لوگوں کے زیر اثر ہمارا سیاسی، معاشی اور تعلیمی نظام تشکیل ہوا ہے۔

ہمارا مزاج ابھی تک تجارتی نہیں بن پایا ہے لیکن ہم نے ان تصورات کو اپنا لیا ہے اور اسی لئے ابھی تک سماجی اور اخلاقی الجھنوں میں مبتلا ہیں۔ ہمارے نظام فکر میں یا فرد پر زور ہے اور یا سب پر۔ اسی لئے گاندھی جی نے اپنے نظریئے کو سَروُدے کا نام دیا ہے۔ اس میں سب کی فلاح کا تصور ہے۔ اس لئے بہوجن ہتائے کی جگہ سروجن ہتائے ہندوستانی مزاج کے زیادہ قریب ہے۔ اس "سب" کی تعریف قدیم ہندوستان کے طرز فکر میں واضح ہے، یہ ہے "وَسُودَھیٔ کُٹمبکم" یعنی زمین کے سب باسی ایک خاندان ہیں۔ اس میں انسان کی تشخیص نہیں ہے، سارے جاندار ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ بہوجن ہتائے کے زیر اثر پیداوار بڑھائی جاتی ہے تاکہ لوگوں کو سستی اور کافی مقدار میں خوراک ملے اور اشیائے ضروری کم قیمت پر دستیاب ہوں۔ لیکن اس کے لئے سائنسی ایجادوں سے کیڑے مکوڑوں کو ختم کیا جاتا ہے۔ ان کی کمی کی وجہ سے بہت سے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ کیڑے مکوڑے ہزاروں بیماریوں کے کیڑوں کو اپنی خوراک بنا کر انسان کو تندرست رکھتے تھے۔ ان کی کمی کی وجہ سے انسانی صحت کے دشمنوں کو آزادی مل گئی۔ آب وہوا کو ان دوائیوں، چمنی کے دھوئیں، کارخانوں کی آلائش نے مکدر کیا اور اسے صاف رکھنے والے ہمارے ساتھی بھی ہم سے بچھڑ گئے۔ یہ سب ہوا زیادہ سے زیادہ لوگوں کی فلاح وبہبود کے لئے۔ اس سے ہم اسی نتیجے پر پہونچے ہیں کہ جو کام بہوجن ہتائے کے لئے کیا جائے وہ ضروری نہیں ہے کہ سب کو سکھ چین پہونچا سکے۔ بہوجن سکھائے ہو۔

بہوجن ہتائے کی طرح بہوجن سکھائے کی بھی ایک تاریخ ہے۔ اس تصور کا وجود بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے قبل ہندوستانی فکر میں ناپید ہے۔ بہوجن ہتائے کا تصور معاشی اور سیاسی ہے اور بہوجن سکھائے کا تصور روحانی اور ادبی ہے۔ اپنے شاہکار رام چرت مانس میں تلسی داس نے اعلان کیا کہ وہ " اپنے انبساط کے لئے رام کی کتھا بیان کرتے ہیں "۔ اپنے اس مصرعے میں انھوں نے "سُوانتا سُکھائے" کی اصطلاح استعمال کی ہے جس کا مطلب ہے نجی لطف وانبساط۔ اسی کے جوڑ پر "بہوجن سُکھائے" کی اصطلاح گھڑی گئی ہے جس کا مطلب ہے بیشتر لوگوں کے لطف وانبساط کے لئے۔ رامائن کے

مترجم چیلیشیف نے اپنے پیش لفظ میں رام کو لوک نایک (قائد عوام) بتایا اور ثابت کیا کہ تلسی داس نے رامائن اپنے لطف کے لئے نہیں لکھی بلکہ انھوں نے رام کی تمثیل کے ذریعہ عوامی جدوجہد کی راہ کا تعین کیا ہے، رام راج کے ذریعہ انھوں نے ایک خوش آئند کل کا مژدہ دیتے ہوئے عوام کو سنایا ہے۔ اس لئے تلسی داس کی رامائن سوانتا سکھائے نہیں ہے بلکہ بہوجن سکھائے ہے۔ تب سے تلسی داس کا ہر نقاد ان کے سلسلے میں بہوجن سکھائے کا استعمال ضرور کرتا ہے۔ تنقیدی ادب کے مبلغوں کا تو یہ تکیہ کلام ہے اس طرح بہوجن سکھائے سے مراد جسمانی اور مادی سکھ چین نہیں ہے۔ لیکن کہیں کی اینٹ، کہیں کا روڑا جوڑ کر فکری بھان متی کا کنبہ جوڑنے کی ہمیں عادت ہے۔ اسی کے تحت بہوجن ہتائے کے ساتھ بہوجن سکھائے جوڑ دیا گیا ہے ان کے میل سے معنی میں ابہام چاہے پیدا ہو گیا ہو لیکن موسیقی کا لطف ضرور حاصل ہوتا ہے۔

بہوجن سکھائے پر خالص مادی نقطہ نظر سے بھی سوچا جا سکتا ہے۔ ہر فلاح و بہبود کا قدم فوری طور پر سکھ اور چین کا ضامن نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک نسل درخت لگاتی ہے اور اس کا پھل دوسری نسل کو ملتا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے آزادی کی جنگ لڑی لیکن اس کا سکھ اور چین ہمیں میسر ہو رہا ہے۔ اس طرح بہوجن ہتائے کے کام دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک وہ جن کا نتیجہ فوری طور پر برآمد ہوتا ہے اور دوسرے وہ جن سے سکھ چین طویل مدت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک ایسا عمل ہے جو اپنے فائدے کے لئے کیا جاتا ہے اور دوسرا ایسا قدم ہے جو دوسروں کی فلاح کے لئے اٹھایا جاتا ہے۔ پہلے میں خود غرضی ہے اور دوسرے میں بے لوث خدمت ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان محض خود غرض ہے یا وہ کبھی اپنی اس سفلی جبلت سے نجات بھی حاصل کر پاتا ہے۔ آج کی دنیا کے ماہرین علم بڑے شد و مد سے اسی بحث میں مبتلا ہیں۔ علم سماجیات کے کچھ ماہر میکیاولی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خود غرضی کو ہی انسان کا جوہر سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف ایسے عالم ہیں جو انسان کو فطرتاً فرشتہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خود غرضی تو اقتصادی اور سماجی حالات نے انسان پر لاد دی ہے۔ وہ معاشی الجھنوں سے نجات پاتے ہی اپنی خود غرضی سے دستبردار ہو جائےگا۔

اگر یہ ممکن ہے تبھی یہ سوچا جا سکتا ہے کہ آج کا انسان طویل المدتی فلاحی کام کر سکتا ہے لیکن آج کی دنیا میں ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ ہم اپنے سکھ چین کے لئے آنے والی نسلوں کے مفاد کو دھکا پہونچا رہے ہیں۔ ہم نے جنگل صاف کر دیئے، معدنیات سے زمین خالی کر دی، پٹرول اور کوئلے کو بیس تیس سال میں ہضم کر جائیں گے۔ ہم نے اپنے تحفظ کے لئے ایٹم بم کے ذخیرے اکٹھے کر لئے ہیں جو تحفظ کے ضامن ہرگز نہیں ہیں۔ یہ سکنڈوں میں ہمیں نیست ونابود کر سکتے ہیں اور بقول آئنسٹائن دنیا میں صرف دو چار بندر ہم پر آنسو بہانے کے لئے رہ جائیں گے۔ ہمارے یہ سارے عمل بہوجن ہتائے ہو سکتے ہیں لیکن بہوجن سکھائے ہرگز نہیں ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہونا چاہئے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب آدم وحوا کی پوری نسل کا مفاد ہماری نظر میں ہو، اپنے سکھ چین کے ساتھ آنے والی نسلوں کے سکھ چین کا بھی ہمیں پاس ہو، ہر جاندار کا مفاد ہمارے پیش نظر ہو۔ ایسی صورت میں "بہوجن ہتائے" "سروجن ہتائے" ہو جائے گا اور "بہوجن سکھائے" "سروجن سکھائے" میں تبدیل ہو جائے گا اور تبھی ہم ان مغربی تصورات کو ہندوستان کی اسپرٹ میں ڈھال سکیں گے۔

۱۔ سترڈ یہ سب

شمیم حنفی

منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

شاعر کے اختیارات کا بیان کرتے ہوئے مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا تھا:

شاعر اگر چاہے تو امورات عادیہ کو بھی بالکل نیا کر دکھائے۔ پتھر کو گویا کر دے۔ درختان پا در گل کو رواں کر دے، ماضی کو حال، حال کو استقبال کر دے۔ دور کو نزدیک کر دے۔ زمین کو آسمان، خاک کو طلا، اندھیرے کو اجالا کر دے۔ اگر غور کر کے دیکھو تو اکسیر اور پارس اسی کو کہنا چاہئے کہ جسے چھو جائے سونا ہو جائے۔ زمین اور آسمان دونوں جہان شاعر کے دو مصرعوں میں ہے۔ ترازو اس کی شاعر کے ہاتھ میں رہے، جدھر چاہے جھکا دے۔

اس اختیار کا وسیلہ وہ پُرپیچ، پراسرار اور خلاقانہ قوت ہے جسے عام اصطلاح میں ہم شاعر کے تخیل سے تعبیر کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے ذکر میں آزاد کی یہ بات یوں یاد آگئی کہ یہی قوت ان کی بیشتر تحریروں میں ایک محرک کی حیثیت رکھتی ہے۔ خود آزاد، جنھوں نے معمولی شعر کہے اور اعلیٰ درجے کی تخلیقی نثر لکھی، اپنی شاعری میں تخیل اور فکر کے توازن کو قائم نہ رکھ سکے تھے۔ اس کے برعکس ان کی نثر کے وہ حصے جہاں ان کی شخصیت کا اظہار برجستہ ہوا ہے، ان کے تخیل کی فتوحات کا پتہ دیتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ اس قوت کے بغیر نہ شاعری اچھی بنتی ہے نہ نثر تخلیقی ہو سکتی ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے اظہار کا ذریعہ نثر کو بنایا مگر آزاد کی طرح انھوں نے بھی اپنی ذات کو اس منطق کے غلبے سے بچائے رکھا جو نثر سے تخلیق کا آب و رنگ چھین لیتی ہے۔ عرصہ ہوا، انتظار حسین نے آزاد کو اردو کا پہلا

افسانہ نگار کہا تھا۔ ادب سے محض پیشہ ورانہ دلچسپی رکھنے والے اس بات پر چونکیں گے کہ اردو افسانے کی روایت کا احاطہ کرتے وقت آزاد کا نام حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتا۔ ادب کا ہر باخبر قاری، معلم، نقاد، طالب علم نثر و نظم کے امتیاز کا شعور، اصناف کے باہمی فرق اور ان کے عناصر ترکیبی کی میزان ہمہ وقت ساتھ رکھتا ہے۔ بہرحال، اس رویّے کی ایک علمی بنیاد ہے سو یہاں اس پر تنقید مقصود نہیں۔ میں تو صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تخلیقی مزاج کی ایک اپنی منطق ہوتی ہے اور ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ مسلّمات کی پابند بھی ہو۔ اس منطق کا اظہار وہ کبھی زبان و بیان کی ایک معینہ ہیئت کے حدود میں رہ کر کرتا ہے، کبھی اس سے ماورا ہو کر۔ اسی ہیئت کی فصیلوں میں وہ کوئی دروازہ یا دریچہ بھی ڈھونڈ نکالتا ہے۔ اس سرگرمی کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی قید اور پابستگی کے احساس کو کچھ کم کر سکے۔ ضرورت آن پڑے تو اس حصار سے باہر دور تک پھیلے ہوئے دشت امکاں میں چلا جائے یا کم از کم اس طرح باہر کی دنیا کے موسموں، مظاہر اور اشیا سے وہ ایک انفرادی تعلق قائم کر لے۔ اس کے حواس کی قوتیں جس قدر فعّال، تخیل جتنا زرخیز، اور نظر جتنی کارکشا ہو گی اس کی جستجو کا سفر بھی اسی تناسب سے تیز تر ہوتا جائے گا۔ ایسی صورت میں زبان اور بیان کے مروجہ سانچوں، آزمودہ نسخوں اور آداب میں چند تبدیلیوں کا در آنا فطری ہے۔

خواجہ صاحب ایک نثر نگار کی حیثیت سے نہ تو اپنی روایت کے منکر تھے، نہ باغی۔ شاید اسی لیے اُن کی نثر میں اردو کی پرانی، مانوس مہک محفوظ ہے۔ یوں بھی انکار اور بغاوت بنیادی طور پر منفی رویّے ہیں اور اس نفی کی تراوش ادب میں جس اثبات سے ہوتی ہے وہ اگر اجتہاد کے عنصر سے یکسر عاری ہو تو اپنی روایت کا حصہ نہیں بنتی۔ خواجہ صاحب اپنی روایت میں شامل تو ہیں مگر اس طرح کہ الگ سے بھی اپنی پہچان قائم کرتے ہیں۔ ان کی اس پہچان کے نشان پر ہم ایک ساتھ کئی زاویوں سے نظر ڈال سکتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی حسِ مزاح، ان کے موضوعات کا تنوع، ان کی اضحیت اُن کا تصوف، مضامین کے انتخاب میں ایک طرح کی بصری، حسّی، ذہنی اور اخلاقی

مساوات کا رویہ جو ان کے شعور پر کسی منظر یا مظہر کا باب بند نہیں کرتا اور بلند و پست کے احساس سے بے نیاز عالم امکاں کے ہر گوشے میں ایک بسیط اور ہمہ گیر وحدت کی تلاش اور دریافت کی جدوجہد سے مربوط ہے۔ غرضیکہ اپنی عام زندگی کی طرح اپنی تحریروں میں بھی وہ کثیر الابعاد نظر آتے ہیں۔ اس مختصر گفتگو میں میں خواجہ صاحب کے صرف اس پہلو کی جانب چند اشارے کروں گا جو ان کی انفرادیت کے ساتھ ساتھ ان کی نثر کی بنیادی سرشت کا تعین کرتا ہے۔ میرے خیال میں یہ پہلو خواجہ صاحب کے تخیل کی منطق اور اس کے طریق کار سے عبارت ہے اور ان کی سادہ بیانی کے باوجود انھیں اردو نثر کے ان تمام مشاہیر سے متمائز کرتا ہے جن کے اسالیب زبان و بیان کی حد تک کم و بیش انھی عناصر و اوصاف سے آراستہ ہیں جو ہمیں خواجہ صاحب کی نثر میں دکھائی دیتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے نہ تو تصوف کے کسی نئے مسلک کی ایجاد کا بیڑا اٹھایا نہ تہذیبی، سماجی، روحانی فکر کے کسی ایسے منطقے تک رسائی کی جستجو کی جسے ہم ان کی دریافت کہہ سکیں۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک جانی پہچانی کائنات کو ایک نیا تخلیقی تناظر بخشا، مظاہر اور موجودات کی مانوس تنظیم میں ایک نئی باطنی ترتیب اور ارتباط کا سراغ لگایا اور ان حقیقتوں کو جو زندگی کے معمولات کا حصہ بن جانے کے سبب اپنی ندرت کا ذائقہ کھو بیٹھی تھیں، حواس کی ایک نئی سطح پر اس طرح یکجا کیا کہ پرانے پتوں میں نئی رتوں کی مہک پیدا ہو گئی۔ اس اعتبار سے خواجہ صاحب کا کارنامہ ایک ساتھ کئی جہتیں اختیار کر لیتا ہے اور ایک ادیب، ایک معلم اور ایک صوفی کی حیثیت سے ان کی شخصیت کے ایک ہمہ گیر تاثر کی ترسیل کرتا ہے۔ کبھی کبھی سچی عظمت اور انفرادیت کی نمود بظاہر عام اور مانوس حقیقتوں کی زمین سے بھی ہوتی ہے۔

فلابیر کہ بجائے خود ایک بے مثال ادیب اور ایک منفرد اسلوب کا مالک تھا۔ کہتا تھا کہ لکھنے والے کا اسلوب در اصل اس کی روح کی آواز ہوتا ہے۔ گویا کہ الفاظ اور زبان کا مجموعی طور اور بیان کا آہنگ اور ان کی تعیین پر اثر انداز ہونے والے رویے اور ایقانات اور احساسات، یہ سب کے سب ایک اخلاقی انتخاب کے پابند ہوتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی فکر کا بنیادی مسئلہ کیا تھا؟ کم و بیش وہی جو ہر صوفی کا ہوتا ہے،

یعنی یہ کہ مظاہر سے ہم آہنگی کی خاطر ایک طرف تو اپنے داخلی ہیجانات کی تنظیم و تہذیب کی جائے، دوسری طرف باہر کی دنیا کے انتشار میں ایک نئی ترتیب اور ربط کا سراڈھونڈ جائے کہ ہر مظہر کا مخزن ایک ہی حقیقت ہے۔ اس نکتے تک رسائی کے لئے بیک وقت رد و قبول کے ایک سلسلے سے گذرنا ہوتا ہے، اشیاء کو ان کی انفرادی ہئیتوں کے ساتھ قبول کرنا پھر انھیں اس دائرے میں محصور کرنا جو ان سب کا رمز اور نکتۂ ارتکاز ہے، جہاں ان کے انفرادی نشانات ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے انشائیوں، اور سب سے زیادہ ان کی کتاب کائنات بیتی سے، مظاہر کا محاصرہ کرنے والی یہی سچائی ہم پر روشن ہوتی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے میر کی طرح سارے جہان کو ایک آئینہ خانے کی مثال دیکھا ہے جہاں دیواروں کے بیچ منہ نظر آتے ہیں۔ جہاں بقول آزاد پتھر گویا ہیں اور درختان پا در گل چلتے پھرتے باتیں کرتے ہیں۔ یہ کائنات بیتی، ایک آپ بیتی بھی ہے اور اس مہیب اور بے کراں اور بسیط حقیقت کی سرگذشت بھی جس کی لکندوں سے مظاہر کا کوئی نشان آزاد نہیں۔

یہاں خواجہ صاحب ایک صوفی اور ایک تخلیقی آدمی کے حقوق ساتھ ساتھ ادا کرتے ہیں — قدر مشترک وہ پُر اسرار توانائی ہے جسے آپ چاہے صوفی کا کشف کہیں یا فن کار کا تخیل۔ اہل نظر نے اس ضمن میں بھانت بھانت کی موشگافیاں کی ہیں۔ کوئی اسے فرد کے اجتماعی لاشعور سے جوڑتا ہے، کوئی خوابوں کے عمل میں اس کی منطق کا سراڈھونڈتا ہے۔ ایک بزرگ کا خیال ہے کہ تخیل کی مثال اس لپٹی ہوئی پرت اندر پرت چٹائی کی ہے جو ایک لمحے کی ضرب سے کھلتی جاتی ہے اور اس میں مخفی ایک انوکھے جہان معنی کے ساز و برگ سامنے آجاتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے تخیل کی بحث میں غالبًا ان فلسفیانہ، نفسیاتی اور عمرانیاتی تصورات کی روشنی میں غالبًا زیادہ کار آمد نہ ہوگی کیونکہ ان کا تخیل شاعر کے تخیل سے مماثلت کے چند پہلوؤں کے باوجود تمام و کمال شاعر کا تخیل نہیں ہے۔ وہ ایک خلّاق، نکتہ رس، معنی آفریں اور طباع ادیب تھے لیکن اول و آخر ایک نثر نگار تھے۔ نثر بہر حال زمین کی چیز ہے جس کے کچھ معینہ حدود اور ضابطے ہوتے ہیں۔ تخلیقی نثر لکھنے والے کا تخیل چاہے جتنی دور کی کوڑیاں لاتے، اس کا گذر ان بے حساب رفعتوں میں نہیں ہوتا جہاں شاعر

کی نگاہ آزادانہ تیرتی پھرتی ہے۔ خواجہ صاحب کا امتیاز یہ ہے کہ ایک علوم اور مخصوص مقصد اور منضبط اخلاقی رویے کے حدود میں رہ کر بھی انھوں نے محض تخیل کی وساطت سے اپنے لئے کچھ گنجائشیں نکالیں اور حواس کی ان قوتوں کو جو خالی خولی نثر نگاروں کے یہاں فکر کے غلبے اور ایک خارجی منطق کے تسلط کی وجہ سے رفتہ رفتہ کند ہو جاتی ہیں، ہمیشہ زندہ رکھا یہی وجہ ہے کہ خواجہ صاحب کی تحریروں میں اشیاء یا مظاہر کی محض خیالی تصویریں نہیں ابھرتیں بلکہ ایک نودریافت سطح پر ان کے حواس کی گرفت میں آنے والی ہر شے ہر مظہر از سر نو خلق ہوتا ہے، متحرک نظر آتا ہے اور قاری کے ذہن کے ساتھ ساتھ اس کی پوری ذات پر وارد ہوتا ہے۔ کیفیتیں اور تاثرات بھی دو قوعوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ قاری ان تحریروں کو ایک خیال پارے کے بجائے ایک کہانی کی طرح پڑھتا ہے اور حواس کے اسٹیج پر کائنات کے ایک مسلسل تماشے سے خود کو دوچار پاتا ہے۔ شبلی نے اس طریق کار کو ایک نوع کے منطقی مغالطے سے تعبیر کیا تھا۔ مغربی علماء اسے LOGICAL FALLACY کہتے ہیں۔ اس کی غایت صحیح کو غلط یا غلط کو صحیح ثابت کرنے کے بجائے یہ ہے کہ ایک ایسی دلیل وضع کی جائے جو عام استدلال سے الگ اور بظاہر نامانوس نظر آنے کے باوجود پڑھنے والے کی جذباتی تائید حاصل کر سکے اور اسے سچائی کا ایک نیا تجربہ بخشے۔ چنانچہ خواجہ صاحب اپنے قاری کو صرف قائل یا مرعوب نہیں کرتے بلکہ اسے جذبے کی سطح پر سیرابی اور حسی اعتبار سے آسودگی کے احساس تک لے جاتے ہیں۔ وہ کثرت میں ایک وحدت کا اور انتشار میں ایک ربط کا سراغ پاتا ہے اور اس سچائی کے رمز تک اپنے تعصبات سے آزاد ہو کر جاتا ہے۔ ایک دھیمے اور نرم آثار آہنگ کے باوجود تسخیر کی ایسی قوت ہمیں خواجہ صاحب کے کسی بھی ہم عصر نثر نگار کے اسلوب میں نہیں دکھائی دیتی۔

محمد حسن عسکری مرحوم نے میرامن کے سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ کہی تھی کہ جب ان کے درویش اپنی کہانیاں سناتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ سارا آسمان کہانی سنا رہا ہے۔ تجربات، واقعات اور واردات کے صفحے الٹتی ہوئی ایک طلسمی صدا روشنی کے ایک مسلسل پھیلتے بڑھتے دائرے کی مثال ساری کائنات کو اپنے اندر سمیٹتی جاتی ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ سب کے سب چپ ہیں، و رگوش بر آواز۔ خواجہ صاحب نے گنتی کے چند کرداروں یا افراد کے بجائے اس عالم بے حساب کا افسانہ رقم کیا ہے جس کا مرکزی نقطہ انسان کی ذات ہے چنانچہ ان کی دنیا میں شجر اور حجر، بے جان اور جاندار، انسان اور جانور سب کے سب ایک ساتھ گویا نظر آتے ہیں اور تخلیق کی ازلی گت پر تھرا رہا ہی جلی آوازوں کے نغمے کا ارتعاش محسوس کیا جا سکتا ہے۔ شبلی نے کہا تھا:

شاعر کی نظر میں عالم کائنات، قوت تخیّل سے ایک اور عالم بن جاتا ہے، ہم کائنات کی دو قسمیں کرتے ہیں، حسّاس اور غیر حسّاس۔ لیکن شاعر کی عالم تخیّل کا ذرہ ذرہ جاندار اور ہوش و عقل سے لبریز ہے۔ آفتاب، ماہتاب، ستارے، صبح، شام، شفق، باغ، پھول، پتے، سب اس سے ہم زبانی کرتے ہیں۔ سب اس کے رازدار ہیں۔ سب سے اس کے تعلقات ہیں۔

اس موقع پر خواجہ صاحب کی کائنات بیتی کا صرف ایک اقتباس سنئے:

ذرا خیال کر، پہلے تمام کائنات میں پانی تھا اور میں خاک اس کی تہہ میں چھپی ہوتی تھی پھر اس پانی کو سمندر میں ہٹا دیا گیا۔ مگر اس کی تہہ میں بھی میں موجود ہوں۔ اور پانی کے اندر بے شمار جانور ہیں، اور ہر جانور مجھ خاک سے بنتا ہے، اور جب مرتا ہے تو پھر میرے اندر سما جاتا ہے۔ سمندر کے اندر پہاڑ بھی ہیں اور درخت بھی ہیں اور دریائی انسان بھی ہیں۔ وہ سب بھی مجھ خاک سے بنتے ہیں اور پھر میرے ہی اندر جذب ہو جاتے ہیں۔ میں خاک کبھی سمندر کی تہہ میں پاؤں جما کر بیٹھتی ہوں اور کبھی سمندر کے چہرے پر موجوں میں لہراتی ہوں۔ جتنے کنارے سمندر کے ہیں وہ بھی سب مجھ ہی سے بنے ہیں۔ اور کناروں سے باہر لاکھوں میل کی خشک زمین میں سوائے میرے اور کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ خوبصورت پھول مجھ سے نمودار ہوتے ہیں۔ بلبل ان سے عشق بازیاں کرتے ہیں۔ کہیں وہ پھول خوبصورت گردنوں کے ہار بنتے ہیں اور کہیں وہ پھول مرنے والوں کے مزار پر چڑھتے ہیں اور خیال کر کہ ہر ایک واقعے میں ایک زندگی ہے اور ایک بیتی ہے۔

ہر واقعے میں ایک زندگی اور ایک بیتی کے سرے تک جا پہنچنا ایک خلاّقانہ جست کے بغیر ممکن نہیں۔ آپ چاہیں تو اسے عشق کی ایک جست کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ میرے خیال میں تم باذنی کا ایک طور یہ بھی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو خواجہ صاحب کی کائنات بیتی اپنی کھال میں سمٹے ہوئے ایک فرد کی آپ بیتی سے کچھ زیادہ مختلف نہ ہوتی۔ (یہ مضمون خواجہ حسن نظامی مذاکرے کے لیے لکھا گیا تھا)

ڈاکٹر سید محمد عزیز الدین حسین

بدھ دھرم ۔ ایک تاریخی جائزہ

(۲)

تتھاگت نے سات سال ریاضت کر کے گیان حاصل کیا تھا، اس وقت ان کی عمر کم و بیش چھتیس سال کی تھی۔ ان کا پری نروان اسّی سال کی عمر میں ہوا، اس طرح انھوں نے قریب چوالیس سال تبلیغ کی پھر بھی وہ کوئی بڑا سنگھ نہ بنا سکے۔ ان کے پری نروان کے وقت سنگھ میں تقریباً پانچ سو بھکشو تھے۔
بدھ دھرم نے اپنا کوئی سماج نہیں بنایا۔ نجات کا خواہش مند اور متلاشی گھر بار تیاگ کر کے تجرد کی زندگی بسر کرتا تھا، پھر بھی نجات صرف اپنے لئے ہی حاصل کرتا تھا۔

مگدھ میں آریہ سماج سیاسی طاقت کمزور پڑ چکی تھی۔ اجات شترو اور بم بسار غیر آریائی سیاسی قوت بڑھانے میں لگے ہوئے تھے جس نے آخر میں "مہاپدما نند" پیدا کیا جو ہمارے دیس کا پہلا شہنشاہ تھا جو آریہ تہذیب اور آریہ دھرم دونوں کا منکر تھا۔ ان غیر آریائی حکمرانوں کے دور میں بدھ دھرم کو لوگوں نے بڑی تعداد میں قبول کیا ہو یا نہ کیا ہو، مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عوام اس دھرم کو پسند ضرور کرنے لگے تھے اور بدھ شرمنوں کی عزت اوروں سے کچھ زیادہ ہی تھی۔

یگیہ اول تو عوام کے لئے ہی نہیں، وہ صرف مالدار اور دولت مند لوگوں کا حق ہو کر رہ گئے تھے۔ اور عوام کو ان سے نفرت ہو گئی تھی۔ بدھ دھرم نے یہ راہ کھولی اور عوام کی نظروں میں یگیہ بے حقیقت ہو گئے۔

تتھاگت نے ویدوں کو نہیں مانا، برہمنوں کی افضلیت اور برتری تسلیم نہیں کی اور نہ مختلف ذاتوں کے فرق سے اتفاق کیا، روح اور قادر مطلق کے متعلق سکوت اختیار کیا۔

یہ سب باتیں آریا تہذیب اور آریہ دھرم کے خلاف تھیں۔ مہاتما بدھ شرمن تہذیب کی پیداوار اور شرمن دھرم کے مبلغ تھے۔ کوئی نہیں کہتا کہ شدودھن نے کبھی یگیہ کرایا ہو جبکہ وہ راجا تھے، اس لئے یہ کہنا کہ تتھاگت آریہ تہذیب کی پیداوار اور ویدک دھرم کے ماننے والے اور اس کے اصلاح کرنے والے تھے، سراسر تاریخ کے منافی ہے اور کسی وجہ سے حقیقت کی پردہ پوشی کی کوشش ہے۔

مہاتما بدھ کا پری نروان ۴۸۳ قبل مسیح میں ہوا معرکے کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنا کوئی جانشین نامزد نہیں کیا، ہدایت کے کچھ اصول مقرر کر دیئے تھے اور سنگھ کو مشورہ دیا تھا کہ ان اصولوں کو سامنے رکھ کر سب کے مشورے سے کام کیا جائے۔ تتھاگت کی زندگی میں بدھ دھرم اور سنگھ نمایاں ترقی نہ کر سکے، دھرم کا دروازہ پہلی بار اس دیس میں شودروں کے لئے کھلا تھا اور انھیں انسانی حق ملا کہ اوروں کی طرح وہ بھی مذہب اور سماج کے مساوی رکن ہیں، چنانچہ مشودروں نے سنگھ میں شرکت کی، مگر پھر بھی سنگھ کی حیثیت میں کوئی نمایاں فرق نہیں آیا اور نہ اس نے کوئی قابل ذکر ترقی کی۔ یہ صورت حال ایک طویل عرصے تک برقرار رہی، بالآخر دھرم اور سنگھ کو ترقی اس وقت ملی جب چندر گپت موریہ کا پوتا، اشوک، مہاتما بدھ کے پری نروان کے کوئی سوا دو سو سال بعد مگدھ کی وسیع سلطنت کا وارث ہو کر بدھ دھرم کا پیرو اور آگے چل کر اس کا مبلغ ہو گیا۔ اشوک نے بدھ دھرم اور سنگھ کو حکومت کا سہارا دے کر اس کو مستحکم بنیادوں پر قائم کیا۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ہر بڑا دھرم حکومت ہی کے سہارے بڑھا اور پھیلا۔ عیسائیت کو ترقی اس وقت ہوئی جب رومن شہنشاہ قسطنطین عیسائی ہوا۔ اسلام نے بے شک شروع میں اپنے اصولوں اور اپنی ذاتی خوبیوں کی بنا پر مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل کی اور دور دراز ملکوں میں پھیلا اور بڑھا مگر بعد کے دور میں اس کی ترقی سیاسی طاقت کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ اور ہندوستان میں برہمن دھرم کا فروغ سیاسی قوت کی بنیاد پر ہوا۔

نندآوں سے لے کر موریوں تک جتنے بادشاہ ہوئے وہ مگدھ تہذیب اور دھرم کے حامی اور آریا تہذیب اور ویدک دھرم کے نہ ماننے والے تھے اس بنا پر برہمنوں اور ان کے حامیوں نے ان حکمرانوں کو نیچ دھرم کا مخالف کہا ہے۔ اشوک تقریباً ۲۷۰ قبل مسیح میں مگدھ کے

تخت پر بیٹھا۔ کچھ وقت سلطنت کے استحکام میں گزرا جب اس طرف سے اطمینان ہو گیا تو مگدھ راج کے پرانے حریف، کلنگ کے حکمراں کی طرف توجہ کی۔ کلنگ کا راجا دراوڑ نسل سے تھا۔ کلنگ کی لڑائی ختم ہونے پر اشوک میدان میں پہونچا تو اس کی قلب ماہیت ہو گئی۔ ہتھیار کی جیت کی بجائے "دھرم وجے" اس کے دل میں پیدا ہو گئی اور اس نے دھرم کی طرف رخ کیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اب تک کسی دھرم سے متعلق نہ تھا ویدک دھرم کا تو ذکر ہی کیا۔ کہتے ہیں کہ اس کا دادا چندر گپت موریہ جینی تھا لیکن اشوک نے اپنے لئے بدھ دھرم ہی کیوں چنا؟ یہ بھی قابل غور بات ہے۔ ویدکیوں کا دھرم کمزور پڑ چکا تھا اس لئے اس کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا۔ رہا جین دھرم تو خود اس کا دادا جینی تھا اس لئے اسے بھی جینی ہونا چاہئے تھا مگر اس نے بدھ دھرم اختیار کر لیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جین دھرم بدھ دھرم کی طرح آفاقی اور عالمی صلاحیت نہیں رکھتا تھا اس کے دروازے شودروں کے لئے بند تھے۔ اشوک ابتدا میں صرف بدھ دھرم کا پیرو تھا، مگر جلد ہی وہ اس مذہب کا سرگرم مبلغ بن گیا، جس کی وجہ سے بدھ مت نے بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی۔

اشوک نے بدھ سنگھ کی جدید تنظیم کی، وہار بنوائے اور ایسے وسائل پیدا کئے کہ بدھ بھکشو دھیان سمادھی اطمینان سے کر سکیں۔ بھکشوؤں کا بھیک پر گزارہ تو ہو سکتا تھا مگر بڑھتی ہوئی تعداد، نیز دھرم اور سنگھ کے بڑھتے ہوئے کاموں کے پیش نظر یہ ضروری تھا کہ بھکشوؤں کو بھیک سے چھٹکارا دلایا جائے تاکہ وہ اپنا پورا وقت گیان، دھیان اور تبلیغ پر صرف کر سکیں، اس لئے بدھ وہاروں کو آراضی کے بڑے بڑے قطعے عطا کئے گئے۔

اشوک نے بدھ مذہب کی ترقی اور اشاعت کے سلسلے میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، ان میں سب سے اہم اور ممتاز کام یہ ہے کہ اس نے اس کی اشاعت کے لئے دنیا کے مختلف حصوں میں مبلغ بھیجے، بقول ایشوری پرشاد: "اشوک نے دور دراز ملکوں میں بدھ مذہب پھیلانے کے لئے اپنے بھکشو روانہ کئے، یہ سب کو بدھ مت کی تعلیم دیتے تھے۔ ۲۴۳ ق م میں اس نے پاٹلی پتر میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ اس جلسے میں تقریباً ایک ہزار عالم اور مہاتما موجود تھے۔ ہندوستان میں بھی بدھ مت کی خوب اشاعت ہوئی اور مہاراجہ نے

اپنے لڑکے، مہندر اور اپنی لڑکی سنگھمترا کو اسی کام کے لئے لنکا میں بھیجا، بہت سے واعظ سیریا، مصر، یونان اور مقدونیہ وغیرہ ملکوں میں بھیجے گئے۔ ان کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ بودھ مذہب ایشیا، یورپ اور افریقہ تک بھی پہنچ گیا۔ افغانستان اور بلوچستان کے لوگوں نے بھی اسے قبول کیا اور اشوک کی بے پایاں کوشش بودھ مذہب کی ترقی کا سبب ہوئی۔" (تاریخ ہندوستان صفحہ ۷۵)

اشوک نے بدھ مذہب کی اشاعت کے لئے مختلف مقامات پر، پتھروں، چٹانوں اور ستونوں پر ہدایتیں کھدوا کر نصب کیں، یہ ستون جو الٰہ آباد، دلی، سارناتھ اور سانچی وغیرہ میں دریافت ہوئے ہیں، ان سے اشوک کی ہدایات اور تعلیمات کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا ساتواں فرمان، جس میں اس نے اپنی تمام کارگزاریوں پر ایک نظر ڈالی ہے، ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اشوک " بادشاہ پیاد اسی، دیوتاؤں کا پیارا " کے القاب سے مشہور تھا۔ ان کندہ فرمانوں میں وہ ان ہی القاب سے یاد کیا گیا ہے، فرمان نمبر ۷ ملاحظہ ہو:

" بادشاہ پیاداسی، دیوتاؤں کا پیارا کہتا ہے: گذشتہ زمانے کے جو بادشاہ تھے وہ سوچتے تھے کہ لوگوں کو دھرم کا پابند کر کے کیسے بہتر بنایا جائے لیکن لوگ دھرم کی پابندی کر کے بہتر نہیں ہوئے جیسا کہ انھیں ہونا چاہئے تھا۔

اس بارے میں بادشاہ پیاداسی، دیوتاؤں کا پیارا کہتا ہے: گذشتہ زمانے میں بادشاہ سوچتے تھے کہ لوگوں کو دھرم کا پابند کر کے بہتر کیسے بنایا جائے لیکن لوگ دھرم کی جیسی کہ چاہئے پابندی کر کے بہتر نہیں ہوئے۔ اب لوگوں کو پابند کیسے بنایا جائے۔ لوگوں سے دھرم کی جیسے کہ چاہئے پابندی کر کے انھیں بہتر کیسے بنایا جائے، میں انھیں دھرم کا پابند کر کے پابند اخلاق کیسے بناؤں۔

اس بارے میں بادشاہ پیاداسی، دیوتاؤں کا پیارا کہتا ہے: مجھے یہ خیال ہوا، "میں دھرم کے احکامات شائع کروں گا، میں دھرم کے احکامات کو دل نشین کراؤں گا، انھیں سن کر لوگ ان کی تعمیل کریں گے۔ ان کے اخلاق بلند ہوں گے، وہ دھرم کی پابندی کر کے خوب ترقی کریں گے۔" اس مقصد سے دھرم کے احکامات شائع کئے گئے،

دھرم کی بہت سی ہدایتوں پر عمل کرنے کی تاکید کی گئی تاکہ میرے (امور دینی کے لئے مقرر کئے ہوئے) عہدہ دار جن کے سپرد بڑی آبادیاں ہیں، ان کی تشریح اور اشاعت کریں۔ دھرم مہاتما عہدہ دار (امور دینی کے صوبائی ناظم) کو، جن کے سپرد لاکھوں جانیں ہیں، حکم دیا گیا کہ فلاں اور فلاں طریقے سے سوال و جواب کے ذریعے لوگوں کے دھرم کو پختہ کریں۔

بادشاہ پیاداسی، دیوتاؤں کا پیارا کہتا ہے: اسی ارادے سے میں نے دھرم کے منارے بنوائے، دھرم کے عہدہ دار مقرر رکھے، دھرم کے احکامات کا اعلان کیا۔ پیاداسی، دیوتاؤں کا پیارا کہتا ہے: سڑکوں پر برگد کے درخت لگوائے گئے کہ آدمیوں اور مویشیوں کو سایہ ملے، آموں کے باغ لگائے گئے، آدھ آدھ کوس پر کنوئیں کھدوائے گئے، سرائیں بنوائی گئیں، جا بجا آدمیوں اور مویشیوں کے آرام کے لئے پانی کا انتظام کیا گیا، آرام بذات خود ایک ادنیٰ چیز ہے، مجھ سے پہلے کے بادشاہوں نے اور میں نے رعایا پر مختلف احسانات کرکے خوش کیا ہے، لیکن میں نے یہ سب اس ارادے سے کیا کہ لوگ دھرم کی پیروی کریں۔"

طوالت کے خیال سے چند ہدایات چھوڑ کر، آخری ہدایت پیش کی جاتی ہے:

"بادشاہ پیاداسی، دیوتاؤں کا پیارا کہتا ہے: میں نے جو نیک کام کئے ہیں ان میں لوگوں نے میری تقلید کی ہے اور ان (نیک کاموں) کی وہ نقل کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ماں باپ کی اور بزرگوں کی اطاعت کرنے لگے ہیں اور ان کی (یہ) اطاعت بڑھتی رہے گی، وہ قدیم رواج کی زیادہ پابندی کریں گے، برہمنوں اور سنیاسیوں، غریب اور مصیبت زدہ لوگوں، غلاموں اور ملازموں کے ساتھ مناسب طور پر پیش آئیں گے۔

دھرم کی راہ میں ترقی دو طرح سے ہوتی ہے، ان پابندیوں کا لحاظ کرنے سے جو دھرم ہم پر عاید کرتا ہے اور دوسروں کا خیال کرنے سے۔ ان دونوں میں پابندیوں کا لحاظ کرنا ایک معمولی بات ہے، دوسروں کا خیال کرنا ایک بڑی

بات ہے۔ دھرم کی پابندی (کا لحاظ کرنے کی ایک مثال) یہ ہے کہ میں نے فلاں اور فلاں جانوروں کو ذبح ہونے سے مستثنیٰ کردیا ہے اور اس کے علاوہ دھرم کی دوسری پابندیاں ہیں جن کا لحاظ کرنے کا میں نے حکم دیا ہے، لیکن دوسروں کا خیال کرنے سے لوگوں نے دھرم (کی راہ) میں زیادہ ترقی کی ہے، جس کا اثر یہ ہوا ہے کہ وہ جاندار مخلوق پر ظلم کرنے اور جان لینے سے پرہیز کرنے لگے ہیں۔ یہ اس لئے کیا گیا ہے کہ (ہمارے) بیٹے اور پوتے اور پرپوتے اس پر اس وقت تک قائم رہیں جب تک کہ چاند اور سورج کا وجود ہے۔ میں نے دھرم کے متعلق یہ فرمان اس وقت نقش کرایا جب مجھے راج تلک لگائے ہوئے چھبیس[۲۶] سال گذر رہے تھے۔

دیوتاؤں کا پیارا یہ کہتا ہے: جہاں کہیں پتھر کے مینارے یا پتھر کی سلیں ہوں، وہاں دھرم کے اس فرمان کو نقش کرادینا چاہئے۔ تاکہ وہ ہمیشہ موجود رہے۔" [تاریخ تمدن ہند (مولفہ پروفیسر محمد مجیب) صفحہ ۱۲۸ --- ۱۳۰]

بدھ دھرم کے سلسلے میں ایک عام خیال یہ پیدا ہو گیا ہے کہ اس میں جانوروں کو مارنا ممنوع تھا۔ اس میں صداقت ضرور ہے مگر ذرا سے فرق کے ساتھ، وہ یہ کہ ممنوع اس معنی میں تھا کہ بے مقصد، بے ضرورت اور بے وجہ نہیں مارا جاسکتا تھا، جیسے یگیہ میں ہوتا تھا، ورنہ غذا اور خوراک کے لئے جانور ذبح ہوتے تھے خود اشوک کے باورچی خانے کے لئے مور اور ہرن ذبح ہوتے تھے۔

اشوک نے بدھ دھرم کی بڑی خدمت کی مگر اس میں عوام کی خدمت کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔ تاکہ ان کو امن، سکون اور خوشحالی نصیب ہو۔ اگر معروضی نقطۂ نظر اور جذبات سے بلند ہوکر دیکھا جائے تو اشوک کی توجہ اور کوشش سے پست طبقے کو سماج میں مساوی حیثیت حاصل ہوئی اور وہ بھی انسان سمجھے جانے لگے۔

اس کے علاوہ اشوک نے بدیسی تہذیب اور بیرونی دھرم کی جگہ مقامی تہذیب اور دھرم کی حمایت اور سرپرستی کی، اس وجہ سے آریا تہذیب اور ویدک دھرم

دونوں کو سخت دھکا لگا اور ملک میں ان کی وہ حیثیت باقی نہیں رہی جو پہلے تھی۔ ظاہر ہے یہ صورت حال آریا تہذیب کے علمبرداروں کے لئے بڑی تکلیف دہ تھی، مگر حالات کی وجہ سے اس وقت بظاہر خاموش رہے، مگر آئندہ چل کر جو واقعات پیش آئے، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اندر ہی اندر اس کے مقابلے کے لئے ضروری تیاریوں میں مشغول تھے۔

اشوک کا انتقال ۲۳۶ قبل مسیح میں ہوا۔ اس کے لگ بھگ پچاس سال بعد بدھ مذہب کے مخالفین نے اپنے اقتدار اور سماج میں اپنی برتری کو پھر سے قائم کرنے کی کوشش شروع کی۔ ۱۸۷ قبل مسیح میں اشوک کے پوتے "برہ ورت" کو جو اس وقت موریہ شہنشاہ تھا، دن دھاڑے فوج کے معائنے کے موقع پر قتل کر دیا گیا۔ قاتل کوئی معمولی آدمی نہیں تھا بلکہ شہنشاہ کی فوج کا سپہ سالار، ذات کا برہمن، گوت کا بھاردواج اور نسل کا "شنگا" تھا۔ اس کا نام "پشیامتر" تھا جس نے موریہ شہنشاہ کو مار کر، تخت پر قبضہ کیا اور پہلا حکم یہ نافذ کیا کہ ملک میں یگیہ پھر ہوا کریں گے، یہی نہیں بلکہ خود یگیہ کرایا۔

مگدھ میں یہ تیسرا انقلاب تھا، پہلا نند اوں کا، دوسرا آریوں کا، اور تیسرا پشیامتر کا۔ مگر یہ آخری انقلاب پچھلے انقلابوں سے کئی اعتبار سے مختلف تھا۔ اس میں مفاد ذاتی نہیں جماعتی تھا مقصد محض حکومت نہ تھا بلکہ حکومت کے بل پر تہذیبی اور مذہبی تبدیلی، یعنی مگدھ کی تہذیب اور شرمن دھرم کو ختم کرکے برہمن اور پروھتوں کے اقتدار کو واپس لانا تھا۔

اشوک کی اصلاحوں سے آریا تہذیب قریب قریب ختم ہوگئی تھی اور ملک اور سماج میں اس کے علمبردار بالکل بے اثر ہوگئے تھے، مگر تھے ہوشیار، وقت شناس اور موقع پرست۔ اس پچاس سال کی مدت میں انھوں نے عوام میں اپنی جگہ بنالی اور فوج پر اپنا قبضہ مضبوط کرلیا۔ اس کے بعد برہمنوں نے مگدھ تہذیب اور شرمن دھرم کے خاتمے کے لئے جدوجہد شروع کی۔ بدھ دھرم میں یگیہ کی مخالفت اتنی اہم نہیں تھی جتنی یہ کہ اس نے پست طبقے کو مساوی حیثیت دے دی تھی اور اس کی مقبولیت عالمگیر تھی۔

پشپامتر نے جس طرح بدھوں، بدھ دھرم اور سنگھ کا خاتمہ کیا وہ ہندوستان کی تاریخ کا

خونی ورق ہے اس کا ذکر آگے آئے گا۔ بارہ سو برس کی مسلسل کوشش نے مگدھ تہذیب اور شرمن دھرم کا نام و نشان اس ملک سے مٹا دیا۔ دنیا کی تاریخ میں اپنے بڑے پیمانے پر مفاد کے ٹکراؤ اور مفاد پرستوں کی کامیابی کی دوسری مثال نہیں ملے گی۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بدھ دھرم کے فروغ میں بلکہ شرمن تہذیب کی ترقی میں چھتریوں کا ہاتھ تھا وہ "ورت" ہی کیوں نہ ہوں۔ برھمنوں نے بدھوں کے ساتھ ساتھ اپنے حریف چھتریوں سے بھی بدلہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ "پرشں رام" کی کہانی سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے چھتریوں کو نیست و نابود کر دیا۔ "سات واھنوں" کا دعویٰ تھا کہ انھوں نے چھتریوں کا گھمنڈ خاک میں ملا دیا۔ برھمنوں نے بدیسیوں اور بعض دیسی قبیلوں کو چھتری بنا کر اپنے ان پرانے حریفوں کو ایسا مٹایا کہ آج ویدک عہد کا برھمن تو بھارت میں مل جائے گا مگر اس عہد کا چھتری نہیں ملے گا۔ چھتریوں کا خاتمہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ برھمنوں کے بعد یہی ایک طبقہ ملک میں پڑھا لکھا اور باشعور تھا، چھتریوں کے خاتمے کے بعد صرف برھمن ہی علم کے مالک رہ گئے۔

بدھ دھرم اور تہذیب کا زوال تو پشیامتر کے وقت سے ہی شروع ہو گیا تھا مگر اس میں سرعت اور تیزی "سات واھنوں" اور "واکاٹکوں" نے پیدا کر دی۔ گپت عہد میں ہی زوال کے اثرات پیدا ہو چکے تھے، راجپوتوں کے عروج نے اس کا خاتمہ کر دیا اور فلسفے کے میدان میں کمارل بھٹ اور شنکر آچاریہ نے اسے مات دے دی۔ رمیش چندر دت نے اپنی کتاب "ہسٹری آف سویلیزیشن ان اینشینٹ انڈیا" میں لکھا ہے: "چھٹی صدی عیسوی میں وکرمادیتہ کی سرپرستی میں ہندوازم نئے پیکر میں زندہ ہوا اور ساتویں صدی عیسوی میں کمارل نے بدھ دھرم پر حملے شروع کر دیئے جس کی تقلید عظیم مصنف شنکر آچاریہ نے نویں صدی عیسوی میں کی۔ ان علمی حملوں کے علاوہ حقیقی استیصال کا بڑا امکان، بنارس کے قریب "سارناتھ" کے انکشافات سے ظاہر ہوتا ہے۔ دسویں صدی عیسوی میں راجپوت شمالی ہندوستان کے وارث ہو گئے یہ ہندو دھرم میں نئے اور پرجوش نو مذہب تھے ان کے دور میں ہندو مندروں نے تیزی سے بدھ مندروں اور وہاروں کی جگہ لے لی۔"

بدھ دھرم ہندوستان سے ختم ہوا مگر برھمنوں نے اس کے لئے کیا کیا اور کیسے کیسے جتن کئے

انہیں دیکھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ مفاد پرستی انسان کو کہاں سے کہاں لے جاسکتی ہے۔ بدھ دھرم کے خاتمے کے لئے مفاد پرستوں نے اپنے مطلب کے آگے عوام کے مفاد کو جس طرح کچلا اس کی نظیر نہیں ملتی۔

ہندوستان سے بدھ دھرم کے خاتمہ کے لئے مسلمان حملوں کو سبب بتایا گیا ہے جبکہ پشپامتر شنگا (۱۸۷ - ۱۵۱ قبل مسیح) کے ہاتھوں برھمنوں پر سب سے زیادہ تشدد اور ظلم ہوا۔ اس نے پاٹلی پتر سے سکلا (سیالکوٹ) تک (یعنی مگدھ سے پنجاب تک) کے بدھ وہاروں کو تباہ اور نذر آتش کر دیا۔ بہت سے بدھ قتل ہوئے اور جو بچ گئے وہ ادھر اُدھر چلے گئے۔

گپت راجاؤں کے بعد ہنوں نے تو وہ ستم ڈھایا کہ دنیا میں اس کی نظیر نہیں۔ ان میں سب سے زیادہ سفاک اور خونخوار "مہرکل" تھا۔ اس نے شمال مغرب اور مالدہ میں برھمنوں کا صفایا کیا۔ ان کے درباروں اور عبادت گاہوں کو زمین سے ملا دیا اور بقول مصنف راج ترنگنی، تین کروڑ انسانوں کو تہہ تیغ کیا۔

یورپ میں بدھوں کے خاتمے کا بڑا گوڑ (بنگال) کے راجہ "ششانک" نے اٹھایا، یہ ذات کا برھمن اور شیو کا معتقد تھا۔ لال منی جوشی کا کہنا ہے کہ: "ششانک کے تباہی اور بے حرمتی کے کاموں کی جڑیں اس کے بدھ دھرم سے تنفر میں پیوست تھیں جس پتھر پر بدھ کے پیر کا نشان تھا اسے اکھاڑ کر گنگا میں پھینک دیا۔ بدھی پیڑ کے مشرق میں جو مندر تھا اس میں سے بدھ کی مورتی نکال کر پھینک دی اور اس کی جگہ شیو کی مورتی رکھ دی۔ نرگرنتھوں کے مٹھوں، خانقاہوں کو برباد کر دیا۔

بنگال کے "سین" راجاؤں نے ایک بدھ کو بھی نہیں چھوڑا۔ پھر بھی دنکر کا کہنا ہے کہ:
"اس کا خاتمہ مسلمانوں کے حملوں کی وجہ سے ہوا کیونکہ مسلمانوں نے سنگھیوں کو نیست و نابود کر دیا اور ان کے خاتمے پر بدھ دھرم جی نہیں سکتا تھا"۔ دنکر نے یہ بات اس وقت لکھی جب وہ یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ "کبھی کبھی راجا شرمنوں کے مٹھوں پر اس لیے بھی حملے کرنے لگے کہ شرمنوں کے بھاگ جانے پر وہ مٹھوں کی دولت پر قبضہ کر سکیں"۔ (سنسکرتی کے چار ادھیائے) یہ بات راجپوتوں کے سلسلے میں کہی گئی ہے۔

ان مظالم کے بعد مسلمانوں کی آمد کے وقت اس ملک میں کتنے بدھ رہ گئے ہوں گے اس کا آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ بدھ دھرم کی یادگار زندہ میں صرف فلسفے کی صورت میں باقی رہ گئی ہوگی۔ اس کی تائید چینی سیاحوں کے سفرناموں سے بھی ہوتی ہے۔ ان میں لکھا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی سے پہلے ہی بدھ دھرم ہندوستان کے بڑے حصے سے غائب ہو چکا تھا۔

بہرحال بدھ دھرم کا ہندوستان سے خاتمہ اور اس کی جنم بھومی کا اس سے محروم ہو جانا، انسانی تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے جس کی وجہ سے آفاقی کلچر کو بڑا نقصان پہونچا ہے۔ ملک میں برہمن دھرم کا پھر سے عروج ہوا اور انسانوں کی بہت بڑی جماعت اپنے اس انسانی حق سے پھر محروم ہو گئی جسے اس نے مہاتما بدھ کی کوششوں کے بعد پایا تھا۔

کوائف جامعہ (بسلسلہ صفحہ ۵۷)

ریاست کشمیر میں، کانگریس کی مدد اور پنڈت جواہرلال نہرو کے اثر سے، شیخ عبداللہ کی سربراہی میں نیشنل کانگریس کو ڈوگرا راج کے خلاف جنگ آزادی میں جو کامیابی حاصل ہوئی اور قومی رہناؤں کی وکوشش سے وہاں کے عوام میں قومی اتحاد و یگانگت کے جو جذبات پیدا ہوئے، اس کی مثال اس وقت کی دوسری دیسی ریاستوں میں ناپید تھی۔

جلسے کا آغاز تلاوت قرآن حکیم سے ہوا تھا، اس کے بعد طالبات نے جامعہ کا ترانہ پیش کیا اور جلسے کے آخر میں قومی ترانہ گایا۔

(کوائف نگار)

کوائف جامعہ

ایک سابق اتالیقہ کی وفات

جامعہ مڈل اسکول کی ایک سابق اتالیقہ محترمہ طاہرہ خاتون شمیم کا ۱۲ ر نومبر کو صبح کے تقریباً ساڑھے سات بجے حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔ انّا للّٰہ وانّا الیہ راجعون۔ مرحومہ آصفہ مجیب (بیگم پروفیسر محمد مجیب) کی حقیقی بہن اور سندیلہ کی رہنے والی تھیں۔ مرحومہ نے تقریباً بیس سال تک، ۱۶ ر جولائی ۱۹۵۵ء تا ۱۵ ر جولائی ۱۹۷۵ء مدرسہ ابتدائی کے بورڈنگ میں جوہر منزل کے چھوٹے بچوں کی اتالیقہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، ریٹائر ہونے کے بعد وہ اپنی چھوٹی بہن، محترمہ آصفہ مجیب کے ساتھ رہتی تھیں۔ انھیں ہائی بلڈ پریشر کی شکایت تھی، مگر عام صحت اچھی تھی۔ ۱۲ ر نومبر کی صبح کو حسب معمول نماز پڑھی اور دیگر معمولات ادا کیے اور اپنی منھ بولی بیٹی، اسمٰی خاتون (متعلمہ بی اے آنرز سال دوم) سے فرمایا کہ کچھ کمزوری محسوس ہو رہی ہے، چائے بنا دو، وہ چائے لے کر آئیں تو اس عرصے میں ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ اسی روز سہ پہر میں انھیں جامعہ کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

ان کے غم میں ۱۲ ر نومبر کو جامعہ بند رہی اور ۱۳ ر نومبر کو صبح کے وقت بیگم مجیب کے مکان پر عورتوں نے اور بعد نماز جمعہ، جامعہ کی مسجد میں مردوں نے قرآن خوانی کی۔ مرحومہ کی تاریخ پیدائش، ان کے پاسپورٹ کے مطابق ۲ ر اکتوبر ۱۹۰۱ء ہے۔ ان کی وفات سے سابق شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب، آصفہ مجیب اور دیگر اعزا کو جو غم ہوا ہے، اس میں ادارۂ ماہنامہ جامعہ، جامعہ کے ارباب حل وعقد اور اساتذہ وکارکنان برابر کے شریک ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا کرے۔ (آمین)

جلسۂ یوم تاسیس

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ۶۱ واں یوم تاسیس، حسب معمول جوش و خروش مگر سادگی اور سنجیدگی کے ساتھ منایا گیا۔ جامعہ کے لوگ اس تاریخ کو احتساب اور جائزہ کا دن سمجھتے ہیں، اس لئے ایسے مضامین بھی پڑھے جاتے ہیں اور ایسی تقریریں بھی کی جاتی ہیں جن میں آزادی کے ساتھ جامعہ کی کارکردگی، رفتار ترقی اور طریق کار پر تنقید کی گئی ہو۔ چنانچہ امسال بھی دو مضامین ایسے پڑھے گئے جن میں اچھے اور ہمدردانہ انداز میں تنقید کی گئی تھی، جناب سید جمال الدین صاحب (شعبۂ تاریخ و تہذیب) نے اردو میں مضمون پڑھا جس کا عنوان تھا: جامعہ بدل گئی اور جناب محمد طالب صاحب (شعبۂ سوشل ورک و سوشیالوجی) نے انگریزی میں مضمون پڑھا جس کا موجودہ بدلے ہوئے حالات میں جامعہ کی معنویت کا جائزہ لیا گیا تھا، یعنی اس مسئلے پر بحث کی گئی تھی کہ جامعہ جن حالات میں قائم کی گئی، وہ یکسر بدل گئے ہیں، اسی لحاظ سے اس کے مقاصد پر بھی غور کرنا چاہئے کہ کہاں تک تبدیلی یا توسیع کی ضرورت ہے۔

یوم تاسیس کے جلسے کا انتظام جامعہ کا کوئی تعلیمی ادارہ کرتا ہے، امسال مڈل اسکول اور مدرسہ ثانوی کے اہتمام میں منعقد ہوا، شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب نے جلسے کی صدارت فرمائی۔ تلاوت قرآن حکیم سے جلسے کا آغاز ہوا، اس کے بعد مڈل اسکول اور مدرسہ ثانوی کے طلبہ و طالبات نے نظمیں سنائیں اور مضامین پڑھے، آخر میں شیخ الجامعہ صاحب نے تقریر فرمائی۔

جلسے سے قبل، حسب معمول، جامعہ کا جھنڈا لہرایا گیا، شیخ الجامعہ صاحب نے سلامی دی اور بچوں نے جامعہ کا ترانہ پڑھا، جسے جامعہ کے سابق استاد اور بچوں کے مشہور شاعر، مرحوم شفیع الدین صاحب نیر نے لکھا ہے اور ہر سال یوم تاسیس کے موقع پر پڑھا جاتا ہے۔ یہ سماں بہت ہی اثر انگیز ہوتا ہے اور جامعہ کی پرانی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

اس جلسے میں جامعہ کالج کی ایک طالبہ، انجم ظہور (متعلمہ بی اے آنرز) نے بھی ایک مضمون پڑھا تھا، جس کے چند اقتباسات یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔ انجم ظہور نے

جامعہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھا کہ: "۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں جامعہ کی بنیاد رکھی گئی۔ جامعہ کا قیام ایک خواب کی تعبیر کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ خواب آزادی کے بعد زیادہ قابل قدر اور قابل ستائش معلوم ہوتا ہے۔ اس موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد کی اس تقریر کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے جو انھوں نے علی گڑھ یونین میں جامعہ کے قیام سے پیشتر کی تھی، انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے طلبہ سے کہا تھا: "جاؤ اور سوچ کر کل مجھے جواب دو۔ رات کا سناٹا ہوگا اور تم ہوگے، اس وقت اپنے ضمیر کو ٹٹولو، اپنے باطن کا جائزہ لو اور سوچ کر ایک رائے قائم کرو۔" اس احتیاط، جذبے اور ولولے نے جامعہ کو جنم دیا تھا۔ مولانا آزاد کا یہ پیغام اور ان کی یہ دعوت عمل آج بھی ہمارے لئے مشعل راہ کا کام دے سکتی ہے، اسے بہرحال ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ جامعہ دوسرے تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں کی طرح محض ایک تعلیمی ادارہ نہیں ہے، بلکہ ایک تحریک اور ایک پیغام ہے۔"

"جامعہ کا قیام اس دور میں ہوا جب جدید ہندوستان کے ذہن کی نشوونما ہو رہی تھی، اس دور کے بیشتر قومی رہنماؤں کی ہمدردیاں اور تعاون جامعہ کو حاصل تھا ـــــ مہاتما گاندھی، شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شوکت علی، حکیم محمد اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری عبدالمجید خواجہ، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، ڈاکٹر سید محمود اور ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ۔ الغرض اس دور کا کوئی بھی قابل ذکر رہنما اور دانش ور، چاہے وہ کسی علاقے اور مذہب سے تعلق رکھتا ہو، ایسا نہیں تھا، جس کا تعلق یا کم از کم اس کی ہمدردیاں جامعہ کو حاصل نہ رہی ہوں۔ محض ایک تعلیم گاہ کا قیام ان سب کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کرا سکتا تھا۔ جامعہ کے بارے میں ان بزرگوں نے متعدد مواقع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، جس سے اس کے کردار اور مقصد پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ جامعہ کے پہلے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر جناب حکیم اجمل خاں صاحب کی تقریر کا ایک اقتباس پیش ہے جس سے اس کے کردار اور مقصد پر روشنی پڑتی ہے۔ فرماتے ہیں: "ہم نے اصولی حیثیت سے تعلیم کو صحیح شاہراہ پر ضرور ڈال دیا ہے اور جہاں ہم نے سچے مسلمان پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کیں، وہاں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا کہ تعلیم و تربیت میں ماحول کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے اور اسلامیات کے ساتھ وطن کی خدمت کا

جذبہ پیدا کرنا بھی ہمارے پیش نظر ہے۔ چنانچہ اس امر کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ جہاں ہندو طلبہ کے لئے اسلامی معاملات پر معلومات حاصل کرنا ضروری ہے، وہاں مسلمان طلبہ بھی اہم ہندو رسوم اور تہذیب و تمدن سے ناآشنا نہ رہیں گے کہ ایک متحدہ ہندوستانی قومیت کی اساس محکم اسی باہمی تفہیم و افہام پر منحصر ہے۔" ہندوستان کے مشہور سائنس داں، پی، سی، رے نے اپنے خطبۂ تقسیم اسناد میں فرمایا تھا کہ: "مجھے اس خیال سے مسرت ہو رہی ہے کہ یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ صداقت و آزادی کی ہمیشہ علمبردار رہے گی۔" دوسری جگہ فرمایا کہ: "جن بزرگوں کے نام اس سے وابستہ ہیں، وہ اس بات کے ضامن ہیں کہ ہندو مسلم اخوت اس جگہ ہمیشہ جاری و ساری رہے گی۔"

اپنے مضمون کے آخر میں انجم ظہور نے کہا کہ: "جامعہ کے بنیادی مقاصد کو آگے بڑھانے کے لئے آج پہلے سے زیادہ کوشش کی ضرورت ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ محض ایک درسگاہ نہیں ہے، ہندوستان اور دہلی میں تعلیم کا کاروبار کرنے والے اداروں کی کمی نہیں ہے۔ کیا جامعہ کو بھی ان میں سے ایک ہو جانا چاہئے؟ اس سوال پر ہم سب کو غور کرنا چاہئے۔ آج کے ہندوستان کو بھی جامعہ کی اسی طرح ضرورت ہے، جیسی آزادی سے پہلے تھی۔ لہذا ملک و قوم کے موجودہ تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے جامعہ کو آگے بڑھنا چاہئے اور اس کو ثابت کرنا چاہئے کہ جامعہ دوسری یونیورسٹیوں کی طرح محض ایک تعلیم گاہ نہیں ہے، یہ اس کے علاوہ اور کچھ بھی ہے۔"

جامعہ میں پروفیسر آنے ماری شیمل کے دو لکچر

ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) کی جرمن پروفیسر، آنے ماری شیمل ہندوستان میں بالخصوص قارئین جامعہ کے لئے اسقدر معروف ہیں کہ کسی خاص تعارف کی ضرورت نہیں، مستشرقین میں وہ ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔ اپنے وسیع مطالعہ، علمی دیانت اور اسلامی موضوعات پر گراں قدر تصانیف کی بنا پر وہ علمی، خصوصاً مسلم حلقوں میں بہت مقبول ہیں۔ وہ جب کبھی دہلی تشریف لاتی ہیں تو عموماً جامعہ میں کسی نہ کسی موضوع پر کوئی لکچر ضرور دیتی ہیں۔ اس مرتبہ از راہ عنایت،

ایک ہی دن میں دو لکچر دیئے۔ ۱۱ر نومبر کو صبح کے ساڑھے گیارہ بجے شعبۂ اردو اور اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی کے مشترک اہتمام میں: "عالم اسلام کی مقامی زبانوں میں صوفیانہ شاعری" پر مقالہ پڑھا اور سہ پہر میں ساڑھے تین بجے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ایک جلسہ میں اقبال کی مشہور نظم "گورستان شاہی" پر تقریر کی۔ اس نقطۂ نظر سے کہ اس نظم میں اقبال کے فلسفے کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ ان دونوں جلسوں کی صدارت پروفیسر سید حمید الدین (ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن۔ دہلی) نے کی۔ جناب شیخ الجامعہ صاحب دہلی سے باہر تشریف لے گئے تھے، اس لئے قائم مقام شیخ الجامعہ کی حیثیت سے جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب شریک رہے اور پروفیسر شمیل کی میزبانی کے فرائض انجام دئے۔

صبح کے جلسے میں فاضل مقالہ نگار نے تقریباً ایک گھنٹے تک عالم اسلامی کی مقبول اور عوامی صوفیانہ شاعری پر اظہار خیال فرمایا اور ترکی، سندھی، پنجابی اور اردو کی صوفیانہ شاعری پر سیر حاصل بحث کی۔ اس جلسے میں بیرونی ممالک کے مہمان بھی اچھی خاصی تعداد میں شریک تھے۔ شعبۂ اردو کے صدر، پروفیسر گوپی چند نارنگ دلی سے باہر تھے، اس لئے ڈاکٹر محمد ذاکر صاحب (ریڈر شعبۂ اردو) نے فاضل مقالہ نگار اور موضوع زیر بحث کا تعارف کرایا اور جلسے کے بعد ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صاحب (سکریٹری اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی) نے معزز مہمان، صدر جلسہ اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

شام کے جلسے میں ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے فاضل مقرر پروفیسر شمل کا تعارف کراتے ہوتے ان کی علمی خدمات کا ذکر کیا اور اقبال کی نظم "گورستان شاہی کے مندرجہ ذیل اشعار پڑھ کر سنائے تاکہ سامعین کے ذہن میں تقریر کے موضوع کی یاد تازہ ہو جائے۔

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے | اس ستمگر کا ستم انصاف کی تصویر ہے
چاند جو صورت گر ہستی کا اک اعجاز ہے | پہنے سیمابی قبا محو خرام ناز ہے
چرخ بے انجم کی دہشتناک وسعت میں مگر | بیکسی اس کی کوئی دیکھے ذرا وقت سحر

اک ذرا سا ابر کا ٹکڑا ہے، جو مہتاب تھا
آخری آنسو ٹپک جانے میں ہو جس کی فنا

زندگی اقوام کی بھی ہے یوں ہی بے اعتبار — رنگ ہائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بہار
اس زیاں خانے میں کوئی ملت گردوں وقار — رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار

ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ اقوامِ نو!
مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوامِ نو!

زندگی سے یہ پرانا خاکداں معمور ہے — موت میں بھی زندگانی کی تڑپ مستور ہے
پتیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح — دستِ طفلِ خفتہ سے رنگیں کھلونے جس طرح

اس نشاط آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے
ایک غم، یعنی غمِ ملت ہمیشہ تازہ ہے

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں — اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں
اشکباری کے بہانے ہیں یہ اجڑے بام و در — گریۂ پیہم سے بینا ہے ہماری چشمِ تر
دہر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم — آخری بادل ہیں اک گزرے ہوئے طوفاں کے ہم
ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کی آغوش میں — برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں
وادیِ گل خاکِ صحرا کو بنا سکتا ہے یہ — خواب سے امیدِ دہقاں کو جگا سکتا ہے یہ

ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

اقبال کی یہ نظم "گورستان شاہی" جون ۱۹۱۰ء میں شیخ عبدالقادر کے مشہور ماہنامہ "مخزن" (لاہور) میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی۔ اس سے تین ماہ قبل ۱۸ر مارچ ۱۹۱۰ء کو اقبال لاہور سے حیدرآباد دکن کے لیے روانہ ہوئے اور ۲۹ر مارچ کو وہاں سے لاہور کے لئے روانہ ہوتے۔ اقبال پہلی مرتبہ حیدرآباد تشریف لائے تھے اور سر اکبر حیدری کے یہاں قیام فرمایا تھا۔ قیام کے اس مختصر عرصے میں مختلف تاریخی اور اہم مقامات کی زیارت کی۔ اسی سلسلے میں شہنشاہ اورنگ زیب کے مزار پر خلد آباد جا کر حاضری دی اور

گورستان شاہی بھی تشریف لے گئے۔ مخزن میں اس نظم کی اشاعت کے ساتھ اقبال کے قلم سے حسب ذیل نوٹ بھی شائع ہوا تھا:

"حیدرآباد دکن کے مختصر قیام کے دنوں میں میرے عنایت فرما جناب مسٹر نذر علی صاحب بی اے معتمد محکمۂ فنانس ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے ایک شب ان شاندار مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت کے لئے لے گئے جن میں سلاطین قطب شاہیہ سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی، ابر آلود آسمان اور بادلوں میں سے چھن کے آتی ہوئی چاندنی نے اس پر حسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔ ذیل کی نظم ان ہی بے شمار تاثرات کا ایک اظہار ہے۔ اس کو میں اپنے سفر حیدرآباد کی یاد میں مسٹر حیدری اور ان کی لئیق بیگم صاحبہ مسز حیدری کے نام نامی سے منسوب کرتا ہوں، جنھوں نے میری مہمان نوازی اور میرے قیام حیدرآباد کو دلچسپ بنانے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔"

اپنے نوٹ میں اقبال نے "شاندار مگر حسرت ناک" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس مناسبت سے پروفیسر شبل نے اپنی تقریر میں اقبال کے مخصوص فلسفے کی روشنی میں ان دونوں الفاظ کی وضاحت بھی کی۔

تقریر کے بعد صدر جلسہ پروفیسر وحید الدین صاحب نے تقریر کا تجزیہ کرتے ہوئے اقبال کے فلسفیانہ شاعری پر مختصراً روشنی ڈالی۔ آخر میں ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے فاضل مقرر، صدر جلسہ اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

فرقہ پرستی پر گول میز مباحثہ

شعبۂ تاریخ اور جامعہ قومی یکجہتی سمیتی کے اہتمام میں اور انڈین کونسل فار سوشل سائنس ریسرچ کے ناردرن ریجنیل سنٹر کی دعوت پر ۱۳ نومبر کی شام کو ایک گول میز مباحثہ منعقد ہوا، جس میں فرقہ پرستی کے مختلف پہلوؤں پر دلی کے دانشوروں نے تفصیل سے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس جلسے کی صدارت شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب نے کی۔ اور نظامت کے فرائض صدر شعبۂ تاریخ ڈاکٹر مشیر الحسن صاحب نے ادا کئے۔

مباحثہ کا آغاز کرتے ہوئے شیخ الجامعہ صاحب نے ہندوستان میں فرقہ پرستی کے مختلف مظاہر پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ یہ راؤنڈ ٹیبل مناسب موقع پر منعقد کی گئی ہے اور خاص طور پر مرادآباد کے پچھلے افسوسناک فسادات کا ذکر کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ اس کے اسباب پر روشنی ڈالی جائے گی اور معروضی انداز میں اس کا تجزیہ کیا جائے گا۔ صدر جلسے کی اس تقریر کے بعد، پروفیسر رشید الدین خاں (شعبۂ سیاسیات جواہر لال نہرو یونیورسٹی)، پروفیسر بی پن چندر (شعبۂ تاریخ جواہر لال نہرو یونیورسٹی) اور ڈاکٹر ٹی۔ این مدان (شعبۂ سماجیات دلی یونیورسٹی) نے تقریریں کیں، اس کے بعد حاضرین جلسہ میں سے متعدد حضرات نے مباحثے میں سرگرم حصہ لیا اور مختلف قسم کے سوالات اٹھائے۔ آخر میں تینوں فاضل مقررین نے جوابی تقریریں کیں۔

اس مباحثے میں مختلف خیالات اور مختلف نقطۂ نظر کا اظہار کیا گیا، مثلاً پہلی تقریر میں آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کے فرقہ وارانہ فسادات پر تفصیلی نظر ڈالتے ہوئے یہ کہا گیا ہے ان فسادات کا تعلق مذہب سے بالکل نہیں ہے بلکہ ان کے اسباب معاشی ہیں، انھوں نے فرمایا کہ عام طور پر یہ فسادات اسی وقت ہوتے ہیں جب معاشی تعطل ہو اور ان ہی مقامات پر ہوتے ہیں جہاں اقتصادی بحران ہو۔ ایک صاحب نے سیاسی پارٹیوں کے اس طریق کار پر سخت تنقید کی کہ انتخابات کے مواقع پر فرقہ وارانہ بنیاد پر ٹکٹ دیئے جاتے ہیں، ایک صاحب نے حکومت پر اعتراض کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک طرف وہ سیکولرزم کا دعویٰ کرتی ہے، دوسری طرف فرقہ وارانہ بنیاد پر تعلیمی اداروں کے قیام کی اجازت دیتی ہے اور ان کی مالی امداد بھی کرتی ہے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ تعلیمی اداروں میں ۳۰ فیصدی نجی ادارے ہیں اور ان میں ۹۰ فیصدی مذہبی ادارے ہیں، ان کا خیال ہے کہ جب تک اس قسم کے تعلیمی ادارے ملک میں کام کرتے رہیں گے، قومی یکجہتی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔ ان تقریروں میں یہ ذکر بھی آیا کہ پولیس میں اقلیتوں کی مناسب نمائندگی ہونی چاہئے، اس کی مخالفت میں کہا گیا کہ پولیس کو پولیس ہونا چاہئے نہ کہ مختلف فرقوں کی نمائندہ جماعت۔ ان صاحب کا خیال تھا کہ اگر مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتیں سختی سے

کام لیں تو پولیس میں چاہے ایک ہی فرقے کے لوگ ہوں یا مختلف فرقوں کے، فسادات روکے جا سکتے ہیں اور امن برقرار رکھا جا سکتا ہے اور اگر حکومت کمزور ہو گی یا توجہ سے کام نہ لے گی تو ملی جلی پولیس ہونے کے باوجود فسادات ہو سکتے ہیں اور امن قائم نہیں ہو سکتا۔ کسی اخبار کا نام لئے بغیر ان اخبارات پر بھی اعتراض کیا گیا جو فسادات کے موقع پر یک طرفہ اور بڑھا چڑھا کر خبریں شائع کرتے ہیں اور فرقہ وارانہ جذبات کو جان بوجھ کر یا غیر شعوری طور پر بھڑکاتے ہیں۔

غرض ان تقریروں میں فسادات اور ان کے اسباب و علل پر تفصیل سے، ایک اچھے ماحول میں، پورے ڈھائی گھنٹے بحث و گفتگو کی گئی۔ اور ڈاکٹر مشیر الحسن کے شکریے پر یہ گول میز مباحثہ ختم ہوا۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری صدی

ہندوستان کے مشہور قومی رہنما اور جامعہ ملیہ کے دوسرے امیر جامعہ، ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کی پیدائش کو امسال ۲۵ دسمبر کو سو سال ہو جائیں گے۔ اسی مناسبت سے، اس سال مارچ کے اواخر میں جامعہ ملیہ کے ایک جلسے میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے انصاری صدی کے آغاز کا اعلان کیا تھا۔ اب اسی سلسلے میں جامعہ ملیہ کے شعبۂ تاریخ کے اہتمام میں ۲۱ تا ۲۳ نومبر، ایک سہ روزہ سیمینار منعقد کیا گیا ہے، جس کا موضوع ہے: "ہندوستانی قومیت کی مقامی بنیادیں"۔ اس سیمینار کا افتتاحی اجلاس ۲۰ نومبر کی سہ پہر میں منعقد ہوا جس میں جامعہ کے اساتذہ، کارکنوں اور طلبا کے علاوہ کافی تعداد میں معززین شہر نے شرکت کی۔

اس سیمینار کا افتتاح امیر جامعہ، جسٹس محمد ہدایت اللہ (نائب صدر جمہوریہ) کرنے والے تھے، مگر عین وقت پر سرکاری مصروفیات کی وجہ سے وہ تشریف نہ لا سکے اور ان کے بجائے ریاست جموں و کشمیر کے معزز رہنما جناب سید میر قاسم نے افتتاح فرمایا۔ موصوف نے اپنے افتتاحی خطبے میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کی شخصیت اور خدمات پر روشنی ڈالی۔ اس سے پہلے سیمینار کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر مشیر الحسن نے امیر جامعہ کا خط پڑھ کر سنایا جس میں انھوں نے برملا کے صدر کی آمد کی وجہ سے نہ آ سکنے پر معذرت کی تھی اور مرحوم ڈاکٹر انصاری کی قومی

خدمات کا ذکر کرتے ہوئے انھیں خراج عقیدت پیش کیا تھا۔

افتتاحی خطبے سے قبل شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا، جس میں انھوں نے مہمان خصوصی سید میر قاسم، محترمہ زہرہ انصاری، سیمینار کے مقالہ نگاروں اور حاضرین جلسہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے، ڈاکٹر انصاری مرحوم کی شاندار قومی اور تعلیمی خدمات پر روشنی ڈالی اور انھیں مخلصانہ خراج عقیدت پیش کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ ڈاکٹر انصاری جامعہ کے بانیوں میں سے ہیں، حکیم اجمل خاں کی وفات کے بعد اگر وہ جامعہ کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں نہ لیتے، اپنے مخصوص اثرات اور ذرائع سے کام لے کر مالی امداد نہ فرماتے تو آج جامعہ کا وجود نہ ہوتا۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ جامعہ کے قبرستان میں دائمی نیند سو رہے ہیں اور ہم نہ صرف محبت اور احترام کے ساتھ انھیں یاد رکھتے ہیں بلکہ ان کی یہ قربت ہمارے لئے فیضان اور محرک کا باعث بھی ہے۔

مہمان خصوصی سید میر قاسم کا خیر مقدم کرتے ہوئے شیخ الجامعہ نے فرمایا کہ اگرچہ اس وقت ان کے پاس کوئی قلمدان وزارت نہیں ہے، مگر کشمیر کے مجاہد آزادی کی حیثیت سے ملک میں ان کی بڑی اہمیت اور ہمارے دلوں میں ان کی بہت عزت ہے۔ ہندوستان سے کشمیر کے تعلقات کو خوشگوار بنانے اور اس میں استحکام پیدا کرنے میں ان کی مخلصانہ خدمات کو بڑا دخل ہے۔ موصوف نے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے ایک عرصے تک کشمیر کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اور شریمتی اندرا گاندھی کی مدد سے ریاست میں قومی یکجہتی اور سکولر ذہنیت پیدا کرنے کے لیے بڑے تحمل اور صبر و ضبط کے ساتھ کام کیا ہے، مگر ان کے خلوص کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ملک اور خود ریاست کے مفاد میں، شیخ عبداللہ کو کشمیر کا وزیر اعلیٰ بنانے کی ضرورت پیش آئی تو بڑی خوشی کے ساتھ اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا، سیاسی دنیا میں ایسی مثالیں بہت ہی کم ملتی ہیں۔ شیخ الجامعہ صاحب نے مزید فرمایا کہ ہمیں بڑی خوشی ہے کہ اس سیمینار کے افتتاح کے لیے بالآخر ہمیں ایک ایسی شخصیت کی خدمات حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی جس کی ذات، ہندوستانی قومیت کی بہت سی مقامی بنیادوں میں سے ایک اہم مقامی بنیاد کی بہترین نمائندہ ہے...... (باقی صفحہ ۵۶۶ پر ملاحظہ ہو)

Regd. No. D-(S.E.)-108 Vol. 77 No. 11 November, 1980
THE MONTHLY JAMIA, Jamia Nagar, New Delhi-110025

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

سالانہ چندہ چھ روپے

جامعہ

قیمت فی پرچہ پچاس پیسے

جلد ۷۷	بابت ماہ دسمبر ۱۹۸۰ء	شمارہ ۱۲

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی ٭ مطبوعہ: جمال پریس دہلی ۶ ٭ ٹائیٹل: فائن پریس دہلی ۶

شذرات

نوبل انعامات میں ادب کے انعام کی کہانی دلچسپ بھی ہے اور متنازعہ فیہ بھی، اسی طرح نوبل انعامات کے بانی الفریڈ نوبل کی داستان حیات بھی دلچسپ ہے۔ اپنی زندگی کے عروج کے دور میں اس نے اپنے بھائی لُڈوِگ کو ایک خط میں لکھا تھا: "ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ حسرتناک ناکام زندگی کسی صاحب خیر طبیب کے ہاتھوں اسی وقت ختم ہو جاتی جب وہ شور مچاتی وجود میں آئی تھی۔" بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن الفریڈ نوبل کی حیات کا غور سے مطالعہ کیجیے تو اس میں کسی قدر صداقت بھی ہے۔ جب اس نے اپنے کیریر کا آغاز کیا تو وہ خالی ہاتھ تھا۔ لیکن جب اس کا انتقال ہوا تو وہ یورپ کے سب سے زیادہ متمول لوگوں میں تھا۔ اس کی وصیت تھی کہ اس کی وفات کے بعد اس کی املاک کا بیشتر حصہ ایک فنڈ کی صورت میں منتقل کر دیا جائے اور سالانہ منافع پانچ حصوں میں تقسیم کر کے فزکس، کیمسٹری، میڈیسن، لٹریچر اور امن و سلامتی کے میدان میں نمایاں کام کرنے والوں کو بطور انعام دیا جائے اس سال ہر انعام ۲ لاکھ بارہ ہزار ڈالر کا تھا

نوبل انعامات کی چمک دمک میں ہمیں اکثر اس شخص کا خیال نہیں رہتا جو اُن کا بانی تھا، لیکن پھر بھی متجسس نگاہیں اسے تلاش کر لیتی ہیں۔ جنوبی فرانس میں بحیرۂ روم کے ساحل پر سین ریمو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اسی قصبہ میں ۱۰ دسمبر ۱۸۹۶ء کو شب میں ۲ بجے اس کے اپنے مکان میں الفریڈ نوبل کا انتقال ہوا۔ اس وقت اس کے ملازمین ہی اس کے ساتھی تھے۔ اس کی موت اس کی عمر بھر کی تنہائی کی ایک زندہ علامت تھی۔ اپنی موت سے کئی سال قبل اس نے لکھا تھا: "جب چون ۵۴ برس کی عمر میں کوئی اپنے آپ کو اس قدر تنہا محسوس کرے کہ اس کا باتنخواہ ملازم ہی اس کا اکیلا غمگسار رہا ہو تو بوجھل غم انگیز خیالات اسے گھیر لیتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اپنے ملازم کی نگاہوں سے میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ اُسے

مجھ پر کتنا ترس آرہا ہے۔۔۔۔، افسوس کی بات یہ ہے کہ بعض خود پسند لکھ پتیوں کی طرح الفریڈ نوبل نے خود اپنے لئے تنہائی کی زندگی پسند نہیں کی تھی۔ اس کے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل تھا لیکن اس کی طبیعت میں تصوریت کا عنصر بھی شامل تھا۔ زندگی کے آخری لمحوں تک اُسے ایک ایسی تعلیم یافتہ، مہذب اور ذہین بیوی کی تلاش رہی جس کا دل محبت اور رحم کے جذبے سے معمور ہو۔ اس نے محبت بھی کی لیکن نتیجہ میں اسے گہری مایوسی، روحانی اذیت اور کرب اور چبھن ہی ملی۔

نوبل ایک ایسے سویڈش خاندان میں پیدا ہوا جس میں پہلے بھی باصلاحیت افراد پیدا ہو چکے تھے۔ اسے کسی یونیورسٹی میں باضابطہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا، لیکن اُس نے اپنے شوق سے جرمن، فرانسیسی، انگریزی، روسی اور سویڈش زبان میں اچھی مہارت حاصل کی، اُس نے کیمسٹری کا علم حاصل کیا اور اس مضمون سے اُسے مرتے دم تک شغف رہا۔ ۱۸۶۷ء میں اس نے ڈائنامیٹ کی ایجاد کی۔ اس کے تخلیقی ذہن نے اس میدان میں اور بھی کئی ایجادیں کیں۔ اس نے اِن کے کارخانے قائم کئے اور اپنی تنظیمی صلاحیت سے پورے یورپ بلکہ امریکہ میں بھی اپنے کاروبار کا جال پھیلا دیا۔ پیرس کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا کر وہ مسلسل یورپ و امریکہ کے اہم مقامات کے چکر لگاتا رہا اور جب وہ دنیا سے رخصت ہوا تو جرمنی، فرانس، سویڈن اور دوسرے ملکوں میں اُس کی کروڑوں کی ملکیت کی املاک تھیں۔ اس کی وصیت کا جب لوگوں کو علم ہوا تو سب حیرت زدہ رہ گئے۔ اس کی وصیت ساری دنیا کے لئے تھی، اس کے عزیزوں نے اسے مستند سمجھنے سے انکار کر دیا اور سویڈن کو اس صاحبِ خیر انسان میں حب الوطنی کی کمی نظر آئی کیونکہ وصیت میں امن و سلامتی کے انعام کی ذمہ داری ناروے کو سپرد کی گئی تھی۔ بہرحال رفتہ رفتہ ہنگامہ فرو ہوا اور ۱۹۰۱ء میں پہلے نوبل انعامات کا اعلان ہوا۔

نوبل انعامات بڑے گراں قدر اور وقیع ہیں اور شاید اسی لئے اس سلسلے میں اختلافِ آرا کے بڑے بڑے معرکے بھی رہے ہیں۔ ادب کا پہلا نوبل انعام سلی پرودھوم کو ملا تھا اور اس پر خاصا اختلاف رہا تھا۔ ٹالسٹائی کو نظر انداز کر دیا گیا تھا اور تمام دنیا کے ادیبوں نے

اس بات پر احتجاج کیا تھا لیکن ۱۹۰۱ء میں ٹالسٹائی کو نظر انداز کئے جانے کی ایک وجہ یہ بتائی گئی کہ قاعدہ کے مطابق یکم فروری سے پہلے کسی کو اس کا نام پیش کرنا چاہئے تھا، اور ایسا نہیں ہوا تھا۔ اُن دنوں نوبل کمیٹی کو یہ اختیار نہیں تھا کہ وہ نامزد کئے گئے اشخاص کی فہرست میں کسی اور نام کا اضافہ کر سکے۔ بعد میں یہ قاعدہ بدل دیا گیا۔ لیکن بعد میں ٹالسٹائی کا نام کئی بار پیش ہوا اور ہر بار اسے نظر انداز کیا گیا۔ یہ صورت حال یقیناً افسوسناک تھی، اور اس کا ذمہ دار نوبل کمیٹی کا ایک با اثر ممبر تھا جس کی دلیل یہ تھی کہ ٹالسٹائی انعام کا مستحق اس لئے نہیں تھا کہ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ روپے پیسے کا انعام مصنفوں، ادیبوں اور شاعروں کے حق میں مضر ہے۔ ادب کے انعام کی کمیٹی کا ایک ممبر ڈاکٹر ہیڈن تھا اس سے اِروِنگ ویلیس نے ملاقات کی اور کئی ممتاز مصنفوں اور ادیبوں کو انعام نہ دیئے جانے کی وجہ پوچھی۔ جواب ملا کہ گورکی کا انتقال قبل از وقت ہو گیا، ایچ۔ جی۔ ویلز کی تخلیقات صحافتی نوعیت کی تھیں اور وہ عام بہت زیادہ مقبول تھا۔ ہیڈن سے جب جیمس جوائس کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے پوچھا: 'یہ کون ہے؟' یہ حال تھا نوبل انعام کمیٹی کے ایک ممبر کا۔

۱۹۱۳ء میں رابندر ناتھ ٹیگور کو نوبل انعام ملا۔ اور تعجب ہے کہ اس پر بہت کم اختلاف رائے ہوا۔ یورپ سے باہر ٹیگور پہلے شخص تھے جنھیں ادب کا انعام ملا تھا۔ ٹیگور کا نام لندن کی رائل سوسائٹی کے تھامس سٹرج مور نے تجویز کیا تھا۔ شروع میں اس پر بحث رہی کہ ٹیگور کو منتخب کیا جائے یا فرانس کے ادبی مورخ امیل فاگوے کو۔ لیکن آخر میں ٹیگور کے نام پر کمیٹی متفق ہو گئی۔

نیچرل سائنسز میں جو انعامات دئے گئے ہیں ان سے متعلق عام طور پر اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن امن و سلامتی کے انعام سے متعلق بڑے اختلافات رہے ہیں۔ الفریڈ نوبل نے اپنی وصیت میں یہ لکھا تھا کہ یہ انعام اس شخص کو دیا جائے جو قوموں کے مابین اخوت اور خیر سگالی کے کام میں نمایاں خدمت انجام دے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بڑا الجھا ہوا مسئلہ ہے۔ آخر وہ کونسا پیمانہ ہے جس کی رو سے ہنری کسنجر اور مادر ٹریسا دونوں امن و سلامتی کے انعام کے لئے سر فہرست رکھے جا سکتے ہیں؟ ۱۹۶۹ء میں نوبل انعامات پانچ کے بجائے چھ کر دئے گئے

الفریڈ نوبل کے زمانے میں معاشیات کو وہ مقام نہیں حاصل تھا جو اسے آج حاصل ہے۔ معاشی علوم کے انعام کے لئے نوبل نے وصیت نہیں کی تھی اور وصیت کی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی تھی۔ لہٰذا صورت یہ نکلی کہ سویڈن کے سویریجیز رکس بنک نے یہ انعام اس طرح قائم کیا کہ وہ ہر سال دوسرے انعامات کے بعد ایک رقم نوبل فاؤنڈیشن کو دے گا جو معاشی علوم میں کسی ممتاز عالم کو دی جائے گی۔ یہ انعام پہلی بار جان ٹینبرگن اور راگنر فریش کو مشترک طور پر دیا گیا۔

اپنی وصیت میں الفریڈ نوبل نے لکھا تھا کہ انعامات کی تقسیم میں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ امیدوار کس ملک کے رہنے والے ہیں۔ اس سلسلہ میں ۱۹۷۳ء تک جو صورت حال رہی ہے اس میں امریکہ سب سے آگے تھا، ۱۹۷۳ء تک وہاں کے ۱۱۳ اشخاص کو یہ انعامات مل چکے تھے۔ اس کے بعد برطانیہ آتا ہے جہاں ۶۷ انعام گئے۔ اس کے بعد جرمنی جہاں کی تعداد ۵۹ تھی۔ لیکن مضمون وار صورت حال مختلف ہے۔ ادب میں فرانس کا نمبر اوّل ہے کیمسٹری میں جرمنی آگے ہے اور فزکس اور میڈیسن میں امریکہ نے سبھی کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ان اعداد و شمار سے ایک ہی حد تک مختلف اقوام کی علمی وادبی صلاحیتوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ہم انعامات کا فیصلہ کرنے والوں کے تحفظات ذہنی کو یکسر نظر انداز نہیں کرسکتے۔ آخر وہ بھی انسان ہیں اور انسانوں سے غلطی کا ہر وقت امکان رہتا ہے۔ پھر زبان اور تہذیب کی تحدیدات بھی ہیں جن کا اثر اگر فیصلہ کرنے والوں کی رایوں پر پڑے تو کچھ ایسی عجیب بات نہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود ہمارے نزدیک جو اہم بات ہے وہ یہ ہے کہ ہر سال جب نوبل انعامات کا اعلان ہو تو ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ آدمی مرجاتا ہے لیکن اس کا اچھا اور بڑا کام زندہ رہتا ہے اور اس طرح وہ گویا خود زندہ رہتا ہے۔

ڈاکٹر عابد پشاوری

سلکِ گوہر کا دوسرا اور رانی کیتکی کی کہانی کا تیسرا مخطوطہ

چار پانچ سال اُدھر جموں یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے لیے انشاؔ کی تین نثری تصانیف کے قلمی نسخے لکھنؤ سے خریدے گئے تھے: سلکِ گوہر، رانی کیتکی کی کہانی اور دریائے لطافت۔ اصلاً یہ تینوں نسخے یک جا مجلّد ہوں گے لیکن اب جلد ضائع ہو چکی تھی۔ ہم نے ڈاکٹر سلیمان حسین کو، جن کی معرفت یہ نسخے خریدے گئے تھے، لکھا کہ ان کی الگ الگ جلد بنوا دی جائے لیکن شاید ۱۵۔۲۰ صفحے کی کتاب کی جلد نہ اچھی بندھتی نہ مضبوط، اس لئے سلکِ گوہر اور رانی کیتکی کی کہانی کی ایک ساتھ جلد بنوا دی گئی اور دریائے لطافت کی الگ۔ ڈاکٹر سلیمان کی اطلاع تھی کہ نسخے بہت کرم خوردہ اور خستہ حالت میں ہیں، اس لیے ان سے درخواست کی گئی کہ وہ کل اوراق پر بٹر پیپر لگوا دیں کہ جموں میں اس کی سہولت نہیں۔ بات شاید ان کی سمجھ میں نہیں آئی اور بجائے اوراق پر بٹر پیپر چپکوانے کے ہر دو صفحات کے درمیان ایک ایک رائس پیپر رکھوا کر جلد بندھوا دی گئی۔ کہیں کہیں حاشیوں اور متن میں بھی اسی کاغذ سے مرمت کروا دی گئی۔ فی الوقت اسی نسخے کا تعارف

ڈاکٹر شیام لال کالڑا، قلمی نام: عابد پشاوری، ریڈر شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی۔ جموں۔ ۱۸۰۰۰۱

مقصود ہے۔

سلک گوہر کا دوسرا مخطوطہ

سلکِ گوہر ایک مختصر سی داستان ہے جس کی سب سے بڑی خوبی یا خامی یہ ہے کہ یہ صنعتِ غیر منقوط میں ہے۔ اب سے پہلے اس کے صرف ایک نسخے کا علم تھا جو رضا لائبریری رام پور کی ملکیت ہے (اس کی تفصیلات معلوم نہیں) اس لحاظ سے یہ دوسرا نسخہ ہے جو دستیاب ہوا ہے۔ سہولت کے لیے آئندہ اسے نسخۂ جموں کہا جائے گا۔

نسخۂ جموں رجسٹر سائز کا ہے جس کی پیمائش تقریباً ۱۳" × ۸" ہے۔ اوراق ½-۱۰ ہیں (گیارھویں ورق کے شروع میں کہانی ختم ہو گئی ہے۔ اسی کے آخر میں رانی کیتکی کی کہانی کا ترقیمہ ہے اور اس کی پشت یعنی ورق ۱۱ ب سے رانی کیتکی کی کہانی شروع ہو جاتی ہے)۔ مسطر پندرہ سطری ہے۔ خط نستعلیق اوسط، کاتب نامعلوم۔

زمانۂ کتابت: اگرچہ خود اس پر کوئی ترقیمہ موجود نہیں تاہم اس کے اختتام پر رانی کیتکی کی کہانی کا ترقیمہ ہے جس میں سنہ ۱۲۴۳ھ موجود ہے (اس میں تحریف کی گئی ہے۔ بصورتِ موجودہ یہ ۱۲۲۳ پڑھا جاتا ہے۔ سلیمان حسین صاحب نے اسے ۱۲۳۲ھ پڑھا ہے۔ تفصیل رانی کیتکی کے ضمن میں بیان ہو گی) چونکہ دونوں کا کاغذ، روشنائی اور کاتب ایک ہی ہے اس لیے اسے بھی ۱۲۴۳ھ ہی کا مکتوبہ ہونا چاہیے۔

کیفیت نسخہ: نسخہ ناقص الاول ہے، لیکن ایک ورق سے زیادہ کا نقصان نہیں۔ لوح وغیرہ کے بعد ورق ۱ کے وسط سے کہانی کا آغاز ہوا ہو گا۔ حمد، نعت، منقبت اور مدحِ ائمۂ اطہار تک کا حصہ ضائع ہو گیا ہے۔ ورق ۲ الف (جو موجودہ نسخے میں ص ۱ ہے، غالباً جلد بندی کے وقت کسی نے سرخ پنسل سے صفحات کے نمبر لکھے ہیں جس کے مطابق یہ داستان ص ۱ سے شروع ہو کر ص ۲۱ کے شروع میں ختم ہو جاتی ہے) کتاب کی تعریف کے بعد اس کے نام سے شروع ہوتا ہے: "اور اسم اس کلام کا سلکِ گوہر رکھ اور آ۔۔۔" داستان کا اختتام مصنف کے خاندان اور والد کی تعریف میں ان جملوں پر ہوتا ہے: "مرد طعام دہ،

مددگار کہہ دیہہ، ہمہ دکھ کا سہارا، گمراس کا اہل کمال کا آسرا، آپا اس کا صلہ اس کو دار السرور اور مدام ظہور عطا کر اور سو لاکھ گرہ کر دا کر۔"

یہ نسخہ انتہائی کرم خوردہ ہے۔ اکثر صفحات چھلنی ہو گئے ہیں۔ اس کے باوجود متن پڑھ لیا جاتا ہے۔ کاغذ باریک اور نفیس قسم کا ہے جو امتداد زمانہ سے پیلا پڑ گیا ہے۔ کرم خوردہ اور دریدہ حصوں پر کہیں کہیں بٹر پیپر کی چیپیاں لگائی گئی ہے لیکن اکثر مقامات پر متن اور حاشیوں کی مرمت کے لئے ویسا ہی باریک کاغذ استعمال کیا گیا ہے، جیسا نسخے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ یہ کام بے سلیقگی سے کیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کئی مقامات کاغذ کے نیچے دب کر ناخوانا ہو گئے ہیں۔ جہاں جہاں یہ کاغذ اکھڑا ہوا ہے، یا اکھڑ سکتا ہے اس کے نیچے متن کا بیشتر حصہ محفوظ ہے اور پڑھا جا سکتا ہے۔

خط اگرچہ اوسط درجے کا ہے، اس کے باوجود محسوس ہوتا ہے کہ کاتب نے خصوصاً اس داستان کو بڑے اہتمام سے لکھا ہے۔ ہر صفحے پر کئی رنگ کی جدولیں ہیں۔ پہلی (اندرونی) شنجرفی، دوسری سیاہ، پھر خاص چوڑی سنہری اس کے بعد دوسرا سیاہ خط اور آخر میں لاجوردی۔ متن میں اکثر و بیشتر اعراب لگانے کا اہتمام بھی کیا گیا ہے جس سے متن کی صحیح قرأت ممکن ہو گئی ہے۔ اس کے باوجود کہیں کہیں کاتب عجلت کا شکار ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے کئی جگہ الفاظ چھوٹ گئے ہیں۔ عنوانات و اسما سرخ روشنائی سے لکھے ہیں۔ کہیں کہیں بین السطور الفاظ کے معنی بھی اسی روشنائی سے لکھے ہیں۔ اشعار مسلسل ہنٹر کی طرح لکھے ہیں البتہ مصرعوں کو سرخ نقطوں سے (؞) علیحدہ کیا گیا ہے۔ شروع کے صفحات میں فقرہ مکمل ہونے پر تین سرخ نقطے (؞) لگا کر اگلے لفظ پر سے بنایا گیا ہے لیکن بعد میں عجلت کی وجہ سے یہ سلسلہ قائم نہیں رہا۔ عجلت کا ایک ثبوت اور بھی ہے۔ مثلاً انشا ہر جگہ شعر یا نظم سے پہلے "کلام مصرع دار" لکھتے ہیں۔ اسے عنوان کی طرح سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے لیکن بعد کے اوراق میں چند مقامات پر عبارت کی بجائے سرخ روشنائی سے علامتِ شعر "ـہ" بنا دی گئی ہے۔

جیسا کہ ذکر ہوا اس سے پہلے سلک گوہر کا صرف ایک نسخہ دستیاب ہوا تھا جو کتب خانہ عالیہ رام پور کی زینت ہے۔ مولانا امتیاز علی خان عرشی نے نسخہ رام پور کو

۱۹۴۸ء میں تاپ میں شائع کر دیا تھا، لیکن اس نسخے کی تفاصیل درج نہیں کیں سوائے اس کے کہ کہیں کہیں حاشیے میں کچھ خاص الفاظ کے سلسلے میں کاتب کے املے کی وضاحت کر دی ہے، یا کہیں کہیں ان معنوں کا ذکر کیا ہے جو بین السطور لکھے گئے ہیں۔ عرشی صاحب نے نہ تو یہ بتایا ہے کہ نسخۂ ہذا کب لکھا گیا (غالباً اس میں کوئی ترقیمہ نہیں ہے) اور نہ ہی دس صفحے کے مقدمے میں داستان کے سنہ تصنیف پر روشنی ڈالی ہے۔ البتہ ایک جگہ 'طور الاسرار' (بے نقط مثنوی) کا حوالہ ضرور دیا ہے جو ۱۲۱۴ھ کی تصنیف ہے اس کا چوں کہ ایک شعر سلکِ گوہر میں بھی ہے، اس لئے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ۱۲۱۴ھ کے بعد کی تصنیف ہے۔ مولانا عرشی نے مقدمے میں کہانی کی کچھ خصوصیات اور کچھ خصوصیاتِ کاتب بھی بیان کی ہیں۔

زمانۂ تصنیف: اس مختصر داستان کا آغاز حمد و نعت و منقبت سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد "مدحِ حاکم عصر ادام اللہ" کے عنوان کے تحت سعادت علی خان کی مدح لکھی گئی ہے۔ چوں کہ اس سے کہیں یہ گمان نہیں ہوتا کہ انشا نواب کے ملازم ہیں، اس لئے راقم نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے مقالے میں یہ قیاس کیا تھا کہ اسے ۱۲۱۴ – ۱۲۱۸ھ کے درمیان کی تصنیف ہونا چاہئے۔ لیکن اب ہمارا خیال ہے کہ یہ ۱۴ر شعبان، ۱۲۱۴ھ کے بعد اور ۱۲۱۵ھ کے اختتام کی تصنیف ہے۔ داستان کے آخر میں انشا نے اپنے دادا اور والد کی تعریف میں چند فقرے لکھے ہیں۔ آخر میں خدا سے، ان کی سخاوت کے صلے میں ان کی "سولاکھ گرہ کو دا" کرنے کی دعا کی ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ میر ماشاء اللہ خان زندہ ہیں۔ ان کا انتقال ۱۲۱۵ھ میں ہوا[1] اس لئے ہمارا قیاس ہے کہ یہ داستان ۱۲۱۵ھ سے پہلے لکھی جا چکی تھی۔ انشا کا بیشتر غیر منقوط کلام (کچھ غزلیات کو چھوڑ کر) ۱۲۱۴ھ ہی کا کہا ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے سنہ مذکور میں انشا پر صنعت غیر منقوط کا دورہ پڑا تھا اور انھوں نے طور الکلام، طور الاسرار، تین غزلیں، کچھ رباعیاں، ایک نثری اور ایک منظوم رقعہ تصنیف کر ڈالے تھے، بلکہ کلامِ انشا کے مخطوطے، مخزونۂ انجمن کراچی سے گمان ہوتا ہے کہ تقریباً نصف دیوان بے نقط بھی ۱۲۱۴ھ تک تصنیف ہو چکا تھا[2] لہٰذا یہ قیاس نامناسب

---

[1] : تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون "انشا کے باپ اور بیٹوں سے متعلق کچھ نئی معلومات"

[2] : ایضاً "کلام انشا کا ایک نادر مخطوطہ"۔

نہیں کہ سلکِ گوہر ۱۲۱۵ھ سے پہلے تصنیف ہو چکی تھی۔

خصوصیات املا: عرشی صاحب نے سلکِ گوہر مطبوعہ ۱۹۴۸ء کے مقدمے میں لکھا ہے کہ کاتب نے "علی" کو کہیں اس طرح اور کہیں "علا" لکھا ہے۔ پہلی صورت انشا کے مقصد کے خلاف تھی (کیونکہ اس دور میں "ی" میں نہ صرف نقطے معتبر سمجھے جاتے تھے بلکہ لکھے بھی جاتے تھے) زیرِ گفتگو نسخے میں بھی ہمیشہ "علی" ہی لکھا گیا ہے بلکہ کئی ایسے الفاظ میں بھی نقطے لگائے گئے ہیں جن میں ہمزہ آتا ہے مثلاً سایل، مایل، دایرہ وغیرہ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دونوں نسخے ایک دوسرے کی نقل ہیں مثلاً نسخۂ رام پور میں "ع" کو کہیں کہیں "ء" لکھا گیا ہے۔ ہمارے نسخے میں ایک جگہ بھی ایسا نہیں ہے۔ البتہ بعض الفاظ جو ہائے مختفی پر ختم ہوتے ہیں انھیں کہیں کہیں نسخۂ رام پور کی طرح الف سے لکھا ہے۔ کبھی اس کے برعکس بھی کیا گیا ہے مثلاً دولھا کو "دولھا" اور "دولہ" دونوں طرح لکھا ہے۔ نسخۂ رام پور میں بین السطور کچھ الفاظ کے معنی لکھے ہیں۔ معنی زیرِ تعارف نسخے میں بھی ہیں لیکن ان الفاظ کے نہیں جو، ن۔ر۔ میں ہیں، بلکہ ان سے الگ ہیں۔ مطبوعہ داستان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کاتب نے غالباً اعراب کا خیال نہیں رکھا۔ ہمارے نسخے میں اکثر و بیشتر اعراب کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ہر ورق کے آخر میں ترک کا اہتمام بھی کیا گیا ہوگا لیکن نسخے میں وہ مقام اکثر دریدہ ہیں اور ان پر چیپیاں لگی ہوئی ہیں۔ ابتدائی صفحات میں فقرے کے خاتمے پر سرخ روشنائی سے تین نقطے (۰۰۰) لگائے گئے ہیں اور نئے فقرے کے پہلے لفظ پر ــ بنایا گیا ہے۔ ہائے مخلوطہ کو ہمیشہ کہنی دار (ھ) سے لکھا گیا ہے لیکن کہیں کہیں تزئین کے لئے (ھ) بھی لکھی گئی ہے جیسے اھل، ھمسر، ھمراہ وغیرہ۔ تزئین ہی کی غرض سے دو لفظوں کے آخری دائرے مشترک بھی بنائے گئے ہیں جیسے عکس صلح (عکس صلح)، کہیں کہیں آخری "ہ" کو گھسیٹ کر حرف ماقبل کے ساتھ ملا دیا گیا ہے مثلاً گلکدہ، رہ رہ، عمدہ، دورہ وغیرہ۔ کاف اور گاف میں عام طور سے امتیاز روا رکھا گیا ہے لیکن کہیں کہیں گ پر ایک ہی مرکز بنایا گیا ہے۔ ن۔ر۔ میں غالباً گ پر ہمیشہ ایک ہی مرکز ہے، اس لئے مرتب کو کہیں کہیں لفظ کی قرأت میں تسامح ہوا ہے۔ "علاحدہ" کو ہمیشہ علحدہ لکھا ہے۔ اعراب بالحروف کا استعمال اوس (اس کے علاوہ بھی کئی الفاظ میں

ملتا ہے اور بے نقط ہونے کی وجہ سے ایسے الفاظ کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ تاہم کاتب کی عجلت پسندی سے قطع نظر نسخہ مزیر تعارف میں املا کی صحت پر زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے جس کی تفصیل حسب موقع پیش ہوگی۔

نسخے کی اہمیت : اس نسخے کی سب سے بڑی اہمیت تو یہی ہے کہ اس نسخے سے پہلے صرف ایک نسخہ تھا اور ایک نسخے سے مرتبہ متن تسامحات سے خالی نہیں ہوتا اور اگر زبان بھی نامانوس اور غیر مروجہ ہو تو کریلا اور نیم چڑھا سمجھئے۔ داستان چوں کہ صنعت غیر منقوطہ میں ہے اور زبان غیر مانوس، اس لئے اس کا پڑھنا اور صحیح متن مرتب کرنا اور بھی مشکل تھا۔ اب اس نسخے کی دریافت سے اکثر مشکوک مقامات کی تصحیح ممکن ہوگئی ہے۔ ذیل میں چند ایسے مقامات کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

م ص ۴ : (م سے مراد مطبوعہ متن اور ن۔ ج۔ سے نسخہ جموّں مراد ہے۔ ن۔ ر نسخۂ رام پور کے لئے استعمال کیا گیا ہے)
"مسرورِ سکر مدام طہور۔۔۔۔ مرصع محل کا وارد ہو کر"

ن۔ ج۔ ۱ : "مسرورِ سکر مدام طہور مرصع محل کا وارد ہوکر"
(ن۔ ر۔ میں طہور کے بعد بقدر یک لفظ نقطے ملتے ہیں۔ ن ج۔ میں نقطے نہیں ہیں اور نہ ہی کوئی لفظ چھوٹا ہوا معلوم ہوتا ہے بلکہ عبارت مربوط و مکمل ہے۔ اس کے علاوہ اس میں "کر" بھی نہیں ہے اور اس کے بغیر بھی عبارت با معنی ہے)

م ص ۴ : سوار کار ہما کر دار صرصر اطوار۔

ن۔ ج۔ ص ۱ : سوار کارِ ہما کردارِ صرصر اطوار
(ہمارے خیال میں سوار کار ایک مرکب ہے "سوار کرنے والا" یعنی گھوڑا جو ہما کردار و صرصر اطوار ہے۔ اس لئے کار کے نیچے کسرۂ اضافت ضروری ہے)

م۔ ص ۵ : موسمِ گل کا ولولہ (نسخے میں ولولا۔ ن، ج۔ میں ولولہ ہی لکھا ہے)

م ص ۶ : اِدھر آؤ، اُدھر اس کو لاؤ (عرشی صاحب نے حاشیے میں بتایا ہے کہ نسخے میں اُدھر "اودھر" ہے۔ اگرچہ مقام اِدھر ہی کا ہے۔ لیکن ن، ج میں بھی اودہر ہے۔ ممکن ہے انشا نے اودہر ہی لکھا ہو)

م۔ص ۷: حاصل کہ وہ اُداس ترک رکاوسا کلمہ . . .

ن۔ج۔ص ۲: حاصل کہ وہ اُداس اُداس . . . الخ

م۔ص ۷: حد سوا دل دُکھا

ن۔ج۔ص ۲: حد دل دُکھا (سوا کے بغیر بھی جملہ درست ہے۔ انشا اکثر اس قسم کی تراکیب استعمال کرتے ہیں جیسے حد گرم، حد حساس ہوا وغیرہ)

م۔ص ۷: وہ اِکلا آلودۂ درد و الم . . . . .

ن۔ج۔ص ۲: وہ اَگلا، آلودۂ . . . الخ (انشا "اگلا" لیڈر، سردار وغیرہ کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ یہاں صاف گاف ہے اور الف کے نیچے زیر بھی نہیں ہے)

م۔ص ۹: محامدِ اوصالِ ملکۂ گوہر آسا (اوصال کے نیچے لکھا ہے: "یعنی اوصافِ سراپا" ن۔ ج۔ میں معنی نہیں ہیں)

م ص ۹: کمر کولا اور ادا . . .

ن۔ج ص ۴: کمر کولہا (کولھا) اور ادا . . .

ن۔ج۔ص ۴: سماکِ رامح اور وہ دو صاد کلکِ مالکِ معاد (خط کشیدہ الفاظ پر اسی طرح خط کھینچ کر بین السطور لکھا ہے: "وآں تصویر لیست در آسمان کہ نیزہ در دست دارد" یہ عبارت ن۔ ر۔ میں نہیں ہے)

م۔ص۔۹: اور محلِ سمع ہر واحد محسودِ کل

ن۔ج۔ص ۴: . . . . محسودِ گل (کان کے لئے محسودِ گُل ہی مناسب ہے)

م۔ص ۹: اور واہ سو واہ، سو لاکھ واہ

م۔ج۔ص ۴: واہ اور واہ، سو واہ، لاکھ واہ، سو لاکھ واہ

م۔ص ۹: دو گال کا اس طرح کا کمال، کہ ہو ہو مہر و ماہ کا سا حال
. . . . . ہو بہو . . . .

(یہ ہوبہو نہ کلمۂ انبساط ہے نہ کلمۂ استعجاب۔ غالباً النسّاخ نے اسے ہُو بہو کے معنی میں استعمال کیا ہے جیسے لمحہ لمحہ یا دن دن یعنی لمحہ بہ لمحہ، دن بہ دن)

م۔ص ۱۰ : گلا کو کلا کا سا

گلا کو کلا سا

م۔ص ۱۰ : اُس سرو کا سامراد کا (ہو) (نسخے میں "ہو" نہیں ہے۔ عرشی صاحب نے قیاساً بڑھایا ہے)

ن۔ج۔ص ۵ : اس سرو کا سامُراد کا کوہ لالا ("کو" گو بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ غالباً النسّاخ نے کو بمعنی کہا لکھا اور مزید زور دینے کے لئے لالا یعنی نہیں ہوسکتا، بڑھادیا۔ یہ بھی ممکن ہے کاتب یہ عبارت غلط لکھ گیا ہو۔ کیوں کہ اس کے فوراً بعد کولا کولھا) یعنی کولھا وہ کولھا ہے لیکن یہاں "کو لالا" کے بعد وہ کو لالہ ..... ہے، اور کولھا کو بھی کو لا ہی لکھا ہے)

م ص ۱۰ : گرہ مو ہر کر اُس ..... الخ (اصل میں یہ موکر ہے۔ ن۔ج۔ میں بھی موکر ہے۔ جب دونوں نسخوں میں موکر ہے تو اسی کو درست ماننا چاہئے گا۔ تاہم یہ فقرہ خاصا الجھا ہوا ہے۔ ن۔ج۔ میں "گرہ" کے نیچے بھی زیر نہیں ہے)

م۔ص۱۰ : رومادل کالا گو دسر کا سہارا کھا کر۔۔۔

ن۔ج۔ص ۵ : رُمادل (کا) کالا گو دِسترہ کا سہار اکہا (کھا) کر۔۔۔

م۔ص ۱۰ : دو کوہ الماس کا آسرا کر ، ٹرک رہا۔ اور وہ مور دِ الماس ولعل و گہر کہ ہر گرد اس کو بل بل محسور سماد سمک ہو۔

۔۔۔۔ ۔۔ ۔ کہ ہر گرد اس کو مل مل محسورِ سماو سمک ہو۔

دگرد یعنی پہلوان۔ ظاہر ہے کوہ کو ملنے کے لئے کسی پہلوان کی ضرورت

ہوگی۔ رِل کی بجائے کِل موزوں ہے، یہاں زیر نہیں ہے۔)

م۔ ص ۱۰: وہ مادۂ (اصل مادّہ) مارکا مولد کہ ہر عروس کا رسوا گر ہو

ن۔ج۔ ص ۵: وہ مادۂ (ۂ بے تشدید) مارکا مولد کہ ہر عروس کا رسوا گر ہو (رسوا گر = رسوا کرنے والا)

ن۔ج۔ ص ۵: اور وہ مصلح عکس صلح ...... (عکسِ صلح کے اوپر سرخ روشنائی میں "یعنی حرب" لکھا ہے۔ ن۔ر۔ میں یہ نہیں ہے)

م۔ ص ۱۱: عکسِ صُلح اُس دم کہ حاکو سمسم اسودِ مدادِ کار کہہ کر معلم کرو۔ دس دس ہلال ہمراہِ ماہ کامل ......

...... حاکو سمسم اسودِ مدادِ کار کہہ کر مُعلم کرو (سمسم کے نیچے سرخ روشنائی میں یہ عبارت ملتی ہے: "یعنی کُنجد سیاہ کہ مراد از نقطہ باشد یعنی حرب و مصلح حرب ناخن است" اور "مُعلم" کے نیچے کالی روشنائی سے "علامت دار" لکھا ہے۔ دال پورا نظر نہیں آتا کہ یہ جگہ کرم خوردہ ہے)

م ص ۱۱: اِس کلام کو مسموع کر کر

ن۔ج۔ ص ۶: .... مسموع کر

م۔ ص ۱۲: وہ کاسہ اور رسّا اگر ...

ن۔ج ص ۶: وہ کاسہ اور وہ رسا اگر ....

م۔ ص ۱۲: مولودۂ مسعودہ (اصل مسعود) گُل رو کو کہا

ن۔ ج ص ۶: مولودۂ مسعودۂ (اصل میں بھی یہی ہے) گُل رُو کو گرما کر کہا

م ص ۱۳: معاکسۂ کلامِ مسطور

ن۔ج۔ ص ۶: معاکسۂ کلامِ مصرع دار

م ص ۱۵: کو کہ مسو سو کوس لو اور ملو لا گولا کھاؤ

نا۔ ج ص ۷: گوکہ مسوسو کوس لو اور ملولا گو کہ کھاؤ (مولانا عرشی نے لکھا ہے کہ

اصل میں "گوکہ" ہے ۔ لیکن کسی تسامح کے سبب انھوں نے اِسے "کوکھ"
بنا دیا ہے ۔ انشا نے گوکہ بمعنی اگرچہ لکھا ہے)

م ۔ ص ۱۶ : گہرا گدرّ کا مار ہم کو

ن ۔ ج ۔ ص ۸ : گہرا گدرّ کا مار ہم کو

م ۔ ص ۱۶ : سر ہلا کر کہا کہ وہ عدکرم (اصل گرم)
(ن ۔ ج ۔ میں بھی گرم ہے اور معنوی اعتبار سے بھی یہی درست ہے)

م ۔ ص ۱۸ : مُل اگر مسکرِ کاستہ عدل ہو

ن ۔ ج ۔ ص ۱۹ : مگر اگر مُسکرِّ کاسۂ مُلِ عدل ہو

م ۔ ص ۱۸ : اور دھرا آسرا

ن ۔ ج ۔ ص ۹ : اور دوہرا آسرا

م ۔ ص ۱۸ : اگر سہو محو معمول ہمارا ہو

ن ۔ ج ۔ ص ۹ : ... سہو و محو ....

م ص ۱۹ : واہ واہ اِلو

ن ۔ ج ۔ ص ۹ : واہ واہ، لو

م ۔ ص ۱۹ : اِس لاگ کو آگ کا لوکا

ن ۔ ج ۔ ص ۱۰ : اِس لاگ لگاؤ کو آگ کا لوکا

م ۔ ص ۲۰ : ہمد گر کا گلہ ولہ (اصل گلا ولا) سارا دوٗر کرو

ن ۔ ج ۔ ص ۱۰ : ہمد گر کا دلاسا و لاسا سارا دور کرو ۔ (یہاں ن ۔ ر ۔ مرجّح ہے)

م ۔ ص ۲۰ : مال اور ملک در کار ہو

ن ۔ ج ۔ ص ۱۰ : مال و ملک .. ..

ن ۔ ج ۔ ص ۱۰ : ملکہ گوہر آرا کا سوہلا واہواہ (سوہلا کے نیچے لکھا ہے : نام راگ)

م ص ۲۰ : سو اس دم اِس سلوکہ کا

ن ۔ ج ۔ ص ۱۱ : سو اِس دم اِس حملوکہ کا

م ص ۲۱ : اِس سوا کام اور ہو

ن۔ ج۔ ص ۱۱ : اِس سوا کام ہو

م ص ۲۱ : گہر اور الماس کا سہ درہ

ن۔ ج۔ ص ۱۱ : گہر اور الماس " "

م ص ۲۲ : گہر اگد کا اور گل کھلاو

ن۔ ج۔ ص ۱۱ : گہر اکد تا اور گل گھلا و

م ص ۲۲ : داہ عدل، سرکو

ن۔ ج۔ ص ۱۱ : داہ عدل واہ عدل، سرکو

م ص ۲۲ : وہ سرکار کا ملوک اور گلرو ملوکہ

ن۔ ج۔ ص ۱۱ : وہ سرکار کا ملوک اور وہ گلرو کا ملوکہ

م ص ۲۴ : کوس رعد آسا، اور ڈہل (اصل دہل دل) سامعہ سا

ن۔ ج۔ ص ۱۲ : کوس رعد آسا اور ڈہلِ دلِ سامع سا (یہ بہتر متن ہے "دل" ن۔ ر میں بھی ہے لیکن "سامعہ" کی وجہ سے ناموزوں لگتا ہے)

م ص ۲۴ : راگِ سامع آرا مسموع کر

ن۔ ج۔ ص ۱۲ : راگِ سامعہ آرا " " (ن۔ ر میں سامع شاید طباعت کی غلطی ہے)

م ص ۲۵ : کہ روح کو آلگا

ن۔ ج۔ ص ۱۲ : روح کو آلگا

م ص ۲۵ : ہر دل کا اِرادہ کر کر، کڑا آگ کا کر

ن۔ ج۔ ص ۱۲ : ہر دل کا اِرادہ کر کر، کڑا (کڑہ) آگ کا کرا۔

م ص ۲۵ : مرادو، اماموکا کھرا کھرا (اصل کہرا کہرا) کہروا

ن۔ ج۔ ص ۱۲ : مرادو (اصل مُرادو) اماموں کا گہرا گہرا کہڑا (ن۔ ر میں ک اگ میں فرق نہیں کیا گیا اس لئے مرتب کو تسامح ہوا ہے)

م ص ۲۵ : دم سادہ، اگم ہو، گاگا کر " ادھو ہر اگہرا والا عالم ہم را "

ن-ج-ص ۱۲ : دم سادھ سادھ، سر در کم ہو گا گا کر : اوڈ ٹھو مُٹھڑا کہڑا وآلا حاکم ہمرا
؟ (اُدھو)

م ص ۲۵ : اور کالا کمل والا گوالا

ن-ج-ص ۱۳ : اور وہ (کالا) کمل والا گوالا

م ص ۲۵ : سولہ سولہ سو کا مسو سا رو رو کہک کہک سلگ سلگ

ن-ج-ص ۱۳ : سولہ سو کا مسوسا رورو گُہک گُہک سُلگ سُلگے (اصل سُو لگ لگے۔
ایک سُو لکھنے سے رہ گیا ہے)

م ص ۲۶ : کاھو کہا دوس سگر و دوس ھارو

ن-ج-ص ۱۳ : کاھُو کو کہا دوس سگر و دوس ہارو

م- ص ۲۶ : اور کورد کا گھما کا، اور ھر ھر سور اور شو ڈر کا گھل گھلاو

ن-ج-ص ۱۳ : اور گوڑ ڈ کا گھما کا، اور ہر ہر سُوڑ اور شُو ڈر کا گھُل گھلاو

م ص ۲۶ : اور کو یک کا لگا

ن-ج-ص ۱۳ : گوُ مک کا لگّا

(مطبوعہ میں ص ۲۸ - ۲۹ پر جو دوہڑے کی اشعار ہیں وہ ن-ج میں کچھ غلط
لکھے ہوئے ہیں البتہ بین السطور الفاظ کے معنی لکھے ہیں جن کی مدد سے اشعار
کو درست کیا جا سکتا ہے)

م ص ۲۸ : واہ واہ ! وہ دو دھارا دِکھا دِکھا، دھمکا دھمکا کر

ن-ج-ص ۱۴ : اور واہ واہ، وہ دو دھارا دکھا دکھا، دھمکا (دھمکا) کر

م ص ۲۸ : کہ اصلِ مُولد گُلّ روہ

ن-ج ص ۱۴ : کہ اصلِ مُولد گُلی روہ

م ص ۲۸ : اعادہ اِس کلام کا : ملا سردارا اِسکوّا اِسکوّا

ن-ج-ص ۱۴ : اعادہ اِس کلام کا : در درہ لاس را کُوہ سردارہ ہر کلہ سردارا اِسکوّا اِسکوّا

م ص ۲۸ : وہ مکالمہ علماءِ اہلِ دہ کا ہمدگر اِس طور

ن-ج-ص ۱۳: وہ مکالمۂ ملاء اہل دہ ہمدگر اِس طور

م ص ۲۸ : ملا محمود مع اولہ

ن-ج-ص ۱۴ : ملا محمود مع اولہ

م ص ۲۹ : ڈوؤ کو رد کریں

ن-ج-ص ۱۴ : دوؤ کو رد کریں

م ص ۲۹ : کہ کہرا اُس سا دوسرا کم ہوگا

ن-ج-ص ۱۵ : کہ کہرا اُس سا " " (کہرا کے نیچے لکھا ہے: "قومی است")

م ص ۲۹ : وہ طمع کلمہ کہ: مار الورد اور دُر دار و ملاو کرکر در کلوم دد۔ اومرو ک...

ن-ج-ص ۱۵ : وہ طمع کلمہ کہ: مار الورد آدر دُر دار و ملاو کرکر در گلوم دِہ ادمردکہ۔۔۔۔

م ص ۳۰ : مُشغدا گودُ، گدا وُھم کرؤ، رُستاکنُو، اُس کو دُوھو، گو دُس کرو، لگا دُھوو، مولوک مُشکا کہاوُ کہڑا کھاو کو لوک

ن-ج-ص ۱۵ : مُشغدا کودا دُہم کرد رُستاکنو، اوسکو دُہڑ، گورُوش کرو، لگا دُہڑ و مولوک مُشکا کہاو، کہڑا کہاو گولوک گولوک۔

م ص ۳۰ : مکالمہ ادسوال

ن-ج-ص ۱۵ : مکالمہ اول سوال (ہمارا خیال ہے کہ یہ عبارت دونوں میں غلط ہے۔ یہ دراصل عنوان ہے۔ ن-ج میں سرخ روشنائی میں ہے اور اسے "مکالمۂ ادوسوال" ہونا چاہئے۔ "ادوسوال" ایک ذات ہے۔ اس عنوان کے تحت الکشانے دوار کا داس ادوسوال کا مکالمہ درج کیا ہے۔)

م ص ۳۰ : گلا دلا کس کا

ن-ج ص ۱۶ : گلا دلا کس کسا

م ص ۳۳ : لوم اور نگرا اور مسکول کا گرما گرما

ن-ج-ص ۱۷ : لوم اور مگرا اور مسکول گرما گرم

م ص ۳۵ : مداح کو اِس کا صلہ آگرا

ن۔ج۔ص ۱۷ : مداح کو اِس کا صلہ آگرا (آگرہ)

م ص ۳۵ : کہ کل اِس کو گاؤ

ن س ج۔ ص ۱۸ : کہ کل اِس کو گاو

م ص ۳۵ : ہر واحد آگ کا کرا

ن۔ج۔ص ۱۸ : ہر واحد آگ کا کُرا (کُرہ)

م ص ۳۵ : اُس کا عالم اِس طور

ن۔ج۔ص ۱۸ : اُس کا عالم رہ رہ کر اِس طور

ن۔ج۔ص ۱۹ : سہر ہر در کو اصلِ طوس لگا (اصلِ طوس کے نیچے "نام پارچہ" لکھا ہے)

م ص ۳۷ : اور ھا ھا ھا

ن۔ج۔ص ۱۹ : اور اہاہاہا

م ص ۳۷ : گھما گھم کا موسم اور دہکلا

ن۔ج۔ص ۱۹ : - - - اور دہکلا (یہ غالباً "رہکلا" ہے۔ اس کے نیچے معنی لکھے ہیں: پچکاری۔)

م ص ۳۷ : وہ کلال اور گالم گال

ن۔ج۔ص ۱۹ : وہ گلال اور گالم گال

م ص ۳۷ : مادھو ہو درس دکھاؤ رادھا کو دوؤ ادھر گھر کر سدا رس لو

ن۔ج۔ص ۱۹ : مادھو ہو درس دکھاؤ رادھا کو، دوؤ ادھر گہہ کر سُدھا رس لو (اصل میں کہہ کر ہے۔ درست گہہ کر ہے)

م ص ۳۹۔۴۰ : صلہ اُس کو دلِسارا ارود

ن ج ص ۲۱ : صِلہ اُس کو دار السرور

اِن اختلافات میں اُن الفاظ کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے جن کا املا نسخۂ رام پور میں غلط ہے اور مولانا عرشی نے درست کر کے شائع کیا ہے۔ ان میں نسخۂ جمّوں کے ان الفاظ کو بھی نظرانداز کر دیا گیا ہے جو صریحاً غلط ہیں اور نہ ہی ان مقامات کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں کاغذ پھٹ جانے سے متن ضائع ہو گیا ہے۔ مندرجہ بالا اختلافات کے

پیش نظر اس داستان کے بیشتر مشکوک مقامات کی تصحیح ممکن ہو گئی ہے تاہم ابھی تک کسی صحیح تر نسخے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

رانی کیتکی کی کہانی کا تیسرا مخطوطہ

یہ مخطوطہ بھی اسی کاتب کا لکھا ہوا ہے جس نے سلک گوہر کی کتابت کی ہے۔ کاغذ اور سائز وہی ہے۔ مسطر بھی سلک گوہر کی طرح پندرہ سطری ہے۔ اسی طرح ہر ورق خوب صورت جدولوں سے مزین ہے۔ البتہ سلک گوہر کے اور اس مخطوطے میں ایک فرق تو یہ ہے کہ اس پر آب رسیدگی کے آثار بھی ہیں، اگرچہ کرم خوردہ یہ بھی ہے لیکن اسے دیمک نے ذرا مختلف انداز سے چاٹا ہے، یعنی شروع کے دو اوراق کو چھوڑ کر باقی نسخے میں وہ چھوٹے چھوٹے سوراخ کثرت سے نظر آتے ہیں جن کی وجہ سے سلک گوہر کا مخطوطہ چھلنی ہو گیا تھا۔ یہاں کرم خوردگی کے بالعموم بڑے بڑے نشان ہیں جن کی مرمت بڑے بھونڈے طریقے سے کی گئی ہے جس سے متن کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ سلک گوہر کے برعکس اس میں حسب ذیل ترقیمہ موجود ہے جو کہانی کے آغاز سے پہلے کے صفحے (سلک گوہر کے آخری صفحے) پر درج ہے:

> قصہ شر در زبان اردو بایں قید کہ ہیچ لفظ عربیہ و فارسی درا و ممزوج نباشد و ایں خیلی دشوارست زیرا کہ زبان اردو اکثر زبانہا مختلط است من تصنیف سید انشا اللہ خان المتخلص بانشا ابن میر ماشاء اللہ النجفی الحسینی
>
> الجعفری
>
> ۱۲۳۱ھ (نقل کا لااصل)

ترقیمے کی یہ عبارت ایک نوٹ کی حیثیت رکھتی ہے جو منجانب انشا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ یہ کسی ایسے نسخے سے نقل کیا گیا ہے جو خود انشا کے مسودے سے نقل ہوا ہوگا، لیکن میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ یہ خود انشا کے اپنے مسودے سے نقل کیا گیا ہے یا اس کا مُبیّضہ ہے۔ جیسا کہ سلک گوہر کے سلسلے میں لکھا گیا سنہ کتابت میں تحریف کی گئی ہے۔ یہ ۱۲۳۳ قطعاً نہیں ہے۔ یہ نسخہ سید محمد ہادی لائق (آل انیس و عارف) کی ملکیت تھا اور شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی

نے سید سلیمان حسین کی معرفت تقریباً پانچ سال پہلے خرید اتھا۔ جناب لائق صاحب کی لیاقت کا مجھے علم نہیں البتہ اتنا معلوم ہے کہ جب تک شعبے سے معاملہ طے ہو، نسخۂ ہذا ڈاکٹر سلیمان حسین کی تحویل میں رہا اور اس کے ساتھ وہی ہوا جو مخطوطۂ بیاضِ غالب کے ساتھ ہو چکا ہے، یعنی اس دو چار سال کی مدت میں اس نسخے کو انتہائی عجلت میں چھپوا دیا گیا (اشاعت اول جولائی ۱۹۷۰ء) اور غالباً اس کا علم مالکِ نسخہ کو نہیں تھا جب سودا طے ہو گیا اور نسخہ شعبے کے کتب خانے میں داخل ہو گیا تو مرتب نے اس کی ایک جلد اس وقت کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر گیان چند کی خدمت میں تحفتاً روانہ کر دی (ڈاکٹر حسین کے دستخطوں کے نیچے ۱۵ دسمبر ۷۰ء کی تاریخ درج تھی) گویا تب تک اپنی اس کارگزاری کا علم انھوں نے شعبے کو نہیں ہونے دیا جب تک کہ نسخہ خرید نہ لیا گیا۔ بہر حال اس جملۂ معترضہ کا مقصد صرف اتنا تھا کہ جب سنہ کتابت میں تحریف کا ذکر کیا جائے تو کوئی الجھن پیدا نہ ہو۔

سلیمان حسین صاحب نے ترقیمے کا سنہ ۱۲۳۳ پڑھا ہے اب یہ معلوم نہیں کہ سہواً یا عمداً۔ مجھے یاد ہے جب مطبوعہ نسخہ پہنچا اور حسین صاحب نے مجھے دکھایا تو میں نے اسی وقت مخطوطہ منگوا کر سنہ کتابت کی تصدیق کرنا چاہی۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مخطوطے میں انتہائی احمقانہ طریقے سے سنہ کو بدلنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں نے حسین صاحب سے اس کا ذکر کیا اور مخطوطہ انھیں دکھایا لیکن انھوں نے قبول نہیں کیا۔ دوسرے دن جب انھیں محدب شیشے سے محرفہ سنہ دکھایا گیا تو انھیں یقین آیا۔ آج پانچ سال کے بعد اس مخطوطے کا تعارف کروانے کا موقع ملا ہے تو ایک بار پھر یہ باتیں ذہن کے پردے پر اُبھر آئی ہیں۔ بہر حال مخطوطے میں کاتب نے ۱۲۴۳ لکھا ہے۔ معلوم نہیں کس نے نیلی روشنائی سے ۴ کے اوپری گول حصے کو ذرا سا اوپر بڑھا دیا ہے (جو بقدر یک نقطہ معلوم ہوتا ہے) جس سے اس کی صورت کچھ اس طرح ہو گئی ہے: "۳" اور صریحاً ۲ پڑھا جاتا ہے۔ نیلی روشنائی کے استعمال سے یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ محرف جو کوئی بھی ہے، اس دور کا آدمی ہے جب نیلی روشنائی کا چلن عام ہے اور اس نے یہ خیال نہیں کیا کہ مخطوطہ کالی روشنائی میں ہے اور جعل کے لئے وہی روشنائی استعمال کرنی چاہئے، ورنہ پردہ کھل جانے کا اندیشہ ہے۔ لیکن شاید اُسے قارئین کی بینائی کمزور ہونے کا

پختہ یقین تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایک نقطہ کسے نظر آئے گا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ گو آج آنکھ والے اندھوں اور کان والے بہروں کی کثرت ہے، پھر بھی ہر فریب، ہر جعل کا پردہ ایک نہ ایک دن چاک ہو کر رہتا ہے۔ خیر وہ کوئی بھی ہو، ہمارا اندازہ ہے کہ وہ مولانا امتیاز علی خان عرشی کی مرتبہ سلکِ گوہر سے ضرور واقف ہے اور اس کے مقدمے میں یہ دیکھ چکا ہے کہ مولانا نے رانی کیتکی کو ۱۲۲۳ھ کے بعد کی تصنیف کہا ہے۔ بلکہ زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ وہ سلکِ گوہر جیسی دقیق کتاب پڑھنے کی اہلیت نہیں رکھتا، البتہ اس نے "نیا دور" لکھنؤ بابت اپریل ۱۹۶۰ء میں مولانا کا وہ مضمون دیکھا ہے جس کا عنوان ہے: "انشا کی دو نادر تحریریں" جس میں مولانا نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ: "شاید یہ کہانی ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء میں حسین علی خان (ابن نواب سعادت علی خان) کی فرمائش پر لکھی گئی ہو" اس سے محرف کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہو گا کہ اس کہانی کا کوئی اور نسخہ تو ہے نہیں (وہ شاید رام پور میں موجود دو مخطوطات سے ناواقف تھا) کیوں نہ اس نسخے کو نسخۂ اوّل بنا دیا جائے اور پھر اس کی اہمیت کے پیشِ نظر چار پیسے کما لئے جائیں، لیکن معلوم ہوتا ہے اس کی یہ حسرت پوری نہیں ہوئی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس کا فائدہ کیوں نہ اٹھا سکا؟ یہ نسخہ چوں کہ میر انیس کے خاندان کے ایک فرد کی ملکیت تھا ظاہر ہے یہ قدیم سے ان کے گھرانے میں موجود رہا ہوگا۔ اگر بعد میں کہیں سے یہ نسخہ ان کے ہاتھ لگتا اور وہ خود اس میں تحریف کرتے تو ڈاکٹر سلیمان حسین صاحب کو واسطہ بنا کر بیچنے کی کیا ضرورت تھی؟ خود ہی اس کا اعلان کرتے کہ ان کی تحویل میں رانی کیتکی کا اوّلین مخطوطہ ہے، خریداروں کی کمی نہ رہتی۔ اب اگر یہ مان لیا جائے کہ مخطوطہ ہذا قدیم سے ان کے خاندان میں موجود تھا تو پھر اس تک صرف ایک شخص کی رسائی تھی، ڈاکٹر سید سلیمان حسین۔ لیکن اگر سلیمان حسین نے یہ تحریف کی تو پھر اوّل یہ کہ اس کی قیمت بہت زیادہ طلب کیوں نہ کی (تینوں مذکورہ نسخوں کے لئے ایک ہزار روپیہ طلب کیا گیا تھا، پانچ سو میں سودا طے ہو گیا) دوسرے جب خود یہ کہانی شائع کی تو اس میں سنہ کتابت ۱۲۳۳ھ کیوں لکھا؟ اور اگر وہ اسے واقعی ۱۲۳۳ھ کا مکتوبہ

سکھتے ہیں (بقول خود انشا کی وفات سے ایک سال بعد) تو پھر اس کی وہ اہمیت بھی نہیں رہتی جو اوّلین نسخہ ہونے کی صورت میں ہوتی۔ دوسرے یہ کس طرح ممکن ہے کہ محرف خود اپنے محرفہ سنہ کو غلط پڑھے؟ بہرحال یہ گتھی فی الوقت سلجھانا ممکن نہیں۔ ایک شبہ ہو سکتا ہے کہ محرف نے ۱۲۴۳ھ کو ۱۲۳۳ھ بنانے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب نہیں ہوا لیکن اپنی دانست میں اسے ۱۲۳۳ھ ہی پڑھتا رہا تاہم اس کے لئے ثبوت کی ضرورت ہے جس کے بغیر کوئی بات کہنا مناسب نہیں، لیکن یہ طے ہے کہ تحریف کی گئی ہے خواہ محرف کوئی ہو اور اس کا مقصد کچھ بھی ہو۔

۱۲۳۳ھ اور ۱۲۴۳ھ کے رد میں دو دلیلیں اور بھی ہو سکتی ہیں۔ مثلاً پہلے ورق کے وسط میں اطرافی جدولوں کی طرف سرخ، سنہری، سیاہ اور لاجوردی، دو افقی جدولیں کھینچی گئی ہے۔ پہلی میں:

رب یسر   بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   وتمم بالخیر

یعنی درمیان میں سیاہ اور آس پاس کی عبارت سرخ روشنائی میں لکھی گئی ہے اور نیلی یا دوسری جدول میں سرخ روشنائی سے یہ عبارت درج ہے:

یہ وہ کہانی ہے کہ جس میں ہندوی کی چھٹ   اور کسی بولی کا میل ہے نہ پٹ

یہ نثری جملہ "چھٹ" اور "اور" کے درمیان ذرا سا فاصلہ دے کر اس طرح لکھا گیا ہے جیسے شعر ہو، اور اس کے لئے ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ بعد کے دور میں کسی نے سرعنوان یہ عبارت لکھوا دی جسے اور بعد کے تک بندوں نے شعر بنا دیا[1] اسے بھی چھوڑ دیئے۔ ۱۲۳۳ھ اور ۱۲۴۳ھ دونوں انشا کی زندگی کے سنہ ہیں۔ (انشا کا انتقال ۱۲۳۳ کے شروع میں ہوا تھا) اور ان کی زندگی میں لکھے ہوئے نسخے میں کم از کم ان کے خلافِ منشا کسی صریح عربی لفظ کے متن میں جگہ پانے کا امکان نہیں۔ کہانی کے آغاز میں ابتدائی حمدیہ فقرے کے بعد ایک شعر ہے: آئیاں جائیاں جو سانسیں ہیں۔۔۔ جس کے لئے طبع اوّل میں کوئی علامت یا عبارت نہیں مگر رام پور کے اس نسخے میں بھی کچھ نہیں لکھا جو ۱۲۴۲ھ کا مکتوبہ ہے لیکن رام پور ہی کے ایک نسخے میں (جس کی تفصیل

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون: رانی کیتکی کی کہانی مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی، مطبوعہ عصری ادب شمارہ ۲۵-۲۶

کسی نے بیان نہیں کی) "دوہا اپنی بولی کا" ملتا ہے۔ ایک فقرے کے بعد پھر " دوہا اپنی بولی کا" ہے اور یہ سب نسخوں میں موجود ہے۔ ان دونوں مقامات پر نسخہ زیر تعارف میں سرخ روشنائی سے " بیت " لکھا ہے۔ اس سے جا قیاس یہ بھی ہے کہ نسخہ منقول عنہ میں ان اشعار سے پہلے کوئی علامت یا عبارت نہیں تھی۔ کاتب نسخہ نے دیکھا کہ یہ دونوں ابیات ہیں لہذا اس نے یہ سوچے بغیر کہ یہ مصنف کے مدعا کے خلاف ہے، دونوں جگہ اپنی طرف سے " بیت " کا لفظ وضاحت کے لئے بڑھا دیا۔ چنانچہ ترقیمے میں جو اصل سنہ ہے یعنی ۱۲۴۳ھ، وہی اس نسخے کا سال کتابت ہے۔

سلک گوہر اور رانی کیتکی کی کہانی، دونوں کا کاتب چوں کہ ایک ہی ہے، لہذا دونوں نسخوں میں خصوصیات املا بھی ایک جیسی ہونی چاہئیں، لیکن ایسا لگتا ہے سلک گوہر کی کتابت نے اسے تھکا دیا ہے اس لئے یہاں وہ زیادہ عجلت زدہ نظر آتا ہے، اور کہیں جگہ الفاظ چھوڑ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سلک گوہر ایک بے نقط داستان تھی اور اس میں نقطے وغیرہ موجود ہیں۔ چنانچہ املا میں کچھ خصوصیات کا اضافہ ہو گیا ہے۔ ذیل میں ان کی تفصیل پیش کی جاتی ہے:

۱۔ گاف پر دو مرکز بھی لگاتا ہے اور ایک بھی۔

۲۔ ی اور ے میں امتیاز نہیں کرتا۔ ی کے نیچے کبھی دو نقطے لگاتا ہے کبھی نہیں۔

۳۔ غنہ میں بھی نقطہ "ں" ڈالتا ہے۔

۴۔ اعراب بالحروف لکھتا ہے سلک گوہر کے برعکس اس کہانی میں اعراب لگانے کا اہتمام نہیں ملتا۔

۵۔ اکثر جگہ الفاظ چھوڑ جاتا ہے۔ کہیں کہیں چھوٹے ہوئے الفاظ حاشیوں میں لکھ دیئے ہیں لیکن بیشتر جگہ ان پر توجہ نہیں دی۔ کہیں کہیں متن میں غلط لفظ کاٹ کر وہیں ٹھیک کر دیا ہے۔

۶۔ درمیانی ہائے مخلوطہ کو ہمیشہ کبھی دار (ھ) سے لکھتا ہے اور آخری کے لئے گول (ہ)۔ دو ایک جگہ " ھو " یا " تھی " کو ہائے مخلوطہ سے لکھا ہے۔

۷۔ ڑ، ٹ، ٹھ پر " ط " بناتا ہے۔ ایک آدھ جگہ چھوٹ بھی گئی ہے۔

۸۔ الفاظ کو ملا کر بھی لکھتا ہے: ننھا (نہ تھا) گھرانیں (گھرانے میں)، دلبادل (دل بادل) وغیرہ۔

۹- کہیں کہیں الفاظ میں غیر ضروری (ہ) کا اضافہ بھی کیا ہے جیسے سات کی جگہ ساتھہ اور کہیں حذف کر دیتا ہے جیسے ٹھیک ٹھاک کی جگہ ٹھیک ٹاک، ساتھ ہی کی جگہ ساتھی۔

۱۰- کہیں کاف پر بھی دو مرکز بنا دیتے ہیں مثلاً کچھا کچھ کی جگہ کچھا کچھ۔

۱۱- کہیں کہیں الفاظ کو غلط جگہ توڑ کر لکھتا ہے مثلاً جھنوالوں گی کو جھن والونگی لکھا ہے۔

۱۲- عنوان اور نام سرخ روشنائی سے لکھے ہیں۔

۱۳- ترک صرف دو صفحوں پر نظر آئی، وہ بھی کرم خوردہ ہے۔ غالباً باقی صفحات پر یہ مقام کیڑوں نے چاٹ لئے ہیں۔

کہانی کے خاتمے پر باریک قلم سے یہ الفاظ گھسیٹے گئے ہیں: "تمام سد کہانی"۔ صفحات پر نمبر شمار سلکِ گوہر کی طرح سرخ پنسل سے لکھے گئے ہیں اور وہ سلکِ گوہر کے ساتھ مسلسل ہیں۔ ایک جگہ شمار کنندہ کو تسامح ہوا ہے۔ مثلاً سلکِ گوہر کا اختتام ص ۲۱ پر ہوا تھا لیکن یہاں اگلے صفحے پر بھی (جہاں سے یہ کہانی شروع ہوتی ہے) ۲۱ نمبر ڈالا گیا ہے اور ۲۲ لکھنے سے رہ گیا ہے۔ اس طرح یہ کہانی ص ۵۲ پر ختم ہو جاتی ہے۔ گویا کُل ۱۶ ورق یا ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

مطبوعہ اور اس میں اختلافات بہت ہیں، ان کی نشاندہی کرنی چاہئے تھی لیکن چوں کہ ڈاکٹر سلیمان حسین نے اسے شائع کر دیا ہے (بقول ان کے بنیادی متن یہی نسخہ ہے) اس لئے یہاں انھیں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ البتہ چوں کہ انھوں نے اسے بہت عجلت میں اور غالباً خفیہ طور پر شائع کیا تھا اس لئے اس میں بھی اغلاط اس کثرت سے ہیں کہ ان کے لئے ایک الگ مضمون کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور عن قریب اس کا بھی جائزہ لیا جائے گا، انشاء اللہ

محمد مشتاق شارق

ندرت میرٹھی

۱۸۸۸ء ــــ ۱۹۵۴ء

شعیب احمد نام۔ ندرت تخلص۔ مشہور شاعر و ناقد مولانا شوکت میرٹھی مجدد السنۂ شرقیہ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔[۱] مولانا شوکت میرٹھی نے ابتدائی تعلیم کے خصوصی انتظام کے بعد، انھیں علوم شرقیہ کی تحصیل کے لئے مشہور اساتذۂ عہد کی خدمت میں بھیجا۔ ان اساتذہ میں قاری محمد اسحق میرٹھی، مولانا احمد علی محدث، مولانا عبدالمومن محدث دیوبندی، مولانا عبدالعلی وغیرہ اپنے اپنے مضامین میں یگانۂ روزگار تھے، خصوصاً مولانا عبدالمومن کو عربی ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ درس کے دوران میں ادبی نکات سے بھی بحث کرتے چلتے تھے جس کی وجہ سے شاگردوں میں ادبی ذوق پیدا ہو جاتا تھا۔ اس کا اثر ندرت میرٹھی پر بھی پڑا۔ ان کی طبیعت میں ابتدا ہی سے ادبی ذوق رچ بس گیا۔ پھر گھر کا ادبی ماحول اس پر مستزاد، انھیں بہت جلد فنی نکات اور عروض پر عبور حاصل ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بیاں، شوکت اور ان کے شاگردوں کی وجہ سے میرٹھ کی فضا مشاعروں کی معرکہ آرائیوں سے گونج رہی تھی۔ ندرت میرٹھی نے بھی شہر کے مشاعروں میں حصہ لینا شروع کر دیا اور اپنے والد ماجد مولانا شوکت میرٹھی کی خصوصی توجہ اور تربیت سے وہ جلد استاذی جلال لکھنوی، مضطر، راسخ، سائل، آغا شاعر وغیرہ کے دوش بدوش غزلیں پڑھیں اور

جناب مشتاق شارق۔ ایک کالج کی پرنسپلی سے ابھی حال میں ریٹائر ہوئے ہیں اور اب مستقل طور پر میرٹھ میں مقیم ہیں۔ ۵۶۔ کوٹلہ۔ میرٹھ۔ ۲۵۰۰۰۲

کامیاب رہے۔ ایک مشاعرے کی روداد بیان کرتے ہوئے "لوح وقلم" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

"دہلی میں امرناتھ ساحر کے دولتکدہ پر مشاعرہ تھا جس میں آغا شاعر قزلباش بزم آفندی، بیخود دہلوی وغیرہ بھی شریک تھے۔ حضرت سائل نے میری غزل کے بعد غزل پڑھی اور سر مشاعرہ یہ مقطع ارشاد فرمایا ؎

تجھ سے اے سائل قیامت تک نہ لکھا جائے گا
خامۂ ندرت نے جیسا لکھ دیا دل چاہیئے "۲۶

ایک اور شہادت سے بھی ندرت کے مرتبۂ شاعری کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے جب اپنا مجموعۂ کلام شائع کیا تو اس میں ایک قطعہ بھی درج فرمایا۔ اس میں انھوں نے اپنے معاصرین کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ استاد، مشاق اور خوشگو۔ مولانا ندرت میرٹھی کو حسرت موہانی نے اساتذہ کی صف میں جگہ دی ہے۔ اس کے علاوہ اردوئے معلیٰ کی جلد دہم میں 'انتخاب سخن' کے تحت ان کے کلام کا انتخاب شائع کیا۔

مولانا ندرت کی شخصیت بڑی دلاویز اور پرکشش تھی۔ وجاہت اور وقار اس کے خاص عناصر تھے۔ ان کا قد کشیدہ اور ماتھا چوڑا تھا، بھری ہوئی لمبی داڑھی ان کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھی۔ آنکھیں ذرا چھوٹی تھیں مگر چشمے کے باعث غیر مناسب نہیں معلوم ہوتی تھیں۔ ان کا عام لباس ترکی ٹوپی، علی گڑھ کاٹ کا پاجامہ (ٹخنوں سے ذرا اونچا) اور شیروانی تھا۔ اس وقت میرے سامنے وہ فوٹو ہے جو ۱۹۳۶ء میں انھوں نے کھنچوایا تھا۔ اس زمانے میں ان کی مالی حالت ایسی تھی جسے نہ اچھا کہہ سکتے تھے نہ خراب۔ بعد میں زوال عمر کے ساتھ جب ان کی مالی حالت خراب ہوگئی تو مولانا ندرت بہت دبلے ہوگئے تھے اور افسردہ خاطری ان کی آنکھوں سے نمایاں طور پر جھلکنے لگی تھی۔ مگر وہ تھے بڑے وضعدار۔ ایسی حالت میں بھی جب باہر نکلتے تو سر پر ٹوپی، بدن پر شیروانی اور ہاتھ میں چھڑی ضرور ہوتی تھی۔ حقّے کے شوقین تھے۔ اظہار رام پوری کی دکان پر آتے تو حقّے کے دو چار کش لگا کر جاتے۔ ان کی پوری زندگی ایک خاص نہج پر بسر ہوئی۔ انھوں نے اپنے مرتبے سے فروتر کبھی کوئی بات نہیں کی۔ ان کی گفتگو تصنع سے پاک ہوتی تھی، ہاں اس میں عالمانہ شان ضرور پائی جاتی تھی۔ ایک اور خاص وصف ان کی شخصیت کا یہ تھا کہ

وہ صاف دل اور بے ریا تھے، غرور ان کی طبیعت کو چھو بھی نہیں گیا تھا، چنانچہ ایک شعر میں اس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں :

اللہ بخشے آدمی ندرت بھی خوب تھا
تھے اس میں لاکھ عیب مگر اک خودی نہ تھی

میرٹھ کے اساتذہ میں ندرت میرٹھی کو امتیاز حاصل تھا، سماج کا ہر طبقہ انھیں احترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔

مولانا شوکت میرٹھی نے اپنے پریس اور صحافت کو اپنا ذریعہ آمدنی بنایا تھا۔ یہی پیشہ مولانا ندرت میرٹھی نے اختیار کیا۔ پہلے ایک رسالہ "عندلیب" کے نام سے جاری کیا جس میں نثر و نظم دونوں کا انتخاب سلیقے سے چھپتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد جب مالی مشکلات کے باعث "عندلیب" بند ہو گیا تو انھوں نے حمید میرٹھی کے "نظارہ" کی ادارت سنبھالی۔ اسی زمانے میں نواب محمد اسحٰق خاں نے انھیں کلیات خسروی کی تہذیب و تدوین کے لئے علی گڑھ بلالیا۔ ابھی یہ کام اختتام کو نہ پہنچا تھا کہ خود نواب صاحب کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا اور کلیات خسروی کی تصحیح کا کام ادھورا رہ گیا اور مولانا ندرت میرٹھ واپس آگئے۔

۱۹۲۳ء میں، مولانا ندرت نے کسی کے اشتراک سے ایک روزنامہ "قوم" جاری کیا۔ اس کے بند ہونے کے بعد اپنا ذاتی ہفتہ وار "آئینہ" جاری کیا جو ان کی وفات تک کسی نہ کسی شکل میں نکلتا رہا۔

یہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مولانا ندرت کی حیثیت ایک استاد فن کی تھی۔ ان کے والد ماجد مولانا شوکت میرٹھی نے اپنی زندگی ہی میں اپنے شاگردوں کو ان کے سپرد کر دیا تھا۔ خود ان کے شاگردوں کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ وہ سب کے کلام کو بہ نظر غائر دیکھتے اور اصلاح دیتے۔ ان کے شاگردوں میں مندرجہ ذیل شعراء نہ صرف صاحب ذوق تھے بلکہ بعض صاحب دیوان تھے۔ ان میں سے قریب قریب سب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ صرف خنجر میرٹھی بفضلہ حیات ہیں۔ ذیل میں اُن کے مشہور تلامذہ کے نام ملاحظہ فرمائیں:

حکیم رضی الدین رضی میرٹھی، پنڈت اندرجیت شرما مرحوم، سردار ی لال نشتر مرحوم، توحید الحق حقی دہلوی، رشید احمد خاں، درویش مرحوم، گلزار، مائل، محمد یوسف ثانی، شیدائے خورجوی، وغیرہ وغیرہ

مولانا ندرت میرٹھی کے مطبوعہ دیوانوں کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ خونابۂ دل اوّل (۱۹۲۴ء)　　۲۔ خونابۂ دل دوم (۱۹۳۶ء)

۳۔ صحیفۂ ندرت (۱۹۴۴ء)　　۴۔ لوح و قلم (۱۹۵۳ء)

یہ سب دیوان مولانا ندرت نے اپنے مطبع آئینہ پریس سے شائع کئے تھے۔ میرٹھ کے سب سے اچھے کاتب شیخ احمد نے ان کی کتابت کی تھی۔ اب یہ سب دیوان نایاب ہیں۔

اپنے آخری دیوان 'لوح و قلم' کے دیباچے میں مولانا ندرت نے ۲۱ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو تحریر فرمایا کہ:

"میرے ساتھی قریب قریب سب یکے بعد دیگرے جاچکے ہیں۔ چند ہستیاں جن کا شمار انگلیوں پر کیا جاسکتا ہے باقی رہ گئی ہیں اور اب میں بھی لب بام ہوں، کچھ نہیں کہہ سکتا کہ میرے لئے بھی کب بلاوا آجائے ۔۔۔ میری استدعا ہے کہ وہ لوح و قلم کو میرا آخری مجموعۂ کلام سمجھیں اور مجھے دعائے خیر سے محروم نہ رکھیں۔"

پھر اس کے کچھ ہی دن بعد جون ۵۴ء میں مولانا ندرت وفات پاگئے اور اسی کے ساتھ میرٹھ کی تاریخ شعر و سخن کا ایک باب ختم ہوگیا۔ تکیہ چشتی صاحب میں مدفون ہیں۔

دنیاوی آسائش اور اولاد کے معاملے میں مولانا ندرت زیادہ خوش نصیب نہیں تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں خونابۂ دل دوم کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"میرا سن اس وقت پچاس ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے یاد نہیں کہ کبھی زمانے نے اطمینان کا سانس لینے کی مجھے مہلت دی ہو۔ بالخصوص جب سے والد مرحوم و مغفور حضرت قبلہ مولائی احمد حسن شوکت نور اللہ مرقدہٗ نے رحلت فرمائی ہے، جسے اب چودہ سال ہوتے ہیں، میری المناکیوں میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ میری زندگی کا ہر سال میرے لئے ایک تازہ آزمائش کا پیام لے کر آتا ہے۔ اس دوران میں، میں اپنے چار جگر گوشوں اور ایک شش سالہ بچی کو اپنے ہاتھوں سے پیوند زمین کرچکا ہوں جن میں سے سرتاج کی وفات نے جس کی عمر چودہ سال تھی اور سال گذشتہ ریحان کے داغ مفارقت

نے جبکہ اپنی عمر کی ساتویں ہی منزل طے کر رہا تھا میری رہی سہی امیدوں کو خاک میں ملا دیا بلکہ یوں کہئیے کہ زندگی ہی کو بے کیف کر دیا۔"

مولانا ندرت نے اپنے پیچھے دو صاحبزادے۔ عمران احمد سطوت اور حسان، اور دو صاحبزادیاں رابعہ اور ایک لڑکی اپنی یادگار چھوڑے۔ انتقال کے وقت ان کے صاحبزادے عمران احمد سطوت سن شعور کو پہنچ کر مشاعروں میں شریک ہونے لگے تھے۔ مولانا کے انتقال کے تین چار سال بعد وہ اچانک ترک وطن کر کے پاکستان چلے گئے۔ کراچی میں مقیم ہیں۔ اب چند معتقدین کے سوا مولانا ندرت کا کوئی نام لیوا میرٹھ میں نہیں رہ گیا۔

فن شعر کے متعلق مولانا ندرت کا اپنا سوچا سمجھا نظریہ تھا۔ لوح و قلم کے دیباچے میں انھوں نے وضاحت کے ساتھ اس پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"میرا کلام کوئی چیستاں یا معمہ نہیں جو دل و دماغ پر بار ہو جائے۔ میں ایسے غیر مانوس الفاظ استعمال کرنا ہی نہیں جانتا جس کے لئے صراح یا قاموس کی ضرورت پڑے۔ اُلجھی ہوئی ترکیبوں کی بھول بھلیاں سے بھی میرا قلم دور ہی رہتا ہے۔ ایسی توالیِ اضافات اور تعقیدات سے بھی جن کی مبتدا اور خبر کے درمیان میلوں کا فاصلہ ہو میں پناہ ہی مانگتا رہتا ہوں۔ اس قسم کے بازی گرانہ گورکھ دھندوں میں پھنسنا میرے بس کا روگ ہی نہیں۔ میری زبان اردو ہے اور مجھے اردو ہی کا قلم کار سمجھا جاتا ہے، اس لئے مجھے اپنے طرز ادا پر پورا پورا بھروسہ ہے کہ وہ صاحب نظر اور صاحب ذوق حضرات کو تکلیف دہ غور و خوض کی مصیبت میں مبتلا نہ کرے گا اور میں نے جو کچھ کہا ہے اس کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔

میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اردو کی اصل شکل مسخ نہ ہو، اس کی قدرتی دلکشی و جاذبیت میں فرق نہ آئے۔ اس کے صحیح خد و خال جن سے میری مراد محاورات ہیں، قائم رہیں اور یہی میرے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔"

اس خیال کو مولانا ندرت نے ایک شعر میں اس طرح ادا کیا ہے:

کچھ ہو اس انقلاب میں ندرت کو غم نہیں ‫ ‫ یہ شوخیِ کلام، یہ رنگ سخن نہ جائے

واقعہ یہ ہے کہ مولانا ندرت ہی کے زمانے میں جو حقیقت میں امیر و داغ کا عہد تھا، اردو زبان نوک پلک سے درست ہوئی۔ تیور، زبان کا رکھ رکھاؤ، محاورہ کا برمحل استعمال اور ایک خاص وصف جسے دکن، کہتے ہیں زبان کو اس عہد میں ملے۔ الفاظ کی ایجاد اہم سہی لیکن ان کو سلیقے سے استعمال کرکے، ان میں حسن پیدا کرنا بہت بڑی بات ہے۔ زبان کی اس نوک پلک کی درستی میں مولانا ندرت کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان کے معاصرین میں یگانہ کے بعد انہی پر نظر پڑتی ہے۔ انھوں نے اردو کے ٹھیٹ الفاظ کو جس سلیقے سے برتا ہے، وہ انہی کا حصہ ہے مثال کے طور پر ایک لفظ ' دھبا ' ہے۔ آتش نے اسے اس طرح استعمال کیا ہے:

ٹیلوں سے خاک کے یہ گڑھے بھر چکیں کہیں
دھبّا مٹے زمین کے نشیب و فراز کا

تسکین قریشی نے اپنے استاد عزیز لکھنوی کا شعر سنایا اور کہا کہ عزیز نے اس لفظ کو بہترین طریقے پر استعمال کیا ہے۔ کہتے ہیں:

بتا اے خالق ارض و سما کیا کام آئے گی
مری ہستی کہ اک دھبّا سا ہے صحرا کے دامن پر

اب مولانا ندرت کا درج ذیل شعر ملاحظہ فرمائیں اور فیصلہ کریں کہ انھوں نے اس لفظ کو کس خوبی سے استعمال کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

بگولے اس لئے منڈلا رہے ہیں میرے مدفن پر
کہ یہ دھبّا بھی کیوں باقی رہے صحرا کے دامن پر

ایک اور شعر بطور مثال درج ہے۔ اس میں ' بھیک ' اور ' لاج ' کے علاوہ ' کرم بے مثال ' اور ' دست سوال ' کے استعمال کو دیکھئے۔ کہتے ہیں:

بندے کو بھیک دے کرم بے مثال کی
تیرے ہی ہاتھ لاج ہے دست سوال کی

اس شعر میں آپ اگر کسی لفظ کا بدل تجویز کرنا چاہیں تو ممکن نہیں۔ ایک اچھے شعر میں یہی وصف ہونا چاہیئے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ میں مضمون کی اہمیت کو نظرانداز کر رہا ہوں۔ شعر میں

مضمون کی بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے، مگر بات کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو اگر اسے موزوں الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا گیا تو غیر دلکش (بھونڈی) ہی رہے گی۔ اس میں لطف و تاثیر کی کمی کا احساس بھی ہوگا۔ مولانا ندرت کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ رفعت خیال کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں زبان و بیان بھی خوب ہے۔ اس لحاظ سے معاصرین کے مقابلے میں ان کی شاعری میں ایک خاص قسم کا وزن و وقار پایا جاتا ہے۔

مولانا ندرت کے فنی کمالات میں سے ایک کمال ان کی زود گوئی بھی ہے۔ باوصف اس کے کہ انھیں ہمہ وقت دشواریوں کا سامنا تھا وہ روزانہ ایک دو غزلیں کہہ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مشاعروں میں وہ ہمیشہ طرحی غزل پڑھتے تھے۔ ان کی زود گوئی کا اندازہ سکین قریشی کے اس حاشیے سے لگائیں جو "مکاتیب جگر" کے صفحہ ۲۲۲ پر درج ہے، لکھتے ہیں:

"مولانا شعیب احمد ندرت مرحوم کا سال وفات جون ۱۹۵۴ء ہے۔ نہایت ماہر فن اور خوش کلام شاعر تھے، بے تکلف، خوش مزاج، باہمہ و بے ہمہ، مجھ سے اختصاص کامل رکھتے تھے۔ میرے سلام کے جواب میں مولانا مرحوم نے فارسی قطعہ لکھ کر بھیجا تھا۔ بطور یادگار درج کیا جاتا ہے:

بادا بلند تر بہ دو عالم مقام تو   از ما ہمیں دعاست جواب سلام تو
سامان صد مسرت و تسکین پیام تست   از ما دعائے خیر جواب سلام تست

شعر گوئی کے علاوہ، مولانا ندرت کا ایک اور وصف ان کے تحت اللفظ پڑھنے کا انداز تھا۔ ان سے بہتر تحت اللفظ پڑھنے والا میری نظر سے نہیں گزرا۔ جب وہ اپنا کلام سناتے تھے تو اس کی تصویر بن جاتے تھے۔ مجھ سے جانسٹھ کے مشاعرے کی وہ رات کبھی نہیں بھلائی جاسکے گی جب انھوں نے وفات سے چند سال پیشتر طرحی غزل کا یہ مطلع سنایا:

جلوۂ دورِ صبح ہے، ابرِ سیاہ نام ہے
صبح کہو تو صبح ہے، شام کہو تو شام ہے

جب انھوں نے دوسرے مصرع کے پہلے ٹکڑے کو ہاتھ اٹھا کر پڑھا تو معلوم ہوا جیسے صبح ہوگئی اور جب دوسرے ٹکڑے کو پڑھا تو معلوم ہوا شام ہوگئی۔

اپنے فن کو معراج کمال تک پہنچانے میں، مولانا ندرت میرٹھی کو دو باتوں سے خاص طور پر مدد ملی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ شاعری انھیں ورثے میں ملی تھی۔ دوسری بات یہ کہ فنی حصول کے لئے انھوں نے بڑا ریاض کیا تھا چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں :

رہی مشق سخن طفلی سے جاری عہدِ پیری تک
غزل گوئی میں جب آیا ہے ندرت کو شعور اتنا

اس شعور میں صرف انداز بیان ہی نہیں بلکہ ان کے جذبات کی آئینہ داری بھی شامل ہے۔ اسی وجہ سے مجھے یہ کہنے میں باک نہیں ہے کہ مولانا ندرت میرٹھی حقیقی معنی میں ایک عہد آفریں شاعر تھے۔ انھیں تاریخ ادب میں صحیح جگہ ملنی چاہئے تھی، افسوس ہے دنیا انھیں بھولتی جا رہی ہے۔ ان کے کلام کے مجموعے بھی نایاب ہوتے جا رہے ہیں۔ اس لئے میں ذیل میں ان کے ہر مجموعۂ کلام کا انتخاب پیش کر رہا ہوں تاکہ وہ ایک بار پھر اہل ذوق کی نظر سے گزر جائے اور محفوظ ہو جائے۔

مولانا ندرت میرٹھی کے وہ اشعار خاص طور پر توجہ کے مستحق ہیں جن کی ردیفیں مشکل ہیں۔ ملاحظہ ہو کس کس انداز سے شعر کہے ہیں :

انتخاب خونابۂ دل اوّل

وہ بھی اب ہو گئے صرف غم الفت، ندرت
چند قطرے تھے لہو کے سر و ساماں دل کا

دردِ دل کا آج اچھی طرح ہو جاتا علاج
وہ تو یہ کہئے کہ ان کے ہاتھ میں خنجر نہ تھا

میری تمھاری آبرو، اب ہے خدا کے اختیار
تم نے بھی تیغ کھینچ لی، میں نے بھی سر جھکا دیا

کہہ رہی ہے اب تو ندرت خود فراموشی تری
کوئی دن میں تو سراپا آرزو ہو جائے گا

بہار آئی ہے، تڑپیں گے اسیرانِ قفس ندرت
اب اس کمبخت کی مشکل ہے جو بے بال و پر ہوگا

کچھ ایسا خونِ دل پانی ہوا تھا غم سے اے ندرت
کہ دھبّا تک نہ آیا آنسوؤں سے جیب و دامن پر

یہ کہہ کر توڑ دی ظالم نے امید شہادت بھی
جو خود مرتا ہو اس کا خون لیں کیوں اپنے دامن پر

یہ بےخودی بھی اک عجب شے ہے کہ بزم یار میں
میں ہی میں ہوتا ہوں کوئی دوسرا ہوتا نہیں

مرے قلب و جگر میں ہیں جو غم کے زخم اے ندرت
اب ان کے چھیلنے کو شعر بھی نشتر نکلتے ہیں

میں بھی چپ ہوں، آپ بھی چپ ہیں، دونوں میں خاموش ہے کون؟
خود بتا دیجے، اب وعدہ فراموش ہے کون؟

منفعل اپنی جفا پر وہ کہیں ہوتے ہیں
خود گلہ کر کے پشیماں تو ہمیں ہوتے ہیں

اٹھاتے ہو تم اپنی بزم سے، اچھا خدا حافظ
یہاں کا ذکر کیا اب تم نہ دیکھو گے کہیں ہم کو

امیری تھی تو ایسی تھی کہ گھر اپنا لٹا بیٹھے
فقیری ہے تو ایسی ہے کہ تیرے در پہ آ بیٹھے

ہمیشہ کے لئے تہہ کر کے غم کی داستاں رکھ دی
ہلے تھے لب کہ اس نے کاٹ کر میری زباں رکھ دی

ہزاروں آرزوئیں دل میں بھر دیں بھرنے والے نے
مزا یہ ہے کہ پھر گنجائش درد نہاں رکھ دی

دل کے ہر گوشے پہ ہے یاس کا پہرا ندرتؔ
یاد بھی ان کی اب آئے تو کدھر سے آئے

انتخاب خونابۂ دل دوم

ناز پروردۂ گہوارۂ گرداب ہوں میں
مجھ کو کیا شوق ہم آغوشیٔ ساحل ہوگا

بس اب نیرنگیٔ شام و سحر سے جی الجھتا ہے
نظر کھائے فریب انقلاب جہاں کب تک؟

مجھ سے اے ندرتؔ وہ کاش اک مرتبہ کچھ پوچھ لیں
میرے لب نا آشنائے لذت تقریر ہیں

ہو گیا رخصت شباب، آثار پیری ہیں عیاں
حضرت ندرتؔ تو اب گرتی ہوئی تعمیر ہیں

فضا کیسی بدل دی چند تنکوں کی تباہی نے
نشیمن بھی مرا اک چیز تھا گویا گلستاں میں

جس پر کرم تری نگہ خوں چکاں کا ہے
وہ زخم رہین منت مرہم ہوا نہ ہو

مرنے کے بعد روح کو شاید اماں ملے
دنیا میں ختم سلسلۂ غم ہوا نہ ہو

نامرادوں کا دم سرد برا ہوتا ہے
برق سے کہہ دو نشیمن سے مرے دور رہے

کھو دیتے شوق رہائی میں تڑپ کر پر و بال
خود بخود قید کی میعاد بڑھا لی میں نے

جب یہیں ان کو نہ دیکھا تو ہمیں کیا امید
حشر بھی جلوہ گہ عام رہے یا نہ رہے

ظلم ہے ہم جو وفا پر انھیں مجبور کریں
وہ جفا کار ہیں ان سے تو جفا ہی ہوگی

طوفاں میں کشتی ہے پھر اس پر یہ مصیبت
موجیں بھی جو بڑھتی ہیں تو ساحل کی طرف سے

ساغر نہیں، آنکھوں کے اشارے ہی ہوں ندرتؔ
کچھ ہو تو سہی ساقیٔ محفل کی طرف سے

یہ دیکھنا ہے کہ کس دل سے اب چمن والے
ہمارے اجڑے ہوئے آشیاں کو دیکھیں گے

دوستوں کی کج ادائی کا گلہ ندرت فضول
آج کل جنس وفا کم یاب کیا نایاب ہے

صحیفۂ ندرت

قبولیت سے محرومی تھی قسمت میں تو بہتر تھا
دعا سے پہلے ہی دست دعا شل ہو کے رہ جاتا

بڑھاتا ہے صیاد کی بدگمانی
قفس میں مرا رو بہ گلزار رہنا

چمن کے لئے اک بڑا سانحہ ہے
مرا فصل گل میں گرفتار رہنا

زندگی تک ہی ہجوم غم بھی ہے
چار دن کے واسطے گھبرائیں کیا

کیا مکمل ہو چکی مشقِ ستم
او مٹانے والے ہم مٹ جائیں کیا

کنجِ قفس میں اب تو گھٹا جا رہا ہے دم
دنیا ہمارے واسطے کیا تنگ ہو گئی اور

یہ مجھ سے تو نے اچھی چھیڑ کی اے حسن بے پردا
تمنا دید کی دے دی نگاہِ نارسا دے کر

زمانے سے تو ندرت ہو گئی ترک تعلق کو
بس اک امید کا رشتہ بھی چھوٹا جائے ہے مجھ سے

لوح و قلم

کرم کیا ستم کے بھی قابل نہ سمجھا
مرے دل کو بے درد نے دل نہ سمجھا

رہا مدتوں تیری محفل میں ندرت
مگر رسم آداب محفل نہ سمجھا

اسیروں کا قفس جب تک گلستاں ہی میں ہے اچھا ہے
گلستاں سے گئے جب پھر گلستاں کون دیکھے گا

ہماری ان کی راہ و رسم کا حاصل نہیں ملتا
نگاہیں بارہا ملتی ہیں لیکن دل نہیں ملتا

محبت جس کو بخشے بے نیازی
وہ دل کھائے فریبِ مدعا کیا

کہہ چکا تو تو سب کچھ اے ندرت
اب جو اس نے کوئی سوال کیا

کئے جا اے دل ناشاد فریاد
یہاں مظلوم کی کیا داد فریاد

ہم سے پروانوں کو اے آتش غم کیا نسبت
جلتے ہی رہتے ہیں ہم اور وہ جل جاتے ہیں

نقوش عظمت ماضی ہزار دھندلے ہوں
انھیں ابھار ہی لیں گے ابھارنے والے

نہ تیرے ہاتھ کو لغزش ہوئی نہ دل دھڑکا
مرے کلیجے میں نشتر اتارنے والے

خدا محفوظ رکھے انقلاب فتنہ ساماں سے — شعار آدمیت آدمی کا چھوٹ جاتا ہے
ناوک فگن تو زور کماں آزما چکا — اے دل اب امتحاں تری گہرائیوں کا ہے
بڑھے حوادثِ عالم تو اُٹھ گئے ندرت — وہ اس ہجوم میں اپنی گزر نہ دیکھ سکے
یقین وعدہ کیا، ہم سے یہ بھی چوک ہوئی — کسی کے قول کو دیکھا، نظر نہ دیکھ سکے

حواشی :

۱۔ مولانا شوکت میرٹھی کے کسی شاگرد نے "گفت سہ مرتبہ شعیب احمد" سے سنہ ہجری میں تاریخ ولادت نکالی تھی۔ تاریخ ولادت کا ایک اور قطعہ سید مہر علی افق نے کہا تھا، جس کا آخری شعر یہ ہے ؎

افق نے لکھا سال ہجری سعید — مبارک ہو فرزند احسن شعار
۱۳۰۵

۲۔ یہ غزل مولانا ندرت نے بقید یک قافیہ کہی تھی۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں :

آپ کیا جانیں کہ دل کی آرزو کیا چیز ہے — آپ دل کے آشنا ہیں، آپ کو دل چاہیئے
چاہیئے انساں کے پہلو میں اک دل بھی، مگر — بے غرض دل چاہیئے، بے مدعا دل چاہیئے
جس میں گھر کر لیں ہزاروں غم، ہزاروں حسرتیں — آدمی کے واسطے اتنا بڑا دل چاہیئے
ہر کسی کو ضبطِ غم کا حوصلہ ہوتا نہیں — اس کو پتھر کا جگر، فولاد کا دل چاہیئے
مجھ سے اب دیکھا نہیں جاتا ہے دل کا اضطراب — اب تو اس کے دیکھنے کو آپ کا دل چاہیئے
مجھ سے نفرت ہے، تو ہو گی دل سے بھی نفرت تمہیں — تم نے کس دل سے کہا ہم کو ترا دل چاہیئے

۳۔ اندرجیت شرما (۱۸۹۳ء – ۱۹۴۶ء) وطن اچھرا ضلع میرٹھ۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ گیت، نظم اور غزل لکھتے تھے۔ ان کی نظموں کا ایک مجموعہ "نیرنگ فطرت" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ شعر میں نہایت سادہ زبان استعمال کرتے تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے :

چرخ کہن کے جور سے تنگ آگئے ہیں سب — یارب کوئی اب اور نیا آسماں بنا
پرواز کا تو بعد میں ہوتا ہے امتحاں — در تو قفس کا پہلے ذرا وا کرے کوئی
بوئے وفا نہیں ہے تو کس کام کا ہے پھول — اچھا تو ہے وہ خار جو دامن کشاں بنا

۴۔ سرداری لال نشتر (۱۹۰۱ء – ۱۹۵۲ء) خیر نگر بازار میرٹھ میں دواؤں کی دکان تھی عشرت لکھنوی

نے اپنے تذکرہ "ہندو شعراء" میں نشتر کا یہ شعر بطور انتخاب دیا ہے ؎

ضبط میں بھی ہو گئی رسوائیوں کی انتہا　　　اب تو اک اک اشک غم طوفاں بداماں چاہیئے

دو شعر اور دیکھئے:

وہ دنیا تھی جہاں تم بند کرتے تھے زباں میری　　　یہ محشر ہے یہاں سننی پڑے گی داستاں میری

جلایا پہلے میرا آشیاں صیاد ظالم نے　　　اڑا دی پھر ہوا کے رخ پہ خاک آشیاں میری

۵؎ رشید احمد خاں درویش (۱۹۰۵ء ـــ ۱۹۴۹ء) زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے مگر ذاتی محنت سے قابلیت پیدا کرلی تھی۔ "سحر حلال" کے نام سے جیبی سائز پر دیوان چھپوایا تھا مگر جب بعض اشعار پر کچھ حضرات نے اعتراض کئے تو انھیں اپنے استاد مولانا ندرت میرٹھی سے شکایت پیدا ہو گئی کہ انھوں نے دیوان کو کاوش سے نہیں دیکھا چنانچہ اس کی اشاعت روک لی۔ ان کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے۔ نواب لیاقت علی خاں کے منیجر سردار اکرم خاں کے صاحبزادے امیر اعظم خاں (سابق وزیر مہاجرین پاکستان) درویش کے احباب میں سے تھے۔ کسی بات پر تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ فی البدیہہ یہ قطعہ کہہ کر سنایا:

تو بھی خودی کا ہے اسیر ، میں بھی خودی کا ہوں اسیر
تیری نظر میں ، میں حقیر ، میری نظر میں ، تو حقیر
تیرا بھی سر نہ جھک سکا ، میرا بھی سر نہ جھک سکا
تو بھی نیا نیا امیر ، میں بھی نیا نیا فقیر

درویش اچھا شعر کہتے تھے۔ زبان و بیان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ کہیں کہیں ان کے کلام میں جذبات کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:

استقامت کے سوا راہ نہیں ہے کوئی　　　کتنی محدود ہے ارباب وفا کی دنیا

بیٹھا رہنا بھی اک آفت ہے چمن میں لیکن　　　اس کی تو موت ہے جو مائل پرواز ہوا

تجدید التفات سے کیا فائدہ ہے اب　　　چھوڑا تھا تم نے مجھ کو جہاں میں وہاں نہیں

ممنون بے وفائی ارباب دیر ہوں　　　مدت ہوئی تھی نام خدا کا لئے ہوئے

صالحہ عابد حسین

وقت، وقت

اس کے کھچڑی بال اب بھی گھنے اور گھونگھریالے تھے۔ گورے رنگ میں سرخی جھلک رہی تھی۔ بلڈ پریشر کی سرخی۔ چوڑے ماتھے پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں، فکر کی لکیریں ـــــ چھوٹی چھوٹی بھوری آنکھوں میں حزن وملال تھا ـــــ "خدایا، خدا، خدا ـــــ؟" اس کا تو کبھی بچپن میں اس سے تعارف ہوا تھا اور تیس سال سے تو اس نے پلٹ کر بھی اس کی طرف نہ دیکھا تھا ـــــ آج، آج یہ کہاں سے اس کی یاد آگئی۔

"خدایا ـــ خدایا ـــــ میں کیا کروں ـــــ میں کیا کروں" قلم ہاتھ میں لئے وہ یہی سوچے جا رہا تھا ـ کیا کروں؟ کیا کروں؟

کیا یہ سچ ہے کہ خدا مصیبت میں یاد آتا ہے؟ کیا یہ سچ ہے کہ عیش وعشرت میں اسے بھول جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

عیش وعشرت ـــــ؟ مگر اسے کون سا عیش ملا ۔ ۔ ۔ بچپن سختیوں، کٹھنائیوں میں بیتا۔ جوانی میں ماں کی ضد اور بزرگوں کی وصیت نے زندگی تباہ کی ـــــ یہ تو خود اس کی محنت کی لگن تھی اور کوششوں کا نتیجہ، ان تھک، بے پناہ ـــــ لگاتار جہد کا ثمرہ تھا کہ وہ آج اس درجہ اس پوزیشن ـــــ اس مقام پر ہے کہ لوگ اس سے رشک کرتے ہیں ـــــ اس کی شہرت سے، اس کے فن پاروں سے، اس کی تعریف سے جلتے ہیں۔ اس پر الزام لگاتے ہیں، کیچڑ اچھالتے ہیں ـــــ مگر وہ جانتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ صرف وہ ـــــ یا پھر ـــــ یا پھر ـــــ اس کی لاڈلی

محترمہ صالحہ عابد حسین، مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس، رہائش جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

پیاری بیٹی ___ بیٹی جو اس کے جسم کا ایک حصّہ ہے ___ جو اس کے وجود کا نغمہ ہے ___ جو اس کی انا کی بہترین غذا ہے ___ جس کی ذات ___ واحد ذات نے اسے مسرت، اپنائیت، احساس مفارقت دیا ہے۔ جو ماں سے نہ ملا ___ جو بیوی سے نہ ملا ___ جو صرف ___ جو صرف ___ محبوبہ ___ مگر آہ ___ اس کا تو ساتھ ہی بہت کم دیا!

اس کی آنکھوں میں سے چند آنسو ٹپ ٹپ کاغذ پر گرنے لگے ۔ ۔ ۔ ۔

کتنی حسین، کتنی ذہین، کتنی پرخلوص تھی وہ ___ چالاکی اور چالبازی سے دور۔ بغیر کسی مذہبی اور سماجی بندش کے اس نے اپنے کو اسے سونپ دیا۔ یہ سوچے بغیر کہ اس کا انجام کیا ہوگا ___ انجام ___ آہ اس کا انجام ___

اس کا چہرہ سرخ ہوگیا ___ ماں نے اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا ___ بیوی نے اس سے پردہ کرلیا ___ خاندان والوں نے اسے دھتکارا ___ وہ اپنے ہی گھر میں اچھوت بن کر رہی ___ مگر ___ میری الفت کی خاطر سب سہار گئی ___ وہ مسکراتی تو سارا دکھ درد یہ مسکراہٹ چوس لیتی ___ وہ گلے میں باہیں ڈال کر اپنی وفا کی یقین دلاتی تو دنیا بھر کی بے وفائیاں دامن کو جھٹک کر بھاگ جاتیں ___ میں اس کے لئے پہاڑ سے بھی ٹکر لے سکتا تھا ___ خاندان کیا چیز ہے ___ بیوی، اُنھ اس کی کیا حقیقت ہے ___ اور ماں ___ قدامت پرست، مذہبی مجنوں ___ خود غرض ماں ___ کیا دیا اس ماں نے ___ کیوں وہ اس کے اصولوں اور قدموں کے لئے اپنی زندگی تباہ کرتا ___ سچ مچ اگر کوئی خدا ہے ___ اگر ہے کوئی خدا تو پتھر ہی ہوگا ___ جنّت کی جھلک دکھا کر پھر جہنم میں جھونک دیا ___ اس کا کمزور نحو دا جسم وہ سب نہ سہار سکا جو اس کے مضبوط ذہن اور قوّت ارادی نے جھیل لیا تھا ___ اپنی ہی صورت کی ایک معصوم وجود کو دنیا میں لانے کے دوران وہ ختم ہوگئی ___ میری دنیا اجڑ گئی ۔ ۔ ۔ مجھے اس وجود سے نفرت ہوگئی جس نے اس کی محبت چھین لی تھی!"

- - - - - - - - - - - -

کاغذ اُڑ کر زمین پر گر چکا تھا۔ قلم میز پوش پر نیلے آنسو ٹپکا کر خاموش اس کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا ___ لکھنے کی کوشش ناکام ہو چکی تھی ۔ ۔ ۔ ۔

آج وہ بھولی بسری یادیں۔ جن کو اس نے جد و جہد حیات میں بھلا دیا تھا، اس کے دل و دماغ کو حصار میں کیوں لئے ہیں !

"عنبریں ـــــ عنبریں ـــــ عنبریں "

اسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ وہ ننھی سی ہستی جس کی تخلیق میں محبوبہ نے جان دی تھی ـــــ جس کے وجود میں لانے کا وہ سو فی صدی ذمہ دار تھا ـــ جس کو پالنا اس کا فرض، جس کو حفاظت اور پیار دینا محبوبہ کی محبت کا فرض تھا ـــ کہاں ہے ـــ ہے بھی یا نہیں ـــ

وہ سب سے دامن جھٹک کر مزید تعلیم کے لئے پردیس چلا گیا ...

کئی سال بعد واپس آیا تو سارے آفیشل اور ضروری اور غیر ضروری کاموں سے نپٹ کر کئی ماہ بعد وطن پہنچا تو دروازے پر ایک بے حد حسین اور ذہین آنکھوں، سانولی رنگت، گھونگھریالے بالوں والی بچی نے اس کا راستہ روک لیا ـــ

"آپ کون ہیں ؟"

"ہم ـــ ہم کون ہیں ـــ ؟" وہ سوچتا ہی رہا کہ کیا جواب دے !

"آپ ـــ آپ کہاں سے آئے ہیں ؟"

"ہم ـــ ہم دور سے آئے ہیں بیٹی "ـــ

"بیٹی ـــ ہم بیٹی نہیں آپ کی ـــ ہم اپنے پاپا کی بیٹی ہیں !!

"آپ کے پاپا کون ہیں ؟"

اب لاجواب ہونے کی اس کی باری تھی۔

"ہمارے پاپا ـــ ہمارے پاپا ـــ" اور پھر ان آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی ـــ

"ہمارے پاپا ـــ ہمارے پاپا ہیں"

"آپ ـــ کے ـــ پاپا کہاں ہیں ہم ان سے ملیں گے "

"ہمارے پاپا ـــ کہاں ہیں ـــ ؟ آپ ان سے ملیں گے ؟"

معصوم آنکھوں میں حیرت کا سمندر موجیں مارنے لگا۔

"وہ کہاں رہتے ہیں ؟"

"اللہ جانے —— ہم نہیں جانتے —— "

"آپ کس کے پاس رہتی ہیں ؟"

" دادی اماں کے —— اور امی جان کے "

" دادی اماں کے ؟ —— امی جان کے ؟" اس کا استعجاب بڑھتا جا رہا تھا ——

" عنبریں —— کس سے باتیں کر رہی ہو "

اندر سے ایک شناسا آواز سنائی دی۔

" بیٹی اندر جا کر کہو ہم ملنے آئے ہیں —— "

" ہم کون ؟ آپ کا نام کیا ہے ؟"

اس نے اپنا نام بتایا تو بچی بے تحاشہ دوڑتی ہوئی اندر بھاگ گئی —— " دادی اماں —— دادی اماں —— پاپا آ گئے —— پاپا آ گئے —— پاپا آ گئے !!

اور اس ننھی سی جان نے دوبارہ اسے ان جالوں، ان بندھنوں، ان کٹھنائیوں اور ان ناگواریوں کے جال میں جکڑ دیا جس سے وہ سالوں پہلے دامن چھڑا چکا تھا . . .

- - - - - - - - - - -

کہانی اب بھی ادھوری پڑی تھی :

عنبریں کے انداز آج کل کس قدر بدل گئے ہیں !

کیا ہو گیا ہے اسے ۔

اس کی باتوں میں بغاوت کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے جیسے وہ اس پر سے اعتماد کھو چکی ہو ! اب وہ اس کا ہر حکم نہیں مانتی .

اب وہ بے تکلفی سے اس سے بحثیں نہیں کرتی

اب وہ اس سے پوچھ کر ہر جگہ نہیں جاتی ہے

اب اپنائیت اور الفت کا وہ انداز نہیں رہا جو صرف اس کے لئے تھا۔

اب وہ اس کے ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی۔

اب وہ . . . .

اب وہ - - - - -

اب وہ - - - - -

مگر یہ نئی نسل ہے ہی ناکارہ —— میں نے کتنے دکھ جھیلے اس کے لئے۔ کتنی قربانیاں دیں، کتنے اصولوں کو خاک میں ملایا، کتنی ناخوشگوار باتوں کو سہا - - - کلب، تاش، سگرٹ اور شراب تو ان دکھوں کو نہ بھلا سکتے تھے جن سے اس کا دل خون ہو رہا تھا۔ ہاں عنبرین ضرور اس کے زخموں کا مرہم تھی - میں نے عنبرین کو ہر عیش و آرام دیا، اسے اعلیٰ تعلیم دلائی —— اس سے خوشی کا رشتہ باندھا —— مجھے بزرگوں سے دوستی اور اپنائیت اور خلوص نہ ملا تھا —— خود غرض —— اپنے کو مسلط کرنے کا شوق، اپنی بات منوانے اور اپنے احسان جتانے کا مرض —— کس قدر تھا ہمارے بزرگوں میں —— مگر میں نے کچھ بھی بدلہ نہ چاہا —— دیا ہی دیا —— لینے کی آرزو نہ کی —— پھر وہ کیوں —— کیوں —— کیوں مجھ سے دور ہو رہی ہے —— کھنچ رہی ہے —— اسی لئے —— اسی لئے کہ میں عنبرین کے اس ہپیچر دوست کو پسند نہیں کرتا جس کے ساتھ وہ گھومتی ہے —— بھلا کہاں عنبرین —— حسن و خوبی کا مجسمہ - عیش و عشرت کی پلی —— اعلیٰ تعلیم یافتہ —— نفاست و نزاکت کی جان —— خود مجسم فن کا ایک شاہکار —— اور کہاں وہ ہپی نما —— مریل سا مرد، جس کی آنکھیں زرد، چہرہ سوکھا ہے، جس کی لمبی چوڑی داڑھی اور خوفناک گل مچھے ہیں —— تنگی پرانی پیوند لگی پتلون اور ٹوٹے بٹنوں والا بدرنگ بدوضع بش شرٹ، ہاتھ میں چوڑی اور گلے میں ہار —— اف خدایا —— کیا ادا عنبرین کو اس چھوکرے کی پسند آئی ہے —— اور حیثیت ؟ کچھ بھی تو نہیں —— آرٹ کا طالب علم —— اور آرٹ بھی —— بے معنی —— بے مطلب —— آج تک سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کس قسم کا آرٹ ہے ؟ پھر وہ اس سے کمائے گا کیا ہوگا ؟ —— اگر خدا نہ کرے - - خدا نہ کرے —— پھر خدا —— آج خدا کیوں کہاں سے میرے دماغ میں گھس بیٹھا ہے !"

- - - - - - - - - - - - -

"پاپا - - - "

"پاپا - - - - "

"ہم اندر آسکتے ہیں ؟"

"ہم ___ ہم کون ___ " اس نے یکایک کاپی پر سے جھکا سر اٹھایا ___

" ہم اندر آجائیں پاپا ___ " اور ساتھ ہی عنبریں مسکراتی ہوئی اندر داخل ہو گئی ___ اس کا چہرہ بشاش تھا، آنکھیں مسکرا رہی تھیں، سیاہ بالوں کی لمبی سی مانگ میں سیندور کی سرخی جھلک رہی تھی۔ اور ماتھے پر معمول سے زیادہ بڑی بندی جگمگا رہی تھی ___

اور اس کے پیچھے ___ اس کے پیچھے ___ اس کے پیچھے ___ دروازہ پر اس کی نظر جا کر جم گئی تھا عنبریں کا دوست ___ معمول سے بہتر کپڑے پہنے، کلین شیو کیے ___ کچھ سہما ہوا ___ گھبرایا ہوا سا کھڑا تھا ___

وہ ایک کو دیکھتا ___ دوسری کو دیکھتا ___ دوسری کو دیکھتا، پہلی پر نظر ڈالتا ___ اس کی بھوری پتلیاں مسلسل گردش کر رہی تھیں ___ اور چہرہ ___ اور چہرہ ___

" پاپا ___ پاپا ڈارلنگ پاپا ___ سنئے ___ پاپا ___ "

وہ خواب سے چونک پڑا اور حسب عادت منھ سے نکل گیا ___ " ہاں ڈارلنگ کہو ___ "

" پاپا ___ میں نے ___ میں نے ___ جگل سے شادی کر لی ہے ___ "

" شادی ___ شادی ___ کر لی ہے "

گنبد کی گونج کی سی آواز اس کے گلے سے نکلی ___

" ہاں پاپا ___ آپ ہی کی تو تعلیم ہے کہ آزادی ہر شخص کا پیدائشی حق ہے ___ شادی ذاتی معاملہ ہے ___ آپ کہتے تھے نا میرے بزرگوں نے میری قسمت پھوڑ دی تھی ___ تمہیں ___ تمہیں ہر طرح کی آزادی ہے ___ تم نئے زمانے کی روح ہو ___ آزاد روح ___ پاپا ___ پاپا ___ آپ ہی نے تو مجھے یہ سب سکھایا ___ تھا ___ ہم نے کورٹ میں شادی کر لی ہے کہ شاید ___ شاید آپ کو اعتراض ___ "

" شادی کر لی ہے ___ کورٹ میں ___ اعتراض ؟ "

اسے خود اپنی آواز اجنبی سی لگ رہی تھی ۔ ۔ ۔

" ہاں پاپا ___ مگر آپ ___ آپ اس قدر ___ "

عنبریں نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا ___

" آپ لیٹ جائیے پاپا ___ شاید آپ کا بلڈ پریشر ___

"چلی جاؤ — چلی جاؤ — میرے سامنے سے "

وہ چونک کر پیچھے ہٹی — یہ اس کے پاپا بول رہے تھے — ؟ آزاد خیال — روشن ضمیر — مذہبی بندشوں اور اخلاقی خودساختہ اصولوں کا خاک اڑانے والے پاپا — اس کے عاشق زار اس کی ہر بات پر آمنا صدقنا کہنے والے پاپا !!

"میں — میں — پاپا — آپ — آپ "

"مرگیا تمھارا پاپا — میرا تمھارا کوئی رشتہ نہیں " اس کی آواز بھیانک تھی، چہرہ پسینے سے بھیگ گیا تھا۔

" اس کمینے انسان سے بیاہ کر کے تو فاقے کرے گی "،

عنبریں نے اپنے ساتھی کے زرد سے مٹیالے ہوتے چہرے کی طرف دیکھا — اس کا سر ایک دم بلند ہو گیا — بغاوت اس کے خون میں گردش کرتی بغاوت بیدار ہو گئی —

"جاتی ہوں — اب میں یہاں کبھی نہ آؤں گی پاپا — میرا ساتھی مجھے دنیا میں سب سے پیارا ہے — آپ سے بھی زیادہ، جو اس کی تحقیر کرے —" اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور دروازے میں کھڑے مبہوت و پریشان جگل کا ہاتھ تھاما — اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے کی آواز اس کے کانوں میں ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

" آپ سے بھی زیادہ — آپ سے بھی زیادہ — "

اس نے سائڈ میز پر رکھی کاپی اٹھالی — وہ ہار نہ مانے گا — وہ بے ہوش نہ ہو گا — وہ اس چھوکری سے ایسا بدلہ لے گا — اپنے قلم کی ایک جنبش سے وہ اسے . . . . دکھا دے گا کہ محبت کر سکتا ہے تو نفرت بھی — اُف خدایا — اس کی محبت — اس کی محنت، ریاضت — کا یہ صلہ — یہ صلہ ملا ہے —

کاپی کھولی قلم اٹھایا — چند سطریں لکھیں . . . لیکن چکر آ رہا تھا — نظروں کے سامنے الفاظ ناچ رہے تھے . . . . سطریں گڈمڈ ہو رہی تھیں . . . . . عنبریں کے حسین چہرے کے برابر ایک بوڑھا، باوقار، چہرہ جو آثار پدید است صنا دید عجم را — کی تفسیر کرتا معلوم ہوتا تھا — اسے دیکھ رہا — تکے جا رہا تھا — تکے جا رہا تھا . . . یہاں تک کہ عنبریں کا چہرہ غائب ہو گیا

۔ ۔ ۔ ۔ اور کاغذ کے صفحے میں سے جیتی جاگتی وہ ہستی اس کے سامنے آکھڑی ہوئی — "ماں — ماں —" اس کے اندر سے ایک آواز ابھری — ماں کے چہرے پر یہ کیسی تمسخرانہ مسکراہٹ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"ماں — یہ کیا ہوا — یہ کیا ہو گیا ماں —"

"وہی جو ہونا تھا — جو ہونا چاہئے تھا؟" "کیا — کیا؟"

اور پھر اس کا دماغ ایک دم ماضی کی دنیا میں کھو گیا!

"ماں — تم مجھے مجبور نہیں کر سکتیں — ماں میں ایک ان پڑھ — بدصورت، لڑکی کے ساتھ بیاہ نہیں کروں گا —"

"وہ تیری پھوپھی کی بیٹی ہے"

"ہوا کرے"

"وہ یتیم ہے بے ماں باپ کی بچی"

"تو کیا یتیم خانہ کھولنا ہے مجھے"!

"تیرے باپ اور پھوپھی کی وصیت ہے"

"میں کسی وصیت کو نہیں مانتا"

مگر ماں — ظالم بے درد ماں — وہی ہوا جو وہ چاہتی تھی — اٹھارہ سال کی عمر میں اپنی ہی عمر کی ایک لڑکی سے ساتھ وہ باندھ دیا گیا — مگر — اس نے ماں اور بیوی دونوں سے خاطر خواہ انتقام لیا — اس "داسی" کی طرف رخ بھی نہ کیا جو اپنا تن من اس پر نچھاور کر رہی تھی — ماں کے پھیلے آنچل اور ٹپکتے موتیوں کو قدموں تلے کچل کر اپنی تعلیم میں منہمک ہو گیا —

اور پھر اسے خوابوں اپنے تصورات اپنی آرزوؤں کا مرکز مل گیا — دونوں نے ایک نیا جیون شروع کرنے اور جنم دن کا ساتھی بننے کے عہد و پیماں کئے ۔ ۔ ۔

اور جب وہ اسے گھر لایا تو ایک بار پھر ماں سے ٹکرایا —

"یہ میرے گھر میں نہیں رہے گی"

"ماں یہ گھر میرا بھی تو ہے —"

"مگر۔۔۔۔"

"جو میرے لیے وہ اس کا ہے ——— وہ نہیں رہے گی۔۔۔"

"میرے اور بہو کے سینے پر مونگ دلوائے گا — اس — چھوکری سے"

- - - - - - - - - - - - - - - - -

یونہی ——— یوں ہی ——— جیسے آج ——— جیسے آج ——— عنبریں ——— اُف ——— اُف خدایا ——— یہ کیا ہے ——— یہ کیا ہے ؟ "قدرت کا انتقام" یہ آواز کہاں سے آئی ——— کہاں سے آئی ——— " ماں ماں ——— یہ تو کہہ رہی ہے ———" دماغ کی سوچوں پر اب اس کا کوئی بس نہیں رہا تھا ——— ماں اس کی محبوبہ یا بیوی سے بات نہیں کرتی تھی۔ ان کا کھانا پینا تک الگ کر دیا تھا۔ اپنے انداز سے اس طرح اس کی توہین کرتی کہ وہ کچھ کہہ بھی نہ سکتا تھا۔ مگر سمجھتا تو تھا — اور انجانے ہی میں وہ اس سے بدلہ لیتا رہتا۔ ماں کو کتوں سے نفرت تھی۔ ان دونوں نے چھ سات قسم کے اعلیٰ نسل کے کتے پال رکھے تھے۔ ماں بلیوں سے ڈرتی تھی ——— ان دونوں کو بلیوں سے عشق تھا ——— ماں پرندوں کو پنجروں میں پال کر قید و بند میں رکھنا گناہ سمجھتی تھی، انھوں نے دنیا بھر کے حسین رنگ برنگے طوطے پال کر کمرے کے عین سامنے لٹکا دیئے تھے ——— دن بھر کتوں کو پچکارنے اور بلیوں کے لئے بل بل کی آوازوں سے دونوں چڑھ جاتے ——— ماں سے نفرت اور جانوروں سے محبت دل میں اور بڑھ جاتی تھی ——— اس نے کبھی نہ سوچا۔ کبھی نہ سوچا —" اُف خدایا ——— خدایا ——— پھر خدا ——— خدا اگر ہے تو ——— تو ——— کیا وہ ——— اسے کیا وہ اسے معاف ——— کرے ——— گا ———"

اس نے اپنے چکراتے سر کو پھر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا ——— عنبریں کو جنم دے کر اس کی ماں دنیا کے دکھوں سے نجات پا گئی تو اس کے دل میں ماں سے اور چڑ پیدا ہو گئی ——— اسی کی وجہ سے اس کی محبوبہ نے داغ مفارقت دیا ——— وہ ماں سے ملے بغیر چلا گیا ——— برسوں باہر رہا ——— واپس آیا تو اسی قدامت پرست تنگ نظر، بے محبت، خود غرض ماں نے اور اس کی بدصورت بے وقوف بیوی نے اس کی بیٹی ——— ننھی سی جان کو ——— پال پوس کر پانچ چھ سال کا کر دیا تھا ——— اسے خیال بھی نہ آیا کہ یہ ان کا کوئی احسان تھا ——— ماں بیٹی سے محبت اور بڑھ گئی!

اور اب اس نے اسی شہر میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ماں کی صحت گر رہی تھی ــــ کھانسی رہتی کبھی بخار آجاتا۔ وہ اپنے اور عنبریں کے برتن الگ رکھتا، بچی کو دادی سے جدا رکھنے کی ہر کوشش کرتا ــــ مگر عنبریں اس کے قابو میں نہ آتی تھی ــــ تھوڑے عرصے کے اندر بات صاف ہوگئی ماں کو T.B. ہے ــــ وہ کانپ اٹھا ــــ اس کی زندگی کی متاع ــــ عنبریں ــــ اگر ماں کے ساتھ رہی تو ــــ "ماں ــــ میں عنبریں کو تعلیم کے لئے پہاڑ پر ایک انگریزی اسکول میں بھیج رہا ہوں" ــــ ماں کا چہرہ سفید ہوگیا ــــ اب احتجاج کی ہمت نہ رہی تھی ــــ پھر بھی وہ جتنا منع کر سکتی تھی کیا، وہ عنبریں کے بغیر زندہ نہ رہے گی۔ مگر اسے ماں سے کہیں زیادہ اپنی بیٹی کی زندگی عزیز تھی ــــ پہاڑ سے وہ چھٹیوں میں گھر آتی تو اس کی ہر ممکن کوشش ہوتی کہ وہ دادی کے پاس کم سے کم جائے ــــ

- - - - - - - - - - - - -

آہ ــــ عنبریں ــــ عنبریں ــــ تیرے لئے میں نے ماں کا کتنا دل دکھایا ــــ کتنا صدمہ دیا ــــ تیرے لئے ــــ عنبریں کے لئے ــــ" ماں کی صحت ــــ ماں کی صحت ــــ" کتنی ضدی تھی ماں ــــ دوا علاج تو خیر ہوتا تھا، خدمت اس کی بہو کر ہی لیتی تھی۔ اور نوکر بھی تھا ــــ مگر وہ غسل خانے جانا نہ چھوڑتی تھی ــــ نہانا نہ چھوڑتی تھی ــــ نماز نہ چھوڑتی تھی ــــ وہ کیا کرے اگر وہ اس کا کہنا ہی نہیں مانتی ــــ اور پھر ــــ جب جاؤ وہ عورت نظر پڑ جاتی تھی۔ ساس کی خدمت کرتی ہوئی وہ جل بھن کر واپس آجاتا۔ ۔ ۔

عنبریں ــــ عنبریں ــــ عنبریں۔

- - - - - - - - - - - - -

"پاپا ہم کشمیر جائیں گے"

"ہاں بیٹا اب کے چلیں گے"

عنبریں اب چودہ پندرہ برس کی نوخیز کلی تھی، جس کی ہر بات وہ مانتا تھا ــــ انھوں نے جانے کی تیاریاں شروع کر دیں ــــ اگلے دن روانہ ہونا تھا، وہ ماں کے پاس جانے ہی والا تھا کہ نوکر نے آکر کہا "صاحب! ماں جی گر پڑی ہیں۔ سر میں اور ہاتھ میں چوٹ آئی ہے۔

"ارے کیسے؟ ڈاکٹر کو بلایا تھا"

"ہاں سرکار، ڈاکٹر دیکھ گیا ہے"

عنبریں دوڑی "کیا ہوا دادی اماں کو"

"چوٹ لگ گئی — چلو —" دونوں کمرے میں پہنچے۔

"دادی اماں — دادی اماں" ان کی خون بھری سر کی پٹی دیکھ کر عنبریں رو پڑی۔

"ارے کیسے لگ گئی چوٹ"

"کچھ نہیں، میری بچی ذرا غسل خانے جا رہی تھی چکر آیا گر پڑی۔ —"

"ماں آپ بات نہیں مانتی ہیں۔ آخر کموڈ پر کیوں نہیں جاتیں۔ اسی طرح اپنی جان دیں گی"

ماں کے چہرے پر عجیب سی ہنسی بکھر گئی۔

"جان — نہیں میرے بچے — بڑی سخت جان ہوں — ایسی آسانی سے نہیں نکلے گی"

وہ چڑ گیا — اس کے اندر چھپا طنز اس سے چھپا نہ رہ سکا

"دادی اماں ڈاکٹر نے کیا کہا ----"

"ہاتھ میں چوٹ ہے — اور سر میں بھی — درد بہت ہے —"

"مگر ہم تو کل ---" اور عنبریں اچانک رک کر باپ کی طرف دیکھنے لگی!

وہ سہما، گھبرایا، کانشس سا، پریشان سا کھڑا تھا — ماں کی حالت چہرے سے ہویدا تھی — مگر اس کا پروگرام — عنبریں کی خوشی — سارے انتظامات مکمل —

"ماں ہم کشمیر جا رہے ہیں — پندرہ دن میں آ جائیں گے —"

ماں کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی!

"نہیں دادی اماں —"

"نہیں ماں ٹکٹ بھی آ گئے ہیں — بس پندرہ دن کے لئے —"

"پندرہ دن بعد چلے جانا — پھر شاید کوئی روکنے والا نہ ہو —" رک رک کر ماں نے کہا تھا

"ماں تم بے کار گھبراتی ہو — نوکر ہیں اور پھر — پھر — تمہاری بھانجی ہے — ہم جلدی آ جائیں گے"

وہ کبھی اپنی بیوی کو بیوی نہ کہتا، ماں کی بھانجی ہے اور بس!

"جاؤ ــــ چلے جاؤ ــــ میں کانٹا نکل جائے گا" ــــ حسرت بے پناہ حسرت تھی ماں کی آواز میں مگر اس نے کان بہرے کر لئے ــــ پھیلے ہاتھوں کو نظر انداز کر دیا۔ اگلے دن اس نے عنبریں کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا جو دادی کا منہ چوم رہی تھی ــــ اور باہر کھڑی موٹر میں جا بیٹھا۔۔۔۔

آہ عنبریں ــــ عنبریں ــــ عنبریں ــــ اس کا سر جھکتا جا رہا تھا ــــ اسے لگا جیسے ماں نے اس کے سر کو تھام لیا۔

"میں نے کہا تھا نا ــــ میں پھر تجھے نہ ستاؤں گی"

"ماں ــــ تم تو آٹھ دن بعد ہی چل بسیں سر کے اندر گہری چوٹ آئی تھی نا ــــ آہ ــــ کتنا بڑا دھوکا کیا تم نے، مجھ سے دنیا نے مجھے لعنت ملامت کی ــــ ہمیشہ تمھاری ؟ سے عنبریں تک خفا ہو گئی کہ ہم کیوں دادی اماں کے پاس نہ رہے ــــ"

وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا ــــ لگا ماں بھی ساتھ ہی کھڑی ہو گئی ہے۔ "ماں یہ کیا ہو رہا ہے ــــ یہ کیا ہو گیا ــــ"

"وقت وقت کی بات ہے ــــ بیٹا ــــ میں ماں تھی ــــ جھیل گئی ــــ تو باپ ہے جھیل نہیں پا رہا ہے" ــــ ماں نے اپنا سفید آنچل اس کے سر پر ڈال دیا ــــ

"وقت وقت کی بات ہے" خدایا ــــ خدایا ــــ خدایا ــــ

پھر خدا ــــ

وقت اپنے کو دہراتا ہے ــــ

وقت اپنے کو دہراتا ہے ــــ

ماں ــــ ماں ــــ

عنبریں ــــ عنبریں ــــ

اندھیرا ــــ تاریکی ــــ

نوکر دوڑ کر آئے ــــ وہ فرش پر اوندھے منہ پڑا تھا ــــ برین ہیمرج ــــ ڈاکٹر نے تشخیص کیا ــــ

(یہ افسانہ، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ کے افسانوی ادب کے بین اقوامی سیمینار میں پڑھا گیا تھا۔)

تعارف و تبصرہ

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

مکتوبات ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی

بنام عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی جامعی

سائز: ۲۲×۱۸/۸، حجم ۶۰ صفحات، غیر مجلد، قیمت: ۴/۵۰ روپے - سال اشاعت: ۱۹۸۰ء

ملنے کا پتہ: دائرۂ حمیدیہ، مدرستہ الاصلاح - سرائے میر - اعظم گڈھ - ۲۷۶۳۰۵

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اردو کے خوشگو شاعر اور اچھے نقاد تھے، افسوس کہ صرف ۵۱ سال کی عمر میں ان کی وفات ہوگئی - ان کی تاریخ پیدائش ۹ اگست ۱۹۲۷ء ہے اور تاریخ وفات یکم جون ۱۹۷۸ء۔ زیر تبصرہ مجموعے میں مرحوم کے صرف ۲۰ خط ہیں اور ان میں سے بیشتر خطوط ابتدائی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی اس دور سے جب خلیل الرحمٰن نہ تو شاعر تھے اور نہ نقاد بلکہ ایک مکتب کے طالب علم - اس مجموعے میں پہلا خط ۱۲ اگست ۱۹۴۰ء کا ہے جبکہ ان کی عمر صرف ۱۳ سال کی تھی، آخری خط ۱۹ جون ۱۹۵۷ء کا ہے جب وہ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر ہو چکے تھے - مگر ابھی بمشکل ۱۰ مہینے ہوئے تھے اور ان کا مجموعۂ کلام: "کاغذی پیرہن"، مجموعۂ مضامین: "فکر و فن"، "مقدمہ کلام آتش" اور "نوائے ظفر" شائع ہو چکے تھے، گویا ان کی ادبی شہرت کا آغاز ہو چکا تھا۔

اگرچہ ان خطوط کی تعداد کم ہے، مگر ان کی بڑی اہمیت ہے، ان سے خلیل مرحوم کی ابتدائی زندگی پر جو بہت سخت گزری ہے، بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے، ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ادب سے دلچسپی اور شاعری کا ذوق شروع ہی سے تھا اور وہ چاہتے تھے کہ کچھ ایسے کام انجام دیں جنھیں ان کے بعد یاد رکھا جائے - چنانچہ اپنے پہلے خط (مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۴۰ء) میں

عبدالرحمٰن ناصر صاحب کو، جو بغرض تعلیم جامعہ ملیہ دہلی آگئے تھے، خطاب کر کے لکھتے ہیں: "آپ ایک حسین اور جمیل مقام پر پہنچ گئے ہیں، جہاں کے نظارے آپ کو موہ لیتے ہیں اور جہاں صبح و شام جمنا کی لہریں آپ کے قدم چومتی ہیں، اس سے مجھے بھی بڑی خوشی ہے، لیکن یہ عرض کروں گا کہ اپنے دیہات کے مناظر کو بھی اپنے دل کے کسی گوشے میں محفوظ رکھئے گا، وہ لہلہاتی ہوئی کھیتیاں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، صبح و شام کے دلفریب نظارے، ساون کی اودی اودی گھٹائیں، کوئل اور پپیہوں کے دردناک نغمے بھی یاد رکھئے گا اور صفحۂ دل پر ان کی تصویریں بنائے رکھئے۔ آپ نے اپنی کسی تقریر میں کہا تھا کہ:

باراں کی طرح لطف و کرم عام کئے جا ۔۔۔ دنیا میں جو آیا ہے تو کچھ نام کئے جا

وہ مجھے اب تک یاد ہے اور میں نے اپنا مقصد زندگی بھی یہی تصور کر لیا ہے کہ آدمی دنیا میں ایسے کام کر جائے کہ مرنے کے بعد اس کی یادگار باقی رہے اور لوگ اس کا نام عزت اور احترام کے ساتھ لیں۔" (صفحہ ۱۰۰۹)

خلیل مرحوم ایک ایسے غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جو انھیں ان کے عزائم اور حوصلے کے مطابق جدید اعلیٰ تعلیم نہیں دلا سکتا تھا جس کا اظہار انھوں نے اس مجموعے کے آخری خط مورخہ ۱۹ جون ۱۹۵۷ء) میں مکمل کر کیا ہے اور اعلیٰ تعلیم کے لئے اپنے محکم عزائم اور مصمم ارادوں کا ذکر کرتے ہوئے اس خط میں لکھا ہے کہ: "اس ماحول کا پروردہ اگر اپنے اندر صلاحیت نہ رکھتا اور اس کے ساتھ عزم و ہمت، تو شاید کہیں قلی گیری کر رہا ہوتا یا رکشا چلا رہا ہوتا، ورنہ بہت ہوتا تو کسی دفتر میں سڑ رہا ہوتا، لیکن میں نے علی گڑھ میں صرف اپنے بل (بوتے) پر تعلیم حاصل کرنے کا حوصلہ کیا۔ شروع میں وہاں کے لوگ یہی سمجھتے رہے کہ میں نادان ہوں کہ پاس کوڑی نہیں اور علی گڑھ کا سفر کر رہا ہوں، لیکن میں نے ان کے ہنسنے کی پروا نہ کی، علی گڑھ میں ٹیوشن اور مزدوری کر کے اور کچھ "ڈیوٹی سوسائٹی" سے قرض لے کر کسی طرح میں نے ایم اے درجہ اوّل میں پاس کیا۔" (صفحہ ۵۵-۵۶)

اس کے بعد پی ایچ ڈی کیا اور اوپر کی خط کشیدہ عبارت میں جس مقصد زندگی کا اظہار کیا تھا اسے واقعی پورا کر دکھایا، یہ بڑی قابل تعریف بات ہے۔

عبدالرحمٰن ناصر صاحب ہم سب اردو والوں کے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ان قیمتی خطوط کو محفوظ رکھا اور بروقت شائع کر کے خلیل مرحوم پر لکھنے والوں کے لئے بڑا اہم

اور بیش بہا مواد مہیا کر دیا۔ فاضل مکتوب الیہ نے لکھا ہے کہ ان کے پاس مرحوم کے ابھی اور بھی خطوط ہیں جو ۱۹ ارجون ۱۹۰۷ء کے بعد لکھے گئے ہیں، بہتر ہوتا اگر یہ خطوط بھی اس مجموعے میں شائع کر دیے جاتے لیکن کسی وجہ سے اگر ایسا نہ ہو سکا تو جلد ہی انھیں بھی شائع کر دیا جائے، کتابی صورت میں ممکن نہ ہو تو کسی موقر رسالے میں شائع کرا دیں۔

مجلّہ سیفیہ ــــ یادگار اقبال

سائز ۲۲×۱۸، حجم ۲۹۲ صفحات، غیر مجلد، قیمت درج نہیں۔ بابت: ۸۰ — ۱۹۷۹ء،
ناشر: سیفیہ کالج پوسٹ گریجویٹ کالج۔ بھوپال

"مجلّہ سیفیہ" بھوپال کے مشہور کالج، سیفیہ کالج کا علمی وادبی رسالہ ہے، جس کے نگراں، شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر عبدالقوی دسنوی ہیں جو اردو دنیا میں اچھی شہرت کے مالک ہیں۔ علامہ اقبال کا ریاست بھوپال اور نواب بھوپال جناب حمید اللہ خاں مرحوم سے بہت گہرا تعلق رہا ہے، اس لئے "مجلّہ سیفیہ" نے اقبال کی یاد میں اپنا خصوصی شمارہ نکال کر ایک مستحسن روایت کی پیروی کی ہے۔ رسالے کے نگراں پروفیسر دسنوی صاحب نے "نگاہ اولیں" میں علامہ اقبال اور بھوپال کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ: "اقبال اور بھوپال کے رشتے کو سمجھنے اور مضبوط کرنے کے لئے آج سے کئی سال پہلے شعبۂ اردو سیفیہ کالج نے ایک مختصر کتاب "علامہ اقبال بھوپال میں" (مولفہ: دسنوی صاحب) شائع کی تھی جو اپنے قسم کی بھوپال کی پہلی کتاب تھی، پھر علامہ اقبال کے تعلق سے یہاں کے شعبۂ اردو میں "گوشۂ اقبال" کی بنیاد ڈالی گئی جس میں آج اقبالیات سے متعلق نہایت اچھا ذخیرہ یکجا ہو گیا ہے ... گذشتہ دو سال میں شعبۂ اردو نے اقبالیات سے دلچسپی پیدا کرنے کے لئے طلبہ کے درمیان مختلف وقتوں میں مسلسل کئی ادبی جلسے کئے جن میں خاص طور سے طلبہ نے مضامین پڑھ کر اپنی دلچسپی کا ثبوت دیا ... اور آج "یادگار اقبال" پیش کر کے ہم اہل سیفیہ اقبال کے بھوپال سے تعلق کو اور بڑھا رہے ہیں ...." (صفحہ ۱۲)

"نگاہ اولیں" کے بعد علامہ محوی صدیقی لکھنوی مرحوم کی طویل نظم درج ہے جو ان چند بہترین نظموں میں سے ہے جو اقبال پر لکھی گئی ہیں، جامعہ ملیہ کے مدرسہ ثانوی کے استاد جناب

خالد محمود کی بھی اقبال پر ایک نظم اس میں شامل ہے۔ جس کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

قرآن کے اسرار و معانی پہ نظر تھی عارف تھا عقیدت کشِ اسلام تھا اقبال
سورج کی شعاعوں میں جو ایک شوخ کرن تھی اس شوخ کا ہی دوسرا اک نام تھا اقبال

مضامین ایک مضمون ڈاکٹر عبدالحق صاحب کا ہے جو دلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں استاد ہیں اور اقبال شناسوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ بارہ صفحے کے اس مضمون میں اقبال صدی کی مطبوعات اور تقریبات کا جائزہ لیا گیا، کہیں کہیں تبصرہ بھی کیا گیا ہے، مگر دونوں سرسری ہیں، اگر اور زیادہ تفصیل سے لکھا گیا ہوتا تو اس کی افادیت اور بڑھ جاتی ہے۔ "اقبال ۔ جامعہ کے مصنفین کی نظر میں" (مرتبہ: پروفیسر گوپی چند نارنگ) کے سلسلے میں فاضل مضمون نگار کو غلط فہمی ہوئی ہے، اس میں جامعہ ملیہ کے اقبال سیمینار کے مقالے شامل نہیں ہیں، بلکہ طلبائے جامعہ کے قلمی رسالہ "جوہر" کے اقبال نمبر کے کچھ مضامین ہیں جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا اور کچھ نئے مضامین ہیں جو اسی مجموعے کے لئے لکھوائے گئے ہیں۔ جامعہ کے اقبال سیمینار کے مقالے، کسی وجہ سے، اب تک شائع نہیں ہو سکے۔

"مجلہ سیفیہ" کا یہ خصوصی شمارہ، سلسلۂ اقبالیات کی ایک مفید کڑی ہے۔ خدا کرے کہ پروفیسر دستوی صاحب کی یہ آرزو اور امید پوری ہو کہ: "اس کی اشاعت سے ہمارے نوجوانوں کو اقبال فہمی میں نہ صرف مدد ملے گی بلکہ وہ ایک دن اقبال کے اس نوجوان کی جگہ لے لیں گے جس کا خواب علامہ ساری زندگی دیکھتے رہے۔"

گیارہ سفر ۔ سیاحت ماجدی

مصنفہ: مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم
مرتبہ: حکیم عبدالقوی دریا آبادی

سائز $\frac{22 \times 18}{8}$، حجم ۳۷۹ صفحات، مجلد مع گرد پوش، کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ،
قیمت: ۳۰ روپے۔ سال اشاعت: ۱۹۸۰ء / ۱۴۰۰ھ۔
ناشر: ادارۂ انشائے ماجدی۔ ۱۴۷، رابندر سرانی۔ کلکتہ ۔ ۷۳

زیر تبصرہ کتاب میں اردو کے مشہور ادیب اور طنز نگار مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم کے گیارہ سفر کی مفصل روداد شامل ہے، پہلا سفر بمبئی کا ہے، دوسرا اور تیسرا بہار کا،

چوتھا بھوپال کا، پانچواں حیدرآباد کا، چھٹا اور ساتواں دہلی کا، آٹھواں کلکتہ کا، نواں لاہور کا اور دسواں و گیارھواں مدراس کا۔ یہ کتاب محض ان سفروں کی روداد ہی نہیں ہے، بلکہ اس میں بیش بہا معلومات بھی ہیں اور چونکہ اس کے مصنف مشہور ادیب اور مفسر قرآن ہیں اس لئے کثرت سے بیش قیمت مذہبی اور علمی و ادبی نکات بھی ہیں۔ نیز بعض اہم شخصیتوں کی خدمات اور ان کے مذہبی اور علمی کارناموں کی طرف اشارات اور کہیں کہیں تفصیلات بھی ملتی ہیں اور بعض مقامات، عمارات اور اداروں کی اہمیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً بہار کے سفر میں اُس وقت کے گورنر ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا سید سلیمان ندوی، پروفیسر عبدالمنان بیدل وغیرہ اور مقامات کے سلسلے میں نالندہ اور پھلواری شریف کا ذکر ہے۔ بھوپال کے سفر میں تاج المساجد کا، حیدرآباد کے سفر میں ادارۂ ادبیات اردو، انجمن ترقی اردو، دائرۃ المعارف عثمانیہ، کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ وغیرہ کا، دہلی کے سفر میں جامعہ ملیہ اور اس کے بعض اساتذہ اور کارکنوں کا، کلکتہ کے سفر میں بعض "صدق" نوازوں اور اہم اخبارات کا، لاہور کے سفر میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی مذہبی خدمات اور ان سے اختلافات کا اور مولانا امین احسن اصلاحی سے عزیزانہ اور برادرانہ تعلقات کا نیز خلیفہ ڈاکٹر عبدالحکیم اور سید ہاشمی فریدآبادی کا، مدراس کے سفر میں، افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کرنولی، پروفیسر عبدالوہاب بخاری وغیرہ اور وہاں کے مسلمانوں کی مطمئن اور پرسکون زندگی کا۔ غرض یہ کتاب ایک ایسا سفرنامہ ہے جس میں علم و ادب اور مذہب و تہذیب پر بہترین روشنی پڑتی ہے۔ یہ کتاب نہ صرف اردو کے سفرناموں میں بلکہ اردو ادب میں بہترین اضافہ ہے۔ امید ہے کہ علمی اور مذہبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور صحیح معنی میں اس کی پذیرائی کی جائے گی۔

زیر تبصرہ کتاب کے ناشر، ادارۂ انشائے ماجدی، کلکتہ نے اس سے پہلے بھی دو کتابیں شائع کی تھیں، خطبات ماجدی اور معاصرین۔ امید کہ اسی طرح مولانا ئے مرحوم کی تمام تحریر اور وہ کتابیں جو ختم ہو گئی ہیں، دوبارہ شائع کر کے علم و ادب کی خدمت انجام دے گا۔

(عبداللطیف اعظمی)

ماہنامہ جامعہ کی قیمت میں اضافہ

کئی ماہ پہلے، ماہنامہ جامعہ کے کسی پچھلے شمارے میں اعلان کیا جا چکا ہے کہ کاغذ، طباعت اور کتابت کی غیر معمولی گرانی کے پیش نظر، نئے سال سے رسالے کی قیمت میں اضافہ کیا جائے گا۔ چنانچہ اگلے ماہ، جنوری ۱۹۸۱ء سے جامعہ کی قیمت حسب ذیل ہوگی:

۱۔ ہندوستان کے لئے : ۹ روپے سالانہ۔ قیمت فی پرچہ : ۷۵ پیسے
۲۔ پاکستان کے لئے : ۳۰ روپے سالانہ
۳۔ دوسرے بیرونی ممالک سے : ڈیڑھ پاؤنڈ یا پانچ امریکی ڈالر

موجودہ گرانی کے پیش نظر اور دوسرے معیاری رسالوں کے مقابلے میں یہ اضافہ شدہ رقم بھی کم ہے۔

82240
7.6.82

(ادارہ)

مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک نئی کتاب

البیرونی اور جغرافیۂ عالم

مولانا ابوالکلام آزاد کی اب تک جس قدر کتابیں شائع ہوئی ہیں، وہ یا تو مذہبی نوعیت کی ہیں یا ادبی حیثیت کی۔ مگر اس کتاب میں پہلی مرتبہ وہ ایک جغرافیہ داں کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ عرصہ ہوا، مولانا نے یہ کتاب لکھی تھی، مگر کسی وجہ سے شائع نہ ہو سکی اور ان کی وفات کے بعد، ان کے کاغذات میں "دفن" ہو گئی تھی۔ جناب مسیح الحسن کی کوششوں سے یہ مسودہ دستیاب ہوا اور جناب ضیاء الحسن فاروقی کے مبسوط اور جامع مقدمے کے ساتھ شائع کیا گیا ہے ——— قیمت: پندرہ روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

MONTHLY JAMIA, Jamia Nagar, New Delhi 110025

